من و سلویٰ

عمیرہ احمد

دور حاضر کی مقبول ترین مصنفہ عمیرہ احمد کا رزق حلال کے موضوع پر لکھا گیا ایک بہت خوبصورت ناول

من وسلویٰ

عمیرہ احمد

انتساب!

"دولت" کے نام!

جس سے زیادہ محبت اور نفرت
کسی دوسری شے سے نہیں کی گئی۔

پیش لفظ

من وسلویٰ کا بنیادی موضوع رزق حلال ہے۔ بنی اسرائیل پر نازل کی جانے والی نعمتوں میں سے ایک من وسلویٰ تھی۔ من ایک میٹھی دانے دار شے تھی جو آسمان سے رات کو شبنم کی طرح گر کر جم جاتی۔ سلویٰ ایک بٹیر تھا جو کثیر تعداد میں ان کے علاقے میں آتا اور وہ اسے پکڑ کر کھاتے۔ بنی اسرائیل چالیس سال تک جلاوطنی کے دور میں یہ آسمانی رزق کھاتے رہے پھر اس رزق پر اعتراض کرتے ہوئے حضرت موسیٰ سے ”زمینی رزق“ کا مطالبہ کرنے لگے۔ وہ اس ”پاکیزہ سادہ کھانے“ کے بجائے انواع واقسام کے کھانے چاہتے تھے۔

مجھے من وسلویٰ کے بارے میں پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ بنی اسرائیل کے ”من وسلویٰ“ اور ہمارے ”رزق حلال“ میں بہت مماثلت ہے۔ وہ ”پاکیزہ سادہ کھانا“ تھا۔ یہ ”پاکیزہ سادہ رزق“ ہے۔ دونوں کا حصول بے حد آسان ہے مگر بنی اسرائیل کے لیے من وسلویٰ پر انحصار کرنا اور ہمارے لیے رزق حلال پر جینا مشکل ہے۔ وہ بنی اسرائیل کی سوچ تھی، یہ ہماری سوچ ہے۔ وہ من وسلویٰ سے ”ناخوش“ تھے اور اس کا ”مذاق“ اڑاتے تھے۔ ناشکری کرتے تھے۔ ہم کو رزق حلال ”پسند“ نہیں ہے اور ہم اس پر ”اعتراض“ کرتے ہیں۔ انہیں زمین سے اگنے والا انواع واقسام کا رزق چاہیے تھا۔ ہمیں شارٹ کٹ سے کم وقت میں بہت زیادہ پیسہ چاہیے۔

بنی اسرائیل کی قوم کہتی تھی کہ موسیٰ کا رب ”کنجوس“ ہے جس کے پاس ان کے لیے من وسلویٰ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہم آج یہ سمجھتے ہیں کہ ”ہمارا خدا“ ہمیں رزق حلال کے علاوہ کچھ نہ دے کر ”تنگ“ کر رہا ہے۔ بنی اسرائیل اپنی اس سوچ اور ناشکری کی وجہ سے مغضوب ہوئی اور ہم......

یقیناً ہم مغضوب ہونا نہیں چاہتے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ من وسلویٰ کے معاملے میں نظر آنے والی یہ مماثلت افسوس ناک ہے، شرم ناک ہے یا ہولناک، اس کا فیصلہ ہم سب اپنی اپنی جگہ پر کر سکتے ہیں۔

اور آخر میں بس ایک بات........

من وسلویٰ کوئی اسلامی کہانی نہیں ہے، نہ ہی یہ کوئی اسلامک اسکالرلی فکشن ہے۔ ایک ایشو کے بارے میں میری ذاتی رائے ہے جو بالکل غلط بھی ہو سکتی ہے۔ میرا علم ناقص ہے، میری عقل محدود اور مجھے ان دونوں پر کوئی گمان نہیں مگر میری نیت میں کوئی خرابی نہیں اور میں اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں۔

تو ”من وسلویٰ“ حاضر ہے۔

عمیرہ احمد

☆☆☆

وہ جانتا تھا، اسے اس سے کیا کہنا تھا۔

"جو بھی ہوا، اس کے لیے مجھے افسوس ہے۔ مجھے تمہاری ہر بات پر اعتبار ہے۔ میں اب بھی تم سے پہلے جیسی محبت کرتا ہوں۔ آؤ، میرے گھر والے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

بس میں بیٹھے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے اس نے اپنے جملوں کو ترتیب دے لیا تھا۔ بہترین لفظوں میں معذرت..... مناسب ترین لفظوں میں اظہار اعتماد..... خوبصورت ترین لفظوں میں اظہار محبت اور بہت ڈرامائی ترین لفظوں میں اسے واپس اپنے گھر تک لے جانا۔

بس کے اندر سیٹوں پر بیٹھے لوگ کیا کر رہے تھے۔ اور باہر سڑک پر کیا ہو رہا تھا، وہ مکمل طور پر اس سے بے خبر تھا۔

اس نے آج تک زندگی میں جتنے لفظ پڑھے یا سنے تھے، وہ ان میں سے بہترین لفظوں کا انتخاب چاہ رہا تھا جو ایک گھنٹہ پہلے اس کے گھر میں اس سے کہے گئے لفظوں کی بدصورتی، بھیانک پن اور اذیت کو کم کر سکیں۔

"یہ بہت مشکل کام ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔

"ایک بلین ڈالر بنانا آسان ہے، بے حد آسان..... مگر زبان سے نکلے ہوئے لفظوں کی اذیت کو مدھم کرنا یا مٹا دینا بے حد مشکل ہے۔"

بس نے یک دم بریک لگائے، وہ چونک کر اپنی سوچوں سے باہر نکل آیا۔ اس کا مطلوبہ اسٹاپ آ چکا تھا۔ وہ اتنی بار اس کے ساتھ اس روٹ پر سفر کر چکا تھا کہ آنکھیں بند کر کے بھی اس راستہ پر اس کے گھر پہنچ جاتا۔

بس کا دروازہ کھلتے ہی اس نے بے اختیار جھرجھری لی اور پھر اسے یاد آیا وہ اپنا لانگ کوٹ جلدی میں گھر پر ہی بھول آیا تھا۔ بس سے نیچے اترتے ہوئے اس نے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔ موسم کی پہلی برف باری ہو چکی تھی۔ اگرچہ وہ بہت مختصر وقت کے لیے ہوئی تھی مگر محکمہ موسمیات نے اگلے چند گھنٹوں میں مزید اور طویل برف باری کی پیش گوئی کی تھی۔

فٹ پاتھ پر برف کی بے حد ہلکی اور معمولی سی تہہ نظر آ رہی تھی جس نے فی الحال لوگوں کی زندگیوں کو مفلوج کرنا اور انہیں عمارتوں کے اندر رکنے پر مجبور کرنا شروع نہیں کیا تھا۔

وہ فٹ پاتھ بھی اس کے لیے شناسا تھا۔ اس کے گھر تک وہ دونوں اتنی بار اس پر چلتے رہے تھے کہ اس فٹ پاتھ پر بیٹھے پانچ بھکاری تک ان کے شناسا بن گئے تھے۔ وہ اب باقاعدہ بھیک لیتے ہوئے ان سے مسکراہٹوں اور greetings کا تبادلہ کیا کرتے تھے۔ اسے شک تھا، وہ ان دونوں کا نام بھی جانتے تھے اور نام نہیں تو کم از کم یہ تو ضرور جانتے تھے کہ وہ پاکستانی ہیں، انڈین نہیں۔ اور ان دونوں کا رشتہ.....؟ شاید اس کے بارے میں بھی انہیں اندازہ تھا۔

اس کا پاؤں یک دم پھسلا، سوچوں سے واپس آتے ہوئے اس نے بے اختیار خود کو سنبھالا۔ کنکریٹ کے اس فٹ پاتھ پر وہ گرتا تو اسے کتنی بری چوٹ آ سکتی تھی۔ وہ ہر بار اس فٹ پاتھ پر اسی جگہ پھسل جاتا تھا۔ ہر بار وہ ساتھ چلتے ہوئے اسے بے اختیار پکڑ کر سہارا دیتی۔ شروع میں

وہ اس پر ہنستی اور وہ شرمندہ ہوتا۔ جب اس کا یہ پھسلنا معمول بننے لگا تو وہ ناراض ہونے لگی اور وہ مزید شرمندہ..... اور اب کچھ عرصے سے وہ فٹ پاتھ پر مخصوص جگہ آنے سے پہلے ہی اس سے کہنا شروع کر دیتی۔

''پھسلنے والی جگہ آنے لگی ہے، اب دھیان سے پاؤں رکھنا۔''

وہ بے حد محتاط ہونے اور اس کی اس تنبیہ کے باوجود وہاں کئی بار پھسلا تھا اور وہ بے اختیار اس کو سہارا دیتے ہوئے کہتی۔

''مجھے لگتا ہے، تم اس لیے یہاں پھسلتے ہو تا کہ میرا ہاتھ پکڑ سکو۔''

''تمہارا ہاتھ پکڑنے کے لیے مجھے پھسلنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ جھنجلا کر کہتا۔ وہ رک جاتی اور اس سے چند قدم دور ہو کر بے حد تیکھے انداز میں اس سے کہتی۔

''اچھا.....؟ تمہارا کیا خیال ہے۔ بغیر وجہ کے اتنی آسانی سے ہاتھ پکڑا دوں گی تمہیں؟''

''میں ہاتھ پکڑانے کی بات نہیں کر رہا، ہاتھ پکڑنے کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ کچھ اور جھنجلاتا۔

''اتنی ہمت ہے؟ ذرا پکڑ کے تو دکھاؤ۔''

وہ بے حد ناراضی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ اپنے عقب میں کر کے اس کو چیلنج کرتی۔ وہ چند لمحے اس کو گھورتا۔ وہ جانتی تھی، وہ اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کرے گا اور اسے بھی پتا تھا کہ وہ یہ بات جانتی ہے۔ دو منٹ کی اس لڑائی کے بعد دونوں ہمیشہ کی طرح ساتھ ساتھ چلنے لگتے۔

اس کے پچھتاوے میں کچھ مزید اضافہ ہوا۔ جیب سے سیل فون نکال کر اس نے ایک بار پھر اس کو کال کرنے کی کوشش کی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس کی کال ریسیو نہیں کرے گی۔ وہ راستے میں پندرہ دفعہ اسے کال کر چکا تھا۔ ہر بار بیل ہوتی رہی تھی۔

سولہویں بار پھر اس نے کسی موہوم سی امید کے تحت کال ملائی۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس نے آج ایک دوسری جگہ سے ٹھوکر کھائی تھی۔ سیل فون کان سے لگائے بے یقینی کے عالم میں اس کے قدم رک گئے۔ دوسری طرف بیل ہو رہی تھی اور پہلے کی طرح کسی نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ اس کے پیروں کو روک دینے والی یہ چیز نہیں تھی بلکہ اس کے سیل فون کی رنگ ٹون تھی جو اس کے آس پاس کہیں بج رہی تھی۔

If tomorrow never comes کی وہ رنگ ٹون اس سیل فون میں اس کی منتخب کردہ تھی۔ بیل جس تواتر سے ہو رہی تھی، وہ رنگ ٹون اسی تواتر سے گونج رہی تھی۔

اس نے کال ختم کر دی۔ وہ جان گیا تھا، فون کہاں ہو سکتا تھا مگر وہاں کیوں تھا؟

وہ چند قدم آگے بڑھ کر ایک سیکنڈ میں اس فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے پانچ بھکاریوں میں سے پہلے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے سیل فون اپنے ہاتھ میں بلند کیے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اس کے سامنے کھڑا اس قیمتی سیل فون کو دیکھ رہا تھا۔ یہ سیل فون چند ہفتے پہلے ہی اس نے اسے گفٹ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا، اس سیل فون کی میموری میں محفوظ واحد نام اور کانٹیکٹ نمبر اس کا تھا۔

"واحد تمہارا نام ہے جسے دیکھ کر مجھے کچھ "محسوس" ہوتا ہے، باقی ہر نام کے ساتھ صرف "یادیں" جڑی ہیں اور میں ان یادوں سے فرار چاہتی ہوں۔ تمہارا نام کافی ہے میرے لیے۔" اس نے سیل فون میں اس کا نام محفوظ کرتے ہوئے کہا تھا۔

اسے یقین تھا، اس سیل فون میں اور کسی کا نام نہیں تھا۔ اس کی فون بک اس کے نام سے شروع ہو کر اسی کے نام پر ختم ہو جاتی تھی۔

اور اب وہ قیمتی فون سڑک پر بیٹھے اس بوڑھے بھکاری کے ہاتھ میں تھا جو ہر روز وہاں بیٹھا تاش کے پتوں سے مختلف چیزیں بناتا رہتا تھا یا اکیلا بیٹھا تاش کھیلتا رہتا۔ آج وہ تاش کھیل رہا تھا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ وہ تاش کے پتے کھڑے نہیں کر سکتا تھا، وہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کئی بار اس کے پاس بیٹھ کر تاش کھیلنا شروع کر دیتی اور وہ احمقوں کی طرح فٹ پاتھ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اس کو یکے بعد دیگرے بازی پر بازی ہارتے دیکھتا رہتا۔ وہ دیکھتا تھا کہ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر وہ آخری لمحوں میں بازی ہار جاتی تھی۔ بہت دفعہ اس کا جی چاہتا، وہ اسے ٹوک کر کی جانے والی غلطی کے بارے میں بتا دے۔ اگرچہ یہ غلط ہوتا پھر بھی وہ اس کو اتنی بری طرح ہارتے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ اسے زبان سے کچھ نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ وہ بوڑھا بھکاری برا مان جاتا اور کسی اشارے کی مدد سے بھی نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ وہ تاش کھیلتے ہوئے ایک بار بھی سر نہیں اٹھاتی تھی۔ کسی مدد، کسی داد، کسی آس سے اس کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ سر جھکائے وہ کچھ دیر وہاں بیٹھی تاش کھیلتی پھر آخری بازی کے بعد ایک گہرا سانس لے کر مسکراتی اور بوڑھے کو دیکھتی جو فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا ہوتا پھر وہ جیب سے چند ڈالر نکالتی اور اس کے ڈبے میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوتی۔

"میں اچھا کھیلی نا؟" وہ ساتھ چلتے اس سے پوچھتی۔

"ہاں۔" وہ مختصراً کہتا۔

"لیکن ہار گئی۔"

وہ جانتا تھا، وہ اس جملے میں کیا کہہ رہی تھی۔

"معمولی غلطی سے۔" اسے بھی پتا تھا کہ وہ ان تین لفظوں میں اسے کیا جتا رہا تھا۔

وہ ایک دوسرے کو دیکھتے، چند لمحوں کے لیے سر جھٹکتے۔ گہری نظروں کا تبادلہ کرتے، نظریں چراتے پھر قدم بڑھا دیتے۔

"She gave it to me" (یہ اس نے مجھے دے دیا۔) بوڑھے بھکاری کی آواز نے اسے یک دم چونکا دیا۔ وہ جھریوں بھرے چہرے پر پیلے دانتوں کی نمائش کرتا اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنے جسم میں کپکپاہٹ محسوس کی۔ یہ سردی نہیں تھی، کچھ "اور" تھا۔ وہ اس کے دیے ہوئے تحفے کو فٹ پاتھ پر بیٹھے بھکاری کو کیسے تھما سکتی تھی؟

اس نے بے یقینی اور شاک کے عالم میں قدم آگے بڑھائے۔ کچھ دور آگے گٹار بجاتے ہوئے اگلے سیاہ فام بھکاری نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

وہ دونوں ہمیشہ وہاں کھڑے ہو کر کچھ دیر خاموشی سے اس کے گٹار کو سنا کرتے تھے پھر جیسے بجائی جانے والی دھن پہچاننے کی کوشش کرتے

اور اکثر اس میں کامیاب ہو جاتے۔ پھر وہ اس سیاہ فام کو کوئی دوسری دھن بجانے کے لیے کہتے۔ ایک دفعہ پھر اسے پہچاننے میں لگ جاتے۔

اس سیاہ فام کی انگلیاں آج بھی بڑی تیزی سے گٹار بجا رہی تھیں مگر وہ آج وہاں کسی دھن کو بوجھنے نہیں آیا تھا، وہ اس کے ڈبے میں پڑے سکوں اور نوٹوں میں اس چیز کو دیکھنے آیا تھا جو وہاں وہ پھینک کر گئی تھی اور وہ چیز سامنے ہی پڑی تھی۔ Gucci کی وہ گھڑی جو اس نے اس کی پچھلی سالگرہ پر دی تھی۔

"تم اسے پہنو گی تو وقت قیمتی ہو جائے گا۔"

وہ گھڑی کا کیس ہاتھ میں پکڑے اس پر ایک نظر ڈال کر مسکرائی۔ "کس کا وقت؟ میرا یا تمہارا؟"

"تمہارا۔" وہ بھی مسکرایا۔

"لیکن میرے پاس تو وقت ہے ہی نہیں۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پتا ہے، میں نے زندگی میں کبھی ریسٹ واچ نہیں پہنی۔"

"کیوں؟" اس نے دلچسپی لی۔

"مجھے وقت کو کلائی پر باندھنے کی بجائے مٹھی میں قید رکھنا زیادہ آسان لگتا ہے۔"

اس نے عجیب سے لہجے میں اس کی دی ہوئی بیش قیمت گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگتا ہے، وقت کلائی پر ہو تو یہ انتظار کروانے لگتا ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ چونکا۔

"انتظار موت ہے۔" اس نے گھڑی کو دیکھتے ہوئے بے حد عجیب لہجے میں کہا۔

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" اس نے اسے ڈانٹا اور پھر گھڑی کیس سے نکال کر اس کی کلائی پر باندھ دی تھی۔

اور اب وہ گھڑی اس ڈبے میں پڑی تھی، اس کے دل کو بے اختیار کچھ ہوا۔

اسے دیکھنا تھا، وہ اگلے بھکاری کو کیا دے کر گئی تھی۔ اس بار اسے کسی ڈبے میں جھانکنا نہیں پڑا۔ وہ اسپینش ہپی جسے وہ ہر وقت نشے میں دیکھتے تھے اور جو کچھ ہوش میں ہوتا تو چند رنگین بالز کو ہوا میں اچھالتے کرتب دکھاتا رہتا یا چند گلاسز کو ہوا میں اچھالتا رہتا۔ وہ ہپی، وہ منک کوٹ پہنے ہوئے تھا جو اس نے نئے سال پر اسے تحفے میں دیا تھا۔ وہ اس لیڈیز منک کوٹ کو اپنے دبلے پتلے جسم پر چڑھائے بے حد مضحکہ خیز مگر بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل بے اختیار ڈوبا۔ اس نے اس دن وہ قیمتی منک کوٹ پہلی بار پہنا تھا۔ اس خاص موقع پر اور اب وہ ایک متروکہ چیز بن چکا تھا۔

"مائی گاڈ" وہ اس کوٹ کو دیکھ کر بے اختیار چلائی تھی۔

"تمہیں پسند نہیں آیا کیا؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنا۔

"اس منک کوٹ کی قیمت میں دس بہت اچھے کوٹ آ جاتے۔ تم ایک بے حد فضول خرچ آدمی ہو۔" وہ واقعی ناراض تھی۔

''تو کیا اسے واپس کر کے دس اچھے اور شان دار کوٹ لا دوں تمہیں؟'' اس نے اسی انداز سے کہا۔

''کتنا روپیہ تم نے عورتوں میں اس طرح کے سنک کوٹ بانٹنے پر ضائع کیا ہوگا۔'' وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

''کون سی عورتیں؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''اچھا اب ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ مدافعانہ انداز میں بولی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے کوئی غلط بات کہہ دی تھی۔

وہ جواب دینے کے بجائے بے حد ناراض ہو کر اس کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ حواس باختہ اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی۔

''مذاق کر رہی تھی۔ اچھا..... اب بس ختم کرو بات کو..... اوکے..... آئی ایم سوری..... اب کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑوں..... اچھا کم از کم تم کچھ کہو تو سہی..... اب ایکسکیوز کر تو رہی ہوں، اب اور کیا کروں..... کیا مر جاؤں؟''

وہ اس کے پیچھے گاڑی تک آتے آتے روہانسی ہو گئی تھی۔

وہ بے اختیار رکا۔ ''میں پہلے تو شاید مان جاتا مگر یہ بے ہودہ بات جو اب تم نے کہی ہے..... یہ.....'' وہ واقعی بے حد غصے میں آ گیا تھا۔

''تم مجھے تحفے مت دیا کرو۔'' اس نے بے اختیار اس کی بات کاٹ کر بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''کیونکہ میں تمہارے اتنے قیمتی تحفوں کے بدلے میں اتنے قیمتی تحفے نہیں دے سکتی۔''

''تو تم سے تحفے مانگ کون رہا ہے؟''

''ہاں، کوئی نہیں مانگ رہا مگر مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگنے لگتا ہے۔''

''اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تمہارا دماغ چھوٹا ہے اور چھوٹے دماغ کے ساتھ انسان صرف چھوٹی باتیں سوچتا ہے۔''

اس نے بے اختیار اسے وہیں کھڑے کھڑے ڈانٹا اور پھر اگلے دس منٹ وہیں پارکنگ میں گاڑی کے پاس کھڑا مسلسل بولتا رہا تھا۔

''کسی سمجھ دار مرد کو کسی بے وقوف عورت سے محبت نہیں کرنی چاہیے۔'' اس نے بالآخر بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''چلو، پھر تو سارا جھگڑا ہی ختم ہوا کیونکہ نہ میں بے وقوف عورت ہوں، نہ تم سمجھ دار مرد ہو۔ آؤ واپس چلیں۔''

وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے بے ساختہ بڑے اطمینان سے بولی تھی۔ وہ چند لمحے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھتا رہا پھر یک دم ہنس پڑا۔

''یہ احساس تک نہیں تم کو کہ اتنی سردی میں یہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ دیکھو، میرے ہاتھ تک نیلے ہو گئے ہیں۔''

اپارٹمنٹ تک واپسی کے پانچ منٹ میں وہ بولتی رہی تھی اور وہ سنتا رہا تھا۔

بچی کے ہاتھ سے بے اختیار ایک بال گر کر اس کے پیروں کے پاس آئی۔ اس نے کھڑے کھڑے جوتے کی نوک سے بال اس کی طرف لڑھکائی اور اگلے بھکاری کی طرف بڑھ گیا۔

اگلے بھکاری نے اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر ڈھولک بجاتے ہوئے سر کو بے اختیار خم کر کے ہمیشہ کی طرح اس کا استقبال کیا۔ اس نے

آج پہلی بار اس کے اس استقبالی انداز کو نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں اس کے ڈبے کے پاس پڑے سرخ برانڈڈ اٹالین جوتوں کے اس جوڑے کو دیکھ رہی تھیں جو اس نے کل ایک بہت مہنگے اسٹور سے کوئی پچاس جوتے ٹرائی کرنے کے بعد اسے خرید کر دیے تھے۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی سے ایک لہر گزری تھی، وہ کیا پاگل ہوگئی تھی کہ اس سردی میں وہ جوتے وہاں اتار کر وہاں سے پیدل اپنے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ تک گئی تھی۔ برف اور سرد ٹھٹھرتی سڑک نے اس کے پیروں کا کیا حال کیا ہوگا۔ کوئی اسے اپنے پیٹ میں گھونسے مارتا محسوس ہوا۔

اسے اپنے سرخ کپڑوں کے ساتھ میچ کرتا سرخ جوتوں کا ایک جوڑا چاہیے تھا۔ چار مختلف اسٹورز سے پھرتے پھراتے وہ بالآخر پانچویں اسٹور میں آئے تھے اور تب تک وہ کچھ جھنجھلا چکا تھا جبکہ وہ ابھی اسی طرح چہکتے ہوئے خوش باش مختلف جوتوں کو پہن پہن کر دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں آخر کس قسم کا جوتا چاہیے؟'' اس نے پندرھواں جوڑا ٹرائی کرنے کے بعد ریجکٹ کر دیا تو اس نے بالآخر تنگ آ کر پوچھا۔

اس نے جواب میں بے حد سنجیدگی سے اسے جوتے کی شکل، معیار، اسٹائل اور رنگ کے بارے میں جو تین منٹ کا لیکچر اسے دیا تھا، اس سے وہ صرف یہ اخذ کر سکا تھا کہ اسے Stiletto ہیلز والا ایک سرخ جوتا چاہیے۔

''تم کسی اور رنگ کا جوتا کیوں نہیں خرید لیتیں؟''

ساتویں اسٹور کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے کہا۔

اس نے جواباً اسے اتنی ملامت بھری نظروں سے دیکھا تھا کہ وہ بے اختیار شرمندہ ہوگیا۔

''میرے کپڑے سرخ رنگ کے ہیں۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اس طرح کہا جیسے کوئی بڑا کسی بچے کو سمجھاتا ہے۔ ''اس لیے کامن سینس تو یہی کہتی ہے کہ مجھے سرخ جوتے ہی خریدنے چاہئیں۔'' اس نے مزید اضافہ کیا۔ اس نے دوبارہ کچھ بولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''کہیں نہ کہیں ایک سرخ جوتوں کا جوڑا ہوگا جو اس کے نام کا ہوگا اور مجھے کیا کرنا ہے، مجھے صرف اس کو escort ہی تو کرنا ہے۔'' اس نے جیسے خود سے طے کیا تھا۔

اور بالآخر جب اسے یقین ہونے لگا کہ شہر میں سرخ جوتوں کا ایسا کوئی جوڑا نہیں ہے جو اس کے نام کا ہے تو اس نے جوتے پہن کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھا ''میرا خیال ہے، یہ ٹھیک ہے۔ تمہیں کیسے لگ رہے ہیں؟''

''Just Perfect''

وہ بے اختیار والٹ نکالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس کے انداز پر بے اختیار ہنسی۔

''کم از کم دیکھ تو لو کہ میں نے کیا خریدا ہے اور یہ میرے پیروں میں کیسے لگ رہے ہیں۔''

''یہ جیسے بھی لگ رہے ہیں، مجھے صرف یہ خوشی ہے کہ تم نے بالآخر جوتے پسند کر لیے ہیں۔'' اس نے کریڈٹ کارڈ نکالتے ہوئے ایک سرسری نظر اس کے پیروں پر ڈالی۔ وہ جوتے اس کے پیروں میں اچھے لگ رہے تھے مگر اسے وہ پچھلے پچاس جوڑے بھی برے نہیں لگے تھے جو اس نے پچھلے پانچ گھنٹوں میں مختلف اسٹورز میں پہن کر اسے دکھائے تھے۔

اور اب پانچ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد ڈھائی سو ڈالرز کے وہ برانڈڈ جوتے اس ناہموار فٹ پاتھ پر فلوٹ بجاتے اس آدمی کے سامنے پڑے تھے جو شاید اسی کی طرح اس ہڈیوں تک اترتی سردی میں اسے جوتے پاؤں سے اتارتے دیکھ کر حیران ہوا ہوگا اور پھر اس نے وہی سوچا ہوگا جو اسے سوچنا چاہیے تھا کہ وہ شاید نشے کی حالت میں ہے۔

اس کا مسنک کوٹ، جوتے، گھڑی، موبائل اس فٹ پاتھ پر پڑے تھے تو اب اس کے پاس اتار پھینکنے کے لیے اور کیا رہ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا، کہ اس کے جسم پر صرف دو چیزیں باقی تھیں۔ اس کا سرخ لباس اور ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی (اس کے جسم پر اس دن سجایا ہوا واحد زیور)

وہ لباس اس کا اپنا تھا۔ اس کا دلوایا ہوا ہوتا تو وہ اسے بھی اتار کر اسی فٹ پاتھ پر پھینک چکی ہوتی۔ وہ کسی دوسری عورت کو جانتا تھا یا نہیں مگر اس کو جانتا تھا۔ وہ اس فٹ پاتھ پر اس کی دی ہوئی چیزیں پھینک رہی تھی۔

فٹ پاتھ پر بیٹھے اسکیچ بناتی اس ادھیڑ عمر عورت کے پاس اس کی انگوٹھی ہونا چاہیے تھی۔ وہ آگے بڑھ کر اس قطار میں بیٹھے پانچویں بھکاری کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ وہ عورت مخبوط الحواس تھی یا کم از کم ان دونوں کو یہی لگتا تھا۔ پچھلے چار بھکاریوں کے برعکس وہ کبھی سر اٹھا کر پاس سے گزرنے والے یا پاس آ کر کھڑے ہونے والے لوگوں کو نہیں دیکھتی تھی۔

وہ ہر بار ایک ہی مرد کا چہرہ اسکیچ کرتی تھی۔ ایک نوجوان۔ خوبصورت مرد کا۔ مگر ہر بار وہ چہرہ کسی دوسرے اینگل سے اسکیچ کر رہی ہوتی۔ وہ اپنے کام میں بلاشبہ حاذق تھی۔ وہ دونوں اکثر اس کے پاس کھڑے اس کو اسکیچ بناتے دیکھتے رہتے۔ وہ دونوں اب اس اسکیچ کیے جانے والے چہرے سے بے حد شناسا ہو گئے تھے۔

''کون ہو سکتا ہے یہ مرد؟'' اس نے ایک دن وہاں کھڑے کھڑے اس سے پوچھا۔ ''شاید اس عورت کا بیٹا۔'' اس نے خود ہی اندازہ لگایا۔

''نہیں، بیٹا نہیں ہے۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

اس نے اس کے جواب پر چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اسکیچ پر نظریں جمائے اپنے اوورکوٹ میں دونوں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔

''تو پھر کون ہے؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں اور چہرے پر بے حد عجیب سا تاثر تھا۔

''چھوڑو، جانے دو۔'' اس نے جواب دینے کے بجائے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔ اس نے جواب کے لیے اصرار نہیں کیا۔ اسے جواب مل گیا تھا۔

وہ عورت اب بھی وہی چہرہ بنا رہی تھی اور اسکیچ کرتے اس کے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں پلاٹینم کی وہ انگوٹھی تھی جو اس نے سات دن سترہ گھنٹے پہلے رات کے تین بجے اسے دی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا، کہاں گئی۔'' وہ رات کے تین بجے اس کے اپارٹمنٹ پہنچنے کے بعد اب اپنی جیکٹ اور اوورکوٹ کی ایک ایک جیب کو کھنگال چکا تھا۔ اور اب جیکٹ کی جیبوں کو ایک بار پھر ٹٹول رہا تھا۔

''کیا کہاں گئی؟'' وہ اس کے قریب کھڑی تھی منہ پر ہاتھ رکھے اپنی جماہی کو روکتے ہوئے اس نے اپنی نیند سے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو

بمشکل کھولتے ہوئے کہا۔

''ایک رنگ تھی۔'' وہ اب جیکٹ کی اندرونی جیب کو دوبارہ چیک کر رہا تھا۔

''کیسی رنگ؟'' وہ جمائیاں لیتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نیند میں کھڑے رہنا اس کے لیے بے حد دشوار تھا۔

''تھی ایک رنگ۔'' وہ بے حد مایوسی سے جیکٹ کو آخری بار جھاڑتے ہوئے بولا۔

''اور تو کوئی مسئلہ نہیں ہے نا؟'' اس نے کشن کو سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا مسئلہ؟'' وہ حیران ہوا۔

''اب رات کو تین بجے تم کسی کے گھر آؤ گے تو وہ تم سے یہی پوچھے گا نا۔'' وہ اب کشنز کے ڈھیر کو صوفے کے ایک طرف کرتے ہوئے اس پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''جب جانے لگو تو دروازہ ٹھیک سے بند کر کے جانا۔ اب یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اسے ہدایت دینے کی کوشش کی مگر آنکھیں بند کرنے سے پہلے ہی وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ لاؤنج میں پڑی کرسیاں ادھر ادھر ہٹا کر فرش پر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے۔ یہیں پر کہیں گری ہے۔'' اس نے مڑ کر اسے دیکھے بغیر کہا۔

''میں سونے لگی ہوں اور اب اگر تمہیں کوئی کرسی ہٹانا بھی ہے تو بالکل آواز نہیں ہونی چاہیے۔ اب ایک رنگ ڈھونڈنے کے لیے تم کیا میرا اپارٹمنٹ کھود ڈالو گے۔'' وہ ہلکی سی خفگی کے ساتھ بڑبڑائی اور ایک بار پھر کشنز کے اوپر سر رکھ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ انگوٹھی اسے فرش پر ہی دروازے سے کچھ فاصلے پر پڑی ملی۔ اس نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا مگر اس تلاش میں پانچ منٹ لگ گئے تھے اور تب تک وہ صوفے پر گہری نیند سو چکی تھی۔ وہ انگوٹھی لے کر اس کے پاس آیا اور دو تین بار اسے آواز دی مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ مزید وقت ضائع کیے بغیر وہ پنجوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اس نے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ اسے وہ انگوٹھی پہنائی اور پھر اسی احتیاط کے ساتھ اس کا ہاتھ دوبارہ کشنز پر رکھ دیا۔ اس کے بیڈروم سے کمبل لا کر اس پر ڈالتے ہوئے وہ اسی خاموشی اور احتیاط کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ سے نکل آیا تھا۔

Till death do us part

وہ انگوٹھی پر کندہ لفظوں کو وہاں کھڑا کسی وقت کے بغیر دیکھ سکتا تھا۔ وہ کیا کر رہی تھی۔؟ اسے اپنی زندگی سے نکال رہی تھی یا خود اس کی زندگی سے نکل رہی تھی؟

وہ میکسیکن عورت فٹ پاتھ کے کونے پر تھی، وہ اسے چھوڑ کر آگے بڑھ اور موڑ مڑ کر اس عمارت کے سامنے آ گیا جس کی 23 ویں منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں وہ اس وقت تھی۔ وہ ہر بار جب بھی اس عمارت کے سامنے آتا، ایک بار لاشعوری طور پر سر اٹھا کر 23 ویں منزل کی اس کھڑکی کو ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کرتا جو اس کے اپارٹمنٹ کی تھی۔ شروع شروع میں وہ ناکام رہا پھر اس نے ایک گملا لا کر اس کی کھڑکی کے باہر بڑھے

ہوئے مجسمے پر رکھ دیا تھا۔ اس گیسے اور اس میں لگی ہوئی جنگل سے وہ آسانی سے اس کی کھڑکی ڈھونڈ لیتا تھا لیکن آج فضا ہلکی ہلکی دھند آلود تھی۔ اسے یقین تھا، وہ سر اٹھا کر 23 ویں منزل کو نہیں دیکھ سکے گا۔

اس نے پھر بھی سر اٹھا کر دیکھا اور پھر وہ سر نیچے نہیں کر سکا۔ اسے 23 ویں منزل نظر نہیں آئی تھی مگر اسے ہوا میں بہت سی تصویریں اڑتی نظر آ گئی تھیں۔ ان میں سے چند کچھ لمحوں تک زمین پر پہنچنے والی تھیں۔

اس کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹ کر گر پڑا تھا پھر اس نے اپنے آپ کو بے تحاشا بھاگتے پایا۔ اس کے پاؤں سے ایک بوٹ نکل گیا۔ اس نے دوسرا خود اتار پھینکا۔ وہ ایک بار بھی سلپ نہیں ہوا اور اس نے برف اور کنکریٹ کی ٹھنڈک کو بھی محسوس نہیں کیا۔ اس کے کانوں میں صرف اس کی ہنسی اور آواز آ رہی تھی۔

وہ دونوں سینما ہال میں بیٹھے تھے اور وہ بے حس و حرکت اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''تم مجھے یہ دکھانے کے لیے یہاں لائی تھیں؟'' اس نے شاکڈ ہو کر بے یقینی سے اس سے کہا۔

''ہاں، تمہیں اچھا لگا؟'' وہ اسی اطمینان سے پاپ کارن کھاتے ہوئے بولی۔

اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتا، اس نے اس سے ایک اور بات کہی تھی۔ وہ اگلے دو منٹ تک بے حس و حرکت اس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اسے لگا کہ وہ اسے نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

دائیں ہاتھ سے تسبیح کے دانوں کو گراتی وہ اپنی گود میں رکھے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کو ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتی رہی۔ بہت ہلکی سی اس سونے کی انگوٹھی میں ایک بہت ہی معمولی قسم کا فیروزی پتھر لگا ہوا تھا۔ اس انگوٹھی کا ڈیزائن اور اس میں نظر آنے والی خامیاں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی بہت چھوٹے جیولر کی دکان سے خریدی گئی تھی۔ کوئی بھی نفاست پسند اور حسن پرست لڑکی کسی جیولر کی دکان پر اس انگوٹھی پر دوسری نظر ڈالنا بھی پسند نہ کرتی مگر یہ صرف زینب ہی تھی جو گھنٹوں اس انگوٹھی کو اسی محبت بھرے انداز میں دیکھ سکتی تھی۔ اس پر ڈالنے والی ہر نظر اسے کسی کے ساتھ اپنے تعلق کی یاد دلاتی تھی۔ کسی کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے لے آتی تھی۔

وہ رات کے اس پچھلے پہر تہجد کے بعد صحن میں بچھے مصلے پر بیٹھی دائیں ہاتھ میں تسبیح لیے اور اس انگوٹھی پر نظریں جمائے بہت کچھ پڑھا کرتی تھی۔ وہ مصلے پر جیسے دو ہاتھوں میں دونوں دنیا ئیں لیے بیٹھی ہوئی تھی۔

رات کے اس پہر ہر طرف خاموشی تھی، اس مختصر صحن کے بیچوں بیچ مصلے پر بیٹھے اس نے تسبیح کا آخری دانہ گراتے ہوئے سجدے میں جا کر سب سے پہلے اسی کے لیے دعا کی جس کے لیے وہ ہمیشہ کرتی تھی۔

دعا کے بعد بھی وہ اگلے دس پندرہ منٹ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے دائیں گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے وہیں پر بیٹھی رہی۔ یہ بھی اس کا معمول تھا۔ وہ اس وقت وہاں بیٹھ کر فضا میں پھیلے ہوئے سکون کو جیسے اپنے اندر اتارا کرتی تھی۔ ہوا میں اب خنکی آ گئی تھی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنی سیاہ چادر کو اپنے پیروں پر پھیلا لیا۔ اس کے سرد ہوتے ہوئے پیروں کو ہلکی سی حرارت ملی۔

تب ہی اس نے گھر کے دو کمروں میں سے ایک کے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ وہ مصلے کا کونہ پلٹتے ہوئے مصلے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''موسم بدل رہا ہے زینی، اب اندر کمرے میں تہجد پڑھا کرو۔'' ضیا نے باہر نکلتے ہی اسے دیکھ کر ہلکی سی فکرمندی کے ساتھ کہا۔

''کچھ نہیں ہوتا ابو! آپ بھی تو پڑھتے ہیں۔'' اس نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''مجھے تو تیس سال سے عادت ہے بیٹا! سردی گرمی مجھ پر اثر نہیں کرتی۔''

انہوں نے اپنی بیٹی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی اولاد میں دوسرے نمبر پر تھی اور ان کے دل کے قریب ترین تھی۔

''مجھے بھی کچھ نہیں ہوتا ابو! سردی گرمی مجھ پر بھی اثر نہیں کرتی۔'' زینی باورچی خانے کا چولہا جلاتے ہوئے بولی۔ ضیا اس کی بات پر ہلکا سا ہنس کر باتھ روم کی طرف چلے گئے۔ ہر موسم میں آنے والی ذرا سی تبدیلی پر اس گھر میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ بیمار ہونے والی وہی ہوتی تھی۔

وہ جب تک باتھ روم سے باہر صحن میں لگے نلکے کے پاس آئے وہ ایک برتن میں نیم گرم پانی اور تولیہ لے کر ان کو وضو کروانے آ گئی تھی۔

ہر روز رات کے اس پہر اس گھر میں صرف وہی دونوں باپ بیٹی جاگ رہے ہوتے تھے۔ وہ تہجد کے لیے باپ سے پہلے بیدار ہوتی تھی۔ ضیا کچھ دیر سے تہجد پڑھتے اور پھر فجر تک صحن میں بیٹھے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے جبکہ وہ تہجد پڑھ کر دوبارہ جا کر سو جاتی مگر آج وہ اندر کمرے میں نہیں گئی بلکہ صحن کے تخت پر بیٹھی باپ کو تہجد کی نماز پڑھتے دیکھتی رہی۔

ضیا نے نماز کے دوران صحن میں اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا، مگر وہ ان کے عقب میں تھی انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

نماز ختم کر کے سلام پھیرتے ہی وہ ان کے پاس آ کر فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے زینی؟ آج سوئیں کیوں نہیں جا کر؟" ضیا نے قدرے تشویش سے کہا۔

"آپ شیراز کے لیے دعا کریں ابو وہ آج اسلام آباد جا رہے ہیں۔" اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"اس کے لیے دعا کروانے کی خاطر اتنی دیر سے بیٹھی ہوئی تھیں؟" ضیا بے اختیار مسکرا دیے۔

"جی۔" وہ بھی مسکرا دی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ کرم کرے گا۔" ضیا نے بڑے پیار کے ساتھ اس کا سر تھپتھپایا۔

"آپ دعا کریں گے تو اللہ زیادہ کرم کرے گا۔"

اس نے بے ساختہ کہا۔

"کیوں دعا نہیں کروں گا میں، تم جا کر سو جاؤ۔ میں خاص دعا کروں گا اس کے لیے کہ اللہ اسے انٹرویو میں کامیابی عطا فرمائے۔" انہوں نے زینی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے پاس بیٹھتی ہوں۔ آپ دعا کر لیں۔"

ضیاء نے اس بار اس سے کچھ نہیں کہا بلکہ انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ پانچ منٹ کے بعد جب انہوں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نیچے کیے تو وہ تب بھی ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

"میں نے بہت دعا کی ہے اس کے لیے بھی اور اپنی زینی کے اچھے نصیب کے لیے بھی۔" ضیا نے اپنی بیٹی کے چہرے پر پھونک مارتے ہوئے کہا۔

"ان کا نصیب اچھا ہو گا تو میرا تو خود بخود ہی اچھا ہو جائے گا۔" وہ اطمینان سے کہتے ہوئے ان کے پاس سے اٹھ گئی۔

"آپ کو قرآن پاک لا دوں؟"

"ہاں۔" وہ چند لمحوں میں قرآن پاک لا کر انہیں تھما گئی۔ ضیا قرآن پاک ہاتھ میں پکڑے اسے اندر جاتے دیکھتے رہے۔ وہ واقعی ان کی آنکھوں کا نور تھی۔ وہ جس دن زینی کو نہ دیکھتے، انہیں لگتا جیسے سورج طلوع نہیں ہوا۔ انہیں چاروں بچوں سے پیار تھا مگر زینی میں جیسے ان کی جان تھی۔ وہ دو سال کی عمر سے ان کے گھر آنے پر ان کے لیے پانی کا گلاس لا رہی تھی اور ضیا نے پچھلے اٹھارہ سال سے زینی کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ سے پانی نہیں پیا تھا۔ زینی کے علاوہ کبھی کوئی اور بیٹی یا بیوی ان کو پانی لا کر دیتی تو وہ گلاس پکڑ کر اسی طرح رکھ دیتے۔ خود زینب کو بھی باپ کے ساتھ چپکے رہنے کی عادت تھی۔ ضیا گھر میں کوئی چیز لانے پر اس کا حصہ تو اسے دیتے ہی تھے مگر اپنے حصے میں سے بھی اسے حصہ دیتے تھے۔ ان کی جیب میں ہر روز نکلنے والا کوئی سکہ بھی زینب ہی کی ملکیت بنتا تھا۔ اور یہ سکہ اس جیب خرچ کے علاوہ ہوتا تھا، جو وہ ہر روز دوسرے بچوں کی طرح اسے دیا کرتے تھے۔

آفس میں اوور ٹائم سے ملنے والی رقم بھی وہ زینی کے بڑا ہونے پر اسی کے پاس بچت کے طور پر رکھوانے لگے تھے۔ زینب نے ہمیشہ ان پیسوں کو بڑی ایمان داری کے ساتھ رکھا تھا۔ وہ باپ کی قلیل آمدنی اور اپنے حالات سے بخوبی واقف تھی۔

ضیا انکم ٹیکس میں کلرک تھے، ان کی جگہ کوئی دوسرا کلرک ہوتا تو وہ اس وقت متوسط طبقہ کے اس محلے کے اس دو کمروں پر مشتمل چار مرلے کے گھر کے بجائے کسی بہتر علاقے میں جدید سہولتوں سے آراستہ کسی بڑے گھر میں بیٹھا ہوتا مگر ضیا اپنی تنخواہ کے چند ہزار پر ہی قانع تھے اور صرف قانع نہیں تھے، وہ رزق حلال کو اپنا اعزاز سمجھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ آفس میں ان کے دوسرے ساتھی ان کے پیٹھ پیچھے اس فخر پر بے شک مذاق اڑاتے ہوں مگر ان کے سامنے کوئی انہیں رزق حرام کی ترغیب دینے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ لوگ ان سے ڈرتے نہیں تھے، ان کی عزت کرتے تھے۔

اور ان کے باقی بچوں کی طرح زینب کو بھی اس رزق حلال پر فخر تھا۔ اس نے باپ سے ''شکر'' وراثت میں پایا تھا۔ باپ ''مذہبی'' نہیں تھا ''دین دار'' تھا۔ اور زینب نے چیزوں پر ''لیکچر'' نہیں سنے تھے، اس نے ماں باپ کو ''عمل'' کرتے دیکھا تھا اور اس ''کرنے'' نے اسے اور اس کے بہن بھائیوں کو ہر چیز بہت واضح طور پر سکھا دی تھی۔

☆☆☆

اس نے کتاب بند کر کے بے اختیار جمائی لی، وال کلاک پر رات کے ڈھائی بجنے والے تھے۔ اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے اس نے کتاب میز پر رکھ دی۔ کچھ دیر بے مقصد کرسی پر بیٹھا وہ اسٹڈی ٹیبل پر جلنے والے لیمپ کے بلب کو دیکھتا رہا پھر اپنے بالوں میں بائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ مضطرب انداز میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

کچھ دیر وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چھوٹے سے اس کمرے میں ایک چارپائی پر اس کا باپ گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔ دوسری چارپائی خالی تھی۔

وہ کمرے میں ایک کونے میں رکھی الماری کے پاس گیا اور اس نے الماری کے اوپر پڑا ایک سفری بیگ اتار لیا۔ الماری کا دروازہ کھول کر اس نے اندر سے دو شرٹس اور ٹراؤزر نکال لیں۔ کچھ دیر وہ تنقیدی نظروں سے ان کپڑوں کو جانچتا رہا پھر ہلکی سی خفگی اور مایوسی کے عالم میں اس نے ان کپڑوں کو بیگ میں ڈال لیا۔

الماری کے اندر سے ایک ٹائی اور موزے نکال کر بھی اس نے اسی بیگ میں ڈال دیے۔ بیگ کی زپ کو بند کرتے ہوئے اس نے دوبارہ الماری کے اوپر رکھا اور چارپائی کے نیچے پڑا بوٹوں کا ایک جوڑا نکال کر ہاتھ میں لے لیا پھر اسٹڈی ٹیبل پر پڑا سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس اٹھائی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر صحن میں آ گیا۔

بوٹوں کو صحن میں پڑے ایک اسٹول کے سامنے رکھتے ہوئے وہ سیڑھیوں کے نیچے پڑی پالش کی ڈبیا اور برش اٹھا کر صحن کے اسٹول پر آ کر بیٹھ گیا۔ ایک سگریٹ جلا کر ہونٹوں میں دباتے ہوئے اس نے ایک جوتا اٹھا کر برش کے ساتھ کچھ پالش لگائی اور جوتے کو رگڑنے لگا۔ جوتا چند لمحوں میں چمکنے لگا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے اگلے حصے میں پڑی ہوئی بہت ساری لکیریں بھی بے حد نمایاں ہو گئی تھیں۔ اس نے چند لمحوں کے لیے

برش رکھ کر سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر دھواں باہر نکالتے ہوئے ایک اور کش لیا۔ دوبارہ سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے وہ ایک بار پھر برش اٹھا کر جوتا پالش کرنے لگا مگر جوتے پر پڑی سلوٹیں جیسے اس کے ماتھے پر جھلکنے لگی تھیں۔ جوتے کے جوڑے کو پالش کرنے کے بعد اس نے پلٹ کر ایک نظر اس کے کونے کو دیکھا، وہ آگے سے بری طرح گھس چکا تھا۔ چند بار اور پہنے جانے پر یقیناً اس میں چھید ہو جاتا۔ اس نے بے حد بے زاری اور جھنجلاہٹ کے عالم میں جوتے کو پھینکا اور دوسرا جوتا اٹھا کر اسے بھی اسی طرح پالش کرنے لگا۔ پالش کرنے کے دوران اس نے پہلے کی طرح ہی سگریٹ کا کش لیا اور اس بار سگریٹ کو فرش پر پھینکتے ہوئے پاؤں میں پہنی چپل سے اس کو مسل دیا۔

''تو اس وقت کیا کر رہا ہے شیراز؟'' اس نے اپنے عقب میں ماں کی آواز سنی۔ وہ دوسرے کمرے میں اس کی بہنوں کے ساتھ سو رہی تھیں اور یقیناً صحن میں ہونے والی کھٹر پٹر کی آوازوں کو سن کر باہر آئی تھیں۔

''اپنی قسمت پر ماتم کر رہا ہوں۔'' اس نے بے حد تلخی سے جواب دیا۔

''ہائے ہائے کیا ہو گیا ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تیری؟'' نسیم نے یک دم ہڑبڑا کر کہا۔

''ٹھیک ہے طبیعت طبیعت کو کیا ہونا ہے؟'' اس نے بے حد بے زاری سے پالش کی ڈبیا کو بند کرتے ہوئے کہا۔

''ارے تو کیوں جوتے پالش کر رہا ہے؟ مجھے کہتا بہنوں میں سے کسی کو جگا دیتا ہٹ ادھر سے، میں کرتی ہوں۔'' نسیم جلدی سے آگے آئیں۔

''کر لیے ہیں میں نے جوتے پالش۔ اب تو رکھنے والا تھا یہ برش اور پالش۔'' اس نے ماں کو روکتے ہوئے کہا۔ اور خود سیڑھیوں کے نیچے پالش اور برش رکھ آیا۔

''سوچا تھا، ابو پیسے لے آئیں گے تو ایک سوٹ اور نئے جوتے لے لوں گا لیکن ابو بھی عین وقت پر '' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور دوبارہ اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''اب کیا کرتے وہ؟ جس جس سے قرض مانگ سکتے تھے، مانگ لیا انہوں نے۔ پر جب سے معطل ہوئے ہیں، ہر ایک پیسے دینے سے کترانے لگا ہے۔'' نسیم پاس بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

''آپ نے ضیا چچا سے بات کی؟''

''ہاں، آج بھی گئے تھے ضیا کے پاس۔ پر اس کا افسر چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ اب وہ آئے تو ہی کوئی بات بنے۔ پر کہہ رہا تھا۔ بحال کروا دوں گا۔'' نسیم نے پرامید انداز میں کہا۔

''اور یہ افسر کتنے دن چھٹی پر رہے گا؟'' شیراز نے تلخی سے کہا۔

''اب افسروں کی چھٹی کا کس کو پتا ہوتا ہے۔ جب چاہے آئے، نہ چاہے تو نہ آئے۔''

''چاہے دوسرا سولی پر لٹکا رہے۔'' شیراز کے لہجے میں زہر تھا۔ ''ابو کو بھی پوری دنیا میں سب کچھ چھوڑ کر ماسٹر ریڈر ہی بننا تھا۔''

''اب اتنا پڑھ کر کیا کمشنر لگ جاتے؟'' نسیم نے شوہر کی حمایت کی۔

''کمشنر نہ لگتے، کمشنر کے دفتر میں کلرک لگ جاتے ضیا چچا کی طرح میز کرسی والی نوکری تو ہوتی۔''

''ضیا نے کلرک بن کر کون سے تیر مار لیے ہیں؟ تمہارا باپ میٹر ریڈر ضرور ہے مگر تمہارے چچا سے اچھا کھلایا پلایا ہے اس نے اپنی اولاد کو۔ ضیا نے کون سی جاگیریں بنالی ہیں کلرک بن کر؟'' نسیم نے تنقید کرتے ہوئے کہا۔

''جاگیریں کہاں سے بنا لیتے۔ اس خاندان کے سارے مرد بزدل ہیں۔ کچھوے کی طرح اپنے خول میں سکڑے سمٹے بیٹھے رہتے ہیں۔ کسی کو آگے بڑھنا ہی نہیں آتا۔ ایک سے دوسری دوسری سے تیسری نسل کلرکی اور میٹر ریڈری کر کے ختم ہو رہی ہے۔ مجال ہے کسی کے کان پر جوں تک رینگے۔ اس محلے میں پیدا ہو کر یہیں مر جائیں گے یہ سب لوگ۔''

شیراز کا انداز بے حد زہریلا تھا۔ وہ ان تمام سوچوں کو رات کے اس پہر اپنی ماں کے سامنے زبان دے رہا تھا جو چوبیس گھنٹے اس کے ذہن میں کلبلاتی رہتی تھیں اور نسیم اس کی زبان سے یہ سب کچھ سننے کی عادی تھیں۔ خاندان کی اکلوتی لائق فائق اولاد ان کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس بات پر جتنا غرور کرتیں، کم تھا۔

وہ بچپن سے سرکاری اسکول میں امتیازی پوزیشن کے ساتھ اسکالرشپ پر پڑھتا رہا تھا۔ پرائمری سے ماسٹرز تک اس نے ہر امتحان میں ٹاپ کیا تھا اور یونیورسٹی میں اکنامکس میں ماسٹرز میں ٹاپ کرنے کے باوجود شیراز اچھی طرح جانتا تھا کہ جاب مارکیٹ اس کے لیے کس قیمت کی کون سی جاب لیے بیٹھی تھی۔ یونیورسٹی میں چند ہزار کی ایک لیکچرر شپ یا کسی آفس میں اسی تنخواہ کی ایک اور میز کرسی والی نوکری جس پر صبح سے شام تک بیٹھ کر فائلوں کے انبار دیکھتے دیکھتے پہلے اس کی آنکھیں جواب دیتیں پھر ریڑھ کی ہڈی کے مہرے ناکارہ ہونے لگتے مگر اس کی مالی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ رات کے باسی سالن کا ٹفن کیریئر لنچ کے لیے لے کر جاتا اور باقی سارا دن بدمزہ سیاہ چائے کے کپ اپنے اندر انڈیل انڈیل کر اپنے اندر اٹھتی بھوک اور خواہشات کے سیلاب کے جھاگ کو بٹھاتا رہتا یا پھر اپنے پاس آنے والے کسی ملاقاتی سے چائے پانی کے نام پر کچھ پیسے لیتا اور فائل پاس ہونے کی خوشی میں کسی سے مٹھائی مانگتا۔

وہ چودہ سال کی عمر سے اپنی زندگی کے اگلے متوقع 54 سال کا ایک ایک دن دیکھتا آ رہا تھا۔ اور ہر تصور اس کے جسم میں جھرجھری اور کپکپی دوڑا دیتا۔ اسے زندگی بھیڑ کا حصہ بن کر نہیں گزارنا تھی۔ اسے سب سے آگے ہونا تھا۔ سرپٹ بھاگنا تھا اور بس بھاگتے ہی جانا تھا۔ اتنی رفتار سے کہ اسے اپنے پیچھے کسی کا سایہ تک نظر نہ آئے۔

''رات کے اس وقت کیوں آ کر بیٹھ گئے ہو یہاں؟ کل اسلام آباد جانا ہے تمہیں، سفر کرنا ہے۔'' اکبر شیراز کے کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آ گئے تھے۔

''کیا باتیں کر رہے ہو اس وقت تم دونوں؟'' وہ بھی نسیم کے پاس آ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''یہ پریشان ہو رہا ہے، پیسے نہ ملنے کی وجہ سے۔''

نسیم نے انہیں بتایا۔

"میں صبح ایک دو اور لوگوں سے بھی بات کروں گا تم فکر مت کرو۔" اکبر نے شیراز کو تسلی دی۔

"معطل نہ ہوا ہوتا میں تو دو منٹ میں لوگ پیسے دے دیتے مجھے۔"

"بس حسد کرتے ہیں، لوگ کھاتا نہیں دیکھ سکتے کسی کو۔" نسیم بے اختیار خفگی سے بڑبڑائیں۔

"میں جانتا ہوں، یہ سب میرے اپنے محکمے کے لوگوں کی سازش ہے۔ انہوں نے ہی اس آدمی کو کہہ کر میرے خلاف رشوت کی شکایت کروائی، ورنہ اس آدمی کی کہاں یہ جرأت تھی کہ ایسا کچھ کرتا۔" اکبر اب جیسے اپنی صفائی دے رہے تھے۔

"کون نہیں لیتا رشوت آج کے زمانے میں۔ باقی میٹر ریڈر کیا دودھ کے دھلے ہوئے ہیں۔ محکمہ والوں کو وہ نظر کیوں نہیں آتے۔ ہر بار آپ کو ہی معطل کر دیتے ہیں۔" نسیم جیسے بلبلائیں۔

"میں کمزور ہوں نا۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں، اس لیے۔" اکبر نے تلخی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، بس اب بیٹا افسر بننے والا ہے۔ ایک بار میرا بیٹا افسر بن جائے پھر میں دیکھوں گا، کون میرے بارے میں زبان کھولتا ہے۔" اکبر نے یک دم شیراز کو دیکھ کر بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

"میں افسر بن کر سب سے پہلے تو آپ سے یہ جاب چھڑاؤں گا۔ بہتیری ذلت کمائی آپ نے اس کام میں۔ چار پیسوں کے لیے مارے مارے گھر گھر پھرنا۔" شیراز نے بے حد بیزاری سے کہا۔

"ارے تم کیا چھڑاؤ گے، مجھے خود یہ کام نہیں کرنا۔ میں کوئی پاگل ہوں کہ خواہ مخواہ ذلیل ہوتا پھروں۔ پھر تو افسر کا باپ ہوں گا۔ آرام سے گھر بیٹھ کر راج کروں گا۔"

اکبر نے بے حد سرخوشی کے عالم میں کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے۔ شیراز اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں سونے جا رہا ہوں۔ صبح جلدی اٹھنا ہے مجھے۔"

"ہاں ہاں، بیٹا! تو جا ..... جا کر سو ..... میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی۔" نسیم نے بے اختیار کہا۔

"تم نے زینب سے پیسوں کی بات کی؟"

شیراز نے اکبر کی بات پر یک دم پلٹ کر انہیں دیکھا۔

☆☆☆

"تمہیں کالج نہیں جانا کیا؟" ربیعہ نے اسے کچن میں مصروف دیکھ کر کہا وہ کالج یونیفارم میں ملبوس تھی۔

"نہیں۔" زینب نے بڑے اطمینان سے ضیاء کے لیے ٹفن تیار کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" ربیعہ کچھ حیران ہوئی۔

"خالہ کے پاس جانا ہے مجھے۔" زینب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شیراز بھائی سے ملنے؟" ربیعہ نے فوراً اندازہ لگایا۔ "وہ تو کہیں سہ پہر کو اسلام آباد جائیں گے، تم کالج سے آ کر ملنے چلی جاتیں۔ کالج سے چھٹی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ربیعہ کو اعتراض ہوا، وہ خود آج کسی ٹیسٹ کی تیاری کے لیے گھر پر تھی۔

"بس ایسے ہی۔ مجھے کچھ اور بھی کام تھا۔" زینب نے گول موں انداز میں بات کی اور ٹفن اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ "ابو کو دے آؤں۔ تم ناشتہ کرلو تب تک۔ میں نے چپاتیاں بنادی ہیں۔"

زینب نے اس سے کہا اور اس چھوٹے سے کچن سے باہر نکل گئی۔

"شیراز کتنے بجے جا رہا ہے؟" ضیا نے زینب سے ٹفن لیتے ہوئے کہا۔

"سہ پہر میں۔" زینب نے بتایا۔

"میں پھر اکبر بھائی کی طرف سے ہوتا ہوا جاؤں گا۔" ضیا نے اپنی سائیکل دروازے سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"اتنی صبح انہیں جگادیں گے ابو! آپ کو پتا ہے، وہ ساری رات بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔" زینب نے بے حد تشویش سے کہا۔

"نہیں، اسے جگاؤں گا نہیں۔ اگر اٹھا ہوا تو خدا حافظ کہہ دوں گا اسے، ورنہ اکبر بھائی اور بھابھی سے مل کر چلا جاؤں گا۔"

ضیا نے جیسے اسے تسلی دی۔ وہ اس کی ہر چیز کا کتنا خیال رکھتی تھی، وہ جانتے تھے۔

وہ میٹرک میں تھی جب شیراز کے ساتھ اس کی نسبت طے ہوئی تھی اور اس نسبت میں دونوں خاندانوں کے ساتھ ساتھ شیراز کی پسند کا بہت زیادہ دخل تھا۔ زینب کو شیراز میں دلچسپی اس نسبت کے طے ہونے کے بعد ہوئی تھی۔ وہ اس کا خالہ زاد اور تایا زاد تھا۔ دونوں کے گھر ایک ہی گلی میں تھے اور چوبیس گھنٹوں میں کئی بار وہ ایک دوسرے کے گھر جاتے۔ وہ خاندان کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی اور شیراز خاندان کا سب سے ذہین لڑکا۔

ایم اے اکنامکس میں یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے کے بعد اس نے ابھی حال ہی میں سی ایس ایس کا تحریری امتحان کوالیفائی کیا تھا اور اب انٹرویو کے لیے اسلام آباد جا رہا تھا۔

اس امتحان سے پہلے تک ہر ایک کو شیراز کی قسمت پر رشک آتا تھا جسے اچھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع بھی مل رہا تھا اور خاندان کی سب سے خوبصورت لڑکی بھی اس کی بیوی بننے والی تھی لیکن اس امتحان میں کامیابی نے یک دم ہر ایک کو زینب کی قسمت پر رشک کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مستقبل میں "افسر" بننے والے خاندان کے پہلے مرد کی بیوی بننے جا رہی تھی۔ اس کا مستقبل اس محلے سے باہر کسی بہت اونچی، بہت اچھی، بہت بہتر جگہ پر نظر آ رہا تھا اور جس مرد کا ساتھ اس کو ملنے والا تھا، وہ اس پر جان چھڑکتا تھا۔ زینب کے علاوہ وہ شیراز کو کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس سے بدتر حال زینب کا تھا۔ اور یہ سب کچھ محلے اور خاندان میں کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

وہ صحن کا دروازہ بند کر کے واپس باورچی خانہ میں آ گئی۔ ربیعہ ابھی وہاں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ زینب نے توا چولہے پر رکھتے ہوئے رات

کا پکا ہوا قیمہ نکال لیا اور پراٹھے بنانے لگی۔ ربیعہ نے اس کی ساری سرگرمیوں کو دیکھا پھر کہا۔

"شیراز بھائی کے لیے بنا رہی ہو؟"

"جب تمہیں پتا ہے تو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" زینب نے بڑے انہماک سے پراٹھا بناتے ہوئے اسے دیکھے بغیر کہا۔

ان کے گھر میں مہینے میں ایک بار قیمہ پکتا تھا اور زینب اپنے حصے کا قیمہ نکال کر رکھ دیتی پھر وہ اگلی صبح شیراز کے لیے قیمے والا ایک پراٹھا بنا کر اسے دے آتی۔ یہ روٹین اتنے عرصے سے جاری تھی کہ ربیعہ کو ٹھیک سے یاد بھی نہیں تھا۔ ہاں، اسے یہ ضرور احساس تھا کہ وہ عید قربان کے سوا پورا سال قیمے کے ذائقے سے ناآشنا ہی رہتی تھی۔ ربیعہ اس کی اس روٹین کو نہیں بدل سکی تھی۔ یہ وہ جانتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے حصے کے سالن کو ہمیشہ بانٹنے کی کوشش کی مگر زینب اس پر بھی تیار نہیں تھی۔

"میں اپنا حصہ لے چکی، تمہارا حصہ کیوں لوں؟"

"کیا فرق پڑتا ہے؟ تم بہن ہو میری۔" ربیعہ اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی۔ "اپنا حصہ منگیتر کو کھلا آتی ہو تو کوئی ہرج نہیں، اگر میرے حصے میں سے کچھ لے لو۔ تمہارا بھی تو دل چاہتا ہو گا تم بھی یہ خود کھاؤ۔"

"جب شیراز ہر بار میرے حصے کی کوئی چیز کھاتے ہیں تو مجھے بغیر کھائے بھی اس چیز کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ اور اس ذائقے سے زیادہ اچھا ہوتا ہے جو میں اسے خود کھا کر محسوس کرتی، مجھے تو کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ میں یہ پراٹھا ان کو کھلا آتی ہوں، خود نہیں کھاتی۔" اس کے پاس سیدھا جواب ہوتا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے، عمران کویت میں بیٹھا ہوا ہے، ورنہ تمہاری حرکتیں دیکھ کر اگر وہ بھی مجھ سے فرمائش شروع کر دیتا کہ میں بھی اسے اس طرح اپنے حصے کے قیمے والے پراٹھے بنا بنا کر کھلاؤں تو میں کیا کرتی۔ میں تو تمہاری طرح قیمہ کھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

ربیعہ مذاق اڑانے والے انداز میں اپنے ہونے والے منگیتر کا حوالہ دے کر کہتی۔ اس کی بات بھی اپنے خالہ زاد کے ساتھ طے تھی لیکن زینب کے برعکس وہ اس طرح عمران پر فدا نہیں تھی۔ نہ ہی زینب کی طرح عمران کا نام ہر وقت اس کی زبان پر ہوتا تھا۔ وہ فطرتاً لاپروا تھی۔ زینب فطرتاً بے حد حساس۔

"میری سمجھ میں تو ایک بات نہیں آتی۔ شیراز بھائی نے کبھی یہ نہیں کیا کہ پراٹھے کے دو حصے کر کے آدھا تمہیں دے دیں۔ سارا خود کھا جاتے ہیں۔"

ربیعہ قدرے مذاق اڑانے والے انداز میں بولی۔

"ہمیشہ وہ مجھے کھانے کا کہتے ہیں، میں خود نہیں کھاتی۔ ایک چھوٹا سا تو پراٹھا ہوتا ہے۔ میں بھی کھانے بیٹھ جاؤں گی تو وہ کیا کھائیں گے۔" زینب نے بے حد اطمینان سے کہا۔

"اور پھر تمہیں کیا تکلیف ہے؟ تم خواہ مخواہ "

ربیعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں یاد ہے جب شیراز بھائی چھوٹے ہوتے تھے، تب بھی تمہاری چیزیں لے کر کھا جایا کرتے تھے۔"

"میں خود دیتی تھی انہیں۔" زینب نے اور برا مانا۔

"ان کے مانگنے پر۔" ربیعہ کو اسے تنگ کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔

"جی نہیں، مانگنے سے بھی پہلے۔" زینب نے بے ساختہ کہا۔

"اسی وجہ سے تو عادتیں بگڑ گئی ہیں ان کی۔" ربیعہ نے اسے مزید چھیڑا۔

"تم اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرو اور فضول باتیں مت کرو۔"

زینب نے پراٹھا توے سے اتارتے ہوئے اس بار قدرے زیادہ ناراضی سے کہا۔ وہ اب تہہ نکال رہی تھی۔

"تم خود تو کم از کم ناشتہ کر کے جاؤ۔" ربیعہ کو یک دم خیال آیا۔

"نہیں میں آ کر کروں گی۔ آج تو گھر پر ہی ہوں۔"

"اور آؤ گی کب؟"

"میں ابھی آ جاتی ہوں۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی مجھے۔"

"شیراز بھائی جانے سے پہلے یہاں سے ہو کر جائیں گے نا؟" ربیعہ نے باورچی خانہ سے باہر اس کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں، پوچھوں گی۔ امی تو گھر پر ہیں نہیں۔ وہ ہوتیں تو پھر ضرور آتے۔"

"خیر، آتے تو وہ صرف تمہارے لیے ہیں یہاں، ورنہ چچا، خالہ یا ان کے دوسرے بچوں میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

ربیعہ کی بات پر اس نے یکدم پلٹ کر اس کو گھورا۔

"اچھا... اچھا... یہ بس آخری بات تھی۔" ربیعہ نے جلدی سے کہا۔

"سلمان کو ناشتہ دے دینا۔" زینب کو یکدم کالج کے لیے تیار ہوتے ہوئے سلمان کا خیال آیا۔

"شکر ہے، لوگوں کو 'بھائی' کا بھی خیال آیا۔"

ربیعہ نے مدھم آواز میں کہا۔ زینی نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔ وہ صحن کا دروازہ پار کر گئی تھی۔

☆☆☆

"لمبی عمر ہے زینی کی ماشاء اللہ۔ ابھی نام لے رہے تھے تمہارا اور تم آ گئیں۔"

نسیم نے زینی کو بیرونی دروازے سے اندر صحن میں آتے دیکھتے ہی بے ساختہ کہا۔ وہ صحن میں ہی بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ دروازہ نزہت نے کھولا تھا۔

"میرا نام کیسے لے لیا خالہ آپ نے؟" زینی نے بے اختیار مسکرا کر کہا۔

"ارے تمہارا نام تو دن رات لیا جاتا ہے اس گھر میں۔ میری اکلوتی بہو کا نام نہیں لیا جائے گا تو اور کس کا لیا جائے گا۔" نسیم نے بے حد پیار سے اپنی بھانجی کے مسکراتے ہوئے چہرے کی دل ہی دل میں بلائیں لیں۔

"ہاں بھئی، امی کو تو بس اکلوتا بیٹا اور اکلوتی بہو ہی یاد رہتی ہے۔ ہمارا تو کسی گنتی میں شمار نہیں ہے۔"

شیراز کی چھوٹی بہن نزہت نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔ وہ اور زینب تقریباً ہم عمر تھیں، اس لیے شیراز کی باقی دونوں بہنوں کی نسبت ان دونوں کے درمیان آپس میں زیادہ بے تکلفی تھی۔

"ہاں بھئی ایسا تو ہے۔ خالہ کو ذکر تو بس ہمارا ہی کرنا چاہیے۔ آخر ہم ہی نے تو رہنا ہے خالہ کے پاس۔ تم سب نے تو چلے جانا ہے یہاں سے۔"

زینی نے بھی اسی انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک ٹرے ہاتھ میں لیے نل کے پاس بیٹھی کپڑے دھوتی نسیم کے پاس کھڑی تھی۔

"اتنا نہیں ہوتا کہ ایک بار اس کو بیٹھنے کا کہہ دے۔ وہ بے چاری برتن اٹھائے کھڑی ہے۔ نہ برتن ہاتھ سے لے رہی ہے، نہ اس کو بیٹھنے کا کہہ رہی ہے۔ مجال ہے تجھے کبھی عقل آ جائے۔" نسیم نے کچھ ناراض ہوتے ہوئے بیٹی سے کہا۔

"نہیں نہیں خالہ! میں خود باورچی خانے میں رکھ آتی ہوں۔ سامنے آپ نظر آئیں تو آپ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس میں نزہت کا کیا قصور۔" زینی نے جلدی سے کہا۔

"کیا لے کر آئی ہو؟" نزہت نے پوچھا۔

"شیراز کے لیے ناشتہ لے کر آئی ہوں۔"

"پھر تو اندر کمرے میں ہی لے جا بیٹا! بس نزہت بنانے ہی والی تھی اس کا ناشتہ۔" نسیم نے کہا۔

"وہ جاگے ہوئے ہیں؟" زینی چونکی۔

"ہاں... ہاں... تیاری کر رہا ہے جانے کی۔ ابھی غسل بھی کر گیا ہے اس سے۔"

"اچھا پھر میں دے ہی جاتی ہوں۔ قیمے کا پراٹھا ہے۔ ابھی گرم ہی ہے بہتر ہے فوراً کھا لیں۔" زینی نے اندر کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

شیراز اپنے بیگ میں کچھ کتابیں رکھ رہا تھا اور وہ پہلے ہی باہر صحن میں زینی کی آواز سن چکا تھا۔

"تو زینب بی بی کو ہمارا خیال آ گیا۔" اس نے زینب کے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ زینی مسکرا دی۔ وہ یہ جملہ سننے کی عادی تھی۔

"سلام نہیں کیا، حال نہیں پوچھا۔ سیدھا گلہ۔"

اس نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ شیراز جواب سننے کا عادی تھا۔ وہ مسکرا کر بیگ رکھتے ہوئے کرسی کھینچ کر اس تپائی کے سامنے بیٹھ گیا۔

"چلو قسمت میں اور کچھ نہ سہی، زینی کے ہاتھ کا پراٹھا تو ہے ہی۔" اس نے لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"کب جا رہے ہیں؟" زینی نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں پتا تو ہے۔" شیراز نے اسے دیکھا۔

"ہاں ... اور کب واپس آئیں گے؟"

"وہ بھی تمہیں پتا ہے زینی۔" شیراز نے لاپروائی سے کہا۔ "آج دس گا دو دن میں۔"

اس نے اگلا لقمہ توڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر ٹھٹک گیا۔ زینی نے اپنی قمیص کی آستین کلائی سے کچھ اوپر کرتے ہوئے بائیں ہاتھ میں پہنی ہوئی سونے کی دو چوڑیاں اتار کر اس کے سامنے تپائی پر رکھ دی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟" شیراز نے بے حد ہکا بکا ہو کر اس سے پوچھا۔

"یہ سونے کی چوڑیاں ہیں۔ میں نے شادی کے لیے بنوائی تھیں ٹیوشن کے پیسوں سے۔ آپ کو دس ہزار روپوں کی ضرورت تھی۔ اتنے تو مل ہی جائیں گے۔" اس نے سادہ لہجہ میں کہا۔

شیراز نے ابھی کل ہی اس سے کچھ رقم مانگی تھی مگر زینی کے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی شیراز اکثر اس سے رقم لیتا رہتا۔ کبھی وہ اسے لوٹا دیتا اور کبھی زینی اس سے واپس نہیں لیتی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ شیراز کو دس ہزار روپے کی ضرورت پڑی تھی۔ وہ اسے چند دن دیتا تو شاید وہ اسے کہیں نہ کہیں سے رقم مہیا کر دیتی۔ مگر ایک ہی دن میں دس ہزار ... اور اس پر شیراز کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ ضیا سے یا گھر میں کسی دوسرے سے اس کا ذکر نہ کرے۔

"مگر شیراز! میرے پاس تو اتنے روپے نہیں ہیں۔ ابو کے کچھ روپے پڑے تھے مگر چند دن پہلے ہی انہوں نے مجھ سے لے کر اپنے کسی دوست کو قرض کے طور پر دیے ہیں۔ میرے پاس پندرہ سو روپے ہیں۔ وہ آپ لے لیں۔" زینی نے بے حد پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں، پندرہ سو سے میرا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس ماہ ٹیوشنز نہیں کیں میں نے۔ انٹرویو کی تیاری کرتا رہا۔ اوپر سے ابو بھی معطل ہو گئے۔ پچھلے ماہ کے بلز ابھی تک ادا نہیں کیے۔ اس ماہ بھی نہیں ہوں گے تو بجلی اور سوئی گیس دونوں کٹ جائیں گے۔ میں چاہتا تھا ایک سوٹ اور جوتا لے لوں انٹرویو کے لیے پھر اسلام آباد آنے جانے اور وہاں رہنے کے لیے پیسے چاہئیں۔"

وہ بے حد پریشان نظر آ رہا تھا اور زینی اس کو پریشان دیکھ کر اس سے زیادہ پریشان تھی۔

"میں ابو سے کہتی ہوں، وہ کچھ انتظام کر دیتے ہیں۔"

"نہیں، چچا سے مت کہنا۔" شیراز نے بے اختیار اسے ٹوکا۔ "میں کہیں اور سے دیکھتا ہوں۔"

اس نے اس سے کہہ کر بات بدل دی تھی مگر زینی اس کی پریشانی کو ذہن سے نہیں نکال سکی۔ رات کو اسے ان چوڑیوں کا خیال آیا تھا اور یک دم جیسے سارا بوجھ اس کے کندھوں سے اتر گیا تھا۔ وہ چوڑیاں بنوانے کے لیے پچھلے دو سال سے ٹیوشنز کے پیسوں کو بچا رہی تھی اور اب دوسرے دن وہ انہیں لے کر اس کے پاس موجود تھی۔

"آپ انہیں بیچ دیں۔" وہ رسانیت سے کہہ رہی تھی۔

''نہیں زینی! میں یہ نہیں کر سکتا۔'' شیراز نے بے ساختہ کہا۔ ''یہ تمہاری ہیں۔''

''آپ کے اور میرے بیچ تمہارا اور میرا کب سے ہونے لگا؟'' زینی نے بے حد برا مان کر کہا۔

''نہیں زینی! میں...'' زینی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ نہیں لیں گے تو بھی میں ادھر ہی چھوڑ کر جاؤں گی زینب کی جو شے آپ کے کام نہ آئے، وہ زینب کے کس کام کی۔''

شیراز چند لمحے بول نہیں سکا۔

''اور یہ بھی رکھ لیں، پندرہ سو روپے ہیں۔'' اس نے اپنی مٹھی میں بھینچے پانچ سو کے تین بالکل مڑے تڑے نوٹوں کو تپائی پر چوڑیوں کے پاس رکھ دیا۔

''ناشتہ کریں۔ یہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' زینی کو یک دم فکر ہوئی۔

مگر شیراز مسلسل چوڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کسی نے یک دم جیسے اس کے سر کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ ایک نیا جوڑا، ایک نئی ٹائی، ایک نیا جوتا، بجلی کے بلوں کی ادائیگی، گھر میں آنے والا کچھ راشن، اسلام آباد کا کرایہ، رہائش، کھانا، پینا۔ وہ چوڑیاں سب کچھ تھیں۔ وہ واقعی زینب کا بے حد مشکور تھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' زینی نے اسے چونکایا۔

''تم یاد رکھنا زینی! میں تمہارے اس احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں گا۔'' شیراز نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''احسانوں کے بدلے تب چکائے جاتے ہیں، جب تعلق توڑنا ہو۔ جہاں محبت ہو، وہاں احسان کیا جاتا ہے اور احسان رکھا جاتا ہے۔'' زینی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''میں جب سول سروس جوائن کر لوں گا تو اپنی پہلی تنخواہ سے تمہیں چوڑیاں بنا کر دوں گا۔ ساتھ کچھ قرض لوں گا اور دو نہیں چھ چوڑیاں بنا کر دوں گا۔'' اس نے بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

''میرے لیے آپ کا ساتھ کافی ہے۔ زیور کی کوئی بات نہیں۔ محبت باقی رہنی چاہیے۔'' زینی نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

''زیور بھی ضروری ہوتا ہے۔'' شیراز نے اپنی بات پر زور دیا۔

''زینب ضیا کے لیے نہیں۔'' زینی نے بے ساختہ کہا۔

''ہاں، زینب خود ہر زیور سے قیمتی ہے۔'' شیراز نے بے اختیار کہا۔

وہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی۔ ''چائے لاتی ہوں آپ کے لیے اور آپ باتیں بند کر کے ناشتہ کریں۔''

زینی نے ایک بار پھر اس کی توجہ ناشتے کی طرف مبذول کروانے کی کوشش کی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ شیراز نے چوڑیاں اٹھا کر دیکھیں، وہ بے حد ہلکی تھیں مگر اس کو یقین تھا، وہ اس کے اس ماہ کے تمام مسائل کا حل نکال سکتی تھیں۔ اسے زینی پر بے اختیار پیار آیا۔ وہ واقعی بہت خوش قسمت تھا۔ اس نے بے حد پر سکون انداز میں پراٹھے کی طرف ہاتھ بڑھایا، تب ہی اسے یاد آیا، وہ ہمیشہ کی طرح زینی کو کھانے کی دعوت دینا بھول گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ

اس کے لیے کچھ پراٹھا چھوڑ دے گا مگر پراٹھا اتنا لذیذ تھا کہ وہ ہاتھ نہیں روک سکا۔ جب تک وہ واپس آئی، وہ پراٹھا ختم کرچکا تھا۔ زینی نے خالی پلیٹ کو بے حد خوشی سے دیکھتے ہوئے پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔

☆☆☆

وہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے پینل کے سامنے پچھلے بیس منٹ سے موجود تھا۔ بورڈ کے ممبرز نے اس سے ہر موضوع پر سوال کیے تھے۔ اس کے سبجیکٹ سے لے کر کرنٹ افیئر زتک، جیوگرافی سے ہسٹری تک، اسپورٹس سے اس دن کی مین ہیڈ لائنز تک۔

وہ مشینی انداز میں جواب دے رہا تھا۔ پراعتماد انداز میں بے حد روانی سے۔ بغیر کسی جھجک اور پریشانی کے۔ وہ ان کی باڈی لینگوئج اور چہرے کے تاثرات سے بتا سکتا تھا کہ وہ اس سے متاثر ہو رہے تھے اور یہ احساس اس کے اعتماد کو اور بڑھا رہا تھا۔ وہ اندر جاتے ہوئے جتنا ٹینس تھا، بیس منٹ گزرنے اور اپنی اس طرح کی پرفارمنس کے بعد بے حد مطمئن ہو گیا تھا۔

مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہاں پر اس سے کوئی ایسا سوال پوچھا جائے گا جس پر وہ اٹک جائے اور وہ سوال پوچھ لیا گیا تھا۔ اور اب وہ چند لمحوں کے لیے گنگ چیئرمین کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جس پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ تھی اور ایسی ہی مسکراہٹ بورڈ کے دوسرے ممبرز کے چہروں پر تھی۔

"کیوں، مشکل سوال ہے؟" چیئرمین نے اس کی فائل بند کرتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔ یہ انٹرویو کے اختتام کا اشارہ تھا۔

شیراز نے مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ اب انٹرویو کے اختتامی چند منٹوں میں اس سے کچھ غیر رسمی قسم کی گفتگو کرنے لگے تھے۔ اس کے ایک دو جوابات پر چیئرمین نے چند ریمارکس دیے اور ان ریمارکس پر کمرے میں کچھ قہقہوں کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔ ماحول اچانک بے حد بے تکلف اور خوشگوار ہو گیا تھا اور اسی ماحول میں بورڈ کے ایک ممبر نے اس سے پوچھا۔

"What is your most valuable asset in life?" (تمہاری زندگی کا اثاثہ کیا ہے؟)

شیراز نے بے ساختگی سے جواب دیا۔

"My intelligence" (میری ذہانت)

"No 2?" (دوسرے نمبر پر؟) اسی ممبر نے دوبارہ پوچھا تھا۔

شیراز نے اسی روانی سے کہا۔

"My academic record" (میرا تعلیمی ریکارڈ)

"No 3?" (نمبر تین) اسی ممبر نے ایک بار پھر پوچھا۔

شیراز کے پاس جوابات کی کمی نہیں تھی۔

"My ambition" (میرا مقصد)

"No 4?" (نمبر چار) بورڈ کا وہ ممبر جیسے اب اسے زچ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"My passion for my ambition"(اپنے مقصد کے لیے میرا تحمل)

"No 5?"(نمبر پانچ)

اس بار پوچھنے والا دوسرا ممبر تھا۔ بورڈ کے سب ممبرز اب اس کے ساتھ جیسے کوئی کھیل کھیلنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

شیراز کے انداز میں تبدیلی نہیں آئی۔

"My practicality"

"آپ نے اپنے اثاثوں میں محبت یا اپنی فیملی کا ذکر نہیں کیا؟"

اس بار بورڈ کے چیئر مین نے جیسے اسے کچھ جتانے والے انداز میں کہا۔

شیراز نے بے ساختہ کہا۔

"Comes at No.6"(وہ نمبر چھ پر آتا ہے)

چیئر مین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"Which one? love or family"(کون سی چیز، محبت یا فیملی؟)

شیراز نے جواب دیا۔

"Both" دونوں۔

"Ary you engaged?"

شیراز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"Yes sir I am engaged"(جی سر! میری منگنی ہو چکی ہے۔)

(کسی لو افیئر کے نتیجے میں؟)As a result of some love affair?

چیئر مین کا انداز برقرار تھا۔

(جی، وہ میری کزن ہے)Kind of. She is my cousine.

"Why do you love her?"(تم اس کو کیوں چاہتے ہو؟)

شیراز نے بے ساختہ کہا۔

"She is very pretty."(وہ بہت خوبصورت ہے)

"So is that the only reason?"(صرف اس وجہ سے؟) چیئر مین نے پوچھا۔

اس بار شیراز پہلی بار الجھا۔ سوالات اتنے سیدھے اور سادہ نہیں تھے جتنے وہ سمجھ رہا تھا، وہ اب اس سے کچھ اور اگلوانے کے موڈ میں تھے۔

"No, there are many others" (نہیں کچھ اور بھی وجوہات ہیں۔)

چیئر مین نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "Like?" (مثلاً)

"She is caring, loving, honest, loyal, sincere and selfless." شیراز نے بے حد نپے تلے انداز میں زینی کی خوبیاں گنوائیں۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جو صرف وہ نہیں، زینی کو جاننے والا کوئی بھی شخص گنوا دیتا۔ اس کے جواب نے چیئر مین کی مسکراہٹ کو کچھ اور عجیب کر دیا تھا۔ شیراز اب اس سے اگلے سوال کی توقع کر رہا تھا اور اس نے بالآخر وہ سوال کر دیا تھا جس نے چند لمحوں کے لیے شیراز کو گنگ کر دیا تھا۔

What will you prefer? A beautiful woman with all these qualities or a beautiful woma

with loads of cash?

(اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری ترجیح کیا ہوگی ایک خوبصورت عورت ان تمام خوبیوں کے ساتھ یا ایک خوبصورت عورت کروڑوں کیش کے ساتھ۔)

پورے انٹرویو میں اس نے پہلی بار توقف کیا تھا۔ پھر اس نے اپنے سامنے پڑا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر پانی کا گھونٹ لیا۔ چیئر مین اور ممبرز کے درمیان نظروں اور مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔

اس وقت پہلی بار شیراز کو احساس ہوا کہ وہ ان فارمل گفتگو کے دوران بہت بری طرح جا پھنسا ہے۔ وہ اس کے لیے ان فارمل گفتگو تھی وہ میز کے دوسری جانب بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے ان فارمل نہیں تھی۔ وہ پہلے سوال کے جواب سے پھنسا تھا۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں جواب اسے اور پھنساتے گئے تھے۔ وہ اس کا لاشعور تھا جو اس وقت بول رہا تھا مگر اب وہ مکمل طور پر ہوشیار ہو چکا تھا۔

محبت یا خاندان کو چھٹے نمبر پر رکھ کر اور ذہانت، تعلیمی ریکارڈ، Ambition, passion اور Practicality کو سرفہرست رکھنے کے بعد وہ جانتا تھا کہ وہ کسی عورت کا انتخاب کرے گا تو وہ اس کی جان ان سوالوں سے چھوٹ جائے گی۔ وہ بالآخر جواب دینے کے تیار ہو گیا تھا۔ وہ اس جواب کو اس وقت نپا تلا سمجھ رہا تھا مگر کمرے سے نکلتے ہوئے ایک بار پھر اپنے دل میں وہ سوال دہراتے ہوئے اسے یک دم احساس ہوا وہ وہی جواب تھا جو چیئر مین کے سوال پوچھنے پر بے اختیار اس کے ذہن میں آیا تھا، وہ عورت اس کا لاشعوری انتخاب بھی تھی۔

"مسٹر شیراز اکبر! آپ انتخاب میں جتنی دیر لگا رہے ہیں۔ اتنی دیر میں تو دونوں عورتیں چلی جائیں گی۔"

بورڈ کے ایک ممبر نے ہلکی سی خوش مزاجی کے ساتھ کہا، چیئر مین اور دوسرے ممبرز ہلکا سا ہنسے۔ شیراز مسکرایا۔ پھر اس نے بے حد اعتماد سے کہا۔

"ہاں۔ مگر ایک عورت کے ساتھ میں بھی ہوں گا۔"

"اور وہ کون سی عورت ہوگی؟"

چیئر مین نے بے حد دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھا۔ وہ تحریری امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد انٹرویو سے گزرنے والا آخری امیدوار تھا۔ اور شیراز کے علاوہ وہاں بیٹھا ہر شخص جانتا تھا کہ وہ پہلی دو پوزیشنز میں سے کسی ایک پوزیشن کے لیے مضبوط ترین دو امیدواروں میں سے ایک

تھا۔ مقابلے کے اس امتحان کے نتیجے میں چیئرمین کا ہر سال شیراز اکبر کے Caliber (معیار) کے کسی نہ کسی سیلف میڈ نوجوان سے سامنا ضرور ہوتا تھا۔ مگر پچھلے چار سالوں میں کبھی ایک بار بھی اس کے طبقے سے تعلق رکھنے والا کوئی لڑکا سی ایس ایس کے امتحان میں ٹاپ نہیں کر سکا تھا۔ اس کے باوجود کہ پہلی دو پوزیشنز کے درمیان چند مارکس سے زیادہ کا فرق نہیں ہوتا تھا۔ اور ان چند مارکس کا فرق ہمیشہ چیئرمین کی وجہ سے ہی پیدا ہوا تھا۔

ہر بار شیراز جیسا کوئی نوجوان کسی ایک آدھ جواب کی وجہ سے مار کھا تا تھا۔ اس بار شیراز اس پوزیشن میں تھا اور چیئرمین کی خواہش تھی کہ اس بار دوسری پوزیشن پر آنے کی روایت ٹوٹ جائے۔ اور اسے یقین تھا وہ روایت ٹوٹ جائے گی۔ وہ اس کا فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین کے طور پر آخری سال تھا اور شیراز ان پچھلے چاروں سالوں کے امیدواروں سے زیادہ مضبوط پوزیشن میں سامنے آیا تھا۔ چیئرمین کو یقین تھا اس بار روایت ٹوٹ جائے گی۔

"تو مسٹر شیراز اکبر! کون سی عورت ہو گی وہ؟"

چیئرمین نے بالآخر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

☆☆☆

زینب کی آنکھیں بے اختیار چمکنے لگی تھیں۔ رشک، فخر، غرور، محبت، مان کیا نہیں تھا اس چمک میں۔

وہ اس وقت شیراز کے سامنے اس کے گھر میں بیٹھی تھی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اسلام آباد سے آیا تھا اور زینب جیسے اڑتی ہوئی اس کے پاس گئی تھی وہ چائے پیتے ہوئے اسے انٹرویو کی روداد سنا رہا تھا۔ اور اس آخری سوال کی۔

"پھر کچھ اور پوچھا انہوں نے؟" زینب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں..... کیسے پوچھتے؟ میرا جواب بالکل ٹھیک تھا۔"

شیراز نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ زینب اس کی بات پر مسکرائی اسے فخر تھا کہ وہ اس کا تھا۔ اور یہ فخر خواہ مخواہ تو نہیں تھا۔

"بس تم اب دعا کرنا کہ بہت اچھی پوزیشن آئے میری۔ مجھے تمہاری دعا پر بڑا یقین ہے۔" شیراز نے اس سے کہا۔

"بہت اچھی کیوں؟ میں تو دعا کروں گی، آپ کی پہلی پوزیشن آئے۔ باقی سب بہت پیچھے ہوں آپ سے۔"

زینب نے بے حد محبت سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

شیراز بے اختیار ہنسا۔ "چلو ٹھیک ہے، یہ دعا ہی کر لینا۔ پر ٹاپ کرنا آسان نہیں ہوتا زینی۔ وہاں سب بڑے قابل ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہوں گے پر مجھے کسی سے کیا۔ مجھے کون سا فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین سے کچھ لینا ہے۔ مجھے تو اللہ سے دعا کرنی ہے۔" زینی نے سامنے پڑی تپائی پر رکھے برتن سمیٹنے شروع کر دیے۔

"ہر چیز دعاؤں سے نہیں ہوتی زینی!" شیراز یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"میرے لیے تو ہو جاتی ہے۔" زینب نے بے حد سادہ لہجے میں کہا۔ "نہ بھی ہو مجھے تو عادت ہے دعا کرنے کی۔ میں یہ عادت نہیں چھوڑ سکتی۔"

"کون کہہ رہا ہے عادت چھوڑنے کو۔ میں تو تمہیں ویسے ہی بتا رہا ہوں۔"

"آپ بھی نماز پڑھا کریں۔" زینب نے ہمیشہ کی طرح تاکید کی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے، تم ہو نا میری جگہ نمازیں پڑھنے کے لیے۔" شیراز نے لاپروائی سے کہا۔ وہ اس کی اس بات کو اسی طرح مذاق میں اڑایا کرتا تھا۔

"نماز دعا کے لیے پڑھتے ہیں اور جب میرے لیے دعا کرنے والی ہے تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے نماز پڑھنے کی۔" شیراز کی یہ منطق اس نے بہت بار سنی تھی۔

"ہاں۔ میں تو کرتی ہوں۔ آپ کے لیے دعا۔ لیکن کبھی آپ خود بھی تو نماز پڑھ کر دعا کیا کریں۔"

"اب یا تو میں اپنے گھر کے مسئلے حل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کروں یا پھر پانچ وقت کی نماز پڑھ لوں۔ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ نہیں کر سکتا میں۔"

"آپ کو پتا ہے نماز فرض ہے۔ اور جو نہ پڑھے بہت گناہ ہوتا ہے اسے۔" یہ زینب کی سب سے بڑی دھمکی تھی۔

"اچھا؟ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔ ساری اسلامی معلومات تو صرف زینب ضیا کے پاس ہی ہوتی ہیں۔ اب میرے جیسے کم پڑھے لکھے آدمی کو کیا پتا کہ نماز فرض ہے اور نہ پڑھنے سے گناہ ہوتا ہے۔"

اس نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"مذاق نہ اڑائیے شیراز!" زینب نے تھوڑا سا برا مانتے ہوئے کہا۔

"نماز پڑھنا اتنا ضروری تھا تو پھر اللہ کو چاہیے تھا، وہ میری زندگی کو کچھ آسان بناتا۔ اسے چھوٹی بڑی ضرورتوں اور حسرتوں کا مجموعہ نہ بناتا۔ صبح آٹھ بجے سے رات دس بجے تک ٹیوشنز پڑھاتا ہوں میں تین سے چار گھنٹے ہر روز بسوں اور ویگنوں کے دھکے کھاتا سفر کرتا ہوں۔ کسی ایک جگہ دو منٹ دیر سے پہنچوں تو بے بھاؤ کی سنتا ہوں۔

کئی بار کھانا کھانا مجھے یاد ہی نہیں رہتا۔ اور کئی بار کسی بس یا ویگن میں کھڑے کھڑے کھانا کھاتا ہوں۔ اور تم مجھے بتا رہی ہو کہ پانچ وقت کی نماز پڑھنا کتنا ضروری ہے۔" وہ بات کرتے کرتے تلخ ہو گیا تھا۔

"اب یا تو میں نماز پڑھ لوں یا پھر کام کروں۔ تم اس لیے عبادت کرتی ہو کیونکہ میری طرح تمہارے سر پر ذمہ داریوں اور مسائل کے پہاڑ لدے ہوئے نہیں ہیں۔ گھر ضیا چچا کی کمائی سے چل رہا ہے۔ تمہارے سر پر تین تین بہنوں کو بیاہنے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ پڑھنے کے لیے کالج گئیں اور پھر آ کر گھر بیٹھ گئیں۔ کیا پتہ کہ مرد کو باہر چار پیسے کما کر لانے کے لیے چار سو گالیاں سننی پڑتی ہیں۔ پھر بھی جو کما کر لاتا ہوں، اس سے پورا نہیں پڑتا۔ ہر مہینے کسی نہ کسی چیز کے لیے کسی نہ کسی سے ادھار لینا پڑتا ہے۔ نمازیں پڑھو، عبادت کرو اور گھر میں بھوکے بیٹھے رہو۔"

زینب کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ اتنے اچھے موڈ میں ہوتے ہوئے اس طرح اچانک غصے میں آ جائے گا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، وہ اس نے پہلے بھی ہزاروں بار اس کے منہ سے سنا تھا۔ وہ اپنے گھر کے مسائل کی وجہ سے بہت پریشان رہتا تھا۔ اور اکثر بات کرتے کرتے تلخ ہو جاتا تھا۔ مگر زینب کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت اسے خوشگوار موڈ میں بات کرتے کرتے یوں ناراض ہو جائے گا۔

پچھلی رات کو اسلام آباد سے آیا تھا، صبح ان کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ کیونکہ وہ کالج چلی گئی تھی اور اب سہ پہر کے وقت جب وہ اس کے لیے کٹلٹس بنا کر اس کے گھر لائی تھی تو وہ اس سے بڑی خوش مزاجی سے ملا تھا چائے پیتے اور اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے کٹلٹس کھاتے ہوئے وہ اسے اپنے انٹرویو کی تفصیل سنا رہا اور وہ بے حد خوشی کے عالم میں سنتی رہی۔ اور اب یک دم اس کی ایک بات پر وہ اس طرح برہم ہو گیا تھا۔ زینب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ شیراز کو غصے میں دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں اسی طرح پھول جاتے تھے۔

شیراز کے خاموش ہونے پر اس نے مزید کچھ کہنے کے بجائے باقی برتنوں کو بھی ٹرے میں رکھنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ رہے تھے۔ جنہیں وہ نظریں جھکا کر شیراز سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے شیراز کو بہت افسوس ہوا۔ پلیٹ ٹرے میں رکھتے ہوئے اس نے زینب کے ہاتھ کو نرمی سے پکڑ لیا۔

"ناراض ہو گئی ہو؟"

آنکھوں میں امڈتی نمی کو آنکھوں سے باہر آنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ زینب نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے اسی طرح نظریں جھکائے نفی میں سر ہلایا۔ مگر اس کے گالوں پر اب آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔

"پاگل ہو تم۔ میں نے تمہیں تو کچھ بھی نہیں کہا۔" شیراز نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تو ایسے ہی ایک بات کر رہا تھا۔"

شیراز نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا، زینب نے چادر کے کونے سے اپنی آنکھوں اور گالوں کو پونچھنے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں اور گال خشک ہوئے، اگلے ہی لمحے وہاں پھر پانی تھا۔ شیراز اکثر اس سے مذاق میں کہا کرتا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا زینی! تمہاری آنکھوں میں اتنا پانی کہاں سے آ جاتا ہے۔ اتنی جلدی تو برسات کی بارش نہیں ہوتی جتنی جلدی تم رونے لگتی ہو۔"

وہ ٹھیک کہتا تھا وہ واقعی چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے لگتی تھی۔ ٹی وی میں کسی ڈرامہ کے کسی ٹریجک سین کو دیکھ کر، کوئی اداس گانا سنتے ہوئے، کسی کے بلند آواز میں ناراضی سے کچھ کہہ دینے پر، اپنی کسی چیز کے نہ ملنے یا گم ہو جانے پر، کوئی چھوٹی موٹی غلطی کر دینے پر، کوئی ہلکی سی چوٹ لگ جانے پر۔ کسی کی زندگی کا کوئی مسئلہ یا پریشانی سن کر، زینب کے لیے آنسو بہانا جیسے ہر مسئلے کا حل تھا۔

وہ طبعاً حساس اور رحم دل تھی۔ یہ خصوصیت اس کے باقی گھر والوں میں بھی تھیں۔ مگر زینب میں تو ان خصوصیات کا واحد مسئلہ رو پڑنا تھا۔ اس کے اپنے گھر والے اور خاندان کے لوگ اس کی اس کمزوری کو اچھی طرح جانتے تھے۔ مگر اس کا مذاق صرف شیراز ہی اڑایا کرتا تھا۔ مگر اس چیز نے بھی زینب کی اس کمزوری یا عادت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

"اچھا......تم سے معافی مانگوں؟" شیراز نے بالآخر کہا۔

"اس طرح کی باتیں مت کیا کریں۔" زینب اس کے جملے پر برا مان گئی۔ وہ اب اپنی سرخ ہوتی ہوئی ناک کی نوک کو چادر سے رگڑ رہی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے نہیں کرتا۔ بس تم رونا بند کرو۔ ورنہ میں رات کو سو نہیں سکوں گا۔"

شیراز نے اس کے دوسرے ہاتھ کو بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں بہت برا ہوں۔ بہت رلاتا ہوں نا تمہیں؟" اس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

زینب نے یک دم نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "آپ پھر اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں نیا سیلابی ریلا آیا۔

"اچھا اچھا میں نہیں کرتا۔ تم اپنے آنسو تو پونچھو۔" شیراز گھبرایا۔

"آپ ہاتھ چھوڑیں گے تو پونچھوں گی نا۔" زینب نے بے چارگی کے ساتھ کہا۔ شیراز نے اس کا ایک ہاتھ چھوڑ دیا۔

"دوسرا بھی چھوڑیں۔ خالہ اندر آئیں گی تو کیا سمجھیں گی۔" زینب نے کہا۔ وہ اب اس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے خجل ہو رہی تھی۔

"یہی سمجھیں گی کہ ان کی بھانجی اسی لیے دن میں بار بار یہاں کے چکر لگاتی ہے۔"

زینب نے بے حد ناراض ہو کر ہاتھ اس سے بے اختیار چھڑایا۔

"ٹھیک ہے۔ اب میں نہیں آؤں گی۔" وہ چادر سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"یعنی میں آ جایا کروں؟" شیراز نے اسے چھیڑا۔

"آپ کی مرضی، آپ کے چچا کا گھر ہے۔" وہ اسی انداز میں بولی۔

"چچا کا تو مجھے پتا نہیں، مگر میرا ہونے والا سسرال ضرور ہے۔ ویسے بیوی کو تمہارے جتنا خوبصورت نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے یک دم بات بدلتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

زینب نے اسے گھورا۔ "کیوں۔"

"ورنہ شوہر تو ہر وقت بیوی کا چہرہ ہی دیکھتا رہے گا۔"

"تو کیا برائی ہے چہرہ دیکھنے میں؟"

"برائی ہے دوسرے بھی تو دیکھتے ہیں۔"

"خواہ مخواہ میں مجھے دوسروں کو چہرہ تھوڑی دکھانا ہے اپنا۔" زینب نے بے ساختہ کہا۔

"تمہیں پتا ہے جب میں انگلینڈ میں چلا جاؤں گا تو سب سے پہلا کام کیا کروں گا۔" شیراز نے یک دم بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''کیا؟'' زینب نے بے ساختہ پوچھا۔

''تمہیں دیکھنے پر ٹیکس لگا دوں گا۔''

زینب نے بے حد برا مان کر ٹرے اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ شیراز بھی برق رفتاری سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اپنے آپ پر۔'' اس نے جیسے جملہ پورا کیا۔

زینب نے چند لمحے اسے ناراضی سے دیکھا پھر یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ہمیشہ الٹی باتیں کرتے ہیں۔''

''سیدھی باتوں کے لیے تم نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔'' شیراز نے اسے پھر چھیڑا۔

''بس اب میں نہیں آؤں گی یہاں، خود ہی آئیں گے۔'' وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''آئیں گے کیا؟ ابھی چلتے ہیں تمہارے ساتھ'' وہ اب اسے زچ کرنے کے موڈ میں تھا۔

''آپ پھر تنگ کر رہے ہیں مجھے۔''

''تم پھر رونا شروع کر دو۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''ایسے ہی رونا کیوں شروع کروں۔'' وہ بے اختیار کندھے اچکاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''پھر شیراز نے کیا کہا کون سی لڑکی کا انتخاب کرے گا وہ؟'' رمشہ نے زینب کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''میں نے پوچھا ہی نہیں۔'' زینب نے بے حد اطمینان سے کہا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ اس سوال کا جواب مجھے پہلے ہی پتا ہے۔ انہوں نے وہی کہا ہوگا جو میں جانتی ہوں۔''

''اچھا اتنا یقین ہے اس پر؟'' رمشہ نے اسے چھیڑا۔

''ہاں۔ یقین ہے تو سب کچھ ہے نا۔'' زینب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ رمشہ کی چھیڑ چھاڑ کی عادی تھی۔

تیسرا پیریڈ فری تھا اور وہ اس وقت کالج کے لان میں چہل قدمی کرنے میں مصروف تھیں۔ اور جب بھی وہ رمشہ کے ساتھ وہاں چل پھر رہی ہوتی آس پاس سے گزرنے والی لڑکیوں کی رشک بھری نظروں کا مرکز ہوتی۔ وہ اس کی عادی ہو چکی تھی۔ زینب ضیا بلاشبہ کالج کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ بعض دفعہ اس کے پاس سے گزرنے والی لڑکیاں اسے باقاعدہ روک کر اس بات کا اظہار کرتی تھیں، زینب ہمیشہ ایسی کسی بات پر جھینپ جاتی تھی اور رمشہ محظوظ ہوتی۔

''بات سنیں، آپ صبح اپنی نظر اتار کر آیا کریں۔''

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک جونیئر کلاس کی لڑکی نے اسے روک کر بڑے جھجکتے ہوئے انداز میں اس سے کہا تھا۔

''آپ کے چہرے پر بڑا نور ہے۔ مجھے لگتا ہے، بہت عبادت کرتی ہوں گی آپ۔'' زینب اور رمشہ مسکراتے ہوئے اس کی بات سنتی رہیں۔

''آپ بس اپنی نظر اتار کر آیا کریں۔''

وہ کچھ دیر ان کے پاس رک کر باتیں کرتی رہی ایک بار پھر اسے ہدایت کر کے گئی۔

''اب شیراز کو ایسی بیوی کہاں سے ملے گی۔ جس پر مرد تو ایک طرف عورتیں بھی عاشق ہوتی پھریں۔ خوش قسمت تو اصل میں تمہارا منگیتر ہے زینب۔''

رمشہ نے اس لڑکی کے جاتے ہی دوبارہ چہل قدمی شروع کرتے ہوئے کہا۔ زینب ہنس پڑی۔

کالج کے گراؤنڈ میں دور ایک حصے میں ایک کوکنگ کمپٹیشن کا افتتاح ہو رہا تھا۔ کسی سرکاری افسر کی بیوی مہمان خصوصی کے طور پر مدعو تھی۔ رمشہ اور زینب کچھ دور کھڑی اس سرکاری افسر کی بیوی کو کالج کی پرنسپل اور پروفیسرز کے جمگھٹے میں پنڈال کی طرف جاتا دیکھتی رہیں۔

''کبھی تم بھی اسی طرح کالجوں میں جا کر ربن کاٹا کرو گی۔ ایک بیگم صاحبہ بن کر۔''

رمشہ نے پھر اسے چھیڑا، اسے زینب کو چھیڑنا اچھا لگتا تھا۔ وہ اس کے چہرے کی سرخ ہوتی رنگت اور اس کی ہنسی سے بہت محظوظ ہوتی تھی۔ حسب عادت وہ اس بار بھی رمشہ کی بات پر ہنس پڑی تھی۔

''اور پھر تم جب ایک افسر کی بیگم بن کر جاؤ تو اپنی اس دوست کو یاد رکھنا۔ یہ نہ ہو تم کہیں مجھے دیکھو اور پہچانو ہی نہ۔'' رمشہ نے مصنوعی افسردگی کے ساتھ کہا۔

''اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم مجھے نہ پہچانو۔'' زینب نے بے ساختہ کہا۔

''تم اتنی موٹی مت ہونا نا۔ اسی طرح رہنا سلم، اسمارٹ۔''

زینب ایک بار پھر ہنسی۔

''البتہ ذرا ماڈرن ہو جانا۔ بال وال کٹوا لینا۔ ذرا اسٹائلش قسم کے کپڑے پہننا اور زیادہ میک اپ اور جیولری۔ افسروں کی بیویوں کا حلیہ ذرا اور طرح کا ہوتا ہے۔''

رمشہ نے چلتے چلتے رک کر ذرا تنقیدی نظروں سے اسے دیکھا۔

''شیراز تو کبھی مجھے اس کی اجازت نہیں دیں گے۔'' زینب نے دوٹوک انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیوں؟''

''بس مجھے پتا ہے۔ انہیں میں اسی حلیے میں اچھی لگتی ہوں۔ اور بال کٹوانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں میرے لمبے بال پسند ہیں۔''

''اور اگر شیراز نے ہی کل کو تم سے کہا کہ تم اپنا حلیہ تبدیل کر لو۔ اسے ماڈرن قسم کی پارٹیز میں ساتھ جانے والی بیوی چاہیے۔'' رمشہ یک دم

سنجیدہ ہوگئی۔

"وہ کہہ ہی نہیں سکتے۔ تمہیں پتا نہیں ہے ان کا۔ ماڈرن لڑکیاں انہیں اچھی نہیں لگتیں۔ انہیں تو بہت غصہ آتا ہے اگر ان کی بہنیں بھی پوچھے بغیر اکیلی ادھر اُدھر چلی جائیں۔"

"بندے کا کچھ پتا نہیں ہوتا زینب۔ ... اب وہ سول سروس میں جائے گا۔ دوسروں کی الٹرا ماڈرن بیویاں دیکھے گا تو تم کو چادر میں لپیٹ کر تو ساتھ نہیں لے کر جایا کرے گا۔"

"کل کی دیکھی جائے گی۔ ابھی تو بس تم دعا کرو، وہ بہت اچھی طرح پاس ہو جائیں۔"

زینب نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"فکر مت کرو۔ بہت اچھی پوزیشن میں پاس ہوگا۔ وہ پہلے ہر امتحان میں ٹاپ کرتا آ رہا ہے تو اس امتحان میں کیوں نہیں کرے گا۔" رمشہ نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"اور تمہارے جیسی نیک بیوی جس کے مقدر میں لکھی ہو۔ اس کو تو ویسے ہی دعاؤں کی ضرورت نہیں رہتی۔ تم سے اچھی اور بہتر دعا اس کے لیے اور کون کر سکتا ہے۔" رمشہ نے کہا۔

"پھر بھی رمشہ ... تم بس دعا کرنا۔"

"اچھا یار! کروں گی۔ تمہارے میاں کے لیے اب اتنا تو کروں گی ہی میں۔ اب کینٹین چلو، کچھ کھاتے ہیں۔" رمشہ نے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"چلتے ہیں۔" زینب نے اپنے بیگ کی زپ کھولتے ہوئے اندر سے چند نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں۔ اس لڑکے نے دوبارہ تو تنگ نہیں کیا؟" رمشہ کو یک دم جیسے یاد آیا۔

پچھلے ایک مہینہ سے کالج سے واپسی پر کوئی لڑکا زینب کا گھر تک پیچھا کرتا تھا اور زینب اس کی وجہ سے بے حد پریشان تھی مگر اب تقریباً دو ہفتے سے یک دم وہ لڑکا غائب ہو گیا تھا۔

"نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ ابھی تک دوبارہ نظر تو نہیں آیا۔" زینب نے بے ساختہ کہا۔

"اچھا ہے کم بخت دفع ہو گیا۔ میں نے تو تم سے پہلے دن ہی کہا تھا کہ اسے کھینچ کر ایک تھپڑ مارو، دوبارہ شکل نہیں دکھائے گا وہ۔"

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" زینب نے اعتراف کیا۔

"ہمت نہیں ہے میری جان، تو ہمت پیدا کرو۔" رمشہ نے جیسے اسے پچکارا۔

"میں نہیں کر سکتی رمشہ' وہ میرا محلہ ہے، وہ گھر تک آتا ہے میرے۔ میں وہاں کوئی ہنگامہ نہیں کر سکتی۔ شیراز یا ابو کو پتا چل گیا تو وہ کیا سوچیں گے میرے بارے میں۔"

''میں تمہاری جگہ ہوتی تو اپنے باپ اور منگیتر دونوں کو خود بتاتی۔ بلکہ اس سے پہلے وہ کرتی جو تمہیں بتا رہی ہوں۔''

رمشہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ زینب جانتی تھی، وہ واقعی ایسا ہی کرتی۔ وہ اپر کلاس سے تعلق رکھتی تھی۔ اور بے حد بے خوف اور نڈر قسم کی لڑکی تھی۔

''میں ابو کو پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ پہلے ہی بہت مسئلے ہیں ان کے لیے۔'' زینب نے کہا۔

''تو شیراز کو بتاؤ... وہ جا کر دو دو ہاتھ کرے اس سے۔''

''شیراز کو تو میں کبھی بھی نہ بتاؤں۔ وہ تو مجھ پر بہت خفا ہوں گے۔'' زینب نے بے ساختہ کہا۔

''کیوں تم پر کیوں خفا ہوگا؟''

''بس ہوں گے۔ مجھے پتا ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ ابھی تو وہ آ بھی نہیں رہے پیچھے۔ مجھے لگتا ہے جان چھوٹ گئی ہے اس سے۔''

اس سے پہلے کہ رمشہ کچھ اور کہتی زینب نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

☆☆☆

''شیراز بیٹا ابھی جوتے مت اتارنا۔ مجھے چائے کا کچھ سامان لا دو۔'' اس سے پہلے کہ نسیم اپنی بات مکمل کرتیں، شیراز نے ان کی بات کاٹ دی۔

''کیوں آج پھر نزہت کو دیکھنے کوئی آ رہا ہے؟'' وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی گھر میں داخل ہوا تھا اور ابھی اپنے کمرے میں آ کر جوتے اتارنے ہی والا تھا کہ نسیم اندر چلی آئیں۔

''اور اب یہ آج آنے والے کون ہیں؟'' اس نے والٹ نکالتے ہوئے اندر رکھے نوٹوں کو چیک کیا۔

''پتا نہیں۔ آئیں گے تو پتا چلے گا۔ لڑکا شاید کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔''

''شہر بھر کا ہر گھٹیا رشتہ اس گھر میں میری بہنوں کے لیے آتا ہے۔ کوئی فیکٹری میں مزدور ہے۔ کوئی حجام ہے۔ کوئی میکنک ہے۔ خالہ رشیدہ کو کوئی اور فضول رشتہ نہیں ملتا۔'' اس نے بے حد ناراضی کے عالم میں رشتہ کروانے والی عورت کا نام لیا۔

''اب ماسٹر ریڈر کے گھر میں اسی طرح کے رشتے آئیں گے، کسی لینڈ لارڈ کا رشتہ تو نہیں آئے گا اور جن رشتوں کو تم گھٹیا کہہ رہے ہو۔ وہ بھی کون سا پسند کر جاتے ہیں نزہت کو۔'' نسیم نے بھی ناراضی سے کہا۔

''اچھا کرتے ہیں نہیں پسند کرتے۔ ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں جانے کا فائدہ۔''

''اس طرح مت کہو۔ بخشش کہیں نہ کہیں تو بیاہی ہیں نا تمہیں۔'' نسیم نے اسے ٹوکا۔

''جانتا ہوں میں۔ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ سے کتنی بار کہا ہے۔ میرے امتحان کا رزلٹ آ لینے دیں۔ ماسٹر ریڈر کی بیٹیوں کے لئے جیسے مرضی رشتے آتے ہوں، سرکاری افسر کی بہنوں کے لیے ایسے رشتے نہیں آئیں گے۔''

"کھانا کھالو۔ پھر جانا۔" نسیم نے جان بوجھ کر بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کھانے میں کیا ہے؟"

"دال بنی ہے۔"

"رہنے دیں۔ مجھے بھوک نہیں۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"تمہیں انڈا بنا دیتی ہوں۔" نسیم نے جلدی سے کہا۔

"میں انڈے اور دالیں کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں۔"

"میں ساتھ والوں کے گھر سے پوچھتی ہوں، صفیہ نے آج آلو گوشت پکایا تھا۔" شیراز نے ماں کو بات مکمل کرنے دی۔

"شوربے کے تالاب میں ایک بوٹی نما چھیچھڑا اور آلو ڈھونڈنے میں جتنی دیر لگے گی۔ اتنی دیر میں رات کے کھانے کا وقت ہو جائے گا۔" وہ تلخی سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

زینب بس سے اتر کر اپنے محلے میں داخل ہوئی۔ آج اتفاقاً اس کے ساتھ محلے سے کالج جانے والی دو لڑکیاں نہیں تھیں۔

پہلی گلی میں داخل ہوتے ہی اس کا دل بے اختیار دھک سے رہ گیا۔ وہ کچھ کے وقفے کے بعد وہی لڑکا ایک بار پھر وہیں کھڑا تھا۔ زینب کو گلی میں آتا دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرایا اور یک دم الرٹ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا سگریٹ پھینک دیا تھا۔

زینب کو گلی سے بے حد خوف آتا تھا۔ کیونکہ دوپہر کے اس وقت یہ گلی عام طور پر بالکل سنسان رہتی تھی۔ اور اس لڑکے نے اسی گلی میں آ کر اس سے بات کرنا شروع کی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے وہ صرف اس جگہ سے زینب کا پیچھا کیا کرتا تھا جہاں زینب محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ بس سے اترا کرتی تھی۔ کچھ عرصہ وہ چپ چاپ اس کے پیچھے آتا رہا۔ پھر یک دم بس اسٹاپ کے بجائے اس گلی میں کھڑا ہونے لگا اور زینب سے بات کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اگلی گلی میں پہلے شیراز کا گھر آتا تھا۔ پھر زینب کا اور وہ گلی سنسان نہیں ہوتی تھی۔ وہاں اکثر محلے کی خواتین باہر کھڑی یا بیٹھی ایک دوسرے سے بات کر رہی ہوتی تھیں۔

جیسے ہی زینب، اپنی گلی کا موڑ مڑتی تھی وہ لڑکا غائب ہو جاتا تھا۔ مگر اس گلی سے آج کل گزرنا زینب کے لیے پل صراط سے گزرنے کے برابر تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے حسب عادت زینب کے پاس آتے ہی کہا۔ اب وہ زینب کے تقریباً ساتھ چل رہا تھا۔ زینب نے اپنا آدھا چہرہ اسی چادر میں ڈھانپا ہوا تھا۔ جسے اس نے اوڑھا ہوا تھا۔ اس کی صرف آنکھیں ماتھے اور ناک کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا مگر اس کے باوجود ایک ہی نظر میں اس خوف کو محسوس کرنا مشکل نہیں تھا جو اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگا تھا۔ وہ بے حد تیز اور بے حد ناہموار قدموں سے چل رہی تھی، اگر اس وقت کوئی اسے روک دیتا تو وہ اس کے جسم کی کپکپاہٹ اور لرزش کو بہت آسانی سے محسوس کر لیتا۔

''کبھی تو سلام کا جواب دے دیا کریں۔ مسلمان نہیں ہیں کیا؟'' وہ اب ہمیشہ کی طرح جملے پھینک رہا تھا۔ ''یہی پوچھ لیں کہ بندہ دو دن کہاں رہا؟''

وہ چلتی رہی، وہ جیسے اپنے قدم گن رہی تھی۔

''آپ نے سوچا، آپ کی جان چھوٹ گئی۔ بندہ کہیں مرکھپ گیا۔'' اس نے اب قہقہہ لگا کر کہا۔ زینب کو بے اختیار رونا آ گیا۔ وہ واقعی چاہتی تھی کہ وہ کہیں مرکھپ گیا ہو۔

''زینب جی!''

زینب کو بے حد اختیار ٹھوکر لگی۔

''سنبھل کے۔ آپ گریں گی تو مجھے ہاتھ پکڑ کر اٹھانا پڑے گا۔ وہ آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔''

اس لڑکے نے بے ساختہ کہا۔ زینب کی کنپٹیوں سے اب پسینہ بہنے لگا تھا، اس سے پہلے وہ ہمیشہ اس کا نام پوچھتا تھا۔ آج اس نے نام پوچھنے کی بجائے سیدھا اس کا نام لیا تھا۔ اب نہ جانے وہ آگے کیا کرتا۔ زینب کو لگ رہا تھا اس کا دل بہہ جائے گا۔

گلی کا موڑ آ گیا تھا۔ ''چلیں پھر کل ملیں گے، میں تو چاہتا ہوں، آپ کے ساتھ آپ کے گھر تک جاؤں۔ مگر یہ ظالم سماج'' اس لڑکے نے اب ایک مصنوعی آہ بھری۔ زینب گلی کا موڑ مڑ گئی۔ وہ جیسے آج پل صراط کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی تھی۔

گھر کا دروازہ ربیعہ نے کھولا تھا، زینب بے حد غصہ اور صدمے کے عالم میں گھر میں داخل ہوئی تھی۔ پچھلی گلی کا خوف اب غصے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اپنا بیگ صحن میں پڑے تخت پر پھینک کر وہ جوتے اتارتی وہیں بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟'' ربیعہ نے اس کے سرخ چہرے کو دیکھ کر کہا۔

''میرا دل چاہتا ہے، میں اس لڑکے کو گولی مار دوں۔'' زینب نے بے حد طیش کے عالم میں کہا۔

''وہ پھر آ گیا؟'' ربیعہ نے بے حد ساختہ پوچھا۔

''ہاں..... آج پھر کھڑا تھا۔'' زینب کی آنکھوں میں اب آنسو آنے لگے تھے۔

''شکل دیکھی ہے اس نے اپنی۔ ان کے گھر بہنیں نہیں ہوتیں کیا؟''

''دفع کرو..... مت ٹینشن لو۔''

''میں تنگ آ گئی ہوں۔ روز روز کے اس پیچھا کرنے سے۔ میرا تو کالج جانے کو دل نہیں چاہتا، جب میں اس کی منحوس صورت دیکھتی ہوں۔''

''اچھا ختم کرو بات کو۔ سلمان اندر کمرے میں ہے۔ سن لے گا۔'' ربیعہ نے اس سے کہا۔

''جرأت دیکھو خبیث کی۔ آج میرا نام لے رہا تھا۔''

زینب نے مدھم آواز میں دانت پیستے ہوئے بے بسی کے عالم میں کہا۔ وہ ساتھ ساتھ اپنی آنکھوں کو پونچھ رہی تھی۔

"چپ ہو جاؤ، سلمان آ رہا ہے۔" زینب نے اندر کمرے سے آتے سلمان کے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔ زینب نے بے حد تیزی سے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو رگڑا اور بیگ اٹھا کر سلمان سے نظریں ملائے بغیر کمرے میں چلی گئی۔

سلمان نے پاس سے گزرتی زینب کو حیرانی سے دیکھا۔

"انہیں کیا ہوا؟" اس نے ربیعہ کی طرف اپنی شرٹ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ وہ بٹن لگوانے آیا تھا۔

"کچھ نہیں۔ بس طبیعت خراب ہے۔" ربیعہ نے شرٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے اسے ٹالا۔

"صبح تو ٹھیک تھیں۔" سلمان نے کہا۔ "تم نے زہرہ آپا کے بارے میں بتایا ہوگا۔"

"نہیں، ابھی نہیں بتایا۔" ربیعہ نے بے حد مدھم آواز میں کہا۔

☆☆☆

"تمہیں کیا ہوا؟" زینب کپڑے بدل کر کھانا کھانے کے لیے کچن میں آ کر بیٹھی تھی۔ ربیعہ نے اسے کھانا نکال کر دیا اور خود اس کے پاس ہی چوکی پر بیٹھ گئی۔ چپاتی کا پہلا لقمہ توڑتے ہی زینب کی نظر ربیعہ کے چہرے پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ ربیعہ بے حد پریشان لگ رہی تھی۔

"کچھ نہیں۔ تم کھانا کھاؤ۔" ربیعہ نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

"امی کہاں ہیں؟" زینب نے اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ آپا کی طرف گئی ہیں۔"

"کیوں خیریت ہے؟"

"ہاں۔ خیریت ہی ہے۔ تم کھانا کھاؤ، سالن ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" ربیعہ نے ایک بار پھر اسے کھانے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی۔

"مجھے صاف صاف بتاؤ، کیا ہوا ہے؟" زینب یک دم پریشان ہو گئی تھی۔

ربیعہ کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

"زہرہ آپا کے ہاں پھر بیٹی ہوئی ہے۔"

زینب سن ہو گئی۔ اس کی بھوک یک دم غائب ہو گئی تھی۔ اس کی بڑی بہن کے ہاں یہ تیسری بیٹی تھی۔

ہاتھ میں پکڑا نوالہ اس نے واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"کھانا کیوں چھوڑ دیا؟" ربیعہ نے اسے ٹوکا۔

"تم نے کھایا؟" زینب نے پوچھا۔ ربیعہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔

زہرہ زینب سے چار سال بڑی تھی۔ پانچ سال پہلے اس کی شادی ضیا کی اکلوتی بڑی بہن فہمیدہ کے بیٹے نعیم سے ہوئی تھی۔ اور شادی کے

پہلے سال ہی زہرہ اس گھر میں بہت سے مسئلوں کا شکار تھی۔ نعیم چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے گھر بھجوا دینے کا عادی تھا۔ ہر تین ماہ کے بعد ایک بار وہ ضرور کسی نہ کسی بات پر گھر سے نکالی جاتی۔ پھر جو چند دن وہ اپنے میکے میں رہتی، وہ زینب کے سارے گھر والوں کے لیے بے حد تکلیف دہ ہوتے تھے۔ ان کا پورا گھر یک دم بے سکونی کا شکار ہو جاتا تھا۔ پھر ضیا تو نعیم کے پاس جا کر فہمیدہ اور نعیم سے بلاوجہ معذرت کرتا یا پھر ان کا کوئی مطالبہ دفتر سے قرض لے کر پورا کرتا اور زہرہ واپس اپنے گھر جاتی۔

لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ سسرال میں زہرہ کی زندگی بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک بیٹی کی پیدائش نے صورت حال کو اور مشکل کر دیا۔ اب اس بار نعیم اور اس کی ماں پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ بیٹی ہونے پر وہ نعیم کی دوسری شادی کر دیں گے۔ اور اب زہرہ کے تمام میکے والوں کی دعاؤں کے باوجود ایک اور بیٹی اس کے گھر آ گئی تھی۔

ربیعہ اور زینب بہت دیر تک اس طرح چپ چاپ باورچی خانے کی چوکیوں پر سوچوں میں الجھی بیٹھی رہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک جملے کا بھی تبادلہ نہیں ہوا تھا۔ دونوں اس وقت زہرہ کی ذہنی حالت اور اس کے سسرال والوں کے رویے کے بارے میں سوچ کر خوف زدہ ہو رہی تھیں۔

وہاں بیٹھے بیٹھے زینب کو یک دم زندگی بے کار لگنے لگی تھی۔ وہ باورچی خانے سے اٹھ کر کمرے میں آ گئی اور بستر پر لیٹ کر بے مقصد چھت کو گھورنے لگی۔ اسے زندگی میں کبھی اپنی غربت کے احساس نے بے بس یا پریشان نہیں کیا تھا سوائے اس وقت کہ جب زہرہ کو سسرال سے واپس بھجوا دیا جاتا تھا۔ صرف وہ دن ایسے ہوتے تھے جب اسے بار بار اپنی اور اپنے گھر والوں کی بے مائیگی اور بے قدری کا احساس شدت سے ہوتا تھا۔ اس کے لیے یہ بات بھی بڑی اذیت ناک ہوتی تھی کہ کوئی غلطی نہ ہونے کے باوجود بھی ہر بار اس کا باپ نعیم اور اس کی ماں سے معافی مانگ کر آتا تھا۔ صرف اس لیے کہ زہرہ کا گھر برباد نہ ہو۔

پورے محلے میں ضیا کی بے حد عزت تھی اور زینب اس بات پر فخر بھی کرتی تھی۔ اس کا باپ بااخلاق، شریف، ایمان دار اور دوسروں کے کام آنے والا شخص تھا۔ محلے کی مسجد کے امام جب کبھی غیر حاضر ہوتے تو ضیا ہی سے نماز کی امامت کروانے کے لیے کہا جاتا تھا۔ مگر جب زہرہ کا مسئلہ پیدا ہو جاتا تو جیسے ان کی غربت اس کے باپ کو یک دم کھنچ جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ گھر میں کوئی اور اس چیز کے بارے میں سوچتا تھا یا نہیں مگر زینب ضرور سوچتی تھی۔ اور بہت دنوں تک سوچتی رہتی تھی۔

اور اب حالات جیسے بالکل ہی نازک موڑ پر آ گئے تھے۔

شام کو نفیسہ گھر آئیں تو وہ بھی بے حد پریشان تھیں۔ وہ زہرہ کی دونوں بیٹیوں مائرہ اور ماہا کو اپنے ساتھ گھر لے آئی تھی۔

''پتا نہیں، اللہ کو اب اور کون سا امتحان مقصود ہے زہرہ کا؟''

زینب اور ربیعہ ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''پھپھو اور نعیم بھائی کا رویہ کیسا ہے۔؟ آپ سے کچھ کہا انہوں نے؟'' زینب نے بے ساختہ ماں سے پوچھا۔

''نعیم تو بیٹی کو دیکھنے ہی نہیں آیا۔ اور فہمیدہ نے خاموش تھوڑی رہنا تھا اس نے باتیں بنائیں۔''

"آپ نے ان کا جواب دیا؟" زینب نے پوچھا۔

"میں کیا کہتی۔ خاموشی سے بے عزتی کرواتی رہی۔ بیٹیوں کی ماؤں کے منہ میں زبان کہاں ہوتی ہے، ایسے موقعوں پر۔" نفیسہ بات کرتے کرتے رونے لگیں۔

"جب سے شادی ہوئی ہے، میری بچی بس تکلیف ہی دیکھ رہی ہے اس گھر میں۔ پتا نہیں کیسا مقدر بنایا ہے اللہ نے اس کا۔ اتنی خوبصورت سگھڑ اور تہذیب والی بچی تھی میری، میں نے تو نعیم سے شادی کرتے ہوئے اس کی شکل وصورت تک نہیں دیکھی اور ان لوگوں نے اس کا جینا حرام کر دیا ہے۔"

"آپ کو پتا تھا پھوپھو کا اور نعیم بھائی کا بھی۔ پھر کیوں آپ نے آپا کی وہاں شادی کی۔ اتنی خوبصورت تھیں وہ، کہیں بھی شادی ہو جاتی ان کی۔" زینب کو ماں سے شکایت ہوئی۔

"شادی نہ کرتی تو اور کیا کرتی۔ دیکھے بھالے خاندان کے لوگ تھے۔ باہر کرتے تو سو مسئلے ہوتے، مجھے کیا پتا تھا خاندان کے لوگ باہر والوں سے بھی زیادہ برے نکلیں گے۔ فہمیدہ نے صاف کہہ دیا مجھ سے کہ وہ نعیم کی دوسری شادی کرے گی اب۔"

زینب مزید کچھ نہ سن سکی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کا دل یک دم بہت زیادہ گھبرانے لگا تھا۔

چھوٹی ماہا کو ساتھ لے کر وہ شیراز کے گھر چلی آئی۔

"ارے زہرہ آئی ہے کیا؟" نسیم نے ماہا کو دیکھتے ہی خوشی کا اظہار کیا۔

"نہیں۔ آپا نہیں آئیں۔ امی آپ کے گھر گئی تھیں۔ واپسی پر انہیں لے آئیں۔" اس نے بے حد اداسی کے ساتھ کہا۔

"زہرہ ٹھیک ہے نا؟" نسیم نے قدرے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

"آپا کی ایک اور بیٹی ہوئی ہے۔" زینب نے افسردگی سے بتایا۔

"میرے اللہ۔" نسیم نے بے اختیار دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر جیسے چیخ دبائی۔ زینب کو ایک کانٹا سا چبھا۔

"فہمیدہ نے تو قیامت اٹھا دی ہو گی۔"

زینب کچھ کہنے کے بجائے افسردگی سے ماہا کو دیکھتی رہی۔ وہ صحن کے ایک کونے میں رکھے ڈربے کے پاس کھڑی اندر موجود مرغیوں کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

"فہمیدہ تو پہلے سے کہہ رہی تھی کہ اس بار بیٹی ہوئی تو وہ زہرہ کو طلاق دلوا کر گھر بھجوا دے گی۔" نسیم نے بے حد تشویش سے کہا۔ "پر تو فکر نہ کر، میں اور تیرے تایا جائیں گے اس کی طرف۔ سمجھائیں گے اس کو۔ تو دل چھوٹا نہ کر۔" نسیم کو زینب کے چہرے سے اس کی حالت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"تو جا شیراز کے پاس بیٹھ تھوڑی دیر کو۔ ابھی ٹیوشن کرنے چلا جائے گا۔ نہ میری دھی، تو کیوں رو رہی ہے۔ چپ میرا بچہ۔" زینب رونے لگی تھی۔

نسیم نے اٹھ کر زینب کو گلے لگا کر چادر سے اس کے آنسو پونچھے۔

اندر چائے پیتے شیراز نے قدرے بے چین ہو کر چائے کا کپ نیچے رکھ دیا۔ زینب کو ہر چھوٹی بڑی بات پر رونے کی عادت تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا رونا اسے ہمیشہ بے چین کر دیتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر باہر جاتا، زینب اندر آ گئی تھی اس کا گال اور آنکھیں فی الحال خشک تھیں مگر آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ دن میں پہلے بھی روتی رہی تھی اور ابھی پھر رو پڑنے کے لیے اس کو زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑی تھی۔

"تم مجھے ایک بات بتاؤ زینی! کہ تم خواہ مخواہ دوسروں کے مسئلوں کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنا دماغ کیوں خراب کرتی رہتی ہو۔"

شیراز نے اس کے اندر آتے ہی بلاتوقف کہا۔ "زہرہ کی تیسری بیٹی ہو گئی ہے تو تمہیں اس سے کیا۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

زینب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ "وہ میری بہن ہے۔"

"تو.....؟" شیراز نے اسی انداز میں کہا۔

"نعیم بھائی نے اسے طلاق دے دی یا دوسری شادی کر لی تو "

شیراز نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تو بھی یہ تمہارے ماں باپ کا اور زہرہ کا مسئلہ ہے تمہارا نہیں۔ تم اپنے اور میرے بارے میں سوچا کرو۔ بس..... " شیراز نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"کل کو اگر میری بھی بیٹیاں ہوئی تو آپ میرے ساتھ اسی طرح کریں گے؟" زینب نے بے حد مدھم آواز میں کہا۔

"بس ساری الٹی باتیں تم ہی سوچا کرو زینب۔" شیراز نے سر جھٹک کر کہا۔

"میں سوچتی نہیں، مجھے خود خیال آتا ہے۔" زینی نے بے چارگی سے کہا۔

"تم اچھی باتیں سوچا کرو۔"

"آپ بتائیں نا۔ آپ کیا کریں گے؟" زینب نے اصرار کیا۔

"تمہیں گارنٹی چاہیے مجھ سے؟ چلو ٹھیک ہے۔ بے فکر رہو۔ بیٹیاں ہوں یا بیٹے، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ ایک سرکاری افسر کے بچے ہوں گے۔ اور تم ایک سرکاری افسر کی بیگم کوئی تمہیں یا میری اولاد کو ایک لفظ نہیں کہہ سکتا۔ بس خوش۔"

زینب کی نم آنکھوں میں بے اختیار چمک آئی، وہ اب مسکرا رہی تھی۔

"مسئلہ بیٹی یا بیٹے کا نہیں ہوتا۔" شیراز اب یک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ "سارا مسئلہ غربت کا ہوتا ہے۔ نعیم بھائی کے پاس پیسہ ہوتا تو بیٹیاں انہیں اتنی بڑی مصیبت نہ لگتیں۔ تمہیں پتا تو ہے، خود انہوں نے اپنی بہنوں کی شادیاں کتنی مصیبتوں سے کی ہیں۔ اب بیٹیوں کی شکل میں انہیں ایک بار پھر وہی مسئلے نظر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ پہلے جوانی بہنوں کے رشتوں اور شادیوں کے لیے دھکے کھا کھا کر خراب ہوئی۔ اور اب بڑھاپا بیٹیوں کی شادیوں کے لیے ذلتیں اٹھا اٹھا کر خراب ہوگا۔ وہ بھی کیا کریں۔"

"اللہ نے پیدا کیا ہے کوئی جوڑ بھی تو بنایا ہوگا۔ انسان اللہ پر تو بھروسا کرے۔"

زینب نے بے ساختہ کہا اور شیراز اس کی بات پر بری طرح چڑا۔

"کیا اللہ پر بھروسا کرے۔ تمہاری ایسی باتوں پر مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ تم پڑھی لکھی ہو۔ اللہ پر بھروسہ، اللہ کو امیروں کو سہولتیں دینے سے فرصت ملے تو اللہ غریبوں کے مسئلے حل کرنے آئے۔"

"آپ کی ایسی باتوں سے مجھے ڈر لگتا ہے شیراز۔" زینب نے بے ساختہ کہا۔

"بہت اچھی بات ہے۔ ڈرا کرو۔ ساری عمر بس ڈر ڈر کر گزارو یہ نالوئر مڈل کلاس ذہنیت ہے تمہاری۔"

وہ اس کی بات پر ناراض ہو گیا۔

"تمہارے سامنے میرے ماں باپ میری بہنوں کے لیے رشتے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اللہ پر ہی بھروسا کر کے ڈھونڈ رہے ہیں تو کیا ہوا اب تک؟ کوئی نتیجہ نکلا نہیں۔ جو آتا ہے، وہ لڑکی کی بات نہیں کرتا۔ باپ اور بھائی کے کام اور آمدنی کی تفصیل پوچھنے بیٹھ جاتا ہے۔ تمہیں میں مل گیا نہ ملتا اور تمہیں میری بہن کی طرح دو دو ٹکے کے لوگوں کے سامنے آکر بیٹھنا پڑتا تو پھر میں تم سے پوچھتا کہ اللہ پر کتنا بھروسا ہے تمہیں۔"

وہ اب بے حد تلخ ہو گیا تھا۔ زینب نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتی تھی وہ نزہت کی شادی کے مسئلے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔

"میں نعیم کی بات کر رہی تھی۔ انہیں یہ تو سوچنا چاہیے کہ زہرہ آپا کا اس میں کوئی قصور نہیں۔"

زینب نے جان بوجھ کر موضوع بدلا۔

"نعیم بھائی اور پھوپھو کو زہرہ پر غصہ نہیں، چچا پر غصہ ہے۔" شیراز نے صاف اور دوٹوک انداز میں کہا۔

"ابو پر کیوں؟ ابو نے کیا کیا ہے؟" زینب ہکا بکا اسے دیکھنے لگی۔

"انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ یہی تو سارا مسئلہ ہے۔ ان کی جگہ کوئی اور انکم ٹیکس میں کلرک ہوتا تو لاکھوں میں کھیل رہا ہوتا۔ زہرہ کو جہیز میں سب کچھ دیا ہوتا تو اتنے گلے تو نہ ہوتے نعیم بھائی کو چچی سے۔ مگر چچا کو کیا، انہیں تو بس اپنی ایمان داری سے مطلب ہے۔ وہ سمجھتے ہیں، لوگ بڑی تعریفیں کرتے ہوں گے ان کی۔ حالانکہ ان کے محکمہ کے لوگ ان کو بے وقوف سمجھتے ہوں گے۔" شیراز بے حد تلخی سے کہہ رہا تھا۔ "میرا باپ تو چلو میٹرک پاس رہتا۔ پھر بھی جتنے مواقع ملے، انہوں نے فائدہ اٹھایا۔ تم لوگوں سے بہتر ہے گھر ہمارا۔ بہتر سامان ہے یہاں پر، ابو نے بہنوں کے لیے بھی تھوڑا بہت جمع کر ہی لیا ہے۔ لیکن چچا نے کون سے تیر مار لیے ہیں؟"

"وہ اوور ٹائم کرتے ہیں، جتنی محنت کر سکتے ہیں وہ۔"

زینب نے باپ کی صفائی دینے کی کوشش کی۔

شیراز نے اسے بات مکمل کرنے دی۔

"میں اوور ٹائم کی بات نہیں کر رہا، اور نہ ہی یہاں پر محنت کی بات ہو رہی ہے۔ دس روپے کے لیے خون پسینہ بہانے کو میں بے وقوفی سمجھتا ہوں، محنت نہیں۔ چچا آخر پیسہ کیوں نہیں بناتے؟ بنا کیں پیسہ۔ یا تو یہ ہو کہ انسان کے پاس موقع نہ ہو۔ انکم ٹیکس کے کلرک اور حالت یہ ہے کہ سائیکل پر

دفتر آتے ہیں۔ کوئی اور آتا ہے ان کے دفتر میں سائیکل پر؟"

"شیراز! آپ ابو کے بارے میں اس طرح کی باتیں مت کریں۔" زینب کا دل بری طرح دکھا۔

"تم باپ کی حمایت بند کرو۔" شیراز نے اسے ڈانٹا۔ "تمہاری بات کبھی نہیں ٹالتے چچا۔ تم اگر ان سے یہ سب کہتیں تو وہ ضرور مانتے لیکن تم نے کبھی انہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔"

وہ اب زینب کے بھی لتے لے رہا تھا۔

"میں کیا کہتی ان سے کہ وہ رشوت لیا کریں؟" زینب نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ ایسے ہی کہہ دیتیں ان سے۔ مگر کچھ کہتیں تو۔ گھر میں پیسہ آتا تو تمہیں فرق پتا چلتا۔"

"پر شیراز! ہمیں کیا کرنا ہے پیسے کا۔ ہمارے پاس تو پہلے ہی سب کچھ ہے۔"

زینب نے بے حد سادگی سے کہا۔ شیراز کا جی چاہا وہ اپنا سر پکڑ لے۔

"تمہارے پاس "سب کچھ" کیا "کچھ بھی" نہیں ہے۔ اس بار ڈیفنس میں رمشہ کے گھر جاؤ تو آنکھیں کھول کر دیکھنا کہ "سب کچھ" کس کو کہتے ہیں۔"

"میں دوسروں کی قسمتوں اور ان کی چیزوں کو نہیں دیکھتی۔"

زینب نے بے اختیار برا مان کر کہا۔

"میں دیکھتا ہوں۔ اور آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں اور تم دیکھنا، ایک دن سب کچھ ہوگا میرے پاس، میں تمہارے ابا کی طرح ماتھے پر خالی نماز کا نشان لے کر نہیں پھروں گا۔"

زینب بے حد دل گرفتہ سی اسے دیکھتی رہی۔ وہ یہاں دل کا بوجھ ہلکا کرنے آئی تھی۔ مگر بوجھ اور بڑھ گیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ شیراز آج کل تایا کے معطل ہونے کی وجہ سے بے حد پریشان تھا۔ اس کی چند ٹیوشنز بھی ختم ہوگئی تھیں اور پریشانی کے دنوں میں وہ بے حد تلخ ہو جاتا، پھر اسی طرح کی چبھتی ہوئی باتیں کرتا مگر آج اس کی باتیں پہلے کی نسبت زیادہ تلخ تھیں یا پھر وہ جس ذہنی حالت میں تھی، اسے یہ باتیں زیادہ محسوس ہوئی تھیں۔

مزید کچھ کہے بغیر وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"اب ناراض ہوگئی ہو؟" شیراز کو ہمیشہ کی طرح بات کہہ دینے کے بعد خیال آیا۔

"نہیں... میں کیوں ناراض ہوں گی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

وہ کہتے ہوئے اس سے نظریں چرا کر باہر نکل آئی۔ شیراز نے اسے آواز دے کر روکا نہیں۔

☆☆☆

”زہرہ کیسی ہے؟“ ضیا کو رات گھر آنے پر زہرہ کی بیٹی کے بارے میں پتا چلا تھا۔ وہ اگر پریشان یا مایوس ہوئے بھی تھے تو انہوں نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

وہ کھانا کھانے بیٹھے تھے۔ جب نفیسہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

”کیسی ہوگی؟ رو رو کر حالت خراب کر لی تھی اس نے۔“ نفیسہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”تم نے تسلی دینی تھی اسے۔“ ضیا نے کھانا کھاتے کھاتے ہاتھ روک لیا۔

”کس بات کی تسلی؟ پہلی بیٹی پر تسلی۔ دوسری پر تسلی۔ اب تیسری پر تو“

ضیاء نے ناگواری سے نفیسہ کی بات کاٹ دی۔

”تمہاری ان ہی باتوں کی وجہ سے بچیاں پریشان ہوتی ہیں۔ ربیعہ اور زینی دونوں کے چہرے اترے ہوئے ہیں۔ بیٹی ہے تو کیا ہے کہ صحت مند اولاد ہے؟ تمہیں تو مبارک باد دینا چاہیے تھی زہرہ کو۔“

”اب میں آپ کی طرح بیٹیوں کی پیدائش پر مبارک باد دے کر مذاق نہیں بنوا سکتی اپنا۔“ نفیسہ نے بے حد ناراض ہو کر کہا۔

”ہم خود تین بیٹیوں کے والدین ہیں نفیسہ۔“ ضیاء نے جتانے والے انداز میں کہا۔

”اس آزمائش سے گزری ہوں۔ اسی لیے تو اس اذیت کو جانتی ہوں۔ کس کس کی باتیں نہیں سنیں میں نے تین بیٹیوں پر۔ وہ تو بس اللہ کا شکر ہے کہ آپ جیسا شوہر تھا۔ نعیم جیسا ہوتا تو مر گئی ہوتی اب تک میں۔“ نفیسہ نے بے اختیار کہا۔

”تمہیں اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کی حدیث یاد ہے نا کہ جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان کی اچھی پرورش کرکے بیاہ دے تو قیامت کے دن وہ میرے اس طرح قریب ہوگا جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں۔“

ضیا نے بڑی رسانیت سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر نفیسہ نے بے حد تلخی سے ان کی بات کاٹ دی۔

”یہ دنیا ہے ضیا صاحب! یہاں لوگ قرآن ہاتھ میں لے کر ماتھے اور سینے سے چاہے لگاتے ہوں۔ حضور ﷺ کا نام سننے پر انگلیاں ہونٹوں سے لگا کر چاہے چومتے ہوں، مگر کرتے وہی ہیں جو ان کی اپنی مرضی اور خواہش ہوتی ہے۔ کس نے نہیں سنی ہوگی یہ حدیث، کس نے نہیں پڑھا ہوگا قرآن۔ یہ مسلمانوں کا ملک ہے ضیا صاحب! یہاں لوگ قرآن پر کٹ مرتے ہیں، مگر قرآن کے مطابق جیتا کوئی نہیں۔“

”جہالت ہے نفیسہ، کیا بیٹے کیا بیٹیاں، سب نے یہیں ختم ہو جانا ہے۔ اگلی دنیا میں آدمی اپنے اعمال لے کر جائے گا۔ بیٹے لے کر جائے گا کیا؟“ ضیا نے کہا۔

”بیٹوں سے نسل چلتی ہے۔ اور مجھے کیا سمجھا رہے ہیں۔ اپنی بہن اور بھانجے کو جا کر بتائیں یہ ساری باتیں۔“

”جاؤں گا میں صبح نعیم کی طرف۔ سمجھاؤں گا اسے بھی اور آپا کو بھی۔“ ضیاء نے دوبارہ کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔

”اللہ کا شکر ہے۔ زہرہ جیسی قسمت میری زینی کی نہیں ہے۔ اس کے سسرال والے قدر کرنے والے لوگ ہیں ورنہ میں تو مر ہی جاتی۔

اور آپ نے اکبر بھائی کے معاملے میں کیا کیا؟'' نفیسہ کو بات کرتے کرتے یاد آیا۔

''ایک دو دن میں میرا افسر آ جائے گا تو بات کروں گا ان سے، پر نفیسہ مجھے تو اب بہت شرم آتی ہے بار بار سفارشیں کرواتے ہوئے پچھلی بار معطل ہونے پر بھی میں نے اکبر بھائی سے کہا تھا کہ اب رشوت نہ لیں۔ لیکن انہوں نے ایک نہیں سنی میری۔ اب تو میرا دل بھی نہیں چاہتا ان کی سفارش کرنے کو۔'' ضیا نے بے حد ناگواری سے کہا۔

''ضیا صاحب! آپ کے صرف بڑے بھائی نہیں ہیں وہ۔ آپ کی بیٹی کے سسر بھی ہیں۔ ابھی تو بھائی بن کر مدد مانگ رہے ہیں آپ سے۔ اگر دوسرے رشتہ کا خیال آ گیا انہیں تو آپ کی یہ شرافت بیٹی کے لیے مسئلہ بنا دے گی۔'' نفیسہ نے جیسے تنبیہ کی۔

''جانتا ہوں، زینب کی وجہ سے ہی کر رہا ہوں یہ سب کچھ۔ ورنہ تو میں کبھی سفارش نہ کرتا ان کی۔ شیراز کا رزلٹ آ جائے اور وہ نوکری پر لگ جائے تو میں تو اکبر بھائی سے کہوں گا کہ وہ ویسے ہی نوکری چھوڑ دیں۔ تب اگر معطل ہوئے تو شیراز بے چارے کے لیے بھی کتنی بدنامی ہوگی۔'' انہوں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

☆☆☆

''تم خوامخواہ پریشان مت ہو، کچھ نہیں ہوگا تمہاری بہن اور اس کے گھر کو۔'' زینب رمشہ کے گھر پر تھی اور رمشہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔

وہ اس کا دل بہلانے کے لیے اسے آج کالج سے گھر لے آئی تھی۔ زینب جب کسی بات پر بہت پریشان ہوتی تھی تو رمشہ اسے اسی طرح اپنے گھر لے آیا کرتی تھی۔

''تم آپ کے سسرال والوں کو نہیں جانتیں۔'' زینب کے اضطراب میں کمی نہیں ہو رہی تھی۔

''اچھا زیادہ سے زیادہ کیا کرلیں گے وہ لوگ؟ طلاق دے دیں گے نا۔ دینے دو۔ بندہ مر نہیں جاتا طلاق سے۔'' رمشہ نے بالآخر جیسے تنگ آ کر کہا۔

''ہمارے جیسے گھرانوں میں مر ہی جاتا ہے۔'' زینب نے ناراض ہو کر کہا۔

''روز روز کے مرنے سے ایک دن کا مر جانا بہتر ہے۔'' رمشہ نے اسی انداز میں کہا۔

''تم یہ سب نہیں سمجھ سکتیں رمشہ! کیونکہ یہ تمہاری زندگی کے مسئلے نہیں ہیں۔ اور ہماری ہماری ساری زندگی ان ہی مسئلوں کے ساتھ گزرتی ہیں۔'' زینب نے بے حد مایوسی سے کہا۔

''خیر۔ تم تو یہ مت کہو۔'' رمشہ نے بات کاٹی۔ ''کم از کم تمہیں ایسے کسی مسئلے کا سامنا نہیں کرنا ہوگا شیراز جیسا جان چھڑکنے والا میاں ہوگا تمہارا۔ افسر کی بیوی بن کر شان دار سے بنگلے میں رہو گی تم۔ سرکاری گاڑی میں گھوما کرو گی۔''

وہ اب اسے چئیر اپ کرنے کے لیے موضوع بدل رہی تھی۔ مگر رمشہ نے نوٹ کیا کہ ہمیشہ کی طرح آج شیراز کے ذکر پر زینب کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح افسردہ اور رنجیدہ تھی۔

''شیراز کا کیا حال ہے؟'' رمشہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہے وہ۔'' اس نے اسی طرح سر جھکائے رمشہ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

''تمہارا اور اس کا کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟'' رمشہ کو شک ہوا۔

''تمہیں پتا ہے، میں ان سے جھگڑا نہیں کر سکتی۔'' زینب نے بے چارگی سے کہا۔

''ہاں... جانتی ہوں۔ مگر وہ تو ناراض ہوتا رہتا ہے۔''

''پھر ناراض ہو گیا ہے کیا؟'' رمشہ اس کے ذریعے شیراز کے مزاج کو بہت اچھے طریقے سے سمجھنے لگی تھی۔

''نہیں۔ ناراض نہیں ہوئے۔ لیکن بعض دفعہ وہ بہت عجیب باتیں کرتے ہیں۔'' زینب نے بے چین ہو کر کہا۔

''کیسی باتیں؟''

''ابو کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، وہ بے وقوف ہیں جو رشوت نہیں لیتے۔ سارے مسئلے اسی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں۔''

''وہ آہستہ آہستہ رمشہ کو ساری باتیں بتاتی گئی۔ رمشہ بے حد سنجیدگی سے اس کی بات سنتی رہی۔

''میں نے تو کبھی یہ خواہش نہیں کی ہے کہ میں بڑے گھر میں رہوں یا میرے پاس گاڑی ہو یا بہت سارا پیسہ ہو، میں تو اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔'' وہ بے حد رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ چیزیں نہیں ہیں تو کون سی کمی ہے اور اگر یہ سب کچھ آ جائے گا تو کیا فرق پڑ جائے گا۔''

''تمہارا منگیتر واقعی بعض دفعہ بے وقوفی کی باتیں کرتا ہے، تم ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے انہیں نکال دیا کرو۔'' رمشہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''جس بات سے مجھے تکلیف ہو، میں وہ ذہن سے نہیں نکال سکتی۔''

زینب نے مدھم آواز میں کہا۔ وہ رمشہ کے کارپٹ پر بیٹی انگلی سے کارپٹ پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔

''مجھے اچھا نہیں لگتا اگر کوئی ابو کو برا کہے اور شیراز بعض دفعہ ابو کا بہت مذاق اڑاتے ہیں۔''

اس کی آواز میں چبھن تھی۔ ''سارے مرد ایسا ہی کرتے ہیں، داماد اور سسر کا رشتہ اسی طرح کا ہوتا ہے۔ تم اتنا مت سوچا کرو۔''

رمشہ نے بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔ زینب نے جواب نہیں دیا، وہ اسی طرح کارپٹ پر لکیریں کھینچتی رہی۔

''اب رونا مت زینی۔'' رمشہ نے جیسے اس کے اگلے قدم کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''تم زہرہ سے زیادہ شیراز کی باتوں کی وجہ سے پریشان ہو؟''

''نہیں، پتا نہیں، اب مجھے گھر بھجوا دو۔ دیر ہو رہی ہے۔''

زینب کو یک دم خیال آیا اور ساتھ ہی گلی میں تنگ کرنے والے اس لڑکے کا۔ اس کے سر میں یک دم درد ہونے لگا۔ چند لمحوں کے لیے

اسے زندگی واقعی عذاب لگنے لگی تھی۔

''میں ابھی کچھ دن کالج نہیں آؤں گی رمشہ۔'' زینب نے کھڑے ہوتے ہوئے بیڈ پر رکھی اپنی چادر اٹھائی۔

''کیوں ؟'' رمشہ نے انٹرکام اٹھاتے ہوئے حیرانی سے پوچھ وہ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

''مجھے اس لڑکے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ اب بہت زیدہ بے ہودہ باتیں کرنے لگا ہے۔ کچھ دن کالج نہیں جاؤں گی تو شاید وہ میرے پیچھے آنا چھوڑ دے۔'' زینب نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں چادر اوڑھتے ہوئے کہا۔

''تم انکل کو کیوں نہیں بتاتیں۔ بلکہ ایسا کرو سلمان کو بتادو۔'' رمشہ نے قدرے خفگی سے کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ میٹرک میں پڑھتا ہے۔ کیا کہوں اس سے کہ میرے پیچھے کوئی لڑکا آنے لگا ہے۔ تم جا کر لڑو اس سے۔ اور پھر وہ خود اس وقت اسکول میں ہوتا ہے، میرے لیے اسکول جانا چھوڑ دے گا؟ اور ابو، وہ شام کو گھر آتے ہیں۔ وہ کتنے دن میرے لیے آفس سے آ کر گلی میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس لڑکے کو منع کریں گے تو وہ کوئی زیدہ بدتمیزی بھی تو کر سکتا ہے۔''

''زینب! اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ سمجھیں۔ دو تھپڑ کھینچ کر مارو۔ اسے چار گالیاں دو۔ پھر دیکھو، کیسے دم دبا کر بھاگتا ہے وہ۔ میں آج اپنے ڈرائیور کو بھیجوں گی تمہارے ساتھ۔ کہوں گی اس سے کہ راستے میں کوئی نظر آئے تو ادھر ہی ٹھکائی کرے اس کی۔ پھر دیکھتی ہوں، کون تنگ کرتا ہے تمہیں دوبارہ۔''

''خدا کے لیے رمشہ، تمہارا ڈرائیور میرے پیے اس لڑکے کو گلی میں پیٹے گا تو پورا محلہ باہر نکل آئے گا۔ لوگ کیا سمجھیں گے، وہ کوئی ڈیفنس نہیں ہے رمشہ، محلہ ہے۔ تم ڈرائیور رہنے دو۔ میں پیدل ہی چلی جاتی ہوں۔'' زینب اس کے ارادے کو جان کر یک دم خوف زدہ ہو گئی تھی۔

''تم بھی جو ہو نا بس... اچھا ٹھیک ہے، نہیں کرے گا کچھ بھی میرا ڈرائیور، بس تمہارے گھر کے دروازے تک چھوڑ آئے گا۔'' رمشہ نے ہلکی سے خفگی سے ساتھ کہا۔

وہ زینب کو لے کر باہر پورچ میں آ گئی۔ اس سے پہلے کہ زینب گاڑی میں بیٹھتی، گیٹ سے ایک اور گاڑی اندر آنے لگی۔

''یہ فاران بھائی کہاں سے آ گئے۔ اس وقت؟'' رمشہ نے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''فاران بھائی؟'' زینب نے پوچھا۔

''ہاں کزن ہیں میرے۔ بڑے تایا کے بیٹے'' رمشہ نے بتایا۔ فاران کی گاڑی تب تک پورچ میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''ہیلو فاران بھائی۔'' رمشہ نے فاران کے گاڑی سے نکلتے ہی کہا۔

''اوہ ہیلو — یہ میرے استقبال کے لیے آئی ہو باہر؟'' فاران نے بے حد خوش مزاجی سے رمشہ سے کہتے ہوئے سرسری نظروں سے زینب کو دیکھا۔ اور پھر وہ نظریں نہیں ہٹا سکا۔

''جی نہیں۔ میں اپنی دوست کو گاڑی تک چھوڑنے آئی ہوں۔ زینی! یہ فاران بھائی اور فاران بھائی! یہ میری بیسٹ فرینڈ زینی۔'' رمشہ

نے دونوں کا تعارف کروایا۔

''السلام علیکم!'' زینب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ رسماً کہا۔ رمشہ کے گھر اکثر اوقات اس کی ملاقات اس کے کسی نہ کسی کزن سے ہوتی رہتی تھی۔''

''اچھا زینب! میں کچھ دنوں تک چکر لگاؤں گی۔ تمہاری طرف۔ نوٹس میں تمہیں بھجواتی رہوں گی۔ ڈرائیور کے ہاتھ۔'' رمشہ نے اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی رمشہ نے بے حد ناراضی سے فاران کی طرف دیکھا۔

''حد ہے فاران بھائی۔ اس طرح گھور رہے تھے اسے۔ کیا سمجھ رہی ہوگی وہ؟''

''اب مجھے کیا پتا تھا رمشہ کہ تمہاری بیسٹ فرینڈ اتنی خوبصورت ہے۔ کون ہے یہ؟''

فاران کی نظریں ابھی بھی گیٹ سے باہر نکلتی گاڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ رمشہ نے حیرانی سے اس کو دیکھا تھا۔

کمرے میں بیٹھے ہوئے تینوں مرد پلکیں جھپکائے بغیر سانس روکے بے حس و حرکت سامنے اسکرین پر ابھرتے بدلتے اور غائب ہوتے اس چہرے کو دیکھتے رہے۔

اسکرین پر آخری تصویر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ اس لڑکی کے چہرے کا کلوز اپ تھا۔ اسکرین پر نظر آنے والی خوبصورت آنکھیں اب جیسے ان تینوں مردوں پر جمی ہوئی تھیں۔

تبریز پاشا نے سامنے پڑی میز پر رکھا شراب کا گلاس اٹھا کر بے اختیار ایک گھونٹ لیا۔ اس نے پچھلے تیس سالوں میں اس انڈسٹری میں بیس ہیروئنیں متعارف کروائی تھیں۔ ان میں سے نو نے اپنے اپنے زمانہ میں انڈسٹری پر راج کیا تھا۔ مگر ان میں سے کسی ایک کو کسی بھی حالت میں دیکھ کر اس کی "وہ حالت" نہیں ہوئی تھی جو اس وقت ہو رہی تھی۔

اس نے اسکرین پر نظر آنے والے چہرے سے زیادہ "خوبصورت چہرہ" اپنے پینتیس سالہ فلمی کیریئر میں نہیں دیکھا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ وہ پاکستان کے سب سے پرانے فلم اسٹوڈیو کا مالک تھا۔ جس کے خاندان کا آبائی پیشہ ہی فلمیں بنانا تھا۔ ہر سال پاکستان میں بننے والی سب سے مہنگی فلم بہت سالوں سے پاشا پروڈکشنز ہی بنا رہا تھا۔ اسے پاکستانی فلم انڈسٹری کا شومین کہا جاتا تھا۔

تبریز پاشا کی فلم باکس آفس پر منافع کماتی یا نہیں مگر کبھی بھی نقصان میں نہیں جاتی تھی۔ وہ اپنی لاگت پوری کر لیتی تھی اور تبریز پاشا نے جن 67 فلموں کو پروڈیوس کیا تھا ان میں سے کسی ایک نے بھی اسے ایک روپیہ کا نقصان نہیں دیا تھا۔ فلم انڈسٹری میں کوئی تبریز پاشا سے بڑھ کر اپنے ڈائریکٹر ہیرو اور ہیروئن کے نخرے نہیں اٹھاتا تھا اور تبریز پاشا سے بڑھ کر کوئی اپنے ڈائریکٹر ہیرو اور ہیروئن کو نگام میں ڈال کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ صرف پاشا پروڈکشنز کے سیٹس پر ہیرو وقت پر پہنچتے تھے۔ صرف پاشا پروڈکشنز کے سیٹس پر بڑی سے بڑی ہیروئن بھی بلا چوں چرا ہر وہ کاسٹیوم پہن لیتی تھی جو اسے پہننے کے لیے دیا جاتا تھا چاہے وہ کتنا ہی عامیانہ اور غیر مناسب کیوں نہ ہوتا اور صرف پاشا پروڈکشنز کی فلم کو ڈائریکٹر اسی وقت میں مکمل کر کے دیتا تھا جو وقت وہ کانٹریکٹ میں لکھتا تھا۔

انور حبیب کا... گلاس اسی طرح میز پر دھرا تھا اس نے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔ وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ اسکرین پر ایک ٹک نظریں جمائے مسلسل اس تمباکو والے پان کو چبا رہا تھا جو اس نے تیس منٹ پہلے منہ میں رکھا تھا اور زندگی میں پہلی بار وہ پان کی پیک تھوکنا بھول گیا تھا۔

وہ پاکستان فلم انڈسٹری کا سب سے "بڑا" اور "کامیاب" ڈائریکٹر تھا کیونکہ اس کا ہاتھ اس عوام کی نبض پر تھا جو سینما جاتی تھی اور یہ صرف انور حبیب جانتا تھا کہ وہ "کب، کیا، کس طرح" دیکھیں گے اور وہ انہیں "جب، جو، جس طرح" دکھاتا تھا "عوام" دیکھتے تھے۔ اور اسی "عوام" کی پسندیدگی نے انور حبیب کو پاکستان فلم انڈسٹری کا پہلا "لکھ پتی" ڈائریکٹر بنایا تھا۔ اس نے اپنے پندرہ سالہ کیریئر میں 155 فلمیں ڈائریکٹ کی تھیں۔ پہلی فلم ڈائریکٹ کرنے کے لیے اس نے چھ سال انڈسٹری کے ہر چھوٹے بڑے پروڈیوسر کی منتیں کی تھیں اور پھر ایک پروڈیوسر کی فلم کو بلا معاوضہ ڈائریکٹ کیا تھا۔ جو اپنی پچاس لاکھ کی بلیک منی کو وائٹ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی پہلی فلم تھی۔

اپنی 155ویں فلم ڈائریکٹ کرنے کے لیے اس نے ایک پروڈیوسر کو منہ مانگی قیمت لے لینے کے باوجود بھی تین سال تک خوار کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ پروڈیوسر خوش تھا کیونکہ اس کی فلم نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا تھا۔ انور حبیب کی فلمیں جمالیاتی اعتبار سے فلم انڈسٹری کی تاریخ کی بدترین اور بزنس کے اعتبار سے کامیاب ترین فلموں میں شمار ہوتی تھیں اور انور حبیب کو ان دونوں باتوں پر فخر تھا۔ وہ اسکرین پر بے حد کم صورت اور بھدی سے بھدی ہیروئن کو بھی قیامت خیز انداز میں پیش کرتا تھا۔ مگر تین منٹ میں اس اسکرین پر اس نے پاکستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ کا خوبصورت ترین جسم دیکھا تھا، اس بات میں اسے ایک لحظہ کے لیے بھی شبہ نہیں تھا۔

سفیر خان نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں اٹکے سگریٹ کو بے اختیار ہاتھ سے جھٹکا۔ وہ اس کی انگلیوں کو جلانے لگا تھا۔ زندگی میں پہلی بار چین اسموکر ہونے کے باوجود اس نے اسگریٹ سلگا کر ایک بھی کش لیے بغیر اسے راکھ کر دیا تھا۔ اسکرین پر نظریں جمائے نیم تاریکی میں فرش پر پڑے سگریٹ کے سلگتے ٹکڑے کو جوتے سے ٹٹول کر اس نے بغیر دیکھے مسلا۔

اپنے دس سالہ فلمی کیریئر میں انڈسٹری کی ہر چھوٹی سے بڑی اداکارہ کے ساتھ انوالو ہونے کے باوجود وہ دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے اسکرین پر نظر آنے والی عورت سے زیادہ خوبصورت اور دلکش عورت اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

سفیر خان پچھلے دس سالوں سے فلم انڈسٹری کا بوجھ تن تنہا اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ ایک سپر اسٹار کا بیٹا تھا اور اپنے منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ وہ چوبیس سال کی عمر میں اپنے باپ کی تیار کردہ پہلی فلم میں ہیرو کے طور پر آیا تھا اور وہ فلم بری طرح فلاپ ہوئی، یہ سلسلہ وہیں ختم نہیں ہوا۔ اگلا پورا سال وہ ایک کے بعد ایک فلاپ فلم دیتا رہا اور اس سے پہلے کہ وہ مایوس اور دل برداشتہ ہو کر فلم انڈسٹری چھوڑ دیتا۔ انور حبیب نے اسے تبریز پاشا کی ایک فلم میں ڈائریکٹ کیا تھا اور وہ ایک بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ اس فلم نے نہ صرف سفیر خان کی فلموں کی ناکامی کے سلسلے کو ختم کر دیا تھا بلکہ اس کے اس امیج کو بھی ہمیشہ کے لیے بدل دیا تھا جو وہ لے کر فلم انڈسٹری میں آیا تھا۔ پچھلے دس سال میں اس نے ساڑھے تین سو فلموں میں کام کیا تھا۔

تبریز پاشا، انور حبیب اور سفیر خان پاکستانی فلم انڈسٹری کے تین اہم ترین برج تھے۔ ان میں سے جو بھی جب چاہتا انڈسٹری کے کسی بھی بڑے چھوٹے، ایکٹر یا ایکٹریس کا کیریئر چٹکی بجاتے میں ختم کر دیتا۔

پاشا پروڈکشنز کی کسی فلم میں کام کیے بغیر انڈسٹری کی کوئی ایکٹریس سپر اسٹار نہیں بن سکتی تھی۔ انور حبیب کی فلم میں صرف وہ ایکٹریس ہوتی تھی جسے وہ چاہتا تھا اور سفیر خان جس ایکٹریس کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیتا۔ وہ مین لیڈ سے سیکنڈ لیڈ پر آتی پھر ایک دو سالوں میں انڈسٹری سے گمنامی کے اندھیروں میں غائب ہو جاتی۔

وہ تینوں اس انڈسٹری کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اور وہ تینوں یہ بات بخوبی جانتے بھی تھے۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی تین مردوں کا کوئی Trio اتنا طاقتور نہیں ہوا تھا۔ اور ان کی اس طاقت نے انہیں بلیک میلر بنا دیا تھا۔ وہ تینوں انڈسٹری میں اگر کسی سے دبتے یا کسی کا خاظ کرتے تھے تو وہ ایک دوسرے کا ہی لحاظ تھا۔ اور یہ لحاظ سے زیادہ ضرورت کا عنصر تھا جو ان تینوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر مجبور کرتا تھا۔

تبریز پاشا کو اپنی فلم کی کامیابی کے لیے سفیر خان کے نام اور انور حبیب کے کام کی ضرورت تھی۔ سفیر خان جانتا تھا کہ وہ پاشا پروڈکشنز کی فلم میں کام نہیں کرے گا تو تبریز پاشا "پاشا پروڈکشنز" کی فلموں سے اس کے مدمقابل کوئی اور حریف لا کھڑا کرے گا اور انور حبیب جانتا تھا کہ "پاشا پروڈکشنز" جتنا پیسہ اور سہولیات فلم انڈسٹری کا دوسرا کوئی ادارہ نہیں دے سکتا اور سفیر خان کا متبادل کم از کم اگلے دس سال میں اُسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ فلمیں دیکھنے والے سفیر خان پر جان دیتے تھے۔

اس کمرے میں سفیر خان اپنی 351 ویں فلم انور حبیب اپنی 156 ویں فلم اور تبریز اپنی 67 ویں فلم کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ اور اسکرین پر نظر آنے والی وہ لڑکی اپنی پہلی فلم کے آڈیشن کے لیے منتخب ہونے والی تھی۔

"پھر؟" تبریز پاشا نے کمرے کی لائٹ آن کرتے ہوئے انور حبیب اور سفیر خان کی طرف باری باری دیکھا۔ کمرے میں پھیلنے والی روشنی نے اسکرین پر نظر آنے والے چہرے کو کچھ دھندلا کر اس کی جادہ کاریوں کو قدرے کم کر دیا تھا۔

"اسے آڈیشن کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ انڈسٹری میں آئے گی تو انڈسٹری کے بڑے بڑے برج الٹا کر رکھ دے گی۔"

انور حبیب نے پہلی بار پان کی پیک تھوکتے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ انڈسٹری کی ہیروئنز کی طرف تھا۔

تبریز پاشا اور سفیر خان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

انور حبیب نہیں جانتا تھا۔ وہ کمرے میں بیٹھے انڈسٹری کے تینوں بے تاج بادشاہوں کی قسمت کا حال بتا رہا تھا۔ اسکرین پر نظر آنے والی لڑکی واقعی تینوں بڑے برجوں کو الٹانے آئی تھی۔

☆☆☆

سلطان کو چند لمحوں کے لیے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ منہ کھولے وہ بے یقینی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی پنڈلی کے گرد سینڈل کے ان اسٹریپس کو لپیٹنا بھول گیا جنہیں چند لمحوں پہلے وہ بڑے انہماک شوق اور محبت کے ساتھ لپیٹ رہا تھا۔

وہ خاموش نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اب بڑی سہولت کے ساتھ جھک کر ان اسٹریپ کو خود لپیٹنا شروع کر دیا تھا۔ سلطان اس کے پیروں کے پاس کارپٹ پر کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھا اسی ہکا بکا انداز میں پری زاد کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ پچھلے آٹھ سالوں سے دن رات اس کے ساتھ تھا اور پچھلے آٹھ سالوں میں اس نے سینکڑوں بار اسے اسی طرح چونکا دیا تھا۔ آٹھ سال کے طویل عرصے کے بعد اب سلطان کو یقین تھا کہ وہ اسے مزید حیران اور پریشان نہیں کر سکتی کیونکہ وہ پری زاد کو اندر باہر سے جان گیا تھا۔

لیکن اس وقت اس کے سامنے بیٹھے وہ اپنے آپ کو احمق سمجھ رہا تھا۔ پری زاد کے بارے میں انڈسٹری جو کہتی تھی، ٹھیک کہتی تھی۔

صرف پانچ منٹ پہلے ہی تو اس کے سرخ کیوٹکس سے رنگے ہوئے بے داغ ناخنوں کو دیکھتے ہوئے وہ اس کے پیروں پر قربان ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ ہر بار اسی شوق اور لگن کے ساتھ پری زاد کے پیروں میں جوتے پہناتا تھا۔ اور اس پر رشک کرتا تھا وہ کسی بیلے ڈانسر کے پیروں کی طرح نازک، خم دار اور دودھیا تھے۔ سلطان نے شراب کے نشے میں بہت سے مردوں کو اس کے پیروں کو چومتے دیکھا تھا اور اسے فخر تھا کہ وہ روز ان

پیروں میں جوتے پہنایا کرتا تھا۔

وہ اب اسٹریپس بند کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوگئی تھی۔ اپنی سرخ ساڑھی کو سنبھالتے ہوئے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی سلطان اب بھی اسی طرح کارپٹ پر بیٹھا سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آئینے میں خود پر تنقیدی نظریں ڈالتے ہوئے اپنی ساڑھی ٹھیک کر رہی تھی۔

کمرے میں پڑا انٹرکام بجنے لگا تھا۔ سلطان چونک گیا پھر اٹھ کر انٹرکام کی طرف گیا۔ وہ اسی طرح آئینے میں اپنی ساڑھی کو ٹھیک کرتے ہوئے بولتی رہی۔

چوکیدار نے انٹرکام پر سلطان کو "کسی" کی آمد کی اطلاع دی۔ سلطان انٹرکام کا ریسیور ہاتھ میں لیے پری زاد کو اس آمد کی اطلاع نہیں دے سکا۔ وہ آئینے سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بولنے سے پہلے ہی اس سے کہہ رہی تھی۔

"اسے اندر آنے دو۔ میں نے تم سے کہا تھا نا وہ وقت سے پہلے یہاں پہنچ جائے گا۔"

سلطان جان نہیں سکا اس کے لہجے میں کیا تھا۔ اس نے انٹرکام پر چوکیدار کو ہدایت دی پھر ریسیور رکھ دیا۔

"یہ مت کریں۔" وہ ریسیور رکھتے ہی پری زاد کی طرف آیا تھا۔ پری زاد نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

وہ "دوپہر" سے اس "ملاقات" کی تیاری کر رہی تھی۔ سلطان اس کی بے چینی کو سمجھتا تھا اور جانتا تھا۔ پری زاد "کب" سے اس ملاقات کی تیاری کر رہی تھی۔ یہ پری زاد کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

"یہ مت کریں۔" سلطان ایک بار پھر گڑگڑایا۔

"کیوں؟" وہ مسکرائی۔ "تمہیں مجھ پر ترس آ رہا ہے یا اس پر؟"

"نو سال لگائے ہیں یہ فلمی کیریئر بنانے میں آپ نے۔ آپ اس طرح کی کوئی چیز سوچ بھی کیسے سکتی ہیں۔"

وہ اب اسے پتہ نہیں کیا کیا یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں سلطان؟"

اس نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے یک دم، مڑ کر مسکراتے ہوئے سلطان سے پوچھا۔ وہ آٹھ سال سے اس کے ساتھ تھا۔ ان آٹھ سالوں میں اسے ایک موقع بھی یاد نہیں آیا جب پری زاد نے اس سے یہ سوال کیا ہو پری زاد کیسی لگتی تھی، پری زاد یہ جانتی تھی۔

اس نے پری زاد سے پہلے انڈسٹری کی دو بڑی ہیروئنز کے ساتھ تیرہ سال کام کیا تھا۔ وہ دونوں بھی انڈسٹری کی خوبصورت ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھیں۔ مگر وہ دن میں کئی کئی بار سلطان سے یہ سوال کرتی تھیں اپنی مرضی کا جواب سننے کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوتی تھیں وہ کہیں جانے کے لیے پندرہ بار اپنی وارڈ روب سے کپڑے نکالتیں، ہر بار غیر مطمئن ہوتے ہوئے انہیں واپس رکھ دیتیں۔ دس دس جوتے پاؤں میں بدلنے کے باوجود اپنے پاؤں کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتی تھیں۔ پندرہ پندرہ بار اپنی جیولری بدلتیں اور پچیسوں بار اپنا میک اپ ٹھیک کرتیں پھر بھی انہیں اپنے چہرے

اور جسم پر موجود دوسرے لوازمات میں کوئی نہ کوئی چیز ٹھیک نہیں لگتی کوئی نہ کوئی چیز پریشان کرتی رہتی۔ چہرے کے کسی نہ کسی حصے پر کمپیکٹ پاؤڈر سے پلٹنگ کی ضرورت پڑتی تھی۔ آنکھوں کا آئی لائنر کہیں نہ کہیں سے نامناسب لگتا ہی رہتا۔

پری زاد وارڈروب کھول کر ہاتھ میں آنے والا پہلا لباس پہن لیتی۔ بعض دفعہ یہ کام بھی سلطان ہی انجام دیتا وہ اپنی مرضی سے اس کے لیے کپڑے نکال دیتا اور وہ دوسری نظر ڈالے بغیر اس لباس کو پہن لیتی۔ سلطان ہی اس کے لیے میچنگ جیولری اور جوتے نکالتا تھا۔ اور پری زاد کو بھی ان پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ سلطان نے ایک بار اس سے یہ کہہ ہی دیا تھا۔

”جس مرد سے شادی کا ارادہ ہوگا اس کے لیے تیار ہوتے ہوئے گھنٹے لگاؤں گی۔ درجنوں ملبوسات کو رد کر کے کسی ایک لباس کا انتخاب کروں گی۔ جوتے بدل بدل کر دیکھوں گی اور صرف وہ زیور پہنوں گی جو اس نے مجھے دیا ہوگا۔“ اس نے ہنس کر کہا تھا۔

”جن کے لیے اب تیار ہوتی ہوں، یہ تو کیڑے مکوڑے ہیں۔“ اس نے اسی سانس میں کہا تھا۔

”لیکن تم فکر مت کرو، پری زاد کسی سے شادی نہیں کرے گی۔“

اس نے ایک بار پھر ہنس کر سلطان سے کہا تھا۔ سلطان نے اسے مذاق سمجھا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا پری زاد مذاق بہت کم کیا کرتی تھی۔

آج پری زاد کو تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر سلطان کو ایک لمحے کے لیے کچھ شبہ ہوا اس کی وہی بات یاد آئی وہ وارڈروب کھولے کھڑی کپڑوں پر نظر ڈال رہی تھی۔ اور کسی لباس سے مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر یک دم مڑ کر اس نے سلطان سے کہا۔

”آؤ سلطان! ساڑھی خریدنے چلیں۔“ وہ اسے لے کر ایک بڑے ڈیزائنر کے بوتیک پر آ گئی۔ وہاں اس نے پہلی ہی نظر میں پسند آنے والی وہ سرخ سلک کی ساڑھی خریدی جس کے ساتھ بیک لیس بے حد مختصر سا سرخ رنگ کا بلاؤز تھا۔ سلطان کو حیرت ہوئی جب پری زاد نے اس ساڑھی کے ساتھ میچنگ میں ملنے والی سرخ سینڈلز کے بجائے اسی بوتیک میں پڑے ایک اور لباس کے ساتھ رکھی لمبے اسٹریپس کی سینڈل لی۔ ساڑھی نے اس کے پاؤں کو چھپا لینا تھا پھر وہ ان جوتوں کو کیوں خرید رہی تھی۔ سلطان کی سمجھ سے باہر تھا۔

پینتیس ہزار کی ساڑھی اور پانچ ہزار کے جوتے کی ادائیگی پری زاد نے اس کریڈٹ کارڈ سے کی تھی جس کے بلز چیمبر آف کامرس کے صدر کو بھیجے جاتے تھے۔

اور اب وہ اسی ساڑھی میں ملبوس وہی جوتے پہنے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ڈی بیئرز کے وہ ڈائمنڈ سٹڈز اور نیکلس پہن رہی تھی۔ جو اسے پچھلے ہفتے رحیم یار خان میں متحدہ عرب امارات کے شاہی خاندان کے ایک فرد نے اپنے محل میں تین روزہ قیام کے بعد روانہ ہوتے وقت دیے تھے۔

اپنے Streaked بالوں کو سر کی پشت پر ایک، بہت سادہ لیکن بہت خوبصورت تراشیدہ انداز کے جوڑے میں لپیٹے پانچ فٹ سات انچ کی وہ قیامت کسی اور کے لیے قیامت اٹھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

سلطان نے اس کے ”میں کیسی لگ رہی ہوں؟“ کا جواب نہیں دیا تھا۔ پری زاد نے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ اسی طرح پلٹ کر پھر آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے نیکلس پہننے لگی تھی۔ وہ واضح طور پر سلطان کی درخواست کا مذاق اڑا رہی تھی۔

نیکلس کو گردن کی پشت کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر نیکلس کے دونوں حصوں کو ہاتھوں سے پکڑے دائیں ہاتھ کی انگلی کو دو تین بار گردن کی پشت پر ہلکے سے مارا۔ یہ سلطان کے لیے مدد کا اشارہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پری زاد کے ہاتھوں سے نیکلس پکڑتے ہوئے اسے اس کی راج ہنس جیسی گردن کی پشت پر بند کر دیا۔ اس کے اتنے قریب کھڑے سلطان نے اس کے جسم سے اٹھتی ایسٹی لاڈر کی مہک کو محسوس کیا۔ چھ انچ اونچی ہیل پہنے وہ اس وقت اس سے آدھ فٹ اونچی تھی۔ سلطان کو اسے گردن اوپر کر کے دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ بیک لیس اور سلیو لیس بلاؤز میں سے نظر آتے اس کے بے داغ دودھیا جسم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کو اگر چھونے کو دل چاہتا تھا تو یہ باعث حیرت نہیں تھا۔ فلم انڈسٹری میں نو سال سے راج کرنے اور دن رات کام کرنے کے باوجود پری زاد آج بھی ہوش ربا تھی۔ وہ اس حسن کے ساتھ انڈسٹری میں اگلے دس سال بھی اسی طرح راج کر سکتی تھی۔ اسے دور دور تک کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ خطرے کو خطرہ بننے سے پہلے ہی ختم کر دیا کرتی تھی۔

سلطان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں دبا لیا وہ اس کے آٹھ سال کی محنت کو مٹی میں ملانے جا رہی تھی۔

''میں یہ سب نہیں ہونے دوں گا۔'' سلطان نے بے ساختہ اس کے عقب میں کھڑے ہو کر کہا۔ اپنے جسم پر ہیوگو باس کا اسپرے کرتے پری زاد کا ہاتھ ایک لمحہ کے لیے رکا پھر ڈریسنگ ٹیبل پر بوتل رکھتے ہوئے وہ پلٹ کر سلطان کے مقابل آ گئی۔

''تم نہیں کرو گے تو کوئی اور کرے گا۔ پری زاد کو جو کروانا ہے، وہ کروا لے گی۔'' اس کا لہجہ سرد اور چیتھا دینے والا تھا۔ سلطان کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ وہ اس کے سامنے سے ہٹ کر بیڈ کی طرف آئی۔ اور وہاں پڑا چھوٹا سا پرس اٹھا لیا۔ سلطان کی طرف دیکھے بغیر وہ بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف جانے لگی۔ سلطان لپک کر اس کے سامنے آیا۔ اس نے پری زاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔ ایک آخری کوشش۔

''مت کریں پری جی! مت کریں، میں آپ کو تباہ ہونے نہیں دوں گا۔'' اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔

''تمہیں لگتا ہے میں تباہ ہونے جا رہی ہوں؟ غلط فہمی ہے تمہاری۔ اس وقت آٹھ بج رہے ہیں۔ میں رات کے دو بجے اسی بیڈ روم میں بیٹھی تمہارے ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں گی۔ اگر تم ویسا کرو گے جیسا میں کہہ رہی ہوں تو اور اگر تم یہ نہیں کرو گے تو جب میں رات کے دو بجے یہاں آؤں گی تو مجھے تمہاری شکل نظر نہیں آنا چاہیے۔ نہ آج نہ دوبارہ کبھی۔''

وہ بے حد پرسکون انداز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ پری زاد نے اسے دھکیلا پھر بڑے پیار سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے سلطان کا گال تھپتھپایا، وہ دنیا میں کسی مرد کسی عورت پر اعتماد نہیں کرتی تھی۔ صرف سلطان پر کرتی تھی کیونکہ اس کا تعلق ان دونوں اصناف سے نہیں تھا۔

دروازہ کھول کر ''قیامت'' کمرے سے چلی گئی اس نے مڑ کر ایک بار بھی سلطان سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ وہ جانتی تھی وہ کیا کرے گا۔ سلطان بھیگی ہوئی آنکھوں اور گالوں کے ساتھ بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ چند منٹوں بعد اس نے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہو کر جانے کی آواز سنی۔ وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ بیڈ کے پاس آیا۔ سائیڈ ٹیبل سے موبائل فون اٹھا کر وہ اس نمبر پر کال کرنے لگا۔ آج کی رات پاکستان فلم انڈسٹری پر بہت بھاری ہونے والی تھی۔

☆☆☆

شوکت زماں اسے پچھلے پندرہ منٹ سے گالیاں دے رہا تھا۔ پہلے پنجابی پھر اردو، اب انگریزی میں۔ وہ کچن میں مصروف تھا۔ لیکن شوکت زماں کی آواز اس تک بخوبی پہنچ رہی تھی۔ شوکت زماں کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ ٹرے میں سوپ کے پیالے رکھنے لگا۔ لاؤنج عبور کر کے کمرے کے کھلے دروازے سے اندر آیا تو وہ اسے فرنچ میں گالیاں دینا شروع کر چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا۔ وہ اب جلد ہی چپ ہونے والا تھا۔ اس کی فرنچ اچھی تھی نہ اس میں اس کی گالیوں کا ذخیرہ الفاظ۔

شوکت زماں اب خاموش ہو کر ہانپ رہا تھا یا پسینے کی وجہ سے خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے ٹرے صوفے کے پاس پڑی سینٹر ٹیبل پر رکھی اور اس میں سے پہلا پیالہ اٹھا کر بیڈ پر اس کے پاس لے آیا۔

''تو آخر جاتا کیوں نہیں یہاں سے؟ کتے کی طرح میرے گھر کیوں پڑا ہوا ہے تو کیا سمجھتا ہے میں تجھے کچھ دوں گا؟ ایک پینی تک نہیں ملے گی تجھے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تیرے دل میں کتنا لالچ ہے۔''

گالیوں کے بعد وہ اسی طرح کی گفتگو کرتا تھا۔ اس نے حسب معمول پہلا پیالہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ شوکت زماں نے ہمیشہ کی طرح پہلا پیالہ اٹھا کر پوری قوت سے فرش پر پھینکا۔ وہ مطمئن ہو کر واپس سینٹر ٹیبل کی طرف مڑ گیا۔

''وصیت لکھوا دی ہے میں نے وکیل کو ہر چیز خیرات میں بانٹ دی ہے میں نے، یہ گھر، میرے گیس اسٹیشن، سپر اسٹور، بینک اکاؤنٹ سب کچھ، اس گھر کا فرنیچر تک میں نے اولڈ ہوم کو دے دیا ہے۔ اس کتیا، اس کے بچوں اور تیرے لیے ایک تنکا تک نہیں چھوڑا میں نے تم سب کو بھی تو پتا چلے شوکت زماں کیا چیز ہے کیا کر سکتا ہے۔''

دوسرا پیالہ اٹھاتے ہوئے اس نے شوکت زماں کو اردو میں کہتے سنا اس نے پچھلے جملے پنجابی میں کہے تھے۔

وہ دوسرا پیالہ لے کر اس کے سامنے آ گیا۔ اس بار پیالہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے بجائے اس نے اس پیالے کو کھڑے کھڑے شوکت زماں کی طرف بڑھایا۔ شوکت زماں نے پیالہ اس کے ہاتھوں سے لے کر پوری قوت سے سوپ اس کے سینے پر اچھال دیا اور پیالہ ایک بار پھر فرش پر پھینک دیا۔ وہ چھناکے سے ٹوٹا۔ اس نے اپنے سوپ میں لتھڑے کپڑوں پر ایک نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر ایک بار پھر سینٹر ٹیبل کی طرف بڑھا۔

''میں تم سب کو برباد کر کے رکھ دوں گا۔ پولیس کو اطلاع کروں گا تمہارے بارے میں جھوٹے مقدمے بنواؤں گا تمہارے خلاف۔ تجھے ڈی پورٹ کروا دوں گا۔ اس ملک سے یا پھر ساری عمر جیل میں گزرے گی تمہاری، تمہارا خاندان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے گا، بھیک مانگتے پھریں گے سڑکوں پر۔ تجھے ابھی پتا نہیں شوکت زماں کیا کر سکتا ہے۔''

شوکت زماں اب انگلش میں حلق کے بل چلا رہا تھا۔ وہ تیسرا پیالہ اٹھا کر اس کے پاس چلا آیا، شوکت زماں نے کبھی اسے فرنچ میں نہیں دھمکایا تھا۔ وہ اسے جانتا تھا اسے فرنچ نہیں آتی، وہ فرنچ میں اسے صرف گالیاں دیتا تھا کیونکہ وہاں اپنے چار سالہ قیام کے دوران فرنچ کے جو چند لفظ اس نے سیکھے تھے۔ وہ گالیاں ہی تھیں اور وہ بھی شوکت زماں کی مدد سے۔

وہ تیسرا پیالہ لے کر اس بار شوکت زماں کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ شوکت زماں نے پوری طاقت سے اس کے چہرے پر تھوکا۔ اس نے دائیں بازو کی شرٹ سے اسے صاف کیا، شوکت زماں نے پوری قوت سے اس کے دائیں گال پر تھپڑ مارا۔ پھر بائیں ہاتھ سے تھپڑ مارا۔ اس نے شوکت زماں کو روکنے کی کوشش کرنے کے بجائے سوپ کے پیالے کو پوری قوت سے پکڑے رکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ سوپ گر جائے پھر شوکت زماں کیا پیتا۔

پہلا تھپڑ، دوسرا، تیسرا، چوتھا دو دائیں گال پر دو بائیں گال پر پھر داہنے کندھے پر دائیں ہاتھ کا بھرپور مکا پھر بائیں کندھے پر بائیں ہاتھ کا مکا اور اب اس کے سر کے بالوں کی باری تھی۔ شوکت زماں اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس کے بال کھینچ رہا تھا اور وہ سوپ کے پیالے کو سنبھالے اس Sequence کو دل میں دہرا رہا تھا جس میں شوکت زماں اس کی پٹائی کر رہا تھا۔

شوکت زماں اب قدرے بے دم ہو کر ہانپ رہا تھا۔ اس نے اطمینان کے ساتھ سوپ کے پیالے سے پہلا چمچ بھر کر شوکت زماں کے منہ کی طرف بڑھایا۔ شوکت زماں نے منہ کھول کر سوپ پی لیا۔ اس نے دوسرا چمچ بڑھایا۔ اس نے وہ بھی پی لیا۔ اب اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا اب شوکت زماں آگے کیا کرنے والا تھا۔ اس نے تیسرا چمچ اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا اس نے پیا آنسو اب اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے اس نے چوتھا چمچ بھی پیا وہ اب سسکیاں لینے لگا تھا پانچواں، چھٹا، ساتواں، آٹھواں، نواں چمچ، دسواں چمچ اس سوپ کے پیالے کا آخری چمچ تھا۔

اور شوکت زماں نے اب بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ وہ بلند آواز میں زار و قطار رو رہا تھا۔

"دیکھ لے میری بات مان لے تجھے اللہ کا واسطہ تجھے تیری ماں کا واسطہ مجھ پر ترس کھا رحم کر دیکھ لے تو جو کہے گا میں کروں گا بس مجھ پر ترس کھا۔"

شوکت زماں اب اس کی ٹانگوں سے چپکا گڑگڑاتا ہوا اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے حد رحم بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

اس نے اپنی ساری زندگی میں شوکت زماں سے زیادہ "شریف، رحم دل، باخلاق، بامروت، اعلیٰ ظرف، مہذب، شائستہ اور سخی" انسان نہیں دیکھا تھا۔

ایک گہرا سانس لے کر اس نے شوکت زماں کو دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ شوکت زماں یک دم رونا بھول گیا۔ شاک کے عالم میں کچھ دیر وہ بے حس و حرکت اس کے قدموں میں بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اس کے پیروں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ مزید ایک لفظ بھی کہے بغیر وہ وہیں اس کے قدموں میں کمرے کے فرش پر کسی نوزائیدہ بچے کی طرح گھٹنے اپنے سینے تک سکیڑے کروٹ کے بل یوں فرش پر ڈھے گیا جیسے وہ مر گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد اس نے بیڈ پہ کھڑے ہو کر شوکت زماں کو پھلانگا۔ ابھی اسے کمرے کا فرش صاف کرنا تھا۔ اپنے کپڑے تبدیل کرنے تھے اور رات کے کھانے کے لیے سوپ کے تین پیالے تیار کرنے تھے۔

☆☆☆

کرم علی نے زندگی کا پہلا سفر سترہ سال کی عمر میں ایک جعلی شناختی کارڈ اور جعلی پاسپورٹ پر مچھلیاں پکڑنے والے ایک ٹرالر پر کیا تھا۔ وہ اسی کی دہائی کے پہلے چند سالوں میں غیر قانونی طور پر کویت پہنچنے والے پہلے تین لوگوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے لڑکوں کی عمریں پندرہ سولہ سال تھیں۔ وہ ان تینوں لڑکوں میں سب سے زیادہ صحت مند بھی تھا۔ ان میں سے ایک کو جذام دوسرے کو ٹی بی جبکہ کرم علی کو صرف برص تھا۔ اس کی کمر اور پیٹ پر سفید دھبے تھے۔ لیکن کرم علی جانتا تھا کچھ عرصہ میں وہ پورے جسم پر پھیل جائیں گے۔ اور اس کے بعد کسی عرب ملک کا سفر کرنا اور وہاں پر کام حاصل کرنا بے حد دشوار ہوتا۔ عرب برص کے مریضوں سے نفرت کرتے تھے اور 80 کی دہائی میں ایشیائی ممالک میں برص کا مرض بے حد عام تھا۔

وہ اس ٹرالر پر موجود واحد ”لیگل“ بندہ تھا۔ باقی کے دونوں لڑکوں کے پاس شناختی کارڈ اور پاسپورٹ نہیں تھے۔ وہ یا یہ جعلی کاغذات تیار کرواسکتے تھے یا کویت کے اس غیر قانونی سفر کے لیے ٹرالر والے کو پیسے دے سکتے تھے۔

ان دونوں لڑکوں کی طرح کرم نے بھی ٹرالر والے کو پانچ ہزار روپے دیے تھے۔ اس میں سے پندرہ سو روپے اس نے پچھلے چار سال میں صبح کے وقت اسکول جانے سے پہلے اخبار بیچ کر، سہ پہر کو پھلوں کی ریڑھی لگا کر، شام کو سگنلز پر پھولوں کے گجرے بیچ کر اور رات کو لفافے جوڑ کر جمع کیے تھے۔ ان پندرہ سو میں کچھ رقم سردیوں میں کوئلہ بیچنے، عیدوں پر غبارے بیچنے، چودہ اگست پر جھنڈیاں، جھنڈے بیچنے اور شب برات پر آتش بازی کا سامان بیچنے سے بھی حاصل ہوئی تھی۔ جمع ہونے والی یہ رقم بہت زیادہ ہوتی اگر کرم تیرہ سال کی عمر میں اپنا گھر خود نہ چلا رہا ہوتا۔ اس کے گھر میں ماں باپ سمیت آٹھ افراد تھے اور بدقسمتی سے وہ ماں باپ اور بہن بھائیوں سب سے ”بڑا“ تھا۔ اس کے ماں باپ ذمہ داریوں کو اٹھانے کے اعتبار سے اس سے بعد میں آتے تھے۔

کرم علی کا باپ جہاں داد سال کے بارہ مہینے میں بارہ مختلف کام کرتا تھا اور کسی ایک کام سے بھی اسے اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی جسے وہ ”پان سگریٹ“ کی اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے کے بعد گھر میں دیتا اور گھر کے اخراجات پورے ہوتے۔

شادی کے چودہ سالوں میں صرف شادی کا پہلا سال تھا جب جہاں داد باقاعدگی سے اپنی بیوی کو خرچ دیتا رہا اس کے بعد کرم علی پیدا ہو گیا اور جہاں داد بیٹے کی پیدائش کے بعد شادی کے دوسرے ہی سال جیسے ہر ذمہ داری سے آزاد ہو گیا۔ گھر میں اب اگلی نسل آگئی تھی یعنی دوسرا مرد۔

اگلے تین سال اخراجات کی ذمہ داری جہاں داد کا باپ اٹھاتا رہا۔ کیونکہ جہاں داد کی بیوی اس کی بھتیجی تھی اور اسی کے اصرار پر اس کے بھائی نے اپنی بیٹی کی شادی جہاں داد کو بے حد ناپسند کرنے کے باوجود بھی کردی تھی۔ ان دو سالوں میں جہاں داد کے ہاں دو بیٹیوں کا اضافہ ہوا اور اس کا دل بیوی اور گھر سے مزید اچاٹ ہو گیا۔ اس کے کسی بھائی کے ہاں دو بیٹیاں نہیں تھیں اگر کسی کی دوسری بیٹی ہوئی تھی تو پیدائش کے کچھ عرصہ کے بعد مر گئی اور اب اس کے ہاں دو بیٹیاں ہو گئی تھیں۔ وہ جتنا دکھی ہوتا کم تھا۔ کرم علی پر اب دو بہنوں کی ذمہ داری بھی آگئی تھی۔ کیونکہ جہاں داد کے خاندان میں بہنوں کو ہمیشہ بڑا بھائی ہی بیاہتا تھا۔

اگلے چار سال گھر کے اخراجات جہاں داد کے باپ کی موت کے بعد اس کے بڑے دونوں بھائیوں نے اٹھائے تھے کیونکہ وہ سب ایک

ہی گھر میں اکٹھے رہتے تھے۔ کھانا پینا بھی مشترکہ تھا اور جہاں داد کو لعنت ملامت کرنے کے باوجود اس کے بھائی اس کی بیوی اور بچوں کو ہر ماہ تھوڑی بہت رقم دیتے رہے۔ کرم علی کو اسی زمانے میں اس کے تایا کے بچوں کے ساتھ ایک سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔

پاکستان میں ٹیلی ویژن کی نشریات کا آغاز ہو چکا تھا۔ جہاں داد کے ایک بڑے بھائی کے کمرے میں بھی ایک بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی آ گیا تھا جس نے گھر کی دوسری عورتوں اور بچوں کی طرح جہاں داد کی بیوی کو بھی خواب دکھانے شروع کر دیے تھے۔ پینٹ کوٹ میں ملبوس سگار پیتا، فر فر انگریزی بولتا لمبی گاڑی سے اترنے والا اور ایک بڑے سے گھر میں رہنے والا اونچا لمبا خوب صورت، پڑھا لکھا مرد۔

جہاں داد ان میں سے کسی ایک بھی خوبی کا مالک نہیں تھا۔ اور کسی بھی معیار کو حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ زینت کی نظر گھر کے دوسرے ننھے مرد پر ٹھہر گئی ان میں سے کچھ چیزیں وہ حاصل کر سکتا تھا۔ یوں کرم علی کو جہاں داد کی شدید مخالفت کے باوجود کسی ورک شاپ کی بجائے ایک سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ ان چاروں سالوں میں جہاں داد کے گھر دو لڑکوں کا اضافہ ہوا۔ جہاں داد کا احساس کمتری کچھ کم ہوا۔ مگر کرم علی کی ذمہ داریوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ جہاں داد کے خاندان میں چھوٹے بھائیوں کی ذمہ داری بھی بڑا بھائی ہی اٹھاتا تھا اور صرف ان ہی کی نہیں ان کی بیوی بچوں کی بھی۔

شادی کے آٹھ سال کے بعد جہاں داد اور اس کے گھر والوں کو جہاں داد کے باپ کی مختصری جائیداد کی تقسیم کے بعد گھر کے ہی ایک حصے میں علیحدہ کر دیا گیا۔ جہاں داد کے باقی تینوں بھائی ایک سال کے اندر اندر اپنے اپنے حصے کو بیچ کر وہاں سے چلے گئے جبکہ جہاں داد اپنے ایک کمرے، ایک برآمدے اور دو اطراف سے ٹوٹی ہوئی دیواروں اور تیسری اطراف میں ٹوٹے ہوئے پٹوں والے لکڑی کے ایک دروازے پر مشتمل تیس فٹ لمبے کچے صحن والے مکان میں ہی مقیم رہا۔ اس کے گھر کے افراد میں اب ایک اور لڑکی کا اضافہ ہو چکا تھا اور ظاہر ہے اگر بڑی دونوں بہنوں کو بیاہنا کرم علی کی ذمہ داری تھی تو چھوٹی بہن کو بیاہنا بھی اسی کا فرض تھا۔

ان چھ سالوں میں گھر کے اخراجات زینت کے بھائی اور باپ برداشت کرتے رہے مگر کرم علی کے تیرہویں سال میں داخل ہوتے ہی انہوں نے اس کام سے ہاتھ اٹھا لیا۔ گھر کا دوسرا مرد اب جوان ہو رہا تھا۔ مگر اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ اسے تعلیم میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور گھر میں اب کسی ٹی وی کے نہ ہونے کے باوجود وہ بے حد بڑے بڑے خواب دیکھنے لگا تھا۔

باپ کی زبردست پٹائی اور دباؤ کے باوجود کرم علی اسکول چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا۔ البتہ وہ ساتھ ساتھ کام کرنے لگا تھا۔ گھر کی گاڑی پھر سے چلنے لگی تھی۔ اس کے گھر میں سب کچھ تھا۔ بھوک، بیماری، غربت، جھگڑا، نااتفاقی، بے سکونی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی کمی ہوتی اس کے باوجود کرم علی اپنے بستے میں کتابوں کے ساتھ ساتھ اپنے خواب بھی اٹھائے پھرتا تھا۔

صبح چار بجے وہ کوئلوں کی استری سے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے کپڑے استری کرتا، استری شدہ کپڑے پہن کر بالوں میں تیل لگا کر اور کنگھی کے ساتھ مانگ نکال کر وہ آدھ گھنٹہ پیدل چل کر اخبار کی اس ایجنسی میں جاتا جہاں وہ صبح صبح جھاڑو دیتا، پونچھا لگاتا، چیزوں کی گرد جھاڑتا پھر اخباروں کے بنڈل آ جانے کے بعد وہ ان بنڈلز کو مختلف ہاکرز میں تقسیم کرتا بعض کو بنڈل کھول کر مطلوبہ تعداد میں اخبار گن کر دیتا۔ لاگ بک میں

انٹری کرتا۔ اس کام کے دوران وہ اردو کے تقریباً ہر اخبار کی سرخیاں پڑھ لیتا اور انگلش کے ہر اخبار کی تصویریں دیکھ لیتا اور اسی کام میں وہ کئی بار وہ اپنی جیب میں موجود کنگھی نکال کر، مانگ ٹھیک کرتا رہتا۔ سوا سات بجے وہ جب ایجنسی کے مالک کو چائے دے کر وہاں سے نکلتا تو اس کے کپڑوں اور ہاتھوں کے ساتھ ساتھ کئی بار اس کے چہرے پر اخبار کی سیاہی لگی ہوتی۔

بھاگم بھاگ وہ گھر پہنچتا اور منہ دھو کر کپڑے بدل کر ایک بار پھر استری شدہ یونیفارم پہن کر بالوں میں کنگھی کر کے وہ محلے کے قریب ہی واقع اس سرکاری اسکول میں چلا جاتا جہاں وہ شروع سے پڑھتا آ رہا تھا۔ گرمیوں میں جب اسکول جلدی لگتا تو کرم علی صبح سویرے یونیفارم پہن کر ہی اخبار کی ایجنسی میں جاتا اور پھر وہیں سے سیدھا اسکول اور جب وہ یونیفارم پہنے ہوتا تو پھر اس کی زیادہ توانائی اس یونیفارم کو گندا یا میلا ہونے سے بچانے میں خرچ ہوتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کے اسکول میں گندے یونیفارم پر کوئی سزا دی جاتی تھی۔ وہ جس علاقے میں تھا وہاں اسکول کے سات سو بچوں میں صرف چودہ بچے پورا اور صاف یونیفارم پہن کر اسکول جاتے تھے اور ان کے نام ان کی کلاس ان کے گھر کا ایڈریس تک ہیڈ ماسٹر کو صرف اسی ایک وجہ سے یاد رہتا۔ باقی 686 بچے یونیفارم سے ملتے جلتے ہر طرح کے لباس میں ہر طرح کے جوتے پہن کر ہر طرح کے حلیے میں اسکول آ جاتے۔

صاف استری شدہ کپڑے پہننے اور بالوں میں کنگھی کرتے رہنے کا یہ سلسلہ اسکول کے بعد ریڑھی لگانے اور رات کو سگنلز پر گاڑیوں کو روک کر پھولوں کے گجرے بیچنے پر بھی ختم نہیں ہوتا تھا۔ کرم علی کو استری شدہ صاف کپڑے پہننے کا جنون تھا۔ جو چند جوڑے اس کے پاس تھے وہ انہیں بھی بڑی حفاظت اور احتیاط کے ساتھ اپنے صندوق میں تہہ کر کے رکھتا تھا۔ اگر کبھی گھر میں صابن ختم ہو جاتا تو وہ خالی پانی سے ہی اپنے کپڑے رگڑ رگڑ کر دھوتا رہتا۔

سترہ سال کی عمر میں اس نے رزق کی تلاش کے لیے خوار ہونے کے ساتھ میٹرک کر ہی لیا تھا اور میٹرک کرنے سے بہت پہلے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ پہلی اور آخری کوالیفکیشن تھی جو اس کے مقدر میں تھی۔ جہاں دادا نے اب چھوٹے موٹے جرائم کے سلسلے میں جیل جانا شروع کر دیا تھا۔ گھر کی حالت بے حد خستہ تھی۔ برآمدے کی چھت گر چکی تھی اور کسی بھی برسات میں کمرے کی چھت بھی گر جاتی۔ جہاں دادا اور زینت کے درمیان جھگڑے اب روزانہ ہوتے اور دن میں کئی کئی بار ہوتے۔ زینت محلے کے چند اچھے گھروں میں صفائی کا کام کرنے لگی تھی۔ اس کے باوجود اخراجات تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اس سے چھوٹی بہنیں باری باری اسکول چھوڑ چکی تھیں۔ اور ان حالات میں آنے والے سالوں میں اس کے باقی بھائی بھی اسکول چھوڑ دیتے اور اس کی طرح کے چھوٹے موٹے کام کرنے لگتے اس کی بہنیں اب شادی کی عمر کو پہنچ رہی تھیں۔

کرم علی نے عمر کے ان سالوں میں پیسہ کمانے کے لیے ہر طرح کا کام کیا اور اس کام کے دوران اس نے جو کچھ سیکھا وہ زندگی میں اس کے بہت کام آیا۔ ایک بچے کے طور پر ان چھوٹے کاموں کے ذریعے رزق کی تلاش مشکل نہیں تھی اور نہ ہی اسے کبھی کوئی بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ صرف دو بار سگنل پر وہ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا۔ پہلی بار اس کی پسلیاں فریکچر ہوئیں۔ اس کا سر پھٹ گیا اس کے چہرے اور کمر پر بھی چوٹیں آ گئیں۔

البتہ دوسری دفعہ ایکسیڈنٹ زیادہ خطرناک ثابت نہیں ہوا صرف اس کا بایاں بازو دو جگہ سے ٹوٹ گیا اور اس کے ایک پاؤں کا انگوٹھا کاٹنا پڑا۔

اور ان ایکسیڈنٹس کا سامنا صرف رات کو ہی کرنا پڑا تھا۔ باقی کاموں میں اسے بے وجہ اجرت کاٹنے، گالی گلوچ، چھوٹی بات پر ہونے

والے تشدد اور ایک دو بار ہونے والی جنسی زیادتی کے علاوہ کسی مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اجرت کٹ جانے کے علاوہ اس نے کبھی کسی دوسری چیز کے بارے میں اپنے ماں باپ میں سے کسی کو نہیں بتایا تھا یہاں تک کہ زیادتی کے بارے میں بھی نہیں۔ اس کے گھر میں اس کے بہن بھائیوں کے سامنے اس کی عزت نفس مجروح ہوتی۔ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتے شاید جہاں داد اسی کو مورد الزام ٹھہرا کر اسے پیٹتا یا پھر اور اس پھر کے بعد کرم علی کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

کرم علی تیرہ سال کا بچہ تھا اور دنیا بہت بڑی تھی اور اس بہت بڑی دنیا میں اسے ہر روز جانا تھا وہ چھپ نہیں سکتا تھا۔ وہ گھر میں بند بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے زندگی میں تب تک بہت ساری باتیں ماں باپ سے چھپائی تھیں۔ پھر بعد میں انہیں بتا دیں مگر تیرہ سال کی عمر میں یہ کرم علی کی زندگی کا پہلا بڑا راز تھا اور اس کے بعد اس نے ہر چیز کو راز رکھنا شروع کر دیا تھا۔

اپنے جسم پر پہلی بار برص کے مرض کا انکشاف بھی ایسا ہی ایک راز تھا۔ اس نے پہلی بار اپنے پیٹ پر وہ نشانات دیکھے تھے اور حیران ہوا تھا۔ اس کی سانولی رنگت کی وجہ سے وہ نشانات پھیلنے لگے تو اس نے زینت یا جہاں داد کے بجائے اپنے ایک دوست کو وہ نشان دکھائے تھے۔

''ہاں یہ برص ہے۔'' اس کے دوست نے بڑے اطمینان اور کسی تشویش کے بغیر کہا۔ ''اس کا کوئی علاج نہیں تمہیں ایک آدمی دکھاؤں گا اسے بھی بیماری ہے اس کے سارے جسم بلکہ ہاتھوں پاؤں اور چہرے پر بھی یہی نشان ہیں۔''

اس کے دوست نے اس سے کہا اور پھر دوسرے ہی دن اسے ایک سڑک پر ریڑھی لگاتا وہ آدمی دکھایا۔ کرم علی دھک سے رہ گیا۔ وہ پہلے ہی بے حد عام سے خدوخال رکھتا تھا۔ اور اگر اس پر اس کے چہرے پر یہ نشان بھی آ گئے تو؟

''اس کا کوئی علاج نہیں ہے شاید ہو مگر مجھے پتہ نہیں ہے اور اگر ہوگا بھی تو بہت مہنگا ہوگا تو کس طرح علاج کروائے گا۔''

اس کے دوست نے کہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا اس بیماری نے کرم علی کی راتوں کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ وہ ہر دوسرے چوتھے دن پیٹ پر موجود ان چھوٹے چھوٹے نشانوں کے گرد پین کے ساتھ حد بندی کرتا اور چند دنوں میں وہ نشان ان لکیروں سے باہر ہوتا۔ اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ نشان پھیل رہا تھا تب تک کرم کو صرف پیٹ پر ان نشانات کا پتہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسے ہی کچھ نشانات اس کی کمر پر بھی تھے اور وہ پیٹ کے نشانات سے زیادہ تیزی سے پھیل رہے تھے۔

کرم علی نے زندگی میں پہلی بار کمائے جانے والے پیسوں سے اپنے جیب خرچ کو بچانا شروع کر دیا تھا۔ اسے ان نشانات کا علاج کروانا تھا۔ چاہے جتنا بھی وقت اور پیسہ لگتا لیکن اسے ان نشانات سے چھٹکارا پانا تھا۔

بہت جلد ہی وہ اس بات سے بھی آگاہ ہو گیا تھا کہ برص اس کی پشت پر بھی ہے۔ عام طور پر وہ چہرے اور ہاتھوں سے شروع ہوتا تھا مگر اس کے پیٹ سے شروع ہوا تھا اور اس مرض نے اسے اپنے آس پاس کے لوگوں سے کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا کوئی اس کے مرض کے بارے میں نہ جان جائے۔ اس نے ان نشانات کے بارے میں جاننے کے بعد کبھی کسی کے سامنے قمیص نہیں اتاری تھی۔ حتیٰ کہ برسات کے دنوں میں

بارش کے پانی میں بھیگتے ہوئے بھی اور گرمیوں کے موسم میں کسی نہر یا تالاب میں نہاتے ہوئے بھی۔

دو سال تک وہ نشان پھیلتے رہے پھر یک دم رک گئے۔ کرم کے لیے یہ ناقابل یقین بات تھی لیکن وہ نشان واقعی اب نہیں پھیل رہے تھے۔ کئی ہفتے وہ ان داغوں کے اردگرد پین سے نشان کھینچتا رہا اور پھر مطمئن ہو گیا۔

تیرہ سال کی عمر میں ہی کرم علی پہلی بار خاموشی سے متعارف ہوا تھا اور مذہب سے بھی۔ اس کے بعد یہ دونوں چیزیں ہمیشہ اس کی زندگی کا حصہ بنی رہیں۔

پانچ ہزار کی اس رقم میں ایک ہزار زینت نے ان دو گھروں سے ادھار لیا تھا۔ جہاں وہ پچاس روپے ماہوار پر گھر کا کام کیا کرتی تھی۔ اس نے اپنی تقریباً ڈیڑھ سال کی اجرت ایڈوانس میں لے لی تھی۔ یہ لینے میں اسے کتنی منتیں اور کتنے مہینے لگے وہ ایک الگ داستان تھی۔

دو ہزار روپے جہاں داد نے اپنے خستہ حال مکان کی رجسٹری کو گروی رکھ کر سود پر لیے تھے۔ زندگی میں اس سے بڑا جوا وہ نہیں کھیل سکتا تھا۔ کرم علی ڈوبتا تو وہ فٹ پاتھ پر آ جاتے۔

کرم علی نے پانچ سو اس نیوز پیپر ایجنسی کے مالک سے ادھار لیے تھے۔ جہاں پر اس نے چار سال کام کیا تھا۔ وہ مالک اسے کبھی ادھار نہ دیتا، مگر گارنٹی کے طور پر کرم علی کا چھوٹا بھائی آصف وہاں کام کرنے لگا تھا۔

ان پانچ ہزار کے علاوہ کرم علی کے پاس صرف دو سو روپے تھے اور وہ ان ہی دو سو روپوں کے ساتھ پاکستان سے کویت آیا تھا۔

وہ صرف پاکستان سے غیر قانونی طور پر کویت جانے والوں کا پہلا گروپ نہیں تھا۔ وہ اس فشنگ ٹرالر کے مالک کا بھی اس کام میں آنے کے بعد پہلا ٹرپ تھا اور وہ بھی اتنا ہی نروس اور پریشان تھا جتنا اس گروپ کے تینوں لوگ اور اس پریشانی میں وہی ہوا تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سمندر میں جس جگہ پر اس ٹرالر کو جس لانچ پر انہیں منتقل کرنا تھا۔ وہ اس جگہ پر نہیں پہنچ سکا بلکہ اگلے تین ہفتے سمندر میں ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔

اور ان تین ہفتوں میں کرم علی کو اپنے زندگی کے سب سے بھیانک تجربات ہوئے تھے۔ وہ اس کے ہی نہیں ان دونوں لڑکوں کی زندگی کا بھی پہلا سمندری سفر تھا اور صرف بارہ گھنٹے گزرنے کے بعد ہی وہ تینوں Sea Sickness کا شکار ہو گئے تھے۔ ٹرالر پر مچھلیاں پکڑنے والے ایک مچھیرے نے ان پر ان چند روایتی ٹوٹکوں کا استعمال کیا جنہیں وہ خود اپنے اوپر استعمال کرتے تھے کرم علی کو اس سے کچھ افاقہ ہوا مگر باقی دونوں لڑکوں کو نہیں۔

جذام والے لڑکے کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی اس کے ہاتھ پر جذام سمندر کی نمکین ہوا کی وجہ سے اسے بے حد اذیت دے رہا تھا۔ ٹرالر کے مالک کو اس کی بیماری کا شروع میں پتہ نہیں تھا ورنہ، وہ اسے کسی بھی صورت میں اپنے ٹرالر پر نہ لاتا۔ مگر ٹرالر پر اس کی بیماری کا پتہ چلنے کے بعد اب مالک سمیت سارے لوگ اس کے پاس آنے سے کترانے لگے تھے۔

تین ہفتوں میں سمندر میں بھٹکتے رہنے کے دوران اس کا جذام بڑھتا گیا تھا۔ اس میں سے پیپ رسنے لگا تھا۔ جذام اب اس کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر بھی منتقل ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ بری طرح سوج گئے تھے اور پیپ کے ساتھ اب اس میں سے خون رسنے لگا تھا۔ کرم کے علاوہ کوئی اور اس کے پاس نہیں آتا تھا۔ صرف وہی اس کے پاس آ کر اس کے منہ میں وہ ابلے ہوئے چاول اور مچھلی کا شوربا ڈالنے کی کوشش کرتا جو

اس ٹرالر پر پکتا تھا۔ وہ جتنا کھانا کھاتا، قے کی صورت میں اتنا ہی باہر نکال دیتا کرم دن میں دو دو تین تین بار اسے کھانا کھلانے کی کوشش کے دوران ٹرالر کے ڈیک پر پھیلی وہ گندگی ماتھے پر ایک شکن لائے بغیر صاف کرتا دوسرے ہفتے کے اختتام تک اس لڑکے نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز وہ اب اپنے اندر لے جانے کے قابل رہا تھا۔ وہ پانی تھا اسے اب تیز بخار رہتا تھا اور وہ زیادہ تر غنودگی کی حالت میں رہتا تھا۔

تیسرے ہفتے کے آغاز میں ایک صبح کرم نے اسے بے حس و حرکت پایا تھا۔ وہ رات کو کسی وقت مر گیا تھا۔ موت کو اتنے قریب دیکھنے کا یہ کرم کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ مگر یہ صرف ابتدا تھی ٹرالر کے مالک نے اس لڑکے کی لاش کو سمندر میں پھینک دیا تھا۔ شدید گرمی کے موسم میں وہ اس لاش کو ٹرالر پر نہیں رکھ سکتے تھے اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ راستہ بھول چکے تھے۔

کرم نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک چادر میں لپٹی اس لاش کو سمندر برد ہوتے دیکھا تھا۔ وہ کچھ دیر پانی کی سطح پر نظر آتی رہی تھی پھر آہستہ آہستہ پانی اسے نگل گیا تھا اور شاید اس کے ساتھ ہی اس کے خاندان کی قسمت بھی ڈوب گئی تھی۔

اس کے گھر والے کویت سے اس کے بھیجے ہوئے دیناروں کے رزق کا انتظار کرتے ہوئے بہت عرصہ تک یہ بھی نہیں جان پاتے کہ وہ خود مچھلیوں کا رزق بن چکا تھا۔

کرم علی اگلے تین دن سو سکا نہ کچھ کھا سکا۔ وہ صرف اس جگہ کو دیکھتا رہتا جہاں وہ لڑکا لیٹا رہتا تھا۔ اس لڑکے کی جگہ وہ بھی ہو سکتا تھا۔ اور ایسا ہوتا تو آج کرم علی بھی سمندر کے پیٹ میں اتر چکا ہوتا یا پھر کل اتر جائے گا یا شاید پرسوں۔ ٹرالر اب بھی سمندر کی لہروں پر بھٹک رہا تھا۔

"قیمت زندگی کی ہوتی ہے موت کی نہیں زندہ انسان وقعت رکھتا ہے کیونکہ وہ بوجھ اٹھا سکتا ہے مردہ نہیں وہ تو بوجھ ہوتا ہے بوجھ کیا وقعت رکھے گا؟ آج اس ٹرالر پر میں مر جاؤں اور میرے ساتھیوں کو واپس پلٹنے کا یقین نہ ہو تو وہ مجھے بھی اسی سمندر میں پھینک دیں گے۔" ٹرالر کے مالک نے کرم علی کے پاس بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہوئے اسے اور دوسرے لڑکے سے کہا تھا۔

تیسرا ہفتہ ختم ہونے سے ایک دن پہلے ہی ٹرالر کے مالک کا اس لانچ سے رابطہ ہو گیا تھا جس نے اس ٹرالر سے یہ پہلی "لاٹ" اٹھائی تھی۔

کرم علی اور وہ دوسرا لڑکا کویت میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اگلے چار سال اس نے کویت میں ہی گزارے تھے اور ان چار سالوں میں کویت میں لیگل اسٹیٹس حاصل کر لیا تھا لیکن بے حد کوشش اور خواہش کے باوجود کرم علی ایک بار بھی پاکستان نہیں جا سکا تھا۔

پاکستان کی طرح اس نے کویت میں بھی ہر وہ کام کیا تھا جس سے اسے چند سکے مل جاتے۔ سبزیوں اور پھلوں کے گوداموں میں کام کرنے سے لے کر، تعمیراتی مزدور تک اور رنگ و روغن سے لے کر بلند و بالا عمارتوں کی کھڑکیوں کے شیشے صاف کرنے تک اس نے ہر وہ کام کیا تھا جو اسے ملا اور جس میں وہ بچت کر سکا۔

چار سالوں میں کرم علی کے گھر والوں کی زندگی میں بہت ساری تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ جہاں داد کے خاندان پر اب کسی کا کوئی قبضہ نہیں تھا۔ زینت لوگوں کے گھر صفائی کا کام چھوڑ چکی تھی اور آصف دوبارہ اسکول جانے لگا تھا۔ جہاں داد کے گھر میں اب محلے کی دکان سے نقد راشن آتا تھا اور بلا

ضرورت اور ضرورت سے زیادہ۔ جہاں داد کا خستہ حال گھر اب چار کمرے کے دو منزلہ پکے مکان کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ جس کے ماتھے پر ماشاء اللہ جگمگا رہا تھا۔ جہاں داد اب گھر میں بیٹھ کر اپنے سارے گھر والوں کے ساتھ وی سی آر پر فلمیں دیکھتا تھا۔ زینت کی بڑی بیٹی امینہ کی منگنی بھی ہو گئی تھی۔

اور ان تمام آسائشوں اور سہولیات کے لیے کرم علی کو ہفتے میں سات دن اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑا تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر چھوٹے موٹے حادثات کے نتیجے میں پچپن زخم کے نشانات کا اضافہ ہوا تھا۔

تیزاب سے ایک بار کبھی کے جلنے کو برداشت کرنا پڑا تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے گرد مستقل حلقوں کا اضافہ ہوا تھا اور سر کے بال نوجوانی میں سفید ہونے لگے تھے صرف ایک چیز اس کی زندگی میں تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا استری شدہ لباس اور سنوارے گئے بالوں کی مانگ۔

زندگی کا اکیسواں سال اس کے لیے بہت سے نئے اور عجیب و غریب اضافے کر آیا تھا۔ اس کی زندگی میں محبت کا اضافہ ہوا تھا۔

عارفہ اس کے تایا کی بیٹی تھی۔ اس نے عارفہ کے ساتھ ہی اسکول جانا شروع کیا تھا اور اس نے عارفہ سے ہی بالوں کو سنوارنا اور کپڑوں کو صاف ستھرا رکھنا سیکھا تھا۔ پانچ سال کی عمر میں اس نے عارفہ کا بیگ بھی اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ واحد چیز تھی جو وہ عارفہ کے لیے کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس عارفہ کو دینے یا اس کے لیے کچھ کرنے کو کچھ نہیں تھا۔

پرائمری کے بعد ان دونوں کے اسکول الگ ہو گئے تھے اور اسی دوران ان کے گھر بھی۔ لیکن ان کے دلوں کے درمیان فاصلہ کبھی نہیں آیا۔ کرم علی جانتا تھا صرف وہ ہی نہیں عارفہ بھی اسے پسند کرتی تھی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے اور عارفہ کے خاندان کی مالی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ عارفہ کے بڑے بھائیوں نے کمانا شروع کر دیا تھا اور یہ فرق مزید بڑھتا جا رہا تھا۔ کرم علی نے عارفہ نام کا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اپنے گھر اور گھر والوں کی صورت میں جو حقائق اس کے سامنے تھے انہوں نے اس کی زندگی سے سارے خواب نکال دیے تھے۔

مگر پہلی بار اسے عارفہ کی یاد اس قرار پر آئی تھی۔ دوسری بار کویت کی زمین پر قدم رکھنے کے بعد "کچھ سالوں کی بات ہے، میں اب یہاں اتنا پیسہ بنالوں گا کہ عارفہ کے گھر والے خوشی خوشی میرے ساتھ اس کی شادی کر دیں گے۔"

اس نے سوچا تھا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ چار سال میں اس کے گھر میں اتنی تیزی سے تبدیلی آئی تھی کہ رشتے دار بھی جہاں داد کے خاندان کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ اب عارفہ کے باپ سے کرم علی کے رشتہ کی بات کی جاتی تو وہ خوشی خوشی قبول کر لیتا مگر دشواری کرم علی کو خود اپنے ماں باپ کو عارفہ سے رشتے کی بات کرنے کے لیے تیار کرنے میں آئی تھی۔ ان دونوں کو جیسے فون پر یہ سن کر شاک لگا تھا کہ کرم علی اپنے رشتے کی بات اپنے منہ سے کر رہا تھا اور وہ بھی ابھی جب اسے کماتے صرف چار سال ہی ہوئے تھے۔ کرم علی اگر انہیں یہ گارنٹی نہ دیتا کہ وہ صرف منگنی کا خواہشمند تھا اور شادی اپنی دونوں بہنوں کی شادیوں کے بعد ہی کرے گا تو جہاں داد اور زینت کسی بھی قیمت پر عارفہ سے اس کا رشتہ طے نہ کرتے اور کرم علی کو اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ عارفہ کی شادی کہیں اور ہو جائے گی تو وہ ابھی اپنی منگنی کی بھی بات نہ کرتا اکیس سال کی عمر میں ایک لمبے عرصے کے بعد کرم علی نے زندگی میں محبت کے نام کے جذبے کی پذیرائی کی تھی۔ پہلی بار اسے کویت میں کسی کے ایسے خط آنے لگے تھے، جس میں کسی چیز کی فرمائش نہیں ہوتی تھی۔ کرم علی کے بارے میں پوچھا جاتا تھا، اس کی بات ہوتی تھی۔

کرم علی کو پہلی بار دنیا اچھی لگنے لگی تھی۔ چند سالوں کی بات تھی وہ اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاتا کاروبار کے لیے کچھ پیسے جمع کر لیتا تو پھر پاکستان واپس چلا جاتا پھر عارفہ کے ساتھ شادی کر کے وہ ایک پرسکون اور خوشحال زندگی گزارتا ایک مکمل زندگی۔

کرم علی نے اس سال کو بھی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا جس سال اسے پاکستان واپس لوٹ جانا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے اٹھائیسویں سال کا انتظار کر رہا تھا جب اسے واپس لوٹ جانا تھا۔ وہ اب الٹی گنتی گننا شروع کر چکا تھا۔

اور اکیسویں سال میں ہی اسے شیخ سعود بن جابر کے اصطبل میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور اس کے بعد اس کی زندگی مکمل طور پر بدل گئی تھی۔

☆☆☆

بیل کی آواز پر زینب نے اٹھ کر دروازہ کھولا ضیاء، نفیسہ کے ساتھ اندر داخل ہوئے دونوں کے چہرے کے اترے ہوئے تھے۔ زینب کا دل بے اختیار ڈوبا چہرے کے ایسے تاثرات کا کیا مطلب ہو سکتا تھا وہ بغیر بتائے بھی سمجھتی تھی۔ زہرہ کی شادی کے ان سالوں میں اس نے کئی بار ماں باپ کو ایسے ہی اترے ہوئے چہرے کے ساتھ نعیم کے گھر سے آتے دیکھا تھا۔ اب تک اسے عادی ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ نہیں ہو سکی تھی۔

نفیسہ چپ چاپ چادر اتارتی اندر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ضیا صحن میں پڑے تخت پر جا کر بیٹھ گئے۔

زینب جب تک پانی کا گلاس لے کر ان کے پاس آئی وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ گہری سوچ بھی زینب کے لیے نامانوس نہیں تھی۔

"پانی پی لیں ابو۔" زینب نے ضیا کو متوجہ کیا انہوں نے چونک کر پانی کا گلاس زینب کے ہاتھ سے لے لیا۔ زینب ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئی۔ ضیا پانی پیتے ہوئے صحن میں چند کھلونوں کے ساتھ ایک طرف بیٹھ کر کھیلتی مائزہ اور ماہا کو دیکھ رہے تھے۔

"کھانا لاؤں؟" زینب نے پانی کا خالی گلاس ضیا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھوک نہیں ہے۔" ضیا نے کہا۔

"نعیم بھائی کے گھر سے کچھ کھا کر آئے ہیں؟" زینب نے موہوم سی آس پر پوچھا۔

"ہاں بہن کی زبان سے گالیاں اور داماد کے منہ سے طعنے، باقی چائے پانی تو پوچھا ہی نہیں انہوں نے۔" اندر سے آتی نفیسہ نے بے حد تلخی کے ساتھ زینب کے سوال کو درمیان میں ہی اچکتے ہوئے کہا۔

زینب کا رنگ ایک بار پھر زرد ہو گیا۔ نفیسہ اب آ کر صحن میں تخت کے پاس پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ زینب نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ یقیناً روتے ہوئے نعیم کے گھر سے آئی تھی۔

"سلطان آ گیا؟" ضیا نے جیسے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لیکن ان کا لہجہ اور آواز بے حد کمزور تھی۔

"نہیں ابھی نہیں آیا۔" زینب نے کہا۔

"اب کیا ہوگا؟... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" زینب کو کچھ پوچھنے کی زحمت نہیں کرنی پڑی نفیسہ خود ہی شروع ہو گئی تھی۔

"ہو جائے گا کچھ نہ کچھ میں اکبر بھائی سے کہوں گا۔ آپا کو سمجھائیں۔" ضیا نے کہا۔

"آج تک نعیم کے کس مطالبے پر اکبر بھائی اس کو سمجھا سکے ہیں؟ ہر بار مطالبہ پورا کرنے پر ہی زہرہ کو واپس لے کر گیا ہے وہ۔" زینب کا سانس رکنے لگا۔

"اب پھر، پھر کوئی مطالبہ کیا ہے انہوں نے؟" اس نے بمشکل باپ دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پانچ سال کی اس شادی میں کم از کم اس نے بیس بار اپنے باپ کو نعیم کا کوئی نہ کوئی مطالبہ پورا کرتے دیکھا تھا۔ اور اب پھر ایک نیا مطالبہ۔

"موٹر سائیکل مانگ رہا ہے اس بار ورنہ دوسری شادی کرے گا زہرہ کو طلاق دے کر۔" نفیسہ نے کہا اور ایک بار پھر رونے لگیں۔ زینب رنج اور صدمے کے عالم میں بیٹھی ماں اور باپ دونوں کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ واشنگ مشین، صوفہ سیٹ، جو سریا کوئی ڈنر سیٹ نہیں تھا جسے ضیاء گھر میں سے رکھی بچت یا چھوٹے موٹے قرض لے کر دلا دیتے۔

وہ اگلے پانچ سال بھی بچت کرتے رہتے تو نعیم کو موٹر سائیکل خرید کر نہیں دے سکتے تھے۔

"جان بوجھ کر ایسا مطالبہ کیا ہے فہمیدہ نے، اسے پتہ ہے نا، ہم پورا نہیں کر سکتے۔ بس جان چھڑانے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں، وہ دونوں میری بیٹی سے۔" نفیسہ سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"مت رو نفیسہ! کچھ نہ کچھ ہو جائے گا پہلے میں اکبر بھائی کو بھیجوں گا ان کے گھر وہ نہ مانے تو پھر میں دیکھوں گا قرض لے کر اگر کوئی سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل ملتا ہے تو۔" نفیسہ نے ضیا کی بات کاٹ دی۔

"سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل پر مان جائیں گے وہ لوگ؟"

"میں منت کروں گا ہاتھ جوڑ لوں گا ان کے سامنے آخر بہن ہے میری وہ۔"

ضیا نے بے اختیار کہا۔ زینب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا، اسے باپ کی شرافت پر زیادہ رحم آیا یا اس کمزوری پر۔

"آپ کی بات سننے اور ماننے والے ہوتے تو آج ہم اس حالت کو کیوں پہنچتے ضیا صاحب آج موٹر سائیکل مانگ رہے ہیں کل کو کچھ اور مانگیں گے ہم ان کے مطالبے پورے کرتے رہیں گے تو باقی دو بیٹیاں کیسے بیاہیں گے؟" نفیسہ نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا کروں میں؟ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھی تو نہیں بیٹھ سکتا۔" ضیا نے بے چارگی سے کہا۔

"میں نے اسی لیے کئی بار آپ سے کہا کہ اتنی شرافت اور ایمانداری ٹھیک نہیں اور کچھ نہیں تو اولاد کے مستقبل کا ہی کچھ خیال کر لیں آج پھر آپ نے وہی ساری باتیں اپنی بہن اور داماد کے منہ سے سنی ہیں، کیا ہے جو انہوں نے آپ کو نہیں کہا۔"

"میں اولاد کے اس دنیا میں مستقبل کے لیے اگلی دنیا میں ان کے اور اپنے لیے دوزخ نہیں خرید سکتا۔ وہ جو کہتے ہیں انہیں کہنے دو میں کیوں کسی کے طعنے سن کر اللہ کا عذاب مول لوں۔"

ضیا نے بے حد سخت لہجے میں نفیسہ سے کہا۔

"اور کم از کم تم تو مجھ سے ایسی باتیں مت کرو۔"

"میں کیا کروں آپ نے زہرہ کی حالت دیکھی ہے، چند ہفتوں میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے وہ، پتہ نہیں کیا کیا کہتے رہتے ہیں وہ دونوں اس سے" نفیسہ ایک بار پھر رونے لگی۔

زینب مزید نہیں سن سکی۔ وہ اٹھ کر باورچی خانے میں آ گئی۔ ربیعہ یہاں پہلے ہی کھانا بناتے ہوئے صحن میں ہونے والی ساری گفتگو سن چکی تھی۔ زینب نے گلاس ایک طرف رکھا اور ایک پیڑھی پر بیٹھ کر رونے لگی۔ ربیعہ نے کچھ دیر خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھا۔ وہ اسی طرح

بے آواز زاروقطار آنسو بہانے میں مصروف رہی۔

"کوئی فائدہ ہے رونے کا؟" اس نے زینی کو ٹوکا حالانکہ وہ جانتی تھی اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ زینی جب رونے پر آتی تو اسی طرح گھنٹوں روتی تھی۔

"میں کل زہرہ آپا کے ہاں جاؤں گی۔" زینی نے اپنی ناک کو رگڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اور وہاں جا کر خود بھی روؤں گی اور انہیں بھی رلاؤں گی۔" ربیعہ نے بے ساختہ کہا۔ "تم نے سنا نہیں ہے نعیم بھائی اور پھوپھو نے ابو اور امی کی کتنی بے عزتی کی ہے تمہیں بخش دیں گے کیا؟"

"پتہ ہے مجھے لیکن میں آپا کے پاس جاؤں گی۔ انہیں ضرورت ہے میری۔" زینی نے سسکیوں کے ساتھ کہا۔

"انہیں اس وقت تم سے زیادہ ایک عدد موٹر سائیکل کی ضرورت ہے جس کی چابی وہ اپنے کمینے شوہر اور ذلیل ساس کے منہ پر مار سکیں۔" ربیعہ نے بے حد تلخی سے کہا۔ زینب کو روتے ہوئے یک دم جیسے بریک لگا۔

"تم نعیم بھائی اور فہمیدہ پھوپھو کو گالیاں دے رہی ہو۔" زینی نے بے یقینی سے ربیعہ کو دیکھا۔

"وہ ہمارے ماں باپ کو گالیاں دے سکتے ہیں تو ہم انہیں پھولوں کے ہار تو نہیں پہنائیں گے۔" ربیعہ نے اسی ترشی سے کہا۔

"ابو سن لیں گے بہت ناراض ہوں گے۔"

"تو ہو جائیں۔ یہ سارا ابو کا قصور ہے۔ آخر ضرورت کیا تھی شروع سے اتنا دبنے کی۔"

ربیعہ نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی اس کی آواز باہر صحن تک جاتی۔ "غربت اور شرافت کو خواہ مخواہ عیب بنا ڈالا، مطالبے کرنے کی عادت ڈال دی انہیں۔ صاف صاف کہہ دیتے انہیں پہلی بار ہی کہ ہم نے بیٹی کو جتنا دینا تھا دے دیا۔ اب مزید کچھ نہیں دیں گے۔ پھوپھو رشتہ دار ہیں شادی سے پہلے روز آتی تھیں اس گھر میں، انہیں کیا پتہ نہیں تھا ہمارے گھر کے حالات کا لیکن نہیں جی، ابو نے آپا آپا کہہ کر آپا کا دماغ خراب کر دیا عمر میں دس سال بڑا معمولی شکل کا داماد یوں اکڑتا پھرتا ہے جیسے وہ کپڑے کی دکان کے بجائے ٹیکسٹائل مل چلا رہا ہے۔ آپا کو پھوپھو کے ہاں نہ بیاہتے تو بھی پھوپھو کو ہمارے جیسے کسی خاندان سے ہی رشتہ ملنا تھا۔ انہیں کیا پاکستان کے صدر نے اپنی بیٹی کا رشتہ دے دینا تھا؟ باتیں سنو ذرا ان کی۔"

ربیعہ بے حد ناراضی سے کہہ رہی تھی اور زینی ہکا بکا اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اپنا رونا بھی بھول گئی تھی۔ ربیعہ اسی طرح صاف صاف باتیں کیا کرتی تھی اور اس کے یا زہرہ کے برعکس بہت پراعتماد اور دبنگ لہجے میں بات کرتی تھی مگر زینی پہلی بار اسے اتنی بدمزاجی اور بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے دیکھ رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ زینب کو کبھی اس کی طرح غصہ نہیں آیا تھا غصہ اس کو بھی بہت اچانک اور بہت شدید آتا تھا لیکن اس کا غصہ ہمیشہ آنسوؤں میں ختم ہو جاتا تھا اور ربیعہ شاید ہی کبھی غصے میں روئی دھوئی ہو۔

"تم کس طرح کی باتیں کر رہی ہو ربیعہ؟" زینی کو حسب عادت ڈر لگا۔

"کیا غلط کہہ رہی ہوں؟ ہفتے کا سو روپیہ جیب خرچ دیتے ہیں نعیم بھائی زہرہ آپا کو، مہینے کے کتنے پیسے بنے؟ چار سو، سال میں دو تین بار

آپا کو گھر سے نکالا جاتا ہے۔ اور وہ دو تین ماہ یہاں رہتی ہیں۔ ان مہینوں میں ان کو وہ چار سو بھی نہیں ملتا۔ پھر جب نعیم بھائی اپنے گھر میں آپا سے ناراض ہوں تو وہ اس ہفتہ بھی آپا کو کچھ نہیں دیتے۔ تو دو مہینے اور اسی طرح نکال دو سال میں آپا کو کل تین ہزار روپے ملتے ہوں گے اور اس تین ہزار کے لیے ساس نندوں کے طعنے اور گالیاں، میاں کی گالیاں اور پٹائی، بچے پیدا کرنا اور انہیں پالنا کوئی کنیز بھی کہیں سے خریدے نا تو اتنی سستی نہ ملے اور اصل میں وہ تین ہزار بھی ابو کی جیب سے ہی جاتا ہے۔ کیونکہ سال میں دو تین مطالبے تو ابو ان کے پورے کرتے ہی ہیں۔ چار پانچ ہزار تو سیدھا نکل گیا۔ پھر آپا کے کپڑے اور جوتے تو ہمیشہ ابو ہی بنوا کر دیتے ہیں تو اس گھر میں رہ کر بھی آپا کا بوجھ ابو نے ہی اٹھایا ہے۔ تو پھر یہیں پر آ جائیں وہ، یہ روز روز کی ذلت سے تو جان چھوٹے گی۔"

ربیعہ آج واقعی بہت تنگ آئی ہوئی تھی۔ زینی کو سمجھ میں نہیں آیا وہ اسے کیسے چپ کروائے۔ "موٹر سائیکل کہاں سے دیں گے ابو؟ نعیم بھائی کی سات پشتوں میں کسی نے موٹر سائیکل نہیں دیکھا اور اب انہیں موٹر سائیکل یاد آ گیا ہے کل کو گاڑی مانگیں گے پرسوں کچھ اور۔" "تم رمشہ جیسی باتیں کر رہی ہو۔" زینی کو بے اختیار رمشہ یاد آئی "کوئی بھی عقل مند شخص ایسی ہی باتیں کرے گا۔ بیٹی نہیں دی پھانسی کے تختے پر پھندہ ڈال کر کھڑا ہو گیا باپ کہ سسرال والے جب چاہیں لٹکا دیں فہمیدہ پھپھو اور نعیم بھائی کو کیا مرنا نہیں ہے؟"

"چپ ہو جاؤ ربیعہ۔" زینب ہول کر رہ گئی۔

"ایسی باتیں مت کرو۔ بس دعا کرو کہ وہ لوگ ٹھیک ہو جائیں اور اپنا مطالبہ واپس لے لیں اور آپا کو اچھی طرح سے رکھیں۔"

"تو اب تک پہلے میں کیا کرتی آ رہی ہوں؟ دعائیں ہی کر رہی ہوں۔" ربیعہ اس کی بات پر اور ناراض ہوئی۔

"تم مجھے بہت پریشان کر رہی ہو۔ چپ ہو جاؤ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔" زینی نے کہا، وہ واقعی زچ ہو کر رہ گئی تھی۔ "ٹھیک ہے نہیں کرتی ایسی باتیں تم کب تک گھر بیٹھی رہو گی کالج جانا شروع کرو۔" ربیعہ نے موضوع بدل دیا۔

"چلی جاؤں گی کالج۔" زینی نے بے حد بیزاری کے ساتھ کہا۔

"اور آج کل تم خالہ کے گھر بھی نہیں جاتیں کیوں؟ کیا شیراز کے ساتھ کوئی ناراضی ہے؟" ربیعہ کو یک دم خیال آیا۔

"تمہیں پتا ہے۔ میں شیراز سے ناراض نہیں ہو سکتی۔" زینی نے مدھم آواز میں کہا۔

"وہ تو ہو سکتا ہے نا؟" ربیعہ نے بے ساختہ کہا۔

"نہیں، وہ بھی ناراض نہیں بس مصروف ہیں وہ۔"

زینی نے نظریں چراتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی وہاں سے اٹھ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شیراز کی کوئی بات ربیعہ سے کہے اور پھر ربیعہ، شیراز پر اس طرح برسے جس طرح کچھ دیر پہلے نعیم پر برس رہی تھی۔ شیراز اور اس کے گھر والے ویسے بھی زہرہ کے سسرال والوں سے بہت مختلف تھے۔ یہ صرف زینب کا خیال نہیں تھا اس کے پورے گھر والوں کا یقین تھا۔

☆☆☆

''بازار چلو گی زینی؟'' جمیلہ نے اس کے دروازہ کھولتے ہی اس سے پوچھا۔

''کس لیے؟'' زینی نے واپس کپڑوں کے اس ڈھیر کی طرف پلٹتے ہوئے کہا جو وہ دھو رہی تھی۔ جمیلہ ان کے برابر والے گھر میں رہتی تھی۔ وہ اور زینی میٹرک تک ایک ہی اسکول میں پڑھتی رہی تھیں۔ میٹرک میں فیل ہونے کے بعد جمیلہ نے تعلیم کو تو خیر باد کہہ دیا تھا البتہ زینب کے ساتھ اس کی دوستی اسی طرح برقرار تھی۔

''کس لیے جاتے ہیں بازار؟'' جمیلہ نے بسنٹ کھاتے ہوئے صحن میں دروازہ بند کیا اور زینب کے پاس آگئی ''کچھ چیزیں لینی ہیں۔'' وہ آج کل اپنے جہیز کی تیاری میں مصروف تھی۔

''لیکن میں تو نہیں جا سکتی کپڑے دھو رہی ہوں۔'' زینی نے دوبارہ جا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ربیعہ نہیں ہے گھر میں؟'' جمیلہ نے باورچی خانے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ربیعہ کو لے جاؤ اندر کمرے میں ہوگی۔'' زینب نے کہا۔

''ارے نہیں ساتھ تو میں نے تمہیں ہی لے کر جانا ہے۔ ربیعہ دھولے کپڑے، خالہ کدھر ہیں؟'' جمیلہ کو ساتھ ہی نفیسہ کا خیال آیا۔

''وہ تسیم خالہ کی طرف گئی ہیں ابھی اور ربیعہ، ماہا اور مائرہ کو سلا رہی ہے۔ وہ نہیں دھو سکتی کپڑے۔'' زینی نے اسے بتایا اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی ربیعہ اندر سے نکل آئی۔

''تم ہو آؤ بازار، میں دھو لیتی ہوں باقی کپڑے اور یہ میرا دوپٹہ بھی رنگوانے دے آنا۔'' ربیعہ اپنا دوپٹہ لینے اندر چلی گئی۔

''اب میں کپڑے تبدیل کروں اور جاؤں تم ہی چلی جاؤ جمیلہ کے ساتھ۔'' زینی نے عذر پیش کیا۔

''نہیں، میں نے کہا ہے نا کہ مجھے تمہارے ساتھ ہی بازار جانا ہے بس اب جلدی سے تیار ہو جاؤ میں بیگ اور چادر لے کر آتی ہوں۔'' جمیلہ کہتے ہوئے تیزی سے گھر سے نکل گئی۔ زینی نے بے حد ناراضی سے اسے دیکھا۔

''تھک جاتی ہوں میں اس کے ساتھ دکانوں پر چڑھتے ہوئے گھنٹوں پھرتی ہے وہ بازار میں، میں نے اچھا خاصا بہانا بنایا تھا اور تم اندر سے نکل آئیں۔''

وہ ناراضی سے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ دھونے لگی۔

''اب میں پہلے کپڑے تبدیل کروں پھر بال بنا کر اس کے ساتھ جاؤں۔'' وہ بے حد بیزاری اور کوفت کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

''نہیں تم اسی طرح اس کے ساتھ چلی جاؤ۔''

ربیعہ نے اس کے بڑبڑانے پر اسے ڈانٹا۔

''ہاں ٹھیک ہے اسی طرح چلی جاتی ہوں کیا فرق پڑتا ہے۔'' زینی کو طنزیہ انداز میں دیا ہوا اس کا مشورہ بے حد نامناسب لگا۔

''ہاں کوئی فرق نہیں پڑتا بس یہ ہوگا کہ اگر گلی میں شیراز سے ملاقات ہوگئی تو وہ بے حد ناراض ہوگا۔ تم کو پتا ہے نا اسے تمہارا اس طرح کا

حسیہ کتنا برا لگتا ہے۔" ربیعہ نے جیسے اسے خبردار کیا۔

"کچھ نہیں ہوتا اور ویسے بھی شیراز اس وقت کہاں گلی میں مل سکتے ہیں۔" زینی نے لاپروائی سے کہا اور کمرے میں گھس گئی۔ ربیعہ نے اس بار اسے کچھ نہیں کہا۔

وہ دس منٹ بعد کمرے سے نکلی۔ ربیعہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ اس نے کپڑے تبدیل کر کے بال سنوار لیے تھے۔ ربیعہ نے بے اختیار اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

☆☆☆

"آپ مجھے جوتا مت پہنائیں میں خود پہن لوں گی۔" سیلز مین نے اس کے پاؤں میں جوتا پہنانے کی کوشش کی تو زینی نے جیسے کرنٹ کھا کر اپنا پاؤں پیچھے کیا۔

"آپ کو ایک بار کہی ہوئی بات سمجھ میں نہیں آتی میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہے میرے پاؤں کو ہاتھ مت لگائیں میں خود پہن لوں گی۔"

اس نے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے ایک بار پھر اپنا پاؤں بے حد طیش کے عالم میں پیچھے کیا۔ سیلز مین نے اس کے روکنے کے باوجود ایک بار پھر ڈھٹائی کے ساتھ اسے جوتا پہنانے کی کوشش کی تھی اور زینب بے حد برہم ہو گئی تھی۔ اس بار اس کی آواز قدرے بلند اور تلخ تھی اور سیلز مین اس کی توقع نہیں کر رہا تھا وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہے زینی! کیا ہو گیا ہے؟ جوتا ہی تو پہنا رہا تھا بے چارہ۔" اس کے ساتھ بیٹھی جمیلہ نے اسے کہنی سے ہلکا سا ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

"میں نے کب کہا ہے کہ مجھے جوتا پہنائے جب منع کیا ہے تو۔" زینی نے غصے میں ہٹ مکمل کرنے کے بجائے پاؤں میں پہنا ہوا جوتا جھٹکے سے اتار دیا۔

اس کا موڈ یک دم بے حد خراب ہو گیا تھا وہ جوتا قطعاً ایسا نہیں تھا جسے پہننے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت پڑتی اور زینب ہمیشہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ محتاط تھی کوئی بھی جوتا ٹرائی کرنے سے پہلے ہی وہ دکان دار یا سیلز مین سے کہہ دیا کرتی تھی کہ وہ جوتا خود پہنے گی اسے مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جمیلہ کے اصرار پر جوتوں کی اس چھوٹی سی دوکان پر آئی تھی۔ اور وہ دکان میں داخل ہوتے ہی زینب کو سیلز مین اور دکان دار دونوں کے انداز اور نظروں سے بے اختیار وحشت ہوئی تھی۔ وہ اپنے آدھے چہرے کو چادر سے چھپائے ہوئے تھی۔ وہ اس کے باوجود وہ اسے ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ ان کے بات کرنے کا انداز بھی ضرورت سے زیادہ بے تکلفانہ تھا۔ جمیلہ ساتھ نہ ہوتی تو زینب ایک منٹ کے لیے اس دکان میں نہ بیٹھتی لیکن جمیلہ بڑے آرام کے ساتھ دکان دار اور سیلز مین سے گپ شپ میں مصروف ہو کر جوتے نکلوانے لگی تھی، دو جوتوں کے جوڑے پسند کرنے اور بھاؤ تاؤ کرنے کے دوران دکان دار اور جمیلہ کے دوران بے تکلفی کا یہ عالم ہو چکا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے پر معنی خیز انداز میں جملے کس رہے تھے اور سیلز مین اس دوران اسے جوتے دکھانے کی کوششوں کا آغاز کر چکا تھا۔ جمیلہ کے اصرار پر اس نے ایک جوتا نکلوایا اور جوتا نکلواتے ہی سیلز مین کو دو ٹوک انداز میں بتا دیا کہ اسے جوتا پہننے کے لیے کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود سیلز مین نے ڈبے سے جوتا نکال کر اس کے

پاؤں کے پاس رکھتے ہی جان بوجھ کراس کے پاؤں کو چھوا زینی نے اپنا پاؤں بے اختیار پیچھے کھینچتے ہوئے اسے ایک بار پھر منع کیا۔ وہ فرش پر بیٹھے بیٹھے کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ مگر جیسے ہی زینی دوبارہ جوتے پہننے کے لیے اس کا اسٹریپ اوپر کرنے کے لیے نیچے جھکی سیلز مین نے دانستہ طور پر ایک بار پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اسٹریپ اوپر کرنے کی کوشش کی اور زینب کے لیے اب معاملہ برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ اسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ نہیں آتا تھا مگر جب غصہ آجاتا تو پھر اس سے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا۔

''کیا ہوا باجی؟ آپ تو ناراض ہو گئی ہیں۔'' اسے جوتا پاؤں سے جھٹکتے اور اٹھ کر کھڑا ہوتے دیکھ کر سیلز مین بھی بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

''بس کافی جوتے لے لیے ہیں۔ اب آگے کسی دکان پر دیکھ لینا۔'' اس نے بے حد تختی سے جمیلہ سے کہا، جو دکان دار کے ساتھ اب تیسرے جوتے کے لیے بھاؤ تاؤ کر رہی تھی۔

''اتنا غصہ باجی! جاؤ باجی کے لیے بوتل اور چاٹ لے کر آؤ۔'' دکاندار نے بڑے نارمل انداز میں ہنستے ہوئے زینب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا کرتی ہیں باجی؟ پڑھتی ہیں؟'' دکان دار نے اب جمیلہ سے پوچھا اس سے پہلے کہ زینی کچھ کہتی جمیلہ نے بڑے آرام سے کہا۔

''ہاں کالج میں پڑھتی ہے، بیٹھ جاؤ زینی! اب چاٹ کھا کر جائیں گے۔''

''تو پھر تم بیٹھ کر کھاؤ میں جا رہی ہوں'' زینب کا پارہ اب آسمان کو چھو رہا تھا۔ اسے اب دکان دار اور سیلز مین کے ساتھ ساتھ جمیلہ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

''اچھا... اچھا چلتے ہیں۔'' جمیلہ بھی یک دم کچھ گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ ''بس یہ جوتا لے لوں دو سو لے لیں اس کے؟'' وہ دکاندار سے کہہ رہی تھی۔

''نہیں باجی! ڈھائی سو سے کم نہیں ہوں گے۔''

دکان دار نے اس بار بے حد عجیب سے انداز میں زینی کو دیکھا۔ جو اب دکان کے دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

''نہیں بھائی دو سو۔''

زینی نے جمیلہ کی بات کاٹ دی۔ ''منت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، نہیں دے رہا دو سو کا تو رہنے دو کوئی ضرورت نہیں ہے پچاس روپے کے لیے منتیں کرنے کی۔''

اس بار جمیلہ اور دکاندار نے بیک وقت اسے دیکھا پھر دکاندار نے یک دم بے حد بدلے ہوئے لہجے میں جمیلہ سے کہا۔

''ڈھائی سو سے ایک پیسہ بھی کم نہیں لوں گا لینا ہے تو لیں ورنہ رکھ دیں۔'' اس بار اس کے لہجے میں چند لمحے کی وہ بے تکلفی اور گرم جوشی غائب ہو چکی تھی۔ جس کا مظاہرہ وہ جمیلہ کے ساتھ کر رہا تھا۔ جمیلہ نے بے حد ناگواری کے عالم میں زینی کو دیکھا پھر جوتا رکھ دیا۔

دوسرے دو جوتوں کی ادائیگی کرتے ہی وہ زینی کے پاس آئی اور اس نے دانت پیستے ہوئے اس سے کہا۔

''کیا تکلیف ہو گئی بیٹھے بٹھائے تمہیں؟ تمہاری وجہ سے دوسو کا جوتا دیتے دیتے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔''

''میری بات کان کھول کر سن لو تم، خبردار آئندہ کسی دکان پر تم نے میرا نام لیا یا دکان دار سے میرے بارے میں کچھ کہا۔'' زینب نے تقریباً غراتے ہوئے کہا۔

''آخر ہو کیا گیا تمہیں؟''

''تمہارے سامنے اس نے میرا پاؤں چھوا پھر میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور تم ''

جمیلہ نے اس کی بات کاٹ دی ''تو کیا قیامت آ گئی؟ تم اتنی خوبصورت ہو کہ کس کا دل نہیں چاہے گا تمہیں ہاتھ لگانے کو۔'' جمیلہ نے بے حد عامیانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''بند کرو اپنی بکواس یہ سب تمہاری اس بکواس کا نتیجہ ہے۔ چھچھوری اور بے ہودہ باتیں کر رہی تھیں تم اس دکاندار اور سیلز مین کے ساتھ آخر تمہیں مذاق کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کے ساتھ؟ تمہاری باتوں کی وجہ سے اسے شہ ملی، اسی لیے اس نے یہ حرکت کی'' اس نے جمیلہ کو بری طرح جھڑک دیا۔

''ان ہی چھچھوری اور بیہودہ باتوں کی وجہ سے اس نے جوتوں کی قیمت کم کر کے دی ہے یہ ہنسی مذاق نہ کرتی تو وہ پانچ سو والے جوتے تین تین سو میں دیتا؟'' جمیلہ نے بڑے فخر سے کہا۔

''اگر تم مہنگے والے جوتے نہیں خرید سکتی تھیں تو تمہیں انہیں نکلوانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ سو دو سو روپے کے لیے تم اس کی بے ہودہ باتیں سنتی رہی۔'' زینی کو اور غصہ آیا۔

''سو دو سو نہیں پورے چار سو روپے کی بچت ہوئی ہے اور تم نے نخرہ دکھایا تو کیا مل گیا تم ایک جوتا تک نہیں خرید سکی ہو، بچت تو دور کی بات ہے اور اچھا بھلا وہ سیلز مین بوتل اور چاٹ لینے کے لیے گیا تھا۔ وہ تک نہیں کھانے دی۔'' جمیلہ نے بے حد ڈھٹائی سے کہا۔

''میں لعنت بھیجتی ہوں اس طرح کی چاٹ اور بوتل پر۔'' زینی کی برداشت جواب دے رہی تھی۔

''تم بھیجتی ہو گی میں تو نہیں، اللہ رزق دے رہا ہے تو ناشکری کیوں کریں۔'' جمیلہ نے بے حد اطمینان سے کہا۔ ''مت کرو لیکن آئندہ مجھے ساتھ لانے کی کوشش مت کرنا میں نہیں آؤں گی تمہارے ساتھ بازار کچھ بھی لینے۔''

''تمہیں پتا ہے زینی! تمہارے ساتھ آنے کی وجہ سے دکان دار کتنی رعایت دے دیتے ہیں مجھے؟'' جمیلہ روانی میں کہہ گئی اور گویا زینب کے سر پر بم پھوڑ دیا۔

وہ بے اختیار چلتے چلتے رک گئی۔

''کیا مطلب؟''

''کوئی مطلب نہیں، ویسے ہی بتا رہی ہوں تمہیں کہ تمہارے ساتھ آنے کا کتنا فائدہ ہوتا ہے مجھے ایمان داری کی بات ہے جب تم ساتھ

نہیں آتیں تو مجھے اتنی رعایت نہیں ملتی جتنی تمہارے ساتھ ہونے کی وجہ سے ملتی ہے کئی دکان دار تو اب تمہارے بارے میں باقاعدہ پوچھتے ہیں مجھ سے، جب تم ساتھ نہیں آتیں۔"

وہ مزے سے بتا رہی تھی۔ اور اس وقت زینب کے جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا۔ اسے بے حد ہتک اور ذلت کا احساس ہوا تھا۔ وہ بازاروں میں جانے کی شوقین نہیں تھی مگر جمیلہ پچھلے تین ماہ سے اسے باقاعدگی سے ہفتے میں ایک دو بار بازار لے آیا کرتی تھی۔ وہ سوچتی تھی، وہ بچپن کی دوستی کی وجہ سے اسے اپنی شادی کی تیاریوں میں شریک کر رہی ہے لیکن اسے اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ اس کی خوبصورتی کو استعمال کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا ان سب دکانوں پر دکاندار اس کا نام بھی جمیلہ کے طفیل جانتے ہوں گے۔ چہرہ نہ بھی پہچانتے ہوں لیکن اس چادر میں لپٹے جسم کو تو بآسانی شناخت کر لیتے ہوں گے۔

ایک لفظ بھی کہے بغیر وہ چلنے لگی۔ وہاں بازار میں کھڑے ہو کر جمیلہ سے کچھ کہنا بے کار تھا لیکن یہ بات طے تھی، اسے دوبارہ اس کے ساتھ کبھی بازار نہیں جانا تھا۔

جمیلہ اگلے دن اسے منانے کے لیے آئی تھی۔

"آخر اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے دکان دار کو جو گاہک اچھا لگتا ہے۔ وہ اسے رعایت دیتا ہے اور دوسروں سے زیادہ رعایت دیتا ہے۔ یہ تو ہماری دنیا میں ہوتا ہے۔"

"میں بازار میں دکاندار کو اچھا لگنے نہیں جاتی اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ کوئی مجھے دوسروں سے زیادہ رعایت دے۔" زینی کو اس کی بات پھر بری لگی۔

"دیکھو زینی! یہ تو مانو تم کہ خوبصورت لڑکیوں کو سارے مرد رعاتیں دیتے ہیں اور خوبصورت عورتیں رعاتیں لیتی ہیں۔"

"پر میرے ماں باپ نے مجھے یہ تربیت نہیں دی کہ میں اپنی خوبصورتی اور ادائیں استعمال کر کے کسی سے رعایت لیتی پھروں۔" زینی کو اس کا پر غصہ آیا۔

"تم میری بات کا پھر غلط مطلب نکال رہی ہو۔" جمیلہ نے اسے برہم دیکھ کر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"اس لیے کیونکہ تمہاری اس بات کا مطلب نکلتا ہی غلط ہے۔ تم دوبارہ کبھی مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جانے کے لیے مت آنا۔ تمہارا وقت ضائع ہوگا۔" زینی نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"دیکھو زینی! آخر حرج کیا ہے۔ دکان دار کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے میں یا بقول تمہارے اسے تھوڑی بہت ادائیں دکھانے میں، آخر ہمارا جاتا ہی کیا ہے اس میں۔ بلکہ الٹا کچھ مل ہی جاتا ہے۔ میں تو اسے عورت کی سمجھداری سمجھتی ہوں کہ وہ اس طرح دکان دار سے کچھ رعاتیں لے لیتی ہے۔"

"جسے تم سمجھداری کہتی ہو، میں اسے بے حیائی کہتی ہوں اور میرے ماں باپ نے مجھے یہ نہیں سکھایا کہ میں دکان دار کے ساتھ چار بے ہودہ جملوں کے تبادلے کے بعد سو روپے کا دوپٹہ اسی روپے میں لے کر اسے بڑی کامیابی سمجھوں۔ مجھے ایسی "رعایتی چیزوں" میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

جمیلہ کے منہ سے پھر ایک بھی لفظ نہیں نکلا۔ زینی اس کے پاس سے اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

"افسر بن جائے گا اس کا منگیتر، اس لیے اتنی پارسائی پھرتی ہے۔ اس محلے میں ساری عمر ایسی زندگی جینی پڑتی تو میں دیکھتی اتنے نخرے کے ساتھ کیسے رہتی۔" جمیلہ بے حد غصے میں سوچتے ہوئے چلی گئی۔

☆☆☆

"کہاں ہے بھئی یہ تمہاری بہن؟"

زینی کرنٹ کھا کر چادر اتارتے ہوئے بستر سے اٹھ گئی۔ وہ شیراز کی آواز تھی، وہ صحن میں ربیعہ سے پوچھ رہا تھا۔

"بہن تو سو رہی ہے۔" ربیعہ نے صحن کا بیرونی دروازہ بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"سو رہی ہے تو جا کر اٹھاؤ اسے۔ یا پھر میں اٹھاؤں؟" شیراز نے مسکراتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑا لفافہ ربیعہ کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" ربیعہ نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"سموسے ... گھر کے لیے لیا تھا تو سوچا زینی کے لیے بھی لے جاؤں۔"

"تو پھر ایک ہی لاتے نا۔ اگر بیگم کے لیے لائے ہیں تو ... خواہ مخواہ چھ لانے کی زحمت کیوں کی؟" ربیعہ نے اس کی بات کا برا مانتے ہوئے لفافہ کھول کر دیکھا۔

"میں نے سوچا شاید زینی کو زیادہ کھانے ہوں۔" شیراز نے اسے چھیڑا۔

"چھ تو خیر وہ بھی نہیں کھا سکتی۔"

"نہیں تو میں بھی تو کھاؤں گا اس کے ساتھ۔" شیراز نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"تو یوں کہیں نا شام کی چائے پینے آئے ہیں یہاں۔" ربیعہ کچھ اور ناراض ہوئی۔

"یہی سمجھو۔"

"ویسے کتنے دنوں بعد ہمارا خیال آ کیسے گیا آپ کو؟ پہلے تو پھر بھی کبھی کبھار آ جاتے تھے۔ اب تو جیسے عید کا چاند ہو گئے ہیں شیراز بھائی۔" ربیعہ نے اسے جتایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا زینی اپنے بال لپیٹتی دوپٹے سے سر چھپاتی باہر نکل آئی۔

"دیکھا آپ کی ہونے والی بیگم کو تو نیند میں بھی آپ کی آمد کی خبر ہو جاتی ہے۔ کسی کو جگانا پڑا ہے بھلا؟" ربیعہ کہتے ہوئے باورچی خانہ کی طرف چلی گئی۔

"میں پہلے ہی جاگ رہی تھی۔" زینی نے ربیعہ کو گھورتے ہوئے کہا جو بڑے معنی خیز انداز میں اسے مسکراہٹ دیتی ہوئی گئی تھی۔

"آپ کیسے ہیں؟" زینی نے اس مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے شیراز سے پوچھا۔ ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ ابھی تک صحن میں کھڑا ہے۔

''آپ بیٹھیں... ربیعہ نے ابھی تک بیٹھنے تک کے لیے نہیں کہا آپ سے۔'' وہ سوال کا جواب لینے سے پہلے ہی صحن میں تخت کے پاس پڑی کرسیوں کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن تم اتنے دنوں سے کہاں غائب ہو؟'' شیراز نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں... میں وہ... ماہ اور مائرہ یہاں پر ہیں تو ان ہی کے ساتھ مصروف ہوں۔'' زینی نے... نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''اتنی مصروف تھیں کہ میرا خیال تک نہیں آیا؟'' شیراز نے گلہ کیا۔

''آپ بھی تو بہت مصروف ہیں آج کل۔ گھر پر کہاں ہوتے ہیں۔'' زینی نے مدھم آواز میں کہا۔

''تمہیں اچھی طرح پتا ہے کب میں گھر پر ہوتا ہوں اور کب نہیں۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی زینی کہ تم مجھ سے ناراض تھیں۔'' زینی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''نہیں... آپ سے ناراض کیسے ہو سکتی ہوں میں؟'' زینی نے ایک بار پھر اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''اس دن میں کچھ غصے میں آ گیا تھا۔ خوامخواہ تم کو ڈانٹا میں نے۔ بعد میں بہت پچھتایا۔ اس دن کے بعد سے انتظار ہی کرتا رہا کہ تم آؤ تو میں تم سے ایکسکیوز کروں لیکن تم آئی ہی نہیں۔''

''کوئی ضرورت نہیں آپ کو ایکسکیوز کرنے کی۔'' زینب نے بے اختیار اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے خلاف کبھی اپنے دل میں کچھ نہیں رکھتی اور غصہ تو بالکل بھی نہیں۔''

''شکایت بھی نہیں؟''

''شکایت تھی بھی تو اب ختم ہو گئی ہے۔ آپ بھی یہ سوچیں بھی نہ کہ آپ کو مجھ سے ایکسکیوز کرنا چاہیے۔'' اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''شکر ہے، میں تو سوچ رہا تھا پتا نہیں تم کتنی ناراض ہو کہ گھر آنا ہی چھوڑ دیا تم نے۔''

شیراز نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ زینی مسکرائی، اسے خوشی ہوئی تھی وہ اس کا خیال رکھتا تھا۔

''اتنے دن سے تمہارے ہاتھ کی کوئی چیز کھانے کو ترس گیا ہوں۔ تم نے تو کچھ بھیجنا بھی بند کر دیا ہے۔''

شیراز نے بے حد بے تکلفی سے کہا۔ زینی بے اختیار شرمندہ ہوئی۔ اس نے واقعی اتنے دنوں میں شیراز کے لیے گھر میں پکنے والی کوئی چیز نہیں بھجوائی تھی۔

''آپا کی وجہ سے اتنی پریشانی ہے کہ بس مجھے خیال ہی نہیں رہا۔'' اس نے کہا۔ ''آپ مجھے بتا دیں، کیا کھانا چاہتے ہیں۔ میں رات کو بنا کر بھجوا دیتی ہوں۔''

''اپنی مرضی کی کوئی بھی چیز۔'' شیراز نے بے ساختہ کہا۔

''اور زہرہ آپا کا مسئلہ ابھی بھی حل نہیں ہوا؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' زینی ایک بار پھر اداس ہو گئی۔ ''وہ ابو سے موٹر سائیکل مانگ رہے ہیں۔''

شیراز یک دم ہنسا۔ زینب کو اس کی ہنسی بری طرح کھلی۔

''سائیکل مانگتے تو چچا شاید اپنی سائیکل ہی دے آتے۔'' شیراز نے قہقہے کے ساتھ کہا مگر زینی کے چہرے پر چھائی سنجیدگی کو دیکھ کر وہ یک دم پھر سنجیدہ ہو گیا۔

''بے وقوف ہے وہ۔ میں ابو سے کہوں گا، وہ جا کر نعیم کو سمجھائیں۔''

زینب نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ چپ بیٹھی رہی۔ چند لمحے پہلے چھانے والی سرشاری اور خوشی یک دم ایک بار پھر کہیں غائب ہو گئی تھی۔

''کم از کم اب اس طرح منہ بنا کر تو مت بیٹھو کہ مجھے لگے تمہیں میرے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہے۔'' شیراز نے بے ساختہ کہا۔

زینی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''آپ کو لگتا ہے، مجھے آپ کے آنے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی؟''

''تمہارے چہرے کو دیکھ کر تو ایسا ہی لگتا ہے۔''

شیراز سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں تو سوچ رہا تھا تم بہت خوش ہو گی، ہنسو گی، باتیں کرو گی لیکن تم بالکل چپ بیٹھی ہو۔'' اس نے گلہ کیا۔ اس سے پہلے کہ زینی کچھ کہتی، ربیعہ چائے کی ٹرے لے کر صحن میں آ گئی۔

''آپ کو پتا تو ہے شیراز بھائی! یہ تو اس کی شروع سے عادت ہے۔ مجال ہے اس میں کوئی تبدیلی آ جائے۔'' اس نے شیراز کی بات سن لی تھی۔

''بہت بری عادت ہے اور زینی کو پتا ہے مجھے یہ عادت پسند نہیں ہے۔'' شیراز نے زینی کو دیکھتے ہوئے جتانے والے انداز میں کہا۔

ربیعہ کچھ کہنے کے بجائے ٹرے رکھ کر چلی گئی۔

زینی نے شیراز کو پلیٹ تھمائی۔ ''خالہ کیسی ہیں؟'' اس نے شیراز سے نسیم کے بارے میں پوچھا۔ ''امی ٹھیک ہیں۔ وہ بھی تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھیں'' شیراز نے ایک سموسا اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہا۔

''میں کل آؤں گی۔'' وہ شیراز کی پلیٹ کے ایک طرف چٹنی ڈالتے ہوئے بولی۔

''اور نفیسہ خالہ نظر نہیں آ رہیں؟'' شیراز کو کافی دیر بعد نفیسہ کا خیال آیا۔

''وہ اندر ہیں۔ نماز پڑھ رہی ہیں، ابھی آ جاتی ہیں۔'' زینی نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

''ارے میں نے تمہیں بتایا کہ ابو بحال ہو گئے ہیں۔'' شیراز نے یک دم کہا۔

زینی نے چونک کر اسے دیکھا پھر بے ساختہ مسکرائی۔

''کب؟'' اس نے بے حد گرم جوشی سے پوچھا۔

''کل۔''

''اللہ کا شکر ہے، میں تو بہت دعائیں کر ...'' وہ بات کرتے کرتے بے اختیار رکی۔ اسے یاد آیا، وہ پچھلی بار ایسی ہی کسی بات پر ناراض

ہوا تھا۔ شیراز نے اس بار ایسا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

"دعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہوتی ہے زینی! اچھا کے افسر نے سفارش کی ہے ابو کے محکمے میں، ورنہ کیا خالی دعاؤں سے بحال ہو جاتے؟ ارے تم بھی تو سموسہ لو نا میں تمہارے لیے لایا تھا۔" شیراز کو بات کرتے یک دم خیال آیا۔

"میں لے رہی ہوں، جو بھی ہے بس شکر ہے کہ تایا ابو کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ خالہ بھی اتنی پریشان تھیں۔" زینی نے دوسری پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ اب شیراز کے اچھے موڈ کی وجہ کو با آسانی سمجھ سکتی تھی۔ اس نے اپنے کندھوں سے یک دم جیسے کچھ بوجھ ہلکا ہوتا محسوس کیا تھا کیونکہ شیراز کے کندھوں سے ایک بڑا بوجھ ختم ہو گیا تھا۔

بہت دنوں کے بعد اس وقت شیراز کے پاس بیٹھے چائے پیتے ہوئے اس نے بہت ساری باتیں کیں اور بہت دنوں کے بعد کسی بات پر ہنسی۔ خود اس نے شیراز کو بھی انٹرویو کے بعد آج پہلی بار اتنا پرسکون اور مطمئن دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ اس وقت صحن میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھی، جب دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"فاروق! جاؤ جا کر دروازہ کھولو۔" زینی نے ایک بچے کی کاپی چیک کرتے ہوئے اسے کہا۔

بچے نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ زینی نے کاپی کا صفحہ پلٹتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے کرنٹ کھا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ زہرہ اپنی چھوٹی بچی کو گود میں لیے صحن میں دروازے سے اندر آ گئی تھی۔

"زہرہ آپا! آپ اس طرح اچانک....." اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی بات کس طرح مکمل کرے۔ زہرہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ زینب کے بدترین خدشات جیسے صحیح ثابت ہونے لگے تھے۔ وہ کچھ دیر گم صم وہیں صحن کے وسط میں کھڑی رہی۔ پھر کاپی فاروق کو پکڑاتے ہوئے اندر کمرے میں چلی گئی۔

زہرہ اور نفیسہ دونوں بستر پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں جبکہ ربیعہ زہرہ کی بچی کو اپنی گود میں لیے افسردہ بیٹھی ہوئی تھی۔ زینی کے اندر آتے ہی اس بچی کو لے کر باہر چلی گئی۔ زینی نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔

"تمہیں گھر چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا جو بھی تھا، وہیں رہنا چاہیے تھا۔" نفیسہ نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے زہرہ سے کہا۔ "میں گھر چھوڑ کر آئی ہوں امی؟ انہوں نے دھکے دے کر مجھے گھر سے نکالا ہے۔" زہرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

زینی زہرہ کے پاس بیٹھ گئی۔

"بس میری قسمت ہی خراب ہے امی! قسمت اچھی ہوتی تو اس بار اللہ مجھے بیٹا دیتا، بیٹی نہیں۔" وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

"پر آپا! بیٹا یا بیٹی ہونے میں آپ کا قصور تو نہیں ہے۔ سائنس تو....." زینی نے زہرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنا چاہا۔ زہرہ نے اس

کی بات بے حد ناراضی سے کاٹ دی۔

"بس کرو نسب اسب پتا ہے لوگوں کو لیکن کوئی مرد سائنس سے پوچھ کر عورت کی قسمت کا فیصلہ نہیں کرتا اور ایف اے فیل آدمی کو میں کیا سائنس سمجھاؤں۔ وہ شیراز کی طرح پڑھا لکھا اور سمجھدار نہیں ہے۔"

"ابو نے بھی تو ایف اے ہی کیا ہے۔" زینی نے کہا۔

"ہر مرد ابو جیسا نہیں ہوتا۔ ساری بات پیسے کی ہے جو نہ ان کے پاس ہے، نہ ہمارے پاس۔ ابو کے پاس دولت ہوتی تو تین چھوڑ، چھ بیٹیاں بھی ہو جاتیں تو کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ وہ ایک لفظ بھی کہتا۔"

زینی اس بار کچھ نہیں کہہ سکی۔

"تمہارے ابو آ جائیں تو وہ خود جا کر نعیم سے بات کرتے ہیں۔" نفیسہ نے زہرہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"کیا بات کریں گے؟ فہمیدہ پھوپھو نے مجھے صاف صاف کہا ہے کہ میں اپنی بیٹیوں کے ساتھ اپنے باپ کے گھر پر ہی رہوں اور اگر مجھے شوہر کے گھر آ کر رہنے کا شوق ہے تو میں اپنے باپ سے کہوں کہ وہ پہلے موٹر سائیکل بھیجیں پھر بچی کو۔"

"کہاں سے لائیں تمہارے ابو موٹر سائیکل کے لیے پیسے؟ ابھی زینی اور ربیعہ کی شادی کرنی ہے۔ اس کے لیے بھی پیسے پاس نہیں ہیں۔ اوور ٹائم کر کے جو تھوڑی بہت بچت ہوتی ہے، اس سے کتنے مطالبے پورے کریں گے تمہارے سسرال والوں کے؟" نفیسہ ایک بار پھر رونے لگی تھیں۔

"آپ نے اپنی مرضی سے میری شادی یہاں کی تھی۔ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ مجھے پھوپھو کے یہاں بیاہیں اور اب آپ اس طرح میرے سسرال والے کہتے ہیں جیسے میں نے مرضی سے انہیں منتخب کیا تھا۔" زہرہ کو ماں کی بات بری لگی۔

زینی اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ اس کا جی یک دم ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ دو کمروں کے اس گھر میں پانچ افراد پہلے ہی رہتے تھے۔ اور جب بھی زہرہ آتی تو جگہ تنگ پڑنے لگتی۔ ضیاء اور سلمان باہر صحن میں سونا شروع کر دیتے اور اب سردیاں شروع ہو رہی تھیں۔ وہ صحن میں نہیں سو سکتے تھے۔ اس نے مختصر سے برآمدے سے گزرتے ہوئے رنجیدگی سے وہاں رکھے سامان کو دیکھا۔ وہاں دو چار پائیاں بچھانا ناممکن تھا۔

"اور اگر زہرہ آپا خدانخواستہ ہمیشہ کے لیے اپنی بچیوں کے ساتھ یہاں رہنے آ گئیں تو کیا ہوگا؟" زینی نے پریشانی کے عالم میں سوچا۔

ربیعہ زہرہ کی چھوٹی بیٹی کو لے کر صحن میں ٹہل رہی تھی۔ اتنے ہفتے گزر جانے کے باوجود بچی ابھی بھی بے نام تھی۔ ربیعہ اور زینی کے درمیان ایک جملے کا تبادلہ بھی نہیں ہوا۔

زینی گم صم ان بچوں کے پاس جا کر بیٹھ گئی جنہیں وہ پڑھا رہی تھی۔ لیکن اب اس کا انہماک اور توجہ یک دم غائب ہو چکی تھی۔ وہ صرف چند منٹ ان بچوں کو مزید پڑھا سکی اور ان چند منٹوں میں بھی اس نے انہیں کیا پڑھایا، اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔

"تم لوگ جاؤ، کل آنا۔" اس نے یک دم ہاتھ میں پکڑی وہ کاپی بند کرتے ہوئے کہا، جسے وہ چند منٹ پہلے چیک کرتے کرتے چھوڑ گئی تھی۔

بچے یک دم بے حد پر جوش انداز میں اپنی چیزیں سمیٹنے لگے تھے۔ زینی باپ کے بارے میں سوچ رہی تھی جو ابھی چند گھنٹوں بعد گھر واپس

آتے اور زہرہ کو اپنی بچی سمیت وہاں دیکھ کر اسی طرح شاکڈ ہو جاتے۔ اسے باپ پر بے حد رحم آ رہا تھا۔ وہ صبح بہت خوش گئے تھے۔ آج وہاں کوئی پارٹی تھی۔ ان کا کوئی کولیگ ریٹائر ہو رہا تھا۔ اور اب زینی کو بے اختیار رونا آیا۔ اسے ماں سے زیادہ باپ کی تکلیف پر رونا آتا تھا۔ اور وہ جانتی تھی، آج کی شام ایک بار پھر اس کا باپ اپنی ساری ایمان داری اور شرافت کے ساتھ کھینچوا بن کر اپنی بیٹی کے سسرال جائے گا۔

☆☆☆

''مجھ سے بڑی غلطی ہوئی جو میں تمہاری بیٹی بیاہ کر یہاں لائی۔ ارے میرا بیٹا تو تب ہی مجھ سے کہہ رہا تھا۔ کہ ماموں کے ہاں مت بیاہ، وہاں سے کیا ملنے والا ہے مگر میں نے کہا نہیں، بھائی ہے میرا۔ میں اس کی بیٹی نہیں لاؤں گی تو کون لائے گا اور بھائی ایسا بھی گیا گزرا نہیں۔ کچھ نہ کچھ تو دے گا ہی بیٹی کو۔ ارے مجھے کیا پتا تھا، بھائی واقعی خالی ہاتھ ہی بھجوا دے گا بیٹی کو۔''

فہمیدہ پچھلے پندرہ منٹ سے مسلسل بول رہی تھیں اور ضیا ہمیشہ کی طرح سر جھکائے خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھے تھے۔

''آپا! اپنی استطاعت کے مطابق جہیز تو دیا تھا میں نے۔'' انہوں نے پوری گفتگو میں پہلی بار کچھ کہنے کی ہمت کی۔

''وہ چار چیزیں جو جہیز کے نام پر تم نے ہمارے منہ پر ماری تھیں وہ۔ وہ ابھی اٹھا کر لے جاؤ اپنے گھر۔ ٹی وی دیا؟ فریج دیا؟ موٹر سائیکل دیا؟ فرنیچر تک تو پورا نہیں تھا تمہاری بیٹی کا اور تم بتا رہے ہو مجھے کہ تم نے جہیز دیا تھا بیٹی کو۔''

''آپا! آپ کو شادی کے وقت پتا تھا کہ میں ایسا ہی جہیز دے سکتا ہوں۔ میں نے کوئی جھوٹا وعدہ تھوڑی کیا تھا آپ سے جو پورا نہیں کیا اور آپ مجھے جتا رہی ہیں۔ میں ایک معمولی کلرک ہوں میں اس سے زیادہ کیا دے سکتا تھا۔'' ضیا نے بے حد سنجیدگی سے باری باری نعیم اور فہمیدہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کلرک نہیں ہو تم ... انکم ٹیکس میں کلرک ہو۔ ارے سارے لوگ لاکھوں کروڑوں کی جائیدادیں بنا لیتے ہیں اور تم نے تیس سال میں اپنی بیٹیوں کا جہیز تک نہیں بنایا۔ ایک موٹر سائیکل تک نہیں دے سکے میرے بیٹے کو۔'' وہ اب ہمیشہ کی طرح باقاعدہ طعنے دے رہی تھی۔

''آپا! آپ کو پتا ہے، میں حرام نہیں کھاتا۔''

''ہاں، بس اس دنیا میں ایک تم ہی تو نیک ہو جو حرام نہیں کھاتا باقی ساری دنیا تو بس حرام پر ہی پل رہی ہے۔'' فہمیدہ کے لہجے میں اور تندی و ترشی آ گئی تھی۔

''آپا! اگر موٹر سائیکل کی بات ہے تو میں ایک دو سال میں پیسے اکٹھے کر کے۔'' ضیا نے۔ موضوع بدلنے کی کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔

''ایک دو سال میں پیسے اکٹھے کر کے موٹر سائیکل دینی ہے تو پھر موٹر سائیکل کے بجائے گاڑی ہی دو میرے بیٹے کو۔ ایک دو سال اس طرح کہا ہے جیسے ایک دو دن کی بات ہے۔''

''بس ماموں! کہہ دیا میں نے۔ اب مجھے زہرہ کو اس گھر میں نہیں لانا۔''

نعیم نے پہلی بار اس گفتگو میں مداخلت کی تھی اور اس کا لہجہ بھی فہمیدہ سے مختلف نہیں تھا۔

"میں دوسری شادی کروں گی اپنے بیٹے کی۔ ارے میرا اکلوتا بیٹا ہے، بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آرہے ہیں۔ اس کے لیے۔ گھر بھر دیں گے اگلے جہیز سے۔"

فہمیدہ کم از کم اس دن کچھ بھی سننے پر تیار نہیں تھیں۔ ضیاء بے حد دل برداشتہ ہو کر وہاں سے نکلے تھے اور وہ زندگی میں کئی بار اس طرح دل برداشتہ ہو کر اس گھر سے نکلے تھے۔ انہوں نے زندگی میں کبھی کہیں اور اس طرح کی ذلت آمیز باتیں نہیں سنی تھیں، جتنی اس گھر سے سنی تھیں وہاں انہوں نے بیٹی نہ بیاہی ہوتی تو شاید وہ کبھی رزق حلال پر دیے جانے والے طعنوں کے بعد اس گھر میں قدم بھی نہ رکھتے۔

سڑک پر سائیکل چلاتے ہوئے اس دن انہوں نے زندگی میں پہلی بار آس پاس سے گزرتی موٹر سائیکلوں کو دیکھا اور ان کی قیمت کا اندازہ لگانا چاہا۔ ایسی ہی کسی ایک موٹر سائیکل سے ان کی بیٹی کا گھر ایک بار پھر بس سکتا تھا۔ انہوں نے دفتر کے علاوہ ان ممکنہ جگہوں کے بارے میں سوچا، جہاں سے وہ قرضہ لے سکتے تھے اور کتنا لے سکتے تھے انہوں نے اس قرضے کو ادا کرنے کے لیے ممکنہ ذرائع کے بارے میں بھی سوچنا شروع کر دیا۔ رات کے اوقات میں انہیں کسی فیکٹری میں اکاؤنٹس کا کچھ کام مل سکتا تھا یا شام کے وقت کسی دکان پر سیلز مین کی جاب۔ صبح آفس جانے سے پہلے وہ اخبار بیچ سکتے تھے۔ انہوں نے باری باری ان سب کاموں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جن سے انہیں کچھ آمدنی ہو سکتی تھی۔ جمعہ کی چھٹی کے دن وہ کسی کے گھر مالی کا کام بھی کر سکتے تھے۔ امکانات نظر آنے لگے تھے۔ ضیاء کو کچھ اطمینان ہوا، وہ اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے۔

☆☆☆

"زینی بیٹا! ابھی تک کیوں جاگ رہی ہو؟" ضیاء تہجد کے لیے وضو کرنے نکلے تھے جب انہوں نے زینب کو صحن میں پڑے تخت پر گم صم بیٹھے دیکھا۔ وہ تشویش میں مبتلا ہو کر اس کے پاس آئے۔

"کچھ نہیں، ایسے ہی۔ بس نیند نہیں آرہی تھی۔"

زینب نے باپ سے نظریں چرانے کی کوشش کی مگر ضیاء اس کی متورم سرخ آنکھیں دیکھ چکے تھے۔

"بیٹا سونے کے لیے لیٹو گی تو نیند آئے گی نا۔ اس طرح یہاں بیٹھ کر نیند کیسے آجائے گی۔"

وہ اس کے پاس تخت پر بیٹھ گئے۔ یہ اندازہ لگانا ان کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ کیوں پریشان تھی۔ گھر میں اس وقت سب کی پریشانی کی واحد وجہ زہرہ ہی تھی۔

"مجھے کبھی کبھی اللہ سے بہت شکایت ہوتی ہے ابو!" زینی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کتنی دعائیں کی تھیں ہم سب نے کہ اللہ اس بار آپا کو ایک بیٹا دے دے مگر اللہ نے کسی کی دعا نہیں سنی۔ اللہ بعض دفعہ دعائیں نہیں سنتا نا۔"

"بری بات ہے زینی اس طرح نہیں کہتے۔" ضیاء نے اسے ٹوکا۔ "کیا فرق پڑتا ہے بیٹے یا بیٹی سے؟"

"آپ کو پتا ہے، کتنا فرق پڑتا ہے ابو! زہرہ آپا کو اور ہمیں فرق پڑ رہا ہے نا بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے؟" اس نے باپ کی بات کو رد کرتے

ہوئے کہا۔

''نہیں، جب لوگ رحمت کو ٹھکرانے لگیں اور اسے عذاب سمجھیں تو پھر وہ دوسروں کے لیے آزمائشیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ زہرہ کا میاں اور سسرال والے اگر اللہ کی رحمت کی ناقدری اور تذلیل کرتے ہوئے اسے ٹھکرا سکتے ہیں تو پھر ہم تو انسان ہیں۔ ہم ان سے اچھائی کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟'' ضیاء نے مدھم آواز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''وہ جو چاہے کریں، تکلیف تو ان کو نہیں ہو رہی۔ تکلیف تو زہرہ آپا کو اور ہم کو ہی پہنچ رہی ہے نا؟''

''اس دنیا میں ہاں۔ پر اگلی دنیا میں خسارے کا سامنا ان کو ہوگا، ہم کو نہیں۔''

''اس'' دنیا میں کون ''اس'' دنیا کا سوچتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔'' اس نے بے اختیار باپ سے ایک بار پھر شکوہ کیا۔

''جو نہیں سوچتا نہ سوچے لیکن میں اور میری اولاد تو سوچتے ہیں نا؟'' ضیاء نے بے حد سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے جیسے سوال کیا۔

زینی نے اثبات میں سر نہیں ہلایا۔ اس نے باپ سے نظریں چراتے ہوئے ایک بار پھر شکایتی انداز میں کہا۔

''لیکن کیا ہو جاتا اگر اللہ آپا کو ایک بیٹا دے دیتا۔''

''بیٹیوں میں کیا برائی ہے؟'' ضیاء نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کوئی ایک برائی تھوڑی ہے۔ برائیاں ہی برائیاں ہیں۔'' زینی کی آنکھوں سے اب آنسو گرنے لگے تھے۔ ''ہر بار زہرہ آپا کی وجہ سے کتنی بے عزتی کرتے ہیں نعیم بھائی اور پھوپھو آپ کی۔ جب میری اور ربیعہ کی شادی ہو جائے گی تو آپ کو اسی طرح ان لوگوں کی باتیں بھی سننا پڑیں گی۔''

ضیاء اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑے۔ زینی کے آنسوؤں کی روانی میں اب اضافہ ہو گیا تھا۔

''زینی' اتنی منفی باتیں کیوں سوچتی ہو تم؟ شیراز اور اس کے گھر والے کتنا خیال رکھتے ہیں تمہارا اور ربیعہ کے سسرال والے بھی بہت اچھے ہیں۔ نعیم بھی وقت گزرنے کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اتنا آگے کا مت سوچا کرو۔ جاؤ اب جا کر سو جاؤ۔ صبح کالج جانا ہے تمہیں۔''

ضیاء نے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ جو چیز ایک بار زینی کے دل میں آ جاتی، اسے نکالنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ اس کی سوئی ایک بار جس بات پر اٹک جاتی، اٹک جاتی۔

''آپ مانیں یا نہ مانیں ابو! اللہ نے آپا کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔''

''بہت بری بات ہے زینی! انسان کو اتنا ناشکرا نہیں ہونا چاہیے۔'' ضیاء کو اس بار اس کا جملہ بری طرح کھلا۔

''میں ناشکری نہیں ہوں لیکن میں جب بھی آپا کے بارے میں سوچتی ''

زینی نے مدافعانہ انداز میں کہنے کی کوشش کی لیکن ضیاء نے اس کی بات کاٹ دی۔

''دنیا اللہ نے صرف تمہاری آپا کے لیے نہیں بنائی۔ زہرہ سے بھی زیادہ تکلیف میں جی رہے ہیں لوگ۔ تو کیا ہر ایک اللہ سے ایسی باتیں کرنے لگے۔''

وہ باپ کی بات پر خجل سی ہوگئی۔ ''میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا۔''

''گھر کا نوکر گھر کے مالک کے بارے میں کوئی بری بات کہے تو مالک کیا حال کرتا ہے اس کا۔ اللہ تو پھر رحیم اور غفور ہے۔ ہماری زبان پر آنے والی ہر بات اور دل میں آنے والے ہر برے خیال کو سننے اور جاننے کے باوجود ہماری دعائیں سنتا ہے۔ آزمائشیں دور کرتا ہے، نوازتا ہے۔ جب بھی زہرہ کے گھر میں کوئی مسئلہ ہوا، اللہ نے ختم کیا نا؟'' وہ اب زینی سے پوچھ رہے تھے۔

''ہاں۔۔۔ پر اللہ جلدی آزمائشیں ختم کیوں نہیں کرتا؟'' اس نے اضطراب کے عالم میں باپ سے پوچھا۔

''ہر کام کا وقت ہوتا ہے زینب! ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔'' ضیا نے اسے سمجھایا۔ ''انسان کو انتظار کرنا سیکھنا چاہیے۔ صبر اور شکر کے ساتھ انتظار۔''

''میں انتظار نہیں کر سکتی ابو! آپ کو پتا ہے، مجھے ہر چیز جلدی چاہیے۔'' زینی نے بے حد بے چارگی سے کہا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اسے واقعی انتظار کرنا نہیں آتا تھا۔

''بہت بے وقوف ہو زینی! سو جاؤ جا کر مجھے تہجد پڑھنا ہے۔''

ضیا نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ جانتے تھے وہ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے ہر چیز فوراً چاہیے ہوتی تھی۔ انہیں یاد نہیں پڑتا تھا، وہ کبھی اس کے بچپن میں آفس سے واپسی پر کھانے کی کوئی چیز لائے ہوں اور زینی نے اسی وقت نہ کھائی ہو۔ یہی حال کسی کھلونے، کپڑے یا استعمال کی دوسری چیزوں کا ہوتا تھا۔ زینی کو ہر چیز فوراً چاہیے تھی اور اسی وقت استعمال کرنی ہوتی تھی۔ کچھ اللہ کی طرف سے بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ کہ زینی باپ سے کوئی فرمائش کرتی اور کچھ نہ کچھ حالات ایسے بن جاتے کہ ضیا ایک دو دن میں ہی وہ فرمائش پوری کر دیتے اور پھر جیسے یہ زینی کی عادت بن گئی تھی۔ ہر چیز جلد پا لینے کی عادت۔

''پھر زہرہ آپا کا مسئلہ حل ہو جائے گا نا؟'' اس نے باپ کو اٹھتے دیکھ کر بڑی بے چینی اور امید سے کہا۔ ''انشاء اللہ تعالیٰ''

''کب؟'' اس نے ایک بار پھر احمقانہ سوال کیا۔

''جب اللہ چاہے گا۔ برا وقت ہمیشہ گزر جاتا ہے۔ چیزیں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ بس انسان کا ظرف آزمانا ہوتا ہے اللہ نے۔''

زینی باپ کے آخری جملے پر بے اختیار شرمندہ ہوئی تھی۔

☆☆☆

''زینب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہوا زینب کو؟''

''بس سر میں کچھ درد ہو رہا ہے۔''

''تو تم Short leave لے کر گھر چلی جاتیں۔''

"نہیں اب ٹھیک ہوں میں۔"

"اگر دوبارہ طبیعت خراب ہوئی تو میں اسے گھر بھجوا دوں گی۔" رمشہ نے کہا اور سامعہ کے جاتے ہی وہ زینب سے مخاطب ہوئی۔

"اب بس اپنی شکل ٹھیک کرلو۔ گراؤنڈ میں بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ یہ بھی خیال نہیں کہ پورا کالج یہاں پھر رہا ہے۔"

وہ دونوں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کلاس سے کر آئی تھیں اور رمشہ نے زہرہ کا ذکر چھیڑا تھا کہ زینب اس سے بات کرتے کرتے ہمیشہ کی طرح رونے لگی۔ گراؤنڈ میں موجود ان کی کلاس فیلو بہت سی لڑکیوں نے زینب کو روتے اور رمشہ کو اسے چپ کراتے دیکھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہاں لڑکیوں کا جمگھٹا لگ گیا تھا۔ صرف زینب ہی نہیں رمشہ کو بھی بڑی خفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اس نے ہر ایک کو زینب کی طبیعت کی خرابی کا بتا کر جان چھڑائی تھی لیکن اب بھی ان کی جس کلاس فیلو کو زینب کے رونے کا پتہ چلتا، وہ ان کے پاس چلی آ رہی تھی۔

"کیا فائدہ ہوا یہاں بیٹھ کر رونے کا۔" رمشہ اب اس پر بگڑ رہی تھی۔ "بات بعد میں کرتی ہو رونا پہلے شروع کر دیتی ہو۔"

زینب کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آنے لگے۔

"خدا کے لیے زینب! کچھ خیال کرو۔" رمشہ نے اس بار بے بسی سے کہا۔

"کوئی فائدہ ہوتا ہے تمہیں رونے کا؟ ہر بار تمہارا بہنوئی یہی سب کچھ کرتا ہے اور تم اسی طرح روتی پھرتی ہو پھر وہ لے جاتا ہے تمہاری بہن کو اور سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اب بھی لے جائے گا۔"

"نہیں۔ اس بار نہیں لے جائیں گے۔ اس بار صورت حال بہت خراب ہے تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ پھوپھو نے رشتہ بھی ڈھونڈنا شروع کر دیا ہے نعیم بھائی کے لیے۔"

زینب نے بے حد متفکر لہجے میں کہا۔

"ایمانداری سے کہہ رہی ہوں۔ وش کرو اس طرح کے بہنوئی کو اگر یہ پھندا تمہاری بہن کے گلے سے نکل رہا ہے تو نکل جانے دو۔" رمشہ نے بے حد اطمینان سے کہا۔

"ایک پھندا گردن سے نکل جائے گا تو سو دوسرے پھندے پڑ جائیں گے۔ زہرہ آپا تین بیٹیوں کو کس طرح اکیلے پالیں گی؟" زینب نے بے حد رنجیدگی سے کہا۔

"اکیلی کیوں؟ تم لوگ بھی دوسری شادی کر دینا ان کی۔" رمشہ نے اسی انداز میں کہا۔

"تین بیٹیوں کے ساتھ کون کرے گا ان سے شادی۔"

"کیوں؟ بیٹیوں کو ان کے باپ کے پاس بھجوانا۔ وہ زہرہ آپا کی ذمہ داری نہیں ہیں۔ باپ رکھے انہیں اپنے پاس۔" رمشہ اب بے حد سنجیدہ تھی۔

"وہ بیٹیاں ہیں، بیٹے نہیں ہیں رمشہ! کہ نعیم بھائی انہیں خوشی خوشی پاس رکھ لیں گے۔ سارا مسئلہ ان ہی کی وجہ سے تو ہو رہا ہے۔" زینب نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"تو آخر یہ مسئلہ حل ہو گا کس طرح؟" اس بار رمشہ بھی کچھ فکرمند ہوئی۔

"نعیم بھائی موٹر سائیکل مانگ رہے ہیں۔ ابو کہاں سے دیں گے؟ اسی لیے تو رونا آ رہا ہے مجھے۔" زینب کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔

"زینی! ایک بات میری کان کھول کر سن لو۔ زندگی میں آنسو بہانے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ساری دنیا سب کچھ چھوڑ کر تمہاری طرح بیٹھ کر روتی رہتی۔ آنسو دنیا کو صرف یہ بتاتے ہیں کہ میں بے حد کمزور ہوں۔ I Need Help (میری مدد کرو) اور کوئی آنسو دیکھ کر مدد کے لیے نہیں آتا سمجھیں تم؟"

رمشہ نے اس بار بے حد سنجیدگی سے اسے سمجھایا۔

"پتا ہے مجھے۔" زینب نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

"میرے پاس کچھ رقم پڑی ہے۔ تم قرض کے طور پر لے لو اور —" زینب نے بے اختیار رمشہ کی بات کاٹی۔

"نہیں میں تم سے کیوں قرض لوں۔ میری بہن تمہاری ذمہ داری تو نہیں اور پھر ہم لوگ اتنا بڑا قرض اتار بھی نہیں سکتے۔"

"لیکن۔" رمشہ نے کچھ کہنا چاہا۔ زینب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں رمشہ! مجھے قرض لینا پسند نہیں۔ میں نہیں لوں گی اور لے بھی لوں تو ابو تو اسی وقت تمہارے گھر واپس دے جائیں گے۔ مجھ سے ناراض بھی ہوں گے۔" زینب نے دوٹوک انداز میں کہا۔

رمشہ کچھ دیر کچھ سوچتی رہی پھر اس نے زینب سے کہا۔

"ایک کام اور ہو سکتا ہے۔"

"کیا؟"

"تم فاران بھائی سے ملی ہو نا؟"

"کون فاران بھائی؟" زینب نے الجھ کر کہا۔

"پچھلی بار جب تم میرے گھر آئی تھیں تو جاتے جاتے وہاں اپنے ایک کزن سے ملوایا تھا میں نے۔ خیر تمہیں یاد نہیں ہو گا۔ فاران بھائی ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلا رہے ہیں۔ اس دن تمہیں دیکھنے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم ماڈلنگ میں انٹرسٹڈ ہو؟ ان کے پاس ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی Campaign ہے۔ آج کل انہیں ایک نیا چہرہ چاہیے اور "

"اس سب سے میرا کیا تعلق ہے؟" زینب نے بے حد خشک لہجے میں رمشہ کی بات کاٹی۔

"تعلق بن سکتا ہے۔ فاران بھائی ایک لاکھ میں سائن کریں گے اس ماڈل کو اور زینی ایک لاکھ سے تمہارے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔"

''آگے ایک لفظ بھی مت کہنا۔'' زینب بے حد غصے کے عالم میں سرخ چہرے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

رمشہ بوکھلا گئی ''زینی! میں۔''

''مجھے تم سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی تم مجھے اس طرح کی سمجھتی ہو؟''

''زینی! آج کل ماڈلنگ بہت اچھی فیملیز کی لڑکیاں بھی کرتی ہیں۔ بہت عزت دار گھرانوں کی لڑکیاں۔''

''ہم اس طرح کے ''عزت دار'' نہیں ہیں۔ میرا باپ مسجد میں امامت کرواتا ہے اور تم چاہتی ہو، میں چار پیسوں کے لیے اپنا چہرہ اور اپنی ادائیں بیچوں؟''

زینب نے بے حد غصے اور صدمے سے کہا۔ اسے وہاں کھڑے جمیلہ کی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ وہ اس کی بیسٹ فرینڈ نہیں تھی۔ رمشہ تھی۔ اور رمشہ کی بات نے اسے جمیلہ کی باتوں سے زیادہ تکلیف دی تھی۔

''ایک لاکھ چار پیسے نہیں ہوتے زینی۔''

''ایک لاکھ، ایک کروڑ، ایک ارب بھی ہو تب بھی زینب ضیا اپنے آپ کو لوگوں کی تفریح کے لیے تماشا نہیں بنائے گی۔'' زینب نے بے حد تند و ترش لہجے میں رمشہ کی بات ایک بار پھر کاٹی۔

''تم مجھے غلط مت سمجھو یہ صرف ایک آفر تھی۔'' رمشہ نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

''اور ایسی آفر دوست لے کر نہیں آتے۔'' زینب نے مزید کچھ کہے بغیر اپنا بیگ اٹھایا اور تیز قدموں سے وہاں سے چلی آئی۔

''میری بات سنو زینی! دیکھو مجھے غلط نہ سمجھو، زینی پلیز۔''

رمشہ نے اسے روکنے کی بے حد کوشش کی تھی۔ مگر وہ ناکام رہی تھی اس نے زینب کو اتنے سال کی دوستی میں کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

زینب کو واقعی زندگی میں کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔ غصے سے زیادہ یہ دکھ اور صدمہ تھا کہ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے اور اس کے گھرانے کو جاننے کے باوجود رمشہ اسے اس طرح کی پیش کش کرے گی۔ جتنی ہتک اسے پچھلے ان چند ہفتوں میں نعیم اور فہمیدہ کے زہرہ کے ساتھ سلوک اور جمیلہ کے یاد روالے واقعہ سے محسوس ہوئی تھی ویسی ہی ہتک اسے رمشہ کی بات سے محسوس ہوئی تھی۔

کالج سے نکلتے ہوئے یہ غصہ ایک بار پھر آنسوؤں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اسے سڑک پر چلنے کا احساس نہ ہوتا تو وہ شاید ہچکیوں کے ساتھ روتی لیکن سڑک پر چلتے ہوئے وہ بار بار اپنی آنکھوں کو خشک کرتی رہی۔

بس اسٹاپ پر کھڑے بس کے آنے سے پہلے ہی کسی بھکاری عورت نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلایا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ زینب کے سامنے کوئی ہاتھ پھیلاتا اور وہ اسے بھیک نہ دیتی مگر آج اس کے پاس صرف پانچ روپے کا ایک ہی نوٹ تھا اور وہ جتنی اپ سیٹ تھی جلدی سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔

''آج پیسے نہیں ہیں بس یہ پانچ روپے ہیں بس کا کرایہ'' اس نے مٹھی میں بھینچے نوٹ کو اس عورت کو دکھاتے ہوئے قدرے بے چارگی

سے کہا۔

"اللہ تیرا مقدر رکھو لے۔ تیرے ساتھی کو لمبی حیاتی دے۔ تجھے راج کروائے۔"

زینب نے چونک کر اس عورت کو دیکھا۔

وہ کہہ رہی تھی "تیرے ساتھی کو لمبی گاڑی اور بنگلہ دے۔"

زینب قدرے بے بسی سے مسکرائی اور اس نے ہاتھ میں پکڑا نوٹ اس عورت کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ شیراز کو دعائیں دے رہی تھی۔ اور زینب کے لیے اب اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔

کرایہ اس عورت کے ہاتھ میں تھما دینے کے بعد اس دن وہ پیدل اسٹاپ سے گھر آئی بس پر وہ فاصلہ پندرہ منٹ میں طے ہوتا تھا آج وہ پینتالیس منٹ میں گھر آئی تھی اور پینتالیس منٹ کے اس سفر میں اس نے زندگی میں پہلی بار سڑک پر بھاگتی ان بڑی گاڑیوں اور راستے میں اکا دکا آنے والے ان بڑے بنگلوں کو دیکھا جنہیں اس سے پہلے اس نے کبھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

وہ سرکاری بنگلے تھے۔ وہ جانتی تھی، دس پندرہ سالوں میں شیراز کے کسی بڑے عہدے پر پہنچنے کے بعد ایسے ہی کسی بڑے بنگلے میں وہ بھی ہوگی۔ سبز رنگ کی نمبر پلیٹ والی ایسی ہی کوئی سرکاری گاڑی اس کے اور شیراز کے زیر استعمال ہوگی۔ دس پندرہ سال شاید بیس سال۔ اس نے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اسے ایسی گاڑی اور ایسا بنگلہ حاصل کرنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ آج گاڑی اور بنگلے کے بغیر صرف شیراز کے ساتھ کی خوشی میں جتنی سرشار ہوتی کل بھی اتنی ہی سرشار ہوتی۔

اس نے کچھ گھنٹہ پہلے رمشہ کے کہے ہوئے جملوں کو ذہن میں ایک بار پھر دہرایا۔ ایک بار پھر اسے تکلیف ہوئی۔ اس نے ایسا سوچا بھی کیوں تھا کہ زینب پیسے کے لیے اتنا گر سکتی ہے اسے چند ہفتے پہلے جیل کی باتیں یاد آئیں۔ اس کی تکلیف میں اضافہ ہوا۔

"روپیہ اور آسائشیں حاصل کرنے کے لیے زندگی میں عورت کو یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے یا کرنا چاہیے۔" اس نے جیسے دہل کر سوچا تھا۔

"اور اس کے علاوہ روپیہ حاصل کرنے کا دوسرا راستہ کون سا ہے۔ کوئی مرد جو باپ، بھائی یا شوہر کے رشتے سے عورت پر اپنا روپیہ خرچ کرتا ہو۔"

سکون اطمینان کی ایک لہری اس کے اندر سے اٹھی۔ اس کے پاس پہلے دونوں رشتے تھے۔ باپ کم سہی پر اس پر پیسہ خرچ کرتا تھا۔ بھائی کم عمر تھا۔ بڑا ہو کر کمانے لگتا تو وہ بھی اس کی ذمہ داری اٹھاتا اور شوہر شیراز کی صورت میں وہ بھی اسے ملنے والا تھا۔ اسے پیسہ حاصل کرنے کے لیے کوئی غلط کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور بہت پیسہ نہ سہی کم بھی ٹھیک تھا زیادہ کی کیا ضرورت ہے۔ آخر کرنا کیا ہے، بہت سارے روپے پیسے کا وہ مطمئن ہوگئی۔

اپنی گلی سے آج کل وہ بڑے اطمینان سے گزرتی تھی وہاں وہ لڑکا اب نہیں ہوتا تھا شاید اس نے سوچا ہوگا زینب نے مستقل طور پر باہر نکلنا بند کر دیا ہے۔

اس کے گھر کا دروازہ کھلا تھا صحن میں سے شور کی آواز آرہی تھی۔ وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اندر صحن میں تسیم نزہت کے

ساتھ بے حد خوشی اور جوش کے عالم میں باتیں کرتی نظر آئی وہ مٹھائی کا ڈبہ لیے صحن کے تخت پر بیٹھی تھیں۔ ان کے اردگرد نفیسہ، ربیعہ اور زہرہ بھی کھڑی تھیں۔ اس نے سب کے ہنستے ہوئے چہروں کو حیرانی کے عالم میں دیکھا۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا تھا کہ شاید زہرہ اور نسیم کا مسئلہ حل ہو گیا۔

اس کے اندر داخل ہونے کی آواز سنتے ہی سب نے پلٹ کر اسے دیکھا اور پھر جیسے نسیم مٹھائی کا ڈبہ لیے اڑتے ہوئے اس کے پاس آئیں اور اسے چپٹا لیا۔

"کیا ہوا خالہ؟" زینی نے نسیم کے گلے سے لگے اس کے عقب میں سب لوگوں کے ہنستے چہروں کو دیکھا۔

"میری دعا آ گئی۔ میں تو انتظار کر رہی تھی۔ ارے شیراز پاس ہو گیا۔ میں نے کہا میں سب سے پہلے زینی کا منہ میٹھا کرواؤں گی۔" نسیم نے بڑے جوش کے عالم میں ڈبہ کھولتے ہوئے اسے بتایا۔

زینب کا دل جیسے خوشی سے اچھلا۔ "رزلٹ آ گیا ان کا؟"

"ہاں۔ پوزیشن آئی ہے۔" نسیم نے ہنستے ہوئے اس کے منہ میں برفی کا ایک ٹکڑا ڈالا۔

"پہلی؟" زینب نے بے اختیار پوچھا۔

"نہیں دوسری۔" نسیم نے کہتے ہوئے ڈبہ پیچھے کھڑے لوگوں کی طرف بڑھا دیا۔

☆☆☆

"اتنی شاندار کامیابی کی توقع کر رہے تھے آپ؟" رپورٹر نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کپ رکھا۔

"جی ہاں۔ میں نے بہت محنت کی تھی اور میں تو پہلی پوزیشن کی توقع لیے ہوئے تھا۔"

شیراز نے بے حد اطمینان کے ساتھ اس رپورٹر سے کہا جو اس سے سوال کرنے کے ساتھ ساتھ اس گھر کا بھی گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا جہاں وہ آ کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہر سال اسی طرح کے سیلف میڈ لوگوں کے انٹرویو کیا کرتا تھا۔ شاندار تعلیمی کامیابیاں حاصل کرنے والے۔ جو اس وقت بڑے جوش و خروش کے ساتھ اسے انٹرویو دیتے بلند و بانگ دعوے کرتے اور اپنی فیلڈ میں آ جانے کے بعد اسے پہچانتے بھی نہیں تھے۔ اس لیے اس نے ایسے نوجوانوں کے دعووں، باتوں اور ارادوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیا تھا۔

"آخر آپ نے انکم ٹیکس کا شعبہ ہی کیوں چنا؟" اس نے شیراز سے سوال کیا اور اس کے منہ کھولنے سے پہلے دل ہی دل میں اس جواب کو دہرایا جو شیراز کبھی اپنے منہ سے نہ کہتا۔

"پیسہ بنانے کے لیے۔"

"ہمارے ملک میں ٹیکسیشن کے نظام میں بہت زیادہ بہتری اور تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور میں اس ڈپارٹمنٹ میں جانا چاہتا تھا جہاں ہر روز میرے لیے نیا چیلنج ہو اور جہاں پر کام کرنے میں یہ اطمینان محسوس کروں کہ میں اپنی صلاحیتوں کو بہترین طریقے سے استعمال کر رہا ہوں۔"

شیراز نے بے حد سنجیدگی کے ساتھ جیسے پکھو رٹے رٹائے جملے ادا کیے۔ رپورٹر نے اسی سنجیدگی کے ساتھ شارٹ ہینڈ میں جیسے ان جملوں کو ڈی کوڈ کیا۔

"ہمارے ملک میں ٹیکسیشن کے نظام میں سب سے زیادہ سقم اور خامیاں ہیں اور میں ان خامیوں کا فائدہ اٹھانے کے لیے اس ڈیپارٹمنٹ میں جانا چاہتا تھا۔ جہاں میں ماہانہ کے بجائے روزانہ کسی فائل کے ذریعے پیسہ بنا سکوں اور جہاں کام کر کے مجھے یہ اطمینان محسوس ہو کہ میں اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کر کے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال بنا سکتا ہوں۔"

رپورٹر کو اپنی اس "ڈی کوڈنگ" پر جیسے خود ہنسی آئی۔ شیراز اسے مسکراتا دیکھ کر خود بھی مسکرایا۔

رپورٹر نے انٹرویو کے اختتام پر اپنی جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر شیراز کی طرف بڑھایا۔

"یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے شیراز صاحب! امید ہے بندے کو یاد رکھیں گے اب آپ افسر بن جائیں گے تو ہو سکتا ہے بندہ بھی کسی خدمت کے لیے آپ کے پاس حاضر ہو۔"

"جی، جی بالکل۔ مجھے خوشی ہوگی آپ کا کوئی کام کر کے۔" شیراز نے بے اختیار کارڈ پکڑ کر کہا۔

"آپ دیکھیے گا۔ کتنی نمایاں جگہ پر آپ کا انٹرویو اور تصویر لگاتا ہوں۔ پہلی پوزیشن والے نے تو گھاس ہی نہیں ڈالی ہمیں۔ یہ امیر لوگوں کی اولادیں اسی طرح کی ہوتی ہیں۔ آپ بھی دیکھیے گا۔ ہمارے ادارے کے انگلش اور اردو دونوں اخباروں میں آپ کو ہی زیادہ کوریج ملے گی۔ اس کو بس اتنی ہی کوریج ملے گی۔ جتنی فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی پریس ریلیز کے ذریعے ملی ہے۔"

رپورٹر اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اب پہلی پوزیشن پر آنے والے امیدوار کے لتے لے رہا تھا جو سپریم کورٹ کے کسی جج کا بیٹا تھا۔ اور جس نے اس رپورٹر کی انٹرویو لینے کی درخواست میں دلچسپی نہیں لی تھی۔

شیراز اس رپورٹر کو دروازے تک چھوڑنے گیا اور واپس اپنے کمرے میں آتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا وزیٹنگ کارڈ کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ شیراز اکبر کے لیے نئی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ پاکستان کی کروڑوں کی آبادی میں سے ان منتخب شدہ 170 لوگوں میں شامل ہونے والا تھا جنہیں حکومت پاکستان نے اس سال عوام کی خدمت کے لیے طاقت کے استعمال کا اختیار سونپا تھا۔ اور اسی عوام سے تعلق رکھنے والے شیراز اکبر نے اس طاقت کے لیے چھبیس سال انتظار کیا تھا۔

☆☆☆

"السلام علیکم نعیم بھائی۔"

سلمان کے قدرے بڑبڑاہٹ میں کیے ہوئے سلام کی آواز صحن میں بیٹھے سب لوگوں نے سنی تھی اور کچھ چونک کر صحن کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہونے والے نعیم کو دیکھا جو سلمان کے سلام کا جواب دیے بغیر بے حد رعونت آمیز تاثرات کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

ضیاء صحن کے تخت پر بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ وہ چونکے اور پھر بڑے جوش کے عالم میں اٹھ کر نعیم کی طرف گئے صحن میں کھیلتی ماہا

اور مائرہ بھی شور مچاتی باپ کی طرف لپکی تھیں۔

"ارے نعیم بیٹا! آؤ، سلمان! کرسی لاؤ بھائی کے لیے۔" نفیسہ نے نعیم کے پاس جاتے ہوئے بے حد خوشی کے عالم میں سلمان سے کہا اس نے برآمدے میں پڑی کرسی لا کر صحن میں تخت کے پاس رکھ دی۔ باورچی خانہ میں کام کرتی زینب اور ربیعہ کو بھی نعیم کی آمد کا پتہ چل گیا تھا اور وہ قدرے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے باہر سے آتی آوازیں سننے لگیں۔

نعیم نے بے حد سرد مہری کے ساتھ ضیاء سے مصافحہ کیا۔ نفیسہ سے سر پر پیار وصول کیا اور پھر ماہا اور مائرہ کی انگلی تھامے کرسی پر بیٹھ گیا۔

تب تک زہرہ بھی کمرے سے باہر آ گئی تھی۔

"السلام علیکم آپ کیسے ہیں؟" اس نے کئی ہفتوں کے بعد شوہر کی شکل دیکھتے ہی پوچھا تھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے ماہا اور مائرہ سے باتیں کرنے لگا۔

"السلام علیکم نعیم بھائی!" زینب نے باہر آ کر بڑی خوشی اور طمانیت کے عالم میں اس سے کہا۔

"وعلیکم السلام۔" نعیم نے پورے گھر میں صرف اس کے سلام کا جواب دیا تھا مگر اسی سرد مہری کے ساتھ۔

"نعیم کے لیے کھانا لاؤ بلکہ سلمان! تم ایسا کرو، بازار سے کباب لے آؤ اور۔"

ضیاء کو اچانک خیال آیا کہ وہ سبزی کھا رہے تھے اور نعیم اپنے گھر میں روز سبزی دال کھانے کے باوجود سسرال میں سبزی پیش کرنے پر پھر زہرہ کی زندگی اجیرن کر دیتا۔ اسی لیے انہوں نے جیب سے پیسے نکال کر کہا مگر نعیم نے اس سے پہلے ہی بے حد درشتی کے عالم میں ضیا کی بات کاٹ دی۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنے بیوی بچوں کو لینے آیا ہوں، زیادہ دیر بیٹھوں گا نہیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمہاری بیوی اور بچے ہیں جب چاہے لے جاؤ۔ جاؤ زہرہ! تم سامان باندھو۔"

نفیسہ کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا تھا اور انہوں نے فوراً ہی زہرہ سے کہا۔ واقعی اس بار کوئی معجزہ ہی ہو گیا تھا کہ وہ اس طرح بیوی اور بچیوں کو مطالبہ پورا ہوئے بغیر لینے آ پہنچا تھا۔ ورنہ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ مختلف لوگوں کے ذریعے فہمیدہ اور اسے سمجھانے اور منانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کھانا تو کھانا ہی ہوگا۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔" ضیاء نے اصرار کیا۔

"میں نے کہا نا میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

نعیم نے اس بار پہلے سے بھی زیادہ درشتی کے ساتھ ضیاء سے کہا۔ باپ کے پاس کھڑی زینب کو لگا جیسے وہ اس کے باپ کو جھڑک رہا ہوں۔ چند لمحوں کے لیے صحن میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ زینب نے باپ کے چہرے کو دیکھا وہ سرخ تھا۔ وہ جانتی تھی یہ غصہ نہیں تھا شرم تھی۔ اپنے ہی صحن میں اپنی بیوی اور اولاد کے سامنے اپنے داماد سے جھڑکیاں کھانا۔

نعیم ٹانگ پر ٹانگ رکھے اسی رعونیت سے کرسی پر بیٹھا اپنی بیٹیوں کی طرف متوجہ تھا اور وہ سب غلاموں کے انداز میں اس کے آس پاس کھڑے تھے۔

تب ہی وہ ماسے بات کرتے کرتے نعیم کو ہلکی سی کھانسی اٹھی۔

"ربیعہ! پانی لاؤ۔ کیا ہوا بیٹا! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

نفیسہ نے گھبرا کر ربیعہ کو آواز دی۔ ساتھ ہی نعیم سے پوچھ۔ اس نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑا سا کھانس کر خاموش ہوگیا۔

"آپا کیسی ہے؟" ضیاء نے جیسے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے پوچھا۔

"بہت جلدی خیال آ گیا آپ کو میری ماں کا؟" بے حد تڑاتوڑ جواب ملا ضیاء ایک بار پھر خجل ہو کر چپ ہو گئے۔

تب ہی ربیعہ پانی کا گلاس لے کر سلام کرتی ہوئی نعیم کے پاس آئی اور پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"میں نے کہا نا نہیں پیوں گا۔ دوسروں کے گھر کا کھانا پینا مجھ پر حرام ہے۔" نعیم نے اسی انداز میں کہا۔ ربیعہ خجل سے انداز میں گلاس ہاتھ میں لیے باپ کو دیکھنے لگی۔

"بیٹا! یہ گھر بھی تمہارا اپنا ہی ہے۔"

"اپنا گھر ہی صرف اپنا ہوتا ہے۔ میں تو صرف شیراز کے کہنے پر زہرہ اور بچوں کو لے کر جا رہا ہوں ورنہ میں تو اس گھر پر تھوکنا بھی پسند نہیں کروں۔ جاؤ دیکھ کر آؤ تمہاری ماں نے سامان باندھا ہے یا پھر یہیں رہنا چاہ رہی ہے وہ۔" نعیم نے زبان سے کوڑے برساتے ہوئے پہلے ضیاء کو جواب دیا پھر مائرہ سے کہا۔

"بیٹا! میں خود دیکھ کر آتی ہوں۔" نفیسہ بے حد گھبرا کر تیزی سے اندر چلی گئیں۔

"تمہاری بڑی مہربانی بیٹا! کہ تم زہرہ کو لینے آ گئے اور۔۔"

ضیاء نے بڑے ممنون انداز میں نعیم سے کہنا شروع کیا اور نعیم نے اسی تلخی اور ترشی سے ان کی بات کاٹ دی۔

"ہاں۔ مہربانیوں کا تو ٹھیکہ لے رکھا ہے میرے خاندان نے۔"

"بیٹا! میں تمہارا سسر ہی نہیں ماموں بھی ہوں۔" ضیاء نے جیسے اسے رشتہ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

"ماموں سمجھ رہا ہوں تب ہی بیٹی بس رہی ہے میرے گھر۔ سسر سمجھ رہا ہوتا تو کب کا فارغ کر چکا ہوتا آپ کی بیٹی کو۔"

وہاں اپنے صحن میں نعیم کے سامنے کھڑے ہو کر نعیم کو سنتے ہوئے زینب کو پہلی بار اس ذلت کا صحیح معنوں میں احساس ہوا جو اس کا باپ نعیم کے گھر جا کر اٹھاتا ہوگا۔ اس وقت اسے صرف اپنے ماں باپ کیچوے نہیں لگے تھے بلکہ سلمان، ربیعہ، زہرہ اور اپنا آپ بھی کیڑے مکوڑوں جیسا ہی لگا تھا۔

پانچ منٹ بعد زہرہ اپنا سامان سمیٹے بے حد بوکھلائی، ہڑبڑائی ہوئی ان ہی بکھرے بالوں اور ملگجے کپڑوں میں حفصہ کو گود میں اٹھائے صحن میں آ گئی تھی۔ نعیم اسی رعونیت اور تکبر آمیز انداز میں اٹھ کر ماں اور مائرہ کا ہاتھ پکڑے پیچھے دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ اس نے زہرہ کا سامان یا حفصہ کو پکڑنے میں اس کی مدد کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔

"جاؤ بیٹا! بہن کو رکشہ تک چھوڑ آؤ۔" ضیاء نے سلمان سے کہا۔

سلمان نے زہرہ کا سامان اٹھا لیا اور وہ اس کے ساتھ صحن کا دروازہ کراس کر گئی۔ زینب اسی طرح صحن کے وسط میں کھڑی دروازے کو دیکھتی رہی جسے اب ضیاء بند کر رہے تھے۔

''کیا ہوا زینی؟'' ضیاء نے دروازہ بند کر کے صحن کے وسط میں گم صم کھڑی زینب سے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ چونک گئی۔ صحن میں اب صرف وہ اور نفیسہ تھے۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ اس نے نعیم کے دل میں نیکی ڈال دی۔'' نفیسہ نعیم کے اس رویے کے باوجود زہرہ کو آ کر لے جانے پر اس کی شکر گزار تھیں۔

ضیاء کچھ کہنے کے بجائے تخت پر بیٹھ کر وہ ٹھنڈا سالن چپاتی کے ساتھ کھانے لگے جس کا گھی تک جم چکا تھا۔

''میں اسے گرم کر دیتی ہوں۔'' زینی نے آگے بڑھ کر برتن اٹھانے کی کوشش کی۔

''کیوں اسے کیا ہوا؟'' ضیاء نے بے حد غائب دماغی کے عالم میں چونک کر ٹھنڈے سالن کو دیکھا۔

''کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں زینی! بس چند لقمے ہی تو رہ گئے ہیں جاؤ بیٹا! تم اپنا کام کرو۔'' ضیاء نے ہاتھ کے اشارے سے اسے نرمی سے ٹوک دیا۔

''میں بھی سوچ رہی تھی یہ آ کیسے گئے لینے؟'' ربیعہ نے تنکی سے برتن دھوتے ہوئے کہا تھا۔

زینب ابھی باورچی خانہ میں داخل ہوئی تھی۔

''شیراز بھائی نے ہی سمجھایا ہو گا انہیں بھی اور پھوپھو کو بھی اور ان لوگوں نے سوچا ہو گا کہ ایک افسر کی بات کیسے ٹالیں۔ افسر کے ساتھ تو بنا کر رکھنی چاہیے۔ زہرہ آپا کو گھر رکھیں گے تو افسر کے ساتھ دوہری رشتہ داری ہو جائے گی۔ بڑی خوش قسمت ہو تم زینی! روز شکرانے کے نفل پڑھا کرو خاندان میں ایسی قسمت کسی بھی لڑکی کی نہیں ہے۔ تمہارے ہونے والے میاں کی افسری کی وجہ سے ہم لوگوں کی بھی عزت ہو جائے گی خاندان میں۔ تمہیں کیا ہوا؟''

ربیعہ کو یک دم احساس ہوا کہ زینی نے اس کی کسی بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ اس نے گردن موڑ کر باورچی خانے کے ایک کونے میں چوکی پر گم صم بیٹھی زینب کو دیکھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے بے حد مدھم آواز میں کہا۔

''خوش نہیں ہو کہ آپا واپس چلی گئیں۔ آج کمرے میں ہم اپنے اپنے بستر میں آرام سے سوئیں گے۔''

''خوش؟ پتا نہیں۔'' زینی اپنا ناخن کاٹ رہی تھی، وہ بے حد الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''پریشان کیوں ہو؟'' ربیعہ کو تشویش ہوئی۔

زینی کچھ دیر اسی طرح اپنے ناخن کاٹتی رہی پھر اس نے کہا۔ ''انسان کے پاس پیسہ ضرور ہونا چاہیے۔ غربت بہت بڑا عیب ہے۔''

”عیب ہے نہیں، ہم سب نے بنا دیا ہے۔“ ربیعہ نے مدھم آواز میں کہا۔

”جو بھی ہے بہت ذلت ہے غربت۔ بہت زیادہ۔“ وہ بے حد الجھی ہوئی تھی۔ ”کوئی بھی منہ اٹھا کر کچھ بھی کہہ دے۔ آپ کیا کہہ سکتے ہیں۔ کیا کر سکتے ہیں۔ پیسہ پاس ہو تو اور کچھ نہیں، آپ کسی کے منہ پر مار کر منہ بند کر سکتے ہیں۔“

”لگتا ہے۔ شیراز بھائی کے کسی لیکچر کا اثر ہو رہا ہے۔“

ربیعہ نے بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ پہلی دفعہ اسے ایسی باتیں کرتے ہوئے سن رہی تھی۔

”تم نے سنا نہیں، آج نعیم بھائی نے ابو کو کیسی باتیں کہیں۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ دکھ سے زیادہ غصہ آیا۔ شیراز نہ کہتے تو وہ زہرہ آپا کو بیٹھے ہی نہ آئے؟ بس یہ وقعت رکھتے ہیں ابو، زہرہ آپا نعیم بھائی کی نظروں میں؟“

”اب تمہیں پتہ چلا، مجھے غصہ کیوں آتا ہے۔ نعیم بھائی اور فہمیدہ پھوپھو پر۔“ ربیعہ نے سر جھٹک کر کہا۔

زینی نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ وہ چپ چاپ ناخن کاٹتی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ربیعہ اس سے مسلسل کچھ کہہ رہی تھی لیکن زینب کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ذہن بے حد الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر دستک کے ساتھ ہی اندر سے کسی کی آواز کا انتظار کیے بغیر کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔ کمرے میں موجود اپنے اپنے کاموں میں مصروف تینوں افراد نے چونک کر دروازے سے اندر آنے والے ٹم فضل دین اور اس چوبیس پچیس سالہ نوجوان کو دیکھا تھا جسے ٹم فضل دین کمرے کے اندر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

"Come in. Come in. تمہاری اپنی ہی جگہ ہے۔" ٹم فضل دین نے بے حد بناوٹی امریکن انگلش میں اس کو اندر آنے کا اشارہ کیا پھر خود اندر داخل ہو گیا۔

"Every body" (سب ٹھیک ہے)

وہ اب کمرے میں موجود تینوں افراد سے بے تکلفی کا اظہار کر رہا تھا جبکہ تینوں افراد نے ایک دوسرے کے ساتھ نظروں کا تبادلہ کرتے ہوئے ٹم فضل دین کی ہیلو، ہائے کا جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ یہ دوسرے لفظوں میں انہوں نے ٹم فضل دین کو گھاس بھی نہیں ڈالی تھی مگر اس چیز نے ٹم فضل دین کی ڈھٹائی آمیز مسکراہٹ پر کوئی اثر نہیں ڈالا لیکن کمرے کے دروازے میں کھڑے کھڑے اس کو ایک ہی نظر میں کمرے کے "حالات کی کشیدگی" کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اب اپنے دونوں سوٹ کیس اندر لانے سے جھجک رہا تھا۔

"Everybody busy" (سب مصروف ہیں)

ٹم فضل دین نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے کمرے کے اندر موجود تینوں افراد کے اس کو گھاس نہ ڈالنے والے رویہ کی جیسے توجیہہ پیش کی۔

"You come in."

ٹم نے ایک بار پھر اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس بار اس نے جھجکتے ہوئے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس بار وہ جھجکتے ہوئے سوٹ کیس اٹھائے اندر آ گیا۔ اندر موجود تینوں مردوں نے اپنے کام میں مصروف ایک لمحہ کے لیے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

ان کی نظروں میں بے حد سرد مہری تھی۔

"You like the room?" (تمہیں یہ کمرہ پسند آیا)

ٹم فضل دین نے بے حد فخریہ اور اشتیاق بھرے لہجے میں اس سے کہا۔ اس نے بے اختیار کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑا کر اس کو پسند کرنے کی کوئی وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ایک نظر تو کیا وہ دس سال بھی وہاں رہ کر ایسی کوئی وجہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ بے حد مختصر قدرے مستطیل شکل کے اس کمرے کی تین دیواروں کے ساتھ تین میٹرس پڑے تھے۔ اور ہر دیوار پر بے شمار کھونٹیوں پر ہر طرح کا سامان لٹکا ہوا تھا۔ صاف نظر آ تا تھا کہ ہر دیوار کی کھونٹیوں کے ساتھ میٹریس بچھا ہوا تھا۔ کمرے کی چوتھی دیوار میں کمرے کا داخلی دروازہ ایک اور چھوٹا دروازہ جو بعد میں باتھ روم ثابت ہوا تھا اور ایک اسٹوو پڑا ہوا تھا۔ اسٹوو کے اردگرد کی جگہ یہ ظاہر کرتی تھی کہ وہ "کمرے کا کچن" تھا۔

اس نے قدرے مایوسی کے ساتھ ٹم کو دیکھا۔ زبانی طور پر اس نے یہاں کا جو نقشہ کھینچا تھا یہ جگہ اس کے بالکل برعکس تھی۔ ٹم کی آنکھوں کی

چمک یک دم بڑھ گئی۔

"مجھے پتہ تھا You will like it (یہ تمہیں پسند آئے گا) ٹم نے بے حد فخریہ انداز میں کہا۔

"The cheapest place in NY."

ٹم نے دایاں ہاتھ اٹھا کر بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

"نیویارک کی گھٹیا ترین جگہ۔" ایک میٹرس پر بیٹھا ہاتھ میں شیشہ پکڑے شیو کرتا شخص ترجمہ کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ اس کے ساتھ ساتھ یقیناً ٹم فضل دین نے بھی یہ "ترجمہ" سنا ہو گا مگر اس نے مکمل طور پر یوں ظاہر کیا جیسے اس نے کچھ نہیں سنا۔

"Meet him. --- He is Tanvir." (اس سے ملو، یہ تنویر ہے۔)

ٹم فضل دین نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو اسٹوو پر ایک چھوٹی سی دیگچی رکھے بڑے انہماک سے کچھ پکانے میں مصروف تھا۔

"This is Mujahid." (یہ مجاہد ہے) ٹم فضل دین نے اب شیو کرتے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تیس پینتیس سال کا تھا۔

"And this is Sabir." (اور یہ صابر ہے) ٹم فضل دین نے اس تیسرے شخص کی طرف اشارہ کیا جو اپنے میٹرس پر بیٹھا اب ایک شرٹ پر بٹن لگانے میں مصروف تھا۔ وہ قدرے فربہ اور ادھیڑ عمر تھا۔ ٹم اب ان تینوں سے اس کا تعارف کروا رہا تھا۔ اس کی اس پوری "مشق" کے دوران ان تینوں میں سے کسی نے بھی ایک لمحہ کے لیے نظر اٹھا کر اسے اور ٹم کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ اپنا نام سننے پر نہ اس کا نام سننے پر۔ وہ تینوں مکمل طور پر اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔ ٹم فضل دین نہیں۔

اس کے خاموش ہونے پر بٹن ٹانکتے ہوئے صابر نے سر اٹھا کر بڑے تیکھے انداز میں ٹم سے پوچھا۔

"فضل دین! یہ جو تم ایک اور نمونہ اٹھا کر لے آئے ہو، اسے رکھو گے کہاں؟ یہاں کوئی جگہ نظر آ رہی ہے تمہیں؟"

اس کے جملے سے زیادہ اس کے لہجے کی کاٹ نے اسے خجل کیا مگر ٹم فضل دین نے بے حد ناراضی سے صابر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"فضل دین میرا باپ تھا، میرا نام ٹم ہے۔"

"حالانکہ تمہارا کوئی باپ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" صابر نے اسی کاٹ دار لہجے میں کہا۔ کمرے میں پہلے سے موجود باقی دونوں افراد نے پہلی بار اس ساری گفتگو میں کوئی دلچسپی لی۔ اس کا خیال تھا ٹم اب آگ بگولہ ہو جائے گا۔ آخر وہ "مالک مکان" تھا۔ یہ پراپرٹی اس کی ملکیت تھی اور صابر اس کا کرایہ دار تھا۔

مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کے خدشات کے بالکل برعکس ٹم فضل دین نے بے حد تحمل برداشت اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے جملے کو مکمل طور پر نظر انداز کیا۔

"یہ جگہ ہے۔ یہاں میٹرس ڈالوں گا میں اس کا۔" تینوں افراد کے ساتھ ساتھ اس نے بھی چونک کر اپنے قدموں کے نیچے اس جگہ کو دیکھا۔ جہاں وہ اشارہ کر رہا تھا۔ وہ کمرے کے درمیان میں موجود بمشکل ایک میٹرس جتنی جگہ کی طرف ہی اشارہ کر رہا تھا اور اس وقت وہ خود اس

کے ساتھ وہیں کھڑا تھا۔

صابر کے گلے سے پہلے ایک غراہٹ نکلی پھر ایک شاندار گالی۔ ثم فضل دین نے پہلے جیسی اعلاظرفی کا مظاہرہ ایک بار پھر کرتے ہوئے ان دونوں چیزوں کو نظر انداز کیا اور کمرے میں موجود واحد کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

''یہاں بھی میٹریس بچھا کر بندہ سلا دے گا تو ہم گزریں گے کیسے۔ اس کے اوپر سے کود کر جایا کریں گے کیا ایک دوسرے کے پاس؟ تیری صرف شکل ہی نہیں، کرتوت بھی دوزخیوں والے ہیں فضل دین۔''

صابر اب دانت پیس رہا تھا۔ جبکہ وہ خود ہکا بکا اپنے پیروں کے نیچے اس فرش کی نظروں ہی نظروں میں پیمائش کرنے میں مصروف تھا جہاں اس کو سونا تھا اور ثم فضل دین برداشت اور اعلاظرفی کی حدوں کو چھوڑ رہا تھا وہ اب کھڑکی کے پاس پہنچ چکا تھا۔

"See. It has a window

When you open it. .."

(یہاں ایک کھڑکی ہے اسے کھولو تو)

ثم فضل دین نے بڑے اطمینان کے ساتھ کھڑکی کھولنے کے لیے اس پر ہاتھ رکھا اور پھر اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ اس کے ہاتھ رکھتے ہی کھڑکی کا پورا فریم باہر غائب ہو گیا تھا۔ کمرے میں رہائش پذیر تینوں افراد نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور پھر وہ پاگلوں کی طرح ہنستے ہی چلے گئے جبکہ وہ خود ہونق بنا ہکا بکا قہقہے لگاتے ہوئے ان تینوں مردوں کے درمیان کھڑا تھا۔ ثم فضل دین نے بے ساختہ حواس باختہ ہو کر کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ وہ تقریباً لٹک گیا تھا پھر یک دم پلٹ کر اس نے غصے میں آگ بگولہ ہوتے ہوئے اپنے اپنے میٹریس پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے ان تینوں مردوں کو دو ناقابل اشاعت گالیاں دینے کے بعد حلق کے بل چلاتے ہوئے پنجابی میں کہا۔

''کھڑکی توڑ دی میری۔ ابھی نیچے کوئی زخمی ہو جاتا یا مر جاتا تو پولیس آ کر لے جاتی مجھے تو پھر کیا تم لوگوں کا باپ چھڑانے آتا مجھے؟''

وہ اب ٹھیٹھ پنجابی میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کی انگریزی اور امریکن لہجہ اڑن چھو ہو گیا تھا۔ وہ تینوں اب بھی اس طرح قہقہے لگا رہے تھے۔

''الو کے پٹھے۔'' اس نے ان تینوں کو ایک گالی دی۔ ان تینوں پر ابھی بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''کیس کروں گا میں تم لوگوں پر، اپنی پراپرٹی کو نقصان پہنچانے کے لیے۔'' ثم نے ان تینوں کو دھمکایا۔

''تم سے کس نے کہا تھا کھڑکی پر ہاتھ رکھو۔ جب تمہیں پتا ہے کہ کتنی مشکل سے اسے اٹکایا تھا ہم نے۔ ہر بار آخر تم اس کھڑکی کو کھول کر باہر کیا دکھانا چاہتے ہو؟ سینٹرل پارک کے سامنے تمہاری بلڈنگ ہے کیا؟ سورج کی روشنی تک نہیں آتی اس کھڑکی سے۔ چالیس منزلہ عمارت ہے اس کے بالمقابل اور نیچے پوری گلی میں کوڑے کے ڈھیر ہیں اور تم جس کو یہاں لاتے ہو اسے کھڑکی کھول کر دکھانا شروع کر دیتے ہو۔''

صابر نے قہقہوں کے بیچ بیچ میں رک رک کر اس سے کہا اور بات ختم کرتے ہی پھر ہنسنے لگا۔

''اب پولیس ہی آ کر تم لوگوں کی بکواس بند کرے گی۔ سمیٹ لو اپنا سامان یہاں سے اور ڈھونڈو کوئی اور ٹھکانا۔'' ثم فضل دین بے حد غصے

سے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

وہ دھڑ سے دروازہ بند کرتے ہوئے باہر چلا گیا تھا۔ وہ یک دم گھبرا گیا تھا۔ وہ رہائش کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور یہاں پولیس آنے والی تھی۔

کمرے میں موجود افراد اب آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگے تھے اور ان میں سے کوئی بھی پریشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کہیں بیٹھو گے یا "ن" کے نقطے کی طرح یہیں جمے رہو گے؟"

صابر نے پہلی بار اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ جملہ طنزیہ تھا مگر لہجے میں وہ تلخی یا ترشی نہیں تھی جو تم فضل دین کی موجودگی میں تھی۔

وہ کچھ نروس سا ہو کر سوٹ کیس وہیں چھوڑتا صابر کے میٹریس کی طرف آ گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ بیٹھتا صابر نے اسے ٹوک دیا۔

اپنے سوٹ کیس وہاں رکھ دو۔" اس نے دیوار کے قریب ایک خالی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں کچھ اور سوٹ کیس بھی پڑے ہوئے تھے۔

وہ اپنے سوٹ کیس اٹھا کر رکھنے لگا۔ کمرے میں موجود لوگ ایک بار پھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو چکے تھے۔ وہ صابر کے پاس آ کر بے حد بے چینی اور پریشانی کے عالم میں بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن تم فضل دین اور پولیس میں الجھا ہوا تھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟" صابر نے پہلی بار اس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"لاس ویگاس سے۔"

"امریکہ میں کب آئے ہو؟"

"ایک سال ہو گیا؟"

لاس ویگاس میں کیا کرتے تھے۔"

"ایک کیسینو میں کام کرتا تھا۔"

صابر کے ساتھ ساتھ تنویر اور مجاہد نے بھی گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ ان کی نظروں سے کچھ اور پریشان ہوا۔

"جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے یار! یہاں سب کو پتا ہے کہ کون کہاں کیا کرتا ہے۔ امریکہ ہے۔ یہاں کوئی کسی سے کچھ نہیں چھپاتا۔ تو بھی نہ چھپا۔" یہ مجاہد تھا جس نے اسے جیسے بہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا چھپایا میں نے؟" اس نے قدرے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"لاس ویگاس میں کیا کرتا تھا؟" صابر نے دوبارہ سوال دہرایا۔

"کیسینو میں کام کرتا تھا۔" اس نے اسی انداز میں کہا۔ "فلور صاف کرتا تھا" اس نے اسی سانس میں کہا۔

"ایک سال ہوا تجھے امریکہ آئے۔ لیگل تو ہے نہیں اور کام مل گیا تجھے کیسینو میں۔" صابر نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا تنویر نے پوچھا۔

"اور کیسینو کا کام چھوڑا کیوں تو نے؟"

"وہاں حرام کام ہوتے تھے۔ رزق حلال نہیں تھا وہاں۔"

اس نے بے حد سادہ لہجے میں کہا تھا۔ تینوں نے چونک کر اسے ایک لمحہ کے لیے دیکھا اور پھر تینوں یک دم ایک بار پھر کھلکھلا کر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ کچھ دیر پہلے ہنس رہے تھے۔ اسے لگا وہ ابنارمل تھے۔

دو سال کے بعد اس کمرے کو چھوڑتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ وہ بھی اتنا ہی ابنارمل ہو چکا تھا۔

"اچھا تو رزق حلال کمانے آیا ہے امریکہ۔ ارے پھر یہاں آنے کے بجائے سعودی عرب کیوں نہیں گیا تو؟" صابر نے اپنی ہنسی کو کنٹرول کرتے ہوئے اس سے کہا اور کمرے میں ایک بار پھر جیسے قہقہوں کا طوفان آ گیا تھا۔ وہ اسی طرح ہونقوں کے انداز میں انہیں دیکھتا رہا۔

"اول تو مجھے یقین نہیں کہ تو کیسینو میں کام کرتا رہا ہے۔ وہاں تو کسی کو چھوٹا موٹا کام دینے سے پہلے بھی سو طرح کی جانچ پڑتال کرتے ہیں پھر تیرے جیسے کنگلے کو جسے امریکہ میں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں کیسے رکھ لیا انہوں نے کسی جان پہچان کے بغیر؟"

"کیسینو کا مالک مجھے جانتا تھا۔"

اس کے جملے پر کمرے میں قہقہوں کا طوفان ایک بار پھر ابل پڑا تھا اور اس بار اس نے طے کیا تھا کہ اسے مزید کچھ نہیں کہنا چاہیے۔

اس سے پہلے کہ کوئی اس سے مزید سوال کرتا کمرے کے دروازے کے باہر کچھ شور ہوا تھا۔

"پولیس" اس کے ذہن میں پہلا خیال آیا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسی پولیس؟ بیٹھ جا۔ فضل دین پیچھے گرنے والی کھڑکی کسی کے ساتھ اٹھا کر کھینے آیا ہے۔"

صابر نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر دروازے کی طرف چلا گیا اور اسے کھول دیا۔ تم فضل دین واقعی ہانپتا ایک دوسرے پاکستانی آدمی کے ساتھ وہ کھڑکی اٹھائے لا رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر اندر ہنسی میں لوٹ پوٹ ہوتے تینوں آدمیوں کو دیکھا اور پھر قدرے خجل سی مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

اس کا ابتدائی خیال تھا اس کمرے میں وہی تین آدمی رہتے تھے جو اسے اس دن نظر آئے تھے۔ بعد میں اسے پتا چلا اس کمرے میں چھ افراد رہتے تھے۔ جن تینوں سے وہ ملا تھا وہ رات کو کام کرتے تھے اس لیے دن کو اس کمرے میں موجود ہوتے۔ دوسرے تینوں مرد دن کو کام کرتے تھے۔ اور وہ رات کو سونے کے لیے آتے تھے اس کمرے میں ہر کوئی صرف چند گھنٹوں کی نیند پوری کرنے کپڑے بدلنے اور نہانے کے لیے آتا تھا۔ ورنہ وہاں کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔

وہ ایک لمبے عرصے کے بعد ایک ہی کمرے میں اتنے بہت سے لوگوں کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ صابر، مجاہد اور تنویر تینوں رات کی شفٹ میں کام کرتے تھے۔ ان میں سے صرف تنویر تھا جو کبھی کبھار دن کے وقت بھی کام کرتا اور اس کمرے میں سب سے کم وقت گزارتا تھا۔ وہ اس کمرے کا سب سے امیر اور صاحب حیثیت رہائشی تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس رہائش گاہ کو جسے وہ نیویارک کی گھٹیا ترین جگہ کہتا تھا۔ بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ان تینوں میں سے کوئی بھی وہاں سنگل نہیں تھا۔ صابر کو نیویارک آئے چودہ سال ہو گئے تھے۔ وہ اس ایک کمرے کے اپارٹمنٹ کے مالک غلام فضل دین کے گاؤں سے تھا اور غلام فضل دین اس سے دبتا تھا۔ اور اس کی گالیاں بھی سن لیتا تھا۔

چودہ سال پہلے چالیس سال کی عمر میں امریکہ آنے سے پہلے وہ اپنی تینوں بیٹیوں کو بہت کم عمری میں ہی پاکستان میں بیاہ چکا تھا۔ شاید وہ کبھی امریکہ آنے کا سوچتا ہی نہ اگر خاندانی دشمنیوں اور مقدمہ بازی کے ہاتھوں وہ اپنی ساری جائیداد سے ہاتھ نہ دھو بیٹھتا اور اسے بھوک کے ساتھ ساتھ جان کے لالے بھی نہ پڑ جاتے۔ وہ اپنی بیوی اور دو کم عمر بیٹوں کے ساتھ پہلے روزگار کی تلاش اور جان بچانے کے لیے کراچی آیا تھا اور پھر بیوی بچوں کو وہیں چھوڑ کر خود کسی ایجنٹ کے ذریعے امریکہ آ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ پاکستان نہیں گیا۔ شروع میں وہ جانا چاہتا تھا لیکن بعد میں اسے بیوی اور بیٹوں دونوں میں دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ واحد دلچسپی جو اسے زندگی میں تھی، وہ زرعی زمین خریدنے میں تھی۔ ہر سال وہ جتنا بھی روپیہ کماتا یا بچاتا، اس سے وہ پاکستان میں اپنے آبائی علاقے میں زمین خرید لیتا تھا اور یہ چیز اس کے اور اس کی بیوی اور بیٹوں کے درمیان اختلاف کی سب سے بڑی وجہ تھی جو اب کراچی میں ڈیفنس کے علاقے میں رہتے۔ اچھے اسکولوں اور کالجز میں پڑھ کر اب مکمل طور پر شہری ہو گئے تھے۔ انہیں گاؤں میں ہر سال خریدی جانے والی اس زمین سے نفرت تھی اس کا ایک بیٹا شادی کر چکا تھا اور دوسرا کرنے والا تھا مگر وہ دونوں آج بھی صابر کی ہر ماہ آنے والی ہنڈی کی رقم سے اپنا گھر چلاتے تھے۔

اچھے اسکولوں میں زبردستی پڑھانے کے باوجود انہیں تعلیم میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ باری باری دونوں نے کالج چھوڑ دیا پھر اسی ترتیب سے یکے بعد دیگرے کاروبار کرنے کی کئی کوششیں کیں اور ان کوششوں میں صابر کا اچھا خاصا روپیہ ڈبویا۔ ان کوششوں میں ناکامی کے بعد صابر نے کوشش کی کہ وہ انہیں اپنے پاس امریکہ بلوالے اور اس نے کسی نہ کسی طرح انہیں وہاں بلوا بھی لیا لیکن صرف چھ ماہ وہاں رہ کر وہ دونوں واپس پاکستان چلے گئے تھے وہ امریکہ میں باپ کی طرح ''محنت'' نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پاکستان میں باپ کی کمائی پر صرف ''عیش'' کر سکتے تھے۔

پاکستان میں صابر کے لیے دوسری دلچسپی اس کی بیوی ہو سکتی تھی جو اس کی خالہ زاد تھی اور جس کے ساتھ اس نے بہت لڑ جھگڑ کر پسند کی شادی بہت کم عمری میں ہی کر لی تھی۔ چودہ سال امریکہ میں قیام کے دوران وہ عشق بھی اڑن چھو ہو گیا تھا ایک ادھیڑ عمر، بھدی، بے ڈول، ان پڑھ، معمولی شکل وصورت والی سادہ دیہاتی عورت میں اب اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ نکاح کے ایک کاغذ اور پانچ بچوں کے علاوہ دونوں کو آپس میں کوئی اور چیز نہیں جوڑتی تھی۔ اگرچہ صابر بھی اتنا ہی ان پڑھ، بھدا، بے ڈول، ادھیڑ عمر اور معمولی شکل وصورت والا تھا۔ جتنی اس کی بیوی۔ لیکن وہ نیویارک میں رہتا تھا اور اتنا فاصلہ نیویارک اور کراچی کے درمیان نہیں تھا۔ جتنا صابر کو اب اپنے اور اپنی بیوی کے ذہنوں کے درمیان فون پر بات کرتے ہوئے محسوس ہوتا تھا۔ اگر اسے پاکستان آنے کی کوئی خواہش نہیں تھی تو اب اس کی بیوی کو بھی اس کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

شروع کے سالوں میں وہ فون پر اس سے اس کے پاکستان آنے کے بارے میں پوچھتی تھی لیکن اب کئی سالوں سے یہ سوال بھی ختم ہو گیا تھا اور فون کالز بھی کم ہو گئی تھیں۔ ایک اچھی مشرقی عورت کی طرح اس نے نانی اور دادی بنتے ہی ادھیڑ عمری میں اللہ اللہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے بڑھاپا آنے سے بہت عرصہ پہلے ہی اپنے اوپر بڑھاپا طاری کر لیا تھا۔ کبھی اگر اسے صابر کا خیال آتا بھی تو وہ اس کے پردیس میں ہونے کو قسمت کا

لکھا سمجھ کر صبر کر لیتی۔

صابر اچھا شوہر اور باپ تھا۔ اس نے کبھی اپنی بیوی اور بچوں کے اخراجات اٹھانے کے لیے رقم بھیجنے میں غفلت نہیں کی تھی اور نہ ہی چودہ سال کے دوران اس نے بہت سے دوسرے مردوں کی طرح دوسری شادی کی۔ البتہ ان چودہ سالوں میں کوئی نہ کوئی بنگالی، انڈین، پاکستانی یا سیاہ فام عورت اس کی زندگی میں شامل ضرور رہی۔ جو چھ ماہ اس کے بیٹوں نے امریکہ میں گزارے تھے۔ اس وقت بھی صابر کے ایک سیاہ فام عورت کے ساتھ تعلقات تھے اور اس کے بیٹوں کو چند ہی ہفتوں میں اس بارے میں پتا چل گیا تھا۔ کیونکہ صابر نے یہ راز ان سے چھپانے کی سرے سے کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور اس راز کو جاننے کے باوجود اس کے دونوں بیٹوں نے ان تعلقات کو مکمل طور پر یوں نظر انداز کر دیا جیسے وہ اس کے بارے میں واقف ہی نہیں تھے۔ واپس پاکستان جا کر انہوں نے اپنی ماں کو بھی اس بارے میں مکمل طور پر بے خبر رکھا تھا۔

وہ باپ کی کسی سرگرمی پر اعتراض کرتے تو اس رقم سے ہاتھ دھو بیٹھتے جو صابر ہر ماہ انہیں بھیج رہا تھا اور شاید اس کے ساتھ ایک لمبی چوڑی زرعی زمین پر مشتمل اس جائیداد سے بھی جو صابر نے اتنے سالوں میں بنائی تھی اور جس سے وہ دونوں شدید نفرت کرتے تھے لیکن اس کے باوجود یہ جانتے تھے کہ جب تک ان کے باپ کا انتقال ہوگا، وہ زمین کروڑوں کی ہو چکی ہوگی اور زمین سے لاکھ نفرت سہی، اس کو بیچ کرملنے والے پیسے سے کسی کو نفرت نہیں تھی۔

صابر نے نیویارک میں کام کا آغاز ایک پاکستانی کی گوشت کی دکان سے کیا تھا اور چودہ سال بعد بھی وہ گوشت کی دکان پر ہی کام کرتا تھا۔ فضل دین کی طرح تھوڑا بہت ذہین ہوتا تو نیویارک میں کوئی کاروبار کرنے کی کوشش کرتا یا وہاں پراپرٹی کی صورت میں ہی کوئی انویسٹمنٹ کر لیتا مگر اس نے کبھی وہاں کوئی بزنس شروع کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اسے زرعی زمین خریدنے سے فرصت ملتی تو وہ ایسا کچھ سوچتا یا پھر شاید اس کے ذہن میں کہیں اب بھی امریکہ "پردیس" تھا جہاں سے ایک دن اسے واپس چلے جانا تھا۔ اور واپس جا کر گاؤں کی زمین پر کھیتی باڑی ہی کرنی تھی۔ اس نے چودہ سال کے دوران اس نے کبھی امریکہ کی شہریت حاصل کرنے کے لیے اس طرح کی دوڑ دھوپ نہیں کی جو وہاں آنے والے غیر ملکی پہلے دن سے ہی شروع کر دیتے تھے۔

مجاہد کو امریکہ آئے دسواں سال ہونے والا تھا۔ وہ اپنی شادی کے چوتھے دن امریکہ آیا تھا، نہ آتا تو ایجنٹ اس کے بجائے کسی اور کو امریکہ بھجوا دیتا۔ وہ پچھلے چار سالوں سے ایجنٹ کے ذریعہ امریکہ آنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب اس کی شادی کو دسواں سال ہو رہا تھا، وہ ابھی تک ال لیگل تھا اور ان دس سالوں میں ایک بار بھی پاکستان نہیں گیا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی شادی کے وقت چھبیس سال کے تھے، اب چھتیس سال کے۔ اور ان دونوں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

امریکہ آتے وقت مجاہد خوابوں کی پوری گٹھڑی اپنے سر پر رکھ کر لایا تھا۔ ارینج میرج کے باوجود وہ اپنی بیوی کو پہلی بار دیکھتے ہی اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا، امریکہ آتے ہی چند سالوں میں اسے وہاں کی شہریت مل جائے گی اور وہ اپنی بیوی کو وہاں بلا لے گا اور نہ بھی بلا سکا تو کم از کم ہر سال پاکستان ضرور آ سکے گا۔ اس نے ایم بی اے کیا ہوا تھا اور اس کا خیال تھا کہ امریکہ میں کوئی شاندار سی نوکری اس کی منتظر ہوگی مگر امریکہ میں پہنچتے ہی اس کے تمام خواب بری طرح چکنا چور ہوئے تھے۔

اس کی ایک پبلک یونیورسٹی سے حاصل کی جانے والی سیکنڈ کلاس ایم بی اے کی ڈگری امریکہ میں تسلیم ہی نہیں کی جاتی تھی اور اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے نہ اتنا وقت کہ وہ امریکہ میں تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر سکتا اس کمرے میں رہنے والے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی ایک بڑی فیملی کو سپورٹ کرتا تھا جس میں صرف چھوٹے بہن بھائی ہی شامل نہیں بلکہ اپنے سے کچھ بڑے شادی شدہ بھائی اور ان کی فیملی بھی شامل تھی۔ وہ بہت سے لوگوں سے قرضہ لے کر رقم اکٹھی کر کے امریکہ آیا تھا اور اسے وہ رقم بھی ادا کرنا تھی اور شادی کے سلسلے میں بھی اس نے اور اس کی فیملی نے جو قرض لیا تھا وہ بھی اتارنا تھا۔ وہ امریکہ میں رہ کر یا تو اپنی فیملی کو سپورٹ کرتا اور قرض اتارتا یا پھر اپنی تعلیم کو دوبارہ سے شروع کرنے کی کوشش کرتا۔ ظاہر ہے اس نے پہلے والے آپشن کا ہی انتخاب کیا تھا۔ اپنے سارے خوابوں کو کچھ عرصے کے لیے اس نے سر سے اتار کر رکھ دیا اور نیویارک میں کیب چلانے لگا اور اسی دوران وہ ان دوسرے بہت سے پاکستانی ڈرائیوروں سے متعارف ہوا جو اس سے زیادہ اعلا تعلیم یافتہ تھے مگر نیویارک میں کیب ہی چلا رہے تھے۔

ان میں ایک بڑی تعداد ڈاکٹرز، انجینئرز اور وکلاء کی بھی تھی اور ان میں سے اکثر لوگ کئی کئی سالوں سے امیگریشن کے لیے وکیلوں کی بھاری بھرکم فیسیں دے رہے تھے۔ مجاہد نے بھی ایک وکیل ہائر کیا تھا مگر چند سال وہاں گزارنے کے بعد بیوی کو وہاں بلا لینے یا ہر سال پاکستان جانے کا خواب بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ پہلی بار اس طرح امریکہ آ جانے پر بری طرح پچھتایا تھا مگر واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پیچھے قرض تھا یا خاندان کی توقعات کا انبار۔ اسے دونوں سے نبٹنا تھا۔

چوتھے سال اس نے تمام قرض ادا کر دیا تھا اور اس وقت تک وہ بری طرح ہوم سک نیس کا شکار بھی ہو چکا تھا۔ اس سال اس کا ارادہ تھا کہ وہ واپس چلا جائے اور یہی خواہش اس کی بیوی کی بھی تھی۔ گھر میں صرف وہی تھی جو مستقل طور پر ہر قیمت پر اس کی جلد واپسی کی خواہش مند تھی۔

مجاہد نے اپنی ماں کو واپس آنے کے بارے میں بتایا تھا اور گھر میں جیسے کہرام برپا ہو گیا تھا۔

”تم واپس آ جاؤ گے تو چھوٹی بہن کی شادی کون کرے گا؟ تم سے بڑی طلاق کے بعد گھر پر بیٹھی ہے، اسے دوبارہ بسانا ہے تمہیں۔ امجد کی بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں اور تمہیں پتا ہے، امجد کا کوئی کاروبار نہیں ہے۔ منظر ابھی پڑھ رہا ہے، اس کی تعلیم کے اخراجات کون اٹھائے گا؟ ہم ابھی تک کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔“

یہ کون کرے گا؟ وہ کون کرے گا؟ یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا، کی ایک لمبی فہرست تھی جس سے مجاہد گھبرا گیا تھا اس نے پاکستان واپس آنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ کم از کم اگلے دو سالوں تک۔ اور چار سالوں میں پہلی بار بیوی کے ساتھ فون پر اس کا جھگڑا ہوا تھا۔ وہ بے حد پریشان تھی۔ مجاہد بھی خوش نہیں تھا۔ مگر اس کا خیال تھا، اسے اس کے مسئلوں کو سمجھنا چاہیے۔

اس کی بیوی کا خیال تھا۔ اسے دوسروں کے ساتھ ساتھ اس کی اور اپنی زندگی کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے، وہ اپنی زندگی کے بہترین سال ایک دوسرے سے الگ رہ کر گزار رہے تھے۔

ان کا جھگڑا بہت دیر تک نہیں رہا تھا۔ چند دنوں میں مجاہد نے بیوی کو منا لیا تھا۔ لیکن اس کے گھر والوں نے اس کی بیوی کو تنگ کرنا شروع کر

دیا تھا۔ وہ پہلے بھی ان کے رویہ سے خوش نہیں تھی۔ مگر اب حالات زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ مجاہد کے گھر والوں کا خوف تھا کہ بیوی کے کہنے پر مجاہد پہلے کی طرح دوبارہ کبھی بھی واپسی کے لیے تیار ہو سکتا تھا اور اس خوف کی وجہ سے اس کی ماں، بہنیں اور بھائی مستقل فون پر اس سے اس کی بیوی کی شکائتیں کرتے رہتے، دوسری طرف اس کی بیوی بھی مجاہد سے ان کی شکائتیں کرتی تھی اور اس صورت حال نے نیویارک میں رزق کے لیے جدوجہد کرتے مجاہد کو ذہنی طور پر بے حد پریشان کر دیا تھا۔

وہ گھر والوں کی طرف داری کرتا تو بیوی ناراض ہو جاتی۔ بیوی کی طرف داری کرتا تو گھر والے برہم ہوتے۔ واحد حل اس نے یہ نکالا تھا کہ بیوی اور گھر والوں دونوں کو فون کرنا کم کر دیا تھا۔ اس چیز نے اس کے گھر پر کوئی اثر نہیں ڈالا مگر اس کی بیوی کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ مجاہد کے بارے میں بہت سے خدشات کا شکار ہونے لگی اور ان میں سب سے بڑا خدشہ دوسری شادی کا تھا۔

مجاہد اور اس کی بیوی کے درمیان اب فون پر صرف شکوے شکایتیں اور اس کا رونا دھونا ہوتا تھا۔ اور ان ہی شکوے شکایتوں میں ان دونوں کی شادی کو نو سال گزر گئے تھے۔ مجاہد اب بھی مہینے میں دوبار وکیل کے دفتر کے چکر لگاتا مگر شروع کے سالوں کی طرح اب وہ پہلے جیسی توقعات اور امیدیں لے کر وہاں نہیں جاتا تھا۔

تنویر اس کمرے میں رہنے والے لوگوں میں سب سے زیادہ خوش شکل تھا اور ان سب کے برعکس اس پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی کیونکہ اس نے کوئی ذمہ داری اپنے سر پر لی ہی نہیں تھی وہ بتیس سال کا تھا اور اس امریکہ آئے سات سال ہونے والے تھے وہ اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور اس کے گھر والوں کی مالی حیثیت بھی کافی بہتر تھی۔ مگر تنویر کو تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور وہ ایف اے میں ہی تعلیم چھوڑنے کے بعد آوارہ گردی کرنے لگا تھا اور اس نے امریکہ جانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔

وہ امریکہ ڈالر کمانے سے زیادہ اس آزادی کے لیے آنا چاہتا تھا جو اسے پاکستان میں میسر نہیں تھی۔ اس کے بڑے بہن بھائیوں نے اس کے امریکہ جانے پر اس لیے سکون کا سانس لیا تھا کہ گھر کا ایک بوجھ کم ہو گیا تھا۔ اور ان شکایتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا جو تنویر کی حرکتوں کی وجہ سے انہیں آئے دن کہیں نہ کہیں سے ملتی تھیں۔

صرف ان سب نے ہی نہیں تنویر نے بھی امریکہ پہنچ کر سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کا تعلق پاکستان کے ایک چھوٹے سے شہر سے تھا۔ جہاں وہ شدید گھٹن کا شکار تھا نیویارک اس کے خوابوں کی سرزمین تھی جہاں وہ جو چاہے کرتا اسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

یہاں ہر کوئی اپنے لیے جیتا تھا اور وہ اپنے لیے جینے ہی وہاں آیا تھا۔ مگر وہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی اس کی عقل ٹھکانے آ گئی تھی۔ وہ محنت کا عادی نہیں تھا اور امریکہ میں ایک کم پڑھے لکھے غیر ہنر مند ایشیائی کے لیے "محنت" نہیں "مشقت" تھی، وہ پاکستان میں یہ خواب دیکھتا رہا تھا کہ امریکہ میں سفید فام لڑکیاں ایشیائی بوائے فرینڈز پر مرتی ہیں اور جیسے ہی وہ وہاں پہنچے گا گھنٹوں کے اندر اندر کوئی امریکن لڑکی اس پر عاشق ہو جائے گی۔ اس کی یہ خوش فہمی بھی چند دنوں میں ہی رفو چکر ہو گئی تھی۔

وہ بروکلین میں رہائش پذیر تھا۔ جہاں "خوبصورت سفید فام دس پھینک امریکن لڑکی" ناپید تھی۔ جو چہرے اسے عام طور پر نظر آتے تھے وہ

ایشیائی یا سیاہ فام عورتوں کے تھے۔ اور ان معمولی شکل وصورت کی لڑکیوں کی آنکھوں میں بھی تنویر کو دیکھ کر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں ابھرتا تھا۔

اپنی شکل وصورت اور قد وقامت پر جو فخر اور غرور لے کر تنویر نیویارک آیا تھا وہ دنوں میں ملیا میٹ ہو گیا تھا۔ نیویارک میں صرف "ہنر" کے دام تھے اور تنویر کے پاس کسی قسم کا کوئی ہنر نہیں تھا۔ نیویارک صرف جان توڑ محنت کرنے والوں کو سیڑھیاں چڑھنے کا موقع دیتا تھا اور تنویر کو محنت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جن جگہوں پر چند چھوٹے موٹے کام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ جلد ہی وہاں سے کسی نہ کسی وجہ سے نکال دیا گیا۔ وہ بہت کام چور، کاہل اور بے ایمان تھا اور نیویارک میں ان خصوصیات کے انسان حشرات الارض کی طرح مر جاتے تھے۔

تنویر بھی بہت جلد بھوکوں مرنے لگا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ واقعی مر جاتا بالآخر ایک دن سڑک پر کھڑے ایک آدمی نے اسے اپنے اسٹوڈیو چلنے کی دعوت دی تھی۔ وہ ایک پینٹر تھا اور کسی انسٹی ٹیوٹ میں پینٹنگ کی کلاسز لیتا تھا۔ اسے آج کل کسی ایشیائی کی ضرورت تھی۔ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس آدمی کی بات کو صحیح طور پر سمجھے بغیر تنویر بے حد فخر اور جوش کے عالم میں اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا چہرہ اتنا دلکش ہے کہ کوئی آرٹسٹ اسے پینٹ کرنا چاہے گا۔ وہ جیسے ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔

اور ساتویں آسمان سے نیچے گرنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اسٹوڈیو پہنچنے کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ آرٹسٹ اس کا چہرہ پینٹ کرنے کے لیے اسے وہاں نہیں لایا۔ وہ اپنے اسٹوڈنٹس کو ان دنوں Nude پینٹ کرنا سکھا رہا تھا اور اسے ماڈل کی ضرورت تھی جو برہنہ حالت میں اس کے اسٹوڈنٹس کے سامنے ہر روز چند گھنٹے کے لیے آ کر بیٹھتا اور وہ اسے پینٹ کرنا سیکھتے۔

چند منٹوں میں تنویر کا غرور، خود اعتمادی اور عزت نفس مٹی کا ڈھیر بن گئے تھے وہ آوارہ اور بدکردار تھا اور اب نہیں ہمیشہ سے تھا۔ مگر پندرہ لڑکے لڑکیوں کی کلاس کے سامنے بے لباس حالت میں پوز کرنا اسے بے حد شرم ناک محسوس ہوا تھا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا تھا، وہ غصے میں اس آدمی کو گالیاں دے اور اس سے لڑے اور اس سے پہلے کہ وہ ان میں سے کسی ایک چیز پر بھی عمل کرتا۔ اس آدمی نے اسے بتایا تھا کہ فی گھنٹہ اسے کتنے ڈالر ملیں گے۔ اور ڈالر کی تعداد سن کر اس کا غصہ اور شرم ایک سیکنڈ میں ہوا ہو گئے تھے۔

وہ پورا دن محنت کر کے بھی اتنے ڈالر نہیں کما سکتا تھا وہاں جتنے ایک گھنٹے کے لیے بے لباس پوز کرنے کے عوض اسے مل سکتے تھے، اور آخر اسے کرنا ہی کیا تھا ...؟ کچھ نہیں ... تو پچھلے چھ سال سے تنویر اسی طرح کی دو تین اسٹوڈیوز میں نیوڈ پینٹنگ کے لیے ماڈلنگ کرتا تھا۔ یہ کام روز نہیں ملتا تھا اور جب وہ یہ کام نہیں کرتا تھا تو ایک Male prostitute کے طور پر نیویارک کی ایک بے حد مشہور اور "معروف" سڑک پر پایا جاتا تھا۔ جہاں امیر سفید فام اور سیاہ فام عورتیں اسے رات کو اپنے ساتھ کہیں نہ کہیں لے جاتیں۔ ان میں سے چند عورتوں کے ساتھ وہ کچھ عرصہ تک دوستی کرنے کی بھی کوشش کرتا رہا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ ایسی ہی کسی امیر عورت کے ساتھ شادی کر کے بروکلین سے مین ہٹن کے کسی شان دار گھر میں منتقل ہو سکے گا اور اگر شادی نہیں تو بوائے فرینڈ کے طور پر ہی کوئی عورت اسے مستقل طور پر اپنے ساتھ رکھ لے گی۔ اس کی یہ خوش فہمی بھی بہت جلد ہی دور ہو گئی۔

کسی One-nightstand والے ایک ایشیائی مرد کو نیویارک کی بورژوا کلاس کی کسی بھی عمر کی سفید فام عورت شوہر یا بوائے فرینڈ کے

طور پر ساتھ رکھنے کی حماقت کرنے پر تیار نہیں تھی۔

تنویر کو اگر بچت کی عادت ہوتی تو وہ ان دونوں ذریعوں سے ہونے والی آمدنی کو بچانے کی کوشش کرتا یا کم از کم اپنا کوئی لائف اسٹائل ضرور رکھتا مگر تنویر کے پاس جتنی رقم آتی، وہ ڈرگز ڈرنکنگ عورتوں اور نائٹ کلبز پر اڑا دیتا۔ وہ بے حد مہنگا لباس پہنتا اور بے حد اچھا کھانا کھاتا۔ کیونکہ وہ دونوں چیزیں اسے وہ عورتیں ہی دے دیتیں جو اسے اپنے ساتھ escort کے طور پر لے جاتیں اور تنویر کو جب ان سفید فام عورتوں سے فرصت ملتی تو وہ اپنے علاقے کی ان ایشیائی عورتوں کے ساتھ ڈیٹنگ میں مصروف رہتا جنہیں وہ پہلے دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا تھا۔ ان سے اردو اور پنجابی میں بے تکلفی اور روانی سے وہ سب کچھ کہہ سکتا تھا جو اتنے سالوں کے وہاں قیام کے بعد بھی وہ اپنی خستہ حال انگلش میں ان سفید فام عورتوں سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہاں رہنے والے باقی لوگوں کے برعکس وہ خوش قسمت تھا کیونکہ وہ بہت جلد امیگریشن کروانے میں کامیاب ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وہ بلڈنگ صابر، تنویر، مجاہد اور خود اس جیسے ایشیائی مردوں اور عورتوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہاں اسی طرح ڈربے نما اپارٹمنٹس میں اسی طرح مختلف شفٹوں میں درجنوں لوگ رہتے تھے۔ جن کی حشرات الارض جیسی زندگیوں سے ان کے اپنے اپنے ملک میں درجنوں لوگ عیش و عشرت کے مزے لوٹ رہے تھے۔ خاندانوں کے رشتوں سے جدائی، تنہائی، مشقت زندگی اور رزق کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ابنارمیلٹی کب ان کے وجود کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیتی، وہ جان بھی نہیں پاتے۔ وہاں اپنے ملک میں اپنے خاندان کے بیچ رہتے ہوئے زندگی کے گھنٹے، دن، ہفتے، مہینے نہیں ہوتے۔ وہاں زندگی میں صرف سال ہوتے ہیں۔ ایک سال یہاں، دو سال وہاں۔ چار سال اس شہر میں، چھ سال اس اسٹیٹ میں۔ پانچ سال اس گیس اسٹیشن پر سات سال اس اسٹور پر اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

اس نے اپنے آنے کے دو گھنٹے بعد صابر سے پوچھا۔

''مسجد کہاں ہے یہاں پر؟''

چائے پیتے ہوئے ان تینوں نے بغور اس کو دیکھا ''کیوں؟ مسجد کو کیا کرنا ہے تو نے؟'' صابر نے اسی طرح قدرے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''نماز پڑھنی ہے۔'' اس نے اسی طرح سادہ لہجے میں کہا۔

''پڑھ پڑھ۔ جتنی نمازیں پڑھ سکتا ہے پڑھ، یہاں جو آتا ہے۔ پہلے پہل دھڑا دھڑ نمازیں پڑھتا ہے۔ جب تک کام نہیں مل جاتا۔ وہ اسی طرح جائے نماز بچھائے بیٹھا رہتا ہے۔ پھر ادھر کام ملتا ہے۔ ادھر نمازیں غائب۔'' صابر نے ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں اس سے کہا۔

''لاس ویگاس میں بھی نمازیں پڑھتا تھا یا صرف نیویارک میں ہی شروع کرنا ہے؟''

صابر کا طنزیہ انداز برقرار تھا۔ ''وہاں بھی پڑھتا تھا۔'' وہ بات کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

''کتنی سال ہو گیا ہے تجھے نمازیں پڑھتے؟''

''گیارہ سال۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ تینوں اس بار اسے چونک کر کیوں دیکھنے لگے تھے۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی یوں

جیسے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیا کہے۔

''گیارہ سال سے باقاعدگی سے پڑھ رہا ہے؟'' صابر نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں'' وہ سمجھ نہیں سکا کہ اس کے اس انکشاف پر حیران ہونے والی کیا بات تھی۔

''آپ مجھے ڈائریکٹ کر دیں، میں مسجد ڈھونڈ لیتا ہوں۔'' اس نے جیسے ان کی حیرت سے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''چل میں تجھے چل کر بتاتا ہوں۔'' صابر یک دم کپ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا، اس نے تشکر آمیز انداز میں اسے دیکھا۔

باہر سڑک پر جاتے ہوئے صابر نے اس سے کہا۔

''تجھے پتا ہے اس کمرے میں اتنے سالوں میں تو پہلا نمازی ہے۔'' اس نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا، پورا راستہ دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی، پھر جب وہ مسجد کے دروازے کے پاس پہنچے اور وہ اندر جانے لگا تو صابر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس سے کہا۔

''اچھا میرے لیے دعا کرنا نماز پڑھ کر۔'' اس نے رک کر اسے دیکھا۔

''کس چیز کے لیے؟'' صابر اس کے سوال پر جیسے سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''کس چیز کے لیے؟ پتہ نہیں کس چیز کے لیے، تو بس کر دینا کسی چیز کے لیے۔''

صابر نے چند لمحوں کے بعد قدرے، الجھ کر اس سے کہا۔ وہ مسجد میں چلا گیا۔

وہ اگلے دو سال وہیں اسی اپارٹمنٹ میں ان ہی تینوں کے ساتھ رہا تھا۔ اور صرف وہی تھا جو اس اپارٹمنٹ میں ''رہتا'' تھا۔ اپنی شفٹ سے فارغ ہو کر اور کبھی کبھار ویک اینڈ پر بھی۔ جب وہ مسلسل کام کرتے کرتے تھک جاتا۔ شروع میں اسے چھوٹے چھوٹے کام ملے تھے۔ بعد میں وہ بھی ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنے کے بعد کیب چلانے لگا تھا۔ اس کے اور اس کمرے کے باقی لوگوں کی زندگی میں واحد فرق یہ تھا کہ وہ لیگل تھا۔ جب چاہتا پاکستان چلا جاتا، اور واپس بھی آ سکتا تھا۔ اور اس کے اور اس کمرے کے باقی لوگوں کی زندگیوں میں مشترک بات یہ تھی کہ ان کی طرح اس کے خاندان کو بھی اس وزٹ سے زیادہ امریکہ سے اس کے بھیجے گئے ڈالرز میں زیادہ دلچسپی تھی۔ لیکن وہ اس احساس کو اپنے ذہن سے جھٹکتا رہتا تھا۔ لیکن ہر روز یہ احساس پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر سامنے آتا تھا۔

''اپنے اوپر بھی پیسہ خرچ کیا کر۔ ہر وقت پاکستان ہی مت بھیجتا رہا کر۔'' صابر نے ایک دن اسے ڈانٹا تھا۔ ''جتنا پیسہ بھیجے گا، پاکستان والے سب کھا جائیں گے۔ وہ سمجھتے ہیں۔ یہاں ہم درختوں سے پیسا اتار کر انہیں بھیجتے ہیں۔''

صابر بے حد تلخی سے کہہ رہا تھا۔

''اپنے پاس پیسہ بچایا کر۔ جو بچت کرنی ہے یہاں تو نے ہی کرنی ہے۔ پاکستان میں تو تیرے پیسے سے عیش کر رہے ہوں گے سب۔ موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں پر پھر رہے ہوں گے تیرے بھائی اور تیری ماں اور بہنیں یا تو گھر کے لیے ٹی وی، فریج وی سی آر کے نئے سے نئے ماڈل بدل رہی ہوں گی یا پھر اپنے کپڑوں، جوتوں اور زیورات پر اڑا رہی ہوں گی۔''

اس نے صابر سے نظریں نہیں ملائیں۔ صرف اسی سے نہیں وہ حقیقت سے بھی نظریں چرانا چاہتا تھا کہ صابر کی باتوں میں سچائی تھی اور پیچھے اس کا خاندان اس کے بھیجے ہوئے "رزق حلال" کو "رزق حرام" کی طرح اڑا رہا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے سر جھکا کر بے حد معمول کے انداز میں کہا۔

"کیوں نہیں ہے؟ میرے بیوی بچے وہاں پاکستان بیٹھے یہی کر رہے ہیں۔ مجاہد کا خاندان یہی کر رہا ہے۔ تنویر پیسہ بھیج رہا ہوتا تو اس کا خاندان بھی یہی کرتا۔ تو تیرا خاندان کیوں نہیں کر رہا ہوگا۔" صابر نے بے حد سرد مہری سے کہا۔

"تو پھر کیا کروں۔ ان کو بھوکا ماردوں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔

"یہی تو مسئلہ ہے زندگی میں کہ کچھ چیزوں کا کوئی حل نہیں ہوتا پاس۔ بس انسان جیے جاتا ہے ان کے ساتھ، جیسے انسان کو چھوٹی موٹی بیماریوں کے ساتھ جینے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ ایسے ہی جھوٹ اور خود غرضی کے ساتھ بھی سمجھوتا کرنا سیکھ لیتا ہے۔"

صابر قوم جب بولنے پر آتا تو لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک ان پڑھ دیہاتی ہے۔

"یہ ماں، بہن، بیوی، سب بہت لالچی ہوتی ہیں۔

عورت کو مرد کے دل میں نہیں اس کی جیب میں دلچسپی ہوتی ہے۔ دل کا کیا کرنا ہوتا ہے اس نے۔ دل کو بیچ کر تو جوتوں کا ایک جوڑا تک نہیں آتا۔"

یہ مجاہد تھا۔ اس کے آنے کے ایک سال بعد اس نے اپنی بیوی کو غصے اور شک میں طلاق دے دی تھی۔ اس کے گھر والوں نے اس پر اپنے چھوٹے دیور کو ورغلانے کا الزام لگایا تھا اور اس کی بیوی نے اس کے چھوٹے بھائی پر زیادتی کی کوشش کا۔ مجاہد نے وہی کیا تھا جو کوئی بھی پاکستانی مرد اشتعال میں کرتا ہے۔ اس نے اپنے خاندان کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے اپنی بیوی کو طلاق بھیج دی تھی۔ وہ بے حد اشتعال میں تھا اور صابر اور تنویر کے ساتھ وہ بھی اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش اور اسے طلاق سے روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ مجاہد نے ان کی ایک نہیں سنی۔

تنویر نے ایک بار اس کی بیوی کی حمایت کرنے کی کوشش کی تھی اور مجاہد اس پر پل پڑا تھا۔ وہ اور صابر تنویر کو نہ بچاتے تو شاید مجاہد اس دن تنویر کی جان لے لیتا۔ "میرے بھائی۔ میرے چھوٹے بھائی پر الزام لگا رہا ہے۔ وہ اتنا بے غیرت ہوگا کہ اپنے بھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالے گا؟ مر کر بھی کبھی ایسا کام نہ کرے وہ۔ میری ماں اور بہن نے قسم کھا کر بتایا ہے مجھے کہ میری بیوی آوارہ ہے اور شروع دن سے ہی آوارہ تھی اور وہ اس کی حرکتوں کو مجھ سے چھپاتی رہیں۔ میرے بھائی کا نام کیسے لے لیا تو نے۔ وہ صرف پچیس سال کا ہے۔؟"

مجاہد حلق کے بل چیختا رہا تھا اور تب ہی خاموش ہوا جب تنویر نے اس سے معافی مانگی تھی۔

پندرہ دن بعد طلاق کے کاغذ پاکستان میں مجاہد کی بیوی کو مل گئے تھے۔ اس کے اگلے دن اس نے خودکشی کرلی۔ مجاہد کو اس نے خودکشی سے پہلے ایک خط لکھا تھا۔ مجاہد کو اس کی موت کے ایک ماہ بعد ملا۔ تب تک وہ اس کی موت کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ اس کے گھر والوں نے اسے اس سے بے خبر رکھا تھا۔

اس خط کے ملنے کے بعد مجاہد اگلے دو ماہ گم صم رہا تھا۔ وہ کئی بار دھاڑیں مار مار کران تینوں کے سامنے رو دیا بھی۔ خط میں اس کی بیوی نے اسے کیا لکھا تھا۔ وہ تینوں نہیں جانتے تھے۔ مگر وہ جو کچھ بھی تھا، اس نے مجاہد کے ضمیر کے بوجھ کو بڑھا دیا تھا۔

چھ ماہ اس نے اپنے گھر والوں کو ایک کال نہیں کی۔ ایک روپیہ نہیں بھیجا نہ ہی ان کی کوئی کال ریسیو کی۔ اس کے گھر والوں نے بوکھلاہٹ میں نیو یارک میں ہر واقف کار اور مجاہد کے ہر دوست کو فون کرنا شروع کر دیے تھے کہ وہ مجاہد کو گھر والوں کی مالی حالت کے بارے میں بتائے تا کہ وہ انہیں دوبارہ پیسے بھیجنا شروع کر دے۔

چھ ماہ کے بعد مجاہد نارمل ہو گیا تھا۔ گھر والوں کو ہنڈی ایک بار پھر جانے لگی تھی۔ فون بھی ہونے لگے تھے۔ البتہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی سے دوبارہ کبھی بات نہیں کی۔ اس نے پاکستان واپسی کے اپنے سارے خواب بھی ختم کر دیے تھے۔ اس کے باوجود کہ ان ہی دنوں اس کی امیگریشن ہو گئی تھی۔

وہ خود ان ہی دنوں امریکہ میں آنے کے ڈھائی سال بعد اپنی چھوٹی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اور بے حد خوش تھا، مگر وہ پاکستان نہیں جا سکا۔ اس کی بہن مسلسل فون پر اسے چند مزید زیورات کے لیے روپے بھجوانے پر اصرار کر رہی تھی۔

"میرے پاس فی الحال بالکل پیسے نہیں ہیں، ٹکٹ کے پیسوں کے علاوہ۔ تم دو، ماہ انتظار کر لو۔ میں شادی میں شرکت کے بعد جب واپس امریکہ آؤں گا تو تمہیں ان زیورات کے لیے روپے بھیج دوں گا۔" اس نے فون پر اپنی بہن سے کہا تھا۔

"اگر شادی پر سارے زیور نہیں پہنے تو بعد میں پہننے کا کیا فائدہ، لوگوں کو پتا کیسے چلے گا کہ میرے میکے والوں نے مجھے کتنا زیور دیا ہے۔"

اس کی بہن اپنے مطالبے پر جمی ہوئی تھی۔

"لیکن شہلا! میرے پاس واقعی پیسے نہیں ہیں۔" اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

"آپ ایسا کریں کہ ٹکٹ کے پیسے مجھے بھجوا دیں۔ باقی کی رقم امی اور ابو کہیں سے ادھار لے لیں گے۔" اس کی بہن نے بڑے اطمینان سے کہا۔ وہ بہت دیر کچھ بول نہیں سکا۔ یہ بھی نہیں کہ وہ پہلے ہی ٹکٹ خرید چکا ہے۔

"ٹھیک ہے، میں تمہیں ٹکٹ کے پیسے بھجوا دیتا ہوں۔"

"آپ دو ماہ بعد آ جائیں جب ٹکٹ کے دوبارہ پیسے اکٹھے ہو جائیں۔ میں شادی کی مووی بنوا کر رکھوں گی آپ کو دکھانے کے لیے بھائی جان۔"

وہ اب چہکتے ہوئے بتا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ ٹکٹ ری فنڈ کروا کر اس نے دوسرے دن ہنڈی کے ذریعے وہ رقم پاکستان بھجوا دی۔ اور پھر چند دنوں کے بعد کسی جانے والے کے ہاتھ وہ چیزیں بھی۔ جو وہ پچھلے کچھ عرصے سے اس لیے خرید رہا تھا کہ پاکستان جانے پر سب کو دے۔

اس نے صابر، تنویر یا مجاہد میں سے کسی کو اپنے پاکستان نہ جانے کی اصل وجہ نہیں بتائی تھی۔ وہ ان کی طرح وہاں بیٹھ کر اپنے گھر والوں کی عیب جوئی نہیں کر سکتا تھا۔

اسے نیویارک میں دو سال ہونے والے تھے جب اچانک ہارٹ اٹیک کی وجہ سے صابر کی موت ہو گئی تھی۔ وہ ہاسپٹل جانے سے پہلے ہی دم توڑ گیا تھا۔ مجاہد نے صابر کے بیٹوں کو فون کر کے انہیں اس کی موت کی اطلاع دی تھی۔ وہ رنجیدہ ہوئے تھے۔ مجاہد ان سے صابر کی ڈیڈ باڈی کو پاکستان بھجوانے کے انتظامات کرنے کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر ان میں سے کسی کو اس کی ڈیڈ باڈی وصول کرنے یا اسے پاکستان منگوانے کے لیے پیسہ خرچ کرنے میں دلچسپی نہیں تھی، وہ چاہتے تھے، اسے وہیں دفن کر دیا جائے البتہ اس کے پاس بینک میں موجود رقم اور دوسری جائیداد کی تفصیلات سے انہیں آگاہ کر دیا جائے۔ وہ اس سلسلے میں امریکہ آنے کے لیے بھی تیار تھے۔

اس نے مجاہد اور تنویر کے ساتھ زندگی کا یہ رخ بھی دیکھ لیا تھا۔ پورا ایک ہفتہ وہ مجاہد کے ساتھ صابر کے بیٹوں کو لاش پاکستان منگوا لینے پر رضا مند کرنے کی کوشش کرتا رہا اور ناکام رہا۔ وہ اس سلسلے میں کسی قسم کی رقم خرچ کرنے یا انتظامات کے لیے تیار نہیں تھے۔

مجاہد اور تنویر کے ساتھ مل کر چندہ جمع کر کے اس نے خود ہی صابر قیوم کی لاش کو پاکستان بھجوانے کا انتظام کیا تھا۔ مجاہد اور تنویر نے اسے ہی صابر قیوم کے سامان اور ڈیڈ باڈی کے ساتھ پاکستان بھجوایا تھا۔ جس زمین پر صابر قیوم اپنے بڑھاپے میں کاشت کاری نہیں کر سکا تھا۔ انہوں نے کوشش کی تھی کہ وہ کم از کم وہاں دفن ضرور ہو سکے۔

جہاز پر امریکہ سے پاکستان کے طویل فضائی سفر کے دوران صابر قیوم کی ڈیڈ باڈی کے ساتھ سفر کرتے ہوئے وہ صابر قیوم کے بارے میں نہیں سوچ رہا، وہ صرف اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا کسی دن اسی طرح جہاز پر کوئی اس کے تابوت کے ساتھ سفر کر رہا ہوگا۔

جہاز کا باتھ روم استعمال کرتے ہوئے ہاتھ دھوتے ہوئے اس کی نظر اپنی کلائی پر پڑی تھی۔ سردی اور خوف کی ایک لہر اس نے اپنے جسم سے گزرتی محسوس کی تھی۔ اپنی کلائی پر پتھر کے بت کی طرح نظریں گاڑے اس نے ایک "ہولناک انکشاف" کے ساتھ اس دن اس سفر کو اپنی زندگی کا بدترین سفر سمجھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ باتھ روم سے نکلنے کے بعد ڈیڑھ منٹ چلنے کے بعد وہ Aisle سیٹ پر بیٹھتے ہوئے جس پسنجر کے پاؤں کے پاس رکھے بیگ سے ٹھوکر کھا کر گرنے والا تھا۔ وہ "خوش قسمتی" تھی جو اس جہاز پر پرواز کر کے پندرھویں گھنٹے میں پچیس سال، آٹھ ماہ، چار دن اور پندرہ گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد بالآخر اس سے ملنے والی تھی۔

☆☆☆

زندگی کے آخری لمحوں میں اس نے ایک بار پھر اپنی موت کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی، وہ ناکام رہی۔ وہ اس کے پیروں کے علاوہ کچھ نہیں دیکھ سکی تھی۔ فرش پر چلتے پھرتے اس کے پیر۔ وہ وارڈ روب کی طرف جا رہا تھا۔ بلند آواز میں کچھ کہتے ہوئے۔ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اس کے ذہن نے ایک دم الفاظ کا مفہوم سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ ہر آواز اس کے لیے شور بن گئی تھی۔ ایک بے معنی، بے ہنگم، بے مقصد شور۔

وہ فرش پر اس کے پیروں کے قریب وارڈ روب میں موجود کپڑوں کو گرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ اب بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کی طرف اسے جاتے دیکھا۔ وہ کمرے میں ہر طرف کسی چیز کو تلاش کر رہا تھا۔ زندگی کے آخری لمحات میں بھی وہ جانتی تھی کہ اسے کس شے کی تلاش تھی۔ پیسے کی اور اس تلاش میں شاید اسے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے اس نے جسے بری طرح زدوکوب کیا تھا۔ وہ مر رہی تھی یا مرنے والی تھی۔ ورنہ آخر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اسے مرنے دیتا۔ آخر وہ اس کا شوہر تھا۔ آخر وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ شوہر؟ محبت؟ شوہر؟

اس کا ذہن اب جیسے کسی شے کو، کسی لفظ کو کوئی مفہوم دینے میں ناکام ہو رہا تھا۔ اوندھے منہ فرش پر گری وہ بے حد کوشش کے باوجود بھی کراہ نہیں پا رہی تھی۔ بے حد کوشش کے باوجود بھی اپنے وجود کو حرکت دینے میں ناکام ہو رہی تھی۔ صرف اس کا سانس تھا جو ابھی چل رہا تھا۔ کیوں چل رہا تھا؟ کیا رہ گیا تھا؟

موت اس کے کمرے کے فرش پر ابھی بھی ادھر سے ادھر چل رہی تھی۔ اس نے بے یقینی سے ایک آخری بار جیسے سوچنے کی کوشش کی تو کیا اتنے سالوں سے وہ اپنی موت سے محبت میں مبتلا تھی؟ وہ اتنے سالوں سے کیا وہ اپنی موت کے ساتھ ایک ہی گھر میں، ایک ہی کمرے میں، ایک ہی بستر پر رہتی آ رہی تھی؟

زری کو آخری سانس لینے تک یہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ اس شخص کے ہاتھوں مر رہی تھی جو اس کی زندگی تھا۔

☆☆☆

اس نے بے یقینی سے سامنے بیٹھے وکیل کو دیکھا۔ پھر اپنے کپکپاتے ہاتھوں کو مٹھیوں کی صورت میں بھینچ لیا۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ وکیل اس کی حالت دیکھ کر کیا سمجھ رہا ہوگا۔

وہ کچھ سمجھ رہا تھا یا نہیں۔ بہر حال اس وقت اس کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ صرف ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھے سر سے پاؤں تک بری طرح لرزتے کانپتے اس تیس سالہ نوجوان کے لیے شاک تھا مگر خود اس وکیل کے پچیس سالہ کیریئر میں یہ سب کچھ بہت بار ہو چکا تھا۔

"دوبارہ پڑھ کر سنا سکتے ہیں؟"

اس نے اپنی زبان اور جسم کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وکیل اسے دیکھ کر مسکرایا۔ پھر بے حد میکانکی انداز میں ایک بار پھر وہی سب کچھ دہرانے لگا۔

اس نے پلکیں جھپکائے بغیر، دم سادھے پوری توجہ سے ان دس لائنز کو سنا۔ وہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ اسے سننے میں کچھ غلطی تو نہیں ہوئی۔ پچھلے ہفتے بھی اسی جگہ اس وکیل کے آفس میں بیٹھے اس کو اس نے پانچ بار سنا تھا۔ اگر وکیل کے ساتھ اس کی اپائنٹمنٹ ختم نہ ہو جاتی تو شاید وہ اس وکیل

کو پانچ بار اور وہی کاغذ اور وہی چند لائنیں پڑھنے کے لیے کہتا۔

اس نے پورا ویک اینڈ ڈھنگ سے کچھ کھائے پیئے بغیر گزار دیا تھا۔ جمعہ کو اس کی وکیل سے ملاقات ہوئی تھی۔ آج پیر تھا۔ اس نے زندگی میں ہمیشہ ویک اینڈ کے آنے کا انتظار کیا تھا۔ کبھی اس طرح اس کے گزرنے کا نہیں جمعے اور ہفتے کی رات کو وہ سو نہیں سکا۔ اس کی نیند یکدم پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اور اتوار کی رات کو وہ نیند میں کوئی بے حد برا خواب دیکھ کر ایک بار پھر جاگ گیا تھا۔ پھر باقی کی رات اس نے بستر میں بیٹھے کھڑکی کو گھورنے یا کمرے کے چکر لگاتے گزار دی۔

سوموار کی صبح وہ اس لا فرم کے کھلنے سے بھی پہلے جا کر وہاں بیٹھ گیا تھا جس کے ساتھ وہ وکیل منسلک تھا۔

اس کی اپوائنٹ منٹ ساڑھے گیارہ بجے تھی۔ وہ تب تک سخت سردی میں پارکنگ لاٹ میں بیٹھا رہا۔ یوں جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ وہاں سے ہٹا تو یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح غائب ہو جائے گا۔

اور اب وہ دس منٹ سے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

”آپ اور کافی لیں گے؟“ وکیل نے جیسے اس کاغذ کو ایک بار پھر پڑھنے سے بچنے کے لیے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے اپنے سامنے پڑے خالی ڈسپوزیبل کپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وکیل نے خود اٹھنے کے بجائے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر اپنی سیکرٹری کو اندر بلا لیا۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں ہی پڑے کافی میکر سے کافی کے دو کپ ان دونوں کے سامنے رکھ گئی۔ وکیل نے ایک سائیڈ ٹیبل پر پڑا کوکونٹ کوکیز کا چھوٹا سا جار اٹھا کر اس کا ڈھکن کھولتے ہوئے اس نوجوان کے آگے کیا۔ اس نے ایک دفعہ اپنے دائیں ہاتھ کو پوری قوت سے کھولنے اور دوبارہ بھینچنے کے بعد جار میں ہاتھ ڈال کر ایک کوکی نکال لی۔ وکیل نے خود بھی ایک کوکی نکالتے ہوئے جار کو دوبارہ بند کر کے اسی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

سامنے بیٹھے نوجوان نے کوکی کا آدھے سے زیادہ حصہ دانتوں سے کاٹ کر کافی کا ایک گھونٹ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وکیل سے کہا۔

”آپ اس کاغذ کو ایک بار پھر پڑھیں۔“ وکیل کا دل چاہا، وہ اب اپنا سر پیٹ لے۔

☆☆☆

”یہ کیا ہے؟“ شیراز نے حیرانی سے اس قیمتی پرفیوم کو دیکھا جو زینب اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔

وہ اگلے دن اکیڈمی جانے والا تھا اور اس دن اسے لے کر باہر کھانا کھلانے آیا تھا۔ کوئی دوسری بیٹی ہوتی تو ضیا اسے کبھی اس طرح منگیتر کے ساتھ باہر جانے نہ دیتے مگر یہ زینی تھی اور اس کی ضد پر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار شیراز کے ساتھ اکیلی کہیں باہر جا رہی تھی۔

ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے بعد وہ اسے ایک پارک میں لے آیا تھا۔ پارک کی بینچ پر بیٹھے باتیں کرتے ہوئے زینب نے اپنے بیگ سے وہ پرفیوم نکال کر شیراز کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔

''آپ کے لیے ہے یہ۔'' زینب نے مسکراتے ہوئے شیراز سے کہا۔ ''آپ کو بہت پسند تھا نا۔''

وہ چار چھ ماہ پہلے کسی دوست کے گھر سے وہ پرفیوم لگا کر زینب کے گھر آیا تھا۔

''ارے امیں کہاں اس طرح کے مہنگے پرفیوم خرید سکتا ہوں۔ یہ تو ایک دوست کے گھر گیا تھا وہیں استعمال کر لیا۔''

اس نے تب زینب کے پوچھنے پر بتایا تھا۔ وہ شرٹ اس نے اگلے چند ہفتے دوبارہ نہیں پہنی بلکہ اسے اپنی دوسری شرٹس کے ساتھ رکھ دیا جن میں سے اسی پرفیوم کی مہک آنے لگی تھی اور وہ اگلے کئی دن ان دوسری شرٹس کو استعمال کرتا رہا۔ زینب کو اس نے ہنسی ہنسی میں یہ بات بتائی تھی۔

''کتنے کا ہوگا یہ پرفیوم؟'' زینب نے تب بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

''دو ڈھائی ہزار کا۔'' شیراز نے بتایا پھر اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا تھا۔ ''یہ کوئی شرٹ، رومال اور گھڑی نہیں ہے زینب بی بی! جو تم مجھے فوراً لا دو گی۔''

وہ جانتا تھا۔ زینی اس سے اس پرفیوم کی قیمت کیوں پوچھ رہی تھی۔ زینب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ دو ڈھائی ہزار واقعی معمولی رقم نہیں تھی۔

اور اب اتنے ماہ کے بعد ہیوگو باس شیراز کے ہاتھوں میں تھا۔

''لیکن اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟'' شیراز اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ مت پوچھیں۔'' زینب نے بے اختیار کہا۔

''پھر بھی...'' شیراز نے اصرار کیا۔

''میں نے کہا نا۔ یہ مت پوچھیں۔'' وہ اسے یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ اس نے پچھلے کئی ماہ سے اپنے لئے کپڑوں کا ایک جوڑا بھی نہیں بنوایا تھا۔ وہ ضیا سے جیب خرچ کے طور پر ملنے والے روپے تک جمع کرتی رہی تھی۔ اپنے چھوٹے موٹے اخراجات اور کالج آنے جانے کا کرایہ وہ ٹیوشن سے نکال لیتی تھی اور اتنے ماہ میں بہت کم ایسا ہوا تھا کہ اس نے کالج میں کینٹین سے کچھ کھایا تھا۔ اگر شیراز ان مہینوں میں وقتاً فوقتاً اس سے ادھار رقم نہ لیتا رہا ہوتا تو زینب بہت پہلے اسے وہ پرفیوم خرید کر دے دیتی۔

شیراز اب پیکنگ کھول کر قدرے جوش کے عالم میں وہ پرفیوم لگا رہا تھا۔ زینی اس کے چہرے پر پھیلی خوشی کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے تھا کہ وہ خوش تھا۔ اس کے دیے گئے کسی تحفے نے اسے مسرور کیا تھا۔

''تم بہت عجیب ہو زینی!'' اس نے پرفیوم دوبارہ ڈبے میں رکھتے ہوئے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

''کیوں عجیب کیوں ہوں؟'' زینی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''محبت میں اس طرح تو مرد کرتے ہیں کہ عورت کی زبان پر کسی چیز کا مطالبہ آئے اور وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر اس کو پورا کر دیں۔ ایسی عورتیں نہیں دیکھیں جو یہ کرتی ہوں۔'' شیراز اس بار بے حد سنجیدگی کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''محبت میں یہ کہاں لکھا ہے۔ کون کس کے لیے کیا کرے گا اور کس کو کس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ بس یہ دل کی بات ہے۔ میں وہ کرتی

ہوں جو میرا دل مجھ سے کہتا ہے اور آپ کو اس خوشی کا اندازہ تک نہیں ہو سکتا جو مجھے ہوتی ہے جب میں آپ کے لیے کچھ کرتی ہوں۔ آپ کے لیے، نہیں کرنا تو پھر اور کس کے لیے کرنا ہے۔''

شیراز کے ہاتھ سے پرفیوم لے کر اس نے بڑے قرینے اور سلیقے کے ساتھ پیک کیا۔ شیراز نے اسے قدرے بے ڈھنگے انداز میں پیک کیا تھا۔

''میں تمہارے لیے بہت کچھ کروں گا زینی! بہت کچھ تم   تم میرے گھر میں ملکہ کی طرح رہو گی۔''

شیراز نے یک دم اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ اسے واقعی اس وقت زینی پر بے حد پیار آ رہا تھا۔

''گھر میں ملکہ بنا کر چاہے نہ رکھیں مگر دل میں کنیز بنا کر ضرور رہنے دیں۔'' زینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ضرور کنیز بنا کر رکھتا اگر تم اتنی خوبصورت نہ ہوتیں۔'' وہ اب اسے چھیڑ رہا تھا۔ ''لیکن اب اتنی خوب صورت لڑکی کو کوئی کنیز تھوڑی بناتا ہے۔''

''میں بہت اداس ہو جاؤں گی آپ کے بغیر۔'' زینی نے یک دم اداس ہوتے ہوئے کہا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ اگلے دن اکیڈمی جا رہا تھا۔

''اداس ہونے والی کیا بات ہے۔ میں دو ہفتے میں ایک بار تو آ ہی جایا کروں گا۔'' شیراز نے اسے تسلی دی۔

''دو ہفتوں میں چودہ دن ہوتے ہیں۔'' زینی نے بے ساختہ کہا۔

''چودہ سو تو نہیں ہوتے نا۔''

''آپ چاہتے ہیں، چودہ سو ہوتے؟'' زینی نے یک دم برا مان کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔

''مذاق کر رہا تھا میں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر برا مان جاتی ہو تم۔'' شیراز نے بے ساختہ کہا۔

''یہ چھوٹی بات ہے کیا؟'' وہ مزید برا مانتے ہوئے بولی۔

''اچھا..... اچھا بہت بڑی بات ہے۔ ہاتھ تو پکڑاؤ۔''

''نہیں، بس اب گھر چلیں، شام ہو رہی ہے۔ میں نے ابو سے کہا تھا کہ میں شام ہونے سے پہلے واپس آ جاؤں گی۔''

وہ یک دم بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اندھیرا پھیلنے کا احساس ہوا تھا۔

''شام کیا رات بھی ہو جائے تو کیا ہے۔ تم میرے ساتھ ہو۔'' شیراز نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''ابو بہت ناراض ہوں گے۔ پہلے ہی انہوں نے بہت مشکل سے اجازت دی ہے۔'' زینی نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم مجھ سے اکیڈمی ملنے آؤ گی؟'' شیراز نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ابو روز روز اس طرح اکیلے کہیں جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔'' زینی نے بے ساختہ کہا۔

''میں خود چچا سے بات کروں گا۔''

''فضول باتیں مت کریں۔''

''تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم میرے بغیر اداس ہو جاؤ گی۔ میں چچا کو یہی بتاؤں گا۔''

''آپ ابو سے یہ کہیں گے؟'' زینی نے ٹھٹک کر بے یقینی سے اس کو دیکھا۔

''ہاں۔ یہی کہوں گا، تم چاہتی ہو، کچھ اور کہوں تو وہ بھی بتا دو۔'' شیراز نے بے حد سنجیدگی اور اطمینان سے زینی سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں اب ہم مہینے میں ایک دو بار اسی طرح کھانا کھانے کہیں جایا کریں۔ پھر اسی طرح کسی پارک میں۔ چچا اجازت نہیں دیں تو بھی ہم جایا کریں گے۔ میں کسی دن کالج سے تمہیں پِک کرنے آ سکتا ہوں۔''

وہ ٹھٹک گئی۔ دو قدم چل کر شیراز نے مڑ کر دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی۔ بے حد ہکا بکا انداز میں۔ شیراز نے بے اختیار اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

''کیا ہوا زینی؟ کیا پارک میں کچھ دیر اور بیٹھنا چاہتی ہو۔ میں تو پہلے ہی تم سے کہہ رہا تھا کہ اتنی جلد گھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے پوچھا۔

زینی کو احساس ہوا۔ وہ اسے جان بوجھ کر تنگ کر رہا تھا۔ اس کی جیسے جان میں جان آئی تھی۔ شیراز کا مذاق اکثر اس کے سر کے اوپر سے گزرتا تھا۔

''میں تو ڈر گئی تھی۔'' اس نے قدم بڑھاتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

''حالانکہ اس میں ڈرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ آخر لڑکے لڑکیاں Dating کرتے ہیں۔ یہ اس پارک میں جو اتنے کپلز تمہیں نظر آ رہے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ سب میاں بیوی ہیں؟'' شیراز نے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے اسے چند جوڑوں کی طرف متوجہ کیا۔

''ویسے مجھے اس طرح کی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔'' اس نے مزید کہا۔

''کس طرح کی؟'' زینی نے بے ساختہ پوچھا۔

''ماڈرن اسٹائلش لڑکیاں۔'' اس نے ستائشی انداز میں پارک میں چلتی پھرتی لڑکیوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اس طرح کے کپڑوں میں؟ کٹے ہوئے بالوں کے ساتھ، اس طرح کے میک اپ میں؟'' زینی کو جیسے یقین نہیں آیا۔

''ہاں کیا غلط ہے اس سب میں۔ بیوی ایسی ہونی چاہیے کہ لوگ مڑ مڑ کر دیکھیں۔ ذرا شادی ہو جانے دو پھر کرتے ہیں تمہارے ساتھ بھی کچھ۔'' شیراز نے بات کرتے کرتے یک دم اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے گڑبڑائی پھر ہنس پڑی۔ اسے یاد آ گیا تھا شیراز کو مذاق کرنے کی عادت تھی اور وہ پھر اس کے مذاق کو حقیقت سمجھ رہی تھی۔

☆☆☆

سول سروسز اکیڈمی میں شیراز کا پہلا دن جیسے بادشاہ کا اپنے دربار میں پہلا دن تھا۔ پہلی چند پوزیشنز لینے والوں کے بارے میں کچھ ہی نہیں فیکلٹی کے ہر ممبر کو بھی دلچسپی تھی اور شیراز زندگی میں پہلی بار جیسے راجہ اندر بنا ہوا تھا۔ مگر صرف چند گھنٹوں میں ہی وہ راجہ اندر اپنے تخت سے معزول ہو گیا تھا۔

اس کے علاوہ پہلی پانچوں پوزیشنز پر آنے والے کامنرز (Commoners) اپر کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ Ruling elite ان سب کے پورے کے پورے نہیں تو کم از کم آدھا خاندان پہلے ہی بیوروکریسی میں اہم عہدوں پر فائز تھا۔ کسی کا باپ فیڈرل یا پروونشل سیکرٹری تھا تو اس

کمشنر، کسی کا بھائی ایمبیسڈر رہا تو بہن ٹریڈ قونصر۔ وہ سب ایک دوسرے کے خاندانوں کو اوپر سے نیچے تک جانتے تھے۔ کون کب کہاں پوسٹڈ تھا اور کب پوسٹ ہونے والا تھا۔ پہلی پانچ پوزیشنز لینے والوں میں وہ واحد تھا جو اردو میڈیم سرکاری اسکول سے پڑھ کر آیا تھا۔ باقی چاروں ساری عمر انگلش میڈیم سے پڑھے تھے۔ ان میں سے دو کی ابتدائی تعلیم بیرون ملک ہوئی تھی اور وہ میڈیکل گریجویٹ تھے۔

دوسرے دو کی اسکولنگ پاکستان میں ہوئی تھی اور وہ اس کے بعد کی تعلیم باہر کی اعلیٰ ترین یونیورسٹیز میں حاصل کرتے رہے تھے۔ وہ چاروں آپس میں جو باتیں کر رہے تھے۔ وہ جیسے شیراز کے سر کے اوپر سے گزرتی رہی تھیں۔ اس کے پاس ان چاروں کو بتانے کے لیے جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ کوئی باپ، چچا، ماموں، بھائی، کوئی نہیں جس کے عہدے کے بارے میں بات کر کے وہ وہاں ان کو اپنے خاندانی ہونے کا ثبوت دیتا۔

وہ چاروں ایک دوسرے کو ذاتی طور پر نہ جاننے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح بے تکلفی سے بات کر رہے تھے جیسے ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے رہے ہوں اور شیراز بالکل گنگ، دم سادھے ان کے بیچ بیٹھا رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کی کلاس سے اس کامن میں کوئی نہیں تھا۔ پیچھے کی پوزیشنز پر کچھ لڑکے لڑکیاں اسی کی طرح لوئر مڈل کلاس سے آئے تھے اور اسی کی طرح وہ بھی اپنے رکھ رکھاؤ سے اپر کلاس کا حصہ نہیں لگ رہے تھے۔ مگر شیراز اٹھ کر ان کے پاس نہیں گیا۔ وہ اس کلاس کو بہت پیچھے دفن کر آیا تھا۔ اسے اب اس کلاس سے بچنا تھا۔

اکیڈمی کے ہاسٹل میں پہلی رات شیراز نے جاگ کر گزاری۔ وہ ایک ہی دن میں شدید احساس کمتری کا شکار ہو چکا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے ان چاروں کا مسز کے انداز میں جن کے ساتھ وہ سارا دن رہا تھا اپنے یا اپنے خاندان کے لیے کسی قسم کی توہین یا ذلت محسوس ہوئی تھی۔ اس کے برعکس وہ چاروں اسے بڑی اہمیت دیتے رہے تھے۔ شاید ان چاروں نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ وہ لوئر مڈل کلاس سے وہاں آیا تھا اور اس کا خاندان بے حد غریب تھا۔ مگر یہ ساری باتیں شیراز کے اپنے ذہن میں تھیں۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنے خاندان، اپنے محلے اور اپنی کلاس کی ہر شناخت اپنے وجود سے ختم کر دیتا۔ وہ ان جیسا بن جاتا، وہ ساری زندگی خواب دیکھتا رہا تھا اور جن کے جیسا بننے کی خواہش کے لیے جدوجہد اسے اس اکیڈمی میں لے آئی تھی۔

اس رات، اکیڈمی کے اس کمرے میں بیٹھ کر اس نے طے کیا تھا کہ وہ اپنی کلاس کی ہر چھاپ کو اپنے اوپر سے رگڑ رگڑ کر مٹا دے گا۔ اسے ایک ننھے بچے کی طرح ہر شے شروع سے دیکھنا تھی۔ اپر کلاس کیا کھاتی تھی، کس طرح کھاتی تھی، کیا پہنتی تھی۔ کس طرح پہنتی تھی۔ اپر کلاس کس طرح چلتی تھی۔ کیا سوچتی تھی۔ کیا کہتی تھی۔ کیا زبان بولتی تھی۔ کن ایشوز کے بارے میں بات کرتی تھی۔ شیراز اکبر سول سروسز اکیڈمی میں پہلی رات کو ہی جیسے اپنے وجود کی کلوننگ کر رہا تھا۔

☆☆☆

"شیراز سے بات ہوئی؟" رمشہ نے اس سے پوچھا۔

"نہیں، کیسے ہوگی؟" زینب نے قدرے مایوسی سے کہا۔ "اکیڈمی میں مصروف ہیں۔"

"اس ویک اینڈ پر گھر آ رہا ہے یا نہیں؟"

''پتا نہیں شاید۔'' زینب نے اسی انداز میں کہا۔ وہ کالج کے گراؤنڈ میں ایک فری پیریڈ میں پھر رہی تھیں۔

شیراز کے پوزیشن لینے کے چند دنوں بعد ہی زینب اور رمشہ دوبارہ سے شیر وشکر ہو گئی تھیں۔ رمشہ کے علاوہ زینب کی اور کوئی دوست نہیں تھی اور رمشہ نے زینب سے بہت زیادہ معذرت کی تھی۔ شاید زینب کچھ عرصہ اسی طرح موڈ آف رکھتی مگر شیراز کی کامیابی کی وجہ سے وہ اتنی خوش تھی کہ اس نے رمشہ کو فوراً معاف کر دیا تھا۔ البتہ وہ اس کے بعد دوبارہ اس کے گھر نہیں گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی، وہاں فاران سے اس کا دوبارہ آمنا سامنا ہو۔

پچھلے کچھ مہینوں سے ان کے تعلقات پھر پہلے جیسے ہی ہو چکے تھے۔ رمشہ پہلے ہی کی طرح وقتاً فوقتاً شیراز کے بارے میں اس سے پوچھتی رہتی تھی۔ آج بھی وہ اسی طرح استفسار کر رہی تھی۔

''چلو، اس ویک اینڈ پر نہ سہی، اگلے ویک اینڈ پر ہی سہی مگر آ تو جائے گا۔ تمہارے خطوں کا جواب دیا ہے؟'' رمشہ کو یک دم یاد آیا۔

''نہیں۔ ابھی تک تو مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ مگر جانے سے پہلے وہ کہہ کر گئے تھے کہ میں انہیں خط لکھتی رہوں چاہے جواب ملے یا نہ ملے۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' رمشہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اسے یہ بات بہت بری لگی۔ ''وہ جواب بھی نہ دے اور تم اسے خط لکھتی رہو۔''

''خط پر خط کیا، صرف تین خط تو لکھے ہیں۔'' زینی نے جیسے شیراز کا دفاع کیا۔

''وہ تمہیں کہتا تو تم تمہیں بھی لکھ دیتیں مجھے خط لکھنے پر اعتراض نہیں ہے جواب نہ آنے پر اعتراض ہے۔''

''تمہیں پتا ہے وہ کتنے...''

رمشہ نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔ ''پتہ ہے مجھے کہ کتنا مصروف ہوگا وہ وہاں۔ مگر چار لائنیں لکھ دینے کے لیے گھنٹوں نہیں چاہئیں۔ اس بار آئے تو بات کرنا اس سے اور وہ جواب نہ دے تو تم بھی خط لکھنا چھوڑ دینا۔''

رمشہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا، زینب قائل نہیں ہوئی مگر اس نے رمشہ کے ساتھ بحث نہیں کی۔ وہ اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اسے اس کے جواب کا انتظار نہیں تھا۔ اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ شیراز کو یہ پتہ چلتا رہے کہ وہ اس کے لیے کیا محسوس کر رہی ہے اس کی عدم موجودگی میں۔

☆☆☆

''یہ کون ہے؟'' جواد نے شیراز کے کمرے میں اس کی اسٹڈی ٹیبل پر پڑی زینی کی ایک فریمڈ تصویر ہاتھ میں لیتے ہوئے بے حد دلچسپی سے پوچھا۔ وہ اس کے کامن کا ہی ایک ساتھی تھا اور پچھلے کچھ دنوں سے وہ اور شیراز زیادہ تر وقت ساتھ گزارتے رہے تھے۔

''یہ میری منگیتر ہے۔'' شیراز نے یک دم بڑے جوش کے عالم میں زینی کا تعارف کروایا۔ کم از کم اس کے پاس ایک ایسی چیز تھی جو اس کے لیے فخر کا باعث تھی۔ ایک غیر معمولی طور پر حسین منگیتر۔

''اوہ! آئی سی۔'' جواد نے اس کے جواب پر بے حد غور سے اس تصویر کو دیکھا۔ ''ویری پریٹی۔'' اس نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''کیا کرتے ہیں تمہارے سسر؟'' اس نے اسی روانی سے اگلا سوال کیا۔

"انکم ٹیکس میں کلرک ہیں۔" اس وقت تک شیراز کا خیال تھا۔ اس کے اپنے باپ کی نسبت ضیا چچا کی جاب قابل عزت تھی۔

"کلرک؟" جواد نے بے ساختہ بے حد حیرانی سے کہا۔ "اوہ۔" پھر اسی انداز میں فوٹو فریم قدرے لاپروائی کے عالم میں اسٹڈی ٹیبل پر رکھ دیا۔ یوں جیسے یک دم اس چہرے کی خوب صورتی میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ شیراز نے اس کے ہر انداز کو لاشعوری طور پر محسوس کیا تھا۔ اس کی واحد قابل فخر ملکیت بھی اپر کلاس کے سامنے کھڑے اس فرد کو مرعوب کرنے میں ناکام رہی تھی۔

"اچھا پھر کب تک باہر آ رہے ہو؟" جواد نے اسی سانس میں اگلا سوال کیا۔

"کہاں جا رہے ہو تم؟"

"کھانا کھانے، سیما کی برتھ ڈے ہے۔ وہی لے کر جا رہی ہے۔ خاقان اور نوشین بھی جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا، تمہیں بھی ساتھ لے لوں۔" سیما جواد کی منگیتر تھی اور اسی کا من میں سول سروسز اکیڈمی میں تھی۔

"نہیں، مجھے کچھ نوٹس تیار کرنے ہیں۔ تم لوگ جاؤ۔" شیراز نے یک دم جیسے ایک بہانہ کیا۔ سیما کی برتھ ڈے پر جانے کا مطلب ایک عدد تحفہ اور ایک اضافی خرچ تھا۔

"بند کر یہ پڑھائیاں پڑھا کو۔ اکیڈمی تو پہنچ گیا ہے پوزیشن لے کر۔ اب اور کیا کرنا ہے تو نے" جواد نے بڑی بے تکلفی سے اسے جھڑکا۔

"نہیں، واقعی میں پڑھنا چاہتا ہوں اور مجھے"

"تو پڑھنا چاہتا ہے اور ہم لنگڑے ہیں نا جو شام کو آوارہ گردی کے لیے نکل جاتے ہیں۔ چھوڑ یار! بس کر۔ یہاں اکیڈمی میں سارے نقلیں مار کر پاس ہوتے ہیں مل ملا کر لیں گے پیپر اب کیا ساری عمر اسی طرح کھپتے رہیں گے۔ میں باہر پارکنگ میں انتظار کر رہا ہوں تیرا فوراً آ جا۔"

جواد کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا۔ مگر شیراز کا دھیان اسٹڈی ٹیبل پر بڑی بے احتیاطی کے عالم میں پڑی زینی کی فوٹو گراف پر تھا۔ آخر کوئی زینی کی تصویر کو اس طرح رکھ کر کیسے جا سکتا تھا۔ کیا واقعی وہ چہرہ کسی حوالے کے بغیر اتنا معمولی تھا کہ جواد جیسا دل پھینک لڑکا بھی اسے یونہی رکھ کر چلا گیا تھا۔ شیراز کے احساس تفاخر کو جیسے بری طرح ٹھیس لگی تھی۔ تو کیا زینی کچھ بھی نہیں تھی اور وہ خوامخواہ اسے سر پر اٹھائے پھر رہا تھا۔ کسی تاج کی طرح۔

اس شام پہلی بار اس نے زینی کی اس فوٹو گراف کو کسی جذبے کے بغیر بہت دیر تک دیکھا تھا۔ خوب صورت گہری سیاہ آنکھیں، سرخ و سفید رنگت۔ بے حد تیکھے نقوش اور جان لے لینے والی مسکراہٹ آج ان میں سے کسی ایک چیز نے بھی شیراز کا دل اپنی طرف نہیں کھینچا تھا۔

کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے اس فریم کو اسٹڈی ٹیبل پر رکھنے کے بجائے اسٹڈی ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا، کوئی اور اس فوٹو گراف کو دیکھ کر وہی سوال کرے جو جواد نے کیا تھا۔

☆☆☆

اس رات پی سی کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے شیراز صرف سیما اور نوشین کا ہی نہیں اس ریسٹورنٹ میں بیٹھی دوسری لڑکیوں کا بھی جائزہ لیتا رہا۔ بلاشبہ وہاں موجود کوئی لڑکی بھی خوب صورتی میں زینی کے مقابل کھڑی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے باوجود وہاں موجود ہر لڑکی شیراز کو زینی سے زیادہ اٹریکٹ لگ رہی تھی۔

بے حد جدید تراش خراش کے ملبوسات میں ملبوس، تراشیدہ بالوں اور میک اپ کیے بے حد خود اعتمادی سے انگلش میں بات کرتی وہ لڑکیاں کسی بھی مرد کو اپنی طرف متوجہ کر اور متوجہ رکھ سکتی تھیں اور زینب ضیا کیا تھی، اس کی طرح ایک سرکاری اسکول سے تعلیم یافتہ گریجویٹ جسے لباس پہننے کا ڈھنگ اور قرینہ آتا تھا نہ انگریزی میں اس طرح دنیا کے ہر ایشو پر بات کرنے کا سلیقہ جسے وہ اگر ایسے کسی ہوٹل میں لے آتا تو وہ حواس باختہ ہو جاتی۔ وہ اپنی چادر سنبھالتی پھرتی یا ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتی مردوں کی نظروں اور موجودگی سے اپنا جسم چرائے بیٹھی رہتی جو اس ڈائننگ ٹیبل پر موجود کسی کانٹے اور چمچ کو صحیح طریقے سے پکڑ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہاں بیٹھے اس کے ساتھی اگر گپیں مارتے، قہقہے لگاتے ہوئے اس وقت اور موقع کو انجوائے کر رہے تھے تو شیراز اندر ہی اندر سلگتے ہوئے اس وقت صرف اور صرف زینب ضیاء اور اس کی شخصیت کا پوسٹ مارٹم کرنے میں مصروف تھا۔ ہر اندازہ، ہر تجزیہ اس کی فرسٹریشن میں اضافہ کر رہا تھا زینب ضیا کی ذات پر پچھلے چار سال سے کیے جانے والا فخر اور غرور یک دم تاش کے پتوں کی طرح دھڑام سے نیچے آن گرا تھا۔ زینب ضیا وہ لڑکی نہیں تھی جسے اس کی شریک حیات ہونا چاہیے تھا۔ اکیڈمی کے تیسرے ہفتے ہی شیراز اکبر کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''آؤ یار! رک کیوں گئے۔ اندر آؤ؟''

جواد نے مڑ کر شیراز سے کہا۔ جو سعید نواز کے گھر کے پورچ میں کھڑی مختلف ماڈلز کی گاڑیوں کو دیکھ کر بے حد مرعوب نظر آ رہا تھا۔ جواد کے ٹوکنے پر وہ اس کے پیچھے گھر کے اندر داخل ہوا۔

''صاحب ناشتے پر آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔'' آگے چلتے ملازم نے جواد کو جیسے اطلاع دی مگر جواد سے زیادہ وہ یہ اطلاع شیراز کے لیے تھی۔ کیونکہ وہ جواد کے چچا کا گھر تھا اور وہ وہاں اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ مگر آج پہلی بار ویک اینڈ پر جواد اصرار کر کے شیراز کو اپنے ساتھ وہاں لے کر آیا تھا۔ کسی انکم ٹیکس کمشنر کے گھر پر یہ شیراز کا پہلا وزٹ تھا اور وہ مرعوب ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے خائف بھی تھا کیونکہ کل کو اسے اس ڈیپارٹمنٹ میں ہی آگے آنا تھا۔ اس کے برعکس جواد ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ میں تھا۔

وہ دونوں اب ڈائننگ روم میں داخل ہو رہے تھے۔ ناشتے کی ٹیبل لگی ہوئی تھی مگر وہاں صاحب کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

''آپ لوگ بیٹھیں میں صاحب کو اطلاع کرتا ہوں۔'' ملازم نے ان سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ شیراز کی نظر ٹیبل پر رکھے ناشتے کے ان لوازمات پر تھی جنہیں وہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ستر فی صد کے نام کے تلفظ کی ادائیگی بھی وہ ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتا تھا۔ استعمال تو خیر دور کی بات تھی۔ اسے اپنے ماتھے کے ساتھ ساتھ اپنی ہتھیلیوں پر بھی پسینہ آتا محسوس ہوا تھا۔

"بیٹھ جاؤ یار انکل آتے ہی ہوں گے۔" جواد نے پہلے کی طرح ایک بار پھر اس سے کہا اور خود ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ شیراز بھی اس کی پیروی کرتا قدموں کی آہٹ اس کے عقب میں سنائی دی تھی اور ایک ملازم کے ساتھ سعید نواز کمرے میں داخل ہوئے۔

"ہیلو انکل!" جواد نے ان کے آتے ہی کہا اور اٹھ کر سعید نواز سے ہاتھ ملایا۔ شیراز کچھ اور نروس ہو گیا۔ سعید نواز اور جواد کے درمیان چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ سعید نواز شیراز کی طرف متوجہ ہوئے۔

"انکل! یہ میرا دوست ہے شیراز اکبر۔"

جواد نے اس کا تعارف کرایا۔ شیراز نے بے اختیار آگے بڑھ کر سعید نواز سے ہاتھ ملایا۔ سعید نواز نے بھی اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے اتنی ہی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

"آئیں، ناشتہ کرتے ہیں۔" سعید نواز کہتے ہوئے اسے لے کر خود بھی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ چند ہی لمحوں میں ملازم نے انہیں سرو کرنا شروع کر دیا تھا۔ سعید نواز اب شیراز سے اس کی پوزیشن اور ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اور شیراز بے حد نروس انداز میں انہیں جواب دے رہا تھا۔ ایک انکم ٹیکس کمشنر کے گھر پر اس کی ٹیبل پر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا شیراز کے لیے اس سے پہلے صرف ایک خواب ہی تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ سعید نواز اسے اتنی اہمیت دیں گے۔

"مجھے سلیف میڈ لوگ بہت اچھے لگتے ہیں کیونکہ وہ بہت آگے تک جا سکتے ہیں۔" سعید نواز نے اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں جاننے کے بعد بے حد ستائشی انداز میں کہا تھا۔

"شینا جاگ رہی ہوتی تو میں تمہیں اس سے بھی ملواتا۔ وہ بہت انجوائے کرتی تمہاری کمپنی کو۔" سعید نواز نے جس کا نام لیا تھا، شیراز اس کے بارے میں پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکا کہ وہ کون ہے۔ یہ مشکل جواد نے ہی آسان کی۔

"شینا سعید انکل کی بیٹی ہے ویری ٹیلنٹڈ۔"

جواد نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی تعریف کی۔ شیراز صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ دے کر خاموش بیٹھا رہا۔ اسے سعید نواز کی ٹیلنٹڈ بیٹی میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

"شیراز کو نیکسٹ ویک اینڈ پر میرے فارم ہاؤس پر ہونے والی پارٹی میں انوائیٹ کیا تم نے؟" سعید نواز ان دونوں کو چھوڑنے باہر پورچ تک آئے تھے اور وہیں الوداعیہ کلمات کہتے کہتے انہیں جیسے یک دم یاد آیا اور انہوں نے جواد سے چونک کر پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے یاد نہیں رہا۔" جواد بھی چونکا تھا۔

"تو بس میں انوائیٹ کر رہا ہوں۔ میں اکثر ایسی پارٹیز دیتا رہتا ہوں تمہیں بہت مزہ آئے گا وہاں آ کر۔"

سعید نواز نے انتہائی درجے کی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ شیراز کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے دیتا۔

"تمہارے انکل بہت اچھے ہیں۔" وہاں سے واپسی پر شیراز نے راستہ میں جواد سے کہا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

"ہاں خیر! اچھے تو وہ ہیں ہی۔ I wish تم شینا سے مل پاتے۔ انکل واقعی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ تم دونوں ایک دوسرے کی کمپنی کو بہت انجوائے کرتے۔"

جواد نے ایک بار پھر شینا کا ذکر کیا۔ وہ اس کا کزن نہ ہوتا تو شیراز یقیناً اس بار اس سے شینا کے بارے میں کھل کر پوچھتا لیکن شیراز اس بار بھی دانستہ چپ رہا۔

☆☆☆

"کھاؤ بیٹا! کھانا کھاؤ... ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟"

نسیم نے بے حد پریشان ہو کر اس سے کہا۔ شیراز ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پورے ایک مہینے کے بعد اس ویک اینڈ پر گھر آیا تھا۔ اور اپنے محلے میں داخل ہوتے ہی اس کا دل وہاں سے غائب ہو جانے کو چاہ رہا تھا، یہی حالت اس کی اپنے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے ہوئی تھی۔ اکیڈمی کی شاندار عمارت میں ایک ماہ رہنے کے بعد اسے وہ گھر یک دم ایک ڈربہ لگنے لگا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا، وہ اسی وقت وہاں سے بھاگ جائے۔

"نہیں... بس اتنی ہی بھوک تھی مجھے۔" شیراز نے کہا۔ وہ خاص طور پر اس کے لیے بنایا ہوا کھانا بھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔

"بھائی! کباب تو لیں نا، یہ میں نے صرف آپ کے لیے بنائے ہیں۔"

نزہت نے جیسے قربان ہونے والے انداز میں کہا۔

وہ یہ نہ بھی کہتی تب بھی شیراز جانتا تھا کہ کباب صرف خاص حالت میں ہی گھر کے مینو کا حصہ بنتے تھے۔ عام حالات میں کھانے پر کبابوں کے بارے میں سوچنے کا مطلب مہینے کے پورے بجٹ کو خراب کرنے کے مترادف تھا۔

"جاؤ شبانہ! بھائی کے لیے پھل کاٹ کر لاؤ۔" نسیم نے دوسری بیٹی سے کہا۔ جو فوراً کمرے سے باہر چلی گئی۔ پورا گھر جیسے شیراز کو کھانا کھلانے کے لیے اس کے اردگرد بیٹھا تھا اور شیراز کو بے حد الجھن ہو رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اکیڈمی نے ماں باپ یا بہنوں سے اس کی محبت میں کمی کر دی تھی۔ ان سے اس کی محبت ویسے ہی تھی مگر ان کے وہ طور طریقے جن پر کل تک وہ غور تک نہیں کرتا تھا آج اسے بری طرح چبھنے لگے تھے۔

"نہیں بس ٹھیک ہے۔" اس نے ٹیبل پیچھے کر دی۔

"بھائی کے لیے چائے بنا لاؤ۔" نسیم نے برتن اٹھاتی نزہت سے کہا۔

"نہیں۔ جب مجھے چائے کی ضرورت ہوگی تو میں خود کہہ دوں گا۔" شیراز نے منع کیا۔

"اب زینب کے گھر سے ہو آؤ... روز پوچھنے آتی ہے تمہارا۔"

نسیم نے اس سے کہا۔ شیراز کا موڈ کچھ اور آف ہو گیا۔ اب وہ اس وقت زینب سے ملنے کا خواہش مند نہیں تھا۔

"صبح جاتے ہوئے مل لوں گا۔" شیراز نے کہا۔

"مگر۔" وہ جھنجلایا۔ اس سے پہلے کہ نسیم اصرار کرتی، اکبر نے مداخلت کی۔

''تم کیوں مجبور کر رہی ہو اسے۔ چلا جائے گا ان کے گھر جب اس کا دل چاہے گا۔ ابھی تو تھکا ہوا ہو گا، آرام کرنا چاہتا ہو گا۔ سونے دو اسے۔'' اکبر کہتے ہوئے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

''کیسی ہو زینی؟'' شیراز نے بیگ پیک کرتے ہوئے مسکرا کر زینی سے کہا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی اور شیراز کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ اور آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اس کے سامنے ہوتے ہوئے اس سے بے رخی یا بے اعتنائی برتنا دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ شیراز نے اسے دیکھتے ہوئے دل میں اعتراف کیا اور شاید وہ پچھلے کچھ ہفتوں سے اس کے خلاف آنے والے خیالات کی وجہ سے اس سے کچھ نادم بھی ہوا۔

''آپ کب آئے؟ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔'' وہ بے حد پرجوش انداز میں کہہ رہی تھی۔

''میں کل شام کو آیا تھا، اب جا رہا ہوں۔''

''کل شام کو؟ مجھے پتا ہوتا تو میں اسی وقت ملنے آتی۔''

''ہاں، بس میں بھی کچھ مصروف ہو گیا تھا ورنہ میں بھی ملنے آتا۔''

شیراز نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زینی سے کیا باتیں کرے، چند ہفتوں میں اس کے بدلتے خیالات نے اس کے اور زینی کے بیچ ایک عجیب سی دیوار کھڑی کر دی تھی جسے شیراز محسوس کر رہا تھا مگر زینی نہیں۔

''ابھی چلے جائیں گے کیا؟'' زینی نے قدرے حیرانی سے اس کے بیگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں اکیڈمی میں بہت سے کام کرنے ہیں۔ میں بہت ساری چیزیں ادھوری چھوڑ کر آیا تھا۔'' شیراز نے اسی انداز میں کہا۔ ''مجھ سے ملے بغیر جا رہے تھے؟'' زینی نے شکوہ کیا۔

''نہیں۔ تم سے مل کر ہی جاتا، میں ابھی آنے ہی والا تھا تمہاری طرف۔'' شیراز نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔ زینی کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

شیراز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔ وہ جس طرح کی باتیں زینی کے ساتھ کر کے خوش ہوتا تھا وہ باتیں اکیڈمی کے چند ہفتوں کے بعد اسے بے حد بے کار اور بچکانہ لگنے لگی تھیں۔ آخر زینی سے چند گھنٹوں کی رومانٹک گفتگو کے علاوہ وہ اور کیا ڈسکس کر سکتا تھا۔ ملک کی اکانومی کرنٹ پولیٹیکل سچویشن، فارن پالیسی کو درپیش گلوبل چیلنجز، انتظامی اصلاحات۔ ؟ آخر کیا ڈسکس کر سکتا تھا۔ وہ ہوم اکنامکس اور اسلامیات اختیاری کے ساتھ گریجویشن کرنے والی اس سادہ اور گھریلو لڑکی سے جس کے عشق میں وہ پچھلے چار پانچ سال سے بری طرح گرفتار تھا۔

وہ ایک بار پھر اسے جانچنے پرکھنے کے عمل سے گزر رہا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر کرسی پر بیٹھی زینی کو یہ احساس ہی نہیں ہو پایا تھا کہ وہ اس کی اسکریننگ کر رہا تھا جیسے کوئی مشین کسی ممکنہ خطرے سے بچنے کے لیے کرتی ہے۔

''آپ کی اکیڈمی کیسی جا رہی ہے؟''

"بہت اچھی"

ایک بار پھر خاموشی۔

"آپ کو میرے خط ملے؟"

"ہاں" شیراز نے قدرے چونک کر کہا۔

"اور آپ نے مجھے جواب بھی نہیں دیا۔"

"میں بہت مصروف ہوتا ہوں زینی!" اس کا جواب زینی کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔

"میں جانتی ہوں۔ کیا بہت پڑھنا پڑتا ہے؟" زینی نے بے حد سادہ لہجے میں کہا۔

"ہاں بہت زیادہ۔" ایک بار پھر مختصر جواب۔

زینی کو پہلی بار شیراز کا انداز قدرے غیر معمولی لگا اس کے انداز میں وہ بے تکلفی نہیں تھی۔ جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ "شاید اس لیے ہے کیونکہ وہ بہت مصروف رہنے لگا ہے۔" زینی نے خود کو تسلی دی۔

"چچا اور خالہ کیسے ہیں؟" شیراز کو بہت دیر بعد خیال آیا۔

"وہ ٹھیک ہیں۔ آپ ان سے مل کر جائیں گے نا؟ ابو گھر پر ہی ہیں۔" زینی نے بے ساختہ کہا۔

"اب کی بار تو نہیں مگر اگلی بار ملنے آؤں گا۔" شیراز نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔

"اگلی بار کب آئیں گے؟"

"یہ تو پتہ نہیں۔ دیکھو، کب آتا ہوں۔"

"میں نے آپ کے لیے کچھ شرٹس بنائی ہیں۔ ابھی لے کر..." زینی کو یک دم یاد آیا اور وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑی ہو گئی مگر اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے نکلتی، شیراز نے اسے روکا۔

"نہیں زینی! رہنے دو... اب تم ان چیزوں پر اپنا وقت ضائع مت کیا کرو۔ اکیڈمی میں بہت اچھی ٹیلرڈ شرٹس پہنی جاتی ہیں۔ وہاں میں اس طرح کی شرٹس پہنوں گا تو لوگ مذاق اڑائیں گے۔" شیراز نے بے حد صاف گوئی سے کہا۔

زینی ٹھٹک گئی۔ "آپ یونیورسٹی میں بھی تو میری شرٹس پہنتے تھے۔ کیا وہاں کبھی کسی نے ان کا مذاق اڑایا؟"

یونیورسٹی کی بات اور تھی۔ یہ سول سروسز اکیڈمی ہے یہاں "جو مرضی نہیں پہنا جاتا۔" شیراز نے بے حد لاپروائی سے کہا۔

زینی کو اگر اس کی بات سے رنج ہوا بھی تھا تو اس نے ظاہر نہیں کیا۔

ہو سکتا ہے وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ آخر وہاں سارے افسر ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے وہاں واقعی بہت اچھا لباس پہنا جاتا ہو۔

اس نے دل ہی دل میں خود کو ایک بار پھر تسلی دی۔ لیکن اس کا دل یہ نہیں مان رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سے سلا جانے والا کپڑا ایک دم اتنا غیر

معیاری ہو گیا تھا کہ پہنا نہ جا سکے۔

واپس گھر جا کر اس نے وہ ساری شرٹس نکال کر انہیں بغور دیکھا تھا۔ اس کی سلائی اب بھی اتنی ہی بہترین تھی۔ ان شرٹس کو دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ ایک زنانہ ہاتھ سے سلائی شدہ تھیں شیراز نے ہمیشہ اس کے ہاتھ سے سلی ہوئی شرٹس کو بڑے فخر سے پہنا تھا پھر اب کیا ہو گیا تھا۔ زینب ضیا تب بھی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی کہ تبدیلی شیراز کے لباس کے انتخاب میں نہیں آئی تھی اس کی سوچ کے انداز میں آ گئی تھی۔ فرق اس کی سلائی میں نہیں آیا تھا شیراز کے اندر آ گیا تھا۔

اگلے کئی دن وہ مسترد شدہ ان شرٹس کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوتی رہی۔ زندگی میں پہلی بار زینب ضیا کے ہاتھ کی سلی ہوئی کوئی چیز پہننے سے کسی نے انکار کیا تھا۔ کسی نے پہلی بار اس کی کسی شے میں خامی جتائی تھی۔ زینب ضیا کیوں پریشان نہ ہوتی۔

☆☆☆

سعید نواز کے گھر پر یہ شیراز کی پہلی اور آخری آمد نہیں تھی۔ سعید نواز کے ہاں اس کا کافی آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ سعید نواز اسے اپنے ہاں ہونے والی ہر دعوت میں انوائیٹ کرتے تھے اور ہر دعوت میں اسے خاص اہمیت دیتے ہوئے سب لوگوں سے متعارف کرواتے تھے۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ ان تمام مواقع پر ایک بار بھی شینا سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ ہر بار کہیں اور مصروف ہوتی مگر صرف سعید نواز ہی نہیں اس کی فیملی کے دوسرے افراد بھی شینا کا اکثر ذکر کرتے نظر آتے۔ وہ سعید نواز کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کا ذکر نہ ہوتا۔ روز بہ روز شیراز کی شینا میں دلچسپی اور تجسس بڑھنے لگا تھا۔

اور پھر بالآخر یہ تجسس ختم ہو ہی گیا۔ سعید نواز نے تقریباً ڈیڑھ دو ماہ کے میل جول کے بعد اس دن اپنے گھر پر پہلی بار شینا سے اس کی ملاقات کروائی اور شیراز پہلی ہی نظر میں شینا پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔

جینز اور بے حد مختصر ٹاپ میں ملبوس وہ جس وقت لاؤنج میں داخل ہوئی اس وقت وہ سعید نواز کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ شینا کو دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ سعید نواز نے دونوں کا تعارف کروایا۔ شینا نے اسے اوپر سے نیچے تک بے حد سنجیدگی سے دیکھا پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے شیراز کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک لمحہ کے لیے شیراز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے اس سے پہلے بھی زندگی میں کسی لڑکی سے مصافحہ نہیں کیا تھا۔ اور وہ بھی اس کے باپ کے سامنے مگر سعید نواز بے حد نارمل انداز میں مسکراتے ہوئے دونوں کو دیکھتے رہے۔ شیراز نے قدرے جھجک کر ہاتھ بڑھایا جسے شینا نے بے حد سرسری انداز میں تھام کر چھوڑ دیا۔

"تم دونوں بیٹھو، باتیں کرو۔ میں ایک فون کال کر کے آتا ہوں۔" سعید نواز ان دونوں کو وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔

شینا بڑے اعتماد کے ساتھ اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھتے ہوئے اس نے شیراز کو ایک بار پھر بے حد دلچسپی سے دیکھا جو شینا کی موجودگی سے یک دم ہی بے حد کانشس ہو گیا تھا۔

شینا نے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا اور وہ جیسے اس سے بے حد محظوظ ہوئی تھی۔ اپنے تراشیدہ بالوں کو گردن کے جھٹکے سے پیچھے کرتے

ہوئے اس نے سامنے پڑی ٹرالی میں سے ایک بسکٹ اٹھایا اور بڑی نزاکت کے ساتھ اس کو کترنے لگی۔ شیراز نے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے بے حد محتاط انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟''

''پروفیشن؟'' وہ بسکٹ کھاتے کھاتے اس کے سوال پر رکی۔

''جی!''

''Nothing, I don't need to.'' (کچھ نہیں۔ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں) ٹکڑا توڑ جواب آیا۔ شیراز کھسیانے انداز میں مسکرایا۔

''وہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ کو ضرورت نہیں ہے۔''

''اور آپ کی ہابیز کیا ہیں؟'' اس نے کچھ دیر کے بعد اگلا سوال کیا اور پہلے سے زیادہ پچھتایا۔

''I flirt.'' شینا نے بے حد اطمینان کے ساتھ بسکٹ منہ میں ڈالا پھر ٹرالی پر ایک اور نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ شیراز کو بے اختیار چائے پیتے ہوئے اچھو لگا۔ شینا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''چائے کچھ زیادہ گرم تھی۔'' شیراز نے جیسے وضاحت دی پھر خود ہی ہنسا۔

''آپ کا Sense of humour (حسِ مزاح) بہت اچھا ہے۔'' اسے لگا شینا نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا۔

اس کی ہنسی سے شینا کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ''آپ دنیا کے پہلے آدمی ہیں جسے میرا سینس آف ہیومر (حسِ مزاح) نظر آیا ہے اور غلط بات میں نظر آیا ہے۔ میں سیریس ہوں مجھے مردوں سے فلرٹ کرنے میں مزا آتا ہے۔ اس سے زیادہ مزے کی ہابی کیا ہو سکتی ہے۔''

شیراز اس بار بمشکل ہنسا۔ پھر اسے احساس ہوا وہ اپنے محلے کی کسی لڑکی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ بورژوا کلاس کی نمائندگی کرتی ایک لڑکی سے بات کر رہا تھا۔ جو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئی تھی۔

''اور کیا ہابیز ہیں آپ کی؟''

''Shopping, Changing out with friends.''

''گڈ۔'' اس نے بے ساختہ اسے سراہا۔

''So tell me about yourself, your life, your hobbies.

(اپنے بارے میں کچھ بتایئے)

اس کے جواب پر شینا نے اسے بے حد غور سے دیکھا پھر پوچھا۔

''آ... میں، میں...'' شیراز نے اس کے سوال پر لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے اٹکا۔ ''میں سی ایس ایس کے امتحان میں دوسری

پوزیشن لینے کے بعد اس وقت سول سروسز اکیڈمی میں ٹریننگ لے رہا ہوں۔ میرا ڈپارٹمنٹ۔۔۔"

شیراز نے کسی رٹو طوطے کی طرح چند جملے دہرانے شروع کیے اور اس سے پہلے کہ وہ پورا مضمون سناتا شینا نے ٹوک دیا۔

"You know what---

I am sick and tired of hearing about this bloody academy

بے حد سرد اور کاٹ دار انداز میں کہے گئے اس کے جملے نے شیراز کی رنگت فق کر دی تھی۔

"It stinks It realy stinks--"

اس شہر میں اتنے آوارہ کتے نہیں ہوں گے جتنے ہمارے خاندان میں بیوروکریٹس ہیں۔ بچپن سے اب تک بہت سن لیا ہے اس اکیڈمی کے بارے میں، اس لیے آپ اپنے بارے میں اپنی لائف اور ہابیز کے بارے میں بات کریں۔"

اس نے اس بار بے حد کلیئر کٹ انداز میں کہا تھا۔ اور جیسے شیراز کے کندھوں کے نیچے سے بیساکھیاں نکال دی تھیں۔ وہ اس وقت بے یار و مددگار انداز میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کہ اس کی کیا ہابیز تھیں اور جو کچھ وہ زندگی کے مختلف اوقات میں کرتا رہا تھا یا کر سکتا تھا، کیا اسے ہابیز کہا جا سکتا تھا۔ پتنگ بازی کرنا، کنچے کھیلنا، گلی ڈنڈا سے لطف اندوز ہونا۔ برسات کے پانی سے مینڈک پکڑنا اور ان کے پیروں میں دھاگہ باندھ کر ان کی ریس کروانا، محلے کی بیری سے پتھر مار مار کر بیر توڑ کر کھانا اور بڑے ہو کر صرف ٹیوشن پڑھانا تاکہ وہ باپ کے ساتھ گھر کا بوجھ اٹھا سکے یا پھر وہ سیدھا سیدھا اس سے یہ کہہ دے کہ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتا تھا وہاں ہابیز نہیں ہوتیں، صرف ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔

"میں میوزک سنتا ہوں اور کتابیں پڑھتا ہوں۔" اس نے بالآخر ایک طویل سوچ بچار کے بعد دو عدد بے حد مہذب، مفید اور بے ضرر ہابیز ڈھونڈ کر پیش کیں۔ جن کا ثبوت وہ دے سکتا تھا۔

"کیا سنتے ہیں؟ ہارڈ، راک، ہیٹل، جاز؟"

"شینا نے ایک ہی لہجے میں اس کی پہلی ہابی کا تیا پانچہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہونق نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"میں کتابیں زیادہ پڑھتا ہوں۔" شیراز نے ... حواس باختہ ہو کر خود کو اور صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"کیا پڑھتے ہیں؟" شینا کا لہجہ اس بار ... ہمدردانہ تھا۔

"لٹریچر۔" شیراز نے محفوظ ترین آپشن کا انتخاب کیا۔

"اوہ پھر تو نیوزی لینڈ کے شارٹ اسٹوری رائٹرز کو آپ نے ضرور پڑھا ہوگا۔"

شینا نے پہلی بار اس کے کسی جواب میں دلچسپی دکھائی اور شیراز کے جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ آخر نیوزی لینڈ کے شارٹ اسٹوری رائٹرز اتنی اہمیت کب سے اختیار کر گئے تھے کہ ان کے بارے میں بات کی جائے انگلش لٹریچر میں وہ برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ کسی تیسرے ملک کے کسی ادیب کو جانتا ہی نہیں تھا۔

شینا کو بالآخر اس پر جیسے ترس آ گیا تھا۔ "او کے، نائس میٹنگ یو۔" وہ بڑے آرام سے کہتے ہوئے اٹھی اور تیز قدموں سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ شیراز نے ٹیبل پر پڑے ٹشو کے ڈبے سے ٹشو نکال کر اپنے ماتھے کا پسینہ خشک کیا۔

وہ زندگی میں صرف ماں بہنوں اور زینی ہی سے واقف تھا جو سب اس کے قدموں میں بچھتی اور اس پر قربان ہوتی رہتی تھیں۔ جن میں سے کوئی اس کی مرضی کے خلاف اس سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ کسی عورت کے ہاتھوں ذلیل ہونے کا یہ اس کی زندگی کا پہلا اتفاق تھا۔

مگر شینا اس خفت آمیز ملاقات کے باوجود اسے بے حد اچھی لگی تھی۔ وہ ویسی ہی عورت تھی جیسی عورت وہ اپنی لائف پارٹنر کے طور پر چاہتا تھا۔ ماڈرن، اسٹائلش، اعلیٰ تعلیم یافتہ، خود مختار، خود اعتماد اور دولت مند۔

اس رات وہ شینا اور صرف شینا کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

☆☆☆

"شیراز بھائی سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا آج کل تمہارا؟" اس دن ربیعہ نے زینب سے پوچھا۔

"نہیں، رابطہ کس طرح ہوگا؟ ہوتا تو میں تمہیں بتاتی۔" زینی نے قدرے اداسی سے کہا۔

"شیراز بھائی تو اکیڈمی نہیں گئے، یوں لگتا ہے جیسے ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔"

ربیعہ نے مذاق میں کہا۔ زینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ دوپٹے پر کڑھائی کرتی رہی۔

"اور بہت دن ہو گئے، تم نے شیراز بھائی کے لیے کوئی نئی شرٹ بھی نہیں سی۔" ربیعہ کو یک دم کچھ اور یاد آیا۔

"وہ اب گھر میں سلی ہوئی شرٹس نہیں پہنتے۔" زینی کو شیراز کی بات یاد آ گئی۔

"کیوں؟" ربیعہ نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"پتہ نہیں۔ شاید وہاں اکیڈمی میں کوئی بھی ایسے کپڑے نہیں پہنتا اس لیے۔" زینی نے کہا۔

"عجیب بات ہے، اکیڈمی میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوتی ہے کیا؟ یونیورسٹی میں تو بڑے شوق سے پہن کر جاتے تھے۔ اب اکیڈمی میں کیا ہو گیا۔ اب تو ہم سے ملنے بھی نہیں آتے ورنہ میں پوچھتی ان سے۔" ربیعہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

زینی نے اس بار پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کڑھائی میں محو تھی یا کم از کم یہی ظاہر کر رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ ان دونوں میں اس موضوع پر کوئی اور بات ہوتی دروازے پر دستک دے کر محلے کی ایک عورت اندر داخل ہوئی۔

"السلام علیکم خالہ!" ربیعہ اور زینی نے انہیں دیکھتے ہی کہا اور صحن کی چارپائی سے چیزیں سمیٹنے لگیں۔

"وعلیکم السلام جیتی رہو۔ کہاں ہے تمہاری اماں؟"

"اندر کمرے میں ہیں، میں انہیں بلاتی ہوں۔" زینی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ خالہ چارپائی پر پڑا دوپٹہ اٹھا کر دیکھنے لگی جس پر زینی کڑھائی کر رہی تھی۔

"بہت خوبصورت کڑھائی کی ہے ماشاء اللہ۔ اپنی زینی کے ہاتھ میں بہت نفاست ہے۔" خالہ نے تعریف کی۔

"جی خالہ! آپ بیٹھیں نا، کھڑی کیوں ہیں؟" ربیعہ نے ان کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ خالہ چارپائی پر بیٹھتیں نفیسہ اور زینی اندر کمرے سے باہر نکل آئیں۔

"کیا حال ہے ذکیہ؟" نفیسہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

"میں ٹھیک ہوں، تم نے زینی کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں اور مجھے خبر بھی نہیں کی۔" خالہ نے قدرے شکایتی انداز میں کہا۔

"ارے نہیں ذکیہ، ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی شادی کہاں۔ بس ویسے ہی تھوڑی بہت کڑھائی وغیرہ کا کام کر رہی ہے زینی اپنے کپڑوں اور دوپٹوں پر۔ تیاری تو تب شروع کریں گے جب تاریخ طے ہوگی۔"

"ابھی تاریخ طے نہیں ہوئی کیا؟"

"نہیں۔ مگر نسیم نے کہا ہے کہ چھ ماہ تک شادی کرنا ہے انہیں۔"

"پھر تو زیادہ وقت نہیں ہے۔ اللہ زینب کی قسمت اچھی کرے بلکہ میں تو کہتی ہوں۔ ہر لڑکی کی قسمت زینب جیسی کرے۔" خالہ نے بے حد دعائیہ انداز میں کہا۔

"میں نے تو اپنی پوتی کا نام بھی زینب ہی رکھا ہے۔" خالہ نے بتایا۔

"اچھا۔ نام رکھ دیا تم نے اصغر کی بیٹی کا؟" نفیسہ نے دلچسپی لی۔

"ہاں۔ آج ہی رکھا ہے۔ یہی بتانے تو آئی ہوں کہ میں نے زینب کے نام پر اس کا نام رکھا ہے کہ اللہ اس کا مقدر بھی زینی کی طرح کھول دے۔"

"بس ذکیہ! تم دعا کیا کرو۔ زینی اور ربیعہ کی طرف سے ماشاء اللہ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اللہ نعیم کو کچھ عقل دے دے تو سب ٹھیک ہو جائے۔ مجھے تو یقین مانو، زہرہ کے علاوہ اور کسی کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔" نفیسہ نے ذکیہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

زینی سامان سمیٹتے ہوئے اندر چلی گئی۔

"فکر مت کرو۔ ہو جائے گا وہ بھی ٹھیک۔ آخر کب تک اس طرح کی حرکتیں کرے گا۔ اچھا میں چلتی ہوں۔"

"ارے خالہ! میں تو چائے بنانے جا رہی ہوں آپ کے لیے۔" ربیعہ نے فوراً کہا۔

"اچھا۔ چلو پھر ٹھیک ہے، چائے پی کر ہی جاؤں گی۔" خالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور زینی کے شادی کے کپڑوں وغیرہ پر کڑھائی کے سلسلے میں اگر مدد کی ضرورت پڑے تو بتانا مجھے۔" خالہ نے نفیسہ کو پیشکش کی۔

"ہاں ہاں ذکیہ! کیوں نہیں۔ ایک بار تاریخ طے ہو جائے تو پھر بتاؤں گی میں تمہیں۔" نفیسہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''سعید انکل کو تو بہت امپریس کر دیا ہے تم نے۔'' جواد نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' شیراز نے چونک کر اس کو دیکھا۔ وہ کچھ کتابیں پڑھنے کے لیے باہر نکلے تھے۔

''ہونا کیا ہے۔ کل رات فیملی ڈنر پر تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔ سب کو بتا رہے تھے تمہارے بارے میں۔''

شیراز کے دل کی دھڑکن بے اختیار کچھ تیز ہوئی۔ ایک اتنے اعلا عہدے پر فائز آدمی کا اس سے متاثر ہونا۔

''میں تو خود ان سے بہت امپریسڈ ہوں۔'' شیراز نے بے ساختہ کہا۔

''یہ بتایا تم نے انہیں؟'' جواد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''انہیں بتایا تو نہیں۔''

''ارے یار بتانا چاہیے تھا..... ویسے مجھے پتا ہے کیا لگتا ہے؟'' جواد نے یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' شیراز اس کے سوال پر حیران ہوا۔

''مجھے لگتا ہے وہ ھینا کے لیے تمہیں کنسیڈر کر رہے ہیں۔''

شیراز کے دل کی دھڑکن ایک لمحہ کے لیے جیسے رک گئی تھیں۔

''کیا؟'' اس نے بمشکل حلق کو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ تم میرڈ یا انگیجڈ تو نہیں ہو؟'' جواد نے بے حد معنی خیز انداز میں کہا۔

''پھر؟'' شیراز کا دل ایک لمحہ کے لیے ڈوبا۔ وہ اس لمحہ پر پچھتایا جب اس نے زینی کی فوٹو گراف اپنی اسٹڈی ٹیبل پر رکھی تھی۔

''میں نے تو یہی کہا ہے کہ شاید تم انگیجڈ نہیں ہو۔'' جواد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ شیراز کا دل چاہا، وہ اسے گلے لگا لے۔ وہ واقعی دوست تھا۔

''اور بھی بہت کچھ پوچھ رہے تھے تمہارے بارے میں۔ مجھے لگتا ہے جلد ہی اس سلسلے میں تم سے کچھ بات کریں گے..... ویسے اگر وہ ایسی کوئی بات تم سے کریں تو تمہارا رسپانس کیا ہوگا۔ میرا مطلب ہے، ان کو تو میں نے نہیں بتایا مگر بہرحال تم انگیجڈ تو ہو ہی۔'' جواد نے بے حد نپے تلے انداز میں اس سے کہا۔

''میں.....'' شیراز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ''میں'' کے بعد کیا کہے۔

اس کا دل چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ کاش وہ اس سے ایسی بات کریں تو وہ فوراً سے پیشتر اس پروپوزل کو قبول کر لے۔ اس کی خاموشی سے جواد نے کوئی اور مفہوم نکالا تھا۔

''دیکھو شیراز! زندگی میں سیلف میڈ ہونے کی بھی کچھ Limits (حدود) ہوتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی اسٹیپ پر کسی نہ کسی کے کندھے کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔ خاص طور پر سول سروس میں.....'' اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''جانتا ہوں۔''

''جانتے ہو تو پھر تم کیا کر رہے ہو آگے بڑھنے کے لیے؟''

''میں ''شیراز اٹکا۔ ''میں محنت کر رہا ہوں یہاں اکیڈمی سے بھی ڈسٹنکشن کے ساتھ پاس آؤٹ ہوں گا۔''

جواد اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑا۔ ''بس تم ساری عمر یہ ڈسٹنکشن کے چکر میں ہی پڑے رہنا۔ اوہ یار! کچھ اور بھی ہاتھ پاؤں مار۔ یہ بھانت بھانت کی لڑکیاں ہمارے کامن میں ہیں۔ ان میں سے کسی پر ہاتھ صاف کر کسی اسٹرونگ بیک گراؤنڈ والی پر۔ اپنے خاندان کا انتخاب انسان خود نہیں کر سکتا۔ وہ قسمت کرتی ہے۔ مگر بیوی اور بیوی کے خاندان کا انتخاب انسان خود کر سکتا ہے۔''

''مطلب؟''

شیراز نے سوال کیا مگر جواد اور وہ خود دونوں جانتے تھے کہ وہ سوال نہیں تھا۔

''مطلب یہ کہ شادی کسی بہت اونچی جگہ پر کرو۔ اگر اپنے خاندان کی سپورٹ نہیں ہے تو پھر بیوی کا خاندان تگڑا ہونا چاہیے۔ اس اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہونے والا کوئی الو کا پٹھا ہی ہوگا جو کسی غریب گھرانے میں شادی کرے۔ ایک منگنی کی حیثیت ہی کیا ہے یار End it'' (ختم کرو اسے) جواد نے جیسے اس کی مشکل حل کر دی تھی۔ شیراز بے اختیار مسکرایا۔ وہ جان گیا تھا جواد اسے کوئی مشورہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس تک کوئی پیغام پہنچا رہا تھا۔ وہ اس سال پاکستان کا دوسرا سب سے ذہین ترین آدمی تھا۔ وہ اتنا احمق نہیں تھا کہ ایسے پیغام کو نہ سمجھ پاتا۔

''End it'' یہ حل تھا۔ ''لیکن کیسے؟'' یہ شیراز کو سوچنا تھا۔

☆☆☆

شینا کے ساتھ وہ ملاقات اس کی پہلی اور آخری ملاقات نہیں تھی۔ اس کے بعد بھی اکثر اس کا شینا سے آمنا سامنا ہوتا رہا مگر اس ملاقات کی طرح انہیں آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ رسمی سی ہیلو ہائے ہوتی پھر شینا دوسرے لوگوں کے ساتھ مصروف ہو جاتی اور شیراز کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔

وہ جان محفل تھی اور جہاں وہ ہوتی وہاں پر صرف وہ ہی وہ نظر آتی تھی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ شیراز زیادہ سے زیادہ اس کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ زینی کب بیک گراؤنڈ میں چلی گئی تھی۔ زینی کے خط اب بھی آتے رہتے تھے اور وہ انہیں کھولنے تک کی زحمت نہیں کرتا تھا۔

ان خطوں میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جسے جاننے میں شیراز کو دلچسپی ہوتی۔ زینی کے جذبات اور اظہار محبت میں بھی اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ لفظ بہت عرصہ پہلے ہی اس کے لیے جذباتی مفہوم یا حیثیت کھو گئے تھے جن کی وجہ سے وہ ان خطوط کو پڑھتا تھا۔

سعید نواز نے اس پر نوازشات اور تحائف کی بھرمار کر دی تھی۔ وہ سعید نواز کی بیوی سے نہیں ملا تھا جس سے اس کی علیحدگی ہو چکی تھی۔ مگر وہ اب تک یہ ضرور جان چکا تھا کہ وہ بھی کسی بہت بڑے سرکاری آفیسر کی دوسری بیوی تھیں اور شینا کے علاوہ ان کی بھی کوئی اولاد نہیں تھی۔

شیراز کو اگر جواد اشارے کنائے میں نہ بھی بتاتا تو تب بھی وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ان عنایات کی کیا وجہ ہو سکتی تھی اور ایسا اگر ہو جاتا تو یہ شیراز کے لیے جیک پاٹ کے مترادف تھا سعید نواز کا داماد ہونا کیا معنی رکھتا تھا۔ شیراز اکیڈمی آنے کے چند ماہ کے اندر ہی جان گیا تھا۔ وہ اب برانڈڈ اشیا استعمال کرتا تھا جو سعید نواز وقتاً فوقتاً اسے مختلف مواقع پر بھجوایا کرتے تھے برانڈڈ شرٹس، ٹراؤزرز، جوتے، پرفیوم، اور دوسری Accessories شیراز اکبر کی وارڈ روب اور رکھ رکھاؤ سے اب یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ اس کی کلاس کیا تھی۔

واحد خدشہ جو شیراز کو وقتاً فوقتاً محسوس ہوتا، وہ اس کی منگنی کا انکشاف تھا۔ اگر سعید نواز کو یہ پتا چل گیا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے تو پھر کیا ہوگا اور اس ''پھر'' کے بعد شیراز کے لیے جیسے ایک تاریک غار آ جاتا تھا۔

بعض دفعہ وہ خود کو تسلی دیتا کہ ہو سکتا ہے جواد نے سعید نواز کو اس کی منگنی کے بارے میں بتا ہی دیا ہو۔ آخر وہ سعید نواز کا بھتیجا تھا۔ اتنی اہم بات سعید نواز سے کیوں چھپاتا۔ مگر پھر اسے خیال آتا کہ جواد نے اسے بتایا تھا کہ اس نے سعید نواز کو یہ بات نہیں بتائی۔ آخر ایک منگنی کی حیثیت ہی کیا تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس منگنی سے جان کیسے چھڑائے۔ کسی وجہ کے بغیر منگنی توڑنا خاندان بھر میں اسے اور اس کے والدین کو خفت اور رسوائی کا نشانہ بناتا۔ شیراز کو تو خیر اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کی ملامت کی کیا ہوتی مگر مسئلہ اس کے والدین کا تھا۔ آخر وہ انہیں کس طرح اس منگنی کو ختم کرنے پر تیار یا آمادہ کرتا۔

☆☆☆

''میں کسی دن تمہارے گھر آنا چاہتا ہوں۔''

اس دن سعید نواز نے بالآخر وہ بات شیراز سے کہہ ہی دی تھی جسے سننے کے لیے شیراز اتنی بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں، میں تمہارے گھر آ کر تمہارے پیرنٹس سے ملوں پھر وہ میرے گھر آ کر شینا سے ملیں اور بات کچھ آگے بڑھے۔''

انہوں نے یہ بات اتنی اچانک کہی تھی کہ توقع کرنے کے باوجود شیراز فوری طور پر بوکھلا گیا۔

''تمہیں تو اندازہ ہوگا ہی کہ شینا تمہیں کتنا پسند کرتی ہے'' شیراز نے چونک کر سعید نواز کو دیکھا۔

اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شینا اسے پسند کرتی ہے۔ آخر اسے یہ اندازہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ شینا نے کبھی اپنے کسی انداز سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا مگر اب سعید نواز کی بات پر وہ جیسے خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

''میری ایک ہی بیٹی ہے شیراز اور میرا جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ تمہیں تو اندازہ ہوگا ہی کہ اس کے لیے کیسے رشتے آ رہے ہوں گے۔ لیکن میں اپنی بیٹی کی شادی صرف اس کے ساتھ کروں گا جو مجھے اور اسے دونوں کو پسند ہو اور تم بہت شریف انسان ہو۔ پیسے کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ وہ میں اپنی بیٹی کو بہت دے سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ جسے میں اس کے لیے منتخب کروں، وہ بھی اس کا اسی طرح خیال رکھے جس طرح میں رکھتا ہوں اور تم ایک بہت اچھے انسان ہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ شینا تمہارے ساتھ بہت خوش رہے گی۔''

شیراز کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم لمحہ تھا ایسا لمحہ جو اس کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے بدل دینے والا تھا۔

"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

سعید نواز نے بات ختم کرتے ہوئے یوں سرسری انداز میں اس سے پوچھا جیسے انہیں کسی اعتراض کی قطعاً توقع نہ ہو مگر وہ پھر بھی سرسری طور پر پوچھ رہے ہوں۔

"میں بہت خوش قسمت ہوں سر! کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔" شیراز نے بمشکل اپنے حواس بحال کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے والدین یا تمہاری کہیں اور پسندیدگی یا کوئی منگنی وغیرہ ؟" سعید نواز نے اسی سرسری انداز میں پوچھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑا اور نیا سگار سلگانے لگے۔ انہوں نے شیراز سے توجہ ہٹا کر جیسے اسے جھوٹ بولنے کے لیے موقع فراہم کیا۔

"No, no, no, sir. ایسی کوئی بات نہیں ہے" شیراز نے بے ساختہ کہا۔

"That's good" سعید نواز نے مسکراتے ہوئے شیراز کو دیکھا۔ "اوکے پھر تم اپنے پیرنٹس سے بات کرو۔ میں چاہتا ہوں بات آگے بڑھے۔"

سعید نواز نے اس کے لیے سب سے مشکل مرحلہ طے کرنے کا اشارہ دیا۔

☆☆☆

اکبر اور نسیم بے حد ہکا بکا انداز میں شیراز کا منہ دیکھ رہے تھے۔ وہ سعید نواز سے بات ہونے کے اگلے ہی ویک اینڈ پر گھر آیا تھا اور بلا تکلف اور توقف اس نے اکبر اور نسیم سے زینب کے ساتھ اپنی منگنی کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

"مگر بیٹا! یہ رشتہ تو تمہاری پسند اور اصرار پر ہوا تھا۔" نسیم نے جیسے اسے یاد دلایا۔ وہ بے حد پریشان ہو گئی تھیں۔

"بے وقوفی اور حماقت تھی وہ میری آپ لوگوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش تک نہیں کی۔" شیراز نے بے حد جھلا کر کہا۔

"آخر آپ خود بتائیں۔ میرا اور زینی کا کوئی جوڑ بنتا ہے؟ کس لحاظ سے وہ میرے ہم پلہ ہے؟" شیراز نے اپنی معمولی شکل وصورت کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے میٹرک پاس باپ کی وجہ سے مسئلوں کا سامنا کرتا رہا۔ اب کلرک سسر کی وجہ سے نئی مصیبتوں میں اضافہ کر لوں۔"

اکبر کا چہرہ اس کے جملے پر سرخ ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں یہ خفت کا احساس تھا یا ہتک کا۔

"لیکن بیٹا! اتنے سال پرانی منگنی توڑنا آسان بات نہیں۔ خاندان والے کیا کہیں گے۔" نسیم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جہنم میں جائیں خاندان والے۔ ان دو ٹکے کے لوگوں کو میں اہمیت نہیں دیتا۔" شیراز نے خودسری سے کہا۔

"لیکن آخر کیا وجہ بتائیں ہم؟ صرف یہ کہ تمہیں اب ضیا کی حیثیت پر اعتراض ہونے لگا ہے۔" اکبر نے اس بار قدرے تلخی سے کہا۔ "اور پھر منگنی توڑ بھی دیں تب بھی کون سے لینڈ لارڈ کی بیٹی بہو بن کر آئے گی۔ یہاں اپنے ہی جیسے لوگوں کے ہاں رشتہ ہوگا تمہارا۔" نسیم نے جیسے اسے یاد دہانی کروائی۔

"ضروری نہیں ہے کہ اپنے ہی جیسے لوگوں میں ہو۔ ایک بہت بڑا سرکاری افسر اکلوتی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنا چاہتا ہے۔" شیراز نے بے

حد فخریہ انداز میں اطلاع دی۔

"سرکاری افسر؟" اکبر نے قدرے حیرانی سے کہا۔

"ہاں انکم ٹیکس کمشنر۔ وہ یہاں آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں اسی مقصد کے لیے۔ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔"

شیراز انہیں سعید نواز اور شینا کے بارے میں بتا رہا تھا اور اکبر اور نسیم بے حد خاموشی سے قدرے بوکھلائے ہوئے انداز میں اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"وہ اگلے ہفتے یہاں آئیں گے اور آپ ان سے میری منگنی کے بارے میں کوئی بات مت کیجئے گا۔"

وہ حتمی انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا تھا اور اکبر اور نسیم بے حد پریشانی کے عالم میں وہیں بیٹھے رہے۔ کسی وجہ کے بغیر اس طرح اچانک منگنی توڑنے کے لیے انہیں خاصی جرأت اور ہمت کی ضرورت تھی جو وہ دونوں میاں بیوی اس وقت اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔

شیراز اس رات وہاں رکا نہیں تھا۔ وہ واپس اکیڈمی چلا گیا تھا۔ اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ زینب اگلے دن اپنے ہاتھ سے پکائی ہوئی بریانی نسیم کو دینے آئی تھی اور اس نے نسیم اور گھر کے دوسرے افراد کے انداز اور لہجے میں تبدیلی فوراً محسوس کر لی تھی۔ نسیم بے حد الجھی ہوئی لگ رہی تھیں۔ جبکہ نزہت اور شیراز کی دوسری دو بہنیں عجیب سی سرد مہری اور بے اعتنائی دکھا رہی تھیں۔

"سب خیریت تو ہے خالہ؟" زینی نے کچھ پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔" نسیم نے قدرے گڑبڑا کر کہا اور سلائی میں مصروف ہو گئیں۔

"شیراز تو ٹھیک ہیں نا؟" زینی کو فوراً شیراز کی فکر ہوئی۔

"ہاں، وہ ٹھیک ہے۔" نسیم نے اسی انداز میں اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ زینی سوچ میں پڑ گئی۔ اگر گھر میں سب کچھ خیریت تھی۔ شیراز بھی ٹھیک تھا تو پھر کیا مسئلہ تھا۔

"زینی! تم کبھی اپنے گھر پر بھی رہا کرو۔"

اس سے پہلے کہ زینی نسیم سے کوئی اور سوال کرتی۔ نزہت نے اسے بریانی کی خالی پلیٹیں واپس لا کر دیتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بے حد کٹیلا تھا۔ مگر زینی نے اس کی بات کو مذاق سمجھا اور برتن پکڑتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"یہ بھی میرا ہی گھر ہے۔ کیوں خالہ؟" اس نے نسیم کی طرف دیکھ کر کہا۔ جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ اس کی حمایت میں بولتی تھیں مگر آج انہوں نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ سلائی مشین کی سوئی میں دھاگہ ڈالنے میں مصروف رہیں یا کم از کم انہوں نے ظاہر یہی کیا تھا۔

"اپنا گھر ہی صرف اپنا ہوتا ہے۔" نزہت نے ایک بار پھر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

اس بار زینی نے قدرے چونک کر اسے دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی نسیم نے مداخلت کی۔

''نزہت! جاؤ اندر سے میرا سوٹ لے آؤ۔ کا شاہے مجھے ابھی اور زینی اتم نفیسہ کو سلام دینا۔''

یہ جیسے اسے جانے کا اشارہ تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے پکڑ پکڑ کر بٹھانے کے بجائے جانے کو کہا جارہا تھا۔ زینی چند لمحوں کے لیے کچھ سمجھ نہیں پائی۔

''جی خالہ!'' وہ قدرے الجھی ہوئی وہاں سے باہر آ گئی۔

اپنے گھر واپس آ کر وہ بہت دیر پریشان بیٹھی رہی۔ ربیعہ نے اس کی خاموشی اور پریشانی کو نوٹ کیا۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' زینی نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''کچھ نہیں تو اس طرح منہ لٹکا کر کیوں بیٹھی ہو اور آج خالہ کے گھر سے اتنی جلدی کیسے واپس ہو گئیں؟'' زینی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے ربیعہ سے کہا۔

''آج خالہ کے گھر میں سب کا رویہ بہت عجیب تھا۔''

''کیا مطلب؟'' ربیعہ بھی چونک کر سنجیدہ ہو گئی۔

زینی نے آہستہ آہستہ اسے ساری بات بتائی۔

''تم بھی زینی! خوامخواہ چھوٹی چھوٹی بات پر پریشان ہو جاتی ہو۔ کوئی مسئلہ ہو گا ان کے گھر میں اور ہو سکتا ہے، نزہت کے رشتے کا ہی کوئی مسئلہ ہو۔ تمہیں تو پتہ ہے، اس کی وجہ سے خالہ اور خود نزہت کتنی پریشان رہی ہے۔'' ربیعہ نے بے حد لاپروائی سے زینی کی پریشانی کو مذاق میں اڑاتے ہوئے کہا۔

''ہاں مگر تمہیں تو پتہ ہے، میں خود ہر نماز کے بعد نزہت کے لیے کتنی دعائیں کرتی ہوں۔ مجھے پتا ہے خالہ، خالو اور خود شیراز کتنا پریشان ہیں اس کی وجہ سے پھر نزہت مجھ سے کیوں اس طرح ناراض ہے۔'' زینی متفکر ہوئی۔

''ناراض نہیں پریشان ہے وہ اور چھوڑو ان باتوں کو۔ دو چار دن بعد خود ہی ٹھیک ہو جائے گی وہ۔ پھر پوچھ لینا آج کے واقعہ کے بارے میں۔'' ربیعہ نے اسے تسلی دی مگر وہ دونوں نہیں جانتی تھیں کہ یہ سوال و جواب کا موقع ہی نہیں آئے گا۔ زینی دوبارہ کبھی شیراز کے گھر نہیں جا سکے گی۔

☆☆☆

سعید نواز اگلے ہفتے آنے کے بجائے دو دن بعد ہی شیراز کو اکیڈمی سے لیتے ہوئے اس کے گھر آن موجود ہوئے تھے۔ ان کی شاندار گاڑی اس محلے میں آنے والی کسی بڑے سرکاری افسر کی پہلی گاڑی تھی۔ مگر صرف یہی نہیں تھا۔ وہ پھلوں کی پیٹیوں اور مٹھائیوں کی ٹوکریوں کے ساتھ بہت ساری دوسری چیزوں کا بھی انبار لے کر آئے تھے۔

ان کے ڈرائیور اور گارڈ نے جب اس سامان کو اکبر اور نسیم کے صحن میں لا کر رکھنا شروع کیا تو ان کا تقریباً پورا صحن مختلف اشیاء کے کریٹس،

نوکریوں اور پیکس سے بھر گیا تھا۔

شیراز کی گردن اگر فخر سے تنی ہوئی تھی تو اکبر اور نسیم کی مرعوبیت سے جھک گئی تھی۔

سعید نواز بے حد منکسری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اکبر کو ساتھ لیے صوفے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور شیراز، اکبر اور نسیم کے ہمراہ بے حد تابعداری سے سعید نواز کی باتیں سنتا رہا۔ پھر ان ہی کے ساتھ وہ قہقہے بھی لگاتے رہے۔

بالآخر ایک بہت پرتکلف چائے کے بعد سعید نواز اس موضوع پر آ گئے تھے جس کے لیے وہ وہاں آئے تھے۔

''آپ کا بیٹا شیراز بہت قابل اور لائق نوجوان ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ترقی کرے گا۔''

سعید نواز نے تمہید باندھنا شروع کی۔ شیراز کے ساتھ ساتھ اکبر اور نسیم کا دل بھی دھڑکنے لگا۔

''آج آپ سے ملاقات کے بعد تو مجھے لگ ہی نہیں رہا کہ میں کسی اور گھر بیٹھا ہوں، یوں لگ رہا ہے۔ گھر پر ہوں۔''

''بے شک، بے شک یہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔'' اکبر نے بے ساختہ کہا۔

''میرا اگر کوئی بیٹا ہوتا تو میری خواہش ہوتی کہ وہ شیراز جیسا ہوتا لیکن اللہ نے بس مجھے ایک بیٹی ہی کی نعمت سے نوازا۔ شیراز تو شینا سے ملتا رہتا ہے۔ دونوں کی بہت اچھی انڈراسٹینڈنگ ہے۔''

سعید نواز نے قدرے مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے شیراز کو دیکھا جس نے پرجوش انداز میں سر ہلاتے ہوئے ان کی تائید کی یوں جیسے واقعی ایسا ہی تھا۔

''میری خواہش ہے کہ میں شیراز کو اپنا بیٹا بنا لوں۔'' سعید نواز نے بالآخر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ''شیراز کی اپنی مرضی بھی یہی ہے اور میری بیٹی بھی شیراز کو بہت پسند کرتی ہے۔'' سعید نواز نے اکبر اور نسیم کی خاموشی پر ایک بار پھر اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے جتانے والے انداز میں کہا۔

''جی جی بھائی صاحب! ہماری تو بڑی خوش قسمتی ہوگی کہ آپ کی بیٹی ہماری بہو بنے۔'' اکبر نے بالآخر اپنی خاموشی توڑتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا۔

سعید نواز نے بے حد خوش ہو کر مزید کچھ کہنے کے بجائے اپنی جیب سے ایک لاکھ روپے کی ایک نئی گڈی نکال کر شیراز کے ہاتھ میں تھما دی۔ ان کا یہ اقدام اتنا اچانک تھا کہ شیراز، اکبر اور نسیم بری طرح بوکھلا گئے تھے۔ ان کی حواس باختگی کی وجہ نوٹوں کی وہ گڈی تھی۔ زندگی میں بلاشبہ پہلی بار وہ اتنے زیادہ نوٹ اکٹھے دیکھ رہے تھے اور اکبر اور نسیم کے لیے بہت مشکل تھا کہ وہ شیراز کے ہاتھ سے نظریں ہٹا کر سعید نواز کے چہرے پر مرکوز کر سکیں۔

''بس تو پھر یہ سمجھیں، آج سے شیراز میرا بیٹا ہے۔ میں اس بار تو کچھ لا نہیں سکا مگر اگلی بار ان شاء اللہ آپ سب کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آؤں گا۔'' انہوں نے دانستہ طور پر کسر نفسی سے کام لیا تھا اور شیراز تم اپنے گھر والوں کو ویک اینڈ پر ہماری طرف لے کر آؤ تاکہ میں شینا سے انہیں ملواؤں۔''

سعید نواز نے اگلا جملہ شیراز سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ ان کے انداز میں بلا کی بے تکلفی تھی شیراز کا ذہن مکمل طور پر ہاتھ میں پکڑی اس گڈی کی طرف تھا۔ وہ ان کی باتیں بھی ٹھیک طرح سے سن نہیں پا رہا تھا۔

''میں گاڑی اور ڈرائیور بھیج دوں گا اور تم سب کو لے کر اس ویک اینڈ پر ڈنر ہمارے ساتھ کر لینا۔''

''جی!'' شیراز نے بے حد نروس انداز میں کہا۔

سعید نواز اس کے بعد زیادہ دیر نہیں رکے۔ ان کا کام ہو چکا تھا۔ انہیں اب وہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

''کتنے ہوں گے؟'' اکبر نے بے حد بے تابی سے شیراز سے پوچھا جو گڈی کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

''ایک لاکھ۔'' شیراز نے بے حد جوش کے عالم میں کہا۔

سعید نواز کے جاتے ہی سارا گھر اسی کمرے میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہر ایک ایک لاکھ روپے کو ہاتھ لگانا چاہتا تھا۔ یہ واقعی ان کی زندگی کا ناقابل یقین لمحہ تھا۔

''کوئی صرف ''ہاں'' ہونے پر ایک لاکھ روپیہ دیتا ہے کیا؟'' نسیم کو ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''یہ بڑے لوگ ہیں امی! ایک لاکھ ان کے نزدیک ایک ہزار کے برابر ہے۔'' شیراز نے اسی انداز میں کہا۔

''پر ایک لاکھ بہت ہوتے ہیں بھائی!'' نزہت کو جیسے اب بھی یقین نہیں آیا تھا۔

''آپ لوگوں نے ان کا گھر نہیں دیکھا۔ ان کی گاڑیاں نہیں دیکھیں۔ لاکھ روپے تو سعید انکل اکثر شینا کو شاپنگ کے لیے دیتے ہیں۔ میرے سامنے کئی بار انہوں نے چیک کاٹ کر شینا کو دیا۔'' شیراز نے نزہت کو بتایا۔

''شکر ہے اللہ کا کہ اس نے میرے بیٹے کے دن پھیر دیے۔'' نسیم نے بے حد گلوگیر آواز میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''آپ خود سوچیں امی! جو لوگ صرف رشتہ طے ہونے پر ایک لاکھ دے رہے ہیں۔ وہ شادی پر کیا کیا نہیں دیں گے۔'' شیراز اب آگے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

''مجھے تو بھائی دو سوٹ لے کر دیں ان پیسوں سے اور نیا جوتا بھی۔'' اس کی چھوٹی بہن شبانہ نے یک دم مداخلت کی۔

''اور بیٹا! ان میں سے کچھ پیسے مجھے دینا۔ میں اپنے اگلے پچھلے کچھ ادھار چکاؤں گا۔'' اکبر کو یک دم خیال آیا۔

''خواہ مخواہ اس طرح پیسہ ضائع مت کرنا، ابھی ہمیں رسم کرنے شینا کے گھر بھی جانا ہے۔ ان ہی پیسوں سے اس کے لیے انگوٹھی اور دوسرا سامان لے لیں گے۔ کتنے اچھے تھے بھائی صاحب، ذرا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اتنے امیر آدمی ہیں۔'' نسیم کو سعید نواز پر رشک آیا۔

''بڑے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' اکبر نے نسیم کی بات کاٹ کر کہا۔

''اب آپ لوگ ایک دو دن میں ضیا چچا کے گھر جا کر منگنی کا سامان واپس کریں۔ لیکن ابھی کسی سے سعید نواز یا شینا کے بارے میں بات

نہ کریں۔'' شیراز نے ماں باپ کو ہدایت کی۔

''منگنی کا سامان؟ آخر تھا کیا منگنی کے سامان میں۔ایک انگوٹھی، چار جوڑے، شیراز تو اپنے جوڑے کب کے استعمال کر چکا۔بس میرے اور بچیوں کے کپڑے پڑے ہیں میں انگوٹھی کے ساتھ واپس کر آؤں گی۔''

نسیم نے اس بار بڑے تنفر سے کہا۔نزہت اپنی بہنوں کے ساتھ صحن میں پڑا سامان اب کمرے میں لا کر رکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''شیراز کہہ تو گیا ہے، مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ نفیسہ کو کس طرح جا کر انکار کروں۔آخر وجہ کیا بتاؤں؟'' دو دن کے بعد نسیم ایک بار پھر اکبر کے پاس بیٹھی پریشان ہو رہی تھی۔''آپ میرے ساتھ چلیں۔''

''نہیں، میں تو کسی صورت تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔'' اکبر نے فوراً سے پیشتر انکار کرتے ہوئے کہا۔

''زیادہ لمبی چوڑی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔بس تم ان سے جا کر کہہ دینا کہ شیراز اس رشتہ سے خوش نہیں ہے اور تم اس کے کہنے پر انکار کرنے آئی ہو۔'' اکبر نے جیسے انہیں سمجھایا۔

''پھر بھی شیراز کے انکار کی بھی تو کوئی وجہ بتانی پڑے گی۔ورنہ پورا خاندان یہاں آ کر ہم سے پوچھے گا۔آخر ہم نے بھی بیٹیاں بیاہنی ہیں۔خاندان والوں کو ناراض کر دیا تو بڑے مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔'' نسیم اب فکر مند ہو رہی تھیں۔

''ہمیں خاندان میں بیٹیاں تھوڑی بیاہنی ہیں کہ تم پریشان ہو رہی ہو۔شیراز نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم اپنی بیٹیوں کے بارے میں پریشان نہ ہو۔وہ خود ہی کچھ کرے گا۔'' اکبر کا اطمینان قابل دید تھا۔

''قسمت میرے بیٹے کا ساتھ دے رہی ہے تو میں بھی اس کا ساتھ دوں گا۔چاہے خاندان والے جو مرضی کہیں۔''

اکبر نے جیسے فیصلہ سنایا اور اس نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔قسمت واقعی شیراز کا ساتھ دے رہی تھی۔

☆☆☆

زینب اس دن کالج سے واپسی پر اپنی گلی میں داخل ہوئی تو کئی ماہ کے بعد اس نے ایک بار پھر اسی لڑکے کو دیکھا۔بے اختیار اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

اس لڑکے نے پہلے کی طرح اس بار اس پر جملے نہیں اچھالے تھے۔وہ تھوڑی دیر اس کے ساتھ چلتا رہا۔پھر اچانک اس کا رستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

زینب نے چند بار آگے جانے کی کوشش کی مگر وہ ہر بار بڑی ڈھٹائی سے اس کے سامنے آتا رہا۔خوف سے زینب کی بری حالت ہو رہی تھی۔

اس نے کوشش کی کہ وہ اس لڑکے کو ڈانٹے یا برا بھلا کہے۔مگر اس کی آواز عین وقت پر جواب دے گئی تھی۔اس کا ذہن بری طرح ماؤف ہو رہا تھا۔

اس لڑکے نے اپنی جیب سے ایک رقعہ نکالا اور زینب کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔

''اسے گھر جا کر پڑھ لیں اور پھر مجھے اس کا جواب دے دیں۔ میں کل یہیں آپ کا انتظار کروں گا۔''

زینب نے رقعہ پکڑنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا، بلکہ وہ بے اختیار چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ بھی پیچھے کر لیے۔ لڑکا چند قدم آگے بڑھ کر شاید دوبارہ اسے رقعہ پکڑانے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ ایسی کوئی حرکت کرتا، اس کے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔

زینب نے بے اختیار کسی کے آنے کی دعا کی اور پھر وہ اس دعا کے بروقت قبول ہونے پر بری طرح پچھتائی، وہ شیراز تھا جو اس گلی میں اس لڑکے کے عقب میں نمودار ہوا تھا۔ زینب کا دل بے اختیار ڈوبا۔ لڑکے نے گھبراہٹ میں وہ رقعہ زینب کے پیروں میں پھینک دیا اور تقریباً بھاگتا ہوا گلی سے نکل گیا۔

''شیراز... یہ میں... یہ لڑکا...'' زینب نے ہکلاتے ہوئے وضاحت دینے کی کوشش کی۔ اس کی پیشانی پسینہ سے تر ہو گئی تھی۔ شیراز اس کی بات سننے کے بجائے آگے بڑھا اور اس نے اس کے پیروں میں پڑا وہ رقعہ اٹھا لیا۔ پھر بے حد سرد مہری سے اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ اس نے رقعے کی تحریر پر نظر دوڑانے میں چند سیکنڈ لگائے تھے اور اس کے چہرے پر ابھرنے والی نفرت اور حقارت کو پہچاننے میں زینب نے چند سیکنڈ بھی نہیں۔

''شیراز، یہ لڑکا مجھے تنگ کرتا ہے۔''

اس نے کہنے کی کوشش کی اور شیراز نے ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی بات سننے کی زحمت نہیں کی۔ رقعہ ہاتھ میں لیے وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ زینب فق چہرے کے ساتھ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ گلی نہ ہوتی تو شاید وہ بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے جاتی۔ اس سے معافی مانگتی۔ اسے منانے کی کوشش کرتی۔ وہ ہمیشہ اس کے ناراض ہونے پر اسی طرح منت سماجت کر کے منایا کرتی تھی۔ مگر آج وہ اتنی پریشان ہو گئی تھی کہ کچھ بھی نہیں کر سکی۔

شیراز جب گلی کا موڑ مڑ چکا تھا تو زینب بے حد تیزی سے تقریباً بھاگتے ہوئے گھر کی طرف بڑھی۔ دروازہ نفیسہ نے کھولا اور زینب کی حالت دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھیں۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' زینب نے کچھ کہنے کے بجائے یک دم نفیسہ کے ساتھ لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''کیا ہوا زینی! کچھ بتاتی کیوں نہیں، کیوں ہولا رہی ہو مجھے؟''

نفیسہ کی آواز پر ربیعہ کھانا چھوڑ کر پریشانی کے عالم میں باہر نکل آئی۔

''کیا ہوا زینی...؟ کیوں رو رہی ہو؟'' وہ بھی گھبرا گئی تھی۔

''وہ لڑکا، وہ لڑکا... اس لڑکے نے آج میری طرف ایک خط پھینکا اور شیراز اچانک وہاں آ گئے۔'' زینب نے ہچکیوں میں کہا۔

''کون سا لڑکا؟ کیسا رقعہ؟'' نفیسہ بوکھلا گئیں۔

''میں خالہ کے گھر جا رہی ہوں۔ شیراز بہت ناراض ہو کر گئے ہیں۔ مجھے ان کو منانا ہے'' وہ اسی طرح روتے ہوئے اپنا بیگ فرش پر رکھ کر

دوبارہ دروازے کی طرف جانے لگی۔ ربیعہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"اس وقت تم مت جاؤ۔ ابھی امی جائیں گی۔ یا ابو کو آنے دو۔ پھر وہ جائیں۔ شیراز بھائی اگر ناراض ہوئے ہیں تو تمہیں دیکھ کر وہ اور ناراض ہو جائیں گے۔"

"مگر ربیعہ! مجھے ان کو منانا ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ اسی طرح رو رہی تھی۔

"آخر تم دونوں مجھے کچھ کیوں نہیں بتا رہیں؟" نفیسہ کی پریشانی اب عروج پر تھی۔

"پتا نہیں شیراز نے گھر جا کر خالہ سے کیا کہا ہوگا۔؟ تم اس وقت وہاں مت جاؤ۔" ربیعہ نے زینب کے رونے کے باوجود اسے باہر جانے سے روکا۔

"نہیں، وہ خالہ کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ مجھ سے جتنا مرضی ناراض ہوں مگر وہ اس طرح میری کوئی بات خالہ سے نہیں کہیں گے۔"

اس نے بہتے آنسوؤں میں اعتماد کے ساتھ کہا۔

☆☆☆

"مجھے کیا پتا، کون سا لڑکا ہے وہ؟ یہ آپ جا کر اپنی بھانجی سے پوچھیں کہ کس سے گلی میں کھڑے ہو کر رقعے وصول کرتی پھر رہی ہے وہ۔"

شیراز نے طیش میں آ کر وہ خط دور پھینکتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی گھر پہنچا تھا اور اس نے گھر آتے ہی وہ رقعہ پڑھ کر نسیم کو سنا دیا تھا۔ نسیم ہکا بکا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا شیراز۔"

"کہہ دیں، میں جھوٹا ہوں۔ اپنے پاس سے گھڑ کر سب کچھ بتا رہا ہوں۔" وہ بھڑکا۔

"نہیں نہیں میں نے یہ کب کہا ہے؟" نسیم گھبرائیں۔

"نہیں نہیں۔ کہہ دیں آپ یہ بھی، آپ کی وجہ سے ہی یہ مصیبت میرے گلے پڑی ہے۔"

"میں اسے کیا سمجھتی تھی اور یہ کیا نکلی۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ کوئی بات ہو، تب ہی لڑکے پیچھے آتے ہیں، یونہی راہ چلتے کوئی رقعہ نہیں پکڑا دیتا۔"

نسیم نے بالآخر جیسے شیراز کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہا۔

"اور رقعہ میں باقاعدہ اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ رشتہ بھیجنے کی بات لکھی ہوئی تھی۔ میرا تو خون کھول رہا ہے یہ سوچ سوچ کر کہ وہ مجھے بے وقوف بناتی رہی۔ آج میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ اور گلی میں پتا نہیں کون کون یہ سب کچھ دیکھتا ہوگا۔ لوگ کیا سوچتے ہوں گے۔ کیا باتیں کرتے ہوں گے۔ یہ محلے میں رہنے والی لڑکیاں بھی سب کچھ کرتی پھرتی ہیں۔ آپ کو اب پتا چل گیا ہوگا کہ میں کیوں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں میرے علاوہ اور کتنے لڑکوں کے ساتھ چکر چلا رہی ہوگی۔"

شیراز کے منہ میں جو آ رہا تھا، وہ بولتا جا رہا تھا۔ غصے میں تو خیر وہ تھا، لیکن اس غصے کے ساتھ ساتھ اس وقت اسے واقعی بے حد ہتک اور

تو ہین کا احساس ہو رہا تھا۔ آخر اس کی منگیتر گلی میں کھڑی کسی لڑکے سے خط لیتی پکڑی گئی تھی۔ شیراز نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور جو کچھ وہ فرضی طور پر تصور کرتے ہوئے اپنے ذہن میں دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں میں بہت فرق تھا۔ وہ اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھے جانے والے منظر پر بھروسا کرنے کے بجائے اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھے جانے والے منظر پر اعتبار کر رہا تھا۔

''تم فکر مت کرو۔ میں ابھی اور اسی وقت ان کی چیزیں ان کے منہ پر مار کر آتی ہوں۔'' نسیم نے بیٹے کو تسلی دی۔

''صرف منگنی کا سامان نہیں، یہ سب کچھ بھی لے جائیں۔'' شیراز نے غصے سے کہا اور کمرے میں موجود الماری کھول کر اس کے اندر موجود ساری چیزیں باہر پھینکنے لگا جو زینی اسے وقتاً فوقتاً دیتی رہی تھی۔

''خالہ آئی ہیں باہر دروازے پر۔'' تب ہی نزہت نے تیزی سے اندر آ کر اطلاع دی۔ شیراز اور نسیم نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر شیراز نے کہا۔

''میں سامنا نہیں کر رہا ان کا۔ میرا پوچھیں تو بتا دیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔''

''تم منگنی کی چیزیں باہر لے کر آؤ۔'' نسیم نے نزہت سے کہا اور خود باہر نکل گئیں۔ دروازے پر نفیسہ بے حد پریشان سی کھڑی تھیں۔ نسیم کے دروازہ کھولتے ہی وہ اندر آ گئیں۔

''تم اگر ہمارے طرف منہ آتیں تو میں خود تمہاری طرف آنے والی تھی۔ یہ تمہاری بیٹی کیا گل کھلاتی پھر رہی ہے؟'' نسیم نے چھوٹتے ہی کہا۔

''آپا! زینی کا کوئی قصور نہیں۔ وہ لڑکا بہت عرصے سے اسے تنگ کر رہا تھا۔'' نفیسہ نے بے حد لجاجت سے کہا۔

''ہماری بیٹیوں کو تو کوئی تنگ نہیں کرتا یوں آتے جاتے۔'' نسیم نے دو بدو کہا۔

''وہ کالج آتی جاتی ہے آپا۔ رستے میں سو برے لڑکے ہوتے ہیں۔''

''برے لڑکے شادی کی دعوت نہیں دیتے پھرتے۔'' نسیم نے ان کی بات کاٹی۔

''شادی کی دعوت؟'' نفیسہ بے اختیار چونکیں۔

''یہ تم اپنی بیٹی سے جا کر پوچھو۔ شیراز نے خود رقعہ پڑھ کر سنایا ہے مجھے۔ اس لڑکے نے تمہارے گھر رشتہ بھیجنے کے بارے میں پوچھا ہے۔''

''اللہ نہ کرے آپا! ہم ایسے کسی لڑکے کے ماں باپ کو اپنے گھر بلوائیں۔ آپ شیراز کو بلائیں۔ میں خود معذرت کر لیتی ہوں اس سے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے معافی کی۔ نزہت! منگنی کا سامان لے آؤ۔ ہمیں تمہاری بیٹی کو نہیں بیاہنا۔'' نسیم نے بلند آواز میں نزہت کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

''آپا! آپ کیا کہہ رہی ہیں اتنی چھوٹی سی بات پر منگنی توڑ رہی ہیں؟'' نفیسہ کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی تھی۔

''تمہارے لیے جو چھوٹی بات ہے۔ وہ ہمارے جیسے عزت داروں کے لیے بہت بڑی بات ہے۔ میرا بیٹا افسر ہے۔ دنیا اسے سلام کرتی پھرے، اور تمہاری بیٹی اس کی عزت کو گلی محلوں کے لڑکوں کے ساتھ اچھالتی پھرے۔'' نزہت تب تک ایک تھیلے میں منگنی کا سامان لے کر باہر آ گئی تھی۔

نفیسہ بے اختیار رونے لگیں۔

"آپا! یہ ظلم نہ کریں۔ میں ہاتھ جوڑ کر زینی کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ کہیں گی تو میں زینی کو بھی لے آتی ہوں۔ وہ آپ کے اور شیراز کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لے گی۔"

"یہ سب پہلے سوچنا تھا اب کوئی فائدہ نہیں۔ شیراز اس سے شادی پر تیار نہیں ہے۔ اور شیراز کیا، کوئی بھی عزت دار آدمی ایسی لڑکی کے ساتھ رشتہ کیوں جوڑے گا۔"

"آپا! صرف ایک موقع دے دیں۔ میں زینی کو گھر بٹھا لوں گی۔ وہ کالج تو کیا کہیں نہیں جائے گی۔ جو آپ لوگ کہیں وہی کرے گی لیکن یہ منگنی نہ توڑیں۔ میری زینی مر جائے گی۔"

"وہ محلے کے لڑکوں کے ساتھ چکر چلاتے ہوئے تو مری نہیں اور اس منگنی کے ٹوٹنے پر مر جائے گی۔ اتنی باحیا ہوتی تو وہ اس لڑکے سے رقعہ لیتے ہوئے مر جاتی۔"

یہ نزہت تھی جس نے بے حد ہتک آمیز انداز میں وہ سامان باہر چارپائی پر لا کر پھینکا تھا۔

☆☆☆

"کچھ بھی نہیں ہوگا زینی! تم خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ شیراز بھائی تھوڑا بہت ناراض ہوں گے پھر ٹھیک ہو جائیں گے۔" نفیسہ کے جانے کے بعد ربیعہ نے زینی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تھوڑا بہت ناراض بھی کیوں ہوں میرے ساتھ۔ میرا تو بالکل بھی قصور نہیں ہے ربیعہ!" اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "پہلے ہی اتنے ہفتوں کے بعد میرا اور ان کا آمنا سامنا ہوا تھا اور وہ بھی اس طرح۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے کہ میں کیا کر رہی ہوں۔"

"کیا کر رہی ہو؟ کچھ نہیں کر رہیں۔ اب اتنی لمبی منگنی کے بعد یہ تو جان ہی گئے ہوں گے شیراز بھائی کہ تم کیسی لڑکی ہو، پھر تم کیوں ڈر رہی ہو۔ یہ سوچ سوچ کر کہ وہ تم پر شک کریں گے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر مجھے پھر بھی ان کے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ ربیعہ کچھ کہتی دروازے پر دستک ہوئی۔

"لگتا ہے امی آ گئیں۔" ربیعہ نے کہا اور جلدی سے اٹھ کر صحن کے بیرونی دروازے کی طرف لپکی۔

دروازے پر واقعی نفیسہ ہی تھیں مگر ان کے چہرے کے تاثرات اور ہاتھ میں پکڑے تھیلے نے زینی کو بھی اٹھ کر نفیسہ کی طرف آنے پر مجبور کر دیا۔

"کیا ہوا امی؟" ربیعہ نے روتی ہوئی نفیسہ سے بے حد پریشان ہو کر پوچھا۔

زینی کی چھٹی حس اسے جیسے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ اس کی نظریں نفیسہ کے چہرے پر نہیں، ان کے ہاتھ میں پکڑے تھیلے پر تھیں۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس میں کیا ہو سکتا تھا۔ اور اس چیز کا خیال بھی اس کے لیے سوہان روح تھا۔

''انہوں نے منگنی توڑ دی۔'' نفیسہ روتے ہوئے صحن کے تخت پر بیٹھ گئیں۔ زینی کو لگا کسی نے اس کی شاہ رگ پر یک دم پاؤں رکھ دیا۔ ربیعہ بھی اسی طرح ہکا بکا کھڑی رہ گئی تھی۔

ایک لفظ کہے بغیر زینی پاگلوں کی طرح بیرونی دروازے کی طرف لپکی۔ ربیعہ نے یک دم آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''میں شیراز کے پاس جا رہی ہوں۔ میں خود ان سے بات کروں گی۔'' نفیسہ تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔

''شیراز گھر پر نہیں ہے۔ صرف اس کی ماں اور بہنیں ہیں۔ تم کیا بات کرو گی ان سے جا کر؟''

''میں پوچھوں گی ان سے، وہ کس طرح میرا اور شیراز کا رشتہ ختم کر سکتی ہیں۔ میں بتاؤں گی انہیں سب کچھ۔'' زینی نے بے حد بے چارگی کے عالم میں کہا۔

''وہ کچھ سننے پر تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے میری بہت بے عزتی کی ہے۔ مجھ سے کیا کیا کہا ہے۔ وہ میں اپنی زبان پر بھی لا نہیں سکتی۔''

''شیراز کو کچھ پتہ نہیں ہوگا ان سب چیزوں کے بارے میں۔ ورنہ وہ یہ سب کبھی نہ ہونے دیتے۔ یہ سب ان کی ماں اور بہنوں نے کر دیا ہے۔ میں خود بات کرتی ہوں جا کر۔ میرے راستے سے ہٹو ربیعہ۔''

''تمہارے ابو شام کو آئیں گے تو وہی ان سے بات کریں گے۔ تمہارے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

نفیسہ نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ رکی نہیں۔ ربیعہ کو تقریباً دھکا دیتے ہوئے وہ تیزی سے صحن کے دروازے سے باہر آ گئی۔

تیز قدموں سے تقریباً بھاگنے والے انداز میں اس نے اپنے گھر سے شیراز کے گھر کا فاصلہ طے کیا۔ دروازہ بند تھا۔ زینی نے دروازے کو پوری قوت سے بجایا۔ یہ دروازہ ساری زندگی اس پر بند نہیں ہوا تھا پھر آج کیسے ہو سکتا تھا۔

اندر صحن میں کھڑا شیراز، نسیم اور نزہت وغیرہ یک دم چونک گئی تھیں۔

''خالہ! دروازہ کھولیں۔'' اس سے پہلے کہ شیراز دروازے کی طرف جاتا، باہر سے زینی کی آواز آئی۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر ٹھٹک گیا۔

''دروازہ کھولنے اور اس سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے کہہ دیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔'' شیراز نے مدھم آواز میں تیزی سے کہا۔ نسیم سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

''کیا کام ہے تمہیں؟'' نسیم نے دروازے کے قریب جا کر اسے کھولے بغیر اندر سے سخت لہجے میں پوچھا۔

''مجھے آپ سے بات کرنا ہے۔'' زینی کے انداز میں لجاجت تھی۔

''جو بات کرنا تھی تمہاری ماں سے کر لی میں نے۔ کچھ اور کہنا یا سننا ہو تو اپنے باپ کو بھیج دینا مگر تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' نسیم نے تیز اور بلند آواز میں کہا۔

''خالہ! دروازہ کھولیں، مجھے اندر تو آنے دیں۔ میری بات تو سنیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں۔ آپ دروازہ تو کھولیں۔'' وہ

دروازہ کے باہر کھڑی منت سے کہہ رہی تھی۔

"میں نے تم سے کہا نا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔" نسیم نے ایک بار پھر وہی بات دہرائی۔

"میں نہیں جاؤں گی، میں آپ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔" زینی نے بے حد ضدی انداز میں کہا۔

"تو پھر کھڑی دروازہ بجاتی رہو۔" نسیم نے بے حد غصے سے کہا۔

زینی پوری قوت سے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں سے اس دروازے کو بجانے لگی۔ ذلت یہ بھی ہوتی ہے، وہ اب جان رہی تھی۔ اور یہ بھی ایک جگہ سے یا ایک ہی انداز میں نہیں ملتی۔ اسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا۔

وہ تب تک دروازہ بجاتی رہی جب تک گلی کے دوسرے گھروں سے لوگ باہر نہیں نکلنے لگے اور شاید ابھی نہ جانے کب تک دروازہ بجاتی رہتی اگر ربیعہ اور نفیسہ زبردستی اسے آ کر وہاں سے نہ لے جاتیں۔ جو بات شاید اگلے چند دنوں میں محلے والوں کو پتہ چلتی، وہ چند منٹوں میں پتہ چل گئی تھی۔

زینی پر شیراز کے گھر کا دروازہ بند ہونا کسی بم دھماکے سے کم نہیں تھا۔

☆☆☆

"سارا قصور تمہارا ہے۔ تم ہی نے اتنی چھوٹ دے رکھی تھی اپنی بیٹی کو۔"

اکبر اب ضیا پر برس رہے تھے۔ ضیا تھوڑی دیر پہلے ہی آفس سے گھر آئے تھے اور گھر پہنچتے ہی انہیں یہ خبر مل گئی تھی۔ وہ اسی طرح الٹے قدموں اکبر کے گھر چلے آئے تھے وہ شیراز سے خود ملنا چاہتے تھے مگر اکبر اور نسیم دونوں نے یہی ظاہر کیا تھا کہ شیراز وہاں نہیں ہے۔ جبکہ شیراز دوسرے کمرے میں موجود ماں باپ اور ضیا کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔

"سو سو لیکچر دیتے تھے مجھے اخلاقیات اور ایمانداری پر۔ اپنی بیٹی کو دینا کیوں بھول گئے؟" اکبر کو پرانی بھڑاس نکالنے کا موقع مل رہا تھا۔

"اکبر بھائی! میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ زینی کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس کا قصور ہوتا تو میں کبھی آپ کے ہاں نہیں آتا۔" ضیاء نے لجاجت سے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ اس کا قصور نہیں ہے۔ ہم جھوٹے ہیں۔" اکبر نے اسی انداز میں کہا۔ زندگی میں پہلی بار انہیں کسی پر برسنے، کسی پر حاکمیت جتانے کا موقع مل رہا تھا اور وہ بھی اپنے اس چھوٹے بھائی پر جس کی سرکاری نوکری اور عزت سے وہ ہمیشہ سے خار کھاتے تھے۔

"خدانخواستہ میں ایسا کیوں کہوں گا اکبر بھائی! یہ سب کچھ کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں زینی کو وہ بھلا اس طرح کا کوئی کام کیسے کر سکتی ہیں۔"

"کسی دوسرے کی اولاد کے بھیدوں کو ہم کیسے جان سکتے ہیں۔" نسیم نے بے حد تلخی سے کہا۔ "ماں باپ کا تو کام ہی پردے ڈالنا ہوتا ہے۔ تم اس کی حمایت کر کے کون سا انوکھا کام کر رہے ہو۔ تم اپنے منہ سے یہ اقرار کیسے کرو گے کہ تمہاری بیٹی کا کردار ٹھیک نہیں ہے۔"

"بھابھی! میری بیٹی کے کردار کے بارے میں ایک لفظ بھی مت کہیے گا۔" ضیا نسیم کی یہ بات برداشت نہیں کر سکے تھے۔

"چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہمارے گھر بیٹھے ہو ہم تمہارے گھر نہیں بیٹھے۔" اکبر نے بلند آواز میں ضیاء سے کہا۔ "سارے زمانے کی آوارہ لڑکی ہمارے بیٹے کے لیے ہی رہ گئی ہے۔"

"آپ کو رشتہ ختم کرنا ہے، کر دیں لیکن میری بیٹی کے کردار پر کیچڑ اچھالنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔"

ضیاء نے یک دم کہا۔ اکبر اور نسیم کی باتیں اور انداز اب ان کے لیے واقعی ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

"ارے اچھا ہوا، ہمیں یہ سب پہلے پتا چل گیا۔ شادی کے بعد پتا چلتا تو میرے بیٹے کی کتنی بدنامی ہوتی۔" نسیم نے کہا۔

"واقعی بہت اچھا ہوا کہ یہ سب کچھ مجھے بھی پہلے پتہ چل گیا۔ شادی کے بعد اس طرح کی کوئی تہمت آپ میری بیٹی کے دامن پر لگاتے تو میں کیا کرتا۔"

"ہمارے بیٹے کی عزت تمہاری بیٹی کی عزت سے کئی گنا زیادہ اور قیمتی ہے۔ معاشرے میں اس کا مقام ہے۔ تمہاری بیٹی کیا ہے اور خود تم کیا ہو۔" اکبر نے بے حد حقارت سے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ! آپ کے بیٹے کا معاشرے میں ایک مقام ہے۔ وہ سرکاری افسر ہے۔ اسے شرم آئے گی ایک کلرک کی بیٹی کو اپنی بیوی بناتے ہوئے۔ مجھے تو یہ سب پہلے ہی جان لینا تھا۔ کچھ تو تھا اس کے اور آپ کے دل میں کہ اکیڈمی جانے کے بعد وہ ایک بار اس چچا کے گھر نہیں آیا، جہاں وہ مہینے میں کئی کئی بار آتا تھا۔ میری بیٹی پر کوئی تہمت لگانے کے بجائے صرف یہ کہہ دیتے کہ اب آپ کے بیٹے اور میری بیٹی کا جوڑ نہیں رہا۔ اتنا لمبا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کی چیزیں میں صبح بھجوا دوں گا۔"

ضیاء نے کھڑے ہوتے ہوئے آخری چند لفظ ان سے کہے اور پھر ان کے گھر سے نکل آئے۔

کندھوں پر انہیں اتنا بوجھ محسوس نہیں ہو رہا تھا جتنا دل پر۔ یہ ان کے خونی رشتے تھے۔ ان کے ماں جائے۔ وہ فہمیدہ آپا ہوتیں یا اکبر ان کے لیے دونوں سانپ سے زیادہ زہریلے ثابت ہوئے تھے۔ دونوں کی آنکھوں پر حرص و ہوس کی پٹی بندھی تھی جس نے انہیں اندھا کر رکھا تھا۔

☆☆☆

ضیا بہت دیر تک اکبر کے گھر پر رہے تھے اور اس سارے عرصے میں زینی جیسے پاؤں کی بلی کی طرح صحن کے چکر کاٹتی رہی تھی۔ صرف وہی نہیں، ربیعہ، نفیسہ اور سلمان بھی بے حد پریشانی کے عالم میں صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ضیا بالآخر جس وقت شیراز کے گھر سے واپس آئے، اس وقت رات کافی ڈھل چکی تھی۔ دروازے پر ان کے دستک دیتے ہی زینی بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا اور ضیا کے تاثرات نے جیسے اس کے بدترین خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! ایک منگنی ختم ہونے سے زندگی ختم نہیں ہوتی۔ اللہ تمہیں شیراز سے بہتر شخص کی رفاقت دے۔"

ضیا نے نم آنکھوں کے ساتھ زینی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور جیسے اسے زندہ قبر میں درگور کر دیا۔ وہ بے یقینی سے باپ کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ہر بار جب وہ زہرہ کا مسئلہ حل کرنے جاتے تھے تو اس کا مسئلہ حل کر کے ہی آتے تھے۔ ہمیشہ اچھی خبر لاتے تھے۔ وہ بھی ایسی ہی اچھی خبر کی توقع

لیے بیٹھی تھی اور یہ کیسے ہو گیا تھا کہ اسے زندگی میں پہلی بار مسئلے کا سامنا کرنا پڑا اور باپ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا اور اب اسے منگنی کے خاتمے پر صبر کی تلقین کر رہا تھا۔ زینی پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ ضیاء کو دیکھ رہی تھی۔ جو نفیسہ سے کہہ رہے تھے۔

''صبح منگنی کا سامان واپس دے آنا۔ اچھا ہوا، ان لوگوں کا اصلی چہرہ سامنے آ گیا، ورنہ کل کو زہرہ کی طرح وہ زینی کو بھی تنگ کرتے۔'' وہ کہتے ہوئے اندر کمرے میں چلے گئے۔

نفیسہ دوپٹہ منہ پر رکھ کر رونے لگی تھیں۔ شاید وہ بھی زینی کی طرح ضیا کے وہاں جانے سے کوئی آس لگائے بیٹھی تھیں۔ زینی اسی طرح صحن کے دروازے کے پاس کھڑی ماں، بہن اور بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ یہ سب کچھ کوئی خواب تھا، کوئی بھیانک خواب۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ زینی نے کبھی زندگی میں کوئی بھیانک خواب تک نہیں دیکھا تھا۔ کوئی آسمان سے زمین پر کس طرح گرتا ہے، یہ زینب ضیاء سے زیادہ بہتر نہ تو کوئی محسوس کر سکتا تھا نہ بتا سکتا تھا۔

''زینی! اس طرح کھڑی مت ہو، بیٹھ جاؤ۔'' ربیعہ نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بے حد نرمی سے کہا۔ زینب کو یکدم جیسے ہوش آ گیا۔ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ تیزی سے ضیا کے کمرے میں چلی گئی وہ پریشانی کی حالت میں اپنے پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ زینب کے اندر آنے پر چونکے۔

''آپ نے شیراز سے بات کی؟'' زینی نے اندر آتے ہی ضیا سے پوچھا۔

''نہیں، وہ گھر پر نہیں تھا۔ اکیڈمی چلا گیا تھا۔'' ضیا نے مدھم آواز میں کہا۔

''ابو! آپ شیراز سے بات کریں۔ ان کو یہ سب پتہ نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے وہ۔۔۔'' زینب نے لجاجت سے کہا۔

''اس کو سب پتا ہوگا۔ انہوں نے اسی کے کہنے پر یہ منگنی توڑی ہے۔'' ضیا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں یہ مان ہی نہیں سکتی۔ آپ شیراز سے بات کریں یا مجھے اکیڈمی لے جائیں۔ میں ان سے بات کروں گی۔''

''نہیں، اب شیراز سے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ نہ میں نہ تم۔'' ضیا نے شاید زندگی میں پہلی بار زینب سے سختی سے بات کی۔

''ابو! صرف ایک بار ان سے بات کریں، ایک بار'' وہ ضیا کے قدموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ وہ روئے گی اور ضیا مان جائیں گے اسے یقین تھا۔ آخر باپ نے زندگی میں اس کے آنسو کب دیکھے تھے۔ اس بار اس کا یہ یقین بھی باطل ثابت ہوا۔

''نہیں زینی! جب رشتہ ختم ہو گیا تو ہو گیا۔ میں ان سے کہہ آیا ہوں کہ اب وہ چاہیں گے تو بھی تمہارا رشتہ انہیں نہیں دوں گا۔'' ضیا نے اسی سختی سے کہا۔

''آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے آپ جانتے ہیں شیراز میرے لیے کیا ہیں۔'' وہ اب بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

''جب عزت پر حرف آنے لگے تو محبت کو چھوڑ دینا چاہیے۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی تمہارے کردار پر کیچڑ اچھالے، تہمت لگائے۔''

ضیا کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسے اس طرح روتے دیکھ کر ان کے اندر جا ہے جو ہو رہا تھا، ان کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی یا فرق نہیں پڑا تھا۔

''ایک بار ابو! صرف ایک بار......''

''جو چیز اللہ نہ دے زینی! اسے انسانوں سے نہیں مانگنا چاہیے۔''

''اسے اللہ نے ہی مجھے دیا ہے ابو!''

دیا''تھا'' ضیا نے اپنے لفظوں پر زور دے کر کہا۔ ''جو چلا گیا اس کے لیے مت روؤ۔''

''آپ اتنے ظالم کیوں بن رہے ہیں ابو! میری زندگی کا سوال ہے اور آپ کو احساس تک نہیں ہے۔'' وہ اسی طرح روتی رہی۔

''احساس ہے مجھے، اسی لیے کہہ رہا ہوں اسے بھول جاؤ۔ اللہ تمہیں'' زینی نے روتے ہوئے ناراضی سے ان کی بات کاٹی۔

''نہیں بھول سکتی میں۔ آپ مجھے اس سے ملنے دیں۔''

''تاکہ پہلے انہوں نے تمہارے ماں باپ کی بے عزتی کی ہے اب تمہاری کریں۔''

''وہ سب کچھ خالہ نے اور باقی گھر والوں نے کیا ہے۔ شیراز ایسے نہیں ہیں۔ وہ میرے ساتھ یہ سب نہیں کر سکتے۔''

''انہوں نے تم پر اپنے گھر کا دروازہ تک بند کر دیا۔ تم کیا سوچ کر اس گھر میں جانا چاہتی ہو۔''

''شیراز نے تو دروازہ نہیں بند کیا تھا۔ وہ دروازہ بند کرتے تو ...''

ضیا نے اس کی باقی بات نہیں سنی تھی۔ وہ اپنے دونوں گھٹنوں پر دھرے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اسے اسی طرح چھوڑ کر اٹھ کر باہر چلے گئے تھے۔ یہ آج زینی کے لیے دوسرا دھچکا تھا۔ ایسا کب ہوا تھا کہ باپ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ہو، اس کی بات نہ مانی ہو۔ کیا ان کو اس کا احساس ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

اس رات ضیا کے گھر میں کھانا پکا تھا نہ ہی کوئی رات کو سویا تھا۔ ہر ایک آنے والے وقت کے بارے میں خدشات لیے جاگتا رہا تھا۔ زینب کی نظروں کے سامنے دوپہر سے رات تک کئی واقعات فلم کی طرح بار بار چل رہے تھے۔ ضیا اور نفیسہ کے کانوں میں اکبر اور نسیم کی کہی ہوئی باتیں۔

صبح ہونے تک زینی تیز بخار میں پھنکنے لگی تھی۔ ضیا آفس جاتے ہوئے اسے دیکھنے آئے تھے۔ زینی نے آنکھیں نہیں کھولیں، نہ ان کی کسی بات کا جواب دیا۔ وہ اپنی آنکھوں پر بازو رکھے چت لیٹی رہی۔ ضیا کا دل کٹنے لگا۔

''آج منگنی کا سامان ان لوگوں کے گھر بھجوا دینا۔'' ضیا نے بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے نفیسہ سے کہا۔

''آپ ناشتہ نہیں کریں گے۔''

''نہیں بھوک نہیں ہے۔''

''میں سوچ رہی تھی اگر ایک بار خاندان کے کچھ لوگوں کو اکٹھا کر کے شیراز اور اس کے گھر والوں سے بات۔ ''

نفیسہ نے بے حد لجاجت آمیز انداز میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ ضیا نے ان کی بات کاٹ دی۔

"تم جانتی ہو، جو باتیں انہوں نے ہم سے زینی کے بارے میں کہی ہیں، وہ انہیں پورے خاندان کے سامنے دہرائیں؟ مجھے یہ منظور نہیں ہے۔ چند دن گزریں گے پھر زینی ٹھیک ہو جائے گی۔"

وہ کہتے ہوئے سائیکل لے کر صحن سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

"امی کہہ رہی ہیں، انہیں منگنی کا سامان بھجوانا ہے۔"

ربیعہ ضیا کے گھر سے جانے کے تھوڑی دیر بعد نفیسہ کے کہنے پر اس کے پاس آئی تھی۔ وہ اپنے بستر پر اسی طرح چت پڑی ہوئی تھی۔ اسے بہت تیز بخار تھا۔ مگر اب وہ رو نہیں رہی تھی نہ ہی آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ بے حد ماؤف ذہن کے ساتھ وہ چھت کو تک رہی تھی۔ بخار نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بری طرح متاثر کیا تھا اور شاید اس ذہنی حالت میں یہ اس کے لیے بہتر ہی ہوا تھا۔

"بھیج دیں۔" اس نے خالی نظروں سے ربیعہ کو دیکھ کر کہا۔

"یہ بھی چاہیے۔" ربیعہ نے جھجکتے ہوئے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا؟" زینب کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا، وہ کیا چیز مانگ رہی تھی۔

"منگنی کی انگوٹھی۔" ربیعہ نے بالآخر کہا۔

زینب اب بھی اس طرح سپاٹ نظروں سے اس کو دیکھتی رہی۔

ربیعہ کچھ دیر منتظر رہی پھر اس نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلی سے وہ انگوٹھی اتار لی تھی۔ زینب نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ وہ بالکل بے جان انداز میں اسے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتارتے دیکھتی رہی۔ وہ انگوٹھی اتنے سالوں میں اس کے وجود کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ وہ سونے کا وہ واحد زیور تھا جو پچھلے چار، پانچ سالوں سے زینب کے جسم پر تھا اور اب اسے اس سے الگ ہونے میں چند سیکنڈز بھی نہیں لگے تھے۔

"میں تمہارے لیے ناشتہ لے کر آتی ہوں، ساتھ کوئی میڈیسن بھی دیتی ہوں۔ بخار اور تیز ہو رہا ہے تمہارا۔" ربیعہ نے قدرے فکر مند ہوتے ہوئے کہا۔

"کچھ مت لانا، میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔" زینی نے کروٹ بدلتے ہوئے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک چادر میں چھپا لیا۔

☆☆☆

وہ اگلے تین دن اسی طرح بخار میں جلتی جسم اپنے بستر پر پڑی رہی۔ ربیعہ اور نفیسہ زبردستی اسے تھوڑا بہت کھلاتی رہیں۔ ضیا کے کئی بار کوشش کرنے پر بھی اس نے ان سے بات نہیں کی۔ اسے اگر شیراز کے گھر والوں کے علاوہ کسی اور سے گلہ تھا تو وہ ضیا ہی تھے۔ وہ رشتہ ختم ہو جانے میں انہیں بھی مورد الزام ٹھہرا رہی تھی۔ "اگر زہرہ آپا کے بیٹے وہ فہمیدہ پھوپھو کے سامنے ہاتھ جوڑ سکتے ہیں تو میرے لیے کیوں نہیں؟" اس کا ذہن ایک ہی بات سوچتا رہتا۔

پھر ایک موہوم سی امید اس کے اندر جاگنے لگتی کہ شیراز جلد یا بدیر اپنے ماں باپ کو دوبارہ رشتہ جوڑنے کے لیے ان کے گھر بھیجے گا۔ آخر یہ ہو کیسے سکتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے زینی سے قطع تعلق کر لیتا۔ وہ سارا دن اپنے بستر پر بیٹھی پتہ نہیں کیا کیا سوچتی رہتی۔

اس کی منگنی ٹوٹنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی تھی۔ سارا دن نفیسہ محلے کی عورتوں کو منگنی ٹوٹنے کی وجوہات بتاتی رہتیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ شیراز اب افسر تھا اور کوئی بھی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ شیراز جیسے لائق اور شریف نوجوان نے بغیر کسی وجہ کے زینی کو چھوڑ دیا تھا۔ ہر عورت نفیسہ سے سارا قصہ سننے کے بعد جیسے تصدیق کے لیے شیراز کے گھر بھی جاتی جہاں پر نسیم اور نزہت انہیں یہ واقعہ مرچ مسالے کے ساتھ بتاتیں۔ وہ عورتیں دوبارہ ان باتوں کو بتانے یا شاید ان پر نفیسہ کی رائے لینے کے لیے زینی کے گھر آتیں اور پھر ان کا اصرار ہوتا کہ وہ زینی سے ملنا چاہتی ہیں تاکہ اس سے ہمدردی کر سکیں اور زینی کمرے میں بند صحن میں ہونے والی باتیں سنتی رہتی۔

"میں نے تو جب سے زینب کی منگنی ٹوٹنے کا سنا ہے، تب سے میرا جی برا ہو رہا ہے۔ آخر ہوا کیا تھا؟" یہ ہر عورت کے ابتدائیہ جملے ہوتے۔

"بس سمجھ لیں قسمت خراب تھی زینی کی۔" نفیسہ کا گہرا سانس اور جوابی جملہ۔

"پر محلے میں تو کچھ اور شور مچا ہوا ہے۔" اگلا تیر۔

"کیسا شور؟" نفیسہ کی پریشانی بڑھ جاتی۔

"نسیم تو کہہ رہی ہے کہ زینب کے لڑکوں کے ساتھ تعلقات ہیں۔ شیراز نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے اسے کسی لڑکے کے ساتھ۔" روح فرسا الزام یا انکشاف۔

"جھوٹ بول رہی ہے، تہمت لگا رہی ہے میری بیٹی پر۔ خدا کا خوف نہیں ہے اسے۔" نفیسہ کا واویلا۔

اور زینی اندر بستر پر پڑی یہ سب کچھ سوچ کر اور ادھ موئی ہوئی جاتی۔ اس کا کمرے سے باہر نکل کر کسی سے سامنا کرنے کا حوصلہ اکٹھا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا۔ کل تک جو عورتیں اپنی بیٹیوں کا نام اس کے نام پر رکھتے ہوئے اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں۔ آج وہی اس پر ترس کھانے یا اس کا تماشا دیکھنے چلی آ رہی تھیں۔

زینب ضیا نے آج تک اپنی قسمت کے اچھا ہونے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ لوگ سوچتے تھے اور لوگ کہتے تھے لیکن آج اپنی قسمت کے خراب ہونے کے بارے میں اسے کوئی شک نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ واقعی بہت بدقسمت ہے زہرہ آپا سے زیادہ۔ محلے کی ہر مطلقہ، بیوہ عورت سے زیادہ۔

اسے اب اس لڑکے پر بھی غصہ نہیں آتا تھا۔ اسے لگتا، وہ لڑکا نہیں تھا۔ بدقسمتی تھی جو اس دن اس کے اور شیراز کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

سارا دن وہ کمرے میں بستر پر چپ چاپ پڑی رہتی اور ساری ساری رات صحن میں ننگے پاؤں پھرتی رہتی یا پھر کسی جگہ بیٹھی رہتی۔ جب تہجد کے وقت ضیا اپنے کمرے سے باہر نکلتے تو وہ چپ چاپ صحن سے اٹھ کر واپس کمرے میں چلی جاتی۔ نہ وہ پہلے کی طرح ضیا سے بات کرتی، نہ وضو

کرواتی، نہ جانے کا پوچھتی۔

ضیا نے بہت بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر زینی کے پاس ایک چپ کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ باپ سے یہ نہیں کہنا چاہتی تھی کہ اسے صرف اور صرف ان ہی سے گلہ تھا اور کسی سے نہیں۔ شیراز یا اس کے گھر والوں سے بھی نہیں۔

مگر اس سب کے باوجود اسے ابھی بھی کوئی آس تھی کہ کچھ دن اور گزرنے پر شیراز کسی نہ کسی طرح اس سے رابطے کی کوشش کرے گا، وہ اسے یاد کرے گا، ورنہ سب کچھ پھر پہلے کی طرح ہو جائے گا۔ سب کچھ۔

☆☆☆

اس رات بھی وہ اسی طرح صحن میں بیٹھی ہوئی تھی جب ربیعہ باہر آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''سو جاؤ زینی! کب تک اس طرح جاگتی رہو گی؟''

''مجھے ایک بار شیراز سے ملنا ہے۔'' زینی نے جواب دیا۔

''کیا کرو گی اس سے مل کر، ابو نے کہا تو ہے، وہ سب ایک جیسے ہیں۔''

''نہیں وہ باقی لوگوں جیسے نہیں ہیں۔'' زینی نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''زینی......''

اس نے ربیعہ کی بات کاٹ دی۔ ''میں انہیں منا لوں گی۔ جتنا بھی ناراض ہوں مگر وہ میرے سامنے مجھے دیکھ کر ناراض نہیں رہ سکتے۔ تمہیں پتہ تو ہے۔''

''انہوں نے منگنی توڑی ہے اور شیراز کی مرضی سے توڑی ہے۔''

''غصے میں، صرف غصے میں۔ ورنہ شیراز میرے بغیر کیسے رہیں گے۔'' زینی نے بے چارگی سے کہا۔

''جیسے مرضی رہے ہمیں کیا ہم سے تو رشتہ ختم ہو گیا ان لوگوں کا۔ ابو نے کہا ہے نا کہ تمہیں ان شاء اللہ تعالیٰ شیراز سے بہتر آدمی ملے گا۔''

''نہیں۔ شیراز نہیں تو کوئی بھی نہیں۔'' زینی نے یک دم دو ٹوک انداز میں کہا۔

''زینی......''

''میں ان کی جگہ کسی کو نہیں دے سکتی۔''

''ابھی نئی نئی بات ہے، کچھ وقت گزرے گا تو وہ تمہارے دل سے نکل جائے گا۔''

''نہیں نکلے گا، سو سال بھی گزر جائیں تو بھی وہ میرے دل سے نہیں نکلے گا۔ کوئی اس طرح دل سے کیسے نکل سکتا ہے۔''

''تم اسے نکال دو گی تو نکل جائے گا۔''

''تم عمران کو اپنے دل سے نکال سکتی ہو؟''

"ہاں، اگر وہ مجھے اس طرح اپنی زندگی سے نکال دے تو میں بھی اسے اپنی زندگی سے نکال دوں گی۔" ربیعہ نے اسی انداز میں کہا۔

"یہ فرق ہوتا ہے تعلق میں اور محبت میں۔ میں تو شیراز کو کسی بھی قیمت پر اپنے دل سے نہیں نکال سکتی اور نہ نکالوں گی اور میں اب کسی اور سے شادی بھی نہیں کروں گی۔"

زینی نے دوٹوک انداز میں کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

☆☆☆

شیراز کا وہ رقعہ پکڑنا اس کے اور اس کے گھر والوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا تھا۔ زینی کے رشتے سے جان چھڑانا شیراز کو جتنا مشکل لگ رہا تھا وہ اتنا ہی آسان ہو گیا تھا۔

اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے شیراز کے گھر والوں نے جی بھر کر زینی کے کردار کے بارے میں محلے اور خاندان میں باتیں کی تھیں۔ کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا جس نے ان کی باتوں پر اعتبار نہ کیا ہو اور منگنی توڑنے کو صحیح قدم قرار نہ دیا ہو۔

کون تھا جو ایک سی ایس پی آفیسر کے خاندان کی کسی غلط بات کو غلط کہہ کر اس سے دشمنی یا ناراضی مول لیتا۔ ہر ایک کو مستقبل قریب یا بعید میں شیراز اور اس کے سرکاری عہدے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

پھر زینب ضیا ایک چیونٹی سے زیادہ اہمیت کہاں رکھتی تھی۔ لڑکیوں کی منگنیاں ہوتی رہتی ہیں ٹوٹتی رہتی ہیں صحیح یا غلط کسی بھی وجہ سے پھر اب کیا خاص بات ہو گئی تھی۔

اور زینب کی منگنی ختم ہونے سے پورے خاندان کے لیے شیراز اکبر ایک بار پھر سے اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ پورے خاندان کے لوگوں کی نظریں ایک بار پھر سے اکبر کے گھرانے پر آ کر ٹک گئی تھیں کہ اب قرعہ کس خوش قسمت لڑکی کے نام نکلتا ہے۔ چار پانچ سال سے جس لڑکی کو خاندان کی خوش قسمت ترین لڑکی کے خطاب سے نوازا جا رہا تھا وہ یک دم اس خطاب سے محروم کر دی گئی تھی۔ اب کسی اور کی باری تھی اور ہر ایک کو اپنی بیٹی ہی شیراز کا مناسب ترین جوڑ لگ رہی تھی۔

ضیا کو دکھ اس بات کا تھا کہ محلے اور خاندان کے کسی فرد نے ان سے اس رشتہ کے ختم ہونے پر اظہار افسوس نہیں کیا تھا۔ ہر ایک نے ان سے صرف اس لڑکے کے قصے کے حوالے سے وضاحت ہی مانگی تھی۔ محلے کا کوئی مرد زینی کا نام نہیں جانتا تھا اور اب وہ ہر ایک کے ہونٹوں پر یہ نام سن رہے تھے۔ کسی باپ کے لیے اپنی بیٹی کا نام غیر لوگوں کی زبان پر اس طرح سننا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہ وہی جانتے تھے۔

اور اس سے بھی تکلیف دہ چیز زینی کا رویہ اور اس کی حالت تھی۔ وہ دنوں کے اندر بدل گئی تھی۔ وہ کئی بار رات کو صحن میں اس کے قدموں کی آواز سنتے اور جاگ جاتے اور اس کے بعد پوری رات سو نہیں پاتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ ساری ساری رات صحن میں بیٹھی رہتی ہے۔ شیراز سے اس کی جذباتی وابستگی کو کوئی ان سے زیادہ اچھی طرح نہیں جانتا تھا اور اب اس کی ذہنی کیفیت کو کوئی ان سے زیادہ بہتر طور پر نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ ہر قیمت پر شیراز کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑ دیتے مگر یہ سب کچھ ان کے ہاتھ میں نہیں تھا اور وہ یہی چیز زینی کو سمجھانے سے قاصر

تھے۔ وہ پہلے کی طرح ان سے جیب خرچ لیتی تھی نہ ان کی لائی ہوئی کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ لگاتی تھی۔ اس نے ضیا کے سامنے آنا تک چھوڑ دیا تھا۔ رشتہ ٹوٹنے سے شیراز کے گھر کو کچھ نہیں ہوا تھا مگر ضیا کے گھر میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

شیراز اور اس کے گھر والوں کو اسی ویک اینڈ پر شینا کے گھر جانا تھا مگر اچانک سعید نواز نے اسے شینا کے دو ہفتے کے لیے اسلام آباد جانے کا بتایا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ وہ جیسے ہی وہاں سے واپس آتی ہے وہ اس کے گھر والوں کو کھانے پر بلوائیں گے۔ شیراز کو اچانک خدشات تنگ کرنے لگے تھے۔ کیونکہ اگلے کچھ دن سعید نواز سے اس کا رابطہ بالکل نہیں ہو سکا تھا۔ دوسری طرف اس کے گھر والے اس سے بار بار شینا کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ شیراز کو یہ خوف محسوس ہوا کہ کہیں سعید نواز کا اچانک ارادہ نہ بدل گیا ہو۔

اس نے بہانے بہانے جواد سے شینا اور اس کے اسلام آباد جانے کے بارے میں پوچھا۔ جواد کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا مگر اس نے شیراز کو یہ تسلی ضرور دی کہ شینا اکثر ٹریول کرتی رہتی ہے اور اس کے اکثر سفر کسی پیشگی اطلاع کے بغیر ہوتے ہیں۔ شیراز مطمئن تو خیر کیا ہوتا مگر اس نے جواد کو سعید نواز کے پرپوزل کے بارے میں بتا دیا۔

جواد نے بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے مبارک باد دی مگر شیراز کو یوں محسوس ہوا جیسے سعید نواز اسے پہلے ہی اس بارے میں بتا چکے تھے۔ مبارک باد دینے کے ساتھ ہی جواد نے اس سے اگلا سوال اس کی پچھلی منگنی کے بارے میں پوچھا اور شیراز نے اس سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ وہ کئی ہفتے پہلے اس رشتہ کو ختم کر چکا تھا۔ جواد نے اس پر اسے ایک بار پھر مبارک باد دی۔

منگنی ٹوٹنے کے اگلے دو ہفتوں میں اسے یکے بعد دیگرے زینب کے تین طویل خط اکیڈمی کے ایڈریس پر ملے۔ اس نے صرف پہلا خط پڑھا اس میں زینب نے اس لڑکے کے تنگ کرنے کے احوال کے ساتھ ساتھ اس سے معذرت کی تھی اور التجا کی تھی کہ وہ ایک بار اس سے مل لے۔

شیراز نے اگلے دونوں خطوں کو پڑھے بغیر پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ زینب ضیا اب اس کے ماضی کا ایک گم گشتہ باب تھا جسے وہ بند کر چکا تھا۔ اس کی زندگی کا اگلا سنہری باب شینا سعید نواز کے وجود سے سجایا جانے والا تھا اور اسے اس وقت صرف اسی کی فکر تھی۔

دو ہفتے وہ مسلسل سعید نواز سے کسی طرح رابطے کی کوشش کرتا رہا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ اسے گھر پر نہیں ملے اور دو ہفتے کے بعد جب وہ بے حد فرسٹریٹڈ ہو چکا تھا تو بالآخر سعید نواز کی طرف سے اسے اور اس کے گھر والوں کو کھانے کی دعوت مل گئی۔ شیراز کا دل بے اختیار سجدے میں گر جانے کو چاہا۔

اس نے اپنے گھر والوں کو اس دعوت کی اطلاع دینے کے ساتھ ہی سعید نواز کے دیے گئے پیسوں سے منگنی کا سامان بھی خرید لیا تھا۔

سعید نواز کی بھجوائی ہوئی شاندار ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں شیراز، اس کے ماں باپ اور بہنوں نے زندگی میں پہلی بار اکٹھے سفر کیا تھا۔ وہ نئے خریدے ہوئے بہترین لباس میں ملبوس تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہے ہوں۔ منگنی کی تقریب ان کے لحاظ سے شادی ہی کی تقریب تھی اور وہ سوچ رہے تھے کہ سعید نواز کے گھر بھی اسی طرح کا اہتمام ہوگا اور ان کا شاندار استقبال ہوگا۔

ان کی توقعات غلط ثابت ہوئی تھیں۔ سعید نواز کے ہاں وہ اور سعیدہ ان کی سابقہ بیوی کے علاوہ ان کو ریسیو کرنے کے لیے کوئی نہیں تھا وہ دونوں میاں بیوی خود بے حد بلکہ کسی حد تک عام لباس میں ملبوس تھے۔ گاڑی پر پہلے چکر میں شیراز اکبر، نسیم اور نزہت آئے تھے اور سعید نواز اور ان کی بیوی نے صرف انہیں ہی ریسیو کیا تھا۔ دوسرے چکر میں آنے والی شیراز کی دو بہنوں کو ریسیو کرنے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ انہیں خود شیراز ہی اندر لایا تھا اور سعید نواز اور سعیدہ انہیں دیکھ کر قدرے حیران ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شاید صرف اکبر، نسیم اور نزہت ہی رسم کے لیے آئے تھے۔

سعید نواز اور سعیدہ اگر شیراز اور اس کے گھر والوں کے لباس کیلئے ملبوسات دیکھ کر حیران ہو رہے تھے تو دوسری طرف شیراز کے گھر والے خاص طور پر اکبر اور نسیم سعیدہ کے سلیولیس بازوؤں والی شرٹ اور ٹراؤزر نما پاجامے کو دیکھ کر اسی طرح ہکا بکا نظر آ رہے تھے۔ باقی کی کسر اس گھر اس کے ڈرائنگ اور ڈائننگ روم میں نظر آنے والے سامان کو دیکھ کر پوری ہو گئی تھی۔ شیراز کے گھر والے سعید نواز اور سعیدہ سے باتیں کم کر رہے تھے اور کمرے میں رکھے سامان کو زیادہ گھور رہے تھے۔ نتیجتاً سعید نواز اور سعیدہ کی زیادہ تر گفتگو شیراز سے ہی ہوتی رہی جو دونوں خاندانوں کے درمیان اس قدر نمایاں فرق کو ہر طرح سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ ڈنر جو کسی دوسری فیملی کے انوائٹ کیے جانے پر بہت دیر بعد شروع ہوتا، وہ سعید نواز نے شیراز کی فیملی کے آنے کے پندرہ منٹ بعد ہی سرو کرنے کا کہہ دیا تھا۔

"لیکن بھائی صاحب! پہلے آپ بچی کو بلوا لیتے اور ہم لوگ رسم کر لیتے تو اچھا تھا۔" نسیم نے کہا تھا۔

"شینا ابھی ڈنر پر ہمیں جوائن کرے گی اور رسم کی کوئی بات نہیں، اتنی فارمیلٹیز کی ضرورت نہیں ہے۔ بس دونوں خاندانوں کے درمیان بات طے ہو گئی یہ کافی ہے" سعید نواز نے ہنستے ہوئے انہیں ڈائننگ ٹیبل کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

ڈائننگ ٹیبل پر سب کے بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی شینا بالآخر آ گئی تھی۔ نسیم اور شیراز کی بہنوں کو لڑکی کی شکل و صورت کے بارے میں جو خدشات پچھلے کئی دنوں سے ستا رہے تھے وہ یک دم غائب ہو گئے تھے۔ شینا زینی جیسی خوبصورت بے شک نہ سہی مگر خوبصورت تھی اور اس کے انداز اور حلیے نے اسے بے حد اٹریکٹو بنا دیا تھا۔

واحد جھٹکا جو نسیم کو اسے دیکھ کر لگا تھا، وہ اس کا جینز اور ایک مختصر سی شرٹ میں ملبوس ہونا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ وہ باقاعدہ طور پر کسی دلہن کے حلیے میں دوپٹہ سے سر ڈھانپے ان کے سامنے نمودار ہو گی اور وہ پھر رسم کریں گے۔ یہاں شینا ہیلو کہہ کر نسیم کے بالمقابل ٹیبل کے دوسرے طرف اپنی ماں کے برابر میں بیٹھ گئی تھی۔ سعید نواز اب شینا سے شیراز اور اس کی فیملی اس کا تعارف کروا رہے تھے۔ اور اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ باری باری ان سب چہروں کو دیکھا تھا جو اس کے آنے کے بعد سے مسلسل اسے گھور رہے تھے یا شاید اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شینا فوری طور پر دونوں میں تفریق نہیں کر سکی۔

نسیم نے "ماشاءاللہ" کہتے ہوئے بالآخر شینا کی تعریف کی تھی جس پر شینا نے ایک اور اچٹتی سی نظر ان پر ڈالی۔ ملازم اب کھانا سرو کر رہے تھے۔ اور میز پر پڑی آدھی سے زیادہ ڈشز کو شیراز کا خاندان پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہی حالت ٹیبل پر پڑی کراکری اور کٹلری کی تھی۔ شیراز کے علاوہ ان

میں سے کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ کون سے برتن کا صحیح مصرف کیا تھا۔ نتیجہ اتنا ہی برا نکلا جتنا شیراز کو خوف تھا۔

اس کے باپ اور ایک چھوٹی بہن نے سوپ کے لیے رکھے ہوئے پیالوں میں سوپ سرو کیے جانے کا انتظار کرنے سے پہلے ہی چکن کری کا سالن ڈال لیا تھا۔ نزہت اور دوسری بہن نے ملازم کے سوپ سرو کرنے پر سوپ پیالے میں تو ڈال لیا تھا مگر اسے یخنی سمجھ کر چپاتی کے ٹکڑے اس میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ تھائی سوپ تھا۔

نسیم نے سوپ پیالے میں ڈال لیا تھا۔ مگر اسے چھوڑ کر اس نے ''چکن فرائیڈ رائس'' اپنی پلیٹ میں ڈالے اور پھر ٹیبل پر پڑی خشک بھنی ہوئی ''دال'' کو ان چاولوں پر ڈال کر وہ ہمیشہ کی طرح اپنے ہاتھوں سے چاول کھانے لگی۔ اس نے ہمیشہ چاول ہاتھ سے ہی کھائے تھے۔ چمچ کا استعمال اس نے اپنے گھر میں کبھی نہیں کیا تھا تو یہاں کس طرح کرتیں۔ سعید نواز اور سعیدہ نے کمال تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر شیراز کے گھر والوں کی بدحواسیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کیا اور یوں ظاہر کیا جیسے انہوں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ وہ مسلسل شیراز سے باتیں کرتے رہے۔

دو دفعہ ٹیبل پر وائن گلاس میں سرو کیا ہوا مشروب باری باری میز پر گرا۔ پہلی بار اکبر سے، دوسری بار نزہت سے۔ چمچ سے چاول کھانے کی کوشش میں کانٹا استعمال نہ کرنے کی وجہ سے ہر ایک کی پلیٹ کے ارد گرد چاولوں کی ایک چھوٹی دیوار بن گئی تھی۔ صرف نسیم کی پلیٹ کے گرد ایسا نہیں تھا کیونکہ وہ ہاتھ سے لقمے لے رہی تھی۔ اس رات اکبر نے ''چکن چلی ڈرائی'' کو چپاتی کے ساتھ کھایا۔ نزہت نے چکن پائن ایپل میں سے پائن ایپل کے ٹکڑے مربہ سمجھ کر نکال دیے جبکہ شبانہ نے چکن آمنڈ میں سے صرف بادام ہی چن کر کھائے۔ صرف اتنا ہی نہیں تھا ان سب نے آخر میں گرین ٹی کے قہوے کے لیے دودھ منگوا کر پہلی بار ملازموں کو بھی حواس باختہ کیا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل کا ماحول اتنا فارمل تھا کہ ان میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ وہ میز پر پڑی ڈشز کا نام یا کھائے جانے کا طریقہ بھی پوچھنے کی ہمت کر سکتے۔ وہ صرف جلد از جلد کھا پی کر اس مشکل مرحلے سے گزر جانا چاہتے تھے۔

ٹیبل پر صرف شینا تھی جو بالکل خاموشی سے ان سب لوگوں کو کھانا کھاتے ہوئے بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ بے حد ''سنجیدہ'' تھی اور صرف شیراز تھا جو اب ان سب کو کسے وہاں لے آنے پر ''شرمندہ'' تھا۔

کھانے کے فوراً بعد واپس ڈرائنگ روم میں آنے پر منگنی کی مختصر رسم ہوئی۔ نسیم نے شینا کو وہ انگوٹھی پہنانے کی کوشش کی جو وہ ساتھ لے کر آئی تھیں مگر سعید نواز اور سعیدہ نے انہیں منع کر دیا۔

''ہمارے یہاں انگوٹھیوں وغیرہ کا تبادلہ نہیں ہوتا، صرف بات طے ہوتی ہے۔ یہ انگوٹھی ہماری طرف سے آپ رکھ لیں۔''

سعیدہ نے کہا تھا۔ انہوں نے منگنی کا وہ دوسرا سامان بھی یہی کہہ کر نہیں رکھا تھا جو شیراز کے گھر والے لائے تھے۔ صرف وہ پانچ ہزار روپیہ لے لیا تھا جو اکبر شینا کو دینا چاہتا تھا۔ شینا مزید نہیں رکی، وہ فوراً اٹھ کر چلی گئی۔

جبکہ سعید نواز نے شیراز اور اس کے گھر والوں کو رخصت کرتے ہوئے ایک بار پھر تحائف اور سامان کا ایک انبار ان کے ساتھ کر دیا تھا۔

واپسی پر سعید نواز نے اپنی ایک گاڑی کے دو چکر لگوانے کے بجائے اپنی دو گاڑیوں میں انہیں گھر بھجوایا تھا۔

وہ رات شیراز کے گھر والوں کی زندگی کی سنہری راتوں میں سے ایک تھی۔ ان سب کو شینا کا گھر اور ماں باپ دونوں بہت اچھے لگے تھے اور اس سے بھی بڑھ کر شینا کی سادگی اور خاموشی اچھی لگی تھی۔ شیراز فخریہ انداز میں شینا اور سعید نواز کی یہ تعریفیں یوں سن رہا تھا جیسے وہ واقعی اسی کی دریافت تھے۔ کچھ گھنٹوں پہلے کی شرمندگی کا اب کہیں نام و نشان بھی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

''بہت اچھے لوگ ہیں لڑکا ابھی جونیئر کلرک بھرتی ہوا ہے ہمارے ہی محکمہ میں۔ خالد صاحب تو بہت ہی شریف آدمی ہیں۔ بیٹا بھی ان جیسا ہی ہے۔ زینی کے بارے میں سن کر بہت تسلی دی مجھے پھر آج رشتہ کی بات کی۔ کہہ رہے تھے کہ میں نے اگر پہلے زینی کا رشتہ نہ کر دیا ہوتا تو وہ پہلے ہی زینی کے سلسلے میں مجھ سے بات کرتے۔ پچھلے سال جب گھر آئے تھے تو زینی سے ملے تھے۔ بہت خوش ہوئے تھے۔''

ضیا بے حد خوشی اور جوش کے عالم میں نفیسہ کو بتا رہے تھے۔ آج منگنی ٹوٹنے کے بعد پہلی بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ اور خوشی تھی۔

''دیکھو، میرا مولا کتنا رحیم ہے۔ ایک دروازہ بند کیا ہے تو فوراً ہی دوسرا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس نے۔ میں تو ابھی شکرانے کے نفل ادا کروں گا مسجد جا کر کہ اس نے مجھے اور میری بچی کو اس تکلیف سے نجات دی۔''

نفیسہ بھی بے حد خوشی سے ان کی بات سن رہی تھی۔ ضیا کے اس دفتر کے کولیگ اور دوست کو وہ بہت عرصے سے جانتی تھیں۔ انہوں نے ضیا سے ان کا کافی ذکر سنا تھا۔ وہ واقعی ان ہی کی طرح کے شریف لوگ تھے اور اب ان حالات میں چند ہفتوں میں ہی اس رشتہ کا آ جانا ان کے لیے معجزے سے کم نہیں تھا۔ شیراز اور اس کے گھر والے زینب کے کردار پر اتنا کیچڑ نہ اچھالتے تو خالی منگنی ٹوٹنے کی صورت میں خاندان اور محلے کے کئی گھر زینب کے رشتے کے خواہش مند ہوتے۔ اس کی خوبصورتی کی وجہ سے لیکن اب جو حالات ہو چکے تھے۔ ان میں ایسا اچھا رشتہ آ جانا ان کے لیے واقعی رحمت کی طرح تھا۔

وہ دونوں صحن میں بیٹھے یہ باتیں کرتے ہوئے یہ نہیں جانتے تھے کہ زینب نے ان کی گفتگو سن لی تھی۔ ایک آتش فشاں تھا جو اس نے ماں باپ کے خلاف اپنے اندر پھٹتے محسوس کیا۔ آخر کتنے دن ہوئے تھے اس کی منگنی ختم ہوئے؟ اور کتنی آسانی سے شیراز کی جگہ کسی دوسرے کی بات کرنے لگے تھے وہ دونوں اس سے پوچھے بغیر۔ یوں جیسے وہ جانور تھی یا کوئی بے جان شے۔

''اس گھر میں میرے لیے اب کوئی نہ آئے اور اگر آئے گا بھی تو میں کسی کے سامنے نہیں آؤں گی۔''

اس کی چپ بالآخر ٹوٹ گئی تھی۔ اتنے دنوں میں پہلی بار زینب نے باپ کو مخاطب کیا تھا۔ وہ ضیا اور نفیسہ کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ زندگی میں کبھی اس طرح وہ ماں باپ کے سامنے کھڑے نہیں ہوئی تھی۔

ضیا اور نفیسہ کے چہرے پر جھلکنے والی خوشی یک دم غائب ہو گئی۔

''تم اندر جاؤ زینی! میں آ کر تم سے بات کرتی ہوں۔'' نفیسہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں اندر نہیں جاؤں گی، جو بات ہوگی، یہیں ہوگی۔'' اس نے تندی سے کہا ضیا گنگ اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"اب شیراز کے لیے ہم نے تم کو بٹھائے تو نہیں رکھنا۔ کہیں نہ کہیں بیاہنا تو ہے۔" نفیسہ کو غصہ آ گیا۔

"میں ساری عمر شیراز کے نام پر بیٹھ سکتی ہوں۔" زینی نے تند آواز میں کہا۔

"جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس..." زینی نے ماں کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"جو کچھ ہوا، وہ شیراز کا قصور نہیں تھا۔ شیراز نے کیا کیا ہے؟"

"یہ رشتہ..."

زینی نے ایک بار پھر نفیسہ کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"میں اب کسی سے شادی نہیں کروں گی۔"

"زینی! میں تمہارا باپ ہوں۔ تمہارے بھلے..." ضیا نے اس دوران پہلی دفعہ کچھ کہنے کی کوشش کی۔ زینی نے ان کی بات بھی کاٹ دی۔

"کیسا بھلا...؟ کون سا بھلا...؟ بھلا تو آپ صرف زہرہ آپا کا کرتے رہے میرے لیے کیا کیا آپ نے؟ میری تو زندگی تباہ کر دی آپ نے۔"

"باپ سے اس طرح بات کرتے ہیں۔" نفیسہ نے بے حد غصے سے اسے ٹوکا مگر ضیا نے انہیں روک دیا۔

"کہنے دو اسے۔ یہ بولے گی تو اس کے دل کا غبار اور بوجھ کم ہو جائے گا۔"

"کوئی بوجھ، کوئی غبار نہیں میرے دل پر۔ صرف حقیقت ہے۔ آخر آپ نے زینی کے لیے کیا کیا؟ آپ کو صرف اپنی عزت پیاری تھی، اس لیے آپ شیراز کے سامنے نہیں جھکے۔ آپ اس سے نہیں ملے، اس سے بات کرنے کی کوشش کے بجائے آپ میرے لیے رشتے ڈھونڈ رہے ہیں۔ زہرہ آپا کی طرح مجھ پر ترس کیوں نہیں آیا آپ کو؟ کتنی منتیں کی تھیں میں نے آپ کی۔"

وہ بے حد تلخ لہجے میں بولتی جا رہی تھی۔ اس کے اندر کا زہر باہر نکل رہا تھا۔

"شیراز برا ہوتا تو وہ یہ سب کچھ آپ سے کہتا، مجھ سے کہتا۔ اس نے تو کچھ نہیں کہا۔ کوئی ایک بات بھی نہیں کی۔ وہ ناراض ہی ہوتا اور آپ کی جگہ جو باپ اپنی بیٹی سے واقعی محبت کرتا وہ اس کے پیچھے جاتا اس سے ملتا۔ اس کو مناتا۔"

"تم سمجھتی ہو، میں اس کے پاس نہیں گیا۔" زینی کو یک دم جھٹکا لگا تھا۔ وہ بات کرنا بھول گئی تھی۔

ضیا نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "گیا تھا اس کے پاس۔ تمہارے لیے گیا تھا۔ اس کو وضاحت دینے اور صفائی پیش کرنے۔"

"آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" زینی کی زبان پہلی بار لڑکھڑانے لگی تھی۔

"کیا بتاتا کہ اس کو اب تمہارے باپ کی چادر میں لگے پیوند نظر آنے لگے ہیں۔ وہ وہاں اکیڈمی میں بیٹھ کر ان چیزوں کو گننے لگا ہے جو اسے میری بیٹی سے شادی کر کے نہیں مل سکتی تھیں۔"

''آپ کو کوئی غلط فہمی۔۔۔'' زیبی نے رکے ہوئے سانس کے ساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''میں نے بھی اپنے آپ سے یہی کہا تھا کہ جو کچھ میں نے شیراز کی زبان سے سنا، وہ میرے کانوں کا دھوکا ہے۔ لیکن اس کی آواز کی گونج ابھی تک ہلکی نہیں ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا آپ کی بیٹی ''جہیز'' کے نام پر کچھ نہیں لائے گی مگر کم از کم ''عزت'' تو لے کر آئے۔''

زیبی کو لگا کسی نے بھرے بازار میں اس کے سر سے چادر کھینچ کر اتار دی ہو۔ بے حس و حرکت وہ باپ کو دیکھتی رہی۔ پلکیں جھپکائے بغیر سانس لیے بغیر۔

خاموشی کا ایک لمبا طویل وقفہ اس کے اور ضیا کے بیچ آیا تھا۔ خاموشی، خاموشی، خاموشی لگتا تھا ساری کائنات ساکت ہو گئی تھی۔

پھر زیبی نے بالآخر کہا۔

''میں یقین نہیں کر سکتی۔'' اس کی آواز بے حد مستحکم تھی مگر وہ اس ایک جملے کے بعد وہاں ٹھہری نہیں تھی، وہ یک دم پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

ضیا کو لگا، ان کی چہیتی اولاد انہیں ''جھوٹا'' کہہ گئی تھی۔

☆☆☆

''میری بیٹی بہت لگژریز کی عادی ہے۔'' گالف کورس پر اس کے ساتھ گیند کے تعاقب میں جاتے ہوئے سعید نواز شیراز سے کہہ رہے تھے۔ جو بے حد فرماں برداری اور تابع داری سے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''تمہیں تو ہمارے لائف اسٹائل سے پتا چل ہی گیا ہو گا کہ شینا کو کس طرح کی زندگی گزارنے کی عادت ہے۔''

''جی!'' شیراز نے اپنا پسندیدہ جواب دیا۔

''شینا کو کسی اور چیز پر اعتراض نہیں ہے سوائے اس محلے کے جس میں تم رہتے ہو۔'' شیراز کا دل چاہا، وہ خود اپنے محلے کو جا کر آگ لگا دے۔ اسے شینا سے ''زیادہ'' اپنے محلے پر ''اعتراض'' تھا۔

''اسی لیے میں سوچ رہا تھا کہ شینا کو اپنا ایک بنگلہ شادی پر گفٹ کر دوں۔''

شیراز اس بار ''جی'' بھی نہیں کہہ سکا۔ خوشی سے جیسے اس کی آواز ہی بند ہو گئی تھی۔ آخر اس نے یہ کہاں سوچا تھا کہ شادی پر شینا کو جہیز میں ''گھر'' ملے گا۔

سعید نواز اب شیراز کو ڈیفنس کا وہ فیز بتا رہے تھے۔ جہاں ان کا وہ بنگلہ تھا اور شیراز سابقہ دن کے اخبار میں ڈیفنس کے گھروں کی قیمتوں کو ذہن میں دہرانے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے اتفاقاً ہی دیکھی تھی۔

''تمہیں سرکاری گھر تو ملے گا مگر ایک جونیئر آفیسر کو جس طرح کا گھر ملے گا، اس میں شینا تو کبھی نہیں رہے گی، اسی لیے میں سوچ رہا تھا کہ تم لوگ اس گھر میں شفٹ ہو جاؤ۔ تم ایک دو دن میں فارغ ہو کر وہاں جاؤ اور دیکھو۔ اگر کچھ آرائش اور مرمت کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ۔ شینا سے

بھی کہوں گا کہ وہ بھی وہاں ایک چکر لگائے اور ہاں، تم اپنے لیے گاڑی بھی پسند کر کے بک کروا دو۔ یہ تمہارے لیے شادی کا تحفہ ہوگا۔'' وہ اس بار پھر جی کہنا چاہتا تھا، ایک بار پھر جی نہیں کہہ سکا۔

''جس شوروم سے میں اور شینا گاڑی وغیرہ خریدتے اور بدلتے رہتے ہیں، وہاں کل ڈرائیور کے ساتھ تمہیں بھجوا دوں گا۔''

سعید نواز گالف کورس پر ہول کے آس پاس کے علاقے میں گیند تلاش کر رہے تھے۔ شیراز کو لمبی گھاس میں گیند نظر آ گئی تھی۔ وہ اس وقت جس ممنونیت اور مرعوبیت کی گرفت میں تھا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کتے کی طرح بھاگتا ہوا جائے اور اپنے منہ میں گیند دبائے لا کر سعید نواز کے قدموں پر رکھ دے۔ صرف اتنا ہی نہیں وہ اپنی زبان سے ان کے پیروں کو بھی چاٹنا چاہتا تھا۔ اس کے اپنے باپ نے ستائیس سال میں اس کے لیے وہ سب کچھ نہیں کیا تھا جو یہ شخص سات دن میں کر رہا تھا۔ شینا سے اس کے عشق میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ اپنے دل میں عزم کر رہا تھا وہ ساری عمر شینا کو سر پر بٹھا کر رکھے گا۔ کبھی اس سے ناراض نہیں ہوگا۔ کبھی کوئی سخت لفظ نہیں کہے گا۔ کبھی شینا سے کوئی کام نہیں لے گا۔ کبھی شینا پر کوئی پابندی نہیں لگائے گا۔ کبھی شینا کو کسی کام سے نہیں روکے گا۔ ہمیشہ اس کا بہت خیال رکھے گا۔ پوری تنخواہ لا کر اسے دے دیا کرے گا۔ پھر اسی سے اپنے اخراجات کے لیے پیسے لیا کرے گا اس کی سالگرہ اور ویڈنگ اینورسری ہمیشہ یاد رکھا کرے گا۔ اسے وقتاً فوقتاً تحائف دیتا رہے گا۔ اس کے لیے پھول لایا کرے گا۔

گیند کی طرف جاتے ہوئے وہ بے حد جذباتی انداز میں ان ممکنہ تمام اقدامات کو طے کر رہا تھا جو اسے کرنا تھے اور ابھی وہ ڈیئر، ڈارلنگ، سویٹی، جان ہنی میں سے اس نام کا انتخاب کر رہا تھا جس سے وہ مستقبل میں شینا کو مستقل مخاطب کرنا چاہتا تھا، جبکہ سعید نواز نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

''اور شیراز! میں چاہتا ہوں۔ شادی بہت مختصر اور سادہ سی ہو۔ صرف تمہارے اور میرے گھر والے اس میں شامل ہوں۔ میں بے حد سادہ اور پرانے خیالات کا آدمی ہوں اور شینا بھی ایسی ہی سوچ رکھتی ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ دونوں خاندان کسی قسم کی فضولیات میں نہ پڑیں۔'' سعید نواز نے جیسے شیراز کی آخری مشکل بھی آسان کر دی تھی۔

''جی ..... جی۔ جی ..... میں بالکل متفق ہوں آپ ٹھیک کہتے ہیں انکل!'' شیراز خود بھی ایسی کوئی تقریب منعقد نہیں کروانا چاہتا تھا جس میں اتنی مشکل سے چھپایا ہوا اس کا خاندان اور خاندانی بیک گراؤنڈ منٹوں میں بیوروکریسی کے جم غفیر میں اسے زیر کر دیتے۔ اسے ابھی منگنی کا احوال ازبر تھا۔

''جیسے ہی تمہاری ٹریننگ ختم ہوتی ہے، ہم ایک سادہ سی تقریب میں شینا اور تمہاری شادی کر دیں گے۔'' سعید نواز نے اس کے رسپانس سے بے حد خوش ہوتے ہوئے جیسے فیصلہ سنایا۔

''اور ایک بات اور تم نے دو چار بار شینا کو گھر پر کال کی ہے۔ شینا نے مجھ سے ذکر کیا۔ بیٹا! میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں بہت پرانے خیالات کا مالک ہوں اور خود شینا بھی ان چیزوں کو پسند نہیں کرتی۔''

شیراز کے ماتھے پر شرمندگی سے پسینہ آ گیا۔ سعید نواز کا لہجہ بے حد نرم مگر دو ٹوک تھا۔ وہ ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکا کہ شینا سے بات کرنے

کی ان کوششوں میں سے کسی ایک کو بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

''سوری۔''اس نے بلاآخر''جی'' کے علاوہ کچھ کہا۔ وہ اس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ مستقبل میں اس کا دوسرا پسندیدہ ترین جواب بننے والا تھا۔

سعید نواز نے مسکراتے ہوئے اس کی پشت تھپتھپائی اور گیند کے پاس پہنچ گئے۔

☆☆☆

''تمہیں کچھ پتا چلا نفیسہ؟ شیراز کی منگنی ہوگئی ہے۔'' زینی کے ہاتھ میں پکڑا شیشے کا گلاس بے اختیار ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا۔ ربیعہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

صحن میں محلے کی عورت نفیسہ سے بات کر رہی تھی۔ زینی بالکل ساکت فرش پر پھیلی گلاس کی کرچیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ بے حس و حرکت، یوں جیسے ایک پل میں وہ پتھر کا مجسمہ بن گئی ہو۔ فوری طور پر ربیعہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے یا اس سے کیا کہے۔

''ابھی نسیم سب سے چھپا رہی ہے، مجھ سے بھی کہہ رہی تھی کہ میں کسی کو نہ بتاؤں مگر خود وہ اور اس کی بیٹیاں خوشی سے بے حال ہو رہی تھیں۔ کسی انکم ٹیکس کمشنر کی اکلوتی بیٹی ہے۔ کروڑوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث۔''

زینی نہیں جانتی تھی کہ اس آواز میں زیادہ چبھن تھی یا گلاس کے ٹکڑوں میں جو بے احتیاطی سے ایک قدم اٹھانے پر اس کے پاؤں زخمی کر دیتے۔

''بات طے ہونے پر شیراز کے ہاتھ پر ایک لاکھ روپیہ رکھ کر گئے ہیں۔ مجھے یقین تو نہیں آیا تھا مگر جو سامان اس نے منگنی کا مجھے دکھایا، مجھے یقین کرنا ہی پڑا۔ نسیم کو سونے کا سیٹ دیا ہے، بہت وزنی۔ اس کی تینوں بیٹیوں کو بھی سونے کے جھمکے دیے ہیں۔ ساتھ سب لوگوں کو پانچ پانچ سوٹ۔ پھلوں کی پیٹیاں تو میں نے خود دیکھی ہیں۔ سمجھو پورا ڈھیر ہے ان پیٹیوں کا ان کے گھر۔ مجھے بھی ان ہی میں سے پھل کھلایا اس نے۔

''اوکے... تمہاری ترجیح کیا ہوگی۔ ایک خوبصورت عورت ان تمام خصوصیت کے ساتھ یا ایک خوبصورت عورت کروڑوں کیش کے ساتھ۔''

کوئی آواز زینی کے ذہن میں لہرائی تھی۔ دھوکا... خوش فہمی... وہ چند لمحے پہلے جانتی تھی کہ شیراز نے کس عورت کو ترجیح دی ہوگی۔

کیا بے یقینی سی بے یقینی تھی یا خود فریبی سی خود فریبی جس کا وہ شکار تھی۔

''نسیم بتا رہی تھی، شیراز کی بیوی کو جہیز میں بنگلہ ملنے والا ہے۔ اور وہ سب لوگ اس میں شفٹ ہو جائیں گے۔ کہہ رہی تھی۔ شیراز کے لیے گاڑی بھی بک کروادی ہے ان لوگوں نے۔''

''وہاں بیٹھ کر وہ ان چیزوں کو گننے لگ گیا تھا جو اسے میری بیٹی سے شادی کر کے نہیں ملنی تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا۔ آپ کی بیٹی جہیز کے نام پر کچھ نہیں لائے گی مگر کم از کم ''عزت'' تو لے کر آئے۔''

پسینہ کی دھار زینی کی کنپٹی سے نیچے بہنے لگی تھی۔ اس نے باپ سے کہا تھا ''اسے یقین نہیں ہے۔'' لیکن اس رات بھی ان لفظوں کو سن کر اس کے اندر ایسی ہی توڑ پھوڑ ہوئی تھی جیسی اب ہو رہی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ باپ کی بات پر یقین نہ کرتی۔ وہ باپ کو جانتی نہ ہوتی تو اس پر یقین نہ کرتی مگر وہ باپ کو ''جانتی'' تھی۔ اسے ''یقین'' آ گیا تھا کہ شیراز نے یہ سب کچھ کہا ہوگا مگر ''اعتبار'' نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کہہ سکتا تھا۔ آخر

کیسے ....؟ کیسے ....؟ کیوں ....؟ کس لیے .... ؟

”تسیم یہ بھی بتا رہی تھی کہ لڑکی بڑی خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے۔ بڑی ماڈرن ہے۔ کہہ رہی تھی کہ شیراز کو بہت پسند کرتی ہے وہ لڑکی اور اس کا باپ ... اسی لیے رشتہ کر رہے ہیں۔“

”دیکھ کر زینی! پاؤں میں جوتا نہیں ہے۔ تمہارے پاؤں زخمی ہو جائیں گے۔“

اس نے قدم اٹھایا تو ربیعہ نے بے اختیار اسے روکا۔ چند لمحوں کے لیے وہاں کھڑی زینی کو لگا اس کا اپنا وجود اس کے جسم سے الگ ہو گیا تھا۔ زینب ضیا کے منہ پر جیسے کسی نے ساری دنیا کی کالک مل دی تھی۔ کس نے ... ؟ شیراز نے ... ؟

بے عزتی وہ نہیں تھی جو شیراز کے رقعہ پکڑنے پر ہوئی تھی۔ تحقیر وہ نہیں تھی جو اس کے گھر کا دروازہ نہ کھلنے پر ہوئی تھی۔ تذلیل تو یہ تھی جو اس کے انتخاب اور ترجیح نے کی تھی۔ سونے کے زیورات، کپڑے، پیسہ، پھلوں کی پیٹیاں، گاڑی، بنگلے کے لیے اس نے زینی کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کی محبت، خلوص، وفاداری، اطاعت، حیا، پارسائی، شرافت میں سے کوئی ایک شے بھی ایسی نہیں تھی۔ جس کے دنیا کے اس بازار میں کوئی دام لگتے۔ وہ دام جو زینی کو انمول بنا دیتے۔ آخر تھا ہی کیا زینب ضیا میں ... ؟

ایک آگ تھی جس کے شعلوں نے زینی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تو شیراز کو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی اسے موقع ملا تھا، سنہری موقع کہ وہ میرے منہ پر کالک ملے اور مجھ سے جان چھڑا لے۔ میری عزت جیسے دو کوڑی کی بھی نہیں تھی۔ واقعی مجھے تو اس نے دو کوڑی جیسی اہمیت بھی نہیں دی۔

اس کا دل چاہا، وہ بے اختیار ہنس پڑے۔

میرے خدا ... میں ایک بار بھی شیراز کا اصلی چہرہ نہیں پہچان سکی۔ اتنے موقع ... اتنے موقع آئے ... پھر بھی نہیں ... مجھے یہ گمان کیوں تھا کہ وہ بھی میرے عشق میں اسی طرح پاگل ہے جیسے میں تھی۔

”زینی! احتیاط سے ... میں کہہ رہی تھی، پاؤں میں شیشہ نہ لگ جائے؟“ ربیعہ نے بے حد تشویش سے کہا۔ زینی کا اگلا قدم واقعی شیشے پر پڑا تھا اور ربیعہ نے خون نکلتے دیکھ لیا تھا۔

”ذرا پاؤں دکھاؤ، دیکھوں زیادہ تو نہیں ...“

ربیعہ نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں کو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اسے پتا تھا زینی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، وہ پاؤں پکڑ کر بیٹھ جاتی اور روتے ہوئے کراہتی رہتی پر اب ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

ربیعہ کے پاؤں پر ہاتھ رکھنے سے پہلے ہی زینی نے زخمی پاؤں کو اٹھایا اور پھر کسی احتیاط کے بغیر بے حد تیزی سے پاؤں میں کھبا ہوا شیشے کا ٹکڑا ایک ہی جھٹکے سے کھینچ کر نکالا اور ایک طرف پھینک دیا اور بغیر کسی لڑکھڑاہٹ کے تیزی سے چلتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی۔ ربیعہ بے حد حواس باختگی اور بے یقینی سے کچن کے فرش پر خون کے نشان دیکھتی رہی، جو زینی کے پاؤں چھوڑ کر گئے تھے۔

☆☆☆

ضیا نے گھر میں داخل ہونے پر بے یقینی سے زینی کو دیکھا۔ دروازہ اسی نے کھولا تھا اور سلام بھی کیا تھا۔ یہ کئی ہفتوں کے بعد پہلی بار ہوا تھا۔
وہ کچھ دیر بعد ہمیشہ کی طرح ان کے لیے پانی کا گلاس بھی لے کر آ گئی۔ ضیا نے بغور اس کا چہرہ دیکھا، وہ بے حد کمزور اور زرد نظر آ رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے گرد حلقے بھی پڑے ہوئے تھے، مگر اس کے چہرے کے گرد بے حد سکون اور اطمینان تھا جو انہوں نے کتنے دن بعد آج پہلی بار دیکھا تھا۔
''پاؤں کو کیا ہوا؟'' ضیا نے اس کے پاؤں کے گرد بندھی پٹی دیکھ کر کہا۔
''کچھ نہیں، معمولی چوٹ لگ گئی۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ پہلے وہ باپ کو چوٹ کی تفصیل سنانے بیٹھ جاتی تھی۔ انگلی میں ایک معمولی سوئی لگنے پر بھی زینی کئی دن اپنی انگلی پکڑے بیٹھی رہتی۔ ساتھ ضیاء کو روز درد میں کمی بیشی کے بارے میں بتاتی رہتی۔ بعض دفعہ ضیا کو ان معمولی چوٹوں پر اس کی تکلیف، سنجیدگی، پریشانی اور تفصیل پر ہنسی بھی آ جاتی تھی مگر وہ زینی تھی جس کی ہر بات سننا اور اس پر سر ہلانا ضیا کی جیسے عادت بن گئی تھی۔
اب وہ بھی توقع کر رہے تھے کہ وہ انہیں کچھ اور بتائے گی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ پانی کا خالی گلاس لیکر وہ واپس چلی گئی۔
''آج تو زینی بالکل ٹھیک لگ رہی ہے۔'' ضیاء نے نفیسہ سے کہا۔
''ہاں، آج ماشاء اللہ اسی طرح کام کرتی پھر رہی ہے۔ کھانا بھی پکایا تھا۔ کئی ہفتوں کے بعد ساری نمازیں پڑھی ہیں۔'' نفیسہ نے پاس بیٹھے ہوئے کہا۔ ''ورنہ میں تو بے حد پریشان ہو رہی تھی کہ اب پتا نہیں وہ کیا کرے گی۔''
''کیوں؟''
''شیراز کی منگنی ہو گئی ہے۔''
ضیا ان کے انکشاف پر چونکے نہیں۔ وہ جانتے تھے، جلدی یا بدیر یہ ہونا ہی تھا مگر زینی کے ردعمل نے انہیں بے حد مطمئن کر دیا تھا۔
نفیسہ اس عورت سے معلوم ہونے والی باتیں انہیں بتاتی رہیں۔
''یہی ہونا تھا، منگنی اسی لیے توڑی تھی انہوں نے۔ اچھا ہوا، ان کا اصل رخ پہلے ہی ہمارے سامنے آ گیا اور میری بیٹی ماشاء اللہ اسی طرح ٹھیک رہے تو مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ وہ جہاں چاہے اپنے بیٹے کو بیاہ دیں۔''
ضیا اس دن زینی کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر بے حد مسرور ہو رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ ان کے کندھوں سے کوئی بوجھ ہٹ گیا۔
''کچھ دن گزر جائیں تو پھر میں دوبارہ خالدہ سے رشتے کی بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے، اب زینی کوئی اعتراض نہیں کرے گی۔'' ضیا نے اسے کھانا لاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

☆☆☆

نفیسہ نے ٹھیک کہا تھا۔ زینی واقعی نارمل ہو گئی تھی۔ وہ اس رات ضیا سے پہلے تہجد پڑھنے کے لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ ضیا نے بے حد خوشی سے اسے تہجد کے بعد باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ کئی ہفتوں سے زینی کے ٹھیک ہونے کی دعا کر رہے تھے اور ان کی دعائیں بالآخر رنگ لا رہی تھیں۔

کئی ہفتوں کے بعد اس نے باپ کو وضو کروایا پھر ہمیشہ کی طرح ان کے پاس بیٹھ گئی۔ انہوں نے سلام پھیرا تو اس نے کہا۔

"میرے لیے دعا کریں ابو!" ضیا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بے حد پرسکون اور سنجیدہ تھی۔

"میں تو پہلے ہی بہت دعائیں کرتا ہوں اپنی زینی کے لیے۔" ضیا نے ہمیشہ کی طرح اسے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"بہت نہ کریں، صرف ایک دعا کریں۔" زینی نے اسی پرسکون انداز میں کہا۔

"کیا؟" ضیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میں جلدی مر جاؤں۔" ضیا لرز گئے تھے۔

"زینی۔"

"نہیں مروں گی تو آپ کے لیے بہت مسئلہ ہوگا، اس لیے آپ دعا کریں کہ زینی جتنی جلدی مر سکتی ہے، مر جائے۔"

وہ بے حد پرسکون انداز میں ان کے ہاتھ میں ایک تسبیح دے کر کھڑی ہوگئی وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر اٹھائے اسے دیکھتے رہے۔

ایک عجیب سا خوف ان کے اندر پیدا ہوا تھا۔

"زینی! کوئی غلط کام نہ کرنا۔" وہ خود بھی نہیں جانتے تھے، وہ اس سے کس غلط کام کا کہہ رہے تھے۔

"نہیں ابو! کوئی "غلط کام" نہیں کروں گی۔ اب میں ہر کام بالکل "ٹھیک" کروں گی جیسے کہ اس کو ہونا چاہیے۔

اس نے اسی پرسکون انداز میں کہا پھر اندر چلی گئی۔ ضیا نے گردن موڑ کر اسے اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ انہیں ایک عجیب سی بے چینی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ربیعہ نے خوشگوار حیرت سے صبح صبح زینی کو کالج جانے کے لیے تیار ہوتے دیکھا۔

"تم کالج جا رہی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ اور بیگ بند کرتے ہوئے اس کی طرف مڑی۔

"کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس؟" اس نے ربیعہ سے پوچھا۔

"کتنے؟"

"جتنے بھی دے سکو، دے دو۔"

"تم کیا کرو گی اتنے پیسوں کا؟"

"پیسے دینے سے پہلے حساب لے رہی ہو؟"

اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ربیعہ اس کی بات پر قدرے شرمندہ ہوگئی۔

"اور آج کالج سے کچھ دیر ہو جائے گی۔"

"کیوں؟" ربیعہ نے اپنے بیگ سے رقم نکالتے ہوئے کہا۔

''رمشہ کے گھر جاؤں گی۔'' زینی نے اس سے پیسے لیے اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

فاران نے بے حد حیرت سے اپنے سامنے کھڑی زینب کو دیکھا پھر یک دم اٹھ کھڑا ہو گیا۔

''زینب آپ ... ؟'' وہ توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اندر آنے والی زینب، زینب ضیاء ہو سکتی ہے۔

''پلیز بیٹھیں ؟'' زینب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ وہ رمشہ سے اس کا ایڈریس لے کر وہاں آئی تھی۔

''کیا لیں گی آپ؟'' فاران نے انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

''بہت کچھ۔'' وہ مدھم آواز میں بڑبڑائی۔

''جی ... ؟'' فاران نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

''فی الحال کچھ نہیں۔ آپ نے کچھ عرصہ پہلے رمشہ کے ذریعے مجھ تک ایک آفر پہنچائی تھی۔'' وہ فوراً موضوع پر آ گئی۔

''جس پر آپ نے بہت بری طرح ری ایکٹ کیا تھا۔'' فاران نے جتانے والے انداز میں کہا۔

''جی۔ وقت وقت کی بات ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''میں اب وہ آفر قبول کرنا چاہتی ہوں۔''

''مگر رمشہ نے تو بتایا تھا کہ کچھ عرصہ میں آپ کی شادی ہونے والی ہے۔'' فاران کو یاد آیا۔

''اب نہیں ہو رہی۔'' زینی کی مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی۔ ایک بار پھر کہیں ایک ٹیس اٹھی تھی۔

''ماڈلنگ کے ذریعے ایک سال میں کتنا پیسہ کما سکتی ہوں میں؟'' اس نے فاران کے مزید کچھ پوچھنے سے پہلے ہی موضوع بدلا۔

''It depends مگر مجھے یقین ہے کہ آپ عنقریب ایک اسٹار بن جائیں گی۔ آپ میں بہت پوٹینشل ہے۔''

''مجھے اسٹار نہیں بننا، صرف پیسہ کمانا ہے۔ یہ واحد چیز ہے جس میں مجھے دلچسپی ہے۔''

''اگر آپ کو فوری طور پر ضرورت ہے تو میں آپ کو دے سکتا ہوں آپ بعد میں مجھے واپس کر دیں۔ آخر کتنا روپیہ چاہیے آپ کو؟ دس، بیس ہزار، لاکھ دو لاکھ ...'' فاران نے بے حد لاپروائی سے کندھے جھٹک کر کہا۔ وہ زینب کی مالی حیثیت کے بارے میں جانتا تھا۔

''مجھے کروڑوں روپیہ چاہیے۔''

زینب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ فاران اس کے جملے پر چونکا۔

''ماڈلنگ کے ذریعے؟''

''کسی بھی چیز کے ذریعے۔''

فاران اس کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

سر جھکائے اس نے فرش پر نظر آنے والے پیروں کو باری باری دیکھنا شروع کیا۔ نکاح خواں، ایجاب وقبول کی عبارت سے پہلے کے چند جملے ادا کر رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے لاوا ابل پڑنے کو تیار تھا۔ وہ سارے ان لوگوں کے پاؤں تھے جو اس کے وجود کو سیڑھی بنا کر اوپر جانا چاہتے تھے۔ اس کا باپ، ماں، بہنیں۔ چند لمحوں کے لیے اسے لگا وہ سارے پیر اس کے جسم کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ ہاتھیوں کے کسی جھنڈ کی طرح اسے روندتے رگیدتے ہوئے، چند لمحوں کے لیے اسے واقعی اپنا وجود بے حد کچلا اور مسلا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جیسے گہرا سانس لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

آخر وہ کیوں ان لوگوں کے لیے سیڑھی بنے، انہیں اپنے اوپر سے گزرنے دے؟ اس نے سوچا۔ لیکن وہ کر کیا سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔

پھر اسے یک دم کسی کا خیال آیا۔ خوف کی ایک لہری اس کے جسم کے اندر سے گزری۔

”تم نے اگر ہاں کی تو میں خود کو گالی مار لوں گا۔ تمہارے گھر سے تمہاری بارات جائے گی تو میرے گھر سے میرا جنازہ۔“

اس کے کانوں میں اس کی دھمکی گونجی، اسے یقین تھا، وہ جو کہتا تھا کر گزرتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی۔ وہ اس وقت ریوالور لے کر وہیں کہیں آس پاس ہوگا۔ وہ ”ہاں“ کہتی، نکاح خواں باہر جا کر اعلان کرتا اور اس کے بعد۔۔۔

میک اپ سے پے پتے چہرے پر بھی اسے پسینے کے قطرے نمودار ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اسے باہر بیٹھے اپنے سے بائیس سال بڑے بوڑھے بے حد معمولی صورت کے اس ”امیر آدمی“ سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ جو شادی کے نام پر اس کا ”سودا“ کرنے آیا تھا۔ اسے اتنی ہی نفرت اس کمرے میں موجود اپنے ”خونی رشتوں“ سے ہوئی جن کی مرضی اور خوشی سے وہ سودا طے پایا تھا۔

ساری دنیا میں صرف ایک ہی شخص تھا جو اس سے محبت کرتا تھا اور وہ شخص اس شادی کی صورت میں اپنی جان دینے کو تیار تھا۔ اسے وہ سارے وعدے یاد آئے جو وہ چار سال سے ایک دوسرے کے ساتھ کر رہے تھے۔ سارے منصوبے، سارے خواب۔ اور اب نئی بھیانک تعبیر ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کہ وہ اسے بھی ایک خواب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک ڈراؤنا خواب۔

مووی کیمرے کی تیز روشنی جیسے اس کے چہرے کو جلا رہی تھی۔ کمرہ اس وقت لوگوں سے بری طرح بھرا ہوا تھا۔ اس کے چچی، ماموں، چچیاں، ممانیاں، محلے کی چند دوسری عورتیں ہر ایک وہاں جیسے کوئی تماشا دیکھنے کے لیے کھڑا تھا یا کم از کم وہ جس ذہنی حالت میں تھی اس کو ایسا ہی لگ رہا تھا۔

نکاح خواں اب بالآخر اس سے وہ سوال کر رہا تھا جس کے جواب کی تیاری وہ پچھلے ایک ہفتہ سے کر رہی تھی، کمرے میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔

☆☆☆

''آج بہت جلدی گھر آ گئیں۔ ...کالج تو اتنی جلدی بند نہیں ہوتا۔'' ربیعہ نے دروازہ کھولتے ہوئے زینی سے کہا۔

''ہاں، بس آ گئی۔'' اس نے بے حد مبہم جواب دیا اور پھر اندر کمرے کی طرف جانے کے بجائے صحن میں بچھی چارپائی کی طرف آ گئی۔

''سونے لگی ہو؟'' ربیعہ نے اسے چارپائی پر لیٹتے ہوئے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' زینی نے اس بار بھی اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ پھر چارپائی پر چت لیٹ گئی۔ ربیعہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کو دیکھتی رہی۔ زینی چارپائی پر چت لیٹی دیوار پر چڑھی انگور کی بیل کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' ربیعہ اس کے پاس آ گئی۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے ربیعہ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''رمشہ سے ملیں؟'' ربیعہ اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''ہاں!'' وہ بدستور انگور کی بیل کو دیکھتے ہوئے ربیعہ کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

''تمہاری اتنی لمبی غیر حاضری سے تو بہت پریشان ہوئی ہو گی وہ۔''

''نہیں۔ وہ خود بھی چھٹی پر تھی۔ اسلام آباد گئی ہوئی تھی ایک ہفتہ پہلے دوبارہ کالج جوائن کیا ہے اس نے ویسے بھی اب تو فارغ کرنے والے ہیں ایک دو دن میں۔ ساری کلاسز نہیں ہو رہی ہیں اب۔''

''اس کو پتا ہے تمہارے اور شیراز کے بارے میں؟'' ربیعہ نے کچھ تامل کے بعد اس سے پوچھا۔

''پورے کالج کو پتا ہے میری منگنی ٹوٹنے کے بارے میں۔ محلے کی جو لڑکیاں کالج پڑھتی ہیں، انہوں نے سب کچھ بتایا ہوا ہے وہاں۔ رمشہ کو بھی کسی نے بتا دیا تھا۔''

''کیا بتا دیا تھا؟''

''یہی کہ میرے منگیتر نے مجھے رنگے ہاتھوں کسی لڑکے کے ساتھ گلی میں پکڑا ہے۔''

ربیعہ کا دل کٹا۔ اس نے لیسی لاتعلقی سے کہا تھا جیسے وہ اپنے بارے میں نہیں کسی دوسرے کے بارے میں بات کر رہی ہو۔

''کسی کو یقین نہیں آیا ہو گا کالج میں ان سب باتوں پر اور رمشہ کو تو بالکل بھی نہیں۔ میں جانتی ہوں سب وہاں تمہیں کتنا پسند کرتے ہیں اور چار سال سے دیکھ رہے ہیں سب تمہیں وہاں، اس بکواس پر تو کسی نے یقین ہی نہیں کیا ہو گا۔''

ربیعہ کے لہجے میں بے حد اعتماد تھا۔ زینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح خاموشی سے انگور کی بیل کو دیکھتی رہی جس پر صحن سے ایک چڑیا اڑ کر جا بیٹھی تھی۔ شاید اسے وہاں کوئی کیڑا نظر آیا تھا اور اب وہ پتوں میں اس کیڑے کو تلاش کرنے کے لئے چونچیں مارنے میں مصروف تھی۔ ربیعہ کچھ دیر اس کے جواب کی منتظر رہی۔ لیکن جب اس نے کچھ نہیں کہا تو ربیعہ نے جیسے قدرے بے صبری کے ساتھ اس سے دوبارہ پوچھا۔

''کیا کہا سب نے؟''

"کچھ نہیں۔" اس نے اسی لاتعلقی سے کہا۔

ربیعہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "کچھ بھی نہیں؟ کسی نے کچھ بھی نہیں کہا؟"

زینی کبھی پریشان کالج چلی جاتی تھی تو سو لوگ اس کو تسلیاں دیتے پھرتے تھے۔ وہ بھی جو اس کو جانتے تک نہیں ہوتے تھے اور وہ گھر آ کر بڑے فخریہ انداز میں ربیعہ کو یہ سب بتاتی تھی اور اب اس کی منگنی ٹوٹ گئی تھی اور کسی نے کچھ نہیں کہا۔ یہ ناقابل یقین تھا۔ ان چار سالوں کے دوران پورے کالج کو زینی کی صرف منگنی کے بارے میں ہی نہیں یہ تک پتا تھا کہ اس کا منگیتر بے حد قابل ہے اور سول سروس کے امتحان میں بیٹھنے سے لے کر اسے کوالیفائی کرنے تک سب کچھ کالج میں پہنچتا رہا تھا۔ ان ساری معلومات کو پہنچانے میں زینی کا نہیں محلے کی لڑکیوں کا ہاتھ تھا جو زینی کے کالج میں ہی اس کی جونیئر یا سینئر تھیں۔ اس کی منگنی کا کالج کی لڑکیوں کو پتا نہ ہوتا تو بہت سے رشتے زینی کے لیے کالج سے ہی آتے۔ لڑکیاں اس کے حسن پر کچھ اسی طرح فریفتہ تھیں وہاں۔

"زبان سے تو مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ نظروں سے بہت کچھ کہا۔" زینی ابھی بھی اس چڑیا کو دیکھ رہی تھی "لڑکیاں مجھے دیکھ کر سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہیں، کچھ ہنستی رہیں، کچھ گھورتی رہیں یوں جیسے منگنی ٹوٹنے کے بعد میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔"

وہ اب بھی اس طرح بات کر رہی تھی جیسے کسی اور کی بات کر رہی ہو۔ ربیعہ کو دھچکا لگا۔

"رمشہ نے تو کچھ کہا ہو گا تم سے؟" ربیعہ نے جیسے کسی آس میں پوچھا۔

"ہاں وہ پریشان تھی۔ لڑکیاں میری عدم موجودگی میں اس سے آ کر اس لڑکے کے بارے میں پوچھتی رہیں، جس کے ساتھ شیراز نے مجھے پکڑا تھا۔ ان میں سے کچھ رمشہ کو کالج کے گیٹ پر کھڑے ہونے والے کچھ لڑکوں کے نام اور حلیے بتاتی رہیں جو میرے لیے وہاں کھڑے ہوتے تھے۔ ان کا خیال تھا میں ان ہی میں سے کسی لڑکے کے ساتھ انوالو تھی۔

کسی گاڑی والے امیر لڑکے کے ساتھ اس کے پیسے کے لئے، کیونکہ سب کو پتا ہے کہ میں غریب ہوں، غربت کی وجہ سے میں لالچ میں آ گئی تھی۔"

چڑیا کو ابھی تک وہ کیڑا نہیں ملا تھا وہ ایک پتے سے دوسرے پر پھدک رہی تھی۔ اس کی ہر حرکت کے ساتھ زینب کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"بس سب نے یہی کہا، کسی نے کچھ اور نہیں کہا؟" ربیعہ کو جیسے شاک لگا۔

"نہیں۔ اور بھی بہت کچھ پوچھتی رہی تھیں لڑکیاں یہ کہ شیراز نے مجھے اس لڑکے کے ساتھ کس حالت میں پکڑا تھا؟ کیا اس نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ یا ہم کوئی اور قابل اعتراض حرکت کر رہے تھے گلی میں؟ کچھ لڑکیوں نے رمشہ کو بتایا کہ شیراز نے مجھے گلی میں نہیں پکڑا، کسی لڑکے کے ساتھ اس کی گاڑی میں پکڑا تھا۔ کچھ نے رمشہ سے کہا کہ شیراز نے دراصل مجھے کسی لڑکے کے ساتھ کالج کے پاس کسی چھوٹے ہوٹل کے کمرے میں پکڑا تھا۔ وہ ہوٹل کا نام جاننا چاہتی تھیں۔ کچھ نے کہا کہ شیراز کو اکیڈمی میں اس لڑکے نے اپنے ساتھ میرے کچھ بلو پرنٹس بھیجے تھے۔ جن کو صرف شیراز نے

نہیں وہاں پوری اکیڈمی نے دیکھا اور شیراز کی بے حد رسوائی ہوئی۔ کچھ نے رمشہ کو قسم کھا کر بتایا کہ انہوں نے خود کئی بار مجھے کالج کے باہر مختلف لڑکوں کی گاڑیوں میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا بعض نے بتایا کہ میں گیٹ پر کسی لڑکے کو دیکھ کر مسکراتی تھی اور اشارے کرتی تھی۔"

ربیعہ کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اس کا جسم کانپنے لگا تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی۔ اس نے کیوں صبح اسے کالج جانے سے نہیں روکا تھا۔

"اللہ ان لوگوں کو، ان بہتان لگانے والوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔" ربیعہ کو بے اختیار رونا آ گیا۔

"اللہ سب کا رب ہے۔ وہ سب کو معاف کر دیتا ہے۔" زینی کے لہجے کی سرد مہری نے ربیعہ کو اور رلایا۔

زینی ابھی بھی چڑیا کو دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ زینی کو دیکھا۔ وہ چارپائی کے سرہانے والی لکڑی کے فریم پر سر لگائے لیٹی ہوئی تھی۔ صحن میں اترتی دھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اس دھوپ نے اس کے رنگ کو سنہری مائل سرخ کر دیا تھا۔ اس کے گلے اور کانوں میں کچھ نہیں تھا۔ البتہ بالوں کی بہت سی چھوٹی بڑی لٹیں اس کی گردن، پیشانی اور چہرے کے اطراف چپکی ہوئی تھیں۔ کالج کے سفید یونیفارم کی شرٹ کے کالر پر بھی اس کے بالوں کی چند چھوٹی چھوٹی لٹیں چپکی ہوئی تھیں۔ ربیعہ نے سفید رنگ کسی پر زینی سے زیادہ سجتا نہیں دیکھا تھا۔ لیکن پھر سوال یہ تھا کہ اس پر کیا نہیں سجتا تھا۔ اس کی بے حد تیکھی ناک کے اطراف میں پسینے کے بہت سے چھوٹے چھوٹے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ وہ قطرے اس کے ماتھے، پیشانی اور گردن پر بھی نمودار ہو رہے تھے۔ چارپائی پر اس حالت میں لیٹی وہ ربیعہ کو کوئی موم کا مجسمہ لگی تھی جسے دھوپ آہستہ آہستہ پگھلا رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس سے نظر ہٹانا مشکل تھا۔ وہ فنا "ہو جانے" والا حسن تھا اور وہ فنا "کر دینے والا" حسن تھا۔

اس کی خوب صورتی دیکھ کر ربیعہ کو اور رونا آیا مگر زینی ارد گرد سے بے خبر اس بیل پر اسی چڑیا کو دیکھنے میں محو تھی۔ آخر اسے رزق کیوں نہیں مل رہا تھا؟

ربیعہ کو یاد نہیں پڑتا تھا کبھی اس نے زینی کو کسی کا دل دکھاتے دیکھا ہو۔ اس کی یادداشت میں اس سے منسوب ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے وہ اس کا گناہ کہتی یا جس کے لیے وہ ایسی سزا کی حق دار ٹھہرتی وہ اسے اندر، باہر سے جانتی تھی۔ وہ جتنی خوب صورت باہر سے تھی، اس سے زیادہ اندر سے خوب صورت تھی، زینی کو دیکھتے ہوئے اسے بے اختیار اللہ سے شکوہ ہوا۔ آخر اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔

"رمشہ کو تو کسی بات پر یقین نہیں آیا ہو گا۔" بہتے آنسوؤں کے درمیان اس نے ایک بار پھر زینی کو مخاطب کیا۔ اس کے بات کرنے کا انداز اسے چبھ رہا تھا۔ "یہ زینی نہیں ہے وہ اس طرح بات نہیں کرتی تھی۔"

"اس نے یہ نہیں کہا کہ اسے ان باتوں پر یقین ہے مگر اس نے مجھے یہ سب کچھ بتایا۔ اس کو ان باتوں پر یقین نہ ہوتا تو وہ سب کچھ مجھے نہ بتاتی۔" زینی نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"وہ بے چاری کنفیوز ہو گئی ہو گی یہ سب کچھ سن کر۔ تم نے اسے بتانا تھا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے، بہتان ہے۔"

"کیوں؟" زینی نے جیسے ٹکڑا توڑ جواب دیا۔

"یہ تو بتانا پڑتا ہے نا کہ سچ کیا ہے۔"

"میرے پاس سچ بتانے کے لئے وقت نہیں تھا۔ مجھے جانا تھا کہیں۔" زینی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم کالج سے کہیں گئی تھیں؟" ربیعہ چونک گئی۔

"گھر آ گئی تھی۔" زینی کا انداز ویسا ہی ٹھنڈا اور لاتعلق تھا۔

"رمشہ نے تم کو تسلی تو دی ہوگی؟"

"وہ میں نے اسے دی تھی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ربیعہ اس کی بات سمجھ نہیں سکی۔

"مجھے پتا ہے، تمہیں بہت زیادہ دکھ ہوا..."

"کس چیز کا دکھ...؟" اس نے ربیعہ کی بات کاٹ دی۔

چڑیا کو کیڑا مل گیا تھا۔ وہ اب اسے کھا رہی تھی پھر وہ یک دم بیل سے اڑ گئی۔

زینی کی نظروں نے بیل سے آسمان تک اس کا تعاقب کیا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ زینی نے مطمئن ہو کر پوری گفتگو میں پہلی بار ربیعہ کو دیکھا۔

"ان سب باتوں کا دکھ..." ربیعہ نے رنجیدگی سے کہا۔

"چہرے کو صرف کالک ملنے والا پہلا ہاتھ میلا کرتا ہے۔ اس کے بعد لاکھ ہاتھ چہرے پر کالک ملیں۔ آدمی ان کو کبھی نہیں گنتا۔ صرف پہلا ہاتھ یاد رہتا ہے۔"

ربیعہ کچھ بول نہیں سکی۔ اسے لگا زینی کے دماغ کو کچھ ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ اس طرح کی باتیں کب کرتی تھی اور آج وہ روئی تک نہیں ورنہ وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنسوؤں کا سیلاب لے آتی تھی اور آج ان باتوں میں کوئی بھی چھوٹی بات نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ زینی سے کیا کہے۔ وہ اس وقت کسی تسلی، کسی دلاسے کی محتاج نہیں لگ رہی تھی۔

"اچھا اب اٹھو، جا کر نماز پڑھو۔ اذان ہو رہی ہے۔" زینی نے ربیعہ کا ہاتھ تھپک کر بڑے پیار سے اسے پچکارا۔

"تم نہیں پڑھو گی؟" ربیعہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نیک لوگ پڑھتے ہیں۔ میری عبادت کی ضرورت نہیں ہے اللہ کو۔" اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

ربیعہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے نہیں کہا۔ وہ صحن میں لگے نل سے وضو کر کے اندر کمرے میں نماز پڑھنے چلی گئی۔

بیس منٹ کے بعد ربیعہ نماز پڑھ کر صحن میں نکلی تو ایک لمحہ کے لئے دھک سے رہ گئی تھی۔ صحن کے وسط میں تیز دھوپ میں زینی اپنے کالج کی سفید چادر سر سے پاؤں تک اوڑھے لیٹی تھی۔ اس چارپائی پر اس کا وجود ربیعہ کو چند لمحوں کے لئے کسی لاش جیسا لگا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آئی اور اس نے چادر اس کے سر سے کھینچ کر پکارا۔ "زینی!" زینی نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی یوں جیسے وہ کچی نیند سے اٹھی ہو۔

"یہاں سے اٹھ جاؤ۔ اندر کمرے میں کپڑے بدل کر لیٹ جاؤ، امی آنے والی ہوں گی۔ تمہیں اس طرح یہاں دیکھیں گی تو پریشان ہوں گی۔"

ربیعہ نے کہا تو زینی اس چادر کو اتارتے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ربیعہ نے باورچی خانے میں جاتے جاتے ایک بار اسے پلٹ کر دیکھا پھر کچھ مطمئن ہو گئی۔ وہ اپنی چادر تہہ کرنے میں مصروف تھی۔

ربیعہ کو صحن میں اسے سفید چادر اوڑھے لیٹا دیکھ کر کوئی شائبہ نہیں ہوا تھا۔

"زینی واقعی مر گئی تھی۔"

☆☆☆

نفیسہ نے ہکا بکا انداز میں دروازے پر کھڑے ڈرائیور کو دیکھا۔

"زینب بی بی کو بھیج دیں، گاڑی آ گئی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر مودب انداز میں اپنا جملہ دہرایا۔ شاید اسے لگا تھا کہ نفیسہ کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ نفیسہ اس وقت صبح سویرے صحن کے کونے میں دانہ چگنے والی چڑیوں کے لئے دانہ پھینک رہی تھیں۔ انہوں نے دروازہ کھولا تھا۔

"کیسی گاڑی؟" نفیسہ نے ہکا بکا انداز میں پوچھا۔

"فاران صاحب نے بھجوائی ہے۔"

"کون فاران؟ تمہیں غلطی ہوئی ہے شاید تم کسی غلط محلے میں آ گئے ہو۔" نفیسہ کو یک دم خیال آیا لیکن اس سے پہلے کہ ڈرائیور کچھ کہتا، اس نے ان کے عقب میں نمودار ہوتی زینب کو دیکھ لیا تھا۔

"تم باہر بیٹھو، میں آتی ہوں۔" نفیسہ نے یک دم پلٹ کر زینب کو دیکھا جو ڈرائیور سے مخاطب تھی۔

"جی اچھا!" وہ کہہ کر چلا گیا۔

"یہ کس گاڑی کی بات کر رہا تھا... کہاں جانا ہے تمہیں؟"

نفیسہ نے بے حد پریشان ہو کر زینی سے پوچھا۔ جو اپنے بیگ میں کچھ ڈالتے ہوئے اسے بند کر رہی تھی۔

"کام پر جانا ہے مجھے۔" اس کے انداز میں بلا کا اطمینان تھا۔

"کیسا کام؟ تم کو تو کالج جانا تھا۔" نفیسہ مزید پریشان ہوئیں۔

"کالج جانا چھوڑ دیا ہے میں نے اور کام شروع کر دیا ہے۔" زینی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ ماں باپ کو پتا نہیں۔ ماں باپ سے پوچھا نہیں اور نوکری کرنے لگیں۔ یہ کیسی نوکری ہے؟ کہاں جانا

ہے تمہیں؟" نفیسہ نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر شاک کے عالم میں کہا۔

"سب کچھ آ کر بتاؤں گی۔ فی الحال تو مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے ماں کو نرمی سے صحن کے کھلے دروازے سے ہٹایا اور باہر نکل گئی۔

نفیسہ کو جیسے غش آ گیا تھا۔

"وہ کہاں چلی گئی تھی۔ اسے کیا ہو گیا تھا۔" انہوں نے بے اختیار صحن کی دہلیز سے باہر نکل کر دیکھا۔ زینی تیز قدموں کے ساتھ گلی کا موڑ مڑ رہی تھی۔ نفیسہ کو لگا وہ ہمیشہ کے لئے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

دکھ انسان کو یا تو ریت کی دیوار کی طرح ڈھا دیتا ہے یا چٹان کی طرح کھردرا اور سخت بنا دیتا ہے۔ بہت بار یہ ہوا تھا کہ زینب ضیاء ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئی تھی مگر چٹان کی طرح کھردری پہلی بار بنی تھی۔ ریت شیشہ بن جائے تو ہاتھ لگانے والوں کو اس طرح زخمی کرتی ہے کہ وہ دوبارہ ہاتھ لگانے سے ڈرتے ہیں۔

شیراز نے زینی کے بارے میں ایک کے سوا سارے اندازے ٹھیک لگائے تھے۔ وہ گھریلو، سلجھی ہوئی، سلیقہ مند لڑکی بری طرح اس کے عشق میں گرفتار تھی۔ وہ اس کے ساتھ سوسائٹی میں یا اس سوسائٹی میں نہیں چل سکتی تھی جس کا حصہ بننے کا شیراز خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ وہ دولت نہیں لا سکتی تھی۔ جس دولت کے شیراز خواب دیکھتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ان موضوعات پر بحث نہیں کر سکتی تھی جن موضوعات پر شیراز اس سوسائٹی کی عورتوں کے ساتھ بات کر سکتا تھا وہ غریب تھی، جذباتی تھی، کمزور تھی، ڈرپوک تھی، خود اعتماد نہیں تھی، تصورات میں رہنے والی تھی دوسروں پر انحصار کرنے والی تھی۔ بات بات پر رو پڑنے والی تھی۔

لیکن وہ بے وقوف نہیں تھی۔

اس نے کالج میں چاہے اسلامیات اختیاری اور ہوم اکنامکس پڑھی تھی۔ اس نے ساری عمر چاہے اردو میڈیم میں پڑھا تھا، وہ چاہے شیراز کی طرح امتحانوں میں ٹاپ نہ کرتی رہی تھی۔ مگر زینب ضیاء بہر حال بیوقوف ہرگز نہیں تھی۔ صرف یہ تھا کہ اس کو کبھی اپنی ذہانت کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی نہ ہی کبھی ایسا موقع آیا تھا۔ زینب ضیاء نے اگر چار سال کی منگنی میں شیراز کی فطرت کو نہیں جانا تھا تو یہی فاش غلطی شیراز اکبر نے بھی کی تھی۔ اپنی تمام تر ذہانت اور علم کے دعوے کے باوجود وہ زینب ضیاء کو نہیں جان سکا تھا۔

☆☆☆

"بال کاٹ دیں اس کے۔ اتنے لمبے بال، ماڈلنگ میں نہیں چلتے۔"

فاران نے جملے کا پہلا حصہ ہیر اسٹائلسٹ سے اور دوسرا زینی سے کہا اور اب وہ اس ہیر اسٹائلسٹ کے ساتھ زینی کے لئے ایک پرفیکٹ اور موسٹ سٹائلش ہیر اسٹائل کو ڈسکس کرنے میں مصروف تھا۔

زینی کھلے بالوں کے ساتھ سیلون کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ گھر سے باہر کسی نے آج تک اس کے سر کے بالوں کو نہیں

دیکھا تھا اور وہ آج یہاں ان دو غیر مردوں کے سامنے بال کھولے بیٹھی تھی۔ تکلیف اسے صرف اپنے سر اور جسم سے اس چادر کو ان لوگوں کے سامنے اتارتے ہوئے ہوئی تھی جو وہ اوڑھ کر وہاں تک آئی تھی، بال کھولتے ہوئے نہیں۔

وہ بال شیراز کو بے حد پسند تھے پسند؟ نہیں وہ مرتا تھا ان پر۔ اس نے Clippers کے ساتھ کٹنے والی بالوں کی اپنی پہلی لٹ آئینہ میں ہیر اسٹائلسٹ کے ہاتھ میں دیکھتے ہوئے سوچا اس کے بعد سوچنے کی نوبت نہیں آئی۔ ہیر اسٹائلسٹ کے ہاتھ اب بے حد پروفیشنل انداز میں یکے بعد دیگر اس کے بالوں کی مختلف لٹوں کو Clippers کے ساتھ برق رفتاری سے کاٹنے لگے تھے۔ وہ زینب ضیاء کے پورٹ فولیو کے لئے اس کے پہلے شوٹ کی تیاری تھی جو ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کے ایک نئے برانڈ کی کمپین کے لئے ماڈل کے انتخاب کے سلسلے میں فاران کو پریزنٹیشن کے لئے تیار کرنا تھا۔

کیمرہ کی آنکھ سے زینی کو نہ دیکھنے کے باوجود فاران کو یقین تھا کہ اس کا چہرہ فوٹو جینک تھا۔ صرف فوٹو جینک نہیں بلکہ وہ پچھلے کئی سالوں میں اس کی نظروں میں آنے والا سب سے خوب صورت چہرہ تھا۔

زینی کی زندگی کا پہلا فوٹو شوٹ اس کی زندگی کا بدترین فوٹو شوٹ تھا۔ فاران کی بے حد کوششوں کے باوجود وہ مسکرا نہیں پا رہی تھی یا کم از کم اس کی مسکراہٹ فاران کو مصنوعی لگ رہی تھی۔ آدھ گھنٹہ کی کوشش کے بعد فاران کو اندازہ ہو گیا تھا کہ زینی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے اور اسے اس مسئلے کو حل کرنا تھا۔

اس نے شوٹنگ روک دی اور وہ اسے لے کر اپنے آفس آ گیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہ کیمرہ کانشس ہو رہی تھی وہ نروس تھی وہ بیمار تھی یا کوئی اور مسئلہ تھا۔ کوئی گھریلو جھگڑا، کوئی مالی مسئلہ یا کچھ اور۔ اس کے پاس آنے والی ماڈلز کے ساتھ یہی سب مسئلے ہوتے تھے۔

کافی کے مگ کو ہاتھ میں تھامے اس میں سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے زینی کسی بت کی طرح فاران کی ہمدردانہ انداز میں کی جانے والی باتوں کو سنتی رہی۔ وہ اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ ان میں سے کسی مسئلے کا شکار نہیں تھی۔ کم از کم اس وقت نہیں۔

اس کا مسئلہ فاران سمیت وہ چاروں مرد تھے جن کے ساتھ وہ شوٹ کروا رہی تھی۔ وہ ان میں سے کسی کی نظروں کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ ان میں سے کسی مرد کی نظریں بھی قابل اعتراض نہیں تھیں۔ وہ بالکل پروفیشنل انداز میں اس کے ساتھ کام کر رہے تھے انہوں نے زینی کی خوبصورتی کے حوالے سے تو شاید کچھ سوچا ہو گا مگر اس کے جسم کے حوالے سے ان کے ذہنوں میں کچھ نہیں آیا ہو گا۔ وہ دن رات ماڈلز کے ساتھ کام کرتے تھے۔ فاران نے جان بوجھ کر اسے پہلی بار بے حد مہذب لباس میں شوٹ کروانا شروع کیا تھا۔ زینی کے بیک گراؤنڈ سے واقف ہونے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ ایک دم سے ماڈرن لباس پہن کر کبھی کیمرہ کے سامنے کمفرٹیبل نہیں ہو سکتی تھی۔

زینی کا جسم مکمل طور پر ان کپڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک اسٹوڈیو میں چار مردوں کے سامنے دوپٹے کے بغیر نہیں کھڑی۔ کسی میدان میں چار ہزار مردوں کے درمیان کھڑی ہے۔ وہ فاران کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ ہر بار فاران یا اسٹائلسٹ جب اس کے پاس آ کر اس کے چہرے یا جسم کے کسی دوسرے حصے کو کسی خاص پوز یا ایکشن کے لئے سیٹ کرنے کے لئے ہاتھ لگاتے تو وہ لمس زینی کے لئے جیسے

کسی جلتے ہوئے انگارے کالمس ہوتا ہے۔

اس کے جسم اور چہرے کو زندگی بھر کسی نامحرم مرد نے نہیں چھوا تھا۔ اور وہ اس چیز سے بھی بے حد خائف رہتی تھی ۔ اسے تو کالج میں اگر کوئی لڑکی کسی وجہ کے بغیر ہاتھ لگاتی یا پاس سے گزرتے ہوئے ٹکرا جاتی تو وہ اس چیز کو بھی محسوس کرتی تھی اور یہاں وہ چاروں اتنی بے تکلفی کے ساتھ آ کر اس کی ٹھوڑی، گردن، کندھے اور بازوؤں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔ وہ گوشت پوست کے زندہ وجود سے یک دم کمرے میں پڑی کوئی آرائشی شے بن گئی تھی جسے ہر کوئی اپنی مرضی سے، اپنی پسند کے طریقے اور جگہ پر سیٹ کرنا چاہتا تھا۔

"اگر کوئی مسئلہ نہیں ہے تو پھر کیا مسئلہ ہے؟"

فاران نے ہر سوال کے جواب میں اس کی نہیں نہیں سے تنگ آ کر بے ساختہ ایک بے تکا سوال کیا۔ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ زینی کافی کا گھونٹ اپنے اندر انڈیل رہی تھی۔

"شوٹ اسٹارٹ کریں، میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ بس کچھ وقت لگے گا۔"

کافی کا کپ خالی کرتے ہوئے اس نے فاران سے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

فاران نے بے حد مختصر شوٹ کروائی تھی۔ اسے صرف یہ دیکھنا تھا کہ زینی کی فوٹوگرافس کے رزلٹ کیسے آتے ہیں۔ چار گھنٹوں میں پرنٹس آ گئے تھے۔

فاران نے پہلی تصویر پر نظر ڈالتے ہی بے اختیار ٹیبل کے دوسری طرف اپنے مقابل بیٹھی زینی کو دیکھا۔ پھر اس نے دوبارہ زینی کو نہیں دیکھا۔ پورے پندرہ منٹ وہ ایک کے بعد ایک تصویر دیکھتا رہا۔ آخری تصویر دیکھنے کے بعد اس نے اسے میز پر رکھا اور انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر اپنی سیکرٹری سے کہا۔

"مس زینب کا کانٹریکٹ تیار کروائیں اور سائننگ امّاؤنٹ کا چیک بھی۔"

وہ پندرہ منٹ میں پہلی بار زینی کو دیکھ کر مسکرایا اور اس نے ریسیور رکھ دیا۔ زینی بے تاثر انداز میں اسے دیکھتی رہی تھی۔

"اگر ایک برے شوٹ کی تصویریں اتنی کمال کی آ سکتی ہیں تو ایک اچھے شوٹ کے ساتھ تو تم قیامت ڈھا دو گی۔"

فاران نے ان تصویروں کو زینی کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ زینی نے ان تصویروں پر نظر نہیں ڈالی۔ وہ فاران کو دیکھتی رہی۔

"مجھے نہیں پتا، اس کمپنی کے کلائنٹ تمہیں پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ مگر میں اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے لئے تمہیں سائن کر رہا ہوں۔"

فاران نے اس سے کہا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد فاران نے کانٹریکٹ سائن کروا لیا تھا پھر اس نے ایک لفافہ میں زینی کو اس کی زندگی کا پہلا چیک دیا۔ زینی نے لفافہ کھول کر اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ایک لاکھ کا چیک تھا۔

فاران کو یقین تھا۔ وہ اب ضرور مسکرائے گی۔ آخر وہ پیسے کے لئے ہی اس فیلڈ میں آئی تھی مگر وہ مایوس ہوا۔ اس نے کسی مسکراہٹ کے بغیر

چیک واپس لفافے میں ڈالا اور اسے بیگ میں رکھ لیا۔

"ایک لاکھ کا چیک ہے۔" فاران نے اسے بتانا ضروری سمجھا۔ اسے ایک لمحہ کے لئے لگا کہ کہیں زینی نے رقم پڑھنے میں غلطی نہ کی ہو۔ ایک لاکھ کی رقم پر وہ خوشی سے چیختی نہ مگر کم از کم مسکراتی تو ضرور یا کچھ نروس ہی ہو جاتی۔ وہ لوئر مڈل کلاس سے آنے والی ماڈلز کو اسی طرح ری ایکٹ کرتے دیکھتا تھا۔

"میں نے پڑھ لیا ہے۔" زینی نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اسی بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا۔

☆☆☆

وہ شام پانچ بجے گھر لوٹی تھی اور ربیعہ اور نفیسہ تب تک بنا کچھ کھائے پیے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ نفیسہ کا خیال تھا۔ وہ صبح انہیں نہیں تو ربیعہ کو تو ضرور کچھ بتا کر گئی ہوگی۔ مگر ربیعہ کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کس کام سے اور کہاں گئی تھی۔ نفیسہ کے بتانے پر خود اس کی حالت بھی غیر ہو گئی تھی۔ اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ سلمان گھر آیا تھا مگر انہوں نے اس سے بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ سلمان نے خود ہی زینی کے بارے میں پوچھا تھا مگر ربیعہ نے اس سے جھوٹ بول دیا کہ وہ رمشہ کے ہاں گئی ہے۔ سلمان مطمئن ہو کر ٹیوشن پڑھنے چلا گیا۔

پانچ بجے تک نفیسہ کئی بار گلی میں جھانک چکی تھیں اور ربیعہ مسلسل صحن کے چکر کاٹ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان اب کسی بات کا تبادلہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ آخر وہ ایک دوسرے سے کیا بات کرتیں۔

ٹھیک پانچ بجے دروازے پر دستک ہوئی اور ربیعہ بھاگتے ہوئے دروازہ کھولنے کے لئے گئی۔ زینی کو دروازے پر دیکھ کر جیسے اس کی جان میں جان آ گئی تھی۔ کچھ یہی عالم صحن میں کھڑی نفیسہ کا تھا۔

زینی چپ چاپ اندر داخل ہوئی پھر کچھ کہے بغیر کمرے کی طرف چلی گئی۔ ربیعہ اور نفیسہ اس کے پیچھے گئی تھیں اور نفیسہ نے اندر جاتے ہی بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ زینی چادر اتار کر رکھ رہی تھی اور اس کے اسٹیپس میں کٹے ہوئے بال اس کے کندھوں سے نیچے تک جھول رہے تھے۔

"تم نے بال کٹوا لیے؟"

زینی نے پلٹ کر بے حد اطمینان سے ماں کو دیکھا اور چادر الماری میں رکھتے ہوئے بولی "ہاں"

ربیعہ صدمے کے عالم میں اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی جلد چمک رہی تھی۔ اس کی بھنوؤں کی شیپ اس شیپ سے مختلف تھی جو صبح گھر سے نکلتے وقت تھی۔ زینی اگرچہ بہت اچھی طرح اپنا میک اپ صاف کر کے آئی تھی پھر بھی اس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ بیوٹی پارلر سے ہو کر آئی ہے۔

"مگر کس لیے؟" ربیعہ پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی تھی۔

"کہاں گئی تھیں تم؟" نفیسہ نے بالوں کے بارے میں پوچھنے کا فیصلہ ملتوی کرتے ہوئے کہا۔ پہلے ضروری تھا کہ اس سے اس چیز کے بارے میں پوچھا جاتا جس نے انہیں صبح سے ہولایا ہوا تھا۔

"کام کرنے۔" وہ اب اپنے بستر پر بیٹھ کر ہاتھ سے اپنے جوتے کے اسٹیپس کھول رہی تھی۔

"کیا کام؟ کون تھا وہ ڈرائیور؟ اور پانچ بجے تک تم کہاں رہی ہو؟" نفیسہ نے یک دم سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"میں نے ماڈلنگ شروع کر دی ہے۔" زینی کا اطمینان قابل دید تھا۔

نفیسہ کو جیسے غش آنے لگا اور ربیعہ کا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔

"میرے اللہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ تمہیں پتا ہے، سارا محلہ تمہارے بارے میں پہلے ہی کیسی کیسی باتیں کر رہا ہے۔" نفیسہ نے بے اختیار چلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اب اس سے فرق نہیں پڑتا کہ کوئی میرے بارے میں کیا کہتا ہے۔" زینی اسی طرح پرسکون تھی۔

"تجھے فرق پڑتا ہو یا نہ پڑتا ہو۔ تیرے باپ کو پڑتا ہے۔ ان کی عزت ہے اس۔"

زینی نے تلخ ہنسی کے ساتھ ماں کی بات کاٹی "کتنی عزت ہے ان کی، میں جانتی ہوں۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے زینی؟" اس بار ربیعہ آگے بڑھی۔

"مجھے عقل آ گئی ہے۔" زینی نے اطمینان سے کہا۔

"مجھے پتا ہے، تم یہ سب کچھ صدمے کی وجہ سے کر رہی ہو۔ تم شیراز کی منگنی کے بعد روئیں نہیں نا اس لیے۔ ایک بار اچھی طرح رو لو، تمہارے دل کا غبار نکل جائے گا تو پھر ..."

زینی نے بے حد غصے سے اپنے کندھے پر رکھا ربیعہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "کیوں روؤں میں؟ ہر دفعہ میں ہی کیوں روؤں؟ اور میرے دل میں کوئی غبار نہیں ہے جسے نکالنے کے لیے مجھے آنسوؤں کی ضرورت پڑے۔"

"تو پھر تو یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہے؟" نفیسہ نے بے چارگی سے کہا۔

"پیسے کے لیے۔"

نفیسہ اور ربیعہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئیں۔

"یہ شریف لڑکیوں کے کام نہیں ہیں زینی!" نفیسہ نے سمجھایا۔

"اسی لیے تو کر رہی ہوں۔ میں بھی تو شریف نہیں ہوں۔"

"تم سے کس نے کہا ہے، تم شریف نہیں ہو۔"

"کسی نے نہیں کہا؟ جا کر محلے والوں سے پوچھیں۔ رشتے داروں سے پوچھیں اور کچھ نہیں تو میرے کالج جا کر پوچھیں۔"

اس نے بے حد پرسکون انداز میں کہا مگر اس کے لہجے میں کسی چیز نے نفیسہ کو بری طرح کاٹا۔

"بکواس کرتے ہیں سب تمہیں کسی کی بات سننے کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے آنکھوں میں امڈتی نمی کو روکتے ہوئے بھرائی آواز

میں زینی سے کہا۔

"یہی تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ کو کسی کی بات سننے کی ضرورت نہیں ہے۔" زینی نے نفیسہ کی جیسے زبان پکڑی۔ وہ کچھ دیر پہلے اسے اسی محلے سے ڈرا رہی تھیں۔

"یہ تمہارے پیسے۔" اس نے بیگ کھول کر ربیعہ کو ایک دن پہلے ادھار دیے ہوئے پیسے لوٹائے۔

"کھانے میں کیا ہے؟" وہ اب یوں ربیعہ سے پوچھ رہی تھی جیسے گفتگو ختم ہو گئی تھی۔ ربیعہ کو اس کا ذہنی توازن واقعی خراب لگا تھا۔

"تمہارے باپ کو پتا چلے گا تو وہ..." اس نے پلٹ کر ماں کی بات کاٹ دی۔

"وہ کچھ نہیں کہیں گے... اگر کہیں گے بھی تو مجھ سے کہیں گے... میں بات کروں گی ان سے... کھانا ملے گا یا میں باہر جا کر کھا آؤں۔" نفیسہ کو رگا۔ قیامت پہلے نہیں آئی تھی۔ قیامت اب آنے والی تھی۔ ربیعہ اور نفیسہ اسے اس طرح دیکھ رہی تھیں۔ جیسے وہ ان دونوں کے لیے بھوت بن گئی تھی۔ زینی چند لمحے ان کے جانے کی منتظر کھڑی رہی پھر خود ہی کمرے سے نکل گئی۔

"ابو کو بتا دیں امی! اسے وہی روک سکتے ہیں۔ یہ ہماری بات نہیں مانے گی۔" ربیعہ نے شاک کے عالم میں ماں سے کہا۔

"آخر کتنے عذاب اکٹھے کروں میں ان کے لیے۔ کتنے ہفتوں کے بعد وہ پچھلے چند دنوں سے کچھ سکون میں ہیں اور اب کیا سوچیں گے وہ۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کو ماڈلنگ کا خیال کہاں سے آ گیا۔ اس نے تو کبھی ٹی وی تک شوق سے نہیں دیکھا۔"

"رمشہ نے کام دلوایا ہوگا اسے... اس نے اس سے کچھ عرصہ پہلے ماڈلنگ کا کہا تھا۔" ربیعہ نے نفیسہ کو بتایا۔

نفیسہ یک دم اب ربیعہ پر برسنے لگیں کہ اس نے انہیں اس بارے میں پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ورنہ وہ اس کا اور رمشہ کا میل جول ختم کروا دیتیں۔ ربیعہ گھبرائے ہوئے انداز میں وضاحتیں دیتی رہی اور کچن میں بیٹھی زینی بے حد اطمینان سے کھانا کھاتے ہوئے اندر سے آنے والی آوازیں سنتی رہی۔

☆☆☆

ضیا بے یقینی سے زینی کا چہرہ دیکھتے رہے۔ نفیسہ نے ان کے آفس سے آنے کے کچھ دیر بعد ہی انہیں زینی کی ماڈلنگ کے بارے میں بتا دیا تھا اور ضیاء کو یقین نہیں آیا تھا مگر اس کے کمرے میں جا کر اس کا سامنا کرتے ہی انہیں جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس نے بے حد حوصلے سے اقرار کیا تھا کہ جو کچھ انہوں نے نفیسہ کے منہ سے سنا ہے وہ سب سچ ہے۔

"مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا قدم..."

اس نے باپ کی بات کاٹ دی۔ "آپ سے پوچھتی تو آپ اجازت دیتے؟"

"نہیں۔ کیونکہ میں تمہیں ایسا کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا جس پر لوگ انگلیاں اٹھائیں۔"

"لوگ پہلے ہی مجھ پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔

''نہیں زینی! عزت دار گھرانوں کی لڑکیاں ایسے کام نہیں کرتیں۔'' ضیاء نے اسے نرم آواز میں سمجھایا۔

''تو پھر کیا کرتی ہیں؟ ... شوہروں کے ہاتھوں جہیز کم لانے کی وجہ سے پٹتی ہیں؟ یا پیسے کے نہ ہونے کی وجہ سے اپنی منگنیاں تڑواتی ہیں۔ پیسے کے بغیر کوئی گھرانہ عزت دار نہیں ہوتا نہ کہلاتا ہے۔''

''تم ناسمجھی کی باتیں کر رہی ہو۔'' ضیاء نے اسے ٹوکا۔

''میں آپ کو وہ سچ بتا رہی ہوں جس سے آپ نے ہمیشہ نظریں چرائیں۔'' اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''زینی! ...'' ضیاء نے اس سے کچھ کہنا چاہا۔

''آج آپ کے پاس پیسہ ہوتا تو آپ کی بیٹیوں کے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہو رہا ہوتا۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''شیراز کے لالچ اور کم عقلی ...'' اس نے ضیاء کی بات کاٹ دی۔

''شیراز نے کچھ غلط نہیں کیا ... اس نے جو کیا ٹھیک کیا۔ آخر کیا ملتا اس کو آپ کی بیٹی سے شادی کر کے۔'' وہ باپ کے بالمقابل کھڑی ہو گئی۔ ''غلطی آپ نے کی کہ آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ آپ کو اپنی بیٹیاں بیاہنی ہیں اور جب ان کو بیاہنا ہے تو ان کو کچھ دینا بھی ہے ... کم از کم اتنا تو دینا ہی چاہیے جتنا دنیا آپ سے مطالبہ کرتی۔''

''میں نے تم لوگوں کو ہمیشہ حلال کھلایا اور مجھے اس پر فخر ہے۔''

ضیاء نے دل گرفتگی سے کہا۔ یہ وہ اولاد تھی جس نے ان سے تو کیا کبھی کسی کے ساتھ اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔

''اور اس فخر کی وجہ سے آپ کی ایک بیٹی سسرال میں تماشا بنی ہوئی ہے اور دوسری خاندان میں۔''

''میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ سب کچھ مجھ سے تم کہو گی۔''

''آپ مجھے ماڈلنگ چھوڑنے کا کہیں گے تو میں یہی سب کچھ کہوں گی آپ سے۔''

''کیوں اس طرح کرنے لگی ہو زینی تم ... ؟'' ضیاء نے رنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

زینی اس بار کچھ نہیں بولی۔ باپ کی کسی بات نے پہلی بار اسے خاموش کروایا تھا۔

ضیاء کے سوال کا جواب زینی کے پاس نہیں تھا۔ اسے خود بھی یہ پتا نہیں تھا، وہ یہ سب کچھ کیوں کرنے لگی تھی۔

انسان کو اگر اس نے چھوڑا ہو جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتا ہے تو وہ رنج میں اس کو سب سے زیادہ تکلیف پہنچانے لگتا ہے جو اس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہو۔ زینی بھی یہی کر رہی تھی۔ یہ انتقام نہیں ہوتا سیلف میکنزم ہوتا ہے، دوبارہ ویسی تکلیف سے بچنے کی کوشش۔ وہ کچھوے کی طرح اپنے خول میں بند ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے اردگرد دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش میں اس نے ان سارے تعلقات، سارے رشتوں، ساری محبتوں کو خود اپنے ہاتھوں سے کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس خوف اور عدم تحفظ کے احساس کے ساتھ کہ کل کوئی اس کے ساتھ دوبارہ وہی کچھ کر سکتا ہے جو شیراز نے کیا تھا۔ وہ صرف یہ بھول گئی تھی کہ وہ سارے اس کے ''خونی رشتے'' تھے۔

وہ کسی دوسرے کو اپنے احساسات کیا سمجھاتی۔ اسے تو خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیا چیز تھی جو اسے مار رہی تھی۔ ہتک، شرم، ذلت، غربت، فریب، غم، غصہ یا پھر شیراز کا چھوڑ دینا۔

اس کے اندر سوالوں کا ایک ہجوم تھا اور ان میں سے کسی کا بھی جواب اسے مل نہیں پا رہا تھا۔ اس کے وجود کے اندر جیسے دھند ہی دھند تھی جس میں اس کو رستہ نہیں مل پا رہا تھا وہ درد کا Epicenter ڈھونڈتی پھر رہی تھی اور اس تلاش نے اس کو درد سے زیادہ بے حال کر دیا تھا۔

☆☆☆

ضیاء نے اس رات اس سے مزید بات نہیں کی۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ ان کی بات نہیں سنے گی۔ پر انہوں نے ہار نہیں مانی تھی۔ وہ مزید کوشش کرنا چاہتے تھے۔

اگلے چند دن نفیسہ، ربیعہ، سلمان اس کو دن رات سمجھاتے رہے۔ وہ روزانہ اطمینان سے فاران کے آفس جاتی شام کو آ کر ان سب کی باتیں سنتی پھر اطمینان سے چادر اوڑھ کر سو جاتی۔ اگلی صبح وہ ایک بار پھر آفس جانے کے لیے تیار ہوتی۔

ایک شان دار گاڑی میں روز وہاں آمد و رفت نے محلے میں مزید سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں کو جنم دیا تھا۔ نفیسہ اور ربیعہ لوگوں سے جھوٹ بولتے بولتے تنگ آ گئی تھیں اور انہیں یقین تھا کہ کسی نے ان کی اس بات پر یقین نہیں کیا ہوگا کہ زینی کسی دفتر میں کام کرنے لگی تھی آخر وہ کون سا دفتر تھا جس کی ایسی شان دار کار ایک عام ورکر کو اس کے گھر سے پک اور ڈراپ کے لئے بھجوائی جاتی تھی اور وہ بھی زینی کے لیے جس نے ابھی بی اے کی ڈگری تک نہیں لی تھی۔ شیراز اور اس کے گھر والوں کے الزامات پر جیسے مہر ثبت ہونا شروع ہو گئی تھی اور نفیسہ اور ربیعہ اس دن سے ڈر رہی تھیں جب زینی کا پہلا اشتہار منظر عام پر آتا اور ان کے جھوٹ کا پردہ فاش ہو جاتا۔

اور ضیاء وہ اب زینی کو سمجھنے کی کوشش کو ترک کر کے صرف اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح ان کے آفس کے وہ دوست زینی کے لئے اپنے بیٹے کا رشتہ لے آئیں۔ انہیں زینی کی فوری شادی ہی اس مسئلے کا حل نظر آ رہی تھی۔ خالد صاحب ان دنوں اپنی بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے اور انہوں نے ضیاء سے اس شادی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ گھر آنے کے بارے میں وعدہ کیا تھا اور ہر گزرنے والا دن ضیاء کو جیسے قیامت کا دن محسوس ہوتا تھا۔

☆☆☆

زینی کو اس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرتے زیادہ دن نہیں لگے تھے۔ صرف شروع کے دن تھے جب وہ ٹھٹکتی جھجکتی، سہمتی، ہچکچاتی، سکڑتی، سمٹتی رہی تھی۔ پھر جیسے ایک ہی منتر تھا جو وہ اپنے آگے آنے والی ہر رکاوٹ، ہر گرو پر پھونکنے لگی تھی۔

''وہ آپ کے گھر سے جہیز کے نام پر کچھ نہیں لے کر آئے گی کم از کم عزت تو لائے۔''

A beautiful woman with all these qualities or a

beautiful woman with laods of cash

(ایک عورت ان تمام خصوصیات کے ساتھ یا ایک خوب صورت عورت کروڑوں کیش کے ساتھ؟)

وہ پہلا منتر پھونکتی۔ وہ کام نہ کرتا تو دوسرا یاد کرتی۔ عزت اور حیا نام کی چیز چند لمحوں کے لئے جھلک سے اس کی دنیا سے غائب ہو جاتی۔ وہ شوٹ کرواتے وقت فوٹو گرافر یا اس کے اسسٹنٹ کی ہدایات نہیں سنتی تھی۔

"Smile, chin up, move to the left, don't bend, straighten your shoulders, bend backwards, pout your lips, raise your left eye brow, look upwards, tuck your tummy in, hold your breath, there it is."

وہ فوٹو گرافر کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے کانوں میں کچھ اور سن رہی ہوتی تھی۔ شیراز کا خط پکڑنا، نسیم کا دروازہ نہ کھولنا، نفیسہ کا منگنی کا سامان واپس لانا، ضیا کا اکبر اور نسیم کے گھر سے نامراد واپس آنا، شیراز کو لکھے جانے والے خط، اپنے ہاتھ سے ربیعہ کا انگوٹھی اتارنا، ضیاء کا اکیڈمی میں شیراز سے ملاقات کے دوران کہی جانے والی باتیں دہرانا۔

ہر فوٹو شوٹ کے دوران اس کا ذہن ان ہی سب باتوں کو دہرا رہا ہوتا اور ان سب واقعات کے ساتھ منسلک تکلیف اور ذلت کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ کسی بھی قابل اعتراض لباس کو پہن کر محسوس کی جانے والی ذلت کو وقتی طور پر جیسے فراموش کر دیتی تھی۔ ماضی اس کے لئے جیسے حال میں انستھیزیا کا کام کرنے لگا تھا۔

وہاں آنے والے بہت سے دوسرے ماڈل لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اس کی جان پہچان اور ہیلو ہائے ہونے لگی تھی۔ مگر زینی کے رویے میں کوئی بات ایسی تھی کہ سب اس سے بدکتے تھے یا پھر خار کھاتے تھے اور رہی سہی کسر اس کی خوب صورتی اور اسٹائل پورا کر رہے تھے۔ وہ ہر ماڈل لڑکی کو خوف اور عدم تحفظ کا شکار کر رہی تھی۔ کل کس کا تھا؟ یہ ہر ایک کو پہلے ہی دیوار پر لکھا نظر آنے لگا تھا۔

فاران ایک مشہور اسٹائلسٹ سے اس کی گرومنگ کروا رہا تھا۔ وہ سارا سارا دن چھ چھ انچ کی ہیل کے ساتھ کیٹ واک کرنا سیکھتی رہتی۔ اس کے چلنے کے انداز میں قدرتی طور پر شاہانہ پن تھا اور اس کے جسم میں بے پناہ سوچ اور یہ چیزیں فاران اور اس اسٹائلسٹ نے پہلی بار اسے کیٹ واک کرانے کی کوشش کرتے ہوئے نوٹ کر لیا تھا۔ باقی ساری چیزیں اس کو سکھانا ان کے لئے کیک واک ثابت ہو رہی تھی۔

فاران کو کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ پاکستان کی پہلی کیٹ واک کوئین کو گروم کر رہا تھا۔ اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ اگلے پانچ سالوں میں اگر اسے صرف اپنے ساتھ کام کرنے پر آمادہ رکھ سکا تو وہ اس کے ذریعے کروڑوں کمانے والا تھا۔

اور اگلے پانچ سال اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے صرف کانٹریکٹ کافی نہیں تھے۔ وہ جانتا تھا، ایک بار زینی منظر عام پر آ گئی تو اس پر آفرز کی بھرمار ہو جائے گی اور ان میں سے ہر آفر ایک سے بڑھ کر ایک ہو گی پھر ان حالات میں زینی کو صرف اپنے ساتھ باندھے رکھنا ناممکنات میں سے تھا۔

اسے اس پر جال ڈالنا تھا۔

☆☆☆

''بھائی! یہ گھر اب ہمارا ہے؟'' شبانہ نے بے یقینی سے گھر میں ادھر ادھر پھرتے ہوئے شیراز سے پوچھا۔ وہ اس دن اپنے پورے خاندان کو وہ بنگلہ دکھانے کے لیے لے کر آیا تھا جو شینا کو جہیز میں ملنے والا تھا، وہاں آج کل مرمت ہو رہی تھی۔

اور اس بنگلے میں آ کر شیراز کے گھر والوں کو جیسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا۔ وہ سب ادھر سے ادھر گھومتے ہوئے اپنے لیے کمرے منتخب کر رہے تھے۔

شیراز بے حد فخریہ انداز میں انہیں ایک ایک چیز دکھا رہا تھا۔ یوں جیسے وہ سب کچھ اس کی بیوی کے جہیز کا نہیں تھا اس کی اپنی برسوں کی محنت کا حاصل تھا اور اکبر تو اپنے بیٹے پر نثار ہو رہے تھے۔ انہوں نے کہاں سوچا تھا کہ ان کی اکلوتی نرینہ اولاد کے مقدر میں اتنا ''رزق'' تھا۔

''یہ ماسٹر بیڈروم ہے۔ یہ میں آپ دونوں کے لیے تیار کروا رہا ہوں۔ میں اور شینا دوسرے بیڈروم میں رہیں گے۔'' شیراز نے نسیم اور اکبر کو ماسٹر بیڈروم میں لے جاتے ہوئے کہا۔ خیر انہیں ماسٹر بیڈروم کی تو کیا سمجھ آتی، ان کے لیے بس یہی کافی تھا کہ گھر کے سب سے بڑے کمرے میں ان کا بیٹا ان کو رکھ رہا ہے۔

''اور بھائی! میں اوپر والی منزل پر الگ کمرہ لوں گی۔'' نزہت نے فوراً یاد دلایا۔

''لے لینا بھئی، لے لینا۔ اوپر والے سارے کمرے خالی ہیں۔ تم لوگ لے لینا ایک ایک۔'' شیراز نے مسکراتے ہوئے بہن کو اطمینان دلایا۔

''میں تو بھائی یہاں آتے ہی اپنے محلے کی ساری سہیلیوں کو اپنے گھر بلاؤں گی۔ انہیں بھی تو پتا چلے، ہم کہاں رہ رہے ہیں۔'' شبانہ نے بھی اپنے مستقبل کے ارادوں کا اظہار کیا۔

''بلا لینا اپنی سہیلیوں کو مگر پہلے اس گھر میں ہم کو آ تو لینے دو۔'' شیراز نے اس کا سر تھپتھپایا۔

''اور وہ جو اپنا گھر ہے، اسے کیا کریں گے؟'' اکبر کو خیال آیا۔

''اسے بیچ دیں گے۔ اب اس محلے کے اتنے چھوٹے سے گھر کا ہمیں کیا کرنا ہے۔'' شیراز نے اپنا ارادہ بتایا۔

''بیچنے کے بجائے کرائے پر چڑھا دیں تو ماہانہ کچھ آمدنی ہوتی رہے گی۔'' اکبر نے کہا۔

''کتنی ماہانہ آمدنی ہو جائے گی۔ سات آٹھ سو روپے۔ چھوڑیں، اب وہ زمانے گئے کہ اس ماہانہ آمدنی پر جئیں گے ہم لوگ۔ اب تو اس سے دو گنا روزانہ خرچ کیا کریں گے ہم۔'' شیراز نے بے حد تفخر سے کہا۔

''کیوں بیٹا! کتنی تنخواہ لگے گی تمہاری؟'' نسیم نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

''تنخواہ کو چھوڑیں امی! سرکاری نوکری میں ''تنخواہیں'' نہیں ہوتیں ''کمائیاں'' ہوتی ہیں۔''

اس کی بات پر اکبر نے بلند آواز میں قہقہہ لگایا۔ افسر اولاد کا باپ ہونے کا نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

''پھر بھی محلے کی عورتیں پوچھتی ہیں۔ مجھے بتانا ہے انہیں۔'' نسیم نے اصرار کیا۔

''ایک تو آپ اس محلے کی عورتوں کو بھول جائیں اب۔ ہم اب ان جیسے نہیں رہے۔ ان سے اوپر ہو گئے ہیں۔ ان سے میل جول ختم

کریں۔ یہ نہ ہو کہ یہاں پر محلے کے لوگوں کی قطاریں لگ جائیں۔" شیراز نے یک دم کسی خدشے کے پیش نظر کہا۔

"نہیں انہیں بیٹا! تم فکر ہی مت کرو۔ ہم کوئی بے وقوف ہیں کہ محلے کے لوگوں کو یہاں بلانا شروع کر دیں۔" اکبر نے فوری طور پر شیراز کو تسلی دی۔

"اور ہاں، وہ گاڑی کا کیا ہوا۔" اکبر کو یک دم یاد آیا۔

"گاڑی بھی آجائے گی۔ ایک نیا ماڈل آنے والا ہے۔ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ جب سسرال والوں سے گاڑی لینی ہے تو پھر لیٹسٹ ماڈل کیوں نہ لو۔"

شیراز نے ہنس کر کہا۔ نسیم اور اکبر دونوں فہمائشی انداز میں ہنسے۔

"تمہارے سسرال والے بڑے دل کے لوگ ہیں۔ دو چار لاکھ کم زیادہ ہو جانے سے ان کو فرق نہیں پڑے گا۔ اکبر نے سعید نواز کی تعریف کی۔

"یہ تو مجھے بھی پتا ہے، اسی لیے تو انتظار کر رہا ہوں نئے ماڈل کا۔"

"بیٹا! ہمیشہ اپنے سسرال والوں کی عزت کرنا، ساس سسر کے فرماں بردار رہنا۔" نسیم نے یک دم شیراز کو نصیحت کرنی شروع کر دی۔

"ایسے اچھے لوگ کہاں ملتے ہیں آج کل کے زمانے میں۔" اکبر نے بھی مداخلت کی۔ "وہ تمہیں اپنا بیٹا بنا رہے ہیں تو تم بیٹا بن کر دکھانا۔"

"انشاء اللہ تعالیٰ۔" شیراز نے بے ساختہ کہا۔ ماں باپ نہ بھی کہتے تو بھی یہ تو اس کے اپنے دل کی آواز تھی۔

نسیم کا بس چلتا تو وہ اسی وقت شیراز کی ایڈاپشن کے کاغذات تیار کر کے شیراز کو سعید نواز کا متبنیٰ بنا دیتیں۔ وہ اس کروڑوں کے گھر کو دیکھ کر اس وقت اتنی ہی جذباتی ہو رہی تھیں۔

"اور کبھی شینا کو کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔ میں اسے بہو نہیں، بیٹی بنا کر اس گھر میں لاؤں گا اور یاد رکھنا، اسے تم سے کوئی شکایت ہوئی تو میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھوں گا۔"

اکبر بھی کچھ مزید جذباتی ہو گیا۔ اس وقت شینا کے لیے سب کے دل میں پیار کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

"میں تو خیر اس کو بیٹیوں سے بھی بڑھ کر رکھوں گی۔" نسیم نے اپنا عزم دہرایا۔

"اور میں نے تو بھابھی کو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دینا۔ میں تو کھانا اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی انہیں اور ایک سال تک تو ہم نے ان سے ویسے ہی کوئی کام نہیں کروانا۔" نزہت کے دل میں بھی بھابھی کی محبت جوش مار رہی تھی۔

"بالکل، اپنی بہو کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھنا ہے میں نے۔" نسیم نے تائید کی۔ آخر شینا نے ان سب کی قسمت بدل دی تھی تو پھر کروڑوں کی اس جائیداد کے ساتھ آنے والی بہو پر کس کو پیار نہ آتا۔

شیراز مسکراتے ہوئے ان سب کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے تصور میں اس وقت شینا تھی۔ وہ اب اسے اس گھر میں اپنے ساتھ گھومتے

بکھرتے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"سنا ہے زینی نے کوئی نوکری کرلی ہے۔"

ربیعہ کی ہونے والی ساس اس دن ان کے گھر آئی تھیں اور نفیسہ کو ان دنوں اگر کسی کی آمد کا اندیشہ تھا تو وہ ان ہی کی آمد تھی۔ زبیدہ ان کی چھوٹی بہن تھیں اور بہت اچھے مزاج کی تھیں مگر نفیسہ یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ تسیم کے ساتھ بے حد انسیت رکھتی ہیں اور اس وقت بھی تسیم کے پاس سے ہی آرہی تھیں اور شاید زینی کی اس نوکری کے بارے میں بھی انہیں تسیم نے ہی مطلع کیا تھا۔

زبیدہ کو اگرچہ شیراز اور زینی کی منگنی ٹوٹنے کا افسوس تھا مگر بہرحال انہوں نے ابھی تک اس بارے میں نفیسہ سے افسوس کے علاوہ زینی کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شاید ان کے دل میں کہیں زینی کے لئے کوئی نرم گوشہ تھا جو اب بھی اسے قصوروار سمجھنے سے انکاری تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی دو تین بار آئی تھیں اور ہر بار زینی کی حالت دیکھ کر وہ مزید رنجیدہ ہو کر واپس جاتی تھیں۔

"ہاں، وہ ایک آفس میں اس کی دوست نے لگوایا ہے اسے۔" نفیسہ نے ان سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟ آپا آپ کو پتا ہونا چاہیے۔ خاندان والے پہلے ہی بہت باتیں کر رہے ہیں اس کے بارے میں۔" زبیدہ نے اعتراض کیا۔

"وہ چھوڑ دے گی۔ ذرا دل بہل جائے گا، اس لیے کام کر رہی ہے۔ چھوڑ دے گی وہ۔" نفیسہ نے جھوٹ بولا۔

"دل بہلانے کے لئے نوکری ہی کرنا رہ گیا ہے۔ پہلے بھی اس کے گھر سے باہر نکلنے کی وجہ سے ہی مسئلہ ہوا۔ آپ کو تو چاہیے تھا کہ اس کو گھر سے باہر ہی نہ جانے دیتیں۔"

نفیسہ نے قدرے شرمندہ انداز میں چائے لاتی ہوئی ربیعہ کو دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے نظریں چرائیں۔ ربیعہ نے چائے کی ٹرے تپائی پر رکھ دی۔ وہ بے حد پریشان تھی۔ زینی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی۔ زبیدہ سے زینی کی ملاقات ہو۔ وہ اگرچہ ابھی بھی چادر لے کر ہی باہر آتی جاتی تھی مگر اس کے حلیے میں زمین آسمان کا فرق آچکا تھا اور تراشیدہ بالوں کے ساتھ زبیدہ کے سامنے آنا جیسے قیامت لانے کے مترادف تھا۔ ربیعہ کو صرف حلیے کا ہی خوف نہیں تھا بلکہ اس کو زینی کی زبان سے بھی خوف آرہا تھا۔ زبیدہ اس سے جاب کے حوالے سے کچھ پوچھ لیتیں تو......؟

ربیعہ کے پیٹ میں جیسے کوئی گھونسے مارنے لگا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ یا تو زینی کو آج دیر ہو جائے یا پھر زبیدہ چائے پی کر چلی جائیں یا پھر ؟ وہ کچھ اور دعا مانگنے کے لیے سوچنے والی تھی، جب دروازہ پر دستک ہوئی تھی۔ ربیعہ نے اطمینان سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے زینی آگئی۔" "اس وقت آتی ہے وہ؟" مغرب میں تھوڑا وقت رہ گیا تھا اور اس وقت زینی کا گھر آنا زبیدہ کے لئے بے حد قابل اعتراض بات تھی۔

"نہیں، عام طور پر تو جلدی آجاتی ہے۔ آج کہہ کر گئی تھی کہ ذرا دیر سے آئے گی۔ کسی دوست کی طرف جانا ہے۔" نفیسہ نے بمشکل

مسکراتے ہوئے کہا۔

ربیعہ جلدی سے دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے چوکھٹ پر کھڑی زینی سے گھبرائے ہوئے انداز میں سرگوشی کی۔

''چھوٹی خالہ آئی ہیں۔ انہیں مت بتانا کہ ماڈلنگ کر رہی ہو اور نہ ہی ان کے سامنے اپنے بال دکھانا۔ چادر کو اچھی طرح لپیٹ ''

ربیعہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ زینی اسے بڑے آرام سے ایک طرف کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئی تھی۔

''السلام علیکم خالہ!'' وہ اندر داخل ہوتے ہی اپنی چادر اتارتے ہوئے سامنے بیٹھی زبیدہ کی طرف گئی۔ چارپائی پر زبیدہ کے ساتھ بیٹھی نفیسہ نے بے اختیار اپنے دانت پیسے۔ زینی کے عقب میں کھڑی ربیعہ نے بے بسی سے ماں کو دیکھا اور زبیدہ چائے کا دوسرا گھونٹ لیتے لیتے رک گئیں۔ ان کی نظریں زینی کے بالوں پر تھیں۔ ایک نظر انہوں نے زینی کو دیکھا پھر نفیسہ کو۔

''تم نے بال کب کٹوائے؟'' انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بجائے اس سے سوال کیا اور زینی نے اس بات کو محسوس کیا تھا۔

''پتہ نہیں، میں نے تاریخ تو لکھ کر نہیں رکھی۔'' اس نے چادر تہہ کی اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے قدرے سرد مہری سے کہا زبیدہ نے اس کے انداز کو محسوس کیا۔

انہوں نے زندگی میں پہلی بار زینی سے اس انداز میں کوئی بات سنی تھی۔ انہیں جیسے کرنٹ لگا تھا۔

''میں نے تو ایسے ہی پوچھا۔ تم بڑی نمازیں اور تہجد پڑھتی ہو۔ اسلام میں بال کٹوانا جائز نہیں ہے۔'' انہوں نے اگلے ہی جملے میں حساب صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔

''اللہ معاف کرنے والا ہے خالہ! اللہ معاف کر دیتا ہے۔''

اس نے بے حد عجیب مسکراہٹ کے ساتھ زبیدہ سے کہا۔ وہ چند لمحوں کے لئے کچھ نہیں بول سکیں۔ کم از کم وہ زینی کے منہ سے اس بات کے جواب میں اس جملے کو سننے کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔ زینی کے بدلے ہوئے جیسے کو انہوں نے محسوس کیا تھا مگر ان کا ذہن ماڈلنگ کی طرف نہیں گیا۔

''کیا کام کر رہی ہو تم؟'' انہوں نے بالآخر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''ماڈلنگ۔'' اس نے اپنے لمبے ناخنوں پر نظر ڈالتے ہوئے ان کے سر پر بم پھوڑا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے دور کھڑی ربیعہ کو مسکراتے ہوئے بے حد معنی خیز نظروں سے دیکھا جو بالکل ساکت اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

زبیدہ نے ہونٹوں سے لگایا کپ دوبارہ پرچ میں رکھ لیا۔ انہوں نے گردن موڑ کر زینی کو دیکھا جو اب اپنے برش نکال کر بالوں میں پھیر رہی تھی۔

''تم ماڈلنگ کر رہی ہو؟ لیکن آپا تو کہہ رہی تھیں، تم آفس میں کام کر رہی ہو۔'' زبیدہ نے نفیسہ کو دیکھا جو اس وقت شرم سے پانی پانی ہو رہی تھیں۔

''پتا نہیں، یہ تو آپ امی سے پوچھیں۔''

اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ زبیدہ نے نفیسہ سے کچھ پوچھنے کے بجائے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے کچھ نوٹ نکال کر بے حد سرد

انداز میں زینی کی گود میں رکھ دیے۔

"میں شیراز کی طرف گئی تھی آج، وہ آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے یہ رقم دی کہ تمہیں دے دوں۔ یہ پندرہ ہزار ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری چوڑیوں کی قیمت سے کچھ زیادہ ہی رقم ہے یہ۔"

بالوں میں برش کرتے ہوئے زینی کا ہاتھ رک گیا۔

"تم نے اپنی چوڑیاں اس کو کیوں دیں؟"

نفیسہ اپنا غصہ بھول کر یک دم بولیں۔ زینی ہزار ہزار کے ان نوٹوں کو دیکھنے لگی۔ وہ چند لمحوں کے لیے ماضی میں لوٹ گئی تھی۔ شیراز نے آخری ادھار لوٹانا فرض سمجھا تھا۔ اسے باقی چار سالوں میں لیے گئے ان گنت چھوٹے بڑے ادھار یاد نہیں آئے۔

"کہہ رہا تھا، اس سے دو چوڑیاں آرام سے بن جائیں گی۔ نہ بنیں تو اسے بتا دوں، وہ مزید رقم بھیج دے گا۔" زبیدہ نے مزید کہا۔

"جب شادی نہیں ہوئی تو چوڑیاں بنوا کر کیا کرنا ہے مجھے۔" زینی نے نوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

نفیسہ نے بے اختیار ہو کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیوں شادی نہیں ہوئی۔ دونوں وقت مل رہے ہیں، بری بات منہ سے مت نکالو۔"

زینی نے کوئی جواب دینے کے بجائے ان نوٹوں کو زبیدہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "ان چوڑیوں کی قیمت اتنی نہیں تھی خالہ! کسی چیز کی قیمت "ضرورت" طے کرتی ہے "پیسہ" نہیں اور ان چوڑیوں کی قیمت کتنی ہے، یہ شیراز کو وقت آنے پر بتاؤں گی۔ قیمت تو ادا کرے گا وہ مگر میری مرضی کی ادا کرے گا۔ ابھی اس سے کہیں، رکھے اپنے پاس۔"

اس نے نوٹوں کو ان کی ہتھیلی پر رکھ کر مٹھی بند کرتے ہوئے سرد مہری سے کہا اور اپنی چادر اور بیگ اٹھاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

شیراز چند لمحے چپ چاپ خالہ زبیدہ کو دیکھتا رہا پھر اس نے ان کے ہاتھ سے نوٹ لے لیے اور اپنا والٹ نکال کر بے حد ناراضی کے عالم میں نوٹ اس میں رکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے، اسے یہ پیسے نہیں چاہئیں تو نہ سہی، میں نے پہلے ہی اسے زیادہ رقم بھجوائی تھی لیکن اب اگر وہ چاہتی ہے کہ میں دوستی کی چوڑیوں کے لیے اسے لاکھوں روپے بھجواؤں تو میں یہ تو نہیں کر سکتا لیکن بہرحال خالہ! آپ گواہ رہیے گا کہ میں نے چوڑیوں کے پیسے بھجوائے تھے۔"

"بالکل زبیدہ! یاد رکھنا یہ بات۔ یہ اتنے کمینے لوگ ہیں کہ ان دو چوڑیوں کو ہزار جگہ دہرائیں گے۔" نسیم نے بے حد غصے کے عالم میں کہا۔ "اور تم نے زبان دیکھی اس کی۔ کیسے دھمکی دے رہی ہے ہمیں کہ قیمت لے گی میرے بیٹے سے۔ ارے اس کے باپ نے کون سی جائیداد دے دی میرے بیٹے کو کہ اب قیمت لینے نکلی ہے وہ۔"

نسیم کو بے حد غصہ آ رہا تھا۔ زبیدہ نے ان کے گھر آ کر حرف بہ حرف زینی کی بات دہرا دی تھی۔

"آپا! میں تو خود اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔ وہ تو پہلے والی زینی لگ ہی نہیں رہی تھی بال کٹوا لیے ہیں۔ میک اپ کیا ہوا

ہے۔ ماں کہتی ہے، آفس میں کام کر رہی ہے۔ بیٹی کہتی ہے، ماڈلنگ کر رہی ہوں۔ میں تو آج خود پریشان ہو گئی ہوں۔" زبیدہ واقعی پریشان تھیں۔

"ماڈلنگ!" شیراز بے اختیار چونکا۔

یہ آخری چیز تھی جو کوئی زینی سے توقع کر سکتا تھا۔

"ہاں، یہی کہا اس نے مجھ سے۔"

"اب یقین آ گیا نا تمہیں کہ میرے بیٹے کو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ اس لڑکی کے لڑکوں کے ساتھ واقعی چکر تھے۔ اب تو پتا چل گیا تمہیں۔" نسیم کا جیسے سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ خاندان بھر میں یہ زبیدہ ہی تھیں جو ڈھکے چھپے لفظوں میں زینی کی حمایت کرتی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ شیراز کو کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی۔

"نہیں آپا! آپ ٹھیک کہتی ہیں، میں ہی غلط تھی۔ زینی کے طور اطوار واقعی خراب ہیں۔ میں تو بس منگنی ٹوٹنے کے بعد اس کی حالت دیکھ کر سوچتی رہی۔ اس وقت بڑی خراب حالت تھی اس کی۔"

شیراز نے باقی باتیں نہیں سنیں، وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر کے لئے ضمیر جاگا تھا اس کا، کچھ دیر کے لئے وہ پریشان ہوا تھا۔ اسے زینی کی کسی بات نے پریشان نہیں کیا تھا۔ نہ پیسے واپس کرنے نے، نہ اپنی مرضی کی قیمت کی دھمکی نے۔ وہ جانتا تھا، زینی کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ سب غصے میں کہے ہوئے چند جملوں سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اسے صرف ایک جملہ چبھا تھا۔

"جب شادی نہیں ہوتی تو چوڑیاں بنوا کر کیا کروں گی۔" "آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ زینی کی شادی نہ ہو۔ وہ اتنی خوبصورت ہے۔ خاندان میں کتنے لڑکے اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور خاندان نہیں تو محلے میں یا جاننے والوں میں۔ ٹھیک ہے، میرے جیسا رشتہ نہیں ملے گا اسے لیکن کوئی نہ کوئی رشتہ تو مل جائے گا اسے۔ منگنیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ لڑکیاں رو دھو کر ٹھیک ہو جاتی ہیں پھر شادی کے بعد سب کچھ بھول جاتی ہیں۔ آخر میں بھی تو زینی کو بھول گیا ہوں پھر زینی مجھے کیوں نہیں بھولے گی۔"

شیراز نے اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے اپنے ضمیر کو دوبارہ تھپکیاں دے کر سلانا شروع کیا۔ اسے اس وقت ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ بھی ابھی تک زینی کو نہیں بھولا تھا۔ کچھ نہ کچھ تھا جو کبھی نہ کبھی اسے بے چین کرتا تھا مگر وہ کبھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ یہ محبت تھی۔ وہ اب صرف اور صرف شینا سعید نواز سے محبت کرتا تھا۔

اس نے جیسے خود کو یاد دلایا اور ایک عجیب سی خوشی محسوس کی۔ "دیکھا میں کہتا تھا نا کہ میں زینی سے اب محبت نہیں کرتا، اب شینا سے محبت کرتا ہوں۔ محبت تو خوشی دیتی ہے جیسے میں شینا کے بارے میں سوچ کر ہوتا ہوں۔ محبت بے چین تھوڑی کرتی ہے۔ جس طرح میں زینی کے بارے میں سوچ کر ہوتا ہوں۔"

شیراز نے جیسے اطمینان کا سانس لیا اور شکر کا بھی۔ اس نے زینی کے بارے میں اتنے ہمدردانہ انداز میں سوچتے ہوئے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس نے اور اس کے گھر والوں نے زینی کے کردار کے بارے میں شرمناک انداز میں کیچڑ اچھالی تھی۔ شاید اسے یہ لگا تھا کہ کسی لڑکی کو کسی

لڑکے کے ساتھ دیکھ لینے کے بعد اس کے ساتھ بھی کیا جا سکتا تھا اور اس کے بارے میں بھی کچھ کہا جا سکتا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ شیراز نے اس لڑکے کے خط دینے کی کوشش پر زینی کے چہرے کا خوف نہ دیکھا ہو یا زینی کا اس خط لینے سے انکار نہ سنا ہو۔

وہ ان دونوں چیزوں سے بھی آگاہ تھا لیکن وہ آگاہی اس وقت اس کے کام نہ آتی۔

اسے چند لمحوں کے لیے اندھا بن جانا تھا اور پھر اس کی قسمت بدل جاتی۔ رشتے کی اس ڈور کو وہ خود پر کوئی حرف آئے بغیر اور کوئی سوالیہ نشان بنے بغیر توڑ پاتا۔

اسے صرف یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس ڈور کو توڑنے کی کوشش میں اس نے زینی کی انگلیاں کاٹ ڈالی تھیں۔

☆☆☆
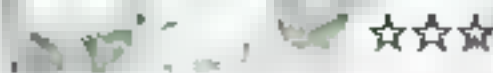
سوئی ہوئی زینی کی آنکھ بچوں کے شور سے کھلی تھی۔ اس نے کچھ دیر آنکھیں کھلی رکھ کر شور کا ماخذ سمجھنے کی کوشش کی۔ یقیناً زہرہ آپا آئی تھیں۔ اس نے کروٹ لے کر دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ زہرہ صحن میں نفیسہ کے پاس بیٹھی روتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

زینی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ اندازہ لگانا اس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ اب کیا مسئلہ ہوگا پھر کوئی نیا جھگڑا، کوئی نیا مطالبہ۔ اس بار کافی مہینے گزر گئے تھے خیریت سے اور اسے خود حیرانی تھی کہ اتنے مہینے نعیم بھائی کی طرف سے کسی مطالبے کے بغیر کیسے گزر گئے تھے۔

وہ اٹھ کر باہر آ گئی اور اسے دیکھتے ہی نفیسہ کی برہمی اور زہرہ کے آنسوؤں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''پھر نکال دیا سسرال والوں نے یا کسی نئے مطالبے کے ساتھ بھیجا ہے آپ کو؟''

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔ تم سے بار بار کہہ رہی تھی کہ چھوڑ دو یہ سارے کام لیکن نہیں۔ تم بہنوں کے گھر تباہ کروا کر چھوڑو گی۔'' نفیسہ نے طیش میں اس کو مخاطب کر کے کہا۔

''اچھا یعنی اس بار میری ماڈلنگ کا بہانہ بنا کر آپ کو نکالا ہے۔'' اس نے اطمینان سے صحن میں کھیلتی بچیوں کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''اب دوبارہ آپ واپس اس گھر میں مت جائیں۔ کیا ہے وہاں پر جس کے لیے اتنی ذلت اٹھا رہی ہیں۔ آٹھ سو روپیہ ماہانہ؟ وہ میں آپ کو دے دوں گی۔ آپ نہیں رہیں۔''

''میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں زینی! چھوڑ دو یہ سب کچھ۔ ابھی انہوں نے مجھے گھر سے نہیں نکالا صرف دھمکایا ہے لیکن وہ نکال دیں گے مجھے۔ میری بیٹیوں کی زندگی خراب ہو جائے گی۔'' زہرہ آپا نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

''آپ میرے سامنے ہاتھ نہ جوڑیں۔ میں نے اپنے باپ کی نہیں مانی تو آپ کی کیسے مانوں گی۔'' اس نے بے حد صاف اور دوٹوک لفظوں میں کہا۔ ''لیکن آپ سے یہ ضرور کہتی ہوں کہ آپ کی بیٹیوں کی زندگی کو کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے پلٹ کر زہرہ آپا سے کہا۔

''امی! آپ کیوں نہیں سمجھ تیں اسے؟'' زہرہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''یہ شیراز کا بدلہ ہم سے کیوں لینے لگی ہے۔ پہلے شیراز کی وجہ سے اس کا دماغ ساتویں آسمان پر تھا کہ اس کا منگیتر تو سرکاری افسر بننے والا ہے یہ سرکاری افسر کی بیوی بنے گی۔''

زینی نے پلٹ کر بہن کو تعجب سے دیکھا۔ یہ کب ہوا تھا کہ اس کے انداز میں اس کی اپنی بہن کو غرور کا شائبہ ہوا تھا۔ ایسا غرور جس کا وہ آج حوالہ دے رہی تھی۔ سرکاری افسر کی بیوی... ؟ اس نے تو زندگی میں کبھی اس چیز کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو شیراز کی بیوی بننا چاہتی تھی۔ چاہے شیراز جو مرضی ہوتا وہ عہدے کے پیچھے پاگل نہیں ہوئی تھی، وہ محبت میں خوار ہو رہی تھی۔

''اور اب اگر منگنی ٹوٹ گئی ہے تو اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔ اتنی خود سر ہو گئی ہے یہ اور آپ اور ابو اس کو روک نہیں رہے۔ میرے گھر کو کچھ ہوا نا امی تو یہ سب کچھ زینی کی وجہ سے ہو گا۔ میں ساری عمر اسے معاف نہیں کروں گی۔''

زینی نے جواب میں کچھ نہیں کہا، وہ پلٹ کر کمرے میں چلی گئی تھی۔

اپنے بستر پر جا کر دوبارہ بیٹھتے ہوئے اسے یاد آیا۔ پہلے ہمیشہ زہرہ آپا کے اس طرح گھر آنے پر وہ بھی ان کے ساتھ رونا دھونا شروع کر دیتی تھی پھر نمازوں کے ساتھ وظیفے شروع ہو جاتے تھے۔ آج ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ اطمینان سے اندر آ کر بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

''کیا میں واقعی بے حس ہو گئی ہوں؟'' اس نے بے اختیار اپنے آپ سے پوچھا۔

''شاید۔'' اس نے جیسے خود ہی جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

''زینب! کہاں تھیں یار! میں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔''

فاران اسے دیکھتے ہی تیر کی طرح اس کی طرف آیا اور پھر اس نے زینی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''We cut the deal'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے زینی کو مبارک باد دی۔ زینی نے حیرانی سے اس سے الگ ہوتے ہوئے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''کون سی ڈیل؟''

''تم بہت لکی ثابت ہوئی ہو میرے لیے۔''

وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ زینی کو کچھ بچھا۔ وہ اب اسے اس انٹرنیشنل برانڈ کے بارے میں بتا رہا تھا جس کی کمپین کے لئے اس نے دو دن پہلے اسے چند لوگوں سے ملوایا تھا۔ کاسمیٹکس کا وہ برانڈ پہلی بار کسی ملک میں کسی اسٹیبلش ماڈل یا ایکٹریس کو لینے کے بجائے ایک نئے چہرے کو لے رہا تھا۔ ان کا اس کمپین کے لئے ابتدائی بجٹ ایک کروڑ تھا۔ فاران کو ملنے والی یہ اب تک کی سب سے بڑی کمپین تھی۔

''تم کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ برانڈ کو انٹروڈیوس کروانے کے لئے کون کون مر رہا تھا۔ یہ کمپین تم کو لائف اسٹائل دے گی۔ ایک بہت شاندار لائف اسٹائل۔ ایک بار یہ کمپین لانچ ہو جائے تو تم ایک کیٹ واک کے لیے اتنے پیسے لوگی جتنی ٹاپ کی ماڈلز اتنے سالوں سے لے رہی ہیں۔ یہ برانڈ تمہاری ایک ایک چیز کا خیال رکھے گا۔'' فاران اسے تفصیل بتا رہا تھا۔ وہ اب اس کے آفس میں داخل ہو گئے تھے۔

''تمہاری وارڈ روب، تمہارا اسٹائلسٹ، تمہارا ہیئر اسٹائلسٹ، تمہاری ڈریس ڈیزائنر، تمہاری Accessories تمہاری بیوٹیشن سب وہ

ہائر کریں گے۔ تم صرف ان کو ریپریزنٹ کرو گی۔"

"کافی مے گی؟" زینب نے کہا۔ وہ صوفہ پر بیٹھ گئی تھی۔

"ہاں ہاں، آج سب کچھ ملے گا۔" فاران نے انٹر کام اٹھا کر اپنی سیکرٹری کو کافی کے ساتھ ریسٹورنٹ سے کچھ دوسرے اسنیکس منگوا کر بھجوانے کے لیے کہا۔ زینی بیگ سے ہیر برش نکال کر اپنے بالوں میں برش کرنے لگی۔

"نہ صرف یہ بلکہ پورا ایک سال تمہاری ساری کاسمیٹکس وہی دیں گے اور اس کی مالیت بھی لاکھوں میں ہے۔"

فاران نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا۔

"لنچ کہاں سے منگوا رہے ہو آج؟" زینب نے اس کو ایک بار پھر ٹوکا۔

"تم بتا دو۔" فاران نے فوراً کہا۔ "یا ایسا کرتے ہیں، کہیں چلتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" زینی نے سر ہلایا اور دوبارہ برش کرنے لگی۔

"یہی نہیں، وہ کہہ رہے ہیں کہ ان کی کمپین کے دوران تم شوز یا شوٹس میں جتنی بھی وارڈ روب استعمال کرو گی، وہ استعمال کے بعد تمہاری ملکیت ہوگی۔" فاران اسے ایک ایک چیز بتا دینا چاہ رہا تھا۔

"تم کوئی سلیپنگ پلز لیتے ہو؟" زینب نے ایک بار پھر مداخلت کی وہ جیسے اس کی گفتگو سے بالکل لاتعلق تھی۔

"ہاں۔" فاران نے چونک کر اسے نام بتایا۔

"مجھے بھی منگوا دو۔"

"میں دیکھتا ہوں۔ شاید میری دراز میں پڑی ہو۔ نہ ہوئی تو میں سارہ سے کہتا ہوں۔"

فاران نے دراز کھولتے ہوئے دیکھا۔ اسے سلیپنگ پلز مل گئی تھیں۔

"and guess what پہلا کمرشل کہاں شوٹ کرنا ہے۔ ملائیشیا میں۔" اس نے سلیپنگ پلز زینی کو تھمائیں۔ جنہیں اس نے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

وہ اب نیل فائل نکال کر اپنے ناخنوں کو رگڑ رہی تھی۔ فاران یک دم چپ ہو گیا۔

"تمہیں خوشی نہیں ہو رہی؟"

"کس بات کی؟"

وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ "زینب ضیاء یہ Once in a lifetime chance ہے جو تمہیں ملا ہے یا یہ سمجھو، تم نے جیک پاٹ ہٹ کیا ہے۔ ہماری سپر ماڈلز ترستی ہیں ایسے چانسز کے لیے۔" وہ اسے اس کمپین کی اہمیت کا احساس دلا رہا تھا۔

"ایک رات، ایک ایڈ اور اگلے دن پورا پاکستان پہچان رہا ہوگا تمہیں۔ ہر ایک کے ہونٹوں پر ایک ہی نام ہوگا۔ زینب ضیاء زینب

ضیاء...''

وہ بے اختیار چونکی۔ ''زینب ضیاء کیوں؟ خالی زینب کیوں نہیں؟''

''کیوں کیا ہوا؟ زینب نام کی تو اور بھی لڑکیاں ہیں۔ خالی زینب تو نہیں دے سکتے۔''

''پھر نام بدل دو میرا۔''

''گڈ آئیڈیا... کیا نام رکھیں؟'' فاران بے اختیار محظوظ ہوا۔

''کوئی بھی نام جس میں میرے باپ کا نام نہ آئے۔ اس کا لک میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے آخری جملہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں کیا ہوا؟'' زینی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ربیعہ کی سرخ اور متورم آنکھیں دیکھ لی تھیں۔ وہ ابھی چند لمحے پہلے ہی باہر سے آئی تھی۔ ربیعہ اپنے بستر پر گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔

''چھوٹی خالہ آئی تھیں۔'' زینی اپنا بیگ رکھتے رکھتے ٹھٹک گئی۔ ان کا اتنی جلدی دوبارہ آنا کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔

''پھر؟'' زینی یک دم بے حد سنجیدہ ہو گئی۔

''پھر یہ کہ وہ بتا گئی ہیں کہ اگر تم نے ڈھنگ نہ چھوڑا تو وہ عمران کے ساتھ میری منگنی توڑ دیں گی بلکہ وہ کہہ رہی تھیں کہ عمران تو اصرار کر رہا ہے کہ رشتہ ختم کر دیں۔''

''تو ختم کر دیں۔'' زینی نے بے حد سرد مہری سے کہا۔

''تم کتنی خود غرض ہو گئی ہو زینی!'' ربیعہ اس کی بات پر جیسے تڑپ گئی۔

''منگنی توڑنے کی بات وہ کر رہی ہیں اور خود غرض میں ہو گئی ہوں۔'' اس نے سلگ کر کہا۔

''وہ تمہاری وجہ سے منگنی توڑنا چاہتی ہیں۔'' ربیعہ نے اس کی بات کاٹی۔

''میری وجہ سے نہیں، ان کو بھی کہیں مال نظر آنا شروع ہو گیا ہوگا۔'' زینی نے تلخی سے کہا۔

ربیعہ اپنے بستر سے اٹھ کر اس کے بستر پر آ گئی اور اس نے زینی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

''زینی پلیز، چھوڑ دو یہ سب کچھ۔ اس میں بڑی بے عزتی ہے۔'' اس نے جیسے منت کرنے والے انداز میں زینی سے کہا۔

''پیسے کے بغیر دنیا میں ویسے ہی بڑی بے عزتی ہے۔'' اس نے بے حد ٹھنڈے انداز میں کہا۔ ''یہ بے عزتی مجھے دنیا میں بے عزتی سے بچا لے گی۔''

''اور جب تک یہ ہوگا، آپا کا گھر تباہ ہو چکا ہوگا۔ میری منگنی ٹوٹ چکی ہوگی۔'' ربیعہ نے اس کی بات کاٹی۔

"شادی کے پانچ سالوں میں پچیس بار آپا کا گھر ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گیا۔ اس میں میرا ہاتھ تو نہیں تھا اور جہاں تک تمہاری منگنی ہے تو ٹوٹنے دو اس منگنی کو۔ جو رشتے محبت کے بجائے بلیک میلنگ کی وجہ سے جڑے ہوں، ان کو ختم کر دینا چاہیے۔ عمران تم سے شادی کر رہا ہے، مجھ سے تو نہیں کر رہا پھر اس کو کیا تکلیف ہے۔ میں جو چاہے کروں۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"مرد بے عزتی محسوس کرتے ہیں ایسے خاندانوں میں رشتہ کرتے ہوئے جہاں ۔۔۔" اس نے ربیعہ کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"سالی، ماڈلنگ کرے گی تو وہ کسی کو منہ نہیں دکھا سکے گا۔ سسر پیٹ کاٹ کر جہیز کا سامان دے گا تو اس کو بیچتے ہوئے اس کی عزت کو کچھ نہیں ہوگا۔" وہ بے اختیار ہنسی۔

"زینی!" ربیعہ نے ایک بار پھر کہنا چاہا۔

"مردوں کی بے عزتی کے معیار کتنے چھوٹے ہیں ہمارے معاشرے میں۔ ایک آپا کے شوہر ہیں، جنہیں بیوی کے باپ کے دیے ہوئے بستر میں سو کر، بیوی کے لائے ہوئے برتنوں میں کھا کر بیوی کو گالی دیتے ہوئے، ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی۔ ہاں بے عزتی محسوس ہوتی ہے، جب بیوی کی بہن ماڈلنگ کرنے لگے۔ ایک تمہارا منگیتر ہے جو بالکل آپا کے شوہر کی طرح میرے باپ سے بیٹی کے ساتھ ساتھ جہیز کی صورت میں ان کی ہر تی جمع پونجی بھی ہتھیائے گا اور پھر ایک لمبی فہرست بھی تھمائے گا، ان تمام کاموں کی جن سے اس کی ممکنہ بے عزتی ہو سکتی ہے اور اس میں سر فہرست ہو گی بیوی کی بہن کی ماڈلنگ۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی یوں جیسے اپنی بات سے خود بے حد محظوظ ہوئی ہو۔

"ان کو ابو کی عزت کا احساس نہیں ہے۔ تم کو ہے تو تم چھوڑ کیوں نہیں دیتیں یہ کام۔"

ربیعہ کو اس کی ہنسی بہت بری لگی۔ اس کے باوجود کہ آج کئی مہینوں بعد اس نے زینی کو ہنستے دیکھا تھا مگر زینی اس طرح کبھی ہنستی بھی تو نہیں تھی۔

"میں اپنے باپ کی نافرمان اولاد ہوں لیکن اپنے باپ کے علاوہ اس دنیا میں فی الحال میں کسی دوسرے مرد کی عزت نہیں کرتی۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"چھوڑ دو زینی! یہ سب چھوڑ دو۔" ربیعہ نے ایک بار پھر اس کی منت کی۔

"اور چھوڑنے کے بعد کیا کروں، آپا کی طرح کسی مرد سے شادی کر کے اس کے تلوے چاٹوں، گالیاں کھاؤں اور جہیز کے نام پر مار کھا کر دوبارہ یہاں آ بیٹھوں۔" اس کے لہجے میں زہر کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے زینی! کیوں ہر ایک کو تم ایک جیسا سمجھنے لگی ہو؟ ساری دنیا بری نہیں ہوتی۔" ربیعہ زچ ہو گئی تھی۔

"جب مجھے دنیا میں کوئی اچھا نظر آیا نا تو میں تمہاری بات پر یقین کر لوں گی۔ فی الحال دنیا بری ہی ہے میرے لیے۔"

وہ اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

زبیدہ کو زینی کی ماڈلنگ کا پتا چلنے کے بعد یہ بات زیادہ دیر تک راز نہیں رہی۔ آہستہ آہستہ پورے خاندان اور محلے کو اس بارے میں پتا چل گیا تھا۔ محلے میں پہلے ہی زینی کے روزانہ گاڑی میں جانے اور آنے کی وجہ سے چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔

اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ زینی کو اپنے محلے کے کسی لڑکے نے تنگ کیا ہو مگر اس کی ماڈلنگ کا پتہ چلنے کے بعد اب اکثر ایسا ہونے لگا تھا کہ وہ اس گاڑی میں آنے اور جانے کے دوران کسی نہ کسی سے، کوئی نہ کوئی جملہ سن لیتی۔ عجیب بات تھی۔ اسے اب کسی، نظر، کسی ہنسی، کسی بات سے خوف نہیں آتا تھا۔ وہ خوف جو تب تک اسے اپنے حصار میں لیے رہے تھے، جب تک وہ نظر جھکا کر سر نیچا کر کے چلتی رہی تھی۔

وہ اب مردوں کے ساتھ کام کرتی تھی۔ ان سے گلے ملتی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق کرتی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی تھی۔ ان کے سامنے قابل اعتراض کپڑے پہن کر فوٹو شوٹس کرواتی تھی۔ اسے آخر اب کس چیز سے جھجک محسوس ہوتی۔

زینب ضیاء کی تصویر زندگی کے کینوس پر نئے رنگوں سے پینٹ کی جا رہی تھی۔

وہ لڑکا بہت لمبے عرصے تک دوبارہ اسے نظر نہیں آیا۔ شاید وہ بہت دنوں تک زینب کا انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو کر کہیں اور چلا گیا تھا مگر زینی نے اس کا انتظار نہیں چھوڑا۔ شعوری اور لاشعوری طور پر ہر روز گاڑی سے اترتے ہوئے وہ ایک نظر اطراف میں ڈالتی تھی۔ وہ ایک بار اس لڑکے سے دوبارہ سامنا چاہتی تھی اور یہ موقع اسے بہت جلد مل گیا تھا۔

ایک لمبے عرصے کے بعد اس نے بالآخر گھر واپس آتے ہوئے اسے اسی دن وہیں دیکھا تھا، جہاں وہ ہمیشہ اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ وہ گاڑی میں تھی اور اس نے اپنے اندر جیسے لاوا پھوٹتے محسوس کیا تھا۔

ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ زینی نے اپنا بیگ کھول کر چند نوٹ نکالے اور ڈرائیور کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ لڑکا دیکھ رہے ہو؟" زینی نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

"جی۔" ڈرائیور نے کچھ چونک کر اس لڑکے کو دیکھا جو خود بھی اب اس گاڑی کی طرف متوجہ تھا اور شاید اس نے زینی کو بھی دیکھ لیا تھا۔

"یہ تنگ کرتا ہے مجھے۔ ابھی میں اتروں گی تو یہ میرے پیچھے آئے گا۔ میں چاہتی ہوں، تم اس کی اتنی پٹائی لگاؤ کہ یہ دوبارہ اس محلے میں آنے کی جرأت نہ کرے۔" اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی اور گاڑی سے اتر گئی۔

وہاں گلی میں کچھ اور لڑکے بھی کھڑے تھے اور انہوں نے ہمیشہ کی طرح زینی کو دیکھ کر ہلکی ہی سیٹیاں بجائیں اور ہنستے ہوئے کچھ جملے کسے۔ روز یہاں سے گزرتے ہوئے اب اس کا استقبال اسی طرح ہوتا تھا۔ پہلے ان میں سے کوئی زینی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ وہ ضیاء صاحب کی بیٹی تھی اور اس کی عزت کرنے کے لیے یہ حوالہ کافی تھا۔ اس کی شیراز کے ساتھ منگنی ہو جانے کے بعد وہ اس محلے میں اور بھی قابل احترام ہو گئی تھی۔

وہ محلے کے ہی ایک دوسرے ایسے لڑکے سے منسوب تھی جو صرف اپنے خاندان کا نہیں، اس محلے کا سب سے قابل لڑکا تھا جس کی تعلیمی کامیابیوں کی وجہ سے پانچویں جماعت کے وظیفے کے امتحان سے اس کی تصویریں اخباروں میں سب دیکھ چکے تھے اور سب جانتے تھے کہ وہ افسر بننے والا تھا یا بالآخر بن جاتا اور پھر کون تھا جو زینب ضیاء کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھتا۔ اس کے باوجود کہ سب اسے محلے کی حسین ترین لڑکی سمجھتے تھے

اور بہت سے شیراز پر صرف اسی ایک وجہ سے رشک کرتے تھے۔

اور اب... اب وہ ضیاء صاحب کی بیٹی تو تھی لیکن اپنے منگیتر کا متروک اثاثہ جسے کسی لڑکے کے ساتھ پکڑا گیا تھا اور جس کا حسن بہت جلد اخباروں اور ٹی وی کی زینت بننے والا تھا۔ وہ اب کسی کی عزت نہیں تھی، صرف ایک ماڈل تھی اور زینی کو یقین تھا، آج وہ لڑکے اس لڑکے کو اس کے پیچھے گلی میں جاتا دیکھتے تو آج نہ سہی کل سہی مگر شبے کا شکار ضرور ہوتے اور پھر اس کے پیچھے صرف ایک لڑکا نہیں آتا کوئی بھی کبھی بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑتا۔

اس کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس لڑکے نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتی رہی۔ وہ لڑکا بھی بڑے اطمینان سے اس کے پیچھے چلتا رہا۔ زینی اب لڑکوں کے اس گروپ کے پاس پہنچنے والی تھی اور وہ لڑکا پہلی بار کچھ کنفیوز ہوا۔ اس نے اس سے پہلے گلی میں اس جگہ لڑکوں کا اتنا جمگھٹا نہیں دیکھا تھا، نہ ہی اس سے پہلے یہاں کھڑے اکا دکا لڑکوں کو بھی زینی پر آوازے کستے سنا تھا۔ آج وہ واضح طور پر زینی پر ہی قہقہے لگاتے ہوئے آوازیں کس رہے تھے۔ وہ دور سے بھی یہ بے حد آسانی سے دیکھ اور سمجھ رہا تھا اور یہ چیز اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

زینی لڑکوں کے اس گروپ کے سامنے سے روز کی طرح نہیں گزری، وہ یک دم ان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور یک دم پلٹ کر اس لڑکے کے بالمقابل آ گئی۔ لڑکوں کے گروپ کا شور اچانک ختم گیا۔ وہ بھی کچھ کنفیوز ہوئے تھے۔ وہ ان کے سامنے کیوں رکی تھی مگر ابھی انہیں مزید حیران ہونا تھا۔ زینی کے پیچھے آتا وہ لڑکا بری طرح گڑبڑایا تھا۔ اس کے تو فرشتوں نے بھی کبھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ سنسان گلی میں گھبراتی، ہکلاتی وہ لڑکی اتنے لوگوں کے بیچ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو جائے گی۔ اس کے ہاتھوں کے توتے نہ اڑتے تو کیا ہوتا۔

"کیا کام ہے آج تمہیں مجھ سے؟ سلام کرنا ہے؟ ہاتھ پکڑنا ہے؟ اظہار محبت کرنا ہے؟ خط پکڑانا ہے؟ یا یہ خبر سنانی ہے کہ تم اپنی ماں کو میرے گھر رشتے کے لیے بھیجنا چاہتے ہو؟"

اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ آس پاس موجود ہر لڑکے نے سنی تھی اور اس لڑکے کے ہی نہیں اوسان خطا ہو گئے تھے وہاں موجود دوسرے لڑکوں کے بھی کچھ دیر کے لئے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

"وہ جس نے پچھلی بار تمہارا خط پکڑا تھا نا، وہ منگیتر تھا میرا۔ منگنی توڑ گیا وہ اور یہ جو کتے بھونک رہے ہیں نا، یہ تمہاری وجہ سے بھونکنا شروع ہوئے ہیں۔"

اس نے لڑکوں کے گروپ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ لڑکا کچھ کہنے کے بجائے یک دم بھاگنے کے لیے وہاں سے پلٹا مگر ڈرائیور تب تک اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس لڑکے کی پٹائی شروع کر دی۔ وہ اسے بڑی بے رحمی اور بے دردی سے پیٹ رہا تھا۔ لڑکا مزاحمت کی کوشش کر رہا تھا مگر بھیم شحیم ڈرائیور کے سامنے اس کا منحنی سا وجود کتنی مزاحمت کر سکتا تھا۔

گلی میں اب مکمل سکتہ تھا جسے اس لڑکے کی چیخوں اور پٹائی کی آوازوں کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں توڑ رہی تھی۔ لڑکوں کا وہ پورا گروپ سانس روکے اس لڑکے کو دیکھ رہا تھا جس کی ناک اور منہ سے اب خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔

وہ معافی مانگتے ہوئے زینی کو اپنی بہن بنانے کا اعلان کر رہا تھا۔ زینی مزید وہاں نہیں رکی۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر لڑکوں کے اس گروپ

کو بے حد چیلنج کرتی ہوئی نظروں سے تنفر آمیز انداز میں دیکھ کر وہاں سے چلی گئی۔

اس گلی میں دوبارہ زینی پر کسی نے جملہ کسا تھا نہ کوئی اس کے پیچھے آیا تھا۔

☆☆☆

شیراز اب CTP کے بعد STP کی ٹریننگ کر رہا تھا۔ اکیڈمی میں کسی کو شیراز کی منگنی کا پتا نہیں تھا۔ سعید نواز نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ شادی ہونے سے پہلے کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کرے کہ وہ سعید نواز کا داماد بننے والا ہے۔ شیراز یقیناً ان کی حکم عدولی کر کے خود کو مستقبل میں ملنے والا اعزاز سب کو دکھاتا۔ مگر جو اس کے کام میں نہ ہوتا جو وقتاً فوقتاً سعید نواز کی ہدایات شیراز کے گوش گزار کر کے جیسے اس کے جذبات پر بند باندھتا رہتا تھا اور کسی انکشاف کی صورت میں سعید نواز کے ممکنہ ردعمل سے بھی اسے ڈراتا رہتا تھا اور یہ دھمکیاں شیراز کے لیے کافی کارگر ثابت ہوئی تھیں۔

سعید نواز یقیناً اس کے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے اتنے محتاط تھے۔ یقیناً ان کے نزدیک یہ بات شرمندگی کا باعث ہوتی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی شیراز جیسے خاندان میں کر رہے تھے اور وہ اپنے حلقہ احباب کے بے جا اعتراضات سے بچنے کے لیے ہی اتنی احتیاط کر رہے ہوں گے۔

شیراز نے سعید نواز کی اتنی احتیاط کی یہی توجیہہ سوچ کر خود کو اطمینان دلایا تھا۔

شادی کی تاریخ بھی اتنی ہی سادگی سے طے ہوئی تھی جتنی سادگی سے منگنی ہوئی تھی۔ اس بار شیراز نے پورے خاندان کو لے جانے کی حماقت نہیں کی تھی۔ اس بار وہ صرف اکبر اور نسیم کو ہی لے گیا تھا اور لے جانے سے پہلے وہ انہیں تین چار مرتبہ ایک ہوٹل میں لے جا کر کھانے کے برتنوں اور کھانے کے آداب کے بارے میں سمجھاتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ حالات میں کچھ زیادہ بہتری نہیں آئی تو اس نے انہیں صرف ایک ہدایت کی۔

"کم سے کم کھائیں۔"

اکبر اور نسیم نے اس بار قابل رشک پرفارمنس کا مظاہرہ کیا تھا انہوں نے سوپ پینے سے انکار کیا تھا۔ چاول لینے کی حماقت نہیں کی تھی۔ صرف قورمہ لیا تھا اور اسے نان کے ساتھ کھاتے رہے۔ وقتاً فوقتاً وہ شیراز کو دیکھتے رہے جو انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں مختلف ہدایات دیتا رہا۔

اکبر اور نسیم نے بے حد جی للچانے کے باوجود ٹیبل پر موجود دوسری کسی ڈش کو نہیں لیا۔ حتیٰ کہ کبابوں کو بھی نہیں کیونکہ انہیں کانٹے سے کھانا پڑتا۔ کسی نے ان سے اصرار کیا بھی نہیں شیراز کی ہدایات کے مطابق انہوں نے آخر میں گرین ٹی پینے سے بھی انکار کر دیا۔

اور ان کے اس انکار کے ساتھ ہی ڈنر ختم ہو گیا۔ شیراز نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔

شینا اس بار بالآخر ان کے سامنے شلوار قمیص میں آئی تھی مگر شیراز نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ اس شلوار قمیص کے مقابلے میں وہ جینز اور ٹاپ زیادہ مہذب تھے۔ سلیولیس قمیص کا گلا صرف آگے سے ہی نہیں پیچھے سے بھی بے حد نیچا تھا۔ وہ تقریباً کمر تک آ رہا تھا اور اس پر قیامت یہ تھی کہ شینا آج بالوں کو بنا تا کلپ کے ساتھ گردن سے کچھ اوپر لپیٹے ہوئے تھی۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔

رہی سہی کسر اس کی قمیص کے لمبے چاکوں نے پوری کر دی تھی جس کے دونوں اطراف سے اس کی خوبصورت سفید کمر نظر آ رہی تھی۔

اس کے شلوار نما پاجامہ کے پائنچے اوپر چڑھ گئے تھے۔ وہ اکبر کے بالکل سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اکبر کو پسینہ آ رہا تھا۔

اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کو اس طرح کے لباس میں ملبوس دیکھا تھا اور وہ بھی وہ لڑکی تھی جو اس کی بہو بننے والی تھی۔

"لیکن یہ تو ماڈرن زمانے کی بچی ہے۔ اونچے خاندان کی لڑکی ہے۔ امیر خاندانوں میں ایسی طرح کے پہناوے ہوتے ہیں۔ اب اس کا باپ بھی تو پاس بیٹھا ہے۔ اسے کوئی اعتراض ہوتا تو شینا کیوں ایسے کپڑے پہن کر آتی۔ شادی ہو جائے گی تو شیراز خود ہی اسے سمجھا دے گا۔"

اکبر اپنے آپ کو خود ہی سمجھانے میں مصروف تھا۔ جبکہ نسیم نے ان ساری چیزوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ "جب بہو اتنی دولت لا رہی ہے تو خواہ مخواہ میں اس طرح کی چھوٹی موٹی باتوں پر کیا اعتراض کرنا۔ ویسے بھی اب ہم کوئی محلے والے تو نہیں رہے۔ بنگلوں میں رہنا ہے انہوں نے۔" وہ اپنے آپ کو تاویلات دے رہی تھیں۔

اور شیراز شینا کے سامنے بیٹھا اس پر مکمل طور پر قربان ہو رہا تھا۔ شینا اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے بیٹھی تھی۔ وہ صرف سعید نواز اور سعیدہ کی باتیں سن اور انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر شیراز کو نہیں دیکھا تھا۔

جبکہ شیراز کو اس کی خود اعتمادی مار رہی تھی۔ اسے صرف یہ اندازہ نہیں تھا کہ شینا میں اور بھی بہت کچھ تھا جو اسے مارنے والا تھا۔

شادی کی تاریخ طے ہونے کے کچھ دنوں بعد سعید نواز نے شادی کی تیاریوں کے لیے پانچ لاکھ روپے کا چیک دیتے ہوئے اسے یہ ہدایت دی کہ وہ بے حد سادگی سے شادی چاہتے ہیں۔ وہ خاندان کے قریبی لوگوں کے علاوہ شادی میں کسی دوسرے کی شرکت نہیں چاہتے۔ نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ شیراز کی طرف سے بھی۔ انہوں نے شیراز تک شینا کا یہ مطالبہ بھی پہنچایا کہ شادی کا صرف ایک مشترکہ فنکشن ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہہ رہے تھے کہ شیراز ولیمے کا اہتمام نہ کرے۔

پانچ لاکھ کا چیک ہاتھ میں لے کر سعید نواز کو "نہ" کہنا ناممکن تھا۔ شیراز بے حد سعادت مندی سے انہیں "ہاں" کہہ کر آ گیا تھا مگر اس کے گھر والوں کو پہلی بار کچھ اعتراض ہوا۔

ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ اس کا بھی ولیمہ نہ کرتے جس کا صاف صاف مطلب یہ تھا کہ محلے اور خاندان کے لوگوں کو یہ پتہ ہی نہ چلتا کہ وہ کیسے امیر گھرانے سے بہو لا رہے ہیں۔ کیسے اونچے خاندان سے ان کی رشتہ داری ہو رہی ہے اور خاندان اور محلے کے لوگوں کو یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ "وہ امیر ہو گئے ہیں" تو یہ ان کے لیے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔

شیراز کی بہنوں کو یہ غم تھا کہ ان کی سہیلیاں ان کی خوبصورت، ماڈرن اور امیر بھابھی کے ڈھیر سارے زیورات کیسے دیکھیں گی۔

شیراز خود بھی کچھ رنجیدہ تھا کیونکہ وہ خود بھی اپنے پورے کامن کو اپنی شادی میں بلا کر افسروں کا ایک جمگھٹا اکٹھا کر کے اس میں راجہ اندر کی طرح پھرنا چاہتا تھا۔ زندگی میں دوبارہ ایسا موقع اسے کہاں ملنے والا تھا لیکن اب۔ خیر

اس نے ماں باپ اور بہنوں کو پانچ لاکھ کا چیک دکھاتے ہوئے انہیں سادگی کے فوائد اور اس کی اہمیت پر ایک لیکچر دیا جس میں اس نے حسب ضرورت کچھ اسلامی حوالے اور حدیثیں بھی استعمال کیں۔

نتیجہ حسب توقع اور حسب سابق رہا۔ گھر والوں پر فوری اثر ہوا تھا البتہ اس "اثر" کو مزید "موثر" کرنے کے لئے اس نے اس رقم سے ان

سب کے کچھ مطالبوں کو پورا کرنے کا وعدہ کیا۔

☆☆☆

''اگلے مہینے کی ''پندرہ'' تاریخ کو شادی ہو رہی ہے شیراز کی۔'' کسی نے زینی کے دل پر گھونسہ مارا تھا، وہ سانس لینا بھول گئی تھی۔

''نسیم اور اکبر جا رہے ہیں گھر چھوڑ کر۔ شیراز کو گھر بھی ملا ہے جہیز میں۔ نسیم بتا رہی تھی۔ بہت بڑا بنگلہ ہے ڈیفنس میں۔ اس گھر کو تو ابھی بند کر رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ اچھے داموں بیچ دیں گے اور نہ بھی بکے تو پڑا رہے گا۔ اب انہیں کوئی ضرورت نہیں اس گھر کی۔ شادی بڑی سادگی سے کر رہے ہیں۔ خاندان اور محلے میں سے کسی کو نہیں بلا رہے۔ نسیم کہہ رہی تھی کہ بیٹے کے سسرال والے بھی زیادہ لوگ نہیں بلا رہے اور یہ لوگ ولیمہ بھی نہیں کر رہے۔ ہاں بھئی، اب بیٹا بڑا افسر بن گیا ہے۔ اب کہاں ہم جیسے لوگوں کو منہ لگائیں گے یہ لوگ۔ تم نے زینی کے لیے کیا سوچا؟''

صحن میں بیٹھی محلے کی کوئی عورت نفیسہ کو شیراز کی شادی کے بارے میں بتانے کے بعد اب زینی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

اندر بستر پر لیٹی ہوئی زینی یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے یہ کیوں سوچا تھا کہ اب شیراز کے بارے میں کچھ بھی سن کر اسے تکلیف نہیں ہوگی۔ منگنی ہوگئی تھی تو شادی تو ہونا ہی تھی پھر اسے یہ کیوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹنے لگا تھا۔ اتنی جلدی وہ کسی دوسری عورت کا ہو جانے والا تھا۔

اس نے بے یقینی سے اپنی انگلیوں کی پوروں پر دن گنے تھے۔

کوئی اور عورت اس کی زندگی میں آنے والی تھی اس کی جگہ لینے والی تھی۔ ''تکلیف'' تو اب ''محسوس'' ہونا شروع ہوئی تھی۔ اس نے ساری زندگی شیراز کے نام کو اپنی ملکیت سمجھا تھا۔ اب وہ نام کسی دوسری کے نام کے ساتھ منسلک ہونے والا تھا۔

اس نے بہت بار اپنے نام کے ساتھ زینب ضیاء نہیں، زینب شیراز لکھا تھا اور ہر بار اس نام پر نظر ڈالتے وہ ایک عجیب سی سرشاری محسوس کرتی اور اب کتنے آرام سے کوئی اور اس نام کو اپنے نام کے ساتھ لگا لینے والا تھا۔ قانونی، مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی استحقاق کے ساتھ۔ نیند تو اب ''اڑنے'' والی تھی۔

پتا نہیں اسے کیا ہوا، وہ چادر اوڑھ کر بیگ پکڑ کر باہر نکل گئی۔ نفیسہ نے اسے پیچھے کتنی آوازیں دیں، اس نے نہیں سنیں۔ وہ اس سہ پہر پیدل ہر جگہ بے مقصد پھرتی رہی۔ کبھی کوئی دن ایسا نہیں گیا تھا جب اس نے شیراز کے بارے میں نہ سوچا ہو مگر کوئی دن ایسا نہیں گیا تھا جب اس نے شیراز کے ساتھ کسی دوسری عورت کے بارے میں سوچا ہو۔ اسے کبھی اس کی منگیتر کا ''جسمانی وجود'' ہونے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ نوٹوں کی گڈیوں، بنگلے اور چیزوں کی شکل میں اس کے سامنے آتی رہی تھی۔

آج پہلی بار اس نے اس منگیتر کے جسمانی وجود کے بارے میں سوچا تھا۔ پہلی بار اسے ''عورت'' سمجھ کر اس کے بارے میں سوچا تھا اور یہ تکلیف پچھلی تکلیف سے زیادہ تھی۔ ساری دنیا کی عورتیں اس وقت اس کے سامنے صرف ایک عورت بن کر آئی تھیں۔

وہ اس سے اسی طرح بات کرتا ہوگا جس طرح مجھ سے کرتا تھا۔ اس کو اسی طرح دیکھتا ہوگا جس طرح مجھے دیکھتا تھا۔ اس کو دیکھ کر مسکراتا ہوگا، اس سے ملتا ہوگا، اسے باہر لے جاتا ہوگا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہوگا۔ میرے خدا

ایسا غم وغصہ تو اس نے تب بھی محسوس نہیں کیا تھا، جب اس کی منگنی ٹوٹی تھی پھر اب کیوں۔ ؟ اتنے دن بعد کیوں؟

وہ نہیں جانتی، وہ کب ہر جگہ سے پھرتے پھرتے سول سروسز اکیڈمی کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ اسے یہ پتا نہیں تھا کہ وہ STP کرنے کے لیے اب وہاں سے جا چکا تھا۔ اندر جانے کی کوشش کرنے کے بجائے وہ باہر ایک فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی تھی۔ اسے یقین تھا وہاں سے گزرنے والے اسے پاگل سمجھ رہے ہوں گے یا کوئی آوارہ لڑکی۔ اسے پروا نہیں تھی کہ لوگ اسے کیا سمجھ رہے تھے۔

سول سروسز اکیڈمی کے دروازے کو دیکھتے ہوئے اسے یاد آیا۔ وہ شیراز کے کہنے پر کس طرح خشوع وخضوع سے اس کے وہاں جانے کی دعائیں مانگتی تھی۔ اس نے تو تہجد بھی صرف شیراز کا مقدر بدلنے کے لیے پڑھنا شروع کیا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا، وہ صرف شیراز کا مقدر نہیں بدل رہی، وہ اپنا مقدر بھی بدل رہی تھی۔ کوئی یوں کسی کو اپنی زندگی سے گندگی کی طرح نکال پھینکتا ہے۔ اسے وہاں بیٹھے اکیڈمی کا دروازہ دیکھتے اپنا وجود گندگی ہی محسوس ہو رہا تھا۔

”تم پاگل ہو رہی ہو زینی!“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”ہاں، میں پاگل ہو رہی ہوں۔ نہیں میں پاگل ہو چکی ہوں، ورنہ اس وقت اس حالت میں یہاں بیٹھی ہوتی۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

☆☆☆

”زینی! کہاں ہے؟“ ضیاء نے ہمیشہ کی طرح گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا تھا۔ آمنا سامنا تو ان کا اب زینی سے شاذ و نادر ہی ہوتا لیکن اس کے باوجود گھر میں آتے ہوئے ضیاء کا پہلا سوال اب بھی اس کے بارے میں ہوتا تھا۔

”پتا نہیں کہاں ہے۔ آج تو جلدی گھر آگئی تھی مگر پھر پتا نہیں کہاں نکل گئی۔ میں تو پہلے ہی پریشان ہو رہی ہوں۔ شام ہوگئی ہے مگر ابھی تک واپس نہیں آئی۔“

ضیاء کے پیروں تلے سے جیسے زمین نکل گئی تھی۔ آج سے پہلے وہ شام تک تو کبھی باہر نہیں رہی تھی۔

”تمہیں کچھ بتا کر گئی۔ کہاں جا رہی ہے یا کب آئے گی؟“

”کچھ بتا کر کہاں جاتی ہے۔ محلے کی ایک عورت آئی ہوئی تھی۔ میں اس کے ساتھ صحن میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ مجھے شیراز کی شادی طے ہونے کے بارے میں بتا رہی تھی۔ بس یہ یک دم کمرے سے باہر آئی اور باہر نکل گئی۔ پیچھے مڑ کر میری آواز تک نہیں سنی۔“ نفیسہ نے ضیاء کو بتایا۔

”شیراز کے گھر تو نہیں گئی؟“ ضیاء کو یک دم خدشہ ہوا۔

”نہیں، وہاں نہیں گئی۔ میں پیچھے گئی تھی اس کے۔ وہ بس گلی پار کر گئی۔“

ضیاء چپ چاپ نسیم کو دیکھتے رہے پھر سائیکل کھڑی کر کے تھکے ہوئے انداز میں باہر نکل گئے۔

انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ اس وقت وہاں گئی ہوگی لیکن پتا نہیں کیوں انہیں خدشہ تھا، وہ وہیں گئی ہوگی۔ اگر وہ شیراز کی شادی کی خبر سن کر گئی تھی تو اسے وہیں ہونا چاہیے تھا۔

اور وہ وہیں تھی، وہ رکشہ پر وہاں آئے تھے مگر رکشہ سے اترنے سے پہلے ہی انہوں نے زینی کو فٹ پاتھ پر بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ وہ ان کی اولاد تھی سب سے خوبصورت، سب سے چہیتی اولاد جسے انہوں نے بچپن میں کبھی گود سے اتار کر پیدل نہیں چلایا۔ فٹ پاتھ پر بٹھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور وہ اس وقت اس گرد اور دھول سے اٹی فٹ پاتھ پر بھکاریوں کی طرح بیٹھی تھی۔

انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں رکشے والے کو اس کے قریب رکشہ لے جانے اور روکنے کے لیے کہا۔

زینی رکشہ کی آواز پر چونکی اور پھر اس نے حیرت سے اسے اپنے پاس رکتے دیکھا۔ ضیاء نے دروازہ کھول کر اس سے کہا۔

''آجاؤ زینی!'' زینی کچھ دیر وہیں بیٹھی خالی نظروں سے باپ کو دیکھتی رہی پھر اٹھ کر رکشہ میں آبیٹھی۔

رکشہ چلنے لگا تھا۔ ضیاء پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ زینی نے ایک نظر باپ کو دیکھا، وہ زندگی میں کبھی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نہیں روئے تھے۔ وہ آج رو رہے تھے۔ اسے پتا تھا وہ کس لیے رو رہے ہیں۔ پوری دنیا میں صرف وہی تھے جو آج زینی کے دل کی حالت کو سمجھ سکتے تھے۔

ضیاء نے زندگی میں ہمیشہ بڑے بھائی کو باپ کی جگہ سمجھا تھا۔ کبھی ان کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ کبھی ان کی حکم عدولی نہیں کی تھی۔ آج پہلی بار اپنی بیٹی کو وہاں فٹ پاتھ پر اس حالت میں بیٹھا دیکھ کر انہیں بھائی سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔

''تباہ ہو جائیں گے یہ سب لوگ زینی! تباہ ہو جائیں گے۔ ان کا پیسہ، ان کا غرور سب مٹی میں مل جائے گا۔ کچھ نہیں رہے گا ان میں سے کسی کے پاس۔ کوئی افسر... کوئی رتبہ... کچھ نہیں۔ یہ دنیا میں بھی رسوا ہوں گے۔ یہ آخرت میں بھی دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔''

زندگی میں پہلی بار زینی نے اپنے باپ کو کسی کے لیے بددعا کرتے سنا تھا اور وہ بھی اپنے خونی رشتے کے لیے، اپنے بڑے بھائی اور اس خاندان کے لیے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ باپ سے کہے بددعاؤں سے کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ بددعا صرف وہ کرتے ہیں جو کچھ اور نہیں کر سکتے۔

پورا راستہ ضیاء اسی طرح روتے رہے تھے اور وہ چپ چاپ رکشے کی پشت سے ٹیک لگائے سڑک پر چلتی ٹریفک کی جلتی بجھتی روشنیوں کو دیکھتی رہی۔

ضیاء رکشہ والے کو کرایہ دے رہے تھے، وہ ان کا انتظار کیے بغیر گھر میں داخل ہو گئی۔ نفیسہ، ربیعہ اور سلمان تینوں نے دروازے پر اس کا استقبال کیا تھا مگر اس کے چہرے کے تاثرات نے کسی کو کچھ کہنے نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ صحن کے تخت پر آ کر سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔

نفیسہ نے اس سے کچھ پوچھا تھا جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔ ضیاء چند منٹوں کے بعد گھر آ گئے تھے۔ ان کی متورم اور سرخ آنکھیں دیکھ کر نفیسہ کو احساس ہو گیا تھا کہ زینی کس کے ساتھ آئی ہے۔

ضیاء بھی اندر جانے کے بجائے اس کے پاس آ کر تخت پر بیٹھ گئے۔

''اسے دل سے نکال دو زینی! وہ اور اس کا خاندان تمہارے لائق نہیں تھا۔''

انہوں نے بے حد رنجیدگی سے کہا۔ زینی سر جھکائے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''وہ میرے دل سے نہیں نکلتا، میں نے بہت کوشش کر کے دیکھا ہے۔ میں نہیں بھول سکتی اسے۔''

وہ زمین پر نظریں جمائے جیسے بڑبڑا رہی تھی۔ ضیاء کو رنج ہوا۔ کیا تھا جو انہوں نے اپنے ہفتوں میں زینی کو پڑھ کر دم نہیں کیا تھا۔ کہاں کہاں وہ زینی کے لیے دعائیں نہیں کرواتے رہے تھے۔ پر سب کچھ ابھی بھی ویسا ہی تھا۔

وہ تین سال کی تھی جب اس نے ان کے ساتھ بندر کا تماشا دیکھا تھا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اس بندر کو گھر لے جانے کی فرمائش کی تھی۔ ضیاء ہنسنے لگے تھے۔ انہوں نے اس فرمائش کو اس کی معصومیت سمجھا تھا مگر یہ زینی کا "مطالبہ" تھا، یہ انہیں چند منٹوں میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ بندر کے بغیر وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھی اور ضیاء ایک قدم بھی وہاں سے اٹھاتے تو وہ چیخیں مار مار کر روتے ہوئے بری طرح ان کی گرفت میں مچلنے لگی۔

انہیں یقین تھا وہ اسے نیچے اتارتے تو وہ زمین پر بیٹھ کر اسی طرح ٹانگیں چلاتی۔ انہوں نے اس سے بہت سے وعدے کیے تھے، بہت سی دوسری چیزیں دلوانے کی کوشش کی مگر زینی کو بندر اور صرف بندر چاہیے تھا اور ابھی چاہیے تھا۔ وہ بادل ناخواستہ مداری سے بندر کو خریدنے کے لیے بھاؤ تاؤ کرنے لگے۔ مداری وہ بندر بیچنے پر تیار نہیں تھا، البتہ اس کے گھر پر ایک اور چھوٹا بندر تھا جسے وہ ضیاء کو بیچنے پر تیار ہو گیا تھا مگر اس کا گھر جس کچی بستی میں تھا، وہ وہاں سے چار میل دور تھی۔

ضیاء زینی کو اٹھائے پیدل اس بندر والے کے ساتھ اس بستی میں گئے، وہاں سے وہ بندر خریدا اور ایک بار پھر چار میل کا فاصلہ طے کر کے جون جولائی کے موسم میں جب پسینے میں شرابور گھر پہنچے تو اس وقت عشاء کا وقت ہو رہا تھا۔ زینی بے پناہ خوش تھی۔ سارا راستہ باپ کے ہاتھ میں پکڑی رسی سے بندھے بندر کو اپنے ساتھ چلتے دیکھ کر ہنستی اور باپ سے باتیں کرتی رہی اور ضیاء اسے دیکھ کر خود بھی ہنستے رہے۔ وہ ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے، ایک بندر کی رسی کو ہاتھ میں لیے گھر آتے دیکھ کر ان کے جاننے والوں نے کیا سوچا ہوگا ضیاء نے یہ نہیں سوچا تھا۔ ان کے لیے اتنا کافی تھا کہ زینی پپیہے کی طرح چہک رہی تھی۔

نفیسہ اس بندر کو دیکھ کر بے حد ناراض ہوئی تھیں یہ جان کر اس سے زیادہ کہ وہ بندر ضیاء کی اس ماہ کی تنخواہ کے چوتھائی حصے سے خریدا گیا تھا مگر نفیسہ کی ناراضی اب بے کار تھی، بندر خریدا جا چکا تھا۔

اگلے کئی دن زینی صحن میں بندھے اس بندر کے ساتھ کھیلتی رہی۔ یہ سلسلہ مزید طویل ہوتا اگر ایک دن ضیاء کی موجودگی میں وہ بندر اچانک زینی پر جھپٹ کر اس کے بازو کو اپنے کھرونچوں سے زخمی نہ کر دیتا۔ ضیاء نے شکر ادا کیا تھا کہ وہ اس وقت وہاں تھے، ورنہ بندر زینی کو زیادہ نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ وہ اس گھر میں بندر کا آخری دن تھا۔ ضیاء اگلے دن اسے کسی کو دے آئے تھے۔ زینی اگلے کئی دن اس بندر کے لیے روتی رہی مگر پھر آہستہ آہستہ بہل گئی۔

مگر اس کے بعد اسے ہمیشہ اپنی مرضی کی چیز ہر قیمت پر لے لینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ ضیاء کے ساتھ عید کے میلے میں جاتی اور سب سے مہنگے کھلونے پر ہاتھ رکھتی۔ ضیاء ایک لفظ کہے بغیر اسے وہ چیز دلا دیتے۔

زینی نے زندگی کو عید کا میلہ سمجھ لیا تھا، جہاں وہ جب بھی جاتی، سب سے مہنگی چیز کے ساتھ لوٹتی کیونکہ وہ باپ کے ساتھ جاتی تھی اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ باپ زینی کو خالی ہاتھ لے آتا اور آج پہلی بار باپ اپنی اولاد کو خالی ہاتھ دیکھ رہا تھا اور یہ چیز ان سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"خالد صاحب کا بیٹا بہت اچھا، بہت شریف لڑکا ہے۔ شیراز سے شکل و صورت میں کئی گنا اچھا ہے۔ صرف افسر نہیں ہے مگر زینی' وہ لوگ بہت قدر کریں گے تمہاری۔" ضیاء نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"بات شکل و صورت اور افسری کی ہے ہی نہیں۔ بات تو شیراز کی ہے۔ وہ جو مرضی ہو شیراز تو نہیں ہوگا۔"

اس نے ایک بار پھر اسی طرح کہا تھا۔ ضیاء کو بے اختیار وہ بندریاد آ گیا تھا جو اسے بعد میں زخمی کر کے گیا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے، ٹھیک اسی وقت زینی کو بھی وہ بندر ہی یاد آ رہا تھا مگر اسے اس کے زخم یاد نہیں آئے۔ صرف یہ یاد آ رہا تھا کہ باپ اس بندر کو خود ہی ایک دن کہیں چھوڑ آیا تھا اور وہ پھر کئی دن روتی رہی تھی۔

"وہ بازار کی کوئی شے ہوتی تو میں ہر قیمت پر اسے خرید کر تمہیں لا دیتا، پر وہ انسان ہے۔ میں انسان کو کیسے خرید کر لا دوں۔"

ضیاء نے دل گرفتگی سے کہا۔

"اس کی منگیتر کے باپ نے تو اسے خرید کر دے دیا اپنی بیٹی کو۔ انسان خریدے نہیں جاتے تو اس نے کیسے اسے خرید کر اپنی بیٹی کا مقدر بنایا۔"

وہ اب بھی جیسے عید کے میلے میں کھڑی تھی، جہاں کا سب سے مہنگا کھلونا اس کے باپ سے کوئی اور بہتر دام دے کر اپنی بیٹی کے لیے لے گیا تھا۔

"جو انسان پیسے سے خریدا جا سکتا ہو، میں اپنی زینی کا مقدر اس کے ساتھ تو کبھی نہ جوڑتا۔" زینی نے گردن اٹھا کر باپ کو دیکھا۔

"چاہے زینی رو رو کر مر جاتی؟" اس نے باپ سے سوال کیا۔

ضیاء نے سر جھکا لیا۔ ان کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے تھے۔ "میں بہت بے بس ہوں زینی! بہت بے بس۔ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ اولاد کا مقدر ماں باپ کے ہاتھ میں ہوتا تو سارے ماں باپ پوری دنیا اٹھا کر صرف اپنی اولاد کو دے دیتے۔"

"دنیا کی بات نہیں تھی، یہ تو صرف "ایک آدمی" کی بات تھی۔ صرف ایک آدمی کی۔"

"چھ ارب انسانوں میں "میرا" بس وہی "تھا" اور وہی "ہے" باقیوں کی مجھ کو ضرورت نہیں ہے۔ بہتر ہوں یا بہترین، مجھے کیا کرنا ہے کسی کا۔"

اس کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔

"آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے مجھے ابو۔ گلہ تو مجھے اللہ سے بھی نہیں ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی تکلیف اللہ مجھے کیسے دے سکتا ہے۔"

"وہ تکلیف اس لیے دیتا ہے کہ ہم اسے یاد رکھیں، یاد کریں۔"

وہ ان کی بات پر جیسے تڑپ گئی۔

"یہ نہ کہیں۔ کم از کم آپ یہ نہ کہیں۔ کب یاد نہیں کرتی تھی میں اسے۔ کب یاد نہیں رکھا میں نے اسے۔ اللہ اگر دلوں کا حال جانتا ہے تو اس کو یہ تو پتہ ہوگا کہ شیراز مل جاتا تو وہ مجھے اور احسان مند پاتا۔ اور ذکر کرنے والا اور... اور شکر کرنے والا۔"

وہ رونے لگی تھی۔

"کوئی گناہ کیا ہے میں نے ابو؟ جس کے بدلے اتنی ذلت، اتنی تکلیف دے رہا ہے اللہ مجھے۔ کچھ تو خرابی ہے مجھ میں کہ اللہ نے میرے

ہاتھ خالی کر دیے ہیں۔ کچھ تو خامی ہے آپ کی ذات میں جو آپ کو نظر نہیں آ رہی، پوری دنیا کو نظر آ رہی ہے۔"

وہ روتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔ ضیاء بے بسی سے اسے جاتا دیکھتے رہے۔ اس رات ان کے گھر میں ایک بار پھر کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

☆☆☆

"تم کچھ کھا کیوں نہیں رہے بیٹا۔ کھاؤ۔"

نسیم نے شیراز سے کہا۔ آج ان کا اپنے نئے گھر میں پہلا کھانا تھا۔ ویک اینڈ تھا اور شیراز گھر پر ہی تھا۔ وہ سب پہلی بار اپنے گھر میں میز اور کرسیوں پر بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے ورنہ اس سے پہلے وہ لوگ چار پائیوں، چوکیوں اور زمین پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ نسیم یہاں بھی اسی شان دار روایت کو آگے بڑھانا چاہتی تھیں۔ مگر شیراز نے انہیں سختی سے منع کیا تھا، بلکہ ان دو چوکیوں کو بھی پھنکوا دیا تھا جو نسیم اپنے پرانے گھر سے ساتھ لے کر آئی تھیں۔

"یہاں پر اس طرح کی کوئی حرکت نہ کریں کہ ملازم ہنسیں، اور بعد میں میرے سسرال والوں تک یہ خبر پہنچے۔ یہ دونوں ملازم جو اس گھر میں ہیں، یہ سعید انکل نے اپنے گھر سے بھجوائے ہیں۔ ایک ایک بات کی خبر دیں گے وہاں۔" شیراز نے سب کو مطلع کر دیا تھا۔

تو اب مجبوراً سب کرسیوں پر بیٹھ کر ہی کھانا کھا رہے تھے۔ اور شیراز خود کھانا کم کھا رہا تھا، وہ ٹیبل پر بیٹھے باقی پانچ افراد کو کھانا کھانے کے آداب کے بارے میں لیکچر زیادہ دے رہا تھا۔ وہ جب بھی ان کے ساتھ کھانا کھاتا، اس کا زیادہ وقت اسی کام میں گزرتا۔ وہ اس پورے ٹولے کو اپر کلاس کا حصہ بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اخبارات میں اپنی اور پورے خاندان کی تصویریں چھپوا کر اشتہار لگوا دیتا۔

مورخہ فلاں فلاں تاریخ سے میں اور میرا پورا خاندان لوئر مڈل کلاس کے بجائے اپنی بیوی اور اس کے خاندان کے طفیل اپر کلاس کا حصہ بن گئے ہیں۔ آئندہ ہر کوئی ہمیں خاندانی سمجھے اور ہمیں "خاندانی" لوگوں کی طرح ٹریٹ کرے۔

شکریہ

ایک "خاندانی" خاندان

شیراز کو صرف یہ پتا نہیں تھا کہ خاندانی کہلانے کے لیے کم از کم دو نسلوں کا منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونا ضروری تھا۔ صرف اپنے ہاتھ پاؤں مار کر دولت اکٹھی کر لینے سے کوئی خاندانی نہیں بن جاتا نہ ہی اشرافیہ کا حصہ کہلاتا ہے اور اس لحاظ سے خود سعید نواز بھی ایک "مڈل کلاسیا" ہی تھا۔

"بیٹا کھاؤ... کیوں نہیں کھاتے۔"

نسیم نے ایک بار پھر واویلا کیا۔ شیراز کا دل چاہا، وہ ان سے کہے۔ "پہلے آپ تمیز سے کھائیں پھر میں کھاؤں گا۔" نسیم فلیٹ ڈنر پلیٹ میں صرف چمچے کی مدد سے چاول کھانے کی کوشش میں پلیٹ کے اردگرد چاولوں کی چار دیواری بنا رہی تھیں۔ وہ کانٹا پکڑے ہوئے تھیں۔ مگر اسے صرف پکڑے ہوئے تھیں۔ وہ بھی شیراز کے پرزور اصرار اور دباؤ پر، لیکن اسے استعمال نہیں کر رہی تھیں۔ نتیجہ وہی تھا، جس طرح کا شینا کے گھر منگنی پر نکلا تھا۔ لیکن آج شیراز کو زیادہ تکلیف نہیں ہو رہی تھی کیونکہ یہاں اس کی سسرال میں سے کوئی موجود نہیں تھا۔

"ابھی شادی میں کچھ دن ہیں، میں تب تک انہیں سدھا لوں گا۔"

اس نے روانی میں سوچا پھر یک دم گڑبڑا کر اپنے جملے کی تصحیح کی۔

"سکھا لوں گا۔" اس نے ایک نظر ٹیبل پر موجود تمام لوگوں پر ڈالتے ہوئے بالآخر ان کبابوں کو اپنی پلیٹ میں ڈالا جنہیں لینے پر نسیم اصرار کر رہی تھیں۔

برائی ہاتھ سے کھانے یا زمین پر بیٹھ کر کھانے میں نہیں تھی۔ برائی شیراز اور اس کے خاندان کی سوچ میں تھی وہ زبردستی اپر کلاس کا حصہ بننے کے لئے اپنے طور طریقوں کو آلائش سمجھ رہے تھے۔

جو انسان اپنے اصل سے بھاگتا ہے، وہ پھر ساری زندگی بھاگتا ہی رہتا ہے۔ کیونکہ اصل کبھی نہیں چھپتا، کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس پر لحاف ڈالیں، غلاف یا مٹی۔ یہ کہیں نہ کہیں سے پھر باہر نکل آتا ہے ہزار سروں والے اژدھے کی طرح جس کا ہزارواں سر کاٹتے کاٹتے پچھلے نو سو ننانوے پھر نکل آتے ہیں۔

شیراز کو احساس نہیں تھا کہ جڑی بوٹیاں صاف کرتے کرتے اس نے اپنی جڑیں کاٹنا شروع کر دی تھیں۔ اپر کلاس، رولنگ اسٹیٹ بورڈ، Haves اس نے صرف یہ ٹرمز سنی تھیں صرف ان کا پرتعیش لائف اسٹائل للچاتے ہوئے ساری عمر دیکھا تھا۔ اس نے تصویر کا دوسرا رخ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ان کی زندگی جی کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اب جینے والا تھا۔ یا پھر "جی" کر مرنے والا تھا۔

☆☆☆

ڈرائیور نے دروازے پر دستک دی۔ نفیسہ نے دروازہ کھولا۔ اس وقت زینی آیا کرتی تھی مگر آج وہاں ڈرائیور کھڑا تھا اس نے سلام کر کے ایک لفافہ نفیسہ کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟ زینی کہاں ہے؟" نفیسہ نے گھر سے قدم نکال کر باہر دیکھتے ہوئے قدرے تشویش سے کہا۔

"وہ اپنے گھر میں ہیں۔" ڈرائیور نے انہیں بتایا۔

"اپنا گھر؟ کیسا گھر؟" نفیسہ کو جیسے کرنٹ لگا۔

"انہوں نے ڈیفنس میں گھر لے لیا ہے۔ کہہ رہی تھیں، آپ کو بتا دوں اور یہ خط دے دوں۔"

نفیسہ کو ٹھنڈے پسینے آگئے۔ ڈرائیور کے ہاتھ سے خط لے کر بنا ایک لفظ کہے انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ زینی ہر روز ایک نئی قیامت ان پر توڑ رہی تھی۔ اور یہ سلسلہ پتا نہیں کہاں جا کر رکنے والا تھا۔

کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولتے ہوئے انہوں نے خط نکالا اور اسے کھول کر پڑھنے لگیں۔

میری وجہ سے آپ کے گھر میں بہت مسئلے پیدا ہو رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتی میری وجہ سے زہرہ آپا، ربیعہ یا سلمان کی زندگی خراب ہو۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ میں آپ کا گھر چھوڑ دوں۔ اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنا خیال رکھنا سیکھ لیا ہے۔

آپ کو اپنے گھر کا پتا بھجوا رہی ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ لوگ میرے پاس آئیں اور مجھ سے ملیں۔ لیکن دوبارہ مجھے واپس لے جانے کے لیے مت آئیں۔ میں واپسی کے سارے راستے بند کر آئی ہوں۔

آپ کی بدقسمت اور نافرمان بیٹی

زینب ضیاء

نفیسہ کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ انہوں نے کبھی زینی کو اس طرح گھر سے رخصت کرنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا اور انہیں اگر شک بھی ہو جاتا کہ وہ گھر چھوڑنے کی نیت سے صبح سامان اکٹھا کر کے بیگ میں بھر رہی تھی تو وہ کبھی اسے گھر سے نکلنے نہ دیتیں۔ وہ گھر سے چند ایک چیزیں ہی لے کر گئی تھی۔ زیادہ لے جاتی تو انہیں شک بھی ہوتا۔ لیکن اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زہرہ اور ربیعہ کے سسرال والوں کا کس طرح سامنا کریں گی۔ زینی کے یوں چلے جانے پر انہیں کون سا نیا جھوٹ گھڑ کر سنائیں گی اور ضیاء شام کو گھر آئیں گے تو ان سے کیا کہیں گی۔ انہیں اپنے شوہر پر اس وقت بے پناہ ترس آیا تھا۔

☆☆☆

''کیسا لگا تمہیں یہ گھر؟''

وہ فاران کی بات پر کھڑکیوں سے باہر نظر آتے لان کو دیکھ کر چونکی۔ وہ اس کے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں لاؤنج میں کھڑے تھے۔

''اچھا ہے۔'' زینی پلٹ کر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اور بیگ سے منرل واٹر کی بوتل نکال کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔

فاران بے اختیار جھلا گیا تھا۔ ''آخر کیا چیز خوش کرے گی تمہیں؟''

''Why are you so cold?'' وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پچھلے سالوں میں درجنوں ماڈلز کو شوبز میں انٹروڈیوس کروایا تھا۔ مگر صرف سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی بوتل سے گھونٹ گھونٹ پانی پیتی لڑکی تھی جسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

وہ رمشہ کی وجہ سے اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں ایک ایک بات جانتا تھا، یہاں تک کہ شیراز اور اس کے رشتے کی تفصیلات بھی۔ لیکن اس کے باوجود زینی اس کے لیے معمہ بنی ہوئی تھی۔ وہ اس کے اندر جھانک نہیں سکتا تھا اور یہ چیز اسے ریچ کر رہی تھی۔

ڈھیروں ماڈلز تھیں جو ایسے ہی حالات کا شکار ہو کر اس کے پاس آتی رہی تھیں۔

کچھ منگنیاں تڑوا کر، کچھ شادیوں کے ناکام ہونے کے بعد اور کچھ Break-ups کے بعد، کئی اس کے پاس بیٹھ کر روتی رہی تھیں۔ کئی اس کے گلے لگ کر بلکتے ہوئے اپنے بوائے فرینڈ یا شوہر کی بے وفائی کے قصے سناتی رہی تھیں۔ کئی روتے ہوئے اپنے سابقہ یا حالیہ بوائے فرینڈ کو گالیاں دیتے ہوئے اس سے ٹشو لے لے کر آنسو پونچھتی رہی تھیں۔

مگر زینی کی طرح چپ سادھ کر اس کے سامنے گونگوں کی طرح نہیں بیٹھی رہی تھیں۔

اس کے پاس ماڈلنگ کرنے والی لڑکیاں پیسے کے لیے آتی تھیں۔ شہرت کے لیے، اپنا ٹیلنٹ دکھانے کے لیے یا بدلے کے لیے، وجہ جو

بھی ہوتی تھی لیکن پیسہ دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو جاتی تھیں اور جس کلاس سے زینی کا تعلق تھا، اس کلاس سے آنے والی لڑکیاں تو پیسہ دیکھ کر خود پر قابو ہی نہیں رکھ پاتی تھیں۔ خوشی ان کے پورے وجود سے چھلکتی تھی۔

اور یہاں زینی سرد مہری کی حد تک بے نیاز نظر آتی تھی۔ اگر پیسہ خوش نہیں کرتا تھا تو پھر آخر وہ لینے کیا آئی تھی، ماڈلنگ میں۔

''مجھے تو یہ پتا نہیں میں دنیا میں کیا لینے آئی ہوں۔ تم ماڈلنگ کی بات کرتے ہو۔'' اس کے اس سوال پر وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی۔

''گاڑی چاہیے مجھے اپنی اور ایک ڈرائیور بھی۔ کب تک تمہاری گاڑی لے کر پھروں گی۔'' اس نے فاران کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی بات بدل دی۔

''چند دنوں میں آ جائے گی وہ بھی۔'' فاران نے اسے مطلع کیا۔

''تم اکیلی رہوگی۔ یہاں؟'' زینی نے پانی کا گھونٹ پیتے ہوئے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، تمہاری فیملی ساتھ شفٹ نہیں ہو رہی؟'' فاران اس کی نظروں سے کچھ خجل ہوا۔

''فی الحال نہیں۔ لیکن کوشش کروں گی، وہ لوگ بھی جلد ہی آ جائیں یہاں۔''

اس نے اپنے پاؤں ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا اور پانی کی بوتل بند کرنے لگی۔

اسے اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔ اس شان دار کرائے کے بنگلے میں بیٹھ کر اپنے باپ کا رزق حلال کی کمائی سے بنایا ہوا دو کمرے کا وہ گھر یاد آ رہا تھا۔

☆☆☆

چوکیدار نے بیل بجانے پر پہلے باہر جھانک کر دیکھا پھر گیٹ کھول کر باہر نکلا۔

''کس سے ملنا ہے؟'' اس نے ضیاء سے پوچھا۔

''یہاں میری بیٹی ہے۔ زینب!''

ضیاء نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ وہ گھر پہنچتے ہی اسے واپس لانے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن یہاں اس بنگلے کے سامنے کھڑے ہوئے ان کو یک دم اپنا آپ بونا لگنے لگا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ زینب سے اپنا کیا رشتہ بتائیں۔

چوکیدار نے سر سے پیر تک انہیں دیکھا، پھر کہا۔

''یہ تو میڈم پری زاد کا گھر ہے۔''

ضیاء کچھ بول نہیں سکے۔ انہوں نے اس کاغذ پر نظر ڈالی جس پر زینب کے ہاتھ سے اسی گھر کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ پھر گھر کی نمبر پلیٹ پر نظر ڈالی اور چوکیدار کی طرف کاغذ بڑھایا۔

''دیکھیں، یہ اسی گھر کا ایڈریس ہے، اسی گھر کا فون نمبر ہے؟''

چوکیدار نے کاغذ پر نظر دوڑائی۔ ''ہاں فون نمبر بھی یہیں کا ہے۔ پر میڈم نے تو نہیں بتایا کہ۔'' وہ کچھ کہتے کہتے سوچ کر رکا۔ ''تمہاری بیٹی

دیکھنے میں کیسی ہے؟؟"

اس اجڈ چوکیدار نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ضیاء سے بیٹی کی شناخت پوچھی۔ ضیاء بول نہیں سکے کوئی باپ بیٹی کو کبھی نہیں "دیکھتا۔"

"جوان ہے؟ خوبصورت ہے؟" چوکیدار نے ان کے چپ رہنے پر اگلے سوال کیے۔ ضیاء کو جیسے کسی نے گالی دی۔ اب کیا ان کی اس پردہ کرنے والی تہجد گزار بیٹی کا تعارف اس کی "جوانی" اور "خوبصورتی" سے ہوگا۔

"اوہ... بابا... کچھ بولو... "چوکیدار اب بے چین ہو رہا تھا۔

"وہ... ماڈلنگ کرتی ہے۔" ضیاء نے سر جھکا کر کہا۔

"اچھا ہماری میڈم بھی کچھ اسی طرح کا کام کرتی ہے۔ پر وہ تو ملائیشیا گئی ہے کچھ ہفتوں کے لیے۔"

ضیاء کو لگا کسی نے انہیں زندہ قبر میں گاڑ دیا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنی پہلی ماڈلنگ اسائنمنٹ پر فاران کے ساتھ ملائیشیا جانے سے پہلے رمشہ سے ملنے گئی تھی۔

رمشہ کی منگنی ہونے والی تھی ان ہی دنوں میں فاران نے اسے بتایا تھا تب زینی کو احساس ہوا کہ وہ ماڈلنگ شروع کرنے کے بعد ایک بار بھی رمشہ سے نہیں ملی نہ ہی رمشہ نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ بی اے کے پیپرز ہو گئے تھے اور زینی نے پیپرز نہیں دیے تھے۔ ورنہ اور کہیں نہیں تو امتحان کے دوران ہی رمشہ سے اس کی ملاقات ہو جاتی۔

اس نے رمشہ کے گھر جانے سے پہلے فون پر اسے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اس نے کسی گرم جوشی کے بغیر اسے اپنے ہاں آنے کا کہا۔ وہ خوشی اس کے لہجے میں مفقود تھی جو پہلے زینی کے اس کے گھر آنے کی اطلاع پر ہوتی تھی اور اس کے گھر جا کر زینی کو احساس ہوا تھا کہ وہ ٹھنڈک صرف اس کی آواز میں ہی نہیں اس کے رویے میں بھی تھی۔

ان کے درمیان پہلے کی طرح باتیں نہیں ہوئی تھیں۔ مسلسل، بے مقصد، بے معنی اور بے تحاشا۔ آج صرف سوال جواب تھے۔ وہ بھی بے حد مختصر اور خاموشی کے بہت سے چھوٹے بڑے وقفے پھر چند لوازمات اور چائے پھر چند اور سوال جواب۔

کوئی اور دوست ہوتی تو زینی اس کے گھر ان حالات میں کبھی نہ جاتی۔ مگر وہ رمشہ کی ممنون ہو کر وہاں گئی تھی۔ اس کے ریفرنس سے وہ فاران کے پاس گئی تھی۔ اور زینی کو احسان یاد رکھنا آتا تھا۔

زینی نے اس سے ملاقات کے دوران ایک بار بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھا تھا۔ اپنے گھر سے باہر صرف رمشہ کی نظریں تھیں جو اس کی آنکھوں کے خالی پن کو پہچان سکتی تھیں۔ صرف وہ تھی جو Before اور After کی تاریخ سے واقف تھی۔

مگر اسے حیرت تھی، رمشہ کے انداز میں اتنی ٹھنڈک کیوں تھی۔ کیا ان سب الزامات کی وجہ سے جو اس نے کالج میں اسے سنائے تھے؟ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ مگر معمہ زیادہ دیر تک معمہ نہیں رہا تھا۔

رمشہ زینی کو ہمیشہ کی طرح پورچ میں چھوڑنے آئی تھی۔ فاران کی گاڑی زینی کو لینے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ زینی اس سے گلے ملنے کے بعد گاڑی کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے اس میں بیٹھنے والی تھی۔ جب رمشہ نے اس سے کہا۔

Faran Bhai is married Zeni.

He has a beautiful wife and two kids.

(فاران بھائی شادی شدہ ہیں زینی! اور ان کی ایک خوبصورت بیوی اور دو بچے ہیں)

زینی کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔ بے حد شاک کے عالم میں اس نے رمشہ کو دیکھا۔ وہ یہ سب کچھ پہلے ہی جانتی تھی۔ پھر رمشہ اسے یہ سب کیوں بتا رہی تھی۔

"ان کی اپنی فیملی ہے۔ اس کا اپنا گھر ہے۔ اور اس میں "کسی دوسرے" کو جگہ نہیں ملے گی۔"

رمشہ نے اب اور زیادہ صاف لفظوں میں اس سے کہا۔ زینی پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتی رہی تو وجہ فاران تھا۔

''مجھے پتا ہے۔'' اس نے بے حد مدھم آواز میں رمشہ سے کہا۔

''نہیں، تمہیں نہیں پتا۔ دیکھو، اگر تمہارا گھر بننے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا ہے تو اس میں تمہارا اپنا تو کوئی قصور ہو سکتا ہے، پر دنیا کی دوسری کسی عورت کا قصور نہیں جو گھر بنا بیٹھی ہے۔'' وہ بے حد پرسکون انداز میں اسے چابک مار رہی تھی۔

''تم اب ایک ماڈل ہو، تم کسی عورت کے جذبات اور احساسات کو نہیں سمجھ سکتیں۔ پھر بھی میں تم سے یہ کہہ رہی ہوں کہ تم میری بہت اچھی دوست رہی ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے۔ ایسا کچھ مت کرنا کہ مجھے تمہارے ساتھ اپنے تعلق پر پچھتاوا ہو۔''

زینی بے حد خاموشی سے دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر لفظ نہیں تھے۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اثبات میں سر ہلایا اور پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی رمشہ کے گھر سے باہر آ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ وہ دوبارہ کبھی اب رمشہ کا سامنا کرنا نہیں چاہے گی۔

اس نے اپنے اور فاران کے تعلقات کے حوالے سے رمشہ کو کوئی وضاحت نہیں دی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ فاران کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ اور فاران اس پر بے تحاشا عنایات کر رہا تھا۔ مگر زینی جانتی تھی، وہ یہ عنایات زینی پر نہیں کر رہا تھا۔ سونے کی اس چڑیا پر کر رہا تھا جسے وہ اپنے پنجرے میں قید رکھنا چاہتا تھا۔

اسے فاران میں، فاران کی زندگی میں اور اس کے گھر میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے دنیا کے کسی مرد کے گھر میں دلچسپی نہیں تھی۔ اور فاران تو وہ آخری آدمی بھی نہ ہوتا جس کا گھر وہ توڑنا چاہتی۔ رمشہ اسے یاد دلاتی نہ دلاتی، زینی کو یاد تھا کہ وہ رمشہ کا کزن تھا۔ وہ اس کے لیے ہمیشہ رمشہ کا کزن ہی رہتا۔

''سگریٹ ہے تمہارے پاس؟''

ڈرائیور نے حیرانی سے پلٹ کر اسے دیکھا، وہ پہلی بار اس سے سگریٹ مانگ رہی تھی۔ بہت ساری ماڈلز سگریٹ پیتی تھیں وہ جانتا تھا پر زینی نے اس کے سامنے کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا۔ ''پھر آج کیوں؟''

ڈرائیور نے خاموشی سے اپنا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر پیچھے بڑھا دیا۔ زینی نے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

بہت ضروری تھا، وہ کسی چیز کو جلاتی، اندر پہلے ہی سب کچھ خاکستر ہو چکا تھا۔ باہر جلانے کے لیے سب سے موزوں چیز وہ سگریٹ ہی تھا۔

☆☆☆

الٹی گنتی شروع ہو گئی تھی۔ وہ ملائیشیا میں شوٹنگ کے دوران روز ایک ایک دن گنتی۔ پندرہ تاریخ نہیں آ رہی تھی۔ زینی کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی پھانسی کا دن قریب آ رہا تھا۔ وہ سگریٹ تو پہلے ہی پی رہی تھی ملائیشیا میں اس نے شراب بھی پینا شروع کر دی تھی۔ وہ جیسے دنیا کی ہر وہ شے استعمال کرنا چاہتی تھی جس سے محبت جیسے روگ کا علاج ہو جاتا۔ وہ اسے بھول جاتی۔ نتیجہ وہی تھا۔ روگ وہیں تھا۔ اور زندگی یہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا کا کوئی علاج اس پر کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

وہ رات کو نیند کی گولیاں نہ لیتی تو اسے نیند نہ آتی وہ ساری ساری رات شیراز اور اس کی ہونے والی بیوی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ اس DOP کا کینیڈین تھا اور اس نے پہلے دو دن کی Photage کے بعد اسے وارننگ دے دی تھی، کہ وہ رات کو سوئے بغیر شوٹ کے لیے نہ آئے، کیونکہ اس کی Photage کے رزلٹ بہت برے آ رہے تھے۔ یہ وارننگ صرف اسی نے نہیں فاران نے بھی اسے دی تھی۔ وہ لوگ ماڈلز کی لیٹ نائٹ پارٹیز اور ایکٹیویٹیز کے عادی تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ ماڈل خواہ کتنی خوبصورت ہو شوٹنگ کے لیے ساری رات جاگی ہوئی ماڈل سے زیادہ بدتر چہرہ کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔

"چاہے سلیپنگ پلز لے کر سو یا شراب پی کر۔ بہر حال مجھے صبح تمہارا چہرہ فریش چاہیے۔ آنکھوں میں کسی سرخی اور تھکن کے بغیر۔ یہ کانٹریکٹ ختم ہوا تو تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ لیکن میری کمپنی سے اور بھی بہت سے کلائنٹس چلے جائیں گے۔"

فاران نے اسے دوٹوک لفظوں میں صاف صاف بتا دیا تھا۔

"زینی رات کو نیند کی گولیاں لے کر سونے لگی تھی۔ مگر پچھلے کچھ عرصے سے انہوں نے اس پر اثر کرنا چھوڑ دیا تھا۔

ملائیشیا میں اس کے کمرشل کی شوٹنگ بہت اچھی ہوئی تھی۔ فاران کا بگڑا ہوا موڈ خود ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کے التفات اور عنایات کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا اور بے تکلفی بھی کچھ بڑھنے لگی تھی۔

وہ ملائیشیا سے واپسی پر دوبئی آئے تھے۔ زینی EPB کی طرف سے منعقد کروائے جانے والے ایک فیشن شو میں اپنی زندگی کی پہلی کیٹ واک کرنے جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس شو میں باقی آٹھوں ماڈلز لڑکیاں پاکستان کے سپر ماڈلز تھے صرف وہ وائلڈ کارڈ انٹری تھی اور اس میں بھی بڑا ہاتھ فاران کے اس دوست ڈیزائنر کا تھا جس کے ملبوسات چند دوسرے ڈیزائنرز کے ساتھ اس شو میں ڈس پلے (Display) کیے جانے تھے۔

"You are going to steal the show" فاران نے ہوٹل میں چیک ان کرتے ہوئے زینی سے کہا۔ وہ بے حد پرجوش تھا۔ اسے یقین تھا، وہ اگلی رات وہاں موجود پاکستان کی تمام سپر ماڈلز کے دل دہلا دینے والی تھی۔ باقی تمام ماڈلز تین دن پہلے وہاں آ کر ریہرسلز شروع کر چکے تھے۔ زینی کے پاس ریہرسلز کے لیے صرف دو دن تھے۔

شو اگلی رات تھا۔ مگر فاران کو یقین تھا، وہ صبح آتی اور اسے رات کو بھی شو کرنا ہوتا تو وہ کر لیتی۔ وہ ملائیشیا میں اس شو کے لیے اسے بہت زیادہ تیاری کرواتا رہا تھا۔

مگر فاران صرف ایک بات نہیں جانتا تھا۔ وہ شو پندرہ کی رات کو تھا۔ ٹھیک اسی وقت جب پاکستان میں شیراز کی شادی ہو رہی ہوتی۔ یہ صرف زینی جانتی تھی۔ اسے اس رات ریمپ پر نہیں چلنا تھا۔ جلتے ہوئے کوئلوں پر چلنا تھا۔

☆☆☆

"کیا ہو رہا ہے تمہیں؟"

فاران نے کچھ حیران ہوتے ہوئے بیک اسٹیج اس سے پوچھا۔ اس کی رنگت خطرناک حد تک زرد ہو رہی تھی۔

ہیئر اسٹائلسٹ ابھی اس کے بال بنا رہا تھا۔اس کا میک اپ کچھ دیر میں شروع ہو جاتا۔اور وہ سامنے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔اسے یقین تھا اس وقت شیراز کی ہونے والی بیوی بھی کسی پارلر پر بیٹھی میک اپ کروا رہی ہو گی۔

شاید اپنے بال بنوا رہی ہو گی اور اسی طرح آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی ہو گی۔

''لیکن وہ میری طرح خاموش نہیں بیٹھی ہو گی۔وہ اپنے ہیئر اسٹائل اور میک اپ کے بارے میں بیوٹیشن کو بار بار ہدایات دے رہی ہو گی۔وہ آج کے دن اپنے آپ کو شیراز کے لیے تیار کر رہی ہو گی۔

''اور میں اپنے آپ کو کس کے لیے تیار کر رہی ہوں؟ ایک چیک کے لیے؟''

آج سے پہلے زینی کو کبھی اپنا چہرہ دیکھ کر اتنا ترس نہیں آیا تھا جتنا ترس اس وقت آیا تھا۔سامنے آئینے میں نظر آنے والا اس کا چہرہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔کون ہارا تھا؟ کون جیتا تھا؟ سب بول رہا تھا۔

وہ اپنے ہی عکس سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔وہ عکس جیسے اس کی شکست بن کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے تمہیں؟'' فاران اتفاقاً اس کے پاس آیا تھا ورنہ وہاں اس کا کوئی کام نہیں تھا۔

''زینی! یہ تمہاری زندگی کی پہلی کیٹ واک ہے۔

'You have to give your best'' فاران نے اسے چیئر اپ کرنے کی کوشش کی تھی۔

''فاران! یہاں سے چلے جاؤ، مجھے خاموشی کی ضرورت ہے۔'' اس نے یک دم بے حد ترشی سے اس کی بات کاٹ دی۔فاران بولتے بولتے چپ ہو گیا۔اس کے ماتھے پر ناگواری تھی مگر وہاں سے چلا گیا۔

میک اپ آرٹسٹ اب اس کے پاس آکر اس کا میک اپ کرنے لگا تھا۔آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اس کا دل چاہا۔وہ شیراز کی بیوی کو دیکھے۔یہ دیکھے کہ کیا وہ اس جیسی خوبصورت ہے۔کیا وہ شیراز کو زینی جیسی خوبصورت لگ سکتی تھی۔اسے اس وقت اپنا چہرہ بے حد بدصورت لگنے لگا تھا۔بے حد۔

"Great skin, lovely features."

میک اپ آرٹسٹ اس کا میک اپ کرتے ہوئے بے اختیار کہہ رہا تھا۔

"Your face is a beautician's delight."

زینی کو لگا وہ اس پر طنز کر رہا تھا۔اس کے چہرے میں خوبصورتی کہاں تھی صرف آنکھیں، ناک اور ہونٹ تھے۔گال، ماتھا اور ٹھوڑی تھی اور یہ ساری چیزیں ہر ایک کے چہرے پر ہوتی ہیں۔

خوب صورتی تو اس چہرے میں ہوتی جسے شیراز محبت سے دیکھتا جسے وہ چھوتا۔اس نے اس کی بیوی کا نام سوچنے کی کوشش کی۔کیا نام ہو گا اس کا؟ اور شیراز کے ہونٹوں سے کیسا لگتا ہو گا۔مگر کیا شیراز اس کو نام سے پکارے گا یا کچھ اور کہے گا۔

زینی نے اختیار آنکھیں بند کیں۔ میک اپ آرٹسٹ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''آنکھیں کیوں بند کرلیں؟'' زینی نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا آنکھ میں کچھ پڑ گیا؟'' اس نے اس کی مسکراتی آنکھوں میں اترتی نمی کو دیکھ کر کہا۔ زینی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بڑی احتیاط سے اس کی آنکھیں چیک کرتے ہوئے بولا۔

''کیا نکالوں؟''

''بینائی۔'' وہ مدھم آواز میں بڑبڑائی جو وہ سن نہیں سکا۔

''مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا۔''

''مجھے بھی کچھ نظر نہیں آرہا۔'' وہ ایک بار بڑبڑائی۔ وہ دوبارہ مطمئن ہو کر اس کا میک اپ کرنے لگا۔

اسے پارٹی ویئر کے Segment میں کیٹ واک کرنی تھی اور فاران بے حد نروس تھا۔ اس کا اتنے دنوں کا اعتماد ختم ہو چکا تھا۔ بیک اسٹیج اسے جس موڈ میں دیکھ کر گیا تھا، اس کے بعد اس نے اپنی ساری امیدوں اور توقعات کو ایک طرف رکھ دیا تھا۔

اسے Sana and Safinaz کی پارٹی رائن کے لیے پہلی کیٹ واک کرنا تھی۔ وہ اس کا پہلا Segment اور وہ چوتھے نمبر پر تھی۔ اس سے پہلے کی تینوں ماڈلز رن وے پر آ چکی تھیں۔

فاران نے زندگی میں پہلی بار آڈینس میں بیٹھ کر انگلیاں چٹخائیں۔ اسے اسٹیج پر آنے میں چند سیکنڈز کی تاخیر ہو چکی تھی اس سے پہلے آنے والی تینوں ماڈلز رن وے کا چکر لگا کر اسٹیج پر اپنی جگہیں لے چکی تھیں اور رن وے خالی تھا۔ چوتھی ماڈل ابھی تک نہیں آئی تھی۔

فاران نے اسے بے اختیار زیر لب گالی دی اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھ جاتا ''پری زاد'' اسٹیج پر آ گئی تھی۔ وہ بے اختیار بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں پری زاد پر چپک گئی تھیں۔ صرف اس کی نہیں پورے ہال کی نظریں پری زاد پر چپک گئی تھیں۔

وہ واقعی رن وے پر کوئین کی طرح چلتی آ رہی تھی۔ رن وے کے اطراف میں بیٹھے فوٹوگرافرز اور کیمرہ مین کے کیمروں کا رخ بدل گیا تھا ''یہ کون ہے؟'' فاران نے اپنے آس پاس سرگوشیاں سنی شروع کر دی تھیں۔ ہال میں بیٹھے فیشن جرنلسٹ نوٹس لینا شروع ہو گئے تھے۔ وہ رن وے کے درمیان آ چکی تھی۔

فاران نے بے ساختہ اعتراف کیا تھا اس نے زینی کو کبھی اس سے زیادہ شاندار انداز میں کیٹ واک کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے زینی کو کبھی اس سے زیادہ باوقار نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کبھی زینی کو اس سے زیادہ ہوش اڑانے والے انداز میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ رن وے پر نہیں چل رہی تھی۔ ہال میں بیٹھے مردوں کے دلوں پر چل رہی تھی۔ اس کے انداز میں غرور تھا۔ تفاخر تھا، تمکنت تھی۔ ملکہ جیسے اپنے دربار میں آئی تھی۔ وہ رن وے کے چکر لگا کر اب اسٹیج پر اپنی جگہ لینے واپس جا رہی تھی۔ پانچویں ماڈل اسٹیج پر انٹری دے رہی تھی۔ ہال میں کسی کو اب پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں ماڈل میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

پورا ہال صرف اس ایک کونے کو دیکھنے میں مصروف تھا جہاں پری زاد کھڑی تھی، جہاں پری زاد توقف کر رہی تھی، جہاں پری زاد نے قدم اٹھایا تھا۔ جہاں پری زاد نے Exit کی تھی۔

فاران نے ٹھیک سوچا تھا کیٹ واک کوئین آ چکی تھی۔

وہ اگلے segment میں پانچویں نمبر پر آئی تھی۔ اس بار وہ ایک ایوننگ گاؤن میں تھی۔

Off the Shoulder تھا اور ''ہال کا حال'' ایک بار پھر پہلے جیسا ہی ہوا تھا۔

اس بار اسے اسٹیج پر ٹھہرنا نہیں تھا، صرف کیٹ واک کر کے چلے جانا تھا اور اس کے Exit پوائنٹ کی طرف جاتے ہوئے فاران بھی ہال سے تقریباً بھاگتے ہوئے بیک اسٹیج چلا گیا تھا۔ وہ اپنا لباس تبدیل کروانے کے لیے کسی کو مدد کے لیے کہہ رہی تھی۔

اس نے فاران کو تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ دور سے آتے دیکھ لیا تھا اور اس کے پاس آنے سے پہلے ہی اسے بے حد تلخی اور تنبیہ کرنے والے انداز میں ہاتھ کے اشارے سے کہا ''Dont'' فاران کے قدم وہیں جم گئے۔

وہ اسے ایک بار پھر کچھ کہنے سے روک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر ویسی ہی وحشت تھی۔ فاران اس کے قریب نہیں آیا مگر بیک اسٹیج ہی ٹھہرا رہا۔

اس وقت اس پری زاد سے لوگوں کو دور رکھنا تھا۔ ڈیزائنرز سے، جرنلسٹ سے، فیشن کوارڈینیٹرز سے۔ وہ اس کی دریافت تھی۔ اس کی محنت تھی۔ اس کا پھل بھی اس کو کھانا تھا۔

زینی کپڑے تبدیل کر کے اب بیک اسٹیج کے ایک کونے میں بیٹھ کر سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہی تھی اور فاران لوگوں کو اس کی طرف آنے نہیں دے رہا تھا۔

''آپ مجھے اس کا منیجر سمجھ لیں، مجھ سے بات کریں۔'' زینی نے اسے کسی سے کہتے سنا۔

''منیجر ـــ'' وہ بڑبڑائی۔ وہ ایک بار پھر شیراز کی شادی میں جا پہنچی تھی۔

''نکاح ... اب یقیناً نکاح ہو رہا ہوگا۔'' اسے لگا جیسے کسی نے اس کے سامنے اس کی زندگی کے سب سے قیمتی اثاثے کی بولی لگانا شروع کر دی ہو۔ اسے یاد نہیں اس نے کتنی بار تصور میں اپنا اور شیراز کا نکاح ہوتے دیکھا تھا۔ سینکڑوں نہیں، ہزاروں بار ... وہ اپنی زندگی کے اس سب سے قیمتی لمحے کی بے حد شدت سے منتظر تھی۔ کاغذ پر چند دستخط شیراز کو ہمیشہ کے لیے اس کی ملکیت بنا دیتے اور اب چند دستخط اسے کسی اور کا بنا رہے تھے۔

اور اب شیراز منتظر ہوگا وہ اپنی بیوی کو دیکھے، اس کی بیوی اس کے سامنے لائی جانے والی تھی۔

''او زینی ـــ ٹینا ـــ اسٹیج سے اترتے ہوئے سلپ ہو گئی ہے، اس کے پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔ وہ فائزہ سمیع کا Segment نہیں کر سکتی۔ فائزہ چاہ رہی ہے تم ٹینا کو Replace کر لو۔'' فاران کچھ ہانپتا کانپتا ایک دم اس کے پاس آیا۔

''کر لیتی ہوں۔'' وہ شکست خوردہ انداز میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چند منٹوں میں فائزہ کی پوری ٹیم اس کے گرد کھڑی تھی وہ ان

Accessories کو دیکھ رہی تھی جو اسے پہننا تھیں۔ تب ہی فائزہ کا اسسٹنٹ اس کا لباس لے کر آ گیا تھا۔ زینی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور ساکت رہ گئی۔ وہ عروسی لباس تھا۔

"میں کسی برائیڈل کی ماڈلنگ نہیں کروں گی۔" وہ یک دم غرا کر فاران سے بولی۔

"لیکن کیوں زینی! یہ فائزہ کا آج کا سب سے قیمتی برائیڈل ہے اور یہ ٹینا کی بدقسمتی ہے کہ وہ سلپ ہو گئی ورنہ تو..."

"یہ ٹینا کی نہیں میری بدقسمتی ہے کہ وہ سلپ ہو گئی۔" زینی بڑبڑائی تھی۔

"جو بھی ہے میں یہ نہیں پہنوں گی۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔

اگلے پانچ منٹوں میں وہاں جھگڑا لگ گیا تھا۔ فائزہ سمیع سمیت ہر ایک اسے وہ لباس پہننے پر مجبور کر رہا تھا۔

"آخر انکار کی وجہ کیا ہے؟ لباس بالکل قابل اعتراض نہیں۔ سب سے مہنگا ہے۔ کلر بھی تمہارے کمپلیکشن پر سوٹ کرے گا۔ تمہیں برا لگنے کا بھی مسئلہ نہیں ہے۔" ہر ایک اس سے اس لباس کو نہ پہننے کی وجہ جاننا چاہ رہا تھا۔

وہ ان سے کہنا چاہتی تھی۔ مسئلہ لباس کے ساتھ نہیں ہے۔ مسئلہ آج کی رات کے ساتھ ہے۔

☆☆☆

اسے فیشن شوز میں دلچسپی نہیں تھی۔ اسے جن لوگوں سے ملنا تھا، انہیں اس شو میں دلچسپی تھی۔ حل وہی تھا جو وہ ہمیشہ نکالا کرتا تھا۔ وہ تقریباً اس وقت ہال میں آیا تھا جب شو اپنے اختتامی آدھ گھنٹے میں داخل ہو چکا تھا۔

فائزہ سمیع کی برائیڈل لائن ڈسپلے کی جا رہی تھی۔ اس نے سیل فون پر بات کرتے ہوئے اپنی مطلوبہ میز کو تلاش کیا اور اس کی طرف بڑھنے لگا اور تب ہی شو کی آخری ماڈل شو کا آخری لباس پہن کر اسٹیج پر نمودار ہوئی تھی۔ اس نے سرسری نظروں سے اسے دیکھا اور اس کے بعد وہ سیل فون پر بات کرنا بھول گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ چند لمحوں کے لیے فق ہو گیا تھا۔

وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑا اسے رن وے پر کیٹ واک کرتے اپنی طرف آتے دیکھتا رہا۔ اس نے زندگی میں کسی عورت کو سرخ عروسی لباس میں اس قدر خوبصورت لگتے نہیں دیکھا تھا۔ سرخ لباس اسے خوبصورت بنا رہا تھا یا وہ سرخ لباس کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"You are in my way" وہ چونک کر پیچھے مڑا۔ کسی نے اس سے کہا تھا اور پھر اسے راستے سے ہٹنے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ سب سے قریبی میز کی چند خالی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ وہ رن وے کے آخری حصے پر پہنچ چکی تھی اور اس کی میز اس کے بالکل سامنے تھی۔ دونوں کی نظریں ایک لمحہ کے لیے ملی تھیں پھر پری زاد وہاں کھڑی ہو گئی۔ پورا ہال اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے میں مصروف تھا۔ مرد اس کے جسم کے دلکش خدوخال کو سراہ رہے تھے۔ عورتیں اس کے لباس کی ڈیزائننگ اور کام کو۔ صرف وہ تھا جس نے ایک لمحے کے لیے بھی پری زاد کے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ اس کے لیے پری زاد آج کے بعد صرف ایک ہی چہرے کا نام تھا۔

پری زاد اب رن وے پر واپس جا رہی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس فیشن شو میں پہلے نہ آنے پر پچھتایا۔

☆☆☆

زینی نے واپس ڈریسنگ روم میں آ کر ڈریس اتارنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ جیسے اس کے جسم کو جلا رہا تھا۔ وہ اس کا دوپٹہ اور جوتے ڈریسنگ روم تک آتے آتے اتار آئی تھی۔ اسٹائلسٹ نے بڑی احتیاط سے اس کا دوپٹہ اتارا تھا اور ساتھ اسے تنبیہ کی تھی۔ وہ بڑی لاپروائی اور جلد بازی سے چیزیں اتار رہی تھی۔ وہ لباس خراب ہوتا تو ڈیزائنر بہت ناراض ہوتی۔

''مجھے پتا ہے، یہ میرا لباس نہیں ہے۔ یہ کسی کا ہے۔'' اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

ڈریسنگ روم کے قد آدم آئینوں کے سامنے اپنے آپ کو دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے خود بھی ٹھٹک گئی تھی۔ اسے نہیں پتا شیراز کی بیوی نے آج کون سا لباس پہنا تھا مگر وہ اپنی شادی پر سرخ لباس ہی پہننا چاہتی تھی۔ شیراز بھی یہی چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا، وہ سرخ لباس میں بہت خوبصورت لگتی۔

وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ کم از کم آئینے تو اس سے یہی کہہ رہے تھے۔ وہ زیور اتار کر باہر اسٹائلسٹ کو دے چکی تھی۔ وہ بغیر زیور اور بغیر دوپٹے کے صرف وہ سرخ عروسی لباس پہنے ہوئے تھی جس کی مالیت لاکھوں میں تھی۔ فرق صرف یہ تھا، وہ اس کی شادی کا لباس نہیں تھا۔

وہ ایک ماڈل تھی دلہن نہیں تھی۔ اسٹیج پر اس پر پڑنے والی نظروں میں ستائش ہوتی، چاہ نہیں۔ کوئی زینی کو، ڈول اور عورت ہونے کا فرق اس سے زیادہ اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ اس کے بعد وہاں نہیں ٹھہری تھی۔ فاران اس پر چیختا چلا تا رہا تھا مگر وہ ہوٹل میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ اس کے پیچھے کمرے تک بھی آیا تھا مگر زینی نے دروازہ نہیں کھولا نہ ہی فون کا ریسور اٹھایا جو بار بار بج رہا تھا۔ اسے یقین تھا۔ وہ اب انٹرکام کے ذریعے اسے دروازہ کھولنے پر مجبور کرتا۔ اس نے اپنا سیل فون پہلے ہی بند کر دیا تھا۔

انٹرکام جب وقفے وقفے سے بار بار بجنے لگا تو اس نے بالآخر اسے اٹھا کر بے حد ناراضی میں کسی کو بھی اپنے کمرے میں آنے یا کوئی پیغام یا کال اس کو دینے سے انہیں سختی سے منع کر دیا۔ کسی نے دوبارہ اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔

کمرے میں جتنے سگریٹ تھے۔ اس نے چند گھنٹوں میں انہیں پھونک دیا۔ پھر وہ سلیپنگ پلز کی بوتل نکال کر بیٹھ گئی۔ اس کے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا، وہ ایک گولی کے بجائے بوتل کی پوری گولیاں نگل لے۔ کم از کم اس کے بعد اس کی زندگی میں کوئی اگلا دن نہ آتا۔ پھر اسے اخبار میں لگنے والی خبریں اور اپنے گھر کے باہر اخبار والے اور ان میں پھنسے ضیاء کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے گولیوں کی بوتل واپس دراز میں رکھ دی۔ وہ اب سونا بھی نہیں چاہتی تھی۔

کمرے میں چکر کاٹتے کاٹتے وہ ایک بار پھر شیراز کے پاس پہنچ گئی تھی۔

''زینی! تم جانتی ہو، میں تمہیں شادی پر کیا تحفہ دوں گا؟''

''کیا؟''

''ڈائمنڈ رنگ۔''

''اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟''

''بھئی! کہیں سے بھی آئیں تمہیں کیا۔ بس تمہیں دوں گا میں۔''

کمرے میں ننگے پاؤں چکر کاٹتے زینی نے بے بسی سے سوچا۔ کیا وہ اسے ڈائمنڈ رنگ دے رہا ہوگا۔ وہ رنگ جو اسے زینی کو دینی تھی۔

کمرے میں یک دم اسے بے حد گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے پہلے کولنگ تیز کی پھر کھڑکی کھول کر بالکونی میں سانس لینے چلی گئی۔ سانس نہیں آرہا تھا۔ پتہ نہیں۔ آج کی رات سب کچھ کیوں خراب تھا۔ وہ دوبارہ اندر آگئی۔ چپ چاپ کھڑی کمرہ دیکھتی رہی۔

پھر وہ ننگے پاؤں اپنے کمرے سے باہر نکل کر نیچے ہوٹل کی لابی میں آگئی تھی۔ وہ اس وقت تنہائی سے بھاگنا چاہتی تھی۔ لوگوں کا شور سننا چاہتی تھی شاید باہر کا شور اس کے اندر پھیلی قبر جیسی خاموشی کو توڑ دیتا شاید باہر لوگوں کے بیچ آکر ان کے چہروں کو دیکھتے وہ یہ بھول جاتی کہ وہ اس وقت کسی دوسری عورت کے ساتھ تھا۔ اس کے بیڈ روم میں۔

زینی کی وحشت بڑھ رہی تھی۔ وہ بے مقصد ننگے پاؤں لابی میں ادھر سے ادھر پھر رہی تھی، یہ جانے بغیر کہ اس کا حلیہ اور انداز اسے بہت لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہے تھے۔

پر اسے کیا پروا ہوتی۔ ایک ہلکی سی ڈھیلی جینز اور ٹاپ میں ملبوس کسی میک اپ اور جیولری کے بغیر تراشیدہ بالوں کو کھلا چھوڑے۔

وہ اس وقت بھی اس لابی میں موجود اور ادھر سے ادھر جانے والی حسین ترین عورتوں میں سے ایک تھی۔ وہاں موجود ایشیائی اور یورپی مردوں نے اسے شام کے شو کی ایک ماڈل کے طور پر پہچانا ہو یا نہ پہچانا ہو لیکن بہرحال وہ اب اسے دیکھ رہے تھے۔ اور جو اس کا چہرہ دیکھ کر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ اس کے ننگے پیروں کو دیکھ کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

Excuse me Yadam! Are you looking for someone?

(ایکسکیوزمی میڈم! کیا آپ کو کسی کی تلاش ہے؟)

ہوٹل کے عملے کے ایک رکن نے اسے بار بار ایک ہی جگہ پھرتے دیکھ کر روکا تھا۔ زینی ٹھٹک گئی۔ تو کیا اب یہ دنیا کو بھی نظر آنے لگا ہے کہ میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ اس نے وحشت بھری نظروں سے اس آدمی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

''No۔'' وہ ایک بار پھر اسی طرح پھرنے لگی تھی۔ عملے کے اس رکن کو اس کے ذہنی توازن پر شبہ ہوا۔ مگر پھر وہ کندھے اچکا کر وہاں سے چلا گیا۔ یہاں اس ہوٹل میں اس طرح کے بہت ''نمونے'' آتے تھے۔

اور تب ہی وہ لابی میں بنے ایک سٹنگ لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے آس پاس کے صوفوں پر بیٹھے دوسرے مردوں کو نہیں دیکھا تھا۔ ان میں کچھ غیر ملکی تھے۔ صرف ایک ایشیائی تھا اور زینی کو یہ پتا نہیں تھا کہ وہ بہت دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہر حرکت، ہر سرگرمی کو تب سے جب وہ

لفٹ کا دروازہ کھول کر لابی میں آئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا اسے کیا پریشانی تھی۔ اس کا کیا مسئلہ تھا مگر وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ پریشان تھی۔ وہ کیا کوئی بھی اس کی شکل دیکھ کر جان جاتا مگر وہ یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس کے اتنے قریب آ کر بیٹھ جائے گی۔

وہ فیشن شو میں اگر ان لوازمات کے ساتھ قیامت لگ رہی تھی تو ان تمام لوازمات کے بغیر اس بدرنگی جینز اور ٹاپ میں بھی اتنے ہی تباہ کن حسن کی مالک تھی۔ اس نے پری زاد کو دیکھتے ہوئے اعتراف کیا۔

پری زاد یا زینی؟ وہ سوچتے ہوئے اٹکا۔ وہ کسی دوست کے ساتھ شو کے بعد بیک اسٹیج گیا تھا۔ وہ زینی سے ملنا چاہتا تھا۔ ایک بار اس کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا اور وہاں اس نے زینی کو فاران کے ساتھ جھگڑتے دیکھا تھا۔ فاران اس کو زینی کہہ رہا تھا۔ دوسرے لوگ پری زاد۔ وہ اس کے پاس نہیں گیا۔ اسے فوراً احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس کے پاس جانے کا مناسب اور موزوں وقت نہیں تھا۔ وہاں سے آتے ہوئے اس نے قدرے مایوسی کے ساتھ سوچا تھا۔ شاید اب وہ دوبارہ اس چہرے کو نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ اگلی صبح کی فلائٹ سے واپس کینیڈا جا رہا تھا۔

فلائٹ بہت صبح کی تھی۔ اپنا سامان پیک کرنے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرف سونے کے بجائے لابی میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے فلائٹ سے پہلے کبھی نیند نہیں آتی تھی۔ وہ پہلے کے چند گھنٹے اسی طرح ضائع کیا کرتا تھا۔

لیکن آج معجزوں کی رات تھی۔ کم از کم اس کے لیے کہ وہ نہ صرف اسے دوبارہ بلکہ اپنے اتنے قریب دیکھ رہا تھا۔

"سگریٹ لے سکتی ہوں؟"

اس نے یک دم پری زاد کو اٹھ کر ایک قریبی صوفے پر بیٹھے غیر ملکی کے پاس جا کر سگریٹ مانگتے دیکھا۔ اس غیر ملکی نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے زینی کو نہ صرف ایک سگریٹ دیا بلکہ لائٹر سے اسے سلگا بھی دیا۔ وہ شکریہ ادا کر کے دوبارہ اپنے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ ایک ہاتھ سے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

قریبی صوفے پر بیٹھے اس کا دل چاہا، وہ اس کے پاس جا کر اس سے بات کرے۔ اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھے۔ کیا پریشانی ہو سکتی ہے پری زاد کو؟ اس نے دلچسپی سے سوچا۔

اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر اس کے پاس جاتا۔ اس نے پری زاد کو ایک بار اٹھتے اور پہلے کی طرح لابی کے چکر کاٹتے دیکھا۔ وہ جیسے نیند میں چلنے والے کی طرح بے مقصد پھر رہی تھی۔ اس نے دور بیٹھے اس کے ننگے پیروں کو دیکھا۔ اسے یقین تھا وہ خوب صورت نرم وہ نازک پاؤں اب تک بہت گندے ہو چکے ہوں گے۔

وہ ایک بار اٹھ کر اس کے پاس جانا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بیٹھا وہ لفظ ڈھونڈتا رہا جس سے وہ پری زاد سے بات شروع کرتا اور جب تک اسے لفظ ملے، اس نے پری زاد کو دوبارہ لفٹ میں سوار ہوتے دیکھا۔

وہ بے حد پچھتایا یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ محتاط تھا۔ ضرورت سے زیادہ سوچتا تھا۔ ضرورت سے زیادہ وقت لیتا تھا اور اکثر چیزیں کھو دیتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کسی کو کھو دیا تھا۔ اسے ایک عجیب سی بے چینی ہوئی۔

وہ اٹھ کر ریسپشن پر آ گیا۔ اس نے پری زاد کے کمرے کا نمبر پوچھا اور پھر ریسپشنسٹ سے اس سے بات کروانے کے لیے کہا۔

"سوری سر! انہوں نے منع کیا ہے کہ ہم کوئی بھی کال انہیں نہ دیں نہ کسی کو ان کے کمرے میں جانے دیں۔"

"لیکن وہ ابھی یہاں تھیں۔" اسے حیرانی ہوئی۔

"ہاں، لیکن وہ شو کے بعد سے کسی سے نہیں مل رہیں۔ کچھ لوگ ان کے کمرے کا دروازہ بجا کر بھی آئے ہیں۔ انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔"

وہ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے ریسپشنسٹ کے پیچھے دیوار پر لگے اس وال کلاک کو دیکھا جو دو بجے کا لوکل ٹائم بتا رہا تھا۔ اسے چیک آؤٹ کر جانا چاہیے تھا۔

"میرے کمرے سے میرا سامان منگوا دیں۔ میں چیک آؤٹ کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا ریسپشنسٹ فون کا ریسور اٹھا کر عملے کے کسی رکن کو اس کے سامان کے متعلق ہدایات دینے لگی۔

اس نے اپنا والٹ نکالا اور اس سے اپنا ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اس کی پچھلی طرف کچھ لکھا۔ پھر اسے ریسپشنسٹ کی طرف کھسکا دیا۔

"پری زاد کب چیک آؤٹ کر رہی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"آج دس بجے۔"

"ٹھیک ہے، آپ تب انہیں میرا یہ کارڈ دے دیں۔"

"او کے سر۔" ریسپشنسٹ نے سر ہلاتے ہوئے وہ کارڈ لے لیا۔

☆☆☆

وہ تین ہفتے کے بعد لاہور واپس آئی تھی اور آتے ہی چند گھنٹوں کی نیند لینے کے بعد اس نے بینک سے کچھ رقم نکلوائی اور وہ چیزیں نکالیں جو اپنے گھر والوں کے لیے لے کر آئی تھی، وہ جانتی تھی۔ اسے گھر جاتے ہی بہت لعنت ملامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح اچانک بغیر بتائے گھر چھوڑ دینا بہت بڑا فیصلہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ ضیاء اسے واپس لے جانے کے لیے وہاں آتے رہے ہوں گے اور وہ یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ وہ ملائیشیا جا چکی تھی۔

چوکیدار نے استفسار پر اسے بتا دیا تھا کہ کوئی آدمی زینب کو تلاش کرتا وہاں تک آیا تھا اور اس نے اسے پری زاد کے ملائیشیا جانے کا بتا دیا۔ وہ دوبارہ نہیں آیا۔ زینی جانتی تھی وہ ناراض ہوں گے۔

"آپ کا نام زینب ہے کیا؟" چوکیدار نے اس سے پوچھا۔ زینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چوکیدار کو جواب مل گیا۔

زینی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے نکل گئی۔ چوکیدار کو وہ نورانی چہرے والا آدمی یاد آیا جس کے ماتھے پر محراب تھی۔

"کیسے کیسے شریف اور نیک آدمیوں کی اولادیں ایسے کاموں میں آ جاتی ہیں ٹھیک ہی کہتے ہیں، اولاد بڑی آزمائش ہوتی ہے۔"

اس نے گیٹ بند کرتے ہوئے سوچا۔

گاڑی گلی میں اسی جگہ کھڑی کروا کر زینی گاڑی سے شاپرز لیے اتر گئی۔ آج پہلی بار وہ چادر کے بغیر صرف دوپٹہ گلے میں ڈال کر اس محلے میں آئی تھی۔ اب کیا بناوٹ اور منافقت کرتی وہ۔ چند ہفتوں میں اس کا پہلا کمرشل آن ایئر ہو جاتا۔ جگہ جگہ بل بورڈز لگ جاتے۔ پھر سر ڈھانپ کر کیا چھپا لینا تھا اس نے۔

پہلی گلی سے گزرتے ہوئے اس نے کچھ لوگوں کو بہت عجیب انداز میں خود کو گھورتے پایا۔ ان کی نظروں نے اسے کوئی عجیب سا احساس دیا۔

وہ اپنی تنگ گلی میں داخل ہو گئی۔ چند گھروں کے بعد اس کا گھر تھا اور اس نے اپنے گھر سے پہلے ایک پھر دوسری عورت کو نکل کر گلی میں دوسری طرف جاتے دیکھا۔ انہوں نے اس طرف نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ زینی کو دیکھ لیتیں۔

اپنے گھر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اسے احساس ہوا، اس کے گھر کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔ یہ عجیب بات تھی، کسی نے ان عورتوں کے نکلنے کے بعد دروازہ بند کیوں نہیں کیا۔ وہ اب دروازہ کے سامنے پہنچ گئی تھی اور تب ہی اسے اندر کچھ اور عورتوں کے ہونے کا بھی احساس ہوا۔ دروازہ واقعی کھلا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ ان عورتوں کے اندر ہونے کی وجہ سے اندر جانے سے جھجکی تھی۔ وہ اس وقت ان کے سوالوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مگر بہر حال جی کڑا کر کے اس نے قدم دروازے سے اندر رکھا اور پھر وہیں جم کر رہ گئی۔ صحن میں سفید چادر پر کچھ عورتیں بیٹھی سپارے پڑھ رہی تھیں۔ اس نے نفیسہ کو دیکھا۔ اس نے زہرہ کو دیکھا۔ اس نے ربیعہ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپرز گر پڑے۔ اسے پتا چل گیا تھا وہ سفید چادر کس کے لیے بچھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ (aisle) سیٹ پر بیٹھے اس مسافر کے پیروں کے پاس پڑے بیگ کی اسٹریپ سے الجھ کر گرتے گرتے بچا تھا۔ اگر سیٹ کی پشت کا سہارا نہ ملتا تو وہ صرف لڑکھڑاتا نہیں، بلکہ منہ کے بل گرتا لیکن شوکت زمان اس سے معذرت کرنے کے بجائے یک دم طیش میں اٹھ کر اس پر برسنے لگا۔

''اندھوں کی طرح چلتے ہیں، یوں جیسے جہاز پر نہیں ٹرین پر چل رہے ہوں، اسی لیے پی آئی اے پر سفر کرنا چھوڑ دیا میں نے۔ ایک سے ایک اجڈ، گنوار، جاہل سفر کر رہا ہوتا ہے اس پر۔''

شوکت زمان نے ان تین جملوں سے پہلے اسے کم از کم ستر گالیاں دی تھیں۔ اردگرد بیٹھے باقی پسنجر بے زاری کے عالم میں شوکت زمان کو دھاڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ صرف وہ تھا جو ہکا بکا شوکت زمان کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اس نے ایسا کیا کیا ہے جس پر اس نے یوں گالیاں بکنا شروع کر دیں۔

اگلے چند منٹوں میں ایئرہوسٹس بیچ بچاؤ کی نیت سے وہاں پہنچ گئی۔ یہ اور بات تھی کہ وہاں بیچ بچاؤ والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ جھگڑا مکمل طور پر یک طرفہ تھا۔ صرف شوکت زمان تھا جو بول رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' ایئرہوسٹس کے استفسار پر شوکت زمان نے اپنے گالیوں کے ذخیرے سے کچھ مزید گالیاں پیش کرتے ہوئے بے حد مختصر الفاظ میں اسے اس کی جرأت کے بارے میں بتایا۔ وہ ابھی بھی اسی طرح حیرت سے شوکت زمان کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ نے اپنا بیگ اوپر کمپارٹمنٹ میں کیوں نہیں رکھا۔ نیچے کیوں رکھا؟'' ایئرہوسٹس نے قدرے ترشی سے شوکت زمان سے کہا۔

''کیوں، میں نے کرایہ نہیں دیا کیا؟ جہاں مرضی رکھوں میں اپنا بیگ۔'' شوکت زمان نے تلخی سے کہا۔

''آپ کے بیگ کے اسٹریپ سے کوئی اور مسافر بھی الجھ کر گر سکتا ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟''

''آپ یہ کریں کہ اپنا بیگ اٹھائیں اور اسے اپنے کمپارٹمنٹ میں رکھیں سر!'' ایئرہوسٹس نے تحمل سے کہا۔

''ورنہ تم کیا کرو گی؟ مجھے جہاز سے باہر نکال دو گی یا پھر میرا بیگ باہر پھینک دو گی؟'' شوکت زمان نے اسی انداز میں کہا۔ اس وقت اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ شراب کے نشے میں تھا۔ شوکت زمان اور ایئرہوسٹس کو اسی طرح آپس میں الجھتا چھوڑ کر وہ اپنی سیٹ کی طرف آ گیا۔ وہ اس وقت جس ذہنی کیفیت میں تھا، اس حالت میں وہ کسی کے ساتھ الجھنے کے قابل نہیں تھا اور وہ اس ذہنی کیفیت میں نہ بھی ہوتا تو بھی کسی کے ساتھ جھگڑا وہ آخری کام تھا جو وہ کرتا۔

وہ چپ چاپ آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ اس وقت صابر قیوم کے بارے میں سوچے، اپنے بارے میں یا چند منٹ پہلے بغیر کسی وجہ کے گالیاں دینے والے اس مسافر کے بارے میں۔ وہ ذہنی طور پر انتہائی اپ سیٹ تھا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر نے اس سے کچھ کہا تھا مگر وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔

اپنی سیٹ کو نیچے کرتے ہوئے اس نے کچھ دیر کے لیے سونا بہتر جانا مگر آنکھیں بند کرتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ نیند کی کوشش بے کار ہے۔ وہ سو نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔

نیویارک میں رہتے رہتے بعض دفعہ اسے لگتا تھا، وہ پاگل ہونے والا ہے یا شاید ہو رہا تھا۔ وہاں کی خاموشی اذیت ناک تھی، وہاں کا شور ہول ناک۔ بعض دفعہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ وہاں کیوں اور کس طرح جی رہا ہے پھر اسے یاد آتا ان سب لوگوں کے لیے جو پیچھے پاکستان میں بیٹھے ہوئے اس کے بھیجے جانے والے "ڈالر" کا انتظار کرتے تھے۔

وہ اپنے لیے کبھی بھی نہیں جیا تھا۔ وہ اب بھی اپنے لیے نہیں جی رہا تھا۔ فضل دین کے فلیٹ کے اس کمرے میں رہنے والا ہر بندہ اسی کی طرح کی لولی لنگڑی زندگی لیے ہوئے تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بات کرنے پر آتے تو گھنٹوں بولتے رہتے۔ خاموشی کا وقفہ آتا تو ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے گھنٹوں ایک لفظ کا تبادلہ کیے بغیر ہر ایک اپنا کام کرتا رہتا۔ کسی بات پر ہنسنے پر آتے تو بغیر وجہ کے کتنی ہی دیر ہنسے جاتے اور لڑنے پر آتے تو ایک دوسرے کو جیسے جان سے ہی مار دینا چاہتے۔

وہ سب جیسے پتھر کے دور میں واپس چلے گئے تھے۔ survival of the fittest

(بقا) والی ماڈرن تہذیب میں رہتے ہوئے۔

وہ امریکہ میں رہ رہے تھے۔

land of the opportunity

میں، جہاں بے شمار مواقع تھے اور ان کو ملنے والا موقع صرف وہ ایک ڈالر کا نوٹ تھا جو ان کے اپنے ملک میں جا کر مٹھی بھر نوٹوں میں تبدیل ہو جاتا تھا اور اس مٹھی بھر نوٹوں سے وہ اپنے خاندان کے لیے آسائشیں خرید رہے تھے۔ ہر روز ہر اضافی کمایا جانے والا ڈالر پیچھے پاکستان میں لائف اسٹائل کو مزید تبدیل کر رہا تھا۔ مطالبات میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ ہوس اور خواہش کو اور بڑھا رہا تھا۔

اپنے گھر والوں کے لیے "جنتیں" بنانے کی خواہش میں وہ سب "دوزخ" میں آ بیٹھے تھے۔ روز رات کو اپنی اپنی شفٹ ختم کر کے اس کمرے میں ہر کوئی پورے دن یا رات کمائے جانے والے اپنے اپنے ڈالر اور سینٹ گن رہا ہوتا۔

ان میں سے کوئی بھی ان کو ڈالرز میں نہیں گنتا تھا۔ ہر ایک روپے میں گن رہا ہوتا تھا۔ اب 45 روپے، 235 روپے، 3040 روپے، 7727 روپے۔

"آج دو سو روپے زیادہ کمائے ہیں۔"

"آج کل سے پانچ سو روپیہ کم کمایا ہے۔"

کوئی نہ کوئی گننے کے بعد خوشی میں یا مایوسی سے اعلان کرتا۔

وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر یہی کچھ کر رہا ہوتا تھا۔

بہن کی شادی... بھائی کی فیس مکان کا کرایہ... مہینے کا خرچ پلاٹ کی قسط... علاج کے اخراجات گاڑی کی قسط...
مکان کی مرمت کا خرچہ گھر میں اے سی لگوانے کے پیسے باتھ روم میں ٹائلز لگوانے کی رقم... گھر میں ماربل لگانے کے اخراجات بچے کو انگلش میڈیم اسکول میں داخل کروانے کے اخراجات... بہن کے جہیز کے سامان کی تیاری اور خریداری بیوی کے زیورات کے لیے رقم قرضے کی رقم کی واپسی کے لیے پیسے... بھائی کے کاروبار شروع کرنے کے لیے رقم... بہن کے بچے کی پیدائش پر تحائف کے لیے رقم... گھر کے نئے فرنیچر کی قیمت... گھر میں کارپٹ ڈلوانے کے پیسے... پاکستان کا چکر لگانے کے لیے ٹکٹ اور تحائف خریدنے کے لیے رقم

وہاں ہر مہینے ہر کوئی کسی نہ کسی چیز کے لیے رقم جوڑ رہا تھا۔ اگلا مہینہ آتا اور ایک نیا خرچہ آ جاتا۔ پاکستان جیسے ان سب کے لیے ایک اندھا کنواں بن گیا تھا، جس میں وہ جو کچھ کماتے، جو کچھ بناتے، ڈال آتے۔

واحد عیاشی جو وہ کرتے تھے، وہ ویک اینڈ پر نیویارک کی کسی سڑک پر کھڑی سب سے سستی hooker کے ساتھ چند گھنٹے گزارنا تھا یا اگر ہفتے میں کچھ زیادہ بچت ہو جاتی تو اس کے ساتھ پوری رات گزارتے اور وہ اس چیز کے لیے ضمیر کے کسی بوجھ، کسی ملامت، کسی شرم، کسی ندامت کا شکار نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی اس کمرے میں موجود مرد ایک دوسرے کو اس کے لیے لعن طعن کرتے تھے۔ land of the opportunity میں یہ محبت کی تلاش کی کوشش تھی یا صرف ضرورت کی تکمیل۔ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

وہ اس کمرے کا واحد مرد تھا جو ویک اینڈ کسی hooker کے ساتھ نہیں گزارتا تھا۔ اس کی چھبیس سال کی زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ اس عورت کے سوا جو اس کی منگیتر تھی اور ویک اینڈ پر وہ سب سے پہلے اسے کال کرتا تھا۔

دس منٹ کی کال میں آٹھ منٹ صرف وہ بولتی۔ پہلے اس کا حال پوچھتی پھر اس کی سرگرمیاں... پھر پوچھتی کہ اس نے اس دن کیا کھایا ہے۔

پھر اس سے پہلا شکوہ کرتی پھر دوسرا پھر تیسرا پھر چوتھا پھر روتی رہتی اور غصے میں بولتی رہتی۔

تب تک آٹھ منٹ ہو چکے ہوتے اور وہ بے حد چپ چاپ افسردگی کے ساتھ اس کی ساری باتیں سنتا۔ اس کا کوئی گلہ غلط نہیں تھا، اس کی کوئی شکایت جھوٹی نہیں تھی لیکن اس کے پاس اس کے کسی مسئلے کا فی الحال کوئی فوری حل نہیں تھا۔ آخری ڈیڑھ منٹ میں وہ اس سے ایک بار پھر اپنی محبت کا اظہار کرتا۔ اس سے پوچھتا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں تھی پھر اس سے وہی جھوٹا وعدہ دہراتا جو وہ ہمیشہ سے دہراتا آ رہا تھا۔

"انشاء اللہ، اگلے ماہ آنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ پچھلے چھ سال سے اس سے یہی وعدہ کر رہا تھا اس کی منگیتر کو پتہ تھا کہ وہ وعدہ نہیں تھا، وہ خواہش تھی۔

وہ روتے ہوئے اسے خدا حافظ کہتی۔ اپنا خیال رکھنے کے لیے کہتی۔ وہ بھی یہی کہتا۔ تب تک کال ختم ہو جاتی۔ وہ پورا ہفتہ ان باتوں کو دن میں کئی کئی بار اپنے ذہن میں دہراتا۔ اس کی آواز کو بار بار اپنے تصور میں لانے کی کوشش کرتا۔

اگلا ویک اینڈ آنے تک وہ سب باتیں اسے ذہن نشین ہو چکی ہوتیں۔

وہ اس سے شدید محبت کرتا تھا، اس میں تو اسے کوئی شبہ کبھی رہا ہی نہیں تھا۔ وہاں اس کمرے میں رہنے والے اکثر مرد اپنی بیویوں اور منگیتروں

کے ساتھ اسی طرح کی شدید محبت کا شکار ہوتے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان سب کی زندگیوں میں کوئی دوسری عورت شامل رہتی یا آتی جاتی رہتی۔

اس کی زندگی میں یہ محبت نہ بھی ہوتی، تب بھی کسی عورت کو خرید کر اس کے ساتھ وقت گزارنے کا وہ کبھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ اپنی ماں، بہنوں اور منگیتر سب سے بے حد محبت کرتا تھا۔ سب کی بے پناہ عزت کرتا تھا۔ سب کا بے تحاشا خیال رکھتا تھا مگر وہ عورت کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا تھا۔ لاس ویگاس کے ایک سال نے عورت کے اس بت کو اس کی نظروں میں بری طرح مسخ کر دیا تھا جس بت کو وہ بچپن سے اپنی سوسائٹی میں دیکھتا آ رہا تھا۔ پیسے کے لیے ''کچھ بھی'' کرنے والی عورت سے وہ امریکہ آ کر ہی متعارف ہوا تھا اور یہ تعارف اس کے لیے جیسے اس کی زندگی کا سب سے بڑا شاک تھا۔

اس نے مغربی عورت کے بارے میں وہاں آنے سے پہلے بھی بہت کچھ سنا تھا مگر وہ سب کچھ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

اور پھر آہستہ آہستہ وہاں رہتے ہوئے اسے احساس ہونے لگا تھا کہ صرف مغربی عورت نہیں، کچھ عورتیں پیسے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ اس میں مشرق یا مغرب کی تخصیص نہیں تھی اور پھر کئی بار وہ ''کچھ عورتوں'' پر اٹکنے لگا۔ کچھ عورتیں، یا عورتیں؟ یا ''عورت''

اس کی الجھن دن رات بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر خبر، ہر واقعہ، ہر حادثہ اسے مزید الجھا رہا تھا۔ وہ ماں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کے ہاتھوں میں استعمال ہونے والے مردوں سے مل رہا تھا۔ انہیں دیکھ رہا تھا۔ ہر مرد وہاں صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیے بیٹھا تھا۔

''عورت کو مرد میں نہیں، اس کی جیب سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اس سے اس کا رشتہ چاہے کوئی بھی ہو۔''

وہ گونگوں کی طرح بیٹھ کر یہ جملے سنتا رہتا پھر ویک اینڈ پر اپنی ماں، بہن اور منگیتر کے لہجے میں لالچ کھوجتا رہتا۔ کبھی وہ ناکام رہتا تو خوش ہوتا اور جب ڈھونڈ لیتا تو مایوس ہوتا۔

کسی نہ کسی طور پر کہیں نہ کہیں اور اپنے آپ کو یہ فریب دیتا رہتا تھا کہ اس کے گھر کی عورتیں پوری دنیا کی عورتوں سے مختلف ہیں۔ ان کو اس سے محبت ہے۔ اس کے وجود سے، اس کے پیسے سے نہیں۔ کہیں نہ کہیں ''ضرورت'' اس کے اس ''فریب'' کے چیتھڑے اڑاتی رہتی۔

وہ اپنے گھر پر بات کرتے ہوئے کبھی کسی ایسے ویک اینڈ پر کسی ایسی کال کا انتظار کرتا رہتا جس میں اس سے کوئی فرمائش، کوئی مطالبہ نہ کیا جاتا۔ بعض دفعہ اسے لگتا اس کی کال کا اس لیے انتظار نہیں کیا جاتا کہ وہ اس کی خیریت جاننا چاہتے تھے بلکہ اس پہ انتظار کیا جاتا تھا کیونکہ کسی نہ کسی کو اس سے کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا تھا۔

صرف اپنی منگیتر کو کی جانے والی وہ دس منٹ کی کال ایسی ہوتی تھی جس میں اس کی طرف سے کوئی فرمائش، کوئی مطالبہ نہیں ہوتا تھا، وہ اس کے لیے اس کا شکر گزار تھا مگر بعض دفعہ وہ سوچتا، شاید وہ ابھی منگیتر ہے، بیوی نہیں، اس لیے مطالبے نہیں کر رہی۔ شاید وہ اس لیے اس سے کوئی فرمائش نہیں کرتی کیونکہ وہ اکثر اوقات کسی آنے جانے والے کے ہاتھ اسے کچھ نہ کچھ بھجواتا رہتا تھا۔ بعض دفعہ روپے بھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا پھر بھی ان کا رشتہ اسی طرح کسی لالچ، کسی غرض کے بغیر ہو سکتا ہے۔ کیا وہ وہی عورت تھی جس کو پیسے سے دلچسپی نہیں تھی، اس سے تھی۔ شاید ایسا ہی تھا۔

اس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ''شاید'' تھا۔ اس کی زندگی میں ''شاید'' نہ ہوتا تو ذہنی طور پر وہ بہت پر سکون رہتا۔

اس کے کندھے کو کسی نے تھپکا، اس نے بے اختیار چونک کر آنکھیں کھول دیں اور آنکھیں کھولتے ہی وہ بے اختیار سیٹ پر سیدھا ہو کر

بیٹھ گیا تھا۔ اس کے پاس ایک بار پھر شوکت زمان کھڑا تھا جواب بالکل بدلے ہوئے موڈ میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

''کیا میں نے تم سے جھگڑا کیا تھا؟''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ ہاں کہے یا نہ یا اس کو get lost (دفع ہو جاؤ) کہے۔

''میں نے تم سے جھگڑا کیا تھا کیا؟'' شوکت زمان نے ایک بار پھر پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ یک دم اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا جس کا مسافر شاید باتھ روم گیا تھا۔

''پتہ نہیں یار! کیا ہو گیا مجھے؟ خوامخواہ تم سے منہ ماری کر بیٹھا مجھے معاف کر دینا یار!''

وہ اب دونوں ہاتھ جوڑے بے حد التجائیہ انداز میں اس سے کہہ رہا تھا اور وہ ایک بار پھر اسی ہونق انداز میں اس کا منہ دیکھنے لگا۔

''بہت گناہ گار ہوا ہوں میں تم سے لڑ کر۔ مجھے ایر ہوسٹس نے بتایا تم کسی ڈیڈ باڈی کے ساتھ سفر کر رہے ہو۔''

اس نے ایک بار پھر الجھے ہوئے انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ شوکت زمان سے یک دم خائف ہو گیا تھا۔ وہ آدمی اسے ذہنی طور پر ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ نشے میں تھا یہ تو اسے معلوم تھا مگر اس کی حالت نشے میں دھت لوگوں جیسی نہیں تھی۔

''کس کی ڈیڈ باڈی کے ساتھ سفر کر رہے ہو؟'' شوکت زمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے حد ہمدردی سے پوچھا۔

اس نے مختصر لفظوں میں صبر قیوم کے بارے میں بتایا اور پھر بے اختیار پچھتایا۔

شوکت زمان نے اس کی پوری بات سن کر چند لمحوں کا توقف کیا پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آس پاس کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے ایک بار اس کو دیکھنا شروع کر دیا مگر اس بار کسی نے شوکت زمان کے لیے ماتھے پر بل نہیں ڈالے۔ صرف وہ تھا جو مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ شوکت زمان کو کس طرح دلاسہ دے کر چپ کروائے۔

''بڑا نیک آدمی تھا صابر قیوم۔'' شوکت زمان نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ وہ اس کی بات پر ہکا بکا رہ گیا۔

''آپ جانتے تھے اسے؟''

''نہیں لیکن نیک ہی ہوگا کہ مرنے کے بعد واپس پاکستان جا رہا ہے۔'' اسے شوکت زمان کی منطق سمجھ میں نہیں آئی۔

شوکت زمان وہاں بیٹھا آدھے گھنٹہ تک اس شخص کے لیے ہچکیوں کے ساتھ روتا رہا جس کے ساتھ اس کا واحد رشتہ یہ تھا کہ اس نے بھی اپنی پوری زندگی شوکت زمان کی طرح باہر گزاری تھی۔

اس سیٹ کا مسافر اس دوران وہاں آ کر شوکت زمان کو روتے دیکھ کر بے حد کنفیوزڈ انداز میں کسی اور خالی نشست پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس دوران ایر ہوسٹس دو بار شوکت زمان کو چپ کروانے آئی تھی لیکن شوکت زمان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ خود ہی خاموش ہو گیا۔ جیب سے ایک رومال نکال کر اس نے اپنے آنسو پونچھے، ناک صاف کیا اور اس سے کہا۔

''میرے لائق کوئی خدمت؟''

''نہیں، شکریہ۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

وہ تنگی اور مجبلی آدمی اس کی کیا خدمت کر سکتا تھا۔

''باڈی لینے کون آئے گا؟''

''باڈی کہاں جائے گی؟''

''خود وہ کہاں ٹھہرے گا؟''

وہ اب اس سے ایک کے بعد ایک سوال کر رہا تھا۔ اس نے اسے صابر قیوم کی باڈی کو پاکستان لانے کے سلسلے میں اس کی فیملی کی عدم دلچسپی کے بارے میں بتایا۔ کس طرح چندہ اکٹھا کر کے وہ اس کی باڈی کو یہاں لا رہے تھے اور کس طرح اسے اس کے ساتھ آنا پڑا۔ شوکت زمان کی رنجیدگی میں اضافہ ہوتا گیا مگر اس کے تمام خدشات کے باوجود وہ یا نہیں بلکہ اس نے دوبارہ ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ جیسے گم صم ہی ہو گیا تھا۔ باقی کا سارا رستہ شوکت زمان اس کے پاس اسی حالت میں کچھ کھائے پیئے بغیر بیٹھا رہا تھا۔ اس نے اس مسافر کے ساتھ اپنی سیٹ تبدیل کر لی تھی۔ اس فلائٹ میں صرف وہی دونوں مسافر تھے جو کچھ کھا پی نہیں رہے تھے، وہ اپنی حالت کی وضاحت دے سکتا تھا۔ اس کا صابر قیوم کے ساتھ تعلق تھا مگر شوکت زمان کس صدمے کی وجہ سے بولنا اور کھانا پینا بھول گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

شوکت زمان صرف فلائٹ میں نہیں، اگلے دو دن بھی اس کے ساتھ رہا تھا۔ صابر قیوم کی تجہیز و تکفین کے انتظامات اس نے یا اس کے خاندان نے نہیں کیے، وہ شوکت زمان نے خود ہی اپنے ذمے لے لیے۔

صابر قیوم کے بیٹے اسے بھی اپنے باپ کا کوئی پرانا دوست سمجھ رہے تھے کیونکہ شوکت زمان خود اس سے زیادہ غم زدہ لگ رہا تھا۔ وہ خود جیسے بیک گراؤنڈ میں چلا گیا تھا۔ سب کچھ جیسے شوکت زمان نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور وہ اس کے لیے اس کا کچھ مشکور بھی ہوا تھا۔ اسے ایئرپورٹ پر لینڈ کرتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ شوکت زمان بے حد وسیع تعلقات اور اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ وہ سب کچھ ''ایک کال'' سے کروا رہا تھا۔ اور کیوں کروا رہا تھا؟ یہ اسے بہت بعد میں پتا چلا تھا۔

وہ تو خود صابر قیوم کی باڈی اس کے آبائی گاؤں میں دفنا کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ جب کہ شوکت زمان ابھی گاؤں میں ہی تھا۔ اسے صابر قیوم کی تدفین کے بعد بھی اس کے لیے کچھ کام کرنے تھے۔

شوکت زمان نے اس کا فون نمبر اور ایڈریس لینے کے بعد بے حد گرم جوشی کے ساتھ اسے رخصت کیا اور اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے شہر میں اس کے گھر آ کر اس سے ملے گا، نہ صرف یہ بلکہ اس نے اس کی واپسی کی فلائٹ کی تاریخ، وقت اور ایئر لائن کا نمبر بھی پوچھا تھا، وہ اسی کے ساتھ واپسی کا سفر کرنا چاہتا تھا۔

وہ عجیب آدمی تھا مگر وہ عجیب آدمی اپنے گھر جاتے ہی اس کے ذہن سے غائب ہو گیا تھا۔

وہ نو سال بعد پاکستان آیا تھا۔ نو سال میں اس کے گھر میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اس سے چھوٹی دونوں بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ ان

دونوں کی شادیاں اس کی عدم موجودگی میں ہوئی تھیں۔ اسے اپنے ہی بہن بھائیوں، اپنے ماں باپ، اپنے گھر، اپنے محلے کو پہچاننے میں بہت وقت لگا تھا۔ سب کچھ ویسا نہیں تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ سب کچھ بدل گیا اور پھر اسے اندازہ ہوا کہ صرف اسے ہی نہیں، انہیں بھی پہچاننے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔ وہ چھبیس سال کی عمر میں چھتیس سال کا لگ رہا تھا لیکن اس کا خیال تھا اس کے حلیے میں تبدیلی اس کے چہرے کی لکیروں، آنکھوں کے حلقوں اور سر کے جابجا سفید بالوں نے پیدا کی تھی۔

وہاں بیٹھنے کے کچھ ہی دیر بعد اسے پتہ چلا اس کا اندازہ غلط تھا۔ کوئی اس کے چہرے کو دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ تبدیلی اس کے امریکی لباس، جوتوں اور گھڑی نے پیدا کی تھی۔ اس محلے اور ان کے خاندان میں کویت، دبئی، سعودی عرب اور گلف کے دوسرے ملکوں سے بہت لوگ آتے تھے لیکن امریکہ سے اس محلے اور ان کے خاندان میں کوئی پہلی بار آیا تھا۔ ہر ایک کو امریکہ میں خریدا جانے والا اسکینڈ ہینڈ سامان بے حد مہنگا لگ رہا تھا۔ یہ کتنے ڈالر کا ہے، یہ کتنے ڈالر کا ..... یہ کتنے ڈالر کا ..... ؟

اسے کچھ دیر کے لیے لگا، اس کے جسم پر لباس، جوتے اور گھڑی نہ ہوتی تو اچھا تھا پھر کم از کم کوئی اس سے اس کے دل کی بات کرتا۔ وہ دو دن صابر قوم کی تدفین اور اس کی تدفین کے دوران اس کے بیٹوں کی سرد مہری دیکھتا رہا تھا۔ وہ اسی ذہنی حالت میں اپنے گھر آ گیا تھا اور یہاں آ کر اسے لگ رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ایسا تھا جو یہاں بھی ٹھیک نہیں تھا۔

مگر وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے لیے گرم جوشی نہیں تھی۔ ہر کوئی اسے لپٹا رہا تھا۔ اس سے خوشی اور جوش سے مل رہا تھا۔ اس کے لیے کھانے پک رہے تھے مگر اس سب کے بعد ہر کوئی اس سے امریکہ کے بارے میں بات کرنے بیٹھ جاتا۔ وہ وہاں کیا کرتا تھا، کتنے ڈالر روز کے کما لیتا تھا، کہاں رہتا تھا، کیا کھاتا تھا، امریکہ میں کیا کیا ہوتا تھا؟ کسی کو اس سے بات کرتے ہوئے یہ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ "پاکستان" آ گیا ہے۔ کوئی اسے امریکہ سے نکلنے ہی نہیں دے رہا تھا۔

"واپسی کب ہے تمہاری بیٹا؟"

اس کے باپ نے اس کی آمد کے دو گھنٹے کے بعد کھانے کے دوران اس سے پوچھا۔ وہ کچھ دیر روٹی کا نوالہ ہاتھ میں لیے ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"پچیس کو۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"اچھا ..... پورا مہینہ بنتا ہے پھر تو بڑے دن رہو گے۔ کام کا حرج تو نہیں ہوگا پیچھے؟"

"اس کی بھوک یک دم اڑ گئی۔ اس کے باپ کے لہجے میں اس کے لیے بے حد تشویش تھی۔

"جی نہیں، کام کا حرج نہیں ہوگا۔" اس نے مدھم آواز میں کہا اور نوالہ رکھ دیا۔

"بھائی جان! باقی سامان کب آئے گا؟" اس کی چھوٹی بہن نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔ وہ اپنے ساتھ صرف ایک سوٹ کیس لے کر آیا تھا۔

"باقی سامان؟" اس نے چونک کر ان لوگوں کو دیکھا۔ اسے احساس ہوا، وہ صرف چھوٹی بہن کا سوال نہیں تھا، ہر ایک کا سوال تھا۔

"بس اتنا سامان ہی ہے۔ میں نے بتایا نا کہ میں کسی کی ڈیڈ باڈی کو لے کر آیا ہوں کچھ اور خریدنے یا لانے کا تو خیال ہی نہیں رہا مجھے۔"

اس نے بے حد معذرت خواہانہ انداز میں سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے اب خیال آرہا تھا، وہ نو سال بعد آرہا تھا۔ اسے کچھ تو لانا ہی چاہیے تھا سب کے لیے۔

''کوئی بات نہیں، بھائی یہیں سے خریداری کروادے گا تم سب لوگوں کو۔ اب آرام سے کھانا کھانے دو میرے بیٹے کو۔'' اس کی ماں کو جیسے اس کا خیال آیا تھا۔

''کباب لو بیٹا!''

''نہیں، بھوک نہیں ہے۔'' اس کا دل واقعی اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ نرمی سے کہتے ہوئے کھانے کی میز سے اٹھ گیا۔

اندر کمرے میں آکر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتا اس کی ماں اندر آئی۔

''کہیں جا رہے ہو بیٹا؟''

''ہاں، میں ذرا عافی سے ملنے جا رہا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ماں سے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں، ہم نے کل تمہاری منگنی توڑ دی ہے۔'' وہ دوسرا سانس نہیں لے سکا۔

☆☆☆

دروازے پر مسلسل دستک ہو رہی تھی۔ غنودگی کے عالم میں اسے یہ شور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ جیسے اس کے لاشعور نے اس شور کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

کوئی دروازہ بجا رہا تھا، آہستہ آہستہ مگر بہت دیر سے مسلسل۔ زینی نے اپنی بوجھل آنکھوں کو بمشکل کھولا۔ اسے اس شور سے عجیب نفرت محسوس ہوئی۔ اس کا سر اور پورا جسم بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں کھلی رکھنے کے لیے بھی جیسے اسے جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔

کچھ دیر کے لیے چپ بستر پر لیٹی وہ چھت کو گھورتے ہوئے پڑی رہی پھر یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے چکر سا آیا تھا۔ ایک لحہ کے لیے اسے لگا وہ کھڑی نہیں ہو سکے گی مگر یہ صرف ایک لحہ کا ہی احساس تھا، وہ دوسرے ہی لمحے اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ اسے سردی محسوس ہوئی تھی۔ کمرے میں ایر کنڈیشنر کی کولنگ کی وجہ سے کمرہ بے حد ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف جانے سے پہلے ایر کنڈیشنر کو بند کیا اور پھر جا کر دروازہ کھول دیا۔

''وہ فاران صاحب آئے ہیں۔ پہلے بھی دو چکر لگا چکے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ آپ سے ضروری ملنا ہے آج انہیں۔''

ملازم نے دروازہ کھلتے ہی زینی کو اطلاع دی تھی۔ اس کا لہجہ بے حد معذرت خواہانہ تھا۔ کتنے دنوں سے وہ اسی طرح کمرے میں پڑی رہتی تھی اور اس نے ملازم کو اسے کسی کو آنے کی اطلاع دینے سے بھی منع کر دیا تھا۔ وہاں فاران کے سوا ابھی آتا بھی کون تھا مگر وہ فی الحال فاران کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

''جا کر کہہ دو، مجھے نہیں ملنا۔'' اس نے ایک بار پھر درشتی سے ملازم سے کہا۔

''میں کہہ دیتا ہوں مگر وہ کہہ رہے ہیں، انہیں آج ہر حالت میں آپ سے ملنا ہے۔ وہ تب تک یہاں سے نہیں جائیں گے، جب تک آپ ان سے مل نہیں لیتیں۔'' ملازم نے جیسے اسے خبردار کیا۔

''تو ٹھیک ہے، اس سے کہو کہ وہ پھر بیٹھا رہے۔''

زینی نے بہت زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ کمرے کی کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر وہ ایک بار پھر اپنے بیڈ پر آ بیٹھی۔ خالی اور بوجھل سر کے ساتھ۔

ایک اور دن آ پہنچا تھا پھر چند گھنٹوں کے بعد ایک اور رات آ جاتی پھر ایک اور پھر ایک اور اسے وحشت ہوئی زندگی اتنی لمبی کیوں ہوتی ہے۔ اس قدر طویل کہ کاٹنے پر بھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آج کون سا دن تھا، کون سی تاریخ تھی، اسے یاد نہیں آیا۔ وقت اس کے لیے پچھلے کئی دنوں سے صرف روشنی اور اندھیرا صرف دن اور رات تھا۔ تاریخ اور دن نہیں تھے۔

اس نے ایک نظر اپنے کمرے میں بیڈ کے آس پاس کارپٹ کو دیکھا۔ جا بجا شراب کی چھوٹی بڑی خالی، ادھ خالی اور بھری ہوئی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ بیئر کے خالی ٹن لڑھکے ہوئے تھے۔ خالی اور گندے گلاس۔ سگریٹ کے خالی اور بھرے ہوئے پیکٹ، ٹرینکولائزر کی خالی شیشیاں، کچھ دوسرے اینٹی ڈپریسنٹ۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑوں کا پہاڑ تھا جو اب ایش ٹرے سے باہر بھی آ چکا تھا۔ کارپٹ پر بھی کئی جگہ راکھ اور

ٹکڑے پڑے تھے۔ کئی جگہ سے کارپٹ سگریٹ کے ٹکڑوں کی وجہ سے جلا ہوا تھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل اور کمرے میں پڑی دوسری تپائیوں پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ وہ کسی نارمل انسان کا کمرہ نہیں لگ رہا تھا، وہ کسی نارمل انسان کا کمرہ تھا بھی نہیں۔

وہ بہت دنوں سے اس کمرے میں مقید تھی۔ جب جاگتی تو یہی کرتی۔ شراب پیتی، سگریٹ پیتی، اینٹی ڈیپریسنٹ لیتی پھر سو جاتی۔ کئی کئی گھنٹے وہ ان چیزوں کے زیرِ اثر سوئی رہتی۔ غنودگی ختم ہوتی وہ جاگتی، نئے سرے سے ان چیزوں کو استعمال کرتی اور دوبارہ سو جاتی۔ ملازم کھانے کی ٹرے کمرے میں رکھ جاتا اور پھر اسی طرح جوں کی توں اٹھا کر واپس لے جاتا۔ اس کی مرضی ہوتی تو وہ کسی چیز کو کھاتی، ورنہ پورا پورا دن کھانا تو ایک طرف پانی کا گھونٹ تک نہیں پیتی تھی۔

بعض دفعہ تو وہ ٹرینکولائزر اور اینٹی ڈیپریسنٹ بھی شراب کے ساتھ نگلتی تھی۔ شراب اور سگریٹ ختم ہوتے تو وہ بیگ سے چند کرنسی نوٹ نکال کر ملازم کو تھما دیتی۔ ملازم جا کر دونوں چیزیں لے آتا۔ وہ فاران کا ملازم تھا۔ فاران نے اسے وہاں رکھوایا تھا۔ وہ جس طبقے کے گھروں میں کام کرتا تھا، وہاں شراب نوشی عام تھی مگر اس نے کبھی کسی عورت کو اسی طرح اور اتنی شراب استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بعض دفعہ تو اسے لگتا کہ وہ کسی دن شراب پی پی کر مر جائے گی لیکن وہ ایک ملازم تھا، وہ گھر کے مالکوں کو مشورے نہیں دے سکتا تھا۔

زینی نے ایک بار پھر پاس پڑے گلاس میں موجود شراب اٹھا کر اپنے اندر انڈیل لی۔ وہ اسی کو پیتے پیتے سوئی تھی۔

گلاس خالی ہو گیا۔ زینی نے ایک سگریٹ سلگا لیا۔ وہ ایک بار پھر اپنے گھر پہنچ گئی تھی۔

''چلی جاؤ یہاں سے، کیا لینے آئی ہو اب یہاں۔ باپ کو مار دیا، گھر اجاڑ دیا ہمارا، باپ کے بجائے تو کیوں نہیں مر گئی زینی... تو مر جاتی... تجھے کیوں نہیں دفنا دیا میں نے... مجھے پتہ ہوتا کہ باپ کی جان لے گی تو... تو میں پیدا ہوتے ہی تیرا گلا گھونٹ دیتی... اپنے ہاتھوں سے مار دیتی تجھے... نکل جا میرے گھر سے... چلی جا یہاں سے... دوبارہ شکل مت دکھانا ہمیں... سمجھ تیرے باپ کے ساتھ ہم سب بھی مر گئے تیرے لیے... نکل میرے گھر سے...''

ایک دھکا، دوسرا دھکا، تیسرا دھکا۔ وہ باہر گلی میں آ گئی تھی۔ اسی طرح... پتھر کے بت کی طرح ساکت ماں کو دیکھتے ہوئے۔

نفیسہ اس کے لائے ہوئے شاپر اٹھا کر دروازے سے باہر گلی میں اس کے اوپر پھینک رہی تھیں۔ اس کی لائی ہوئی ساری چیزیں اس کے ارد گرد گلی میں بکھر گئی تھیں۔ نفیسہ نے روتے ہوئے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور وہ بند دروازے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ گلی کے دوسرے گھروں سے عورتیں اور بچے باہر نکل کر اپنی چوکھٹوں پر کھڑے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔

تب ہی ساتھ والے گھر سے ایک عورت باہر نکلی اور اس نے روتے ہوئے زینی کو ساتھ لپٹانے کی کوشش کی۔ زینی اب بھی اسی طرح گم صم کھڑی تھی۔

''گیارہ دن ہو گئے زینی اور تم اب آئی ہو۔'' وہ اس سے لپٹ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''گیارہ دن... اور مجھے پتہ تک نہیں چلا کہ میرا باپ... گیارہ دن۔''

زینی شاک کے عالم میں کھڑی رہی۔ ایک دو اور عورتیں اب اس کے پاس آئی تھیں اور اس سے افسوس کر رہی تھیں۔ کچھ کہہ رہی تھیں جب کے دوسری طرف سے نفیسہ کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

چند عورتوں نے اس کے آس پاس بکھری چیزوں کو اکٹھا کر کے شاپرز میں ڈالنا شروع کر دیا۔

زینی کی ٹانگیں کانپنے لگیں تو اس کا باپ اس لیے پیچھے نہیں آ رہا تھا کیونکہ وہ... اس کے حلق میں پھندے لگنا شروع ہو گئے تھے۔ ورنہ یہ کیسے ہوتا کہ وہ زینی کو ڈھونڈنے، اس کو واپس لانے کے لیے نہ آتا۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ عورت اب بھی اس کے ساتھ لپٹی روتے ہوئے اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ زینی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

زینی کا ماتھا چومنے والا اور اس پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والا مرد اس دنیا سے چلا گیا تھا جو اسے دنیا میں لایا تھا۔

"آپ دعا کریں، میں جلدی مر جاؤں، ورنہ آپ کے لیے بہت مسئلہ ہو جائے گا۔"

اس نے فاران کے پاس جانے سے ایک رات پہلے ضیاء سے دعا کرنے کے لیے کہا تھا۔

"کوئی غلط کام مت کرنا زینی!"

ضیاء نے اس سے کہا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ باپ نے اس کے لیے نہیں، اپنے لیے جلد مر جانے کی دعا کی ہو گی۔ اس سے پہلے کہ وہ زینی کے کسی غلط کام کا نتیجہ دیکھتے۔

اس نے اس عورت کو خود سے الگ کر دیا تھا اور وہ گلی میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بلک بلک کر روئی تھی۔ ساتھ والی عورتوں نے اسے اٹھا کر اپنے گھر لے جانے کی کوشش کی مگر زینی وہاں سے نہیں اٹھی۔ وہاں گلی میں بیٹھ کر اس نے اس خسارے کی پہلی فصل کاٹی تھی جس کے بیج اس نے اپنی زندگی میں بوئے تھے پھر وہ وہاں سے روتے، ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کس منہ سے اب اس گھر میں جاتی، جہاں اس کا باپ نہیں تھا۔

زینی نے گلاس میں کچھ اور شراب انڈیلی اور اس میں برف ڈالے بغیر اسے ایک بار پھر اپنے اندر انڈیلنے لگی۔ روز یہی ہوتا تھا، وہ اس دن کے ایک ایک لمحے کو یاد کرتی تھی۔ پیتی رہتی تھی۔ سگریٹ پھونکتی جاتی تھی اور پھر ٹرینکولائزر لے کر سو جاتی۔

وہ ملائیشیا میں تھی، جب ضیاء کی وفات ہوئی تھی، وہ وہی رات تھی جس رات اس نے پہلی بار پی تھی۔

اس نے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ اتنے دنوں میں ایک بار بھی اسے شیراز کا خیال نہیں آیا تھا۔ نہ اس کا نہ اس کی بیوی کا۔ صرف باپ کا خیال آتا تھا، وہ جیسے اس کے لیے کائنات بن گئے تھے۔

پورا سگریٹ اس کی انگلیوں میں دبا دبا راکھ بن گیا۔ کچھ دیر کے لیے زینی کو یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ وہ صرف اپنے باپ کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اپنے بارے میں۔ ننھی زینی کے بارے میں۔ ساری عمر باپ کی انگلی پکڑ کر باپ کے ساتھ ساتھ سیدھے رستے پر چلتی رہی تھی۔ صرف ایک بار وہ انگلی اس کے ہاتھ سے چھوٹی تھی اور اس کے بعد وہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا تھا۔

سگریٹ نے یک دم اس کی انگلیوں کو جلایا۔ اس نے چونک کر انگلیوں میں پھنسے سگریٹ کے باقی ماندہ حصے کو ایش ٹرے میں پھینکا پھر اس نے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

اتنے دن میں ایک بار بھی اس نے باپ کو خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ ہلکی سی جھلک۔ کوئی آواز کوئی شائبہ کوئی خیال کچھ نہیں۔ وہ جب تک جاگتی، ہوش میں ہوتی۔ باپ کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے ہوتا لیکن وہ باپ سے خواب میں ملنا چاہتی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی، وہ کہاں ہیں؟ کس حال میں ہیں؟ سننا چاہتی تھی، وہ اس سے کیا کہنا چاہتے تھے پوچھنا چاہتی تھی، وہ کیوں اس طرح اس کی دنیا سے غائب ہو گئے۔

لیکن وہ اتنے دنوں سے ایک بار انہیں خواب میں بھی نہیں دیکھ پائی تھی۔ وہ ترس گئی تھی ان کے لیے۔ وہ تو ضیاء کی زندگی میں، ان کے پاس رہتے ہوئے ہر دوسرے چوتھے دن باپ کو خواب میں دیکھتی تھی تو اب کیا ہو گیا تھا۔ ایسا بھی کیا ہو گیا تھا کہ

زینی کا سگریٹ پھر راکھ بن گیا تھا۔ اس نے اسے بھی ایش ٹرے میں پھینکا۔

اس سے پہلے کہ وہ ایک اور سگریٹ سلگاتی۔ دروازہ کھول کر فاران اندر داخل ہوا۔ زینی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اشتعال کی ایک لہر اس کے اندر سے اٹھی۔ یہی تو تھا جو اسے یہاں سے لے گیا تھا۔ وہ نہ لے جاتا تو اس کا باپ زندہ ہوتا۔

"out،out ۔" وہ بے اختیار کھڑے ہوتے ہوئے چلائی۔

"اپنی حالت دیکھو زینی! اپنے آپ پر رحم کرو۔" فاران کو اندازہ تھا کہ اس کی حالت خراب ہو گی لیکن جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، اس نے اسے ہولا دیا تھا۔

"مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے، سمجھے تم۔" وہ ایک بار پھر چلائی۔ "جاؤ یہاں سے اور مجھے اپنی شکل مت دکھاؤ۔" وہ حلق کے بل چیخ رہی تھی۔ فاران کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نشے میں تھی۔

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گا، جب تک تم ان دونوں چیزوں کو نہیں چھوڑتیں۔" فاران نے اس بار قدرے سخت لہجے میں کہا۔

اس بار زینی نے کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی، وہ یک دم دوبارہ کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ اب ایک اور سگریٹ سلگا رہی تھی۔ فاران کو اس پر ترس آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ اس سے کیا کہے۔

"مجھے بہت افسوس ہے زینی! ابلیوی۔ مجھے انکل کے بارے میں۔"

اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ زینی نے بے حد ترشی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"مجھے کوئی ایکسکیوز مت دینا، یہ مت کہنا کہ تمہیں پتا نہیں تھا کہ" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"I swear زینی! مجھے نہیں پتا تھا۔"

فاران نے جھوٹی قسم کھائی۔ اسے ضیاء کے بارے میں اسی دن پتا چل گیا تھا۔ زینی کے گھر والوں نے رمشہ کے ذریعے اس سے رابطے کی کوشش کی تھی اور رمشہ نے فوری طور پر فاران کو فون کیا تھا۔ فاران کے لیے یہ بے حد نازک وقت تھا۔ اس کمرشل کی شوٹنگ پر ڈھیروں روپیہ خرچ ہو

رہا تھا۔ اب اگر وہ یک دم سب کچھ چھوڑ کر پاکستان چلی جاتی تو اسے بہت بڑا سیٹ بیک ہوتا۔ بے حد خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے رمشہ کو یہ مسئلہ بتایا تھا اور اس سے چپ رہنے کی درخواست کی تھی۔ رمشہ کو تامل ہوا تھا مگر پھر اس نے زینی کی فیملی سے جھوٹ بول دیا کہ وہ فاران سے رابطہ نہیں کر پا رہی۔

اور اب وہ اس کے سامنے بیٹھا جھوٹی قسمیں کھا رہا تھا۔ اسے یقین تھا، وہ اس پر اعتبار کرے گی۔ آخر اس کا جھوٹ کیسے پکڑا جا سکتا تھا۔

''تم نے بکواس کر لی۔ میں نے بکواس سن لی۔ Now get out'' (اب دفع ہو جاؤ)۔

فاران کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے زندگی میں کسی ماڈل کی زبان سے اس طرح کے کلمات اپنے لیے نہیں سنے تھے۔ اس کے ماڈل اسے اس کی عدم موجودگی میں جو چاہے کہتے تھے مگر اس کے سامنے کوئی فاران سے اونچی آواز میں بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا اور یہ دو ٹکے کی ماڈل اپنے آپ کو کیا سمجھ رہی تھی۔ اس نے اس پر عنایت اور نوازشات کا ڈھیر لگا دیا تھا اور وہ رتی بھر اس کی مشکور نہیں تھی بلکہ الٹا بکواس کر رہی تھی۔ فاران کا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔ وہ ماڈلز کو تیر کی طرح سیدھا رکھنے میں ماہر تھا۔ ایک معمولی نخرا کرنے پر وہ کسی بھی ماڈل کا کانٹریکٹ ختم کر دیتا تھا پھر وہ اس سے گڑگڑا کر معافی مانگتے تو وہ انہیں واپس لیتا اور یہ   یہ اپنے آپ کو کیا سمجھ رہی تھی۔

وہ اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر خاموشی کے وقفے میں اس نے چند سیکنڈز میں سارا حساب کتاب کر لیا تھا اور اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ بری طرح پھنسا ہوا تھا اس وقت۔ وہ اسے فارغ کرتا تو کمپین کھو دیتا۔ اس کے ساتھ کچھ اور بڑے کانٹریکٹ ٹوٹتے۔ بڑے کانٹریکٹ ٹوٹتے تو مارکیٹ میں اس کے بارے میں افواہوں کا بازار گرم ہو جاتا۔ چار دن میں اس کی بنائی ساکھ زمین پر آ جاتی اور زینی ۔ اس کا کیا جاتا ۔ کچھ نہیں.... کیونکہ اس کا ابھی تک کچھ تھا ہی نہیں۔

ایک گہری سانس لے کر وہ مسکرا دیا۔

''مجھے تمہاری پرواہ ہے زینی! اس لیے ....''

زینی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم اپنی پرواہ کرو، میری چھوڑ دو۔''

فاران اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بہت ہو گیا تھا۔ ایک لفظ کہے بغیر وہ دروازے کی طرف گیا اور دروازہ کھولا، تب ہی اس نے اپنے عقب میں زینی کی آواز سنی۔

''میں بہت رلاؤں گی تمہیں فاران! یاد رکھنا بہت رلاؤں گی۔''

فاران نے پلٹ کر دیکھا، وہ گلاس میں شراب دوبارہ انڈیل رہی تھی۔ ہونٹ بھینچتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

زینی نے خواب آور دوا ڈھونڈنا شروع کی۔ اسے ضیاء کو خواب میں دیکھنے کی ایک اور کوشش کرنا تھی۔

☆☆☆

ضیاء کی موت نے شیراز کی شادی کی تاریخ اور انتظامات پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ سوائے اس کے کہ اکبر اور نسیم کو ایک بار پھر زینب کے گھر آنا پڑا تھا اور اس محلے کی شکل دیکھنی پڑی تھی جس سے انہوں نے اتنی مشکل سے جان چھڑائی تھی۔

اکبر کو بھائی کی اس طرح اچانک موت کا کسی حد تک صدمہ ہوا تھا مگر پھر اس نے اسے اللہ کی رضا قرار دے کر سر جھٹک دیا۔ وہ گھر سے باہر ہی ضیاء کے جنازے میں شرکت کر کے اور سلمان سے تعزیت کر کے چلا گیا اور کچھ اسی طرح کی تعزیت نسیم نے بھی کی تھی۔ اس نے نفیسہ سے بات نہیں کی تھی۔ شاید اسے یہ خدشہ تھا کہ وہ غم و صدمہ کی حالت میں ضیاء کی موت کا ذمہ دار انہیں نہ ٹھہرانے لگیں، وہ زہرہ اور ربیعہ سے تعزیت کر کے آ گئی تھی اور وہاں بیٹھنے کے دوران وہ جس کا سامنا کرنے سے سب سے زیادہ خوف زدہ تھی، خوش قسمتی سے اسے وہ وہاں نظر نہیں آئی اور وہاں بیٹھے بیٹھے اس محلے کی عورتوں سے زینب کے گھر سے چلے جانے کا احوال معلوم ہو گیا تھا۔ نسیم نے اگر کہیں کوئی رنجیدگی یا ضمیر کا بوجھ محسوس بھی کیا تھا تو زینی کے اس طرح گھر سے چلے جانے سے جیسے وہ اتر گیا۔

''یعنی یہ صرف زینی ہی تھی جو باپ کی موت کی ذمہ دار تھی۔'' نسیم نے بے حد اطمینان سے سوچا۔

اگلے کئی دن ان کے گھر میں ضیاء کی موت سے زیادہ زینی کی گمشدگی ڈسکس ہوتی رہی تھی۔ آخر زینی اتنی بہادر کیسے ہو گئی تھی کہ اس نے گھر چھوڑ دینے جیسا بڑا قدم اٹھا لیا تھا۔ ہر ایک اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے جیسے صرف ایک سوال کا جواب چاہتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سوال کا جواب ان میں سے ہر ایک کو بہت پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔

شیراز کی شادی مقررہ تاریخ کو بڑی ''دھوم دھام'' سے ہوئی۔ باراتیوں کا ''جم غفیر'' دولہا کی تین بہنوں اور ماں، باپ کے علاوہ دو ڈرائیور، ایک نوکرانی، ایک نکاح خواں اور شیراز کے ایلیٹ کلاس کے سب سے نئے اور اہم دوست جواد پر مشتمل تھا۔

دلہن کے گھر پر ان کا استقبال کرنے کے لیے اس سے بھی ''بڑی تعداد'' موجود تھی جس میں دلہن کے باپ کے ساتھ اس کی ماں اور ماں کا نیا شوہر بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ دو سوتیلے بہن بھائی بھی موجود تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جواد کا باپ، ماں اور اس کی منگیتر سیما بھی وہیں تھے اور گھر کے نوکروں کی ایک لمبی چوڑی تعداد اس کے علاوہ تھی۔

بارات اگر استقبال کرنے والوں کو دیکھ کر ششدر تھی تو کچھ اسی طرح کی حالت استقبال کرنے والوں کی بارات کو دیکھ کر تھی۔

شادی کی پوری تقریب میں صرف دو رسومات ہوئی تھیں۔ نکاح اور کھانا۔ پہلی سے دلہن کی جان جا رہی تھی اور دوسری سے دولہا کی۔

یہ ''شادی کا کھانا'' تھا۔ یہ ناممکن تھا شیراز کے اہل خانہ یہ کھانا نہ کھاتے اور دولہا بنے ہونے کی وجہ سے شیراز کے لیے اب یہ ممکن نہ تھا کہ وہ انہیں کھانا کھانے سے ''روکتا'' یا کوئی ہدایات دے پاتا۔ نتیجہ ویسا ہی تھا جیسا ہو سکتا تھا۔ یہ وہ پہلی شادی تھی جس کا کھانا صرف بارات نے کھایا تھا، اہل خانہ نے نہیں۔

نکاح کے فوراً بعد جواد اور اس کی فیملی چلی گئی تھی۔ انہیں کسی اور شادی میں بھی شرکت کرنی تھی۔ کھانے کے فوراً بعد شینا کی رخصتی ہو گئی تھی۔ وہ آج ایک ساڑھی میں ملبوس تھی اور اپنے سسرال والوں کے کھانے سے فارغ ہو جانے کے انتظار میں اپنے ماں باپ کے ساتھ خوش گپیوں

میں مصروف تھی۔ صرف دولہا تھا جو دلہن کی طرح اکیلا لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھا کبھی اپنے ماں باپ اور بہنوں کو دیکھ رہا تھا اور کبھی اپنی بیوی اور اس کے اہل خانہ کو جو لاؤنج کے ایک کونے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

شیراز نے دو چار بار ان کے پاس جا کر کھڑا ہونے کی کوشش کی مگر ہر بار اس کے ان کے پاس جاتے ہی خاموشی چھا جاتی پھر سب سے پہلے شینا وہاں سے ہٹتی پھر باری باری وہ سب کھانے کی کوئی چیز پینے کا بہانہ کر کے کھسک جاتے اور پھر ایک بار پھر ان لوگوں کا گروپ کمرے کے کسی اور کونے میں اکٹھا ہو جاتا۔ ایک بار پھر ان کے درمیان کسی ایشو پر بات ہونے لگتی اور شیراز ہونقوں کی طرح ان کے پاس سے ہٹ کر واپس صوفہ پر آ کر بیٹھ جاتا۔

نسیم اور شیراز کی بہنوں نے اسے بھی کھانا کھلانے کی دو چار بار ناکام کوشش کی مگر شیراز فی الحال کھانا کھانے کے نام پر اس وقت اس گروپ کا حصہ نہیں بن سکتا تھا جسے اس وقت گھر کے ملازم تک گھور رہے تھے۔

دو ڈھائی مہینے میں سکھائے جانے والے ٹیبل مینرز اور ایٹی کیٹس چارسنٹ میں کھانا لینے کے لیے اٹھائی جانے والی پہلی پلیٹ کے ساتھ ہی پلیٹ کر رکھ دیے گئے تھے۔ شیراز مخمصے میں تھا، وہ ماں باپ اور بہنوں پر ترس کھائے یا غصہ۔ دونوں باتوں کا اظہار وہ اس وقت شینا کے گھر پر نہیں کر سکتا تھا۔

ایک گہرا سانس لے کر اس نے اپنی خوبصورت اسٹائلش بیوی پر نظریں جمانے کی کوشش کی جو سیاہ سلک کی کام والی ساڑھی کے ساتھ ایک بے حد مختصر بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ وہ بیوٹی پارلر سے دلہن بنی بارات کے وہاں پہنچنے کے پندرہ منٹ بعد آئی تھی اور اس نے نسیم کو ہولا دیا تھا۔

شادی پر سیاہ لباس؟ کچھ دیر کے لیے تو وہ حواس باختہ انداز میں اپنی بیٹیوں اور شوہر کو دیکھتی رہی کیونکہ شیراز اس وقت ان سے نظریں نہیں ملا رہا تھا پھر اس نے کمرے میں موجود ان دوسرے لوگوں کی داد و تحسین پر غور کیا جو شینا کی ساڑھی، میک اپ اور ہیر اسٹائل کو سراہ رہے تھے۔

"شاید بڑے لوگوں کی بیٹیاں اسی طرح دلہن بنتی ہیں۔"

نسیم نے ایک بار پھر اپنے آپ کو تسلی دی اور اپنی بیٹیوں کو بھی جو اس صدمے سے دو چار تھیں کہ بھابھی نے لہنگا نہیں پہنا، دوپٹہ بھی نہیں لیا جس کو پکڑنے اور سنبھالنے کے لیے وہ تینوں بے حد تیاریوں کے ساتھ آئی تھیں۔ بھابھی کو تو اس وقت کسی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شرم اور جھجک کی تو انہیں خیر پہلے بھی کوئی توقع نہیں تھی کیونکہ وہ شینا کو منگنی پر دیکھ چکے تھے مگر شینا کو تو لگتا تھا، کسی کی مدد کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

یہ صدمہ بہت دیر تک چلتا، اگر سعید نواز نکاح کے فوراً بعد شیراز کو گاڑی کی چابی اور اس کی فیملی کو ایک بڑے بیگ میں زیورات کے ڈبے نہ تھما دیتا۔ اس کی شاید یہ کوشش تھی کہ وہ لوگ گھر جا کر اپنے زیورات دیکھیں مگر یہ ناممکن تھا۔ نسیم اور اس کی بیٹیوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے زیورات کے ڈبے نکال کر کھول کھول کر انہیں دیکھنا شروع کر دیا اور ان ڈبوں کو کھول کر دیکھتے ہوئے ان سب کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ نسیم نے کنگنوں کی جوڑی کو کانپتے ہاتھوں سے نکال کر ان کا وزن کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پوری زندگی میں کبھی ایک ڈیڑھ تولہ سے زیادہ وزنی چیز نہیں پہنی تھی۔ اس کے باوجود اسے یقین تھا، وہ دونوں کنگن 20 تولے سے کم کے نہیں تھے۔ 20 تولے سونے کی مالیت؟ نسیم نے وہیں بیٹھے بیٹھے اندازہ لگانا شروع کیا

اور اندازے نے اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو بڑھا دیا۔ اسے اچانک احساس ہونے لگا کہ اسے رات کو واپس گھر تک جانا ہے، اب اتنی مالیت کے زیور کے ساتھ گھر تک جانا، اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کنگنوں کو پہنے یا ڈبے میں رکھ کر دوبارہ بیگ میں رکھ دے اور بیگ میں رکھنے کی صورت میں بیگ کس کو پکڑائے۔

اس وقت اسے اپنا شوہر بھی قابل اعتبار نہیں لگ رہا تھا اور ساتھ آنے والی نوکرانی اور دونوں ڈرائیوروں کو دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تینوں بیٹیاں بھی یک دم اسے غیر ذمہ دار لگنے لگی تھیں۔ واحد ذمہ دار اور قابل بھروسہ آدمی اسے اس وقت شیراز ہی نظر آیا تھا۔ ڈبے میں سے کنگن نکال کر ڈبہ بیگ میں رکھ کر وہ شیراز کے پاس آئی اور شیراز کی ساری ہچکچاہٹ، جھجک اور شرمندگی کے باوجود اس نے شیراز کے کوٹ کی اندرونی جیب میں کنگن رکھوا کر دم لیا۔

شیراز نے حتی المقدور کوشش کی تھی کہ یہ ذلت آمیز کام وہ اپنے سسرال والوں کی نظروں سے بچا کر کرے مگر وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا تھا، وہ نہیں جان سکا۔

اس کی بہنیں زیور کے معاملے میں زیادہ جرأت مند نکلی تھیں۔ انہوں نے اپنے اپنے جیولری سیٹ اسی وقت ڈبوں سے نکال کر پہن لیے تھے۔

نسیم نے تینوں کے پاس آ کر اس پر خفگی کا اظہار کیا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی اپنا زیور اتارنے پر تیار نہیں تھی۔

نسیم کو بالآخر ہار ماننی پڑی، ورنہ وہ ان تینوں سیٹوں کو بھی شیراز کی جیبوں میں رکھوا کر دم لیتی لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ گھر جاتے ہی ان سب کے زیورات کو ڈبوں میں بند کر کے رکھوا دے گی۔ اب کم از کم اسے ان تینوں کی شادی میں زیورات بنانے کی پریشانی سے نجات مل گئی تھی بلکہ وہ یہ بھی پلان کر رہی تھی کہ اگر ممکن ہوا تو وہ ان زیورات کو تڑوا کر ان ہی میں سے چند اور زیورات بنانے کی کوشش بھی کرے گی کیونکہ وہ سیٹ بھی نسیم کو کافی وزنی محسوس ہوئے تھے اور اس نے اکبر کو ملنے والی انگوٹھی سے پہلے ہی اپنے لیے ایک اکٹ سیٹ بنوانے کا فیصلہ کر لیا تھا جبکہ اکبر اپنی انگوٹھی پہنے اس کو بیچ کر اس سے اپنے نئے اور پرانے قرضے اتارنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

دوسری طرف شیراز گاڑی کی چابی ہاتھ میں یہ طے کر رہا تھا کہ اسے کل کس وقت ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے پہلی بار پریکٹس کرنے جانا تھا اور ساتھ اسے چیک پر تحریر رقم جاننے کا بھی تجسس ہو رہا تھا جو سعید نواز نے ایک بند لفافے میں اس کے حوالے کیا تھا۔ وہ کم از کم اپنے اہل خانہ کی طرح اتنا بے صبرا ثابت نہیں ہوا کہ وہیں وہ لفافہ کھولنے کی کوشش کرتا۔

شینا کو دلہن کے روپ میں سیاہ ساڑھی میں دیکھنے کا ابتدائی صدمہ جلد ہی اس چیک، چابی اور زیورات نے بھلا دیا تھا۔ شینا کسی کو دلہن لگ رہی ہو یا نہیں مگر "پیاری" ضرور لگ رہی تھی۔

کھانے کے فوراً بعد رخصتی ہو گئی تھی۔ شینا کو وہ اکلوتا سیٹ اور چھ چوڑیاں پہنانے کی حسرت نسیم کے دل ہی میں رہ گئی تھی جن کی حفاظت کرتے کرتے وہ ہلکان ہو رہی تھیں۔ شینا کو ان کے زیورات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس کے لباس سے میچ نہیں کرتے تھے۔

اسے ان کی لائی ہوئی دوسری چیزوں میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا لایا ہوا سوٹ کیس بغیر کھولے واپس گاڑی کی ڈکی میں رکھوا دیا گیا۔ نسیم

کا خیال تھا، شینا شادی کے بعد ان چیزوں کو استعمال کرے گی۔ بعد میں انہیں احساس ہوا، یہ ان کی خوش فہمی تھی، وہ ان کے "اسلامی" ملبوسات کو کسی قیمت پر نہ پہنتی۔

شینا کو گاڑی میں شیراز کے ساتھ بٹھانے کے لیے نسیم یا اس کی بیٹیوں کو کسی قسم کا تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ خود ہی اپنے اہل خانہ سے گلے ملنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ البتہ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے نزہت کو گاڑی میں بیٹھنے سے روکا جو اسی کی طرف سے گاڑی میں بیٹھنا چاہ رہی تھی۔ دوسرے دروازے سے نسیم پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی اور اس کے ساتھ شیراز کی چھوٹی بہن بھی۔ اب نزہت کے بیٹھنے کا مطلب یہ ہوتا کہ شینا ان تینوں کے درمیان سینڈوچ بن جاتی۔

"آپ دوسری گاڑی میں بیٹھیں۔" شینا نے بے حد دوٹوک انداز میں اس سے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے شیراز نے فوراً گاڑی سے اتر کر پچھلی گاڑی میں نزہت کو بٹھا دیا۔

کچھ اسی قسم کا سین شیراز کے گھر پہنچ کر ہوا تھا، جب شینا کے گاڑی سے اترتے ہی اس کی نندوں اور ساس نے اسے بازو سے تھام کر اندر لے جانے کی کوشش کی۔ اس نے بڑے آرام سے اپنے بازوؤں سے ان کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"یہ میرا گھر ہے، ہزار بار آ چکی ہوں یہاں۔ مجھے یہاں گائیڈنس کی ضرورت نہیں۔"

وہ یہ کہہ کر دولہا کو اس کے "اہل خانہ" کے پاس چھوڑ کر اندر چلی گئی تھی۔

"ظاہر ہے امی! گھر تو دیکھا ہوا ہے اس نے۔ اس کا جو ہے۔" شیراز نے مسکرا کر ان سب سے کہا جو بے حد ہونق انداز میں اس کو دیکھ رہے تھے۔

"ہاں ہاں۔ کوئی بات نہیں۔" چلو سب اندر چلو۔ شینا بیٹی سے باتیں کرنی ہیں ابھی۔"

اکبر نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ماحول کو خوشگوار کیا۔ اندر پہنچ کر اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ شینا بیٹی کو واقعی ان سے باتیں کرنی تھیں۔

"ماسٹر بیڈ روم کس کے زیر استعمال ہے؟" وہ لاؤنج میں کھڑی انہیں لوگوں کی منتظر تھی۔ مخاطب شیراز تھا اور لہجہ کڑا۔

"ماسٹر بیڈ روم؟ وہ ابو کے پاس ہے۔" شیراز پہلے ہکلایا پھر اس نے مسکرانے کی فاش غلطی کی۔

"کیوں؟"

"وہ" شیراز اٹکنے لگا۔ سی ایس ایس میں دوسری پوزیشن حاصل کرنا آسان تھا۔ اپنے سے بہتر خاندان سے لائی ہوئی بیوی کے کسی سوال کا صحیح جواب دینا بے حد مشکل۔

یہ مشکل شینا نے آسان کر دی، وہ کچھ کہے بغیر گراؤنڈ فلور کے اس دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی جو ان کی ممکنہ قیام گاہ ہو سکتی تھی۔ شیراز کی جیسے جان میں جان آئی تھی اور کچھ ایسا ہی حال شیراز کے گھر والوں کا تھا شینا کے وہاں سے جاتے ہی سب کے چہروں کی رنگت بحال ہو گئی تھی۔

شیراز باہر جا کر مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکروں کے علاوہ ان دوسری چیزوں کو رکھوانے لگا تو جو سعید نواز کے گھر سے آئی تھیں جبکہ نسیم اپنی

بیٹیوں اور شوہر کے ساتھ اب ان ملبوسات کو کھول کر دیکھنے میں مصروف تھیں جو ان لوگوں کو سعید نواز کے گھر سے ملے تھے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کا بیٹا پہلی بار شینا کے رویے سے متفکر ہوا تھا مگر فی الحال وہ اس پریشانی کو کسی پر ظاہر نہیں کر رہا تھا۔

☆☆☆

شادی کی رات کو شینا کے بیڈ روم میں داخل ہونے سے پہلے شیراز نے ان تمام ڈائیلاگز اور وعدوں کی پریکٹس کی جو اسے شینا سے کرنے تھے۔ شینا کا بے حد سرد مہری اور رُوڈ رویہ دیکھنے کے باوجود اسے یقین تھا کہ شینا کے دل میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی نرم گوشہ ضرور ہوگا، ورنہ وہ کسی طرح اس سے شادی پر تیار نہ ہوتی۔ وہ سعید نواز کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ سعید نواز اس پر کوئی جبر کرتا۔

تو اب اسے صرف اس نرم گوشہ کو تلاش اور اس کا استعمال کرنا تھا۔ اس نے ان ساری باتوں کو بھی اپنے ذہن میں دہرایا تھا جو وہ زینی سے کیا کرتا تھا اور زینی اس پر جان دینے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔

زینب ضیاء اور شینا سعید نواز میں کیا فرق تھا۔ یہ اس رات اسے اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولتے ہی سمجھ میں آ گیا تھا۔

شینا ایک جینز اور شرٹ میں ملبوس ایک سیل فون پر کسی سے ناراضی سے بات کرتے ہوئے کمرے کے چکر لگا رہی تھی۔ اس نے شیراز کو اندر آتے دیکھا تھا مگر صرف دیکھا تھا، کسی تاثر کے بغیر۔ یوں جیسے کمرے میں کوئی آیا ہی نہ ہو۔

شیراز بالکل بے حس و حرکت کمرے کے وسط میں کھڑا اسے اپنے سامنے اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ شینا نے زیادہ لمبی بات نہیں کی۔ شاید وہ پہلے ہی اپنی بات کا اختتام کرنے والی تھی۔

فون بند کرتے ہی اس نے شیراز سے پوچھا۔

"میرا فرنیچر، ماسٹر بیڈ روم کے بجائے یہاں کیوں لگوایا تم نے؟"

"وہ ماسٹر بیڈ روم میں امی اور ابو ہیں۔ وہ میں نے ان کو دے دیا ہے۔" شیراز نے اس بار قدرے مستحکم لہجے مگر پست آواز میں کہا۔

"وہ شادی میں شرکت کے لیے آئے ہیں، انہیں ماسٹر بیڈ روم کی کیا ضرورت تھی۔ صبح ملازموں سے کہہ کر کمرے کا سامان وہاں شفٹ کروانا۔"

شینا کے اگلے جملے نے شیراز کے جیسے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

"نہیں ... وہ ... وہ تو مستقل شفٹ ہو گئے ہیں یہاں۔" اس کا اعتماد چند سیکنڈز میں اڑن چھو ہو گیا۔

"What---؟ کیا مطلب کہ شفٹ ہو گئے ہیں یہاں؟ یہ میرا گھر ہے، میرے ماں باپ نے میرے رہنے کے لیے دیا ہے۔ تمہارے ماں باپ کے رہنے کے لیے نہیں۔" شینا نے تیز لہجے میں کہا۔

"لیکن اب تو وہ لوگ آ گئے ہیں یہاں۔" شیراز نے بے چارگی سے کہا۔

"تو میں کیا کروں۔ مجھ سے پوچھ کر تو ان کو یہاں نہیں لائے تم۔"

"گھر میں بڑوں کے ہونے سے برکت ہوتی ہے شینا!" شیراز نے بے حد جذب کے عالم میں بے حد احمقانہ بات کی۔

"اگر مجھے برکت کی ضرورت ہوئی تو میں اپنے باپ کو اپنے گھر لے آؤں گی۔"

"مگر..."

"شینا نے اس کی بات کاٹی۔

"I dont need your

ifs and buts---

صبح بتا دو انہیں کہ شادی ختم ہو گئی، اب وہ جائیں۔"

"لیکن وہ کہاں جائیں؟"

"کیوں؟ گھر نہیں ہے کیا ان کا؟ یہ سب کچھ بیچ کر آئے ہو تم لوگ یہاں؟" شینا نے اتنی بدتمیزی کے ساتھ کہا۔

"Now give me the car key(تم مجھے گاڑی کی چابی دو)"

"تم کہاں جا رہی ہو؟" وہ گھر کا رونا یک دم بھول گیا۔

"یہ سوال مجھ سے دوبارہ کبھی مت کرنا۔ میرے باپ نے کبھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا تو تم کیا چیز ہو۔ چابی دو۔"

شیراز نے فق ہوتی ہوئی رنگت کے ساتھ جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر اسے دے دی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس گاڑی کے پاس تصویر بنوا کر آیا تھا جو اس کے سسرال والوں نے دی تھی۔

شینا نے تقریباً چھیننے والے انداز میں اس سے وہ چابی لی اور پھر اس پر ایک نظر ڈالے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

شیراز نے ایک گھنٹہ لاؤنج میں شینا کے بگڑے تیوروں سے شادی کی اس رات کے بارے میں جو بھی متوقع برے اندازے لگائے تھے، ان میں یہ انجام کہیں بھی نہیں تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔

یہ انجام نہیں تھا، یہ آغاز تھا۔

شیراز نے وہ ساری رات بیڈروم کی ایزی چیئر پر لیٹے گزار دی تھی۔ وہ اپنے دل اور دماغ کو شینا کے اس رویے کے لیے ہر ممکن تاویلیں دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور اس سب سے بھی بڑھ کر مسئلہ اب یہ تھا کہ وہ اس وقت کہاں گئی تھی؟

یہ معمہ بہت دیر تک معمہ نہیں رہا۔

وہ فجر کے کچھ دیر بعد آ گئی تھی اور باہر پورچ میں گاڑی کی آواز سنتے ہی شیراز یک دم چاق و چوبند ہو گیا تھا۔ وہ چند منٹوں میں اندر تھی اور اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی شیراز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا موڈ اب رات جیسا خراب نہیں تھا۔ اس چیز نے اسے کچھ تسلی دی۔ غصہ ہر انسان کو آتا ہے، شینا کو بھی کسی بات پر آ گیا ہوگا۔ ورنہ وہ... شیراز نے قدرے پرسکون انداز میں سوچا۔

شینا آتے ہی واش روم میں گھس گئی تھی، چند منٹوں بعد وہ اپنا نائٹ ڈریس پہن کر باہر آئی۔ کھڑکیوں کے باہر اب سفیدی جھلک رہی تھی اور وہ سونے کی تیاری میں مصروف تھی۔

شیراز نے اس وقت ہمت کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "تمہیں بہت دیر ہوگئی؟"

شینا نے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف جاتے جاتے اسے مڑ کر دیکھا۔

"کیسی دیر؟ صرف صبح ہوئی ہے اور میں عام طور پر اسی وقت گھر آتی ہوں۔"

شیراز کا دل چاہا تھا، بے اختیار پوچھے "کیوں؟" لیکن وہ رات کا سبق ابھی بھولا نہیں تھا۔ اتنا غنیمت تھا کہ وہ اسے بتا رہی تھی۔

شینا اب اپنے بالوں میں برش کرتے ہوئے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ شیراز کو اس وقت وہ ڈائمنڈ رنگ یاد آئی جو وہ شینا کو دینا چاہتا تھا۔ وہ کوٹ کی جیب سے انگوٹھی والی ڈبیا نکال کر شینا کے پاس چلا آیا اور اس نے اپنے لہجے میں حتی المقدور خوشگواری بھرتے ہوئے اس سے کہا۔

"میں تمہیں کچھ دینا چاہتا تھا۔"

شینا نے چونک کر پہلے آئینے میں سے اسے دیکھا پھر گردن موڑ کر۔ شیراز تب تک ڈبیا میں سے انگوٹھی نکالے اس کے ہاتھ بڑھانے کا منتظر تھا۔ مگر شینا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے انگوٹھی لینے کے لیے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ شیراز نے قدرے تامل کرتے ہوئے انگوٹھی اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ شینا نے انگوٹھی انگلیوں میں پکڑتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالی پھر بڑی لاپروائی کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک دی۔ انگوٹھی سلپ ہوتے ہوئے نیچے اس کے پیروں میں کارپٹ پر گر پڑی۔ شیراز نے بے حد ہتک محسوس کی مگر یہ ہتک محسوس کرنے کا وقت نہیں تھا۔

"تمہیں پسند نہیں آئی؟" اس نے پتہ نہیں کیا سوچ کر اس سے پوچھا۔

"نہیں۔" شینا نے بالوں میں برش چلاتے ہوئے کہا۔

"ڈائمنڈ رنگ تھی۔" شیراز نے ساتھ اس کی قیمت بتانے سے زبردستی خود کو روکا۔

"میں صرف Tiffany کے ڈائمنڈز پہنتی ہوں۔ تم اپنی ماں یا بہنوں میں سے کسی کو دے دینا۔" شینا نے اسی لاپروا انداز میں کہا۔

"یہ تمہارے لیے شادی کا تحفہ تھا۔" شیراز نے اسے کچھ جتانا چاہا۔

"تحفہ خوشی کے موقع پر دیا جاتا ہے۔"

شینا نے اپنا ہیر برش بھی انگوٹھی والے انداز میں ٹیبل پر پھینکا اور بیڈ کی طرف چلی گئی۔ لیکن اس کے جملے نے شیراز کی ساری جان نکال دی تھی۔

"تم اس شادی سے خوش نہیں ہو؟" اس نے بے یقینی سے شینا سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟" شیراز اس بار خود کو سوال کرنے سے نہیں روک سکا۔

"اپنے آپ کو آئینے میں دیکھو تمہیں پتا چل جائے گا کیوں اب مجھے سونے دو میں تمہاری بک بک سننے کے لیے تمہیں یہاں

نہیں لائی۔"

شینا نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔ وہ آنکھیں بند کر چکی تھی۔ شیراز کو یقین نہیں آیا کہ اس نے یہ سب کچھ اس سے کہا تھا۔ چند لمحے شینا کو دیکھ کر اس نے پلٹ کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔

اسے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو اسے کسی عورت کے لیے ناقابل قبول بناتی۔ وہ مناسب خدوخال رکھتا تھا اور ان ہی خدوخال پر زینی مرتی تھی۔

اس نے بے حد گڑبڑا کر چور نظروں سے آئینے سے بیڈ پر سوتی ہوئی شینا کو دیکھا۔ یہ زینی یہاں کہاں آ گئی تھی یہاں اس کا کیا کام تھا۔

اس نے اسے اپنے ذہن سے جھٹکا۔

ابھی اسے شینا کے بارے میں سوچنا تھا۔ جس سے پچھلی رات کو اس کا نکاح ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر جا کر ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیڈ پر سوئی ہوئی شینا کو ایک بار پھر دیکھا پھر اپنے کمرے اور اس میں پڑی چیزوں کو، چند لمحوں میں اس کا ڈپریشن غائب ہو گیا تھا۔

ٹھیک ہے۔ وہ شینا کا دل نہیں جیت سکا تھا۔ مگر شادی کے جوئے میں اس نے بہت کچھ جیتا تھا۔ ایک عورت کا دل نہیں تو نہ سہی۔ وہ پرسکون ہو گیا تھا۔ بہر حال شینا کا شوہر تو وہی تھا۔ سعید نواز کے داماد کے نام سے تو سوسائٹی اب اسے ہی پہچاننے والی تھی۔

☆☆☆

شیراز گیارہ بارہ کے قریب سو کر اٹھا تھا۔ شینا تب بھی گہری نیند سو رہی تھی۔ اٹھتے ہی ایک بار اسے رات اور صبح شینا کے ساتھ ہونے والی تمام گفتگو یاد آئی اور پھر یک دم اسے اس ڈائمنڈ کی انگوٹھی کا خیال آیا۔ وہ بیڈ سے اٹھتے ہی سیدھا ڈریسنگ ٹیبل کے پاس گیا اور کارپٹ پر رنگ ڈھونڈنے لگا۔ چند لمحوں میں اس نے انگوٹھی تلاش کر لی تھی کارپٹ پر پڑی ہوئی اس انگوٹھی پر اس نے بڑی رقم خرچ کی تھی اور اس کا خیال تھا شینا کو وہ ضرور پسند آئے گی آخر وہ پچاس ہزار کی تھی۔ مگر اب اسے کارپٹ پر پڑا دیکھ کر اسے رنج ہو رہا تھا کہ اس نے خواہ مخواہ پچاس ہزار ضائع کیے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ کوئی سستی سی انگوٹھی خرید لاتا۔ کیونکہ شینا اس کا بھی یہی حشر کرتی۔

وہ اپنے بیڈ روم سے جس وقت باہر آیا۔ اس وقت اس نے ذکیہ اور نسیم کو لاؤنج میں بیٹھے دیکھ لیا تھا اور ماں باپ کے چہرے کے تاثرات نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ یقیناً شینا کو رات کو گھر سے جاتے اور صبح آتے دیکھ چکے تھے اسے پہلے ہی یہ خدشہ تھا مگر اس نے بظاہر بڑے نارمل سے انداز میں ملازم کو ناشتہ لگانے کے لیے کہا اور ان دونوں کے پاس بیٹھ گیا۔

"شینا کہاں ہے بیٹا؟" نسیم نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

"وہ سو رہی ہے۔" شیراز نے لہجے کو بے حد نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

"رات کو وہ کہیں گئی تھی۔ پھر میں نے دیکھا صبح فجر کے بعد آئی؟" نسیم نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔

"ہاں ۔ وہ انکل کی طبیعت کچھ خراب تھی تو انہوں نے اسے بلوایا تھا۔" شیراز نے جھوٹ بولا۔

"بھائی سعید نواز کی؟ ان کو کیا ہوا؟" نسیم نے یک دم پریشان ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس شاید شینا کی شادی کی وجہ سے کچھ اداس تھے۔ ذرا ہیڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا۔'' شیراز نے جھوٹ پر جھوٹ بولا۔

''اور تم نے بہو کو اکیلے بھیج دیا۔ وہ بھی رات کے وقت تمہیں خود ساتھ جانا چاہیے تھا۔ کیا سوچ رہے ہوں گے سعید بھائی۔'' اکبر نے اس ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''میں آج جاؤں گا، ابھی ناشتے کے بعد۔'' شیراز نے انہیں تسلی دی۔

''بلکہ ہم دونوں کو بھی ساتھ لے جانا ہم بھی ان کی طبیعت پوچھ لیں گے۔'' نسیم نے کہا۔

''نہیں نہیں امی! اس کی ضرورت نہیں بلکہ آپ شینا سے بھی ان کی بیماری کے بارے میں بات مت کیجئے گا وہ خوامخواہ پریشان ہوگی۔'' شیراز کو یک دم اپنے جھوٹ کے پکڑے جانے کا اندیشہ لاحق ہوا۔

''لو بھلا، اب ہم بہو سے اس کے باپ کی خیریت بھی نہ پوچھیں۔'' نسیم نے بے اختیار برا مانا۔

''نہیں امی! ابھی نہیں۔'' ''میں خود آپ کو آکر سعید انکل کا حال بتادوں گا۔ شینا کہہ رہی تھی وہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

شیراز نے جلدی جلدی کہا! اکبر اور نسیم نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر شیراز کو۔

''میرا خیال ہے ناشتہ لگ گیا ہے۔ میں ذرا ناشتہ کرلوں۔'' شیراز نے بہتر سمجھا کہ اس وقت وہاں سے نکل جائے۔

☆☆☆

''شینا بالکل بچی ہے۔ بعض دفعہ اس طرح کی باتیں کردیتی ہے۔ تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔''

وہ کچھ دیر پہلے ہی سعید نواز کے پاس آیا تھا اور سعید نواز اس کی ساری باتیں سن کر بڑے اطمینان سے ہنس کر بولے تھے۔

''لیکن انکل! اس نے مجھ سے خود کہا ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔'' شیراز نے بے حد سنجیدگی سے انہیں بتایا۔

''وہ نہ بھی کرے، میں تو کرتا ہوں نا'' انہوں نے اسی انداز میں کہا۔

''غصے کی تیز ہے اور کوئی بات نہیں۔''

''لیکن انکل! اس نے مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ میں اپنے ماں باپ کو واپس بھجوا دوں۔'' شیراز اب اس بات کی طرف آیا جو اس کی پریشانی کی اصل وجہ تھی۔

''بیٹا! یہ تو کوئی نامناسب مطالبہ نہیں۔ وہ گھر میں نے تم دونوں کو رہنے کے لیے دیا ہے۔ شینا کو جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنے کی عادت نہیں۔ وہ تو یہاں میرے ساتھ رہتی تھی تو اوپر کا پورا پورشن استعمال کرتی تھی۔ اب میری سمجھ میں آیا، اس کا موڈ کیوں آف ہوا۔ تم جلد از جلد اپنے گھر والوں کو واپس بھیجو۔''

کچھ دیر پہلے کی مسکراہٹ اور اطمینان اب سعید نواز کے چہرے پر نہیں تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھے اور شیراز کچھ مزید اپ سیٹ۔ اس کا خیال تھا۔ سعید نواز اس کے ماں باپ کو وہیں رکھنے کے سلسلے میں اس کی حمایت کریں گے۔

''لیکن انکل! میں اتنی جلدی انہیں واپس شفٹ نہیں کرسکتا۔ ابھی کچھ دن لگیں گے مجھے کرائے کا کوئی گھر تلاش کرنے میں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''کیوں، وہ تمہارے پرانے گھر کو کیا ہوا؟'' وہ چونکے۔

''وہ... میں نے کرائے پر دے دیا۔'' اس نے جھوٹ بولا۔

''تو خالی کروالو بلکہ میں خالی کروا دیتا ہوں۔'' سعید نواز نے فوراً کہا۔

''نہیں انکل! میں اب انہیں وہاں نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ وہ گھر ذرا چھوٹا ہے۔'' شیراز نے فوراً کہا ''میں کوئی اور گھر کرائے پر لے کر انہیں وہاں رکھوں گا۔''

''لیکن یہ کام جلد ہونا چاہیے۔ فی الحال تو میں شینا کو سمجھا دوں گا۔ لیکن یہ اس کا گھر ہے۔ اگر اسے وہاں پرائیویسی نہیں ملے گی تو وہ ری ایکٹ تو کرے گی۔'' سعید نواز نے بے حد سنجیدگی اور سرد مہری سے کہا۔ ان کے انداز میں کسی قسم کا لحاظ یا گرم جوشی مفقود تھی۔

''جی!'' شیراز نے بے حد پست آواز میں کہا۔ اس کی پریشانی اب شروع ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ گھر والوں سے یہ کس طرح کہے گا کہ ''انہیں اس گھر سے جانا ہے وہ انہیں ساتھ نہیں رکھ سکتا۔''

☆☆☆

سعید نواز کے پاس اس دن جانا شیراز کو بہت مہنگا پڑا تھا۔ سعید نواز نے شام کے وقت فون کرکے شینا سے کچھ بات کی تھی اور اس کے دس منٹ بعد شینا غصے میں آگ بگولا اپنے بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی۔ شیراز اور اس کے گھر والے اس وقت مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے کھولے ان کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھے جو انہیں اپنے مختلف رشتے داروں کو بھجوانے تھے۔

''تم میرے باپ کے پاس جاکر میری شکایت کرکے آئے ہو؟''

شینا نے لاؤنج کے درمیان میں آکر شیراز سے کہا جس کی ٹانگیں کانپنا شروع ہوگئی تھیں۔ وہاں صرف اس کے ماں باپ اور چھوٹی بہنیں ہی نہیں تھیں، اس وقت دو ملازم بھی تھے اور اس وقت اس کی شادی کا دوسرا دن تھا۔

''نہیں۔ میں نے کوئی شکایت نہیں کی'' شیراز نے تھوڑا سا کھنکار کر حلق سے آواز نکالی۔

''جھوٹ مت بولو۔ تمہارا خیال تھا کہ مجھے کچھ پتا نہیں چلے گا۔''

شینا نے پہلے سے بھی بلند آواز میں کہا۔ دونوں ملازم خود ہی وہاں سے چلے گئے تھے۔ وہ شینا کے گھر کے ملازم تھے جان گئے تھے، اب آگے کیا ہونے والا تھا۔

اکبر اور نسیم کے ساتھ شیراز کی تینوں بہنیں بھی منہ کھولے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کا لائق فائق سرکاری افسر بھائی یوں کسی کے سامنے منمنائے گا اور وہ بھی کسی عورت کے سامنے انہوں نے تو ساری عمر شیراز کے نخرے اٹھائے تھے۔

"میں..." وہ ہکلایا، شینا نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی "تم سمجھتے ہو، میرا باپ تمہاری بکواس سن کر تمہارے ساتھ ہمدردی کرے گا؟"

"میں..." شیراز نے کچھ کہنا چاہا۔

"شٹ اپ، تم میں ہمت تھی تو میرے سامنے کھڑے ہو کر بات کرتے۔ میرے باپ کے پاس کیوں بھاگے گئے؟"

"میں..." شیراز نے قدرے بے چارگی سے اپنے اہل خانہ پر نظر ڈالتے ہوئے شینا سے ایک بار پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"خبردار۔ آئندہ میرے باپ کے پاس گئے تم جو بات کرنا ہے۔ مجھ سے کرو ورنہ اپنا منہ بند رکھو اور ابھی اور اسی وقت اس چڑیا گھر کو میرے گھر سے نکالو۔ آئندہ میں شکل نہ دیکھوں ان میں سے کسی کی یہاں پر۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے۔ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے کہ تم اپنا پورا خاندان لے کر آ گئے ہو یہاں۔"

شیراز نے اس بار منمنانے کی کوشش نہیں کی۔ شینا نے بھی مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی تیز قدموں سے لاؤنج سے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

شیراز اپنے گھر والوں کے ساتھ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق لاؤنج میں مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکروں کے درمیان کھڑا تھا اور ہر ایک اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

وہ عورت اس کا انتخاب تھی۔ یہ شادی اس کا فیصلہ تھی اور یہ بے عزتی اس کا مقدر۔ وہ اس سے بھاگ کر کہاں جا سکتا تھا۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ ان سب کو لے کر کہاں جاتا۔ شینا کے پاس جا کر بھیک مانگنے یا منت کرنے میں اسے کوئی عار نہ ہوتا اگر اسے یقین ہوتا کہ شینا اس کی بات مان جائے گی لیکن اس کے ساتھ شادی کو صرف چوبیس گھنٹے گزرنے کے باوجود اسے یقین تھا کہ شینا سے جا کر اس معاملے کے بارے میں بات کرنے کا مطلب مزید بے عزتی تھی اور سعید نواز سے بات کرنے کا مطلب اپنے ماں باپ کے ساتھ خود بھی اس گھر کو الوداع کہنا تھا۔ وہ ایک ہی حماقت دن میں دو بار نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ لوگ اپنا تھوڑا بہت سامان پیک کر لیں۔ میں آپ کے لیے کسی جگہ کا انتظام کر کے آتا ہوں۔" شیراز نے سب سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"لیکن بیٹا! بہو کو ہم سے کیا شکایت ہوئی ہے؟" نسیم نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔ کسی اور نے یہ سوال نہیں پوچھا۔

شیراز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب فی الحال اس کے پاس بھی نہیں تھا شینا اس طرح کیوں کر رہی تھی؟ اور اسے یہی سب کچھ کرنا تھا تو اسے شیراز سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن فی الحال شیراز کے پاس گتھیاں سلجھانے کا وقت نہیں تھا۔ مٹھائی اور پھلوں کے اس ڈھیر کو وہیں چھوڑ کر وہ سب لوگ افسردگی اور رنجیدگی کے عالم میں اپنا اپنا سامان اٹھانے لگے۔ شیراز نے ایک ہوٹل میں چند دن کے لیے بکنگ کروائی تھی۔ فی الحال وہ یہی کر سکتا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں ان لوگوں کو چھوڑ کر رات گیارہ بجے وہاں سے واپس آتے ہوئے شیراز بے حد افسردہ تھا اور اکبر اور نسیم دل گرفتہ۔

انہوں نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی کی دوسری رات بے گھر اور بے در گزاریں گے۔ وہ پہلی رات تھی جو ان پانچوں نے ہوٹل کے اس کمرے میں جاگ کر گزاری تھی کچھ کھائے پیے بغیر۔ اس رات ان پانچوں کو زینی بہت یاد آئی تھی۔

☆☆☆

''دفتر والے کہہ رہے ہیں، ابو کے پراویڈنٹ فنڈ میں زیادہ رقم نہیں ہے۔ ابو وقتاً فوقتاً قرضہ لیتے رہے ہیں۔ اور پنشن جاری ہونے میں بھی دیر لگے گی۔ اتنی جلدی پنشن نہیں ملے گی۔''

سلمان نے بے حد مایوسی سے نفیسہ کو بتایا۔ وہ آج ضیاء کے دفتر ان کے واجبات کے حصول کے لیے گیا تھا۔

''کتنی دیر؟'' نفیسہ نے بے حد بے چینی سے پوچھا۔ ضیاء کی وفات کو یہ دوسرا مہینہ ہونے والا تھا اور جو جمع پونجی تھی وہ اب قریب الختم تھی۔

''کوئی سفارش ہوئی تو جلدی ملنے لگے گی ورنہ کئی مہینے لگ سکتے ہیں۔''

نفیسہ کا دل ڈوبنے لگا۔ کئی مہینے کا کیا مطلب تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں۔

اس گھر میں آمدنی کا واحد ذریعہ ضیاء کی تنخواہ تھی اور اب وہ نہیں تھے تو نفیسہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، گھر کیسے چلے گا۔ پہلے ضیاء کے جانے کا غم تھا جس نے انہیں بے حال کر دیا تھا۔ اب بھوک کا خوف تھا جو انہیں ادھ موا کر رہا تھا۔

گھر میں پہلے ہی بے شمار مسئلے اکٹھے ہو چکے تھے۔ زہرہ، ضیاء کی وفات پر اپنے بچوں سمیت آئی تھی اور اس کے بعد سے واپس نہیں گئی تھی۔ نعیم اور فہمیدہ نے اسے واپس لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ فہمیدہ نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ کہیں نعیم کی بات طے کر چکی ہیں اور اب اس کی شادی کی تیاری کر رہی ہیں۔ وہ صرف بھائی کی یک دم وفات کی وجہ سے زہرہ کو طلاق بھجوانے سے کچھ جھجک گئی تھیں ورنہ وہ زہرہ کو طلاق بھجوانے کا ہی ارادہ رکھتی تھیں۔ لیکن انہوں نے زہرہ کو صاف طور پر یہ بتا دیا تھا کہ اگر اس نے دوبارہ نعیم کے گھر آنے کی کوشش کی تو وہ اسے طلاق دلوا دیں گی۔ نعیم دو بیویاں رکھ سکتا تھا نہ ہی اس کے گھر میں دو بیویوں کے لیے گنجائش تھی اور جس بیوی کو وہ گھر میں رکھنا چاہتا تھا وہ ابھی آنے والی تھی۔

نفیسہ نے ضیاء کی موت کے غم کے ساتھ زہرہ کی واپسی کو بھی زہر کے گھونٹ کی طرح پی لیا۔ جب مصیبت آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی اس کے ساتھ ایک ہزار ایک مصیبتیں ہوتی ہیں۔

ضیاء کی وفات کے کچھ دن بعد ہی ربیعہ کی ساس آ کر ربیعہ کی منگنی کا سامان واپس کر گئی تھیں۔ انہوں نے منگنی توڑنے کی ایک ہی وجہ دی تھی کہ عمران رشتہ پر تیار نہیں تھا۔ وہ کسی ماڈل کی بہن کو بیوی نہیں بنا سکتا تھا۔

نفیسہ نے آنسو بھری آنکھوں سے منگنی کا سامان دیکھتے ہوئے سوچا تھا کہ ضیاء خوش قسمت تھے جنہوں نے اپنی بیٹیوں کو اس طرح برباد ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ورنہ وہ کیا کرتے۔ ان پر کیا گزرتی، جتنے صبر سے نفیسہ نے منگنی کے ٹوٹنے کو لیا تھا۔ اتنے ہی صبر کے ساتھ ربیعہ نے یہ دکھ برداشت کیا تھا۔ اس نے ایک بار بھی نفیسہ پر اپنے کسی انداز سے یہ ظاہر نہیں کیا کہ اسے دکھ ہوا تھا۔ وہ ماں کی اذیت میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن باپ کی موت پر زینی کے لیے اس کے دل میں جو نفرت پیدا ہوئی تھی، وہ اپنی منگنی ٹوٹنے پر اور گہری ہو گئی تھی۔

''آپ فکر نہ کریں امی! میں کسی اسکول میں نوکری کر لوں گی۔'' ربیعہ نے ماں کو تسلی دی تھی۔
اس وقت وہ سارے ہی سلمان کے گرد اکٹھے ہو کر بیٹھے تھے یوں جیسے وہ گھر کا سربراہ تھا۔
''میں بھی ایک دو لوگوں سے کہہ رہا ہوں۔ کہیں نہ کہیں کوئی سیلز مین کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔''
سلمان نے بے چارگی سے کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس طرح کے کام سے گھر میں موجود سات افراد کے اخراجات نہیں اٹھائے جا سکتے تھے۔
نفیسہ نے ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ صرف ان چھوٹے موٹے قرضوں کو ذہن میں دہرا رہی تھیں جو ان کو محلے کے مختلف گھروں میں واپس کرنے تھے۔
زندگی کیا چیز تھی؟ انہیں پہلی بار سمجھ میں آنا شروع ہوئی تھی۔

☆☆☆

''بی بی جی! بجلی والے میٹر کاٹنے آئے ہیں۔'' ملازم نے اسے اطلاع دی۔ وہ بے اختیار چونک گئی۔
''میٹر کاٹنے؟ کیوں؟''
''بل نہیں دیا اس لیے۔''
''تو بل کیوں نہیں دیا...؟'' وہ مزید حیران ہوئی۔
''جی مجھے نہیں پتا۔ آپ کو پتا ہو گا۔ آپ نے تو مجھے بل جمع کروانے کے لیے نہیں کہا۔''
زینی بیڈ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔
''ان کو جا کر کہو، ہم کل جمع کروا دیں گے۔ وہ کل آ کر چیک کر لیں۔'' ملازم خاموشی سے باہر نکل گیا۔
اس وقت وہاں بیٹھے زینی کو پہلی بار اپنے گھر کا خیال آیا۔ کس طرح چل رہا ہو گا گھر؟ کون بل دے رہا ہو گا؟ وہ بے چین ہونے لگی۔
''اتنے دن ہو گئے اور میں نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ ابو کے بعد اب....''
وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دراز سے رقم نکالنے لگی۔ دراز خالی تھی۔ اس نے چیک بک ڈھونڈنا شروع کی مگر اسے چیک بک کہیں نظر نہیں آئی۔ جس ذہنی حالت میں وہ تھی۔ اس میں تو اسے سامنے پڑی چیزیں نظر نہیں آ رہی تھیں اور یہ تو ایک چھوٹی سی چیک بک تھی۔
وہ پورا ایک گھنٹہ چیک بک تلاش کرتی رہی اور پھر آخر چیک بک مل گئی۔ اس نے ایک چیک کاٹ کر ملازم کو دیا۔ ''ڈرائیور سے کہو، یہ کیش کروا لائے۔'' اس نے ساتھ ہدایات دیں۔
ملازم چیک لے کر گیا اور چند ہی منٹوں میں واپس آ گیا۔
''ڈرائیور کہہ رہا ہے، گاڑی میں پٹرول نہیں ہے۔''
وہ اس کی بات پر بے اختیار جھنجلائی ''اس سے کہو، اپنے پاس سے ڈلوا لے، چیک کیش ہو جائے پھر میں اسے دے دوں گی۔''

"اور راشن بھی منگوانا ہے جی..... کچن میں سب کچھ ختم ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی جیب سے بھی پیسے ڈالے ہیں۔" ملازم نے اسے اطلاع دی۔

"اچھا سن لیا ہے میں نے۔" وہ مزید جھنجھلائی اور دوبارہ اوندھے منہ بستر پر گر گئی۔

ڈرائیور آدھ گھنٹے میں bounced چیک کے ساتھ ایک بار پھر گھر پر موجود تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں چند سو روپے تھے اور چیک کی مالیت ہزاروں میں تھی۔ زینی کو شاک لگا۔ اس نے اتنی رقم کہاں خرچ کی تھی؟ پھر اسے یاد آیا کہ وہ پچھلے کچھ عرصے سے صرف رقم خرچ کر رہی تھی۔ کما نہیں رہی تھی۔

گھر کا ایڈوانس، گاڑی کے لیے رقم اس نے فاران سے ادھار لی تھی مگر باقی اخراجات وہ خود ہی کر رہی تھی اور اب اس کا اکاؤنٹ امپٹی ہو چکا تھا۔

اسے فاران یاد آیا۔ فون اٹھا کر اس نے فاران کو فون کرنے کی کوشش کی۔ فون ون وے تھا۔

اس نے وارڈ روب کھول کر بہت دنوں کے بعد وہاں سے اپنے لیے ایک سوٹ نکالا اور باتھ روم میں گھس گئی۔ وہ بھیانک لگ رہی تھی۔ آئینے میں خود پر پہلی نظر ڈالتے ہی اس نے اعتراف کیا۔ بہت دنوں کے بعد وہ آج پہلی بار مکمل طور پر ہوش میں تھی۔ الکحل یا اینٹی ڈیپریسنٹ کو استعمال کیے بغیر۔

اور جب وہ ہوش میں تھی تو اسے احساس ہو رہا تھا "بے ہوش" رہنا کتنا مشکل تھا۔ دنیا سے کنارہ کش ہونے کے لیے بھی روپیہ چاہیے تھا۔

وہ جس وقت فاران کے آفس پہنچی، وہ کسی ماڈل کی شوٹ کروا رہا تھا۔ وہ اس کے آفس میں بیٹھ کر کئی دنوں بعد پہلی بار کافی پینے لگی۔

فاران دو گھنٹے کے بعد آیا تھا اور زینی پر پہلی نظر پڑتے ہی اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ ملاؤ خرابا ہر آ گئی تھی۔

"مجھے پیسے چاہئیں کچھ؟" اس نے فاران کو دیکھتے ہی اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ فاران کو پتا چل گیا وہ کیوں آئی تھی۔

"پیسے لینے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔ پری زاد۔" فاران نے دانستہ اس کا دوسرا نام لیا۔

"کام کر تو رہی ہوں میں۔" زینی نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ فی الحال وہ فاران سے لڑنے کی متحمل نہیں تھی۔

"جس طرح کا کام تم کر رہی ہو اس سے پیسہ کمایا نہیں جاتا پیسہ گنوایا جاتا ہے۔"

"تم پہلے مجھے لیکچر دو گے یا پیسے؟" زینی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"تم پہلے اپنی شکل آئینے میں دیکھو اور دیکھو کہ تم میری اتنے ماہ کی محنت کو کس طرح ڈبو آئی ہو۔" فاران نے اسے ملامت کی۔

"دیکھ آئی ہوں آئینہ میں اور لعنت بھی بھیج آئی ہوں اپنے آپ پر..... کچھ اور؟" زینی نے سرد مہری سے کہا۔

"اگر تمہیں پیسے اس لیے چاہئیں کہ ایک بار پھر تم گھر کے اس کمرے میں بیٹھ کر شراب میں ڈوبو تو زینی میں تمہیں ایک پائی نہیں دوں گا۔"

"بے فکر رہو، نکل آئی ہو اس کمرے سے باہر۔ اپنے گھر بھجوانے ہیں پیسے....." زینی نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"میں چیک کاٹ کر دے رہا ہوں تمہیں..... لیکن کل سے آفس آنا ہے تمہیں۔ ابھی کچھ دن تو شکل ٹھیک ہونے میں لگیں گے....."

فاران نے چیک کاٹتے ہوئے بڑبڑانا جاری رکھا۔

"اپنا ad دیکھا ہے؟" اسے یک دم جیسے خیال آیا۔

"کون سا ad؟" زینی نے چونک کر اسے دیکھا۔

فاران کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ "کتنے ad کیے ہیں تم نے زینی؟"

اس نے ناراضی سے چیک ٹیبل پر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لوں گی۔ کوئی جلدی نہیں ہے مجھے۔" زینی نے چیک پر ایک نظر دوڑائی اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"آج شام کو پیرس جانا ہے تمہیں۔ میں تمہاری بکنگ کروا رہا ہوں۔" فاران نے فون اٹھاتے ہوئے اپنی سیکرٹری کو ہدایات دیں۔

"چلی جاؤں گی۔" زینی نے میکانکی انداز میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"اس سے کہہ دینا، ہمیں اس کے پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھے۔" نفیسہ نے بے حد تلخی سے ڈرائیور سے کہا جس نے دروازہ کھولنے پر ایک لفافہ ان کی طرف بڑھایا تھا۔

ڈرائیور نے مزید کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن نفیسہ نے دروازہ بند کر دیا۔

"کون تھا امی؟" زہرہ نے ڈرائیور کو دیکھ لیا تھا۔

"زینی نے پیسے بھجوائے تھے۔ میں تو اس کے پیسے پر تھوکنا بھی پسند نہیں کروں، کیا سمجھتی ہے وہ کہ اپنے پیسے سے ہمیں خرید لے گی۔" نفیسہ نے بے حد غصے کے عالم میں کہا۔

"ہم کیا اتنے بے غیرت ہیں کہ اب اس کا پیسہ استعمال کرنے لگیں۔" وہ کہتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ زہرہ وہیں صحن میں کھڑی رہی۔

گھر کی حالت روز بہ روز ابتر ہو رہی تھی۔ اس کی بڑی بچی کا اسکول چھوٹ گیا تھا کیونکہ نہ تو کوئی اسے اسکول لے جانے والا رہا تھا نہ ہی اس کی فیس کے لیے پیسے تھے۔ سلمان نے تعلیم چھوڑ کر کہیں کام ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کام ڈھونڈتا پھر ضیاء کے دفتر واجبات کے حصول کے لیے چکر لگاتا۔ ربیعہ کو البتہ ایک اسکول میں جاب مل گئی تھی۔ مگر تین سو روپے ماہوار کی معمولی جاب گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ ایسے میں زینی کی طرف سے آنے والی رقم کم از کم زہرہ کو غیبی مدد کے مترادف محسوس ہوئی تھی۔ لیکن وہ یہ بات گھر کے کسی دوسرے فرد سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیونکہ فی الحال کوئی بھی زینی کے حق میں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

"انہوں نے پیسے نہیں لیے۔" ڈرائیور نے گاڑی میں بیٹھتے ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھی زینی کی طرف لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ بہت دیر چپ چاپ ڈرائیور کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے شکست خوردہ انداز میں وہ لفافہ پکڑ لیا۔ اس لفافے کا واپس آ جانا اس کے

لیے کوئی شاک نہیں تھا پھر بھی زینی کو جیسے کوئی موہوم سی آس تھی کہ شاید وہ کسی طرح لفافہ رکھ لیں۔ کوئی ضرورت کوئی مجبوری انہیں مجبور کر دے۔

ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا اور وہ خالی ذہن کے ساتھ گاڑی سے باہر دیکھ رہی تھی اور تب پہلی بار اس نے ایک بڑی سڑک پر لگے ہوئے بل بورڈ پر کسی لڑکی کا ایک بے حد شناسا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کی مسکراہٹ اور پھر جیسے ایک دھماکا اس کے ذہن میں ہوا۔ وہ اس کا اپنا چہرہ تھا۔ وہی ad جس کا ذکر فاران کر رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اس بل بورڈ سے نظریں ہٹائیں۔ اسے لگا تھا جیسے وہ چہرہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ یا جیسے اسے کچھ جتانے کی کوشش کر رہا تھا۔

بل بورڈ گزر گیا۔ گاڑی اسے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ زینی دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ایک اور بل بورڈ قریب آ رہا تھا۔ اس نے ایک عجب سی تلخی اپنے اندر اترتے محسوس کی۔ وہ یک دم "انسان" سے "اشتہار" بن گئی تھی زینی سگریٹ سلگانے لگی۔ وہ فی الحال اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ فی الحال دولت سے خریدی جانے والی صرف یہی ایک چیز تھی جو اس کے کام آ رہی تھی۔

وہ اب سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اپنے پاس دائیں سیٹ پر پڑے ایک سفید لفافے کے اندر موجود نوٹوں کو اپنے گھر والوں کے لیے "رزق" بنانے کے لیے وہ کیا کرے۔

☆☆☆

بہت دنوں بعد وہ ہوش و حواس میں اس رات جاگی تھی اور ساری رات جاگی تھی۔

اپنے بیڈ روم کے صوفے پر بیٹھ کر پانی کے ایک گلاس کو ہاتھ میں لیے وہ پانی کے اس گلاس میں جیسے اپنی زندگی دیکھتی رہی۔ اسے پچھتاوا نہیں تھا زندگی میں وہاں چلے آنے کا جہاں وہ اس وقت تھی۔ وہ دولت کے راستے سے نہ گزر کر آتی تو پچھتاتی۔ لیکن صرف ایک شاک تھا جس سے وہ باہر نہیں آ پا رہی تھی۔ وہ ضیاء سے اس آخری ملاقات کی باتیں یاد کر رہی تھی۔ باپ کا اس طرح بلک بلک کر رونا اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ جانتی تھی، باپ اس کے لیے رو رہا تھا اور اسے اس وقت باپ کو روتے دیکھ کر کچھ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ کوئی دکھ، کوئی تکلیف، کوئی رنج نہیں۔ ایک عجیب سی بے حسی تھی جس نے تب اس کے وجود کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ بے حسی یا کوئی شکایت تھی جو اس کے دل سے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

اور اب جب ضیاء نہیں تھے تو اسے لگ رہا تھا جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ اس کی زندگی سے شیراز چلا گیا تھا تو دنیا اس کے لیے خالی ہو گئی تھی اور ضیاء چلے گئے تھے تو وہ خالی ہو گئی تھی۔

پہلے باہر کچھ نہیں تھا۔ اب اندر بھی کچھ نہیں تھا۔

اس رات وہاں اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس نے اپنی انگلی کی پوروں پر اپنے خونی رشتوں کو گننا شروع کیا۔ آخر کون تھا جو اب بھی اس کا تھا؟ کوئی ایک بھی نہیں "ماں، بہنیں، بھائی ...... اور؟

اس نے دوستوں کو گننا شروع کیا۔ انگلیوں کی پوریں ایک بار پھر خالی رہیں۔ دنیا میں اب کوئی نہیں تھا جسے وہ اپنا دوست کہہ سکتی۔ رمشہ بھی نہیں۔ اس نے محبت کو نہیں گنا، وہ اس کی زندگی میں تھی ہی نہیں اور دوست؟ اس نے اپنے اثاثے گننے کی کوشش کی۔ دولت کے نام پر بھی اس کے

پاس کچھ نہیں تھا۔ کرائے کا گھر، پرانی گاڑی۔ فاران کے چند نوکر اگر وہ پیسے کے لیے یہاں آئی تھی تو پیسہ کہاں تھا۔ کیا اس طرح پیسہ بنانا تھا اسے کہ وہ چار دن گھر بیٹھتی تو بجلی کٹنے کی نوبت آ جاتی اور اسے فاران کے سامنے جا کر ہاتھ پھیلانا پڑتا۔

یہ وہ پیسہ نہیں تھا جو وہ چاہتی تھی اور یہ اس طرح کا پیسہ نہیں تھا جو اسے چاہیے تھا تو پھر اسے کیا چاہیے تھا اور کتنا چاہیے تھا؟ کم از کم پوروں سے شروع ہو کر پوروں پر ختم ہو جانے والا نہیں چاہیے تھا۔

☆☆☆

تبریز پاشا اور انور حبیب نے ایک دوسرے کو دیکھا، ان دونوں کی نظروں میں ستائش تھی۔ اندر داخل ہو کر ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھنے والی لڑکی اسکرین پر آڈیشن کی ٹیپ دیکھتے ہوئے انہیں جتنی خوبصورت لگی تھی، حقیقی زندگی میں اس سے زیادہ خوبصورت تھی۔

''میں نے تو آپ کو پہلی بار بل بورڈ پر دیکھتے ہی طے کر لیا تھا کہ پاشا پروڈکشنز کی اگلی ہیروئن یہی ہو گی۔ کئی ہفتے لگے مجھے آپ کا کانٹیکٹ نمبر حاصل کرنے کے لیے اور پھر آڈیشن کے لیے بلوانے کے لیے۔''

زینی نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس کی ساری باتیں سنی تھیں۔ تین دن پہلے انور حبیب نے اس کا آڈیشن لیا تھا اور آج وہ وہاں بیٹھی تھی۔

''شوبز میں کس طرح آئیں؟''

تبریز پاشا نے اس سے پوچھا، وہ جاننا چاہتا تھا۔ بازارِ حسن کے کس گھرانے سے اس کا تعلق تھا اور اگر وہ لاہور سے نہیں تھی تو پھر کس علاقے کے بازار سے آئی تھی۔ ملتان؟ فیصل آباد؟ گوجرانوالہ؟ جھنگ؟

''اس چیز کا آپ کی فلم سے کیا تعلق ہے؟ یہ کچھ غیر ضروری سوال نہیں ہے؟''

تبریز پاشا نے اپنے پورے فلمی کیریئر میں ایک فلم میں پہلی دفعہ کام کرنے کی خواہش مند ہیروئن سے اس طرح کی بات نہیں تھی یا تو اسے پاشا پروڈکشنز کا پتہ نہیں تھا یا تبریز پاشا کا۔ یہاں میز کے دوسری طرف بیٹھ کر ہیروئن بننے کی خواہش مند اداکارائیں پہلے پاشا پروڈکشنز کے گن گاتیں پھر تبریز پاشا کے اور یہ اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ غیر ضروری سوال کر رہا تھا۔ انور حبیب اور تبریز پاشا کے درمیان پہلے نظروں کا تبادلہ ہوا پھر مسکراہٹوں کا۔ زینی نے دونوں چیزوں کو نوٹس کیا مگر وہ لاپروائی سے سگریٹ پیتی رہی۔

''ڈانس آتا ہے آپ کو؟'' اس بار تبریز نے سوال بدل دیا۔

''نہیں۔ لیکن میں سیکھ لوں گی۔'' زینی نے کہا۔

''گڈ۔'' تبریز نے اطمینان سے کہا۔ اسے یقین تھا، وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اداکاری کی خواہش مند لڑکی کو ڈانس کے بارے میں کچھ پتہ ہو لیکن اس کے ''جھوٹ'' سننے میں مزہ آ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، کل کانٹریکٹ آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔ آپ سائن کر کے بھیج دیں۔''

تبریز پاشا نے چند سیکنڈز میں طے کیا۔ اس کا خیال تھا، وہ کم از کم اب احسان مندی کا اظہار کرے گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ زینی نے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک اور سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔

''کانٹریکٹ بھجوانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مالی معاملات کو طے کریں۔''

آج تبریز پاشا اور انور حبیب کی زندگی کا ''ناقابلِ فراموش'' دن تھا۔ پاکستانی فلم انڈسٹری میں پہلی بار کوئی لڑکی ان دو بڑے ناموں کے سامنے بیٹھ کر سائن کر لیے جانے پر احسان مندی کے اظہار کے بجائے مالی معاملات طے کرنے کی بات کر رہی تھی یا تو وہ بے وقوف تھی یا انجان اور یہ

پھر وا تھی اس کا تعلق اس بزنس کے کسی گھرانے سے نہیں تھا۔ ورنہ اسے پتہ ہوتا کہ لڑکیاں پاشا پروڈکشنز جیسے اداروں کی فلم میں کاسٹ ہونے کے لیے پیسے نہیں لیتی تھیں، پیسے اور تحفے دیتی تھیں۔ ڈائریکٹر کو بھی اور پروڈیوسر کو بھی اور یہ بہت بعد میں ہوتا کہ یہ ادارے کسی ہیروئن کو پیسے دینا شروع کرتے۔ یہ فلم انڈسٹری کا ان کہا قانون تھا۔ اداکارائیں فلمز کے معاوضے سے امیر نہیں ہوتی تھیں۔ وہ فلمز سے حاصل ہونے والی شہرت کو سیاست دانوں، بزنس مین اور دوسرے مردوں کو ٹریپ کرنے کے لیے استعمال کر کے امیر ہوتی تھیں۔

تبریز اور انور حبیب کو یک دم اس میں بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

''تمہیں شاید پتا نہیں ہے کہ پاشا پروڈکشنز کی ہیروئن بننا ہی کسی لڑکی کے لیے اعزاز کی بات ہے۔''

تبریز نے بالآخر اس کے لیے تم کا صیغہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ کسی اداکارہ کے لیے آپ کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے اس کی زبان بل کھانے لگتی تھی۔

''یہ پاشا پروڈکشنز کے لیے اعزاز کی بات ہے کہ پری زاد ان کے لیے کام کر رہی ہے۔'' زینی نے اسی انداز میں کہا۔

''پری زاد کو فلم انڈسٹری میں کوئی نہیں جانتا۔'' انور حبیب نے مداخلت کی۔

''پہلی فلم ریلیز ہوتے ہی پورا پاکستان جاننے لگے گا۔'' زینی کے انداز میں اس بار بھی تبدیلی نہیں آئی۔

''چلو ٹھیک ہے، ٹوکن منی دیں گے ہم تمہیں پچاس ہزار اور پچھلے پندرہ سالوں میں ہمارا ادارہ پہلی بار کسی نئی ہیروئن کو اتنی ٹوکن منی دے گا۔'' تبریز پاشا نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ اسے پری زاد پسند آئی تھی اور اس نے اس کے لیے غور کرنے میں تامل نہیں کیا تھا۔

''اس صورت میں میرا خیال ہے کہ میں آپ کی فلم میں کام نہیں کر سکتی۔ آپ ٹوکن منی کا اعزاز کسی دوسری لڑکی کو دیں۔ آپ لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔ بائے۔''

اس نے سگریٹ کا پیکٹ ایک ہاتھ میں لیا۔ بیگ دوسرے ہاتھ میں اور چند لمحوں میں اپنی کرسی سے اٹھ کر کمرے سے باہر تھی۔

کمرے میں دو افراد تھے مگر دونوں سکتے میں تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی لڑکی تبریز پاشا اور انور حبیب کے سامنے فلم سے انکار کر کے ان سے اجازت لیے بغیر اٹھ کر چلی جائے گی مگر پری زاد جا چکی تھی۔ وہ ٹوکن منی سمیت اس سال کی سب سے بڑی فلم ان کے منہ پر مار گئی تھی۔

☆☆☆

فاران نے شوبز نیوز کا صفحہ کھولتے ہوئے جوس کا گلاس اٹھایا اور پھر گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے جیسے اس وقت زمین نکل گئی تھی۔ شوبز کے صفحات پر سب سے بڑی خبر پاشا پروڈکشنز کی آنے والی فلم کی تقریب کے حوالے سے تھی اور پری زاد سفیر خان، تبریز پاشا اور انور حبیب کے ساتھ پریس کانفرنس سے خطاب کر رہی تھی۔

وہ ناشتہ چھوڑ کر آ گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ جا کر پری زاد کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دے۔ اس فلم کو سائن کرنے کا مطلب فاران کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو ڈبو دینا تھا اور وہ ڈبو رہی تھی۔

کوئی اور حالات ہوتے تو وہ اسے فون کرتا مگر اس وقت وہ اندھا دھند گاڑی چلا کر اس کے گھر پہنچا تھا۔ اسے یقین تھا، وہ اس وقت شوٹ کے لیے نکلنے کی تیاری کر رہی ہوگی اور اگر وہ اس کے گھر نہ جاتا تو ان دونوں کی ملاقات آفس یا اسٹوڈیو میں ہوتی۔

اس کا اندازہ ٹھیک تھا، وہ واقعی شوٹ کے لیے تیار تھی اور لاؤنج میں کسی سے سیل فون پر بات کر رہی تھی۔ جب فاران آندھی طوفان کی طرح لاؤنج میں داخل ہوا۔

زینی کو اس کی اسی قسم کی آمد کی توقع تھی مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی صبح اس کے گھر آن دھمکے گا۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ فون بند کر دیا۔

''تم کس طرح کر سکتی ہو یہ میرے ساتھ؟'' فاران اسے دیکھتے ہی اس پر دھاڑا تھا۔

''کیا؟'' زینی نے کمال بے نیازی سے پوچھا۔

''فلم سائن کر لی ہے تم نے؟'' وہ غرایا۔

''اوہ اچھا.... اس کی بات کر رہے ہو.... ہاں۔'' اس نے بے حد اطمینان سے فون اپنے بیگ میں رکھا۔

''تم جانتی ہو، پانچ سال تک تم کسی اور کے ساتھ کوئی پروجیکٹ نہیں کر سکتیں۔ کوئی ad، کوئی فلم، کوئی ٹی وی سیریل نہیں۔ کانٹریکٹ میں ہے یہ سب کچھ۔'' زینی صوفہ پر بیٹھ گئی۔

''اور ایک سال تک تو تم اس ملٹی نیشنل کمپنی کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے کوئی پروجیکٹ نہیں کر سکتیں اور تم سائن کر رہی ہو فلم۔ وہ تمہارا کانٹریکٹ ختم کریں گے اور تمہارے ساتھ ساتھ میرا بھی۔'' وہ اسی طرح چلایا۔

''اور میں یہی چاہتی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ مزید کام نہیں کر سکتی۔''

اس کا انداز اتنا سرسری تھا جیسے وہ اسے بتا رہی ہو کہ وہ اس کے ساتھ چائے نہیں پی سکتی۔ فاران کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس پر اس نے عنایات کی بھرمار کر دی تھی جسے اس نے چند مہینوں میں پاکستان کی ٹاپ ماڈلز کے برابر لا کھڑا کیا تھا اور وہ احسان فراموشی کی ساری حدیں توڑ رہی تھی۔

''تمہیں اگر معاوضے کے سلسلے میں کوئی شکایات ہیں تو....'' اس نے فوری طور پر اپنے لہجے اور الفاظ میں تبدیلی کی۔ زینی نے اس تیز رفتاری کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں، میں نے کہا نا۔ میں تمہارے ساتھ کام نہیں کرنا چاہتی اور نہیں کرنا چاہتی تو نہیں کرنا چاہتی۔''

''تم کانٹریکٹ توڑ نہیں سکتیں۔'' فاران نے اسے دھمکایا۔

''ورنہ تم کیا کرو گے؟''

''میں تمہیں کورٹ میں لے جاؤں گا۔ کوئی دوسری ماڈلنگ ایجنسی تمہیں سائن نہیں کرے گی۔ تمہیں کام نہیں دے گی۔''

"پھر ٹھیک ہے، تم مجھے کورٹ میں لے جاؤ۔ باقی معاملات ہم وہیں طے کرلیں گے اور جہاں تک ماڈلنگ ایجنسی کے نہ ملنے کا تعلق ہے تو میں نے سوچا ہے۔ میں اب ایکٹریس بنوں گی کیونکہ میرا خیال ہے، مجھ میں ایکٹنگ کا بہت زیادہ ٹیلنٹ ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ اب ایک سگریٹ سلگا رہی تھی اور ایک سلگا دینے والی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ہوئے تھی۔

"تم احسان فراموش ہو، بے حد احسان فراموش۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"شوبز میں احسان نہیں ہوتا، کام ہوتا ہے۔ پہلے مجھے تم سے تھا، اب نہیں ہے۔"

"تم سب ماڈل لڑکی ایک ہی ذات ہوتی ہے۔ بدذات۔" فاران خود پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔

"اگر یہ tip of the day ہے تو میں اسے یاد رکھوں گی اور اگر یہ تمہاری زندگی کی فلاسفی ہے تو میں اس کے لیے تمہیں داد دیتی ہوں لیکن اس فلاسفی میں صرف معمولی ترمیم کی ضرورت ہے۔ ماڈلز کے ساتھ تمہیں ایڈورٹائزنگ ایجنسیز کے مالکان کا نام بھی لینا چاہیے۔ اس سے تمہاری فلاسفی "ذاتی تجربہ" نہیں لگے گی۔" وہ اپنا بیگ اٹھا کر اب وہاں سے جا رہی تھی۔

اس نے کہا تھا، وہ اسے بہت رلائے گی۔ وہ اپنے پہلے وعدے پر حرف بہ حرف پوری اتری تھی۔

☆☆☆

تبریز پاشا نے زینی کے اپنے آفس سے نکلنے کے چند سیکنڈز کے بعد ہی اس کے پیچھے اپنا چپراسی دوڑا دیا تھا۔

وہ جب دوسری بار کمرے میں داخل ہوئی تو کمرے کا ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔ تبریز پاشا اور انور حبیب اب مسکرا رہے تھے۔ ان کے انداز میں پہلے والی رعونت نہیں تھی۔ وہ فلمی لڑکی نہیں تھی، وہ اسے فلمی ہتھکنڈوں سے قابو نہیں کرسکتے تھے۔ یہ انہیں اندازہ ہو گیا تھا۔

"تم کتنا معاوضہ چاہتی ہو؟" تبریز پاشا نے اس کے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"پانچ لاکھ۔" زینی نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ تبریز پاشا نے پہلے قہقہہ لگایا اور پھر وہ ہنستا ہی گیا۔ انور حبیب البتہ مسکراتا رہا۔

"تمہیں پتا ہے انڈسٹری کی سب سے ٹاپ ایکٹریس شمسہ اس وقت کتنا معاوضہ لے رہی ہے۔ تین لاکھ روپے اور اس تین لاکھ روپے کے پیچھے تیرہ سالوں کی محنت ہے۔" تبریز پاشا نے بے حد محظوظ ہوتے ہوئے جیسے اسے بتایا۔

"میں کسی محنت کا معاوضہ نہیں مانگ رہی، میں تو اس بدنامی کی قیمت کو کچھ قابل قبول بنانا چاہتی ہوں جو ایک فلمی اداکارہ کا لیبل مجھے دے گا۔"

اس کے جملے نے تبریز پاشا اور انور حبیب کے چہرے سے مسکراہٹوں کو غائب کر دیا تھا۔ پری زاد واقعی عجیب تھی۔ انہوں نے اس طرح کی بے دھڑک اور بے لحاظ باتیں کرنے والی کہاں دیکھی تھی۔

"اس لیبل سے تم صرف بدنامی نہیں کماؤ گی، کروڑوں روپیہ بھی بناؤ گی۔" اس بار تبریز پاشا نے بھی کسی لحاظ کے بغیر کہا۔

"اسی لیے آپ سے صرف پانچ لاکھ مانگ رہی ہوں، پانچ کروڑ نہیں۔" اس بار انور حبیب نے قہقہہ لگایا تھا اور تبریز پاشا صرف مسکرایا تھا لیکن ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھی ہوئی لڑکی ان دونوں کو بیک وقت اچھی لگی تھی۔

وہ ان عورتوں سے ملتے رہتے تھے جو میک اپ کے تمام لوازمات سے خود کو آراستہ کیے مصنوعی پلکوں اور کاجل اور آئی لائنر کی لکیروں کے ساتھ مردوں کے دلوں میں اترنے کی کوشش کرتی تھیں جو زبان میں کسی ''امیر مرد'' کے لیے ''شیرینی'' کے علاوہ اور کچھ نہیں رکھتی تھیں اور وہ مرد اگر پروڈیوسر یا ڈائریکٹر ہوتا تو اس شیرینی کی مقدار میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔

اور سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کے لہجے میں ''مٹھاس'' کے علاوہ سب کچھ تھا اور مٹھاس کیوں نہیں تھی؟ غرور کی وجہ سے یا بے نیازی کی وجہ سے؟ یہ وہ سوال تھا جس کے جواب کو جاننے میں تبریز پاشا اور انور حبیب کو دلچسپی پیدا ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، پانچ لاکھ ہی دیں گے ہم تمہیں۔ اور کچھ؟'' تبریز پاشا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں اور کچھ نہیں۔'' تبریز پاشا کا اگر یہ خیال تھا کہ وہ اور کچھ کا سنتے ہی کچھ اور فرمائشیں بھی کرے گی تو ایک بار پھر یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ ہیروئنز کے منہ پھاڑ کر فرمائشیں کرنے اور انہیں پوری کرنے کا عادی تھا۔

سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی اس بازار سے نہیں تھی۔ انہیں یقین آ گیا اور ساتھ ہی تشویش ہوئی تھی۔ اگر اسے واقعی ڈانس نہیں آتا تھا تو یہ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ صرف اس کے لیے نہیں کسی بھی پروڈیوسر کے لیے۔ جو کلاس پاکستان میں سینما جاتی ہے، وہ صرف ہیروئن کو ناچتا دیکھنے کے لیے جاتی ہے۔ اس کی خوبصورتی، اس کا جسم، اس کی ایکٹنگ سب ثانوی حیثیت رکھتی تھیں اور پری زاد نے بتا دیا تھا اسے ڈانس نہیں آتا تھا۔ جس کا مطلب فلم انڈسٹری کی زبان میں تھا کہ ہیروئن ''لنگڑی'' ہے۔

تبریز پاشا نے اس خدشے کا اظہار پری زاد سے نہیں کیا۔ اس کے جانے کے بعد انور حبیب سے کیا جس نے بڑی لاپروائی کے ساتھ کہا۔

''اس نے کہا ہے، وہ سیکھ لے گی تو مجھے یقین ہے وہ سیکھ لے گی۔ جو تبریز پاشا جیسے آدمی سے پانچ لاکھ لے سکتی ہے۔ وہ ڈانس بھی سیکھ سکتی ہے۔ وہ تو بہرحال آسان کام ہے۔'' تبریز پاشا اس کی بات پر ہنس پڑا تھا۔

انور حبیب نے دوسرے دن سے ہی فلم انڈسٹری کے ایک نامور ڈانس ڈائریکٹر کو پری زاد کے گھر ڈانس سکھانے پر مامور کر دیا تھا۔ اگرچہ اس نے تبریز پاشا کی بات کو اس وقت لاپروائی سے نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا تبریز کا اندیشہ بالکل ٹھیک تھا۔ مسئلہ صرف ڈانس کا نہیں تھا۔ اس ڈانس کا تھا جس پر سینما ہال میں بیٹھے مرد ناچتے۔ اور پری زاد اس بازار سے ہوتی تو وہ مردوں کی نبض کو جانتی۔ اب بازار سے نہیں تھی تو اس کو سب کچھ سکھانا پڑتا تھا۔

انور حبیب کو اس وقت احساس ہونے لگا تھا، وہ سب پری زاد کو اس سال کی سب سے مہنگی فلم میں کاسٹ کر کے اپنی زندگی کا سب سے بڑا رسک لے چکے تھے۔

☆☆☆

زری کا اگر یہ خیال تھا کہ فاران سے جان چھڑانا آسان تھا تو یہ خیال اگلے چند دن میں ہی غلط ثابت ہو گیا تھا۔ اسے ایک کے بعد ایک لیگل نوٹس آنا شروع ہو گئے تھے۔

اور دو دن بعد مالک مکان نے اسے گھر خالی کرنے کا بھی نوٹس دے دیا۔ تیسرے دن ڈرائیور سمیت اس کے تینوں ملازم کام چھوڑ کر چلے گئے۔

فاران وہ سارے حربے استعمال کر رہا تھا جس سے وہ پریشر ائز ہوتی اور پھر مصلحت کی کوشش کرتی۔ لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا، وہ صحیح حربے غلط شخص پر استعمال کر رہا تھا۔ یہ زینی تھی۔ کوئی دوسری ماڈل نہیں جو فاران کے سامنے ناک رگڑنے پر مجبور ہوتی۔ اس کا ہر حربہ فاران سے اس کی نفرت میں اضافہ کر رہا تھا۔

اور اس کے بعد فاران نے آخری حربہ استعمال کیا تھا۔ اخبار میں اس کے بارے میں خبریں لگنا شروع ہو گئی تھیں۔ پری زاد کے لالچ کے بارے میں، اس کی بے ایمانی کے بارے میں، اس کے فریب کے بارے میں اخباروں میں آنے لگا کہ فاران نے کس طرح ایک لوئر مڈل کلاس لڑکی کو ایک ٹاپ ماڈل بنایا۔ اس کا کیریئر بنانے کے لیے کس طرح اپنے دن رات ایک کر دیئے اور پری زاد چار پیسے زیادہ ملنے کی وجہ سے کس طرح اسے چھوڑ کر پاشا پروڈکشنز کی فلم کرنے لگی۔

شروع میں یہ سب کچھ "نامعلوم ذرائع" کی "اطلاعات" ہوتیں اور زینی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ ان "حقائق" کو پڑھتی۔

پھر فاران بالآخر پردے کے پیچھے سے نکل کر کھلم کھلا سامنے آ گیا تھا۔

اس نے ایک پریس کانفرنس منعقد کر کے پری زاد کی "کمینگی، لالچ، خود غرضی، گھٹیا پن، کم ظرفی، اور احسان فراموشی" کے بارے میں تفصیلات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر حتی المقدور کیک الزامات لگائے۔ اس کی شراب نوشی کی تفصیلات دیں۔ اسے منشیات کا عادی قرار دیا۔ بہت سے مردوں کے ساتھ اس کے تعلقات کے حوالے سے اس پر الزامات لگائے، یہاں تک کہ اس پر شوٹ کے دوران اپنی رقم اور شوٹ کے لیے استعمال ہونے والی جیولری کی چوری تک کے الزامات لگائے۔

زینی نے اگلے دن اخبارات میں اس پریس کانفرنس کی تفصیلات کو بے حد دلچسپی سے پڑھا۔ اسے کسی ایک بات، ایک جھوٹ، ایک الزام پر غصہ نہیں آیا تھا۔

وہ شیر از نہیں تھا جس کی زبان سے نکلنے والے لفظ اسے مار دیتے۔ وہ اس کے لیے "کوئی آدمی" تھا اسے دلچسپی نہیں تھی، اس آدمی کے منہ سے نکلنے والے الزامات سن کر اور پڑھ کر دنیا اسے کیا سمجھتی تھی۔

مگر اس پریس کانفرنس کی تفصیلات پڑھنے کے کچھ دیر بعد ہی تبریز پاشا نے اسے فون کیا تھا۔ وہ پچھلے کچھ دن میں اخبار میں آنے والے اسکینڈل کے بارے میں تمام خبریں پڑھ رہا تھا اور وہ پری زاد کے شوبز میں امیج کے حوالے سے بہت زیادہ تحفظات رکھتا تھا۔ اس لیے وہ پری زاد سے اس سارے مسئلے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

اس نے پندرہ منٹ زینی کی بات سنی اس کے بعد اس سے کہا کہ وہ اس کے لیے فوری طور پر گھر کا انتظام کر رہا ہے وہ فاران کا دلوایا ہوا گھر چھوڑ دے۔

اس نے زینی کو وہ سارے لیگل نوٹس بھی ڈرائیور کے ہاتھ اسے بھجوا دینے کے بارے میں کہا تھا، جو فاران نے اسے بھجوائے تھے۔

شام کو زینی ڈیفنس کے علاقے میں ہی ایک نئے بنگلے میں منتقل ہو چکی تھی اور وہ اب بے حد ریلیکس ہو گئی تھی۔ تبریز پاشا فوری طور پر اس کے لیے فرشتہ بن کر آیا تھا۔

اگلی صبح کے اخبار میں اس کے اسکینڈل کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ یہ زینی کے لیے ناقابل یقین بات تھی۔ وہ اگلے دو تین دن اخباروں کا ڈھیر لے کر بیٹھی رہی۔ کسی اخبار میں اس کے حوالے سے کوئی منفی خبر نہیں تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ تبریز پاشا اپنی فلم کی ہیروئن کو فلم آنے سے پہلے ہی تباہ ہونے دیتا۔ اسے صرف چند ڈوریاں ہلانا پڑی تھیں۔ اور اخباروں نے فاران کی باتیں شائع کرنا بند کر دی تھیں۔ فاران یک دم جیسے کہیں غائب ہو گیا تھا۔ تبریز پاشا نے اس مسئلے کو کیسے حل کیا یا فاران کے ساتھ کیا Settlement کی، زینی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ لیکن یہ ضروری ہوا تھا کہ اب پہلے کی طرح اس کو جو Crank calls آنے لگی تھیں، ان کا سلسلہ یک دم بند ہو گیا تھا اور فاران نے اس سے دوبارہ بھی رابطے کی کوشش نہیں کی۔

وہ سیڑھی کے دوسرے ڈنڈے پر چڑھ آئی تھی اور فاران نام کا باب اس کی زندگی سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

"انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا امی کہ انہوں نے مجھے نہیں رکھنا، مجھے طلاق چاہیے تو وہ مجھے بھجوا سکتے ہیں یا پھر میں ان کے نام پر بیٹھی رہوں، لیکن دوبارہ اپنے گھر لے کر نہیں جائیں گے وہ۔"

زہرہ نے سسکتے ہوئے نفیسہ اور ربیعہ کو بتایا تھا۔ وہ آج اپنی چھوٹی بیٹی کو لے کر نعیم کی دوکان پر گئی تھی۔ نعیم نے ہر طرح کا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے گالیوں کے ساتھ اس کی بے عزتی کی۔

"تم اس سے کہتیں کہ وہ تمہارا نہ سہی، بچوں کا ہی کچھ خرچ اٹھا لے۔" نفیسہ نے بیٹی کو روتے دیکھ کر رنجیدگی سے کہا۔

"امی! وہ کچھ نہیں دیں گے مجھے، وہ مجھے دیکھ کر اتنا آگ بگولہ ہو رہے تھے تو پیسے مانگنے پر تو ----" زہرہ بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگی۔

"میری بچیوں کا تو کسی کو بھی خیال نہیں ہے۔ نہ ان کے باپ کو، نہ آپ کو۔" زہرہ نے ماں سے گلہ کیا۔

"میں نے کیا کیا زہرہ؟" نفیسہ کو جیسے دکھ ہوا۔

"زینی بار بار پیسے بھیج رہی ہے۔ اور آپ بار بار اس کے پیسے واپس کر دیتی ہیں۔ کتنے مسئلے حل کر سکتے ہیں وہ پیسے ہمارے۔" زہرہ نے بالآخر آج اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"اس کا نام مت لیں آپا! اس کے اسی پیسے کی وجہ سے ابو کی جان گئی اور آپ چاہتی ہیں کہ اب ہم وہی پیسہ استعمال کرنے لگیں۔" ربیعہ نے تڑپ کر نفیسہ کے کچھ کہنے سے پہلے زہرہ سے کہا تھا۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ کتنی دیر یہی سب کچھ لے کر بیٹھی رہو گی تم۔ آخر بہن ہے وہ ہماری۔ ہماری مدد کرنا چاہتی ہے تو کیا غلط کرنا چاہتی ہے۔" زہرہ نے ربیعہ کی بات کاٹ کر کہا۔

"حرام کے پیسے سے مدد......"

زہرہ نے ایک بار پھر اسی طرح سسکتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"چھوڑ دو یہ حرام حلال کی تکرار...... پیسہ صرف پیسہ ہوتا ہے۔ کوئی حرام حلال نہیں ہوتا۔ آج ہمارے پاس پیسے ہوتے تو بھرے بازار میں نعیم میری بے عزتی کرتے؟ ٹھیک کیا زینی نے جو کیا۔ عیش تو کر رہی ہے نا۔ آرام سے گھر میں تو بیٹھی ہے نا۔ ہماری طرح چند روپوں کے لیے دھکے کھاتی تو نہیں پھر رہی۔"

زہرہ روتے ہوئے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ ربیعہ اور نفیسہ جیسے ساکت وصامت صحن میں بیٹھی رہیں۔

زہرہ میں آنے والی تبدیلی اچانک نہیں تھی۔ وہ پچھلے چند دنوں سے بار بار زینی کا ذکر چھیڑتی تھی۔ لیکن ان دونوں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنے کھلے لفظوں میں زینی کی حمایت کرے گی۔

گھر کی حالت واقعی خراب تھی۔ بجلی کٹ چکی تھی۔ انہوں نے ہمسائے کے گھر سے ایک تار لے کر بلب لگایا ہوا تھا۔ محلے کے وہ گھر اب آہستہ آہستہ ان چھوٹی بڑی رقموں کا تقاضا کرنے لگے تھے۔ جو ضیا کی تدفین اور تدفین کے بعد مختلف اخراجات کے سلسلے میں نفیسہ نے لوگوں سے لی تھیں۔ گھر کی بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں۔ اب تک بک چکی تھیں۔ ضیا کیا گئے تھے۔ اس گھر کے رزق سے برکت چلی گئی تھی۔

سلمان ایک دوکان پر سیلز مین کر رہا تھا۔ زہرہ چھوٹی موٹی سلائی کرنے لگی تھی اور ربیعہ اسکول میں پڑھانے کے بعد گھر میں ٹیوشنز بھی پڑھاتی۔ اس کے باوجود ان کی گزر بسر بے حد تنگ دستی کی حالت میں ہو رہی تھی۔ ضیاء کی پنشن کے لیے چکر لگاتے لگاتے سلمان نے تھک ہار کر وہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔

وہ نہ تو ٹرانسپورٹ کے اتنے لمبے چوڑے کرائے دے سکتا تھا۔ نہ ہی روز روز چھٹی لے سکتا تھا۔

زینی کا حال احوال محلے کی عورتوں کی ذریعے نفیسہ اور باقی لوگوں کو پتا چلتا رہتا تھا۔ کیونکہ وہ اب ایک ماڈل تھی۔ سلیمان جس دکان میں کام کرتا تھا۔ اس سڑک پر ایک بل بورڈ پر اس کی بڑی بہن کا چہرہ روز اس کو نظر آتا تھا اور وہ روز اس بل بورڈ کے آگے سے گزرتے ہوئے شرم سے پانی پانی ہو جاتا یوں جیسے ساری دنیا یہ جانتی ہو کہ وہ اس کی بہن تھی۔

اس نے کبھی گھر میں جا کر ماں یا بہنوں کو اس بل بورڈ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ مگر اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ چہرہ زینی کا ہو سکتا تھا۔ اس کی تہجد گزار بہن اس طرح...... اسے یقین نہیں آتا تھا۔

محلے کی عورتیں اب جب نفیسہ کے گھر آتیں تو زینی کے بارے میں کچھ اور انداز سے بات کرتیں۔ ان کے انداز میں اب دلچسپی، تجسس اور اشتیاق ہوتا اور حسرت بھی۔

یوں جیسے زینی ایک ایسی دنیا میں چلی گئی تھی جس میں جانے کی سب کو خواہش تھی۔

چند ماہ پہلے تک ان کے لہجے میں زینی کے لیے جھلکنے والا شک، شبہ، حقارت، ملامت اور ترس اب یک دم غائب ہو گیا تھا۔ اور یہ تبدیلی

نفیسہ نے نوٹ نہیں کی تھی۔ ربیعہ نے کی تھی۔

"زینی آ کر ملنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی؟"

"سنا ہے پیسے بھجواتی ہے؟"

"کہاں رہتی ہے؟"

"کئی دفعہ یہاں اپنے ڈرائیور کے ساتھ اتنی لمبی سی گاڑی میں آ کر بیٹھی ہوتی ہے۔"

"ایسے شان دار اور اچھے کپڑے ہوتے ہیں اس کے۔"

"تم لوگوں کو کیا اپنے ساتھ لے جا رہی ہے وہ؟"

"سنا ہے بہت بڑے بنگلے میں رہتی ہے وہ۔"

"پتا ہے سفیر خان کے ساتھ ہیروئن آ رہی ہے۔"

"ہائے اللہ... زینی ناچے گی کیسے؟"

"اتنی اسمارٹ ہو گئی ہے زینی کہ کیا بتاؤں؟ پتہ نہیں جیولری کہاں سے لے کر پہنتی ہے وہ۔"

"میں نے تو زینی کو کبھی ایک جوڑا دوسری بار پہنے نہیں دیکھا۔ یہ اتنے کپڑے کون دیتا ہے اسے۔"

"اتنی خوبصورت لگتی ہے وہ، پتا نہیں میک اپ کہاں سے کرواتی ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ میک اپ کیا ہے۔"

"اب تو لوگ پری زاد کہتے ہیں اسے۔"

"یہ پری زاد نام کا مطلب کیا ہوا خالہ؟"

"میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ فلم میں کام کرنے کے پانچ لاکھ ملیں گے۔ اے ہائے خالہ... ! زینی کے پاس تو بہت پیسہ آ گیا۔ کیسے خرچ کرے گی اسے۔"

"میرا تو دل چاہتا ہے زینی سے ملنے کا۔ پتا نہیں اب ہمیں پہچانے گی بھی یا نہیں۔"

"رات کو میں نے ٹی وی پر دیکھا ہے۔ وزیراعظم کے ساتھ کھڑی تھی۔ دوسری ایکٹرسوں کے ساتھ۔ سب سے اچھی لگ رہی تھی۔"

"خالہ! زینی کا ایڈریس یا فون نمبر ہے تو مجھے دیں، مجھے ملنا ہے اس سے۔ بڑا جی چاہتا ہے۔"

"اس بار اس کا ڈرائیور آئے تو مجھ کو بتانا خالہ! میں نے زینی کا پتہ لینا ہے اس سے۔"

"اب غصہ تھوک بھی دو خالہ۔ بیٹی اتنی بڑی اسٹار بن رہی ہے اور تم ابھی تک ناراض ہو اس سے۔"

کون کہتا ہے، رنگ صرف گرگٹ بدلتا ہے یا آسمان... انسانوں سے زیادہ تیزی سے رنگ کوئی نہیں بدلتا۔

نفیسہ کے گھر میں پہلے بھی زینی کا ہی ذکر ہوتا تھا۔ آج بھی زینی کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایسا ممکن نہیں تھا کہ محلے کی کوئی عورت، کوئی لڑکی ان کے

گھر آئے اور زینی کے بارے میں کچھ پوچھ کر یا بتا کر نہ جائے۔

زہرہ، ربیعہ، نفیسہ پہلے سر جھکا کر شرمندگی سے زینی کا تذکرہ سنتی تھیں اور اب سر اٹھا کر حیرانی سے۔ آخر دنیا... سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ لوگوں کی زبان کیوں بدلتی رہتی ہے۔ انسانوں کو کیا ہو جاتا ہے۔

کسی کو یہ دلچسپی نہیں تھی کہ ضیا جیسے نیک اور ایمان دار انسان کے اہل خانہ کس حالت میں جی رہے تھے۔ ان کے مسائل کیا تھے؟ انہیں کس چیز میں مدد کی ضرورت تھی۔ وہ کس طرح تین کے بجائے دو وقت کا کھانا کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

وہاں ہر ایک کو یہ دلچسپی تھی کہ پری زاد کہاں رہتی تھی۔ کس طرح رہتی تھی۔ کتنے پیسے کماتی تھی۔ کس ماڈل کی گاڑی میں پھرتی تھی۔ کتنے کنال کے گھر میں رہتی تھی۔ کتنے اہم لوگوں کے ساتھ نظر آتی تھی۔ کتنی ماڈرن اور اسٹائلش ہو گئی تھی۔

مقابلہ ایک بار پھر ضیاء اور زینب کے بیچ تھا۔ مقابلہ ایک بار پھر زینب جیت رہی تھی۔

نفیسہ نے اس دن زینی کے جہیز کی ساری چیزوں کو دھوپ لگوانے کے لیے نکلوا کر باہر صحن میں رکھا تھا۔

اس میں زینی کی شادی کا جوڑا بھی تھا۔ اس جوڑے کو دیکھتے ہوئے انہیں بے اختیار رونا آ گیا۔

کتنے چاؤ سے ایک ایک چیز بنائی تھی اس نے۔ چار چار دن لگا کر ایک ایک دوپٹہ کاڑھا۔

”ایسی تو نہیں تھی میری زینی۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا اسے۔“ نفیسہ نے بھرائی ہوئی آواز میں ربیعہ سے کہا۔ جو ان کے ساتھ مل کر وہ کپڑے باہر لائی تھی۔ ربیعہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا وہ صرف سرد مہری سے اس دوپٹے کو دیکھتی رہی۔ اسے ماں کی طرح زینی پر ترس نہیں آیا تھا۔ شاید آ جاتا اگر ان کی زندگی میں پچھلے چھ ماہ نہ آئے ہوتے۔

نفیسہ تو ماں تھیں ان کپڑوں اور چیزوں کو دیکھ کر انہیں زینی کی وہ خوشی، وہ ہنسی یاد آ گئی تھی جو وہ انہیں خریدتے انہیں بناتے ہوئے محسوس کرتی تھی۔

ایک ایک پھول، ایک ایک پتہ، ایک ایک ٹانکہ، کوئی ان کپڑوں کو دیکھ کر با آسانی بتا سکتا تھا کہ وہ ایک ہی لڑکی کے ہاتھ کے ہیں۔ اور جس لڑکی کے ہاتھ کے ہیں اس نے ان چیزوں کو بنانے میں جی جان ماری ہو گی۔ اپنے دن رات لگا دیے ہوں گے۔

نفیسہ اس کی شادی کا لباس گود میں لیے بہت دیر بیٹھ کر روتی رہیں۔ اس کی شادی کے دوپٹے کے کچھ حصے پر گوٹا کناری ابھی بھی باقی تھا۔ زینی نے حسب عادت سوئی دوپٹے کے ساتھ ہی اٹکا کر رکھی ہوئی تھی۔ وہ سوئی ابھی بھی وہیں تھی۔ وہ دوپٹہ ابھی بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ نفیسہ کو ایک بار پھر سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔ وہ وہیں اسی صحن میں، اسی تخت پر سارا سارا دن اس دوپٹے کو گود میں لیے بیٹھی رہتی تھی۔ کسی کو صاف ہاتھ بھی نہ لگانے دیتی کہ کہیں ہاتھ کی قدرتی چکنائی کا کوئی داغ، کوئی دھبہ دوپٹے پر نہ آ جائے۔ اور ہر روز کا کام ختم کرنے کے بعد انہیں دوپٹہ کا اتنا حصہ بے حد خوشی اور فخر سے دکھاتی۔

”ان چیزوں کو دھوپ کیوں لگوا رہی ہیں؟“ ربیعہ نے ان کے انہماک کو توڑا تھا۔ اس کو تو اب ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہو گی؟“

ربیعہ کا اشارہ زینی کی طرف تھا۔

"تمہارے کام آئیں گی یہ ساری چیزیں۔" نفیسہ نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس کی کوئی چیز استعمال نہیں کروں گی۔ جہیز میں لے کر جانا تو دور کی بات ہے۔ ان ساری چیزوں کو بیچ دیں۔ پھنکوا دیں۔ یا خیرات کر دیں۔ مگر میرے لیے نہ رکھیں۔ مجھے انہیں استعمال نہیں کرنا۔"

ربیعہ نے بے حد سرد مہری کے ساتھ نفیسہ کو دو ٹوک انداز میں بتایا اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

نفیسہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

زینی نے اپنے اور تبریز پاشا کے درمیان صوفے پر پڑے ڈائمنڈ سیٹ کے کھلے ڈبے کو ایک نظر دیکھا پھر تبریز پاشا کو جس کے چہرے کے تاثرات نے کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں رہنے دیا تھا۔

وہ اس فارم ہاؤس میں اپنی پہلی فلم کی مہورت کے بعد ہونے والی اپنی پہلی فلمی پارٹی میں شرکت کرنے کے لیے آئی تھی۔ انڈسٹری کی ہر بڑی ہیروئن تبریز پاشا کی اس پارٹی میں موجود تھی۔ اور فلم انڈسٹری کا ہر بڑا پروڈیوسر اور ڈائریکٹر وہاں موجود تھا۔

زینی کے لیے یہ پہلی فلمی پارٹی ضرور تھی مگر پہلی پارٹی نہیں تھی۔ وہ ماڈلنگ کا آغاز کرنے کے بعد اسی طرح کی لیٹ نائٹ پارٹیز اٹینڈ کرتی رہی تھی۔ دونوں پارٹیز کے لوازمات ایک تھے۔ شراب، ڈرگز، ڈانس اور عورتیں۔

"البتہ ان "لوازمات" کی کوالٹی میں فرق تھا۔ ماڈلنگ کے دوران اٹینڈ کی جانے والی پارٹیز میں میوزک انگلش ہوتا اور بولی جانے والی زبان بھی۔ اس فلمی پارٹی میں سب کچھ پنجابی میں تھا۔

تبریز پاشا اسے ساتھ لے کر ہر جگہ پھراتا رہا تھا۔ پروڈیوسر سے ہیروئنز تک وہ جن جن سے اسے انٹروڈیوس کروا سکتا تھا۔ اس نے کرایا تھا۔ وہ اس پارٹی میں موجود ہر چھوٹی بڑی ہیروئن کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اس پر رشک کیا جا رہا تھا۔ اس سے حسد کیا جا رہا تھا۔ اور اس سے نفرت کی جا رہی تھی۔ وہ پاشا پروڈکشنز کی نئی ہیروئن تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ انڈسٹری میں ایک نیا سورج طلوع ہونے والا تھا اور اس سورج کے طلوع ہونے سے کتنے چاندوں کو گہنانا تھا۔ ہر ایک کو یہی خدشہ تھا۔

رات ڈھلے تبریز پاشا اسے فارم ہاؤس کے اس کمرے میں لے آیا تھا اور اس پوری پارٹی میں یہ پہلا موقع تھا جب زینی خائف ہوئی تھی۔

تبریز پاشا پیے ہوئے تھا بلکہ ضرورت سے زیادہ پیے ہوئے تھا۔ مگر اس کے باوجود اپنے ہوش و حواس میں تھا۔

زینی کو کمرے میں لانے کے بعد اس نے زینی سے وہی کہا تھا جس کا زینی کو خدشہ تھا۔ کچھ دیر کے لیے زینی کے حواس جواب دے گئے تھے۔ شوبز میں یہ پہلا موقع تھا جب کوئی مرد اس سے اس طرح کا مطالبہ کر رہا تھا۔ فاران اور دوسرے بہت سے ماڈلز اور اس کے پرستار مرد اس سے فلرٹ کرنے کی یا افیئر چلانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ بڑی آسانی کے ساتھ ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیتی تھی۔

مگر تبریز پاشا۔

"میں انڈسٹری میں یہ سب کرنے نہیں آئی۔" وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تو پھر کیوں آئی ہو؟ گھر میں بیٹھتیں۔"

تبریز پاشا نے بے حد توہین آمیز انداز میں کہا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"فلم انڈسٹری کے طور طریقوں کا اب تک تو پتہ چل جانا چاہیے تھا تمہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"کھڑی مت رہو، بیٹھ جاؤ۔ یہاں کوئی تم سے زبردستی نہیں کرے گا۔" زینی کو ایک لمحے کا تامل ہوا پھر وہ اسی صوفہ پر بیٹھ گئی جہاں پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔

"میں نے تمہیں تمہارے منہ مانگے معاوضے پر سائن کیا کیوں؟ تم کوئی سپر اسٹار تو نہیں تھیں۔ ٹھیک ہے، ماڈلنگ میں تمہارا نام تھا۔ مگر جو کلاس فلمیں دیکھنے سینما آتی ہے۔ وہ کسی ماڈل کو نہیں پہچانتی۔ وہ ہیروئن کو پاشا پروڈکشنز کی ہیروئن کے نام سے جانتی ہے۔ تو تمہیں سوچنا تو چاہیے تھا کہ تم پر اتنی عنایات کیوں کر رہا ہوں میں۔"

زینی پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی اور طے کر رہی تھی کہ اس کو کیا کرنا ہے۔

"فاران والا مسئلہ ہوا تو میں نے تمہارا ساتھ دیا۔ ورنہ اخبار والے تو چار دن میں خبریں لگا کر کھا جاتے تمہیں گھر بٹھا دیتے۔ تمہیں گھر کا مسئلہ ہوا تو میں نے تمہارے لیے گھر کا انتظام کروایا۔ تمہارا کیا خیال تھا، ان سب چیزوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے پری زاد ہر چیز کی۔ انڈسٹری میں کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔ اور تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ میں یہ سب کچھ تمہارے حسن سے متاثر ہو کر تم پر نثار ہو رہا ہوں۔" تبریز پاشا کے لہجے میں تلخی نہیں تھی۔ طنز بھی نہیں تھا۔ کچھ اور تھا۔ اور وہ کچھ اور کیا تھا، زینی اسے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

تبریز پاشا اب منی بار کی ایک closet سے ایک جیولری کیس نکال رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں اس ڈبے کو لیے دوسرے ہاتھ میں شراب کا پیگ لیے اس کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور اس نے ڈبہ صوفے پر رکھتے ہوئے اسے کھول دیا۔

"تم اس انڈسٹری میں رہنا چاہتی ہو تو اس ڈبے کو اٹھا لو۔ ورنہ اس کمرے کا دروازہ وہ ہے۔ تم باہر چلی جاؤ مگر یہ یاد رکھو، یہ تبریز پاشا کے کمرے سے باہر نکلنے کا دروازہ نہیں ہے۔ یہ انڈسٹری سے باہر جانے کا دروازہ ہے۔"

وہ اس کے برابر بیٹھا شراب پی رہا تھا اور اس کے اور زینی کے درمیان صرف "ڈائمنڈز" تھے۔ تبریز کی آواز میں کوئی ایسی چیز تھی جس نے زینی کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔

وہ سانپ اور سیڑھی کا کھیل کھیلتے کھیلتے 99 پر آ کر رک گئی تھی اور اب آگے جاتا تھا۔ یا پیچھے آتا تھا، یا اسے طے کرنا تھا۔

تبریز پاشا کے گلاس میں شراب کے چار گھونٹ تھے۔ زندگی اور موت کے درمیان بعض دفعہ چار گھونٹ کا فاصلہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

کرم علی کو شیخ سعد بن جابر کے اصطبل میں کام کیسے ملا اور کیوں ملا یہ شیخ جابر کا ملازم بننے کے تین دن تک کرم کو پتا نہیں چلا۔ اور صرف وہی نہیں کویت میں اس کے شناسا باقی سارے لوگ بھی اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ تین دن تک خود وہ بھی اپنی قسمت پر رشک کرتا رہا تھا۔ تیسرے دن سب بدل گیا تھا۔

سعود بن جابر کا اصطبل کویت کے سب سے بہترین اصطبلوں میں سے ایک تھا اور وہاں کا کوئی ملازم ایسا نہیں تھا جو تربیت یافتہ یا تجربہ کار نہ ہو، صرف کرم علی ایسا تھا جس نے گھوڑوں کی تصویریں دیکھی تھیں یا پھر انہیں پاکستان میں تانگے میں جتا دیکھا تھا مگر کسی گھوڑے کو ہاتھ لگانا تو ایک طرف وہ کبھی کسی گھوڑے کے قریب تک نہیں گیا تھا اور اب وہ دنیا کے مہنگے ترین گھوڑوں والے اصطبل میں ایک سائیس کے نائب کے طور پر متعین کر دیا گیا تھا۔

اور اس حیثیت میں اسے رہائش کے لیے جو کمرہ اور سہولیات دی گئی تھی، انہوں نے کرم علی کو زندگی میں پہلی بار صحیح معنوں میں حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ کویت کی سبزی منڈی میں سبزیوں کی دکان میں سوتے سوتے اب جس اصطبل کی رہائش گاہ میں آیا تھا وہ دو کمرے اور اٹیچ باتھ روم اور کچن پر مشتمل ایک ائیر کنڈیشنڈ اور فلی فرنشڈ کوارٹر تھا۔ کرم علی کم از کم ایک گھنٹہ ایک ہی جگہ کھڑے ادھر سے ادھر اپنے پیروں پر گھومتا رہا اس کوارٹر میں بلاشبہ سب سے عجیب اور غیر موزوں چیز خود وہی تھا۔ کرم کو خود سے اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ہوا۔

سبزی منڈی سے اصطبل کا سفر اس کے لئے جیسے حقیقت سے خواب تک کا سفر تھا۔ وہ اس دن بھی منڈی میں کریٹ ہی اتار رہا تھا جب ایک کویتی اور ایک پاکستانی اس کے پاس آئے تھے۔

''شیخ سعود بن جابر کے اصطبل میں کام کرو گے؟''

اس پاکستانی نے اس کا نام دریافت کرتے ہی اس سے پوچھا۔ وہ ہونقوں کی طرح ان دونوں کا منہ دیکھتا رہا۔ اسے لگا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔

''آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں؟'' کرم علی نے تکتے ہوئے اس پاکستانی سے پوچھا۔

''ہاں شیخ کے اصطبل میں ایک کام کرنے والے کی ضرورت ہے۔'' اس پاکستانی نے اس کی حیرت اور تعجب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ اس کی دکان کا پاکستانی مالک بڑی تیزی سے اس کے قریب آ گیا اور اس نے کرم علی سے کہا۔

''تمہیں ضرور شیخ کے لیے کام کرنا چاہیے۔ ایسا موقع روز روز تھوڑی ملتا ہے۔'' کرم علی نے اس بار حیرانی سے آصف بھٹہ کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی سہولت سے اسے یہ آفر قبول کرنے کو کہے گا۔

''آپ جانتے ہیں انہیں؟'' کرم علی نے آصف بھٹہ سے پوچھا۔

''میں کیا پورا کویت جانتا ہے شیخ سعود جابر کو۔ تم بس دیر نہ کرو۔ فوراً ان کے ساتھ چلے جاؤ۔'' اسے آصف بھٹہ کے انداز پر حیرت ہوئی۔

آخر اتنی جلدی کیا تھی ان کے ساتھ بھیجنے کی۔ وہاں کام کرنے والے دوسرے مزدور بھی اب ان کے آس پاس کھڑے ہوئے تھے۔

"لیکن میں اس اصطبل میں کیا کام کروں گا؟ مجھے تو "

پاکستانی نے اس بار اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ تمہیں وہاں جا کر پتہ چلے گا۔ یہاں کھڑے کھڑے کیسے بتائیں۔"

"ہاں ہاں، تم اطمینان سے ان لوگوں کے ساتھ چلے جاؤ۔ جو بھی کام ملے کر لینا۔" آصف بھٹہ نے ایک بار پھر مداخلت کی۔ "تم جاؤ۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور ان کے ساتھ چلے جاؤ۔"

"ابھی ؟" کرم علی نے کچھ کہنا چاہا مگر اس پاکستانی نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں ابھی اور اسی وقت ہم صرف تمہیں لینے ہی آئے ہیں۔"

کرم علی مجمع میں کھڑا کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں باری باری آصف بھٹہ اور ان دو لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے لینے آئے تھے مگر کیوں؟ کیا انہیں اصطبل میں کسی کام کرنے والے کی ضرورت تھی؟ یا پھر صرف اسی کی ضرورت تھی؟ اور وہ کیا وہ اسے پہلے سے کسی حوالے سے جانتے تھے؟ کس حوالے سے؟ اور وہ اس کا نام کیسے جانتے تھے۔ ایک کے بعد ایک سوال، اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ مگر اس کے پاس اب وہاں بیٹھے ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لیے وقت نہیں تھا۔

پندرہ منٹوں میں اپنا سامان اٹھا کر جس گاڑی میں وہ شیخ سعود بن جابر کے اصطبل کی طرف روانہ ہوا تھا وہ ایک لیموزین تھی۔

اکیس سال کی عمر میں کرم علی نے پہلی بار لیموزین میں سفر کیا تھا۔ اس وقت اس کا خیال تھا وہ لیموزین میں اس کا آخری سفر بھی تھا۔

اور پھر وہ اس کوارٹر میں آ گیا تھا۔ وہاں اس جیسے کوارٹرز کی ایک لمبی قطار تھی اور اس جیسے ملازمین کی ایک بڑی تعداد مگر ان میں اور کرم علی میں فرق یہ تھا کہ ان سب کو اپنے اپنے کاموں کا پتہ تھا۔ صرف کرم علی تھا جسے یہ پتا نہیں تھا کہ اسے کس کام کے لیے رکھا گیا تھا اور اسے کیا کرنا تھا۔ وہ ہر روز صبح اصطبل چلا جاتا اور پھر منتظر رہتا کہ کوئی اسے کوئی کام کرنے کو کہے گا مگر کوئی اسے کوئی کام نہیں کہتا تھا۔ ہر ایک میکانکی انداز میں اپنے اپنے کام میں مصروف رہتا اور وقتاً فوقتاً اس کو عجیب نظروں سے دیکھتا رہتا۔ ان کی نظریں عجیب تھیں یہ کرم علی کو وہاں پہلے دن آتے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔

اصطبل میں ایک آدھ کے علاوہ کوئی پاکستانی نہیں تھا اور کرم علی کوشش کے باوجود ان پاکستانیوں سے بات نہیں کر سکا یا یہ کہنا زیادہ بہتر تھا کہ انہوں نے اس سے بات نہیں کی۔ وہ ان کے رویے بھی سمجھ نہیں سکا۔ مگر وہاں کی باقی چیزیں بھی کہاں سمجھ پا رہا تھا۔

شیخ سعود بن جابر کے اصطبل میں گھوڑوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی۔ کویت میں بہت سے دوسرے اصطبلوں میں سینکڑوں کی تعداد میں گھوڑے تھے۔ مگر سعود کے اصطبل میں دنیا کی ہر بہترین نسل کا گھوڑا موجود تھا۔

سواری سے لے کر ریس کے گھوڑوں تک، ہر نایاب قسم کا گھوڑا اس کے پاس تھا اور ان گھوڑوں کے لیے اس نے دنیا کی بہترین سہولیات اور بہترین عملہ مہیا کر رکھا تھا۔ پھر ان میں کرم علی اپنے آپ کو مس فٹ نہ سمجھتا تو کیا سمجھتا۔

شیخ سعود بن جابر کو اس نے وہاں اپنے آنے کے تیسرے دن ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ اس سائیس کے ساتھ چند گھوڑوں کو باہر لا رہا تھا۔ جب رائڈنگ گیئر میں ملبوس ایک آدمی گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کی طرف آیا تھا۔ اس نے سائیس اور آس پاس کے چند دوسرے ملازمین کو یک دم محتاط ہوتے دیکھا۔ اس وقت تک اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ شیخ سعود بن جابر ہو سکتا تھا کیونکہ وہ اسے کوئی ادھیڑ عمر بوڑھا آدمی سمجھ رہا تھا مگر وہ چالیس سال کی عمر کا ایک بے حد ہینڈسم اور لمبا مرد تھا۔

اس کے قریب آنے پر دوسرے ملازموں کی طرح اس نے بھی اسے سلام کیا تھا۔

سعود بن جابر کی نظریں کچھ دیر تک اس پر جمی رہیں پھر اس نے سائیس سے انگریزی میں کچھ کہا۔ سائیس نے جواباً کچھ کہا اس بار سعود بن جابر نے اسے دیکھا اور پھر بے حد صاف اردو میں اس سے کہا۔

"اپنی شرٹ اتار دو۔"

"کرم علی کو اس کے منہ سے اردو سن کر جتنا جھٹکا لگا تھا، اس جملے کو سن کر اس سے زیادہ شاک لگا۔ وہ اس وقت نیکر اور شرٹ میں ملبوس تھا۔ وہ تقریباً اسی طرح کا لباس تھا جو وہاں کام کرنے والے زیادہ تر ملازم پہنے ہوئے تھے اور اب شیخ سعود بن جابر اسے سب کے سامنے شرٹ اتارنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ کرم نے پچھلے کئی سالوں میں برص کا مرض ظاہر ہونے کے بعد کبھی کسی کے سامنے اپنی شرٹ نہیں اتاری تھی اور کہاں یہ کہ یہاں کھلے عام سب کے سامنے وہ اپنی شرٹ اتار دیتا۔ گویا جو راز وہ پچھلے اٹھارہ سالوں سے چھپائے پھر رہا تھا، اسے بیچ چوراہے میں فاش کر دیتا۔ اس کا حلق یک دم خشک ہو گیا تھا اسے شدید حبس کا احساس ہوا تھا۔

"اپنی شرٹ اتار دو۔"

اس بار سعود بن جابر نے بے حد کرخت لہجے میں اس سے کہا اور اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہتا یا کرتا دو ملازم آگے بڑھے تھے اور انہوں نے چند سیکنڈز میں کرم علی کی شرٹ اتار دی۔ کرم علی نے مزاحمت نہیں کی۔ مزاحمت بے کار تھی۔ وہاں موجود ہر شخص کی نظریں کرم علی کے پیٹ اور کمر پر موجود برص پر جم گئی تھیں اور کرم علی کی نظریں سعود بن جابر کے گھوڑے کے پیروں پر۔

اس نے اپنے جسم کے بال کھڑے ہوتے ہوئے محسوس کیے تھے۔ سعود بن جابر اب اپنے گھوڑے پر بیٹھا اسے آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے کرم علی کے گرد چکر لگا رہا تھا اور چکر لگانے کے ساتھ ساتھ وہ بڑی سنجیدگی سے کرم علی کے جسم پر موجود ان نشانات کو دیکھ رہا تھا، پھر جیسے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے اس نے کرم علی سے پوچھا۔

"جسم پر اور بھی کہیں برص کے داغ ہیں؟" اس بار اس کے لہجے میں پہلے جیسی کرختگی نہیں تھی۔ کرم علی نے گھوڑے کے پیروں سے نظریں اٹھا کر سعود کو دیکھا اور پھر خشک ہوتے ہوئے حلق کے ساتھ کہا۔

"نہیں۔"

"شرٹ پہن لو۔" سعود نے اس سے کہا اور پھر سائیس سے ایک بار پھر انگلش میں کچھ کہنے لگا۔ کرم علی نے اس دوسرے ملازم کے ہاتھ

سے شرٹ لے کر پہن لی، جس نے اس کی شرٹ اتار دی تھی۔

سعود بن جابر کا رویہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔ مگر باقی سب کچھ کہاں اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ سعود بن جابر صرف چند منٹ اور وہاں ٹھہرا تھا۔ پھر اسی طرح گھوڑا دوڑاتے اور کرم علی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

کرم علی کا خیال تھا کوئی نہ کوئی اب اسے وہاں سے چلے جانے کے لیے کہے گا۔ برص دیکھنے کے بعد یہی ہونا چاہیے تھا، اس کا خیال ایک بار پھر غلط نکلا تھا۔ کسی نے اسے وہاں سے جانے کے لیے نہیں کہا۔ برص کے ان داغوں کو دیکھ کر بھی نہیں، کچھ نہ کچھ غلط ضرور تھا مگر غلط کیا تھا؟ یہ کرم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہاں کام کرنے والا ہر شخص اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ مگر اس فاصلے میں کرم کو نفرت یا حقارت کی جھلک نہیں آ رہی تھی اور یہ چیز بھی اسے الجھا رہی تھی یہ نفرت اور حقارت نہیں تھی تو پھر کیا چیز تھی جو ان سب کو اس سے دور رکھ رہی تھی۔ وہاں آمد کے ساتویں دن اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا۔

اس دن اپنے کوارٹر میں جا کر بہت دیر تک کرم اس پورے واقعہ کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ ہتک کا احساس بے حد شدید تھا مگر پیسے کی ضرورت اس سے زیادہ شدید۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں سے چلا جائے اور اس کا دماغ اس سے کہہ رہا تھا وہ یہ حماقت نہ کرے۔ آخر اس کا گیا ہی کیا ہے۔ صرف اس کی شرٹ ہی تو بارہ پندرہ لوگوں کے بیچ میں اتروائی گئی تھی اور تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

وہ اب ایک عربی شیخ کا ملازم تھا اور وہ چاہتا تو اس کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کر سکتا تھا۔ وہ اپنے میل جول کے لوگوں سے عربوں کے اپنے ملازموں کے ساتھ بدسلوکی کے قصے سنتا رہا تھا اور یہ بدسلوکی تو ان قصوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ کم از کم ایسی نہیں کہ وہ اس ملازمت کو چھوڑ کر چلا جائے۔

وہ بار بار خود کو تسلیاں دے رہا تھا۔ مگر اس کے اندر ہونے والی چبھن بے حد شدید تھی وہ ساری رات روتا رہا تھا۔ اپنے گھر سے نکلنے کے بعد وہ کویت آنے کے بعد کئی بار رویا تھا۔ مگر زندگی میں پہلی بار یہاں آ کر وہ بے بسی کے احساس سے رو رہا تھا۔ پہلی بار اسے وہ ساری زنجیریں تکلیف دینے لگی تھیں۔ جنہوں نے اس کے مقدر اور رزق کو شیخ سعود بن جابر کے اصطبل کا حصہ بنا دیا تھا۔

اگلی صبح وہ پھر ٹھیک تھا۔ جب کام کرنا تھا تو پھر رو کر کیا اور ہنس کر کیا۔ سعود بن جابر سے ساتویں دن تک اس کا دوبارہ سامنا نہیں ہوا، وہ دوبارہ اس کا سامنا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

اصطبل میں بظاہر سب کچھ نارمل تھا مگر کرم کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اصطبل کے عملے میں ایک عجیب طرح کی بے چینی اور پریشانی پائی جا رہی تھی۔

اصطبل کے ڈاکٹر ہر وقت ایک کے بعد ایک گھوڑے کا معائنہ کرتے نظر آتے تھے۔ گھوڑوں کو دیا جانے والا چارہ عجیب طرح کے حفاظتی اقدامات میں اصطبل سے باہر سے منگوایا جاتا تھا اور پھر چند خاص افراد ہی اس چارے کو گھوڑوں کو دیتے تھے۔ گھوڑوں کو دی جانے والی باقی خوراک بھی سیلڈ ہوتی تھی اور وہی افراد انہیں گھوڑوں تک پہنچاتے تھے۔ یہی حال اس پانی کا تھا، جو گھوڑوں کو پلایا جا رہا تھا۔ اصطبل میں کام کرنے والے کسی

آدمی کی رسائی پانی کے اس ذخیرہ تک نہیں تھی۔ جس کا پانی ان گھوڑوں تک نلکوں کے ذریعے پہنچایا جاتا تھا۔

اصطبل کے تمام ملازمین اپنی اپنی شفٹ میں جب وہاں کام کرنے جاتے تو ان کی مکمل طور پر تلاشی لی جاتی تھی وہاں سو کے قریب گھوڑے تھے۔ اور ان سو گھوڑوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے تقریباً پانچ سو کے قریب عملہ اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس عملے کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا اور ان میں سے زیادہ تر تعداد Vets کی تھی۔

کرم علی کی سمجھ میں یہ سب کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے زندگی میں چاہے اس طرح کا کوئی اصطبل پہلے نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ اتنا اندازہ ضرور کر سکتا تھا کہ اصطبل اس طرح ڈاکٹرز سے بھرے نہیں ہوتے۔ پھر اس اصطبل میں کیا مسئلہ تھا۔ اصطبل میں کوئی گھوڑا بیمار بھی نہیں نظر آ رہا تھا۔ پھر ڈاکٹرز کی اس فوج کا کیا مطلب تھا؟

چھٹے دن گھوڑوں کو باہر پھرانے کے لیے نہیں نکالا گیا اور ساتویں دن کرم علی نے سعود بن جابر کو خود بھی اصطبل میں پایا۔ وہ بے حد فکر مند انداز میں ایک ایک گھوڑے کے پاس جا رہا تھا۔ کرم علی کی بہت کوشش تھی کہ سعود بن جابر سے اس کا سامنا نہ ہو مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ کئی بار اس سے ٹکرایا اور ہر بار سامنا ہونے پر کرم علی کو اس کی نظریں بے حد عجیب لگیں۔

کرم علی کا خیال تھا شفٹ ختم ہونے پر وہ وہاں سے چلا جائے گا۔ مگر اسے بتایا گیا کہ اسے اس رات بھی اصطبل میں ہی رہنا تھا۔

"کیوں؟"

اس کا جواب بھی کسی کے پاس نہیں تھا۔

وہ رات کرم نے اصطبل کے ایک کونے میں بیٹھے سوتے جاگتے گزاری۔ وضو کر کے فجر کی نماز بھی اس نے وہیں اسی کونے میں پڑھی اور نماز کے بعد کس وقت اسے نیند آ گئی اسے پتہ نہیں چلا وہ وہیں زمین پر لیٹ کر سو گیا تھا۔

دوبارہ اس کی آنکھ گیارہ بجے کے قریب کھلی تھی اور کرم علی ہڑبڑا کر اٹھ گیا تھا۔

اصطبل میں معمول کے مطابق سرگرمیاں جاری تھیں، گھوڑوں کو دو دن کے وقفے کے بعد اصطبل سے نکالا جا رہا تھا۔ کرم علی کچھ دیر بیٹھا اپنے حواس بحال کرتا رہا پھر اس کی نظر اپنے سے کچھ فاصلے پر کرسی پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں پر پڑی، جو اس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے وہ انہیں سعود بن جابر کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔

شاید وہ اس کے سیکریٹری تھے۔ یا کسی اور طرح کے مددگار۔

کرم علی نے قدرے شرمندگی کے عالم میں آنکھیں مسلتے ہوئے انہیں دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح وہاں بیٹھے بیٹھے سو جائے گا۔ اسے اٹھتے دیکھ کر وہ آدمی بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اسے ایک لفافہ تھمایا۔ کرم علی کچھ حیرانی کے ساتھ اس لفافے کو دیکھتا رہا پھر اسے کھول کر دیکھنے لگا اور اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ اس لفافے میں کویتی دینار تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ کرم کے سمجھے بڑھتے جا رہے تھے۔ اصطبل میں کام کرنے والے لوگ اس وقت بھی کرم کو دیکھ رہے تھے اور وہ ان کی

نظروں کو سمجھنے میں ایک بار پھر ناکام ہو رہا تھا۔

کچھ دیر اس لفافے کو ہاتھ میں بے مقصد پکڑے رہنے کے بعد کرم علی بالآخر اس سائیس کے پاس گیا جس کے مددگار کے طور پر وہ کام کر رہا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں اسے اس لفافے کا قصہ سنانے کی کوشش کی مگر اس نے پوری بات سننے سے پہلے ہی اسے ٹوک دیا اور اسے بتایا کہ وہ لفافہ اس کے لیے شیخ سعود بن جابر نے بھجوایا تھا۔

"کیوں؟" اس سوال کا جواب سائیس نے نہیں دیا۔ اس نے اس کو کوارٹر میں جا کر آرام کرنے کے لیے کہا اور ساتھ اس سے یہ بھی کہا کہ اسے ہر روز وہاں آ کر کام کرنے کی ضرورت نہیں، اس کا جب جی چاہے وہ آ کر کام کرے۔ جی نہ چاہے تو نہ کرے۔ کرم علی کو لگا وہاں سب اس کے ساتھ مذاق کرنے لگے تھے۔ کوشش کیے بغیر کام کا ملنا اور کام کیے بغیر پیسے۔ ایسا کہاں ہوتا تھا۔ کیا صرف شیخ سعود بن جابر کے اصطبل میں؟ یا پھر وہاں صرف اس کے ساتھ، کیونکہ وہ وہاں باقی تو ہر شخص کو کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ تقریباً اسی طرح کام کرتے اور جان مارتے جیسے شیخ سعود کے اصطبل میں آنے سے پہلے تک وہ کیا کرتا تھا۔

کوارٹر میں آ کر اس نے وہ دینار گنے وہ ایک ہزار دینار تھے۔ اس نے اس رقم کو اسی طرح رکھ دیا۔ یہ وہ رقم نہیں تھی جس کے لیے اس نے محنت کی تھی اور اسے خرچ کر سکتا تھا اسے لگا آج اگر اسے ہزار دینار دیے گئے تھے تو کل اس سے ہزار دینار واپس بھی مانگے جا سکتے تھے۔

سہ پہر کے قریب وہ وہاں سے باہر جانے کے لیے گیٹ پر آیا وہ آصف بھٹہ کے پاس جانا چاہتا تھا۔ کچھ دوسرے ساتھیوں سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ انہیں بتانا چاہتا تھا۔

گیٹ پر کھڑے گارڈز نے اسے باہر جانے نہیں دیا۔

"شیخ کا حکم نہیں ہے۔" ان میں سے ایک نے اسے بتایا تھا۔

کرم علی کو لگا جیسے وہ کچھ غلط وقت پر باہر جانے کے لیے نکلا تھا۔ اس لیے اسے روکا گیا۔ اس نے گارڈ سے پوچھا کہ وہ کس وقت باہر جانے کے لیے نکل سکتا ہے۔

"کسی وقت پر بھی نہیں۔" اسی گارڈ نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"شیخ نے کہا ہے کہ آپ یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔"

کرم علی کو صحیح معنوں میں پسینہ آ گیا تھا۔ "تو کیا وہ وہاں قیدی تھا؟"

وہ واپس کوارٹر میں آ گیا اور ایک بار پھر ہزار دینار سے بھرے ہوئے لفافے کو نکال کر دیکھنے لگا۔ اسے اب غصہ آ رہا تھا شیخ سعود بن جابر پر اس اصطبل پر اور اپنے آپ پر، وہ آصف بھٹہ کی دکان پر کھڑے شیخ سعود کے دو آدمیوں کے ساتھ آنے سے انکار کر دیتا تو کوئی اسے کیسے یہاں لا سکتا تھا۔ یہ کرم علی کی غلط فہمی تھی۔ وہ وہاں آنے سے انکار کر دیتا تو بھی اسے اس اصطبل میں لے آیا جاتا کیونکہ شیخ سعود بن جابر کو اپنے گھوڑوں کی زندگی کے لیے کرم علی کے وجود کی ضرورت تھی۔

اس رات سعود بن جابر سے اس کی دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس بار وہ پچھلی رات ملاقات کی طرح سنجیدہ نہیں تھا وہ اس ولا کے ایک کمرے کے بار میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ جب کرم علی کو ایک ملازم وہاں چھوڑ کر آیا۔ اس نے پرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے اس طرح کرم کا استقبال کیا تھا، جیسے وہ طویل عرصے کے بعد کسی دوست سے مل رہا ہو۔ صرف فرق یہ تھا کہ وہ کرم علی کے پاس نہیں آیا تھا اور کرم علی سے گلے ملا تھا نہ اس نے کرم علی سے ہاتھ ملایا تھا مگر اس نے کرم علی کا حال احوال بے حد گرمجوشی سے پوچھنے کے بعد اسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا اور خود اس کمرے میں موجود منی بار پر کھڑے ہو کر اپنے لیے شراب کا پیگ تیار کرنے لگا تھا۔

اس کے کہنے کے باوجود کرم علی فوری طور پر بیٹھ نہیں سکا۔ وہ کمرہ اس قدر شاندار تھا کہ کرم علی کو لگا وہ کسی کرسی یا صوفے پر بیٹھے گا تو وہ خراب ہو جائیں گے۔ حالانکہ وہ بے حد صاف ستھرے لباس میں تھا پھر بھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ سعود بن جابر نے بغیر مڑے اپنے کام میں مصروف اس سے کہا تھا یوں جیسے اسے پتہ ہو کہ وہ ابھی بھی کھڑا ہوگا۔

اس بار کرم علی ہمت کر کے ایک کرسی پر بیٹھ ہی گیا تھا۔

”کیا لو گے؟“ سعود نے بے حد دوستانہ انداز میں اپنا گلاس تیار کر کے پلٹتے ہوئے اس سے پوچھا اور ساتھ ہی ایک کے بعد ایک شراب کا نام لیتا گیا۔

کرم علی ہونقوں کی طرح اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس نے زندگی میں وہ نام بھی نہیں سنے تھے۔ مگر وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ بار پر کھڑے ہو کر وہ اسے شراب کے علاوہ کسی اور مشروب کا نہیں پوچھ سکتا تھا۔

سعود اب منتظر تھا کہ وہ کچھ کہے مگر کرم علی کے حلق سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ سعود شراب کے سپ لیتا ہوا بے حد تیکھی نظروں سے اسے دیکھتا اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔

”نہیں، مجھے کچھ نہیں چاہیے؟“ کرم علی نے بالآخر اپنا خشک سا منہ کھولا۔

”تم یہاں سے کہاں جانا چاہتے تھے؟“ سعود بلا توقف اپنے اصلی موضوع پر آ گیا تھا۔

وہ اب بار سے ہٹ کر کرم علی سے کچھ فاصلے پر موجود ایک کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ کرم علی فوری طور پر اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ وہ کچھ اور نروس ہو گیا تھا۔ صرف چند گھنٹے پہلے ہی تو اس نے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ اور چند گھنٹوں میں ہی سعود اس سے اس بارے میں پوچھ رہا تھا۔ یقیناً کرم علی کے بارے میں ہر خبر اس تک پہنچائی جا رہی تھی۔

”میں ۔۔۔ میں اپنے کچھ دوستوں سے ملنا چاہتا تھا۔“ کرم علی نے بالآخر کہا۔

”تم وسید کو بتا دو وہ تمہارے دوستوں کو یہیں بلا لے گا۔“ سعود نے وہاں کے انتظامی امور کے نگران کا نام لیتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں یہاں سے باہر کیوں نہیں جا سکتا؟“ کرم علی نے بالآخر وہ سوال کیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ سعود نے جواب دینے کے بجائے شراب کے گلاس سے ایک سپ لیا کرم علی منتظر نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ جواب نہیں آیا۔

"مجھے یہاں کس لیے لے کر آئے ہیں، کام کے لیے تو نہیں لے کر آئے؟ اور مجھے ہزار دینار کس لیے دیے ہیں۔ میں نے کیا کیا ہے؟"
کرم علی اب یکے بعد دیگرے سوال کرنے لگا۔ شیخ سعود بن جابر سے اب وہ خوف اور جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی جو اس سے پہلے ہوتی رہی تھی۔

سعود اس کے چہرے کو خاموشی سے دیکھتا رہا پھر اس نے شراب کا گلاس رکھ دیا۔
ساڑھے پانچ ماہ سے شیخ سعود بن جابر کے اصطبل کے گھوڑے یکے بعد دیگرے بغیر کسی وجہ کے مر رہے تھے۔ ہر ہفتے ایک گھوڑا، شروع کے چند ہفتے سعود نے اسے ایک اتفاق سمجھا۔ مگر جب یہ سلسلہ جاری رہا تو اس نے اسے سازش سمجھا۔ ہر مہینے گھوڑوں کا طبی معائنہ کیا جاتا تھا، وہ معائنہ ہر ہفتے ہونے لگا گھوڑوں میں کسی قسم کی کوئی بیماری نہیں تھی۔

اور مرنے والے گھوڑوں کے جسم میں بھی زہر خوانی کے کوئی اثرات نہیں تھے۔ اس کے باوجود سعود نے بہت سا پرانا عملہ نکال دیا۔ اور بہت سا نیا عملہ رکھا گھوڑے مرتے رہے، سعود حفاظتی اقدامات اور علاج معالجہ کے انتظامات بہترین سے بہترین کرتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ خود اس اصطبل کے ساتھ منسلک ولا میں مستقل طور پر رہنے لگا اور اس کے دن رات کا بڑا حصہ ان گھوڑوں کے ساتھ گزرنے لگا۔ اس کے باوجود ہر ساتویں دن ایک گھوڑا اچانک زمین پر گرتا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتا۔ اور جب تک ڈاکٹرز یا اصطبل کا عملہ کچھ کرپاتا وہ گھوڑا ختم ہو چکا ہوتا۔ پچھلے تین ماہ سے سعود بن جابر کے سامنے یہ گھوڑے مر رہے تھے اور وہ بے بسی سے انہیں مرتا دیکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سلسلہ

Orlando polish Arabian نسل کے گھوڑوں کے مرنے سے شروع ہوا تھا اور اب تک دس مختلف نسلوں کے گھوڑے مر چکے تھے۔ آخری مرنے والے دو گھوڑے Percheron stallion تھے۔ اور ان گھوڑوں کی موت کے ساتھ ہی سعود بن جابر کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ وہ اس کے بہترین اور پسندیدہ ترین گھوڑوں میں سے تھے۔

وہ توہم پرست نہیں تھا مگر مجبور ہو گیا تھا کہ اسے کالا جادو سمجھتا وہ اپنے قبیلے کے کسی بڑے کی ہدایت پر کسی دوسرے قبیلے کے ایک بدو سے ملا تھا اور کرم علی کی وہاں آمد اس ٹوٹکے کا نتیجہ تھی۔ جو اس بدو نے بتایا تھا۔

عرب کے قبائل میں برسوں سے اگر کسی کے اصطبل کے گھوڑے اس طرح مرنے لگتے جس طرح سعود بن جابر کے اصطبل کے مر رہے تھے تو وہ کسی عجمی نسل کے ایسے آدمی کو اپنے اصطبل میں لا رکھتا جس کے پیٹ اور کمر پر برص کے داغ ہوتے اور اس کے علاوہ اس کے جسم پر کہیں اور برص نہ ہوتا۔ ایسا آدمی ڈھونڈنا اس لیے مشکل ہوتا تھا کیونکہ برص عام طور پر کسی بھی آدمی کے کمر اور پیٹ پر پہلے ظاہر نہیں ہوتا تھا اور اگر وہاں ظاہر ہوتا بھی تو ساتھ ہی ہاتھوں پیروں اور چہرے پر بھی نمودار ہونا شروع ہو جاتا۔

کرم علی ان لوگوں میں شامل تھا جن کے پیٹ اور پشت پر برص ظاہر ہونے کے بعد رک گیا تھا۔

سعود بن جابر کے لوگوں نے کویت میں ایسے کسی آدمی کی فوری طور پر تلاش شروع کر دی تھی اور یہ تلاش انہیں آصف بھٹہ کے پاس لے آئی تھی اس کی دکان سعود بن جابر کے ملکیتی علاقے کے ایک بازار میں تھی اور سعود بن جابر کے کسی ہرکارے کے استفسار پر اس نے انہیں کرم علی کے

بارے میں بتایا تھا۔ وہ نہ بتاتا اگر اسے بھاری انعام میں دلچسپی نہ ہوتی جو سعود بن جابر کے لوگ ایسے کسی آدمی کے بارے میں اطلاع پہنچانے پر دینے کا اعلان کر رہے تھے۔ آصف کو یہ یقین نہیں تھا کہ کرم کی پشت پر یا جسم کے کسی اور حصے پر برص تھا یا نہیں مگر اس نے کرم علی کے پیٹ پر برص کے داغ بہت عرصے پہلے دیکھے تھے اور وہ اس کے ذہن میں تھے۔ کرم علی نے تب کوئی کریٹ اٹھا کر رکھتے ہوئے اپنے چہرے اور گردن کا پسینہ اپنی قمیص کا دامن اٹھا کر صاف کیا تھا۔ اور اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ آصف بھٹہ کی نظر اس کے پیٹ کے اس حصے پر پڑ گئی تھی جہاں برص تھا۔

اور اب اس واقعہ کے دو سال بعد آصف بھٹہ نے بڑے آرام سے اس کے بارے میں سعود بن جابر کے آدمیوں کو بتا دیا تھا اور وہ خوش قسمت تھا کہ کرم علی کی پشت پر بھی برص نکل آیا تھا۔ اگر نہ نکلتا تو آصف اس رقم سے محروم رہ جاتا جو اس نے کرم کے بارے میں اطلاع دے کر حاصل کی تھی۔

کرم علی کو وہاں لانے کے بعد اس ہفتے کوئی گھوڑا نہیں مرا تھا۔ صدیوں پرانا استعمال ہونے والا ٹوٹکا اب بھی کارگر ثابت ہوا تھا۔ کرم علی ہی وہ آدمی تھا۔ جو سعود کے گھوڑوں کو بچا سکتا تھا اور اس بار وہ ہزار دینار، سعود کے کسی گھوڑے کو کسی ممکنہ موت سے بچانے کے لیے کرم علی کی اجرت یا انعام تھا۔

کرم علی منہ کھولے شیخ سعود بن جابر کی باتیں سن رہا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے سعود بن جابر کی باتیں ایک من گھڑت قصہ لگ رہا تھا۔ مگر یہ بات سعود کو کہنے کا مطلب ہوتا کہ وہ اسے جھوٹا کہتا اور وہ کم از کم اتنا احمق نہیں تھا۔

اس نے زندگی میں کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ برص کا وہ مرض جسے وہ ساری عمر چھپاتا پھرا تھا اسے کسی شیخ کے پاس اس کے گھوڑوں کی زندگی بچانے کے لیے لے آئے گا۔

شیخ سعود بن جابر اب اپنے شراب کے گلاس کو دوبارہ بھر رہا تھا۔

''میں تمہارا بہت احسان مند ہوں۔ تمہاری وجہ سے میرے گھوڑے مرنا بند ہو گئے ہیں۔ اس ہفتہ کوئی گھوڑا نہیں مرا اس بدو نے کہا تھا کہ اگر اس ہفتہ گھوڑے ٹھیک رہے تو پھر تب تک انہیں کچھ نہیں ہوگا جب تک تم یہاں رہو گے۔''

''لیکن میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔''

کرم علی نے فوراً کہا۔ سعود اس کے جملے پر فوراً سے پیشتر پلٹا۔

''کیوں؟ یہاں کیا پریشانی ہے تمہیں؟ سب کچھ تو مل رہا ہے تمہیں، جو نہیں مل رہا وہ بھی بتا دو میں وہ بھی دے دوں گا۔'' سعود اس بار سنجیدہ تھا۔

''تمہیں کسی دوست سے ملنا ہو وہ یہاں آ جائے گا۔ پاکستان فون پر بات کرنا ہے وہ بھی یہاں سے کر سکتے ہو پاکستان پیسے بھجوانا چاہتے ہو ولید کو بتا دو۔ وہ بھجوا دے گا۔ تمہارے خاندان کو کوئی مسئلہ ہوا تو ولید اسے بھی حل کر دے گا۔ کوئی شراب، کوئی عورت چاہیے ولید تمہیں وہ بھی مہیا کر دے گا۔ تفریح کا کوئی اور سامان چاہیے وہ بھی مل جائے گا۔ صرف تمہیں یہاں سے باہر نہیں جانا، ویسے تو کوئی تمہیں یہاں سے باہر جانے بھی نہیں دے گا۔''

سعود نے بے حد صاف لفظوں میں اس سے کہا۔ کرم علی دم سادھے اس کی بات سنتا رہا پھر اس نے کہا۔

''اور مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟'' سعود بن جابر اس کے سوال پر کچھ دیر اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اس نے شراب کا ایک گھونٹ

پیتے ہوئے کہا۔

"جب تک تم زندہ ہو یا جب تک تمہارا برص جسم کے کسی دوسرے حصے پر آنا نہیں شروع ہو جاتا۔"

"ہر ہفتے گھوڑوں کو کچھ نہ ہونے کی صورت میں تمہیں ایک ہزار دینار ملیں گے تم اس رقم کو جیسے چاہو خرچ کرو۔ تمہارے باقی سارے اخراجات میرے ذمہ ہیں۔" سعود بن جابر نے کہا کرم علی کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس کا احسان مند ہو یا اس سے نفرت کرے۔ اس کی آزادی چھین کر اسے پیسہ دے رہا تھا۔ اور وہ پیسہ پاکستان میں اس کے گھر والوں کی زندگیاں بدل دینے والا تھا۔ مگر وہ اس کی زندگی بھی بدل دینے والا تھا۔

کرم علی کا دل چاہا وہ کچھ دیر کے لئے چلائے، شور مچائے ہنگامہ کرے۔ سعود بن جابر کو جتنی شدید اس کی ضرورت تھی وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ مگر پھر اسے لگا کہ اس کا شور مچانا بے کار ہے۔ وہ اس ملک میں کیا کر سکتا تھا جو اس کا اپنا نہیں تھا۔ وہ اس وقت تک ماؤف ذہن کے ساتھ سعود بن جابر کے سامنے بیٹھا رہا جب تک اس نے اسے اپنے پاس سے چلے جانے کے لیے نہیں کہا۔

اس رات بھی وہ سو نہیں سکا جاگتا رہا، باری باری ان سب چہروں کو یاد کرتا رہا جنہیں اب وہ کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کے چہرے اور عارفہ کا چہرہ اس نے سوچنے کی کوشش کی تھی کہ کیا اس سے کوئی گناہ ہوا تھا کیا اس نے کسی کا دل دکھایا تھا؟ کوئی دھوکا؟ کوئی جھوٹ؟ کوئی فریب؟

اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ اسے واقعی کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ کرم علی نے زندگی میں واقعی کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ البتہ اسے ہر وہ تکلیف ضرور یاد تھی جو دوسرے اسے پہنچاتے رہے تھے۔ پھر وہ کون سا گناہ تھا جو کرم علی کو وہاں لے آیا تھا وہ جتنا سوچتا جیسے پاگل ہونے لگتا۔ اسے بار بار سال پہلے اس لانچ میں مرجانے والے جذام زدہ اس لڑکے کی لاش یاد آتی جسے اس کی آنکھوں کے سامنے سمندر میں پھینک دیا گیا تھا اس کا گناہ یہ تھا کہ اس نے یہ ہونے دیا تھا۔ لیکن وہ اس وقت بے بس تھا۔ چاہتا بھی تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ آج بے بس ہے۔

اگلے دن وہ اصطبل اور اس دارے سے باہر نکلنے کے راستے ڈھونڈتا رہا۔ اسے احساس ہوا یہ بھی بے حد دشوار تھا۔ اصطبل کے دو تین ملازم سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہتے تھے، وہ وہاں سے کسی بھی طرح بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اگلے دن ولید کو کویت میں اپنے کچھ پاکستانی دوستوں کے ایڈریس اور فون نمبر دے کر کہا کہ وہ ان سے ملنا چاہتا تھا۔

دو دن بعد اس کا ایک دوست بے حد ہراساں انداز میں ایک گاڑی میں وہاں لایا گیا اور پھر ایک اور اردو بولنے والا کویتی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کرم علی کو ولید پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اسے اپنے کسی دوست سے اس ساری صورت حال کا ذکر نہیں کرنا ورنہ اس کے دوست کو بھی اس کی طرح وہاں سے باہر نہیں نکلنے دیا جائے گا۔

کرم علی پھر بھی کسی نہ کسی طرح اپنے دوست کو اپنی حالت اور مصیبت کے بارے میں بتانا چاہتا تھا شاید وہ کچھ کر سکتا شاید ایمبیسی کچھ کر سکتی، شاید حکومت پاکستان کچھ کر پاتی لیکن اردو جاننے والے اس کویتی کی موجودگی میں وہ اپنے دوست سے کیا کہتا۔ وہ دونوں صرف ایک دوسرے کا اور ایک دوسرے کے گھر والوں کا حال احوال دریافت کرتے رہے۔ اس کے دوست کو اس کویتی کی اس کے پاس موجودگی کھٹک رہی تھی۔ مگر اس کویتی نے اپنا تعارف کرم علی کے دوست کے طور پر کروایا تھا اور کرم علی نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات پر سر ہلا کر تائید کی تھی۔

''میرے لیے بھی یہیں اصطبل میں کہیں کام دیکھو۔'' اس کے دوست نے اس سے کہا۔

کرم کا جی چاہا وہ اس سے کہے کہ وہ بہت خوش قسمت ہے جو اس اصطبل میں نہیں ہے۔ ''ہاں میں دیکھوں گا۔'' کرم نے سر ہلا کر اس سے کہا۔ ایک گھنٹہ کی ملاقات میں کرم علی کا ذہن مکمل طور پر کہیں نہ کہیں بھٹکتا رہا تھا۔

اسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ اس کا وہ دوست یا اس کے باقی دوستوں میں سے کوئی بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سب چھوٹے لوگ تھے جن کے وجود سے ان کے خاندانوں کے چولہے جلتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کویت میں غیر قانونی طور پر رہ رہے تھے اور جو قانونی طور پر آتے تھے، وہ اپنے کفیل کے ہاتھوں خوار ہو رہے تھے۔ ان میں سے کوئی اس کے لیے کیا کرتا۔ کون پولیس اسٹیشن جا کر شیخ سعود بن جابر کے خلاف حبس بے جا کی رپورٹ درج کروا سکتا تھا اور رپورٹ درج ہو بھی جاتی تو وہ کویت سے ڈی پورٹ ہو جاتا اس کا کفیل اسے زبردستی واپس بھجوا دیتا اور سعود بن جابر کے ولا سے پھر بھی کرم علی برآمد ہوتا نہ ہوتا لیکن ایک خاندان کے لوگوں کی زندگیاں اور رزق ضرور کرم علی کی وجہ سے جاتا۔

وہ کسی دوست سے پہلی اور آخری ملاقات تھی جو اس نے وہاں کی تھی۔ اس نے دوبارہ کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور کسی میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ کوئی سعود بن جابر کے ولا میں کرم علی سے ملنے آتا یا ہو سکتا ہے کوئی ملنے آیا بھی ہو مگر اس کو پتہ نہ چلا ہو۔

اصطبل میں دوسرے ہفتے بھی کوئی گھوڑا نہیں مرا۔ کرم علی کو ایک ہزار دینار اور دیے گئے۔ اس کے پاس اب دو ہزار دینار تھے اور ان دو ہزار دیناروں کے لیے اسے کسی قسم کی محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ اس نے پچھلے چار سالوں میں بھی کویت میں دو ہفتوں میں دو ہزار دینار نہیں کمائے تھے۔ وہ کئی گھنٹے ان دیناروں کو ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہا۔ وہ ایک عمر قید کاٹنے والے کو ملنے والا معاوضہ تھا۔

اگلے دن وہ دو ہزار دینار اس نے اپنے گھر والوں کو پاکستان بھجوا دیے تھے۔ اس نے پچھلے ہفتوں میں دو بار ان سے فون پر بات کی تھی۔ اس فون کے دوران بھی وہ کویتی اس کے پاس بیٹھا رہا۔

اس نے دو ہی بار فون پر عارفہ سے بات کی تھی۔ اس وقت پہلی بار اس کا دل چاہا وہ اس سے کہے کہ وہ اس کا انتظار نہ کرے۔ اسے اب واپس نہیں آنا تھا مگر وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکا۔ وہ اتنی محبت اور گرم جوشی کے ساتھ اس کا حال احوال پوچھتی رہی تھی کہ وہ اس سے سچ نہیں بول سکا۔

تیسرے ہفتے بھی اصطبل کا کوئی گھوڑا نہیں مرا تھا شیخ سعود بن جابر نے اس ہفتے اپنے ولا میں ایک جشن کا اہتمام کیا تھا۔ کرم علی کو ایک ہزار کے بجائے دو ہزار دینار دیے گئے اور اس رات اس کے لیے ولا میں منگوائی ہوئی عورتوں میں سے ایک عورت اور شراب بھی بھجوائی گئی۔ سعود بن جابر اصطبل میں اس کی دل بستگی کا سامان کر رہا تھا۔ کرم علی نے دونوں چیزیں واپس بھجوا دیں وہ جب آزاد تھا تب بھی اسے ان دونوں چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اب تو وہ ایک غلام تھا۔

چوتھے ہفتے کرم علی نے دعا کی تھی کہ اس ہفتے گھوڑا مر جائے شاید اس طرح اس کو وہاں سے نجات مل جاتی اس نے سعود بن جابر سے یہ واقعی نہیں پوچھا تھا کہ اگر اس کی وہاں موجودگی میں بھی گھوڑے مرتے رہتے تو پھر کیا ہوتا۔ یقیناً پھر اسے وہاں سے نجات مل جاتی۔ یک دم جیسے اسے ایک موہوم سی امید پیدا ہوئی تھی۔ چوتھے ہفتے بھی کسی گھوڑے کو کچھ نہیں ہوا تھا۔

اور اس ہفتے سعود بن جابر سے کرم علی کی دوبارہ ملاقات ہوئی سعود بن جابر پہلے سے بھی زیادہ گرم جوشی سے کرم سے ملا تھا اور اس بار اس نے وہی سوال کیا تھا جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے ذہن میں بار بار آ رہا تھا۔

"اگر میرے یہاں رہتے ہوئے بھی گھوڑے مرتے رہے تو یا دوبارہ مرنے لگے تو؟"

سعود بن جابر کے چہرے کی مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی۔ کرم علی جانتا تھا اس کا سوال غلط تھا اور نامناسب بھی مگر جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا اس میں وہ کسی مناسب یا غیر مناسب چیز کی کیا پروا کرتا۔

"اس بدو نے کہا تھا کہ ایک برص زدہ آدمی کے آجانے سے یہ سلسلہ رک جائے گا اور یہ سلسلہ رک گیا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ سلسلہ ایک بار رک گیا تو دوبارہ شروع نہیں ہوگا۔" سعود بن جابر نے بے حد جتانے والے انداز میں کہا۔

"لیکن اگر پھر ہونے لگا تو؟" کرم نے ایک بار پھر وہی سوال کیا۔ سعود بن جابر پلکیں جھپکائے بغیر بہت دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"اس بدو نے کہا تھا کہ اگر یہ سلسلہ نہ رکا اور رکنے کے بعد دوبارہ شروع ہو گیا تو پھر اس برص زدہ آدمی کو مرنا پڑے گا۔"

کرم علی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے لگا سعود بن جابر نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ مگر اس سعود بن جابر کے چہرے پر مذاق کی کوئی رمق نظر نہ آئی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"اس لیے تم دعا کرو کہ یہ سلسلہ دوبارہ شروع نہ ہو۔" سعود بن جابر نے شراب کا اگلا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ اب کرم علی کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ ایک برص زدہ آدمی کی تلاش اتنی رازداری سے کیوں کی گئی تھی۔ سعود بن جابر اخبار میں اشتہار دیتا تو سینکڑوں نہیں تو درجنوں لوگ اسے ان علامات کے ساتھ کہیں بھی مل جاتے مگر اس کے ساتھ ہی اخبار کا یہ اشتہار بہت سے دوسرے لوگوں کی نظروں میں آتا اور بدوؤں کی یہ روایت کسی نہ کسی طرح منظر عام پر آ جاتی۔ اور یہ منظر عام پر آ جاتا تو اس کے لیے اس آدمی کو اس طرح غائب کرنا یا ضرورت پڑنے پر جان سے مار دینا آسان نہیں ہوتا۔

سعود بن جابر کو ایک برص زدہ آدمی کی ضرورت نہیں تھی، قربانی کے ایک جانور کی ضرورت تھی اور کرم علی کی شکل میں اسے وہ جانور مل گیا تھا اور کرم علی ایک دن پہلے تک یہ دعا کرتا پھر رہا تھا کہ سعود بن جابر کے گھوڑے پھر مرنے لگیں۔ یہ جانے بغیر کہ پہلے اگر ان گھوڑوں کی زندگی اس کے وجود کی محتاج تھی تو اب اس کا وجود گھوڑوں کی زندگی تھی۔

چار ہفتوں میں ایک بار اسے کسی گھوڑے کی زندگی اور موت میں دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے یہ ہفتے کا ساتواں دن کوئی معنی نہیں رکھتا تھا اور اب وہ ہفتے میں ایک بار ضرور مرتا تھا۔ ساتویں دن کا ایک ایک لمحہ گھونٹ گھونٹ موت کی صورت میں اس کے اندر اترتا تھا۔ یوں جیسے کوئی ریوالور کے چیمبر میں سے کسی ایک میں گولی ڈال کر اسے گھما دے پھر اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ کر باری باری پانچ دفعہ ٹریگر دبائے اور پھر ریوالور یہ کہہ کر ہٹا لے کہ گولی چھٹے چیمبر میں ہے۔

اور کرم علی نے اس اذیت کو ایک دن، ایک ہفتہ، ایک مہینہ یا ایک سال نہیں جھیلا تھا۔ اس نے اگلے تین سال اسی اصطبل میں جیتے مرتے باہر کی دنیا سے مکمل طور پر کٹ کر گزارے تھے۔

تین سالوں میں حادثاتی طور پر اور طبعی طور پر ایک آدھ گھوڑے کی ہلاکت ہوئی بھی تھی مگر اصطبل کے کسی آدمی کو اب اس بات کا اندیشہ تک نہیں تھا کہ اصطبل کے گھوڑوں کو اب تین سال پہلے جیسا کوئی مسئلہ درپیش ہو سکتا تھا۔ وہاں کام کرنے والا کوئی شخص اب ہفتے کے دنوں کی گنتی نہیں کرتا تھا سوائے ایک آدمی کرم علی کے۔

تین سال میں اس نے موت کا انتظار کیا تھا یا پھر برص کے مرض کے دوبارہ ظاہر ہونے کا۔ دونوں میں سے کوئی بھی نمودار نہیں ہوا تھا۔ کسی نے کرم علی سے زیادہ لمبی موت نما زندگی نہیں پائی ہوگی۔ اس وقت کرم علی کا یہی خیال تھا۔

تین سال نے اس کے ظاہر کو جتنا بدلا تھا۔ اندر کو اس سے زیادہ تبدیل کر دیا تھا۔ ہر ہفتے ملنے والے ایک ہزار دینار ہر مہینے جمع کر کے وہ اسی طرح پاکستان بھجوا دیتا تھا اس نے تین سال میں ان دیناروں میں سے ایک دینار بھی خرچ نہیں کیا تھا اور ہر ماہ اتنی بڑی رقم پاکستان بھجواتے رہنے سے اس کے خاندان کی مالی حالت اور بھی اچھی ہو گئی تھی۔

وہ جانتے تھے کہ اب کرم علی شیخ کے اصطبل میں کام کرتا تھا۔ کیا کام کرتا تھا؟ یہ ان میں سے کسی نے کبھی کرم علی سے نہیں پوچھا۔ یہ پوچھنا ضروری تھا بھی نہیں اور ان تین سالوں میں کرم علی باقاعدگی سے فون پر ان سب سے بات کرتا رہا اور بار بار اس چبھن کا شکار ہوتا رہا کہ ان میں سے کسی کو اس کی پاکستان آمد کا انتظار نہیں تھا۔ صرف اس رقم کا انتظار رہتا تھا جو وہ پاکستان بھجواتا تھا۔ وہ اگر اس کے پاکستان آنے کے بارے میں پوچھتے بھی تھے تو اتنے سرسری انداز میں کہ کرم علی کو شاید کوئی لمبی چوڑی وضاحت بھی دینی نہیں پڑتی تھی۔ اسی سانس میں دوسرا جملہ کوئی مطالبہ ہوتا تھا۔ اس کی ایسی ہر فون کال کے دوران کوئی نہ کوئی آدمی موجود ہوتا تھا نہ بھی ہوتا تو کرم علی اپنی فیملی کو اپنی مصیبت کے بارے میں نہ بتاتا۔

اسے لگتا تھا اس کی تکلیف ان کے لیے تب تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک وہ انہیں اتنی بڑی بڑی رقوم بھجوا رہا تھا۔

تین سال میں صرف عارفہ تھی جس کا وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ وہ کبھی کھل کر اسے یہ نہیں بتا سکا تھا کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ اس کا انتظار نہ کرے، کسی اور کے ساتھ شادی کر لے۔ بہت بار اس نے عارفہ سے یہ کہنا چاہا لیکن کوئی نہ کوئی چیز آڑے آتی رہی۔ کبھی عارفہ کی کوئی بات، اس کی ہنسی، کبھی کرم کی جھجک، مناسب الفاظ کے انتخاب کی کوشش اور کبھی فون کٹ جاتا۔ اور پھر سب کچھ جیسے اگلے ہفتے پر چلا جاتا تھا۔

اس نے کئی بار عارفہ سے بات کرنا بھی چھوڑا صرف اسی خواہش میں کہ وہ اس کی بے اعتنائی پر اس سے متنفر ہو جائے یا اسے اس کی نیت اور ارادے پر ہی کوئی شبہ ہو کہ شاید وہ واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ شاید وہ اس سے اب شادی کرنا نہیں چاہتا، شاید وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں ہے۔

کئی کئی ہفتے اسے فون نہ کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فون کرتا اور چند چھوٹے موٹے گلوں کے بعد سب کچھ پھر وہیں پر آ جاتا۔

عارفہ کو اس پر اندھا اعتماد تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اس پر شک کرتی یا اسے کبھی شک ہوا بھی ہو تو اس نے کرم علی سے اس کا اظہار نہیں

کیا۔ وہ اس کی زندگی کے 28 ویں سال کا انتظار کر رہی تھی جب کرم علی کو واپس آ جانا تھا اور ایک موہوم سی امید اور آس کے ساتھ جڑی ہوئی تھی کہ شاید وہ اس سے بہت پہلے واپس آ جائے۔ شادی کے لیے نہ سہی، ویسے ہی سہی۔ وہ ہر خط میں یہ لکھتی، وہ اس کے ہر خط کو ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں بار تو ضرور پڑھتا اور اس کے ضمیر کا بوجھ بڑھتا جاتا۔ وہ اسے دھوکا دے رہا تھا اس کے ساتھ جو کچھ کر رہا تھا غلط کر رہا تھا۔

وہ جانتا تھا وہ اس کی زندگی کے سال ضائع کر رہا ہے کرم علی کی خاموشی اگر کسی کو نقصان پہنچا رہی تھی تو وہ عارفہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی۔

ہر بار اس کا خط پڑھنے پر وہ خود سے وعدہ کرتا کہ اس بار وہ اسے کہہ دے گا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا، وہ اس کے انتظار میں اپنی زندگی ضائع نہ کرے۔ اس نے بہت خطوں میں عارفہ کو یہ بات لکھی بھی مگر کبھی کسی خط کو پوسٹ کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ یہ اس کی خود غرضی تھی یا بزدلی یا پھر عارفہ سے محبت۔ وہ یہ طے نہیں کر پایا تھا۔

تین سال کرم علی اگر چاہتا تو وہ اپنے کوارٹر میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر گزار دیتا۔ کم از کم مسعود بن جابر نے کھلے لفظوں میں اس سے یہی کہا تھا مگر کرم علی دن میں آٹھ گھنٹے اصطبل میں کام کرتا بعض دفعہ آٹھ گھنٹوں سے بھی زیادہ، وہ جانوروں کے ساتھ پہلی بار اتنا وقت گزار رہا تھا۔ بعض دفعہ اسے لگتا تھا جیسے وہ ان کی زبان سمجھنے لگا تھا۔ ان کے احساسات، ان کے جذبات وہاں اصطبل میں بندھے گھوڑے اسے اپنے جیسے مجبور اور بے بس لگتے تھے یا اس سے کچھ کم بے بس جانوروں سے یہ محبت اس نے شیخ مسعود بن جابر کے اصطبل میں سیکھی تھی اور پھر یہ ساری عمر اس کے ساتھ رہی۔

تین سال میں اس نے صرف کام نہیں کیا تھا۔ عبادت بھی بہت زیادہ کی تھی۔ وہاں سے نکلنے کے لیے، اس مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے اس نے ہر وہ وظیفہ پڑھا تھا، جو اسے یاد آیا تھا۔ پہلا ایک سال تو وہ دن رات قرآن پڑھنے کے علاوہ کچھ اور کرتا ہی نہیں تھا۔ سارا دن وہ اصطبل میں کام کرتا اور ساری رات قرآن پڑھتا رہتا خاص طور پر ہر ہفتے کی ساتویں رات کو جب اس کی زندگی داؤ پر لگتی تھی۔ خوف تھا یا کیا تھا مگر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ وہ بے خوابی کا شکار ہو گیا تھا اور اس حالت میں وہ قرآن لے کر بیٹھا رہتا۔

پہلے سال کے بعد اس نے وظیفے چھوڑ دیے تھے۔ وہ صرف قرآن پڑھتا نماز پڑھتا، تہجد پڑھتا۔ اپنی آزمائش پر جیسے اسے صبر آنے لگا تھا۔ اسے لگتا وہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرح مچھلی کے پیٹ میں ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کبھی باہر آ سکے گا یا نہیں۔

تین سال تک وہ ہر روز صبح آنکھ کھلنے پر اور رات کو سونے سے پہلے اپنے جسم کے ہر حصے کو دیکھتا۔ وہ برص جس کے اپنے جسم پر نظر آنے پر وہ کئی ہفتے خوف کا شکار رہا تھا اب وہ اسی کے جسم کے کسی دوسرے حصے پر نظر آنے کی دعا مانگتا رہا تھا۔ وہ برص اس کے لیے جیسے اسم اعظم بن گیا تھا، جسے پڑھ کر وہ وہاں سے نکل سکتا تھا۔

اور تین سال بعد اسے بہر حال اپنی دائیں ران پر وہ ننھا سا دھبہ نظر آ گیا تھا۔ جس نے اسے مچھلی کے اس پیٹ سے نجات دلا دی تھی۔ وہ کئی گھنٹے خوشی اور بے یقینی کے عالم میں تیز دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس ننھے سے دھبے کو دیکھتا رہا۔ پھر اسے لگا جیسے وہ نظر کے دھوکے کا شکار ہو رہا تھا۔ شاید وہ دھبہ اس کے جسم پر تھا ہی نہیں لیکن جب کئی بار آنکھیں بند کرنے اور کھولنے پر بھی وہ دھبہ وہیں رہا تھا تو اسے شبہ ہونے لگا کہ وہ برص کے بجائے کسی اور چیز کا داغ بھی ہو سکتا تھا اگلے کئی دن وہ پہلے کی طرح پین لے کر اس داغ کے گرد حد بندی کرتا رہتا داغ بڑھ رہا تھا ایک ننھے سے

وجہ سے وہ ایک تنکے کے برابر ہو گیا تھا۔

تب ایک لمبے عرصے کے بعد وہ سعود بن جابر سے ملا۔ وہ یہ دیکھ کر وہ بھی اسی طرح سکتے میں آ گیا تھا جیسے کرم علی۔ بہت دیر چپ رہنے کے بعد اس نے کرم سے پوچھا۔

"یہ کب ظاہر ہوا؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"دو ہفتے پہلے۔" کرم نے کہا اور پچھلے دو ہفتوں سے برص پھیلنے کے باوجود سعود بن جابر کے کسی گھوڑے کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ سعود بن جابر کو کچھ تسلی ہوئی۔

"تو اب میں جا سکتا ہوں؟" کرم علی نے دھڑکتے دل کے ساتھ بالآخر وہ سوال کیا جس کا جواب وہ جانتا تھا۔

سعود بہت دیر چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ تین سال میں اس کی زندگی میں ہونے والی ایک ایک چیز سے واقف تھا۔ یہاں تک کہ عارفہ سے بھی۔

کرم کی فون کالز ریکارڈ ہوتی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ہر ہفتے ملنے والی رقم جوں کی توں پاکستان بھیج دیتا ہے۔ اس میں سے کچھ بھی خرچ کیے بغیر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ تین سال میں وہ اصطبل کے اچھے ملازمین میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس نے کئی بار اس کو کام کرتے دیکھا تھا اسے حیرت ہوتی تھی۔ موت کے خوف اور قید نے کام میں اس کی دلچسپی اور جانفشانی کو متاثر یا کم نہیں کیا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ وہ بے حد عبادت گزار تھا۔ تین سال میں کئی بار ولید نے اس کے کہنے پر کرم علی کے پاس عورتیں اور شراب بھجوائی اور ہر بار وہ شکریے کے ساتھ انہیں واپس بھجواتا رہا۔

تین سال میں کبھی اسے کرم علی کے کسی مطالبے، کسی فرمائش کا پتہ نہیں چلا تھا۔ اسے کرم علی پر کبھی ترس یا رحم نہیں آیا تھا مگر اس میں دلچسپی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ بالکل ویسی ہی دلچسپی جیسی اسے اپنے اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑوں سے ہوتی تھی۔ اسے کرم علی بھی اپنے اصطبل کا ایک گھوڑا لگتا تھا۔ ویسے گھوڑا جیسے گھوڑوں کے لیے سعود کچھ بھی کر سکتا تھا۔

"کہاں جاؤ گے تم؟" سعود نے بالآخر اس سے پوچھا۔

کرم علی سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی وہ اب کہاں جائے گا۔ تین سال سے کویت میں کسی شخص کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔

اس کے گھر والے بتاتے تھے کہ کویت میں اس کے پرانے دوست سمجھتے تھے کہ وہ بے حد مغرور ہو گیا تھا اور غرور میں ہی کسی سے رابطہ نہیں رکھ رہا تھا اور اب اگر وہ جا کر انہیں بتائے گا کہ وہ کس وجہ سے تو ۔

"پاکستان جاؤ گے؟" سعود بن جابر نے اسے سوچتے دیکھ کر ایک بار کہا۔

"پاکستان!" کرم علی چونک گیا۔

"اتنا پیسہ تو اس کی فیملی اب جمع کر ہی چکی ہو گی کہ وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان چلا جاتا۔ جتنا روپیہ اسے سعود بن جابر کے اصطبل میں کام کر کے تین سال میں ملا تھا اتنا پیسہ وہ اٹھائیس سال تک کہیں مزدوری کر کے بھی نہیں کما سکتا تھا۔ ہاں واقعی اسے پاکستان چلے جانا چاہیے۔ اس نے بے

حد مسرور ہو کر سوچا۔

"ہاں، میں پاکستان جاؤں گا۔" کرم نے بے ساختہ کہا۔

"اس کے بعد واپس آؤ گے۔" سعود بن جابر نے پوچھا۔

"واپس؟" کرم چونکا۔ "نہیں واپس کیوں آؤں گا؟ کچھ نہ کچھ کروں گا۔ میرے گھر والوں نے کافی رقم جمع کر لی ہوگی۔ اس سے کوئی کاروبار کر لوں گا۔"

کرم علی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ رہائی کے آثار نظر آتے ہی اس کے لہجے کا اعتماد لوٹ آیا تھا۔

"یہاں کام تو کر رہے ہو چاہو تو یہیں رہ جاؤ اسی تنخواہ میں۔" کرم علی نے چونک کر اسے دیکھا پھر بے ساختہ کہا۔

"نہیں۔ مجھے یہاں نہیں رہنا، واپس پاکستان جانا ہے۔" سعود کو وہی جواب ملا تھا جس کی وہ توقع کر رہا تھا۔

"تم ایک بے حد عجیب آدمی ہو کرم علی۔"

کرم علی نے حیرانی سے سعود بن جابر کا چہرہ دیکھا۔ اس کا دل چاہا تھا وہ اس سے کہے کہ کیا وہ اس سے بھی زیادہ عجیب انسان تھا۔ جو اپنے گھوڑوں کے لیے ایک جیتے جاگتے انسان کو قیدی بنائے ہوئے تھا اور اسے ضرورت پڑنے پر مارنے کو بھی تیار تھا۔

"اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں تو مجھے بتاؤ۔" سعود بن جابر نے بے حد فراخدلی سے کہا۔

"نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" کرم علی نے اسی انداز میں کہا۔

"جاؤ جا کر سوچو پھر مجھے بتانا۔" سعود بن جابر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

کرم علی کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ وہ شام اس کی زندگی کی سب سے اچھی شام تھی۔ اسے اگلے دن اس اصطبل سے ہمیشہ کے لیے چلے جانا تھا۔

سعود کے پاس آ کر اس نے سب سے پہلے عارفہ کو فون کیا اور اسے بے حد پر جوش لہجے میں بتایا کہ وہ چند دنوں تک پاکستان واپس آ رہا ہے۔ اس وقت یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس کے پاس ٹکٹ کے لیے پیسے تک نہیں تھے۔ عارفہ اسی کی طرح خوش ہوئی تھی اور خوشی کے ساتھ اسے حیرانی بھی ہوئی تھی۔ چند دن پہلے کے کرم علی اور آج کے کرم علی کی آواز میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"میں تمہیں سب کچھ پاکستان آ کر بتا دوں گا۔"

کرم علی نے اس سے کہا تھا، پھر اس نے دوسرا فون اپنے گھر اپنے باپ کو کیا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے اسی پر جوش انداز میں انہیں بتایا کہ وہ چند دنوں تک مستقل طور پر پاکستان آ رہا تھا۔

دوسری طرف یک دم خاموشی چھا گئی پھر کچھ دیر کے بعد جہاں واد نے بے حد تشویش بھرے انداز میں اس سے کہا۔

"لیکن کیوں بیٹا؟ اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر تم یہاں کیوں آ رہے ہو؟"

کرم علی کی ساری خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ اس کے پاس واقعی باپ کے اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

"میں" وہ بھلا یا کیا کہتا وہ چار ہزار دینار مہینے والی نوکری چھوڑ کر پاکستان کیا کرنے آ رہا تھا۔

"میں پاکستان میں کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں ابو۔" اس نے بالآخر جہاں داد سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! مگر کاروبار کے لیے کتنی رقم ہے تمہارے پاس؟"

کرم علی کچھ بول نہیں سکا "میں، میں پچھلے تین سال میں جو رقم بھجواتا رہا اس میں سے کچھ رقم بچائی تو ہوگی آپ نے۔" اس نے بالآخر کہا۔

"کہاں بیٹا! اتنی مہنگائی ہوگئی ہے پاکستان میں کہ کچھ بھی بچتا کب ہے۔ تمہیں بتایا تو تھا کہ ایک گاڑی لی ہے پچھلے سال دو دفعہ آصف کا ایکسیڈنٹ ہوا اس گاڑی پر کتنی رقم لگ گئی۔ اب بلکہ مجھے کہہ رہا تھا کہ بھائی جان سے کہیں نئی گاڑی کے لیے پیسے بھیجیں۔ کوئی نیا ماڈل بنا رہا تھا محلے میں کسی نے لیا ہے۔ اوپر کے دو کمروں میں اے سی لگوائے ہیں۔ بہت گرمی ہوتی ہے اور وہاں تمہاری ماں نے نبیلہ کا کچھ زیور بنوایا ہے۔ ایک دو کمیٹیاں ڈال کر، اب اس ماہ ابھی گھر میں Paint کروایا ہے۔ تمہارے بہن بھائی کہہ رہے تھے کہ پردے بھی بدلوانے ہیں۔ کچھ رقم میں نے کرم داد بھائی سے ادھار لی ہے کہ جیسے ہی تم بھیجو گے میں انہیں لوٹا دوں گا۔ ابھی دو ماہ تک نبیلہ کی منگنی کا فنکشن ہے۔ اس کے لیے بھی رقم چاہیے۔"

کرم علی ایک لفظ کہے بغیر چپ چاپ فون پر یہ ساری تفصیل سنتا رہا۔

"کس کا فون ہے؟" اسے فون پر اپنی ماں کی آواز دور سے آتی سنائی دی۔ "کرم علی، کہہ رہا ہے نوکری چھوڑ کر مستقل طور پر پاکستان آ رہا ہے۔" جہاں داد نے مڑ کر اسے بتایا تھا۔

"ہیں! بھلا وہ کس لیے؟" اس نے ماں کو بے حد تشویش بھرے لہجے میں کہتے سنا تھا۔

"پتہ نہیں، تم سمجھاؤ اسے، یہ حماقت نہ کرے۔"

جہاں داد نے ریسیور بیوی کو تھماتے ہوئے ہدایت کی کرم فون پر یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ چند لمحے پہلے کی خوشی اور مسرت کا احساس یک دم غائب ہو گیا تھا۔

"ہیلو..... کرم بیٹا! یہ تمہارے ابو کیا کہہ رہے ہیں۔"

زینت نے فون کا ریسیور تھامتے ہی بے حد حواس باختہ انداز میں کرم علی سے کہا۔

"کچھ نہیں امی! میں نے ویسے ہی ایک بات کی تھی۔ ایسے ہی پاکستان آپ لوگوں سے ملنے کے لیے آنا چاہتا تھا تو "

"سو دفعہ پاکستان آؤ بیٹا! میں تو خود بڑی اداس ہو رہی ہوں تمہارے بغیر، لیکن بیٹا! اس طرح لگی لگائی نوکری پر لات مارنا اچھی بات نہیں۔ رشتہ داروں میں کسی کے بیٹے کی ایسی اچھی نوکری نہیں ہے کویت میں کچھ سال اور لگا لو بیٹا پھر آ تو جانا ہی ہے۔ ابھی تو تمہارے علاوہ گھر میں کوئی کمانے والا تک نہیں ہے۔ تم آ جاؤ گے تو گھر کیسے چلے گا؟"

"آپ کو بچت کرنی چاہیے تھی امی! میں جتنی رقم بھیجتا رہا آپ کو وہ سب خرچ نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ماں سے گلہ کیا۔ اس نے تین سال میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ دینار پاکستان بھیجا تھا اور اس کے گھر والے وہ سارا خرچ کر چکے تھے۔ وہ واقعی بے وقوف تھا جو اپنے پاس کچھ بھی بچا کر رکھنے کے بجائے ساری کی ساری رقم پاکستان بھجواتا رہا اور کویت میں سات سال گزارنے کے باوجود وہ آج بھی وہیں کھڑا تھا، جہاں کل تھا۔

"بیٹا! بچت ہوتی کہاں ہے، سو تو خرچے ہوتے ہیں تم الگ سے کوئی رقم بھیجتے تو میں بینک میں جمع کرواتی رہتی۔ مگر تم نے کبھی گھر کے خرچے کے علاوہ تو کبھی کوئی فالتو رقم نہیں بھجوائی۔ آصف کہہ رہا تھا کہ بھائی جان شاید اب عارفہ کے لیے رقم اکٹھی کر رہے ہیں۔ کیونکہ عارفہ کے ماں باپ خاندان میں کہتے پھر رہے ہیں کہ سال دو سال میں کرم علی شادی کے لیے پاکستان آئے گا۔ تم نے عارفہ سے کب ہوگا۔ میں نے پھر بھی آصف سے کہا کہ کوئی بات نہیں اچھا ہے وہ اگر شادی کے لیے رقم اکٹھی کر رہا ہے شادی پر روپے پیسے کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے۔ آصف نے حالانکہ کتنی بار مجھے کہا کہ بھائی جان سے کہیں کہ وہ کاروبار کے لیے رقم بھیجیں جب بھائی جان کی شادی ہوگی تو میں وہ رقم واپس کر دوں گا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی دوں گا بھائی جان کو"

اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ کرم علی نے کچھ بھی کہے بغیر فون کا ریسیور رکھ دیا۔

اس کے پاس اس وقت 27 دینار تھے اور یہ وہ رقم تھی جو تین سال پہلے سعود بن جابر کے پاس آنے سے پہلے مہینے کا خرچ پاکستان بھیجنے کے بعد بچی تھی۔ تین سال میں اس رقم میں کوئی کمی یا اضافہ نہیں ہوا تھا اور اس کے گھر والوں کو شبہ تھا کہ وہ اپنی شادی کے لیے رقم اکٹھی کر رہا ہے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ ہر مہینے اپنی پوری تنخواہ نہیں بھجواتا ہوگا۔ اپنے پاس اس کا کچھ نہ کچھ حصہ تو رکھتا ہی ہوگا۔

کرم علی اب آزاد تھا۔ کتنا آزاد؟ وہ باہر اصطبل کے گھوڑوں میں آ کر پھرنے لگا۔ اس شام اس کا واقعی جی چاہا تھا کہ اس کے جسم پر برص پھیلنے کے بجائے اصطبل کا کوئی گھوڑا مر جاتا تاکہ اس کے بدلے اس کی جان چلی جاتی۔

وہ اگلی صبح اصطبل نہیں گیا اس نے سعود بن جابر کو بتا دیا کہ وہ اس کے پاس کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔ سعود بن جابر نے اس سے کوئی سوال جواب کیے بغیر بخوشی اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ لیکن اس بار اس نے کرم علی کو اصطبل میں رکھنے کے بجائے اپنے رہائشی محل میں رکھا تھا اپنے ذاتی خدمت گار کے طور پر اور وہاں رکھنے کے چند ماہ بعد وہ اسے اپنے ذاتی طیارے میں اپنے ساتھ لاس ویگاس کے اس کسینو میں لایا تھا جو سعود بن جابر کی ملکیت تھا اور وہ مہینے میں ایک بار جوا کھیلنے کے لیے اپنے کسینو ضرور جاتا تھا یہ ایک اتفاق تھا یا سعود بن جابر کی بدقسمتی لیکن آج تک سعود اپنے کسینو میں جوا کھیلتے ہوئے کبھی نہیں جیتا تھا لاس ویگاس کے کسی بھی دوسرے کسینو میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی ہار کا سلسلہ جتنا لمبا ہوتا گیا اس کے کسینو کے ملازمین کا یہ اصرار بھی کہ وہ اسے دھوکہ بازی سے جتانے کی کوشش کریں۔ سعود بن جابر کوئی بہت زیادہ ایماندار آدمی نہیں رہا تھا مگر اس کی ضد تھی کہ وہ اپنے کسینو میں اگر جیتے گا تو کسی دھوکہ بازی کے بغیر ورنہ تب تک ہارنا پسند کرے گا جب تک قسمت اس کا ساتھ نہیں دیتی۔

وہ کرم علی کو اپنے ساتھ خوش قسمت سمجھ کر اس کی قسمت آزمانے کے لیے نہیں لایا تھا لیکن یہ عجیب اتفاق تھا کہ جس رات وہ کرم علی کے ساتھ اس کسینو میں آیا۔ اس رات سعود بن جابر نے بیس سال کے بعد اپنے کسینو میں رقم جیتی تھی۔ صرف یہ نہیں وہ اس رات ایک بازی بھی نہیں ہارا تھا۔

رقم سعود بن جابر کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ جیت معنی رکھتی تھی۔ وہ تقریباً خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ کرم علی کو ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ سعود بن جابر کے لیے خوش قسمت ثابت ہوا تھا لیکن سعود بن جابر کو سب سے پہلے یہی خیال آیا تھا۔ کرم علی نے اس کے ہار کے سلسلے کو توڑ دیا تھا۔ کرم علی یک دم اس کے نزدیک بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس کے بعد وہ جب بھی لاس ویگاس آتا کرم علی کو ساتھ لے کر آتا اور ایسے ہی ایک سفر پر کرم علی نے اس سے مستقل طور پر لاس ویگاس میں ہی رہنے کی خواہش کی تھی۔ سعود بن جابر نے کسی تامل کے بغیر اس کی بات مان لی تھی۔

''کسینو میں جو کام کرنا چاہو میں تمہیں دلوا دیتا ہوں۔''

سعود نے بڑی فیاضی کے ساتھ کہا۔ کرم علی کا دل بے ساختہ چاہا اسے کہے وہ وہاں کوئی کام کرنا نہیں چاہتا۔ اسے اس جگہ سے بھی نفرت تھی۔ لیکن اسے خدشہ پیدا ہوا تھا کہ سعود اس کی بات پر بگڑ سکتا تھا یا اگر دوبارہ اسے کویت لے گیا تو۔۔؟

''کسینو میں کام۔۔۔'' کرم علی کہتے کہتے اٹکا۔

''ہاں۔۔۔ کوئی بھی کام جو تم کرنا چاہو۔'' سعود بن جابر نے ایک بار پھر اسی انداز میں کہا۔ کرم علی بہت دیر چپ رہا پھر اس نے کہا۔

''میں کسینو کا فرش صاف کرنا چاہتا ہوں۔'' سعود بن جابر کو تین سال سے زیادہ کے عرصے میں کرم علی کبھی بے وقوف نہیں لگا تھا مگر اس وقت وہ واقعی احمق تھا اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو آج سعود بن جابر سے کچھ ایسی چیز مانگتا جس سے ہمیشہ کے لیے اس کی قسمت بدل جاتی مگر وہ چھوٹے ذہن اور چھوٹی کلاس سے تعلق رکھنے والا آدمی تھا۔ اتنا بڑا خواب کیسے دیکھتا؟ ساڑھے تین سال میں پہلی بار سعود بن جابر کا دل کرم علی سے اٹھ گیا۔

وہ یہ نہیں جانتا تھا اس چھوٹے ذہن کے اور چھوٹی کلاس سے تعلق رکھنے والے آدمی نے اس کسینو میں ان چند کاموں میں سے ایک چننے کی کوشش کی تھی جس سے اسے رزق حلال کے قریب ترین والا رزق ملتا۔

سعود بن جابر نے ہی امریکہ میں اس کے سارے پیپرز بنوائے تھے۔ کرم علی کویت سے لاس ویگاس آ گیا تھا۔

☆☆☆

''کون ہے سلمان؟'' نفیسہ نے سلمان کو دروازہ کھول کر کھڑے دیکھا۔ سلمان جواب دینے کے بجائے سامنے سے ہٹ گیا۔ زینی اندر آ گئی۔ صحن کے تخت پر بیٹھی نفیسہ گود میں رکھی پلیٹ سے روٹی کا لقمہ لیتے لیتے رک گئیں۔ انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا روٹی کا لقمہ لیتے لیتے رک گئیں۔ انہوں نے پلیٹ کو گود سے ہٹا کر تخت پر رکھ دیا۔ کئی ماہ پہلے کی طرح زینی کو دیکھ کر غصے سے پاگل نہیں ہوئی تھیں وہ اس بار۔

زینی کچھ دیر چپ چاپ شکست خوردہ انداز میں صحن میں کھڑی رہی۔ پھر ایک بھی لفظ کہے بغیر نفیسہ کے قدموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اس نے ماں کی گود میں منہ چھپاتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔

ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''تم نے بڑا ظلم کیا ہم سب پر زینی کتنا سمجھایا تھا انہوں نے تمہیں کتنا کہا تھا انہوں نے، لیکن تم نے ان کی بات نہیں مانی اب دیکھو کس حال میں ہو تم؟'' زینی نے سر اٹھا کر ماں کو نہیں دیکھا وہ ماں کے پاس صرف رونے آئی تھی۔ ماں کے پاس ہر کوئی رونے ہی آتا ہے۔

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ نفیسہ بھی رونے لگیں وہ جانتی تھیں زینی، ضیاء کے کتنے قریب تھی۔ وہ ابو کی بیٹی تھی ماں کی کچھ نہیں۔ وہ جانتی تھیں باپ کی موت نے اس پر کیا اثر کیا ہوگا وہ نہیں جانتی تھیں وہ اس رات ان کی گود میں باپ کے لیے آنسو بہانے نہیں آئی تھی۔ وہ جس چیز کے لیے رو رہی تھی وہ نفیسہ جان جاتیں تو وہ جان سے جاتیں۔

''اب کیا فائدہ رونے کا زینی! اب کچھ واپس تو نہیں آئے گا۔ چپ ہو جاؤ اب۔'' نفیسہ نے بالآخر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بہت دیر تک روتی رہی۔

زہرہ اور ربیعہ صحن سے آنے والی آوازیں سن کر باہر نکل آئی تھیں۔ زہرہ زینی کو اس طرح روتے دیکھ کر خود بھی رونے لگی تھی۔ مگر ربیعہ صرف چند لمحے رکی تھی وہاں پھر وہ واپس کمرے میں چلی گئی۔ زینی کے آنسوؤں اور مگرمچھ کے آنسوؤں میں اسے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔

''وہ بہت ناراض تھے تم سے میں نے انہیں زندگی میں کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ تمہارے گھر گئے تھے تمہیں لینے۔ مگر جب انہیں پتہ چلا کہ تم ملائشیا چلی گئی تو بہت صدمہ ہوا تھا انہیں، بہت بہت برا بھلا کہا انہوں نے اس رات واپس آ کر یہ بھی کہا کہ وہ دوبارہ اب کبھی تمہاری شکل نہیں دیکھیں گے... یہ بھی کہا کہ وہ مر بھی جائیں تو ہم تمہیں ان کے جنازے میں شریک نہ ہونے دیں انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ حرام رزق کھانے اور پہننے لگ گئی ہے۔ اس حالت میں میرے پاس آئے گی تو میری روح کو تکلیف ہوگی۔ اسی رات انہیں رات کے پچھلے پہر ہارٹ اٹیک ہوا اور چند گھنٹوں میں وہ ختم ہو گئے۔''

نفیسہ آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی ہوئی اس کو بتا رہی تھیں۔ وہ سب نہ بھی بتاتیں وہ جانتی تھی باپ اس سے ناراض تھا ورنہ یہ کیسے ہوتا کہ اس کے خواب میں ہی نہ آتا۔ ایک بار بھی نہیں اور ضیاء کی خواہش پوری ہوئی تھی۔ وہ ان کے جنازے میں شرکت نہیں کر سکی تھی۔ ان کی رزق حرام کھانے والی چہیتی اولاد آخری بار ان کے پاس نہیں آ سکی۔

بہت بار اسے ضیاء کی قبر پر جانے کا خیال آیا تھا مگر ہر بار ایک عجیب سی ندامت ملامت اس کے پاؤں پکڑ لیتی۔ اس میں باپ کا سامنا

کرنے کی ہمت نہیں تھی اور کم از کم اب اس حالت میں جب اس کا پورا وجود رزق حرام میں چھپ ہوا تھا۔

زینی تخت پر بیٹھی پلیٹ میں پڑی پیاز کے ساتھ وہ روٹی کھانے لگی جو نفیسہ نے چھوڑ دی تھی۔ نفیسہ اب بھی ضیاء کی باتیں بتا رہی تھیں اور وہ رزق حلال کھا رہی تھی۔ اس نے یاد کیا آخری بار کب اس نے کھانا کھاتے ہوئے اس کے ذائقے پر اتنا غور کیا تھا۔ یقیناً وہ آخری بار اس گھر میں ہی ہوئی تھی۔ اس گھر سے نکلنے کے بعد نہیں۔

زہرہ نے پانی کا گلاس لا کر اس کے پاس رکھ دیا۔ زینی اب آخری لقمہ لے رہی تھی۔

''آپ ابھی تک یہیں ہیں آپا؟'' زینی کو اس وقت پہلی بار زہرہ کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا۔

''یہ تو کئی مہینوں سے یہیں ہے۔ تمہارے ابو کی وفات کے بعد نعیم اسے واپس لے کر ہی نہیں گیا۔ وہ دوسری شادی کرنے والا ہے۔ بچیاں اور زہرہ تب سے یہیں ہیں۔''

زہرہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نفیسہ نے رنجیدگی سے کہا۔

''ربیعہ کی منگنی ٹوٹ گئی ہے۔''

زینی کو شاک لگا۔ ربیعہ ابھی تک باہر اس کے پاس نہیں آئی تھی وہ اب وجہ سمجھ سکتی تھی۔

''تمہیں کتنا روکا تھا، اس کے سسرال والوں نے تمہاری ماڈلنگ کی وجہ سے ہی یہ منگنی توڑی ہے۔'' نفیسہ کے لہجے میں ملامت نہیں تھی۔ گلہ تھا اور گلہ ہونا بھی چاہیے تھا۔

''آپ لوگ اپنا سامان پیک کرلیں۔ میں آپ سب کو لینے آئی ہوں۔'' نفیسہ نے چونک کر زینی کو دیکھا۔ اب وہ پانی پی رہی تھی۔

''میں تو یہ سمجھی کہ تم واپس آگئی ہو۔'' زینی کو ماں کی سادگی پر بے ساختہ پیار آیا۔

''زندگی کے ہر موڑ پر واپسی کا موقع نہیں ملتا۔ پیچھے اب بچا کیا ہے جس کے لیے میں واپس آؤں۔'' اس کی آواز میں نمی تھی۔

''آنا ہوتا تو جاتی کیوں؟ آپ لوگ ابھی میرے ساتھ چلیں صبح میرے ملازم آکر سامان لے جائیں گے۔''

اس نے نفیسہ سے کہا، اس سے پہلے کہ نفیسہ کچھ کہتی زہرہ اور سلمان اٹھ کھڑے ہوئے۔

نفیسہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے جیسے باور کرا دیا تھا کہ ان کا فیصلہ کیا ہونا چاہیے تھا۔

بھوک اور ذلت میں اگر ایک چیز کا انتخاب کرنے کا موقع ملے تو ہر شخص ذلت ہی چنے گا۔ بھوک زندگی کو سالوں اور مہینوں سے انگلی کی پوروں پر لے آتی ہے۔

ان سب نے اس سے پہلے ''غربت'' اور ''تنگ دستی'' نہیں دیکھی تھی ضیاء کی موت نے ان دونوں سے روشناس کروایا۔ ان کی موت سے پہلے گھر میں جیسا بھی پکتا مگر دن میں تین بار کھانا پکتا ہر ایک کی ہر ایک ضرورت تاخیر سے ہی سہی مگر پوری ہو جاتی لیکن اب۔ اب اس گھر سے رزق نہیں گیا تھا رزق کی برکت چلی گئی تھی۔

نفیسہ نے کچھ نہیں کہا خاموشی سے سر جھکا دیا۔ یہ جیسے ہتھیار ڈالنے کے مترادف تھا۔ لیکن ربیعہ نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے یا کم از کم اس آسانی سے نہیں ڈالے تھے۔ وہ زہرہ کے سامان پیک کرنے کے لیے اندر آتے ہی غصے میں آگ بگولہ باہر صحن میں آ گئی۔

''میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی امی اور کسی حرام کھانے والے کے گھر میں تو کبھی نہیں۔''

اس نے صحن میں آ کر زینی کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے نفیسہ سے با آواز بلند کہا، زینی خاموش رہی اس کے پاس اس وقت کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

''یہاں رہ کر بھی بہت سے مسئلے ہیں ربیعہ! تم تو اپنی آنکھوں سے گھر کا حال دیکھ رہی ہو زہرہ کی دو بچیاں بیمار پڑی ہیں اور علاج کے لیے پیسے نہیں اس کی بڑی بچی اسکول چھوڑ کر گھر میں بیٹھی ہے سلمان نے تعلیم چھوڑ دی تم نے تعلیم چھوڑ دی۔ پھر بھی گھر کے اخراجات پورے نہیں ہو رہے۔''

''سب کچھ خراب ہے تو کوئی بات نہیں کل ٹھیک ہو جائے گا۔ ابو کی پنشن آنے لگے گی۔ میرا رزلٹ آ جائے تو مجھے کوئی بہتر نوکری مل جائے گی ہمیں کسی کے ٹکڑوں پہ پلنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

وہ نفیسہ سے یوں بات کر رہی تھی جیسے زینی وہاں ہے ہی نہیں۔ زینی نے مداخلت نہیں کی وہ اس پلیٹ میں نمک مرچ کے ذرات کو اپنی انگلی سے صاف کر کے اپنی پوریں چاٹتی رہی۔

''تمہیں اگر یہاں رہنا ہے تو رہو لیکن ہم میں سے تو کوئی یہاں نہیں رہے گا ہم سب زینی کے پاس جائیں گے وہ بہن ہے ہماری۔''

زہرہ نے باہر نکل کر بڑی سختی سے ربیعہ سے کہا۔

''ابو کو کتنا دکھ ہوتا اگر یہ بات آپ ان کے سامنے کرتیں۔'' ربیعہ نے پلٹ کر زہرہ سے کہا۔

''ابو ہوتے تو کوئی یہاں سے نہ جاتا لیکن اب ان حالات میں یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، تم نے رشتہ داروں کو آزما لیا، محلے والوں کو دیکھ لیا، اب اور کس کو پرکھنا باقی ہے؟ میں یہاں بیٹھ کر اپنی بیٹیوں کو مرتے نہیں دیکھ سکتی۔ کوئی اور نہ بھی جائے میں تو زینی کے ساتھ جاؤں گی اور سلمان بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔''

زہرہ نے علی الاعلان کہا۔ زینی پلیٹ کے اطراف میں لگی ہوئی معمولی سی نمک مرچ کو بھی اپنی انگلی سے صاف کرنے اور چاٹنے میں لگی تھی۔ یوں جیسے وہ صرف اسی کام کے لیے وہاں آئی ہو۔

ربیعہ نے نفیسہ کو دیکھا اور کہا۔

''مگر میں اور امی یہاں سے نہیں جائیں گے۔''

''ربیعہ! اب تم ضد مت کرو پہلے اس کی ضد کی وجہ سے یہ دن دیکھنے کو ملا ہے۔ اب تمہاری ضد کوئی اور آفت لے کر آئے گی ہمارے لیے جب کوئی یہاں نہیں رہنا چاہتا تو تم اکیلے یہاں کیسے رہو گی؟'' نفیسہ نے بالآخر کہا۔ ربیعہ نے بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔

''آپ... آپ بھی یہاں نہیں رہیں گی؟''

"نہیں جہاں باقی جا رہے ہیں میں بھی وہیں جاؤں گی۔" نفیسہ نے مدھم آواز میں کہا۔ ربیعہ کچھ دیر کچھ بول نہیں سکی۔ پھر اس نے پہلی بار زینی کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے آخری بار اپنی انگلی پلیٹ میں پھیر رہی تھی۔ پلیٹ اب بالکل صاف تھی اس میں کہیں نمک مرچ نہیں رہ گیا تھا۔ زینی نے ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ ربیعہ کو اس سے اس وقت بے تحاشا نفرت محسوس ہوئی۔ اسے وہ زندگی میں کبھی اتنی بدصورت نہیں لگی تھی۔

☆☆☆

زینی کس حد تک بدل گئی تھی۔ یہ نفیسہ اور باقی گھر والوں کو اس کے گھر میں آنے کے چند دنوں کے اندر ہی پتہ چل گیا تھا۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے دھونے والی اور ہر اچھی بری چیز سے چند لمحوں میں خائف ہو جانے والی زینی کا اب کہیں کوئی وجود نہیں تھا۔ جسے وہ اب دیکھ رہے تھے وہ کوئی اور زینی تھی جس کی طاقت، اثر و رسوخ پر کبھی ان سب کو شبہ ہوتا اور کبھی انہیں اس پر رشک آتا۔ وہ پیسہ جس کے لیے وہ سب دن رات ترستے رہتے تھے اس گھر میں وہ پیسہ اب کسی کا مسئلہ نہیں تھا یا کم از کم فی الحال کسی کو وہ مسئلہ نہیں لگ رہا تھا۔

زینی دن ڈھلے اٹھتی تیار ہوتی پھر گھر سے نکل جاتی اور رات گئے آتی یا گھر آتی ہی نہیں تھی اور جب وہ گھر آتی تو گھر کا فون اور اس کا سیل فون مسلسل بجتے رہتے۔ گیٹ کے باہر کوئی نہ کوئی گاڑی اس کے انتظار میں کھڑی رہتی۔ وہ بعض دفعہ گھر میں صرف لباس تبدیل کرنے آتی تھی۔ بعض دفعہ اس کے لیے بھی نہیں جوس کا ایک گلاس جو وہ صبح جاگ کر لیتی تھی وہ واحد خوراک تھی جو وہ روز باقاعدگی سے گھر میں لیتی تھی پھر اس کے بعد وہ باہر کیا کھاتی تھی کیا پیتی تھی۔ کچھ کھاتی پیتی بھی تھی یا نہیں نفیسہ کو کچھ پتا نہیں ہوتا تھا۔

ربیعہ اور سلمان دوبارہ کالج جانا شروع کر چکے تھے۔ زینی کا گھر والوں کو گھر میں لانے کے بعد ربیعہ سے اکیلے میں کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ اگر کبھی سامنا ہوا بھی تو ربیعہ اس سے بات کیے بغیر ہٹ جاتی تھی۔ وہ ناراض تھی زینی جانتی تھی۔

اس کی ناراضی ٹھیک تھی زینی یہ بھی جانتی تھی جو کچھ ہوا زینی کو اس پر دکھ بھی تھا اور افسوس بھی۔

لیکن اس سب کے باوجود وہ ربیعہ کے ساتھ بیٹھ کر کسی پرانے ایشو کو ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہر چیز ساتھ ساتھ دفن کرتی جا رہی تھی۔ یہ نہ کرتی تو زندہ رہنا اس کے لیے بے حد ناممکن ہو جاتا۔

فاران کے ساتھ کانٹریکٹ ختم ہونے کے باوجود زینی کے ماڈلنگ کیریر پر کوئی بڑا اثر نہیں پڑا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ پہلے سے زیادہ مصروف زیادہ مشہور ہو رہی تھی اور اس کی پہلی فلم کی ریلیز میں صرف کچھ وقت ہی باقی تھا۔ اس فلم کی کامیابی اسے سپر اسٹار بناتی اور اس کے ریٹس میں یک دم اضافہ ہو جاتا اور یہ وہ واحد چیز تھی جس سے زینی کو دلچسپی تھی۔ پیسہ اور صرف پیسہ۔

اس کے گھر میں پہلے فلم انڈسٹری سے منسلک لوگ آتے تھے مگر اپنے گھر والوں کو وہاں لے آنے کے بعد اس نے شوبز سے منسلک یا اپنے شناسا کسی بھی شخص کو گھر آنے سے روک دیا تھا۔ وہاں اس کی بہنیں اور اس کی بہن کی بچیاں تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھی اس کی زندگی یا لائف اسٹائل کی وجہ سے ان میں سے کسی کے لیے کوئی مزید مسئلہ پیدا ہو۔

☆☆☆

نعیم کو لگ رہا تھا اس کا دل جیسے رک جائے گا۔ پولیس اس کے سامنے اس کی دکان کے سامان کو نکال نکال کر پھینک رہی تھی۔ اچھرہ میں کرائے پر لی ہوئی کپڑے کی یہ دکان وہ پچھلے پندرہ سال سے چلا رہا تھا۔ آج تک کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا اور ایک ہفتہ پہلے یک دم ہی اس کی دکان کے مالک نے اس سے دکان خالی کرنے کے لیے کہتے ہوئے کہا کہ اس نے دکان کسی کو بیچ دی ہے۔

نعیم کے سر پر جیسے آسمان گر پڑا تھا۔ اس طرح کیسے وہ اچانک دکان بیچ سکتا تھا؟ اس نے دکان خالی کرنے سے انکار کرتے ہوئے مالک سے کہا کہ وہ اس کے خلاف تاجروں کی یونین کے پاس جا کر شکایت کرے گا۔

مالک نے جواباً کہا کہ وہ اس کے خلاف کیس کرے گا۔ نعیم کیس کا سنتے ہی کورٹ سے سٹے آرڈر لے آیا۔ اس کا خیال تھا کچھ عرصہ یہ مسئلہ اسی طرح لٹکا رہے گا پھر دونوں پارٹیز کے درمیان مصالحت ہو جائے گی۔ وہ تب تک سکون کا سانس لے سکتا ہے۔

چار دن بعد ویسے بھی اس کی دوسری شادی ہونے والی تھی وہ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اپنی شادی کے انتظامات میں بھی مصروف تھا۔ مگر اب stay order کے دوسرے ہی دن پولیس کی ایک پارٹی وہاں آئی تھی اور انہوں نے اس سے اس بار دکان خالی کرنے کے لیے نہیں کہا انہوں نے یہ کام خود کرنا شروع کر دیا۔

اور کپڑے کے تھان اور کٹ پیس کا ڈھیر دکان سے باہر پھینکنا شروع کرنے سے پہلے انہوں نے نعیم کے مزاحمت کرنے پر اس کی ٹھکائی کی تھی اور اس ٹھکائی کے نتیجے میں کوئی دوسرا دکان دار نعیم کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھا تھا۔

مختلف رنگوں اور پرنٹوں کے کپڑوں کا ڈھیر دکان سے باہر پوری سڑک پر پھیلا ہوا تھا۔ نعیم کا رزق اس کے سامنے مٹی میں مل رہا تھا۔

☆☆☆

سلطان سے زینی کی پہلی ملاقات اس دن ہوئی تھی جب وہ اپنی فلم کے پہلے سین کے لیے ڈریسنگ روم میں میک اپ کروا رہی تھی۔ وہ انڈسٹری کی سپر اسٹار نشا کا سیکرٹری تھا اور انڈسٹری میں کنگ میکر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ انڈسٹری کی ہر ہیروئن نشا سے زیادہ اس کے سیکرٹری سے خوف کھاتی تھی۔ وہ جوڑ توڑ کا ماہر تھا اور اس کے تعلقات انڈسٹری کے ہر پروڈیوسر کے ساتھ تھے۔ ... اگر کوئی اسے نہیں جانتا تھا تو وہ پری تھی اور اگر وہ کسی کو جاننا چاہتا تھا تو وہ پری زاد تھی۔

میک اپ آرٹسٹ غفور اس کا میک اپ کر رہا تھا جب نشا یک دم دروازہ کھول کر سلطان کے ساتھ اندر آئی تھی۔ زینی کو اس کا یہ انداز بے حد برا لگا تھا۔ غفور میک اپ کرتے کرتے نشا کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس نے بڑے مودب انداز میں نشا کو سلام کرتے ہوئے اس کا حال پوچھا۔

''جلدی کرو غفور! مجھے سین کروانا ہے ابھی۔''

زینی نے غفور کو ٹوکا۔ غفور ایک بار پھر تیزی سے اس کے چہرے پر ہاتھ چلانے لگا۔ سامنے لگے آئینے میں زینی نے نشا کی بے حد چبھنے والی نظروں کو محسوس کیا تھا جو مسلسل اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔

''تمہیں کسی نے یہ نہیں سکھایا کہ سینئرز کی عزت کیسے کی جاتی ہے؟'' نشا نے بالآخر بے حد تیزی سے کہا۔

"اگر تمہیں کسی نے یہ نہیں سکھایا کہ کسی کے ڈریسنگ روم میں کیسے آتے ہیں تو کوئی مجھے کیسے سکھا سکتا ہے کہ کسی کی عزت کرنی ہے۔"

زینی نے سرد مہری کے ساتھ کہا۔ نشا نے بے حد تیکھی اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔

"میں نے سوچا پاشا صاحب کی "نئی ہیروئن" کا دیدار کر لوں۔ پتہ نہیں کتنے دن رہتی ہے یہاں۔ بڑا شوق ہے پاشا صاحب کو "نئی ہیروئنوں" کا۔ شکل وصورت تو خیر ٹھیک ہی ہے تمہاری۔ پر غفور! بڑا کام کرنا پڑے گا تمہیں اس پر۔ اب ہر کوئی نشا تو نہیں ہوتا کہ میک اپ مین کو کچھ کرنا ہی نہ پڑے۔ کیوں سلطان؟"

نشا نے سلطان سے رائے لی اور اسی وقت زینی نے آئینے سے نشا کے عقب میں کھڑے اس مخنی سے آدمی کو دیکھا جس پر ایک نظر ڈالتے ہی کسی کو بھی اس کی جنس کا اندازہ ہو جاتا۔ وہ ایک ہیجڑا تھا۔ زینی نے دوسری نظر اس پر نہیں ڈالی۔ وہ اسے اس قابل نظر نہیں آیا تھا۔

مگر زینی پر ایک نظر ہی سلطان کو تشویش میں مبتلا کر گئی تھی۔ وہ نشا کے کیریئر کے لیے پچھلے بارہ سالوں میں پہلی بار فکر مند ہوا تھا۔

"بازار کے کس گھر سے ہو؟" نشا نے اب زینی سے پوچھا جس نے اس کے پچھلے تبصرے پر کچھ نہیں کہا تھا۔

"بازار سے نہیں ہوں میں۔" زینی نے اس بار غرا کر کہا۔ نشا کی وہاں موجودگی اب اسے بری طرح کھلنے لگی تھی۔

"اوہ۔ اچھا۔ پہلے ہی ڈیفنس چلی گئی۔ تو پھر بازار میں کون ہے؟ ماں، خالہ، نانی، بہن؟" نشا نے بڑے بھولپن سے کہا۔

"غفور! دروازہ کھول کر اسے باہر کا راستہ دکھاؤ، یہ راستہ بھول کر آئی ہے یہاں۔" زینی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے غفور سے سختی سے کہا اور جیسے غفور کے لیے پریشانی پیدا کر دی۔

"چار دن ہوئے ہیں انڈسٹری میں آئے اور خاندانی بننے لگیں۔ نشا نے بارہ سال میں تمہارے جیسی درجنوں ہیروئنوں کو "آتے" اور "جاتے" دیکھا ہے۔ ایک فلم سائن کی ہے، وہ فلاپ ہوئی تو عقل ٹھکانے آ جائے گی تمہاری۔" نشا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"پچھلے ہفتے اس سال کے دوران تمہاری ساتویں فلم ریلیز ہو کر فلاپ ہوئی۔ تمہاری عقل ٹھکانے آ گئی کیا؟"

زینی نے بے حد ٹھنڈے انداز میں اس سے کہا اور جیسے اسے چابک دے مارا۔ اس سے پہلے کہ نشا غصے سے آگ بگولا ہو کر اسے کچھ کہتی، سلطان نے فوراً بیچ میں مداخلت کی۔

"نشا جی..... چلیں یہاں سے..... ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔"

نشا کمرے سے نکلنے سے پہلے زینی کو پہلی بار ان گالیوں کا تحفہ پیش کر کے گئی تھی جو بعد میں وہ ہر روز سنتی رہی تھی اور وہ صرف پہلی بار تھا، جب وہ کسی عورت کی زبان سے اس طرح کے الفاظ سن کر کچھ دیر کے لیے سن ہو گئی تھی۔

جب تک اس کے حواس بحال ہوئے۔ نشا اس کمرے سے جا چکی تھی۔ غفور بے حد نارمل انداز میں کام کر رہا تھا۔ یوں جیسے ان گالیوں میں کوئی خاص بات ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

سلطان سے زینی کی دوسری ملاقات ایک ماہ بعد ہوئی تھی۔ وہ اس رات دیر سے گھر آئی تھی اور گھر کے اندر آتے ہی پورچ میں بیٹھے ایک آدمی کو دیکھ کر وہ چونک گئی جو اس کی گاڑی کو اندر آتے دیکھ کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا، وہ سلطان تھا۔

گاڑی سے اترتے ہی زینی نے اس سے پوچھا۔ "تم یہاں اس وقت کس لیے آئے ہو؟" اسے سوال کا جواب نہیں ملا۔ سلطان ہچکیاں لیتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ تب پہلی بار زینی نے اس کے پھٹے ہوئے کپڑے اور اس کے چہرے پر زخموں کے نشان دیکھے۔

"اسے اندر لے جاؤ، کھانا کھلاؤ، کپڑے تبدیل کرواؤ پھر بات کرتی ہوں اس سے۔" زینی نے اپنے ڈرائیور سے کہا اور اندر چلی گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ جب کپڑے تبدیل کر کے شب خوابی کے لباس میں سگریٹ سلگائے لاؤنج میں آئی تو سلطان وہاں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کر چکا تھا اور اب قدرے پرسکون نظر آ رہا تھا۔

زینی کو دیکھ کر وہ کپ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھ جاؤ، کس نے مارا ہے تمہیں؟" زینی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"قسمت نے۔" اس کے جواب نے زینی کو چند لمحوں کے لیے حیران کر دیا۔ وہ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے مسکراتے ہوئے بڑے عجیب سے لہجے میں سلطان سے کہا۔

"قسمت مارے تو نشان چہرے پر نہیں، دل پر پڑتا ہے۔"

سلطان نے اپنے سینے کے بائیں جانب ہاتھ رکھتے ہوئے زینی سے کہا۔

"یہاں بھی پڑا ہے پری جی۔" زینی نے مسکراتے ہوئے اس بار کچھ کہنے کی بجائے سینٹر ٹیبل پر سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر اس کی طرف کھسکا دیا۔ سلطان نے ایک سگریٹ نکال لیا پھر بڑبڑانے لگا۔

"نشا نے مارا ہے اپنے ایڑھی والے جوتے سے پھر ملازموں سے پٹوایا پھر گھر سے باہر پھنکوا دیا مجھے۔ وہ کہتی ہے، میں نے اس کا پانچ لاکھ کا زیور چوری کر لیا۔"

زینی نے سگریٹ منہ سے ہٹاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"تم نے چوری کیا؟"

"نہیں۔" سلطان نے بے ساختہ کہا۔ زینی ایش ٹرے میں راکھ جھاڑنے لگی۔ سلطان اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا؟"

"نہیں۔" زینی نے اطمینان سے کہا۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے" زینی نے بے اختیار اس کی بات کاٹی۔

"تم قسم مت کھاؤ، قسم کھانے والا جھوٹا لگتا ہے مجھے۔" سلطان اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر بے اختیار ہنس پڑا۔ زینی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا ہوا؟''

''نشا نے بھی یہی کہا تھا مجھ سے۔ حالانکہ اس کو پتا تھا، میں نے زندگی میں کبھی قسم نہیں کھائی۔ آپ سے تو خیر مجھے کوئی گلہ ہی نہیں ہے پری جی! آپ کے پاس بیٹھے تو چند گھنٹے ہوئے ہیں مگر نشا کے خاندان کی تو بیس سال خدمت کی تھی میں نے۔'' سلطان کے لہجے میں اب رنجیدگی تھی۔

''بیس سال سے ہو اس کے ساتھ؟''

''ہاں، پہلے اس کی بہن کے ساتھ پھر نشا کے ساتھ۔ میں نے اسے اسٹار بنایا۔''

زینی نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم نے واقعی اس کا زیور نہیں لیا؟''

''کس لیے لیتا زیور؟ کرتا کیا زیور کا میں۔ میری کون سی بیوی ہے، گھر ہے، جس پر لگاتا پھر کیا کرتا میں نے زیور چوری کر کے؟'' سلطان نے تلخی سے کہا۔

''کیوں پیسے نہیں چاہئیں تمہیں؟ دنیا میں کون ہے جو پیسے کے پیچھے نہیں جاتا۔''

''مجھے دنیا کا نہیں پتہ مگر میں کبھی پیسے کے پیچھے نہیں گیا۔ تب بھی نہیں جب انڈسٹری کی بڑی بڑی ہیروئنوں نے مجھے توڑنے کی کوشش کی۔ میں تو محبت کے نام پر مر گیا۔ پیار کے پیے خوار ہوتا رہا۔''

زینی نے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''تمہیں محبت کا کیا پتہ؟''

''ہیجڑا ہوں، پر انسان ہوں میں۔ محبت کرنے کے لیے عورت یا مرد ہونا تو کوئی شرط نہیں۔''

''کس سے محبت تھی تمہیں؟'' زینی کو اس کے ساتھ باتوں میں مزہ آ رہا تھا۔ ''نشا سے؟''

''نہیں۔ اس کی بڑی بہن سے۔''

''وہ تو شادی کر کے فلم انڈسٹری چھوڑ گئی۔'' زینی کو یاد آیا۔

''اس سے کیا کوئی محبت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔''

زینی اس بار بول نہیں سکی۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ کوئی چیز اسے بہت بری طرح چبھی تھی۔

''یعنی پھر چلے جاؤ گے نشا کے پاس؟'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔

''نہیں، اب تو مر کر بھی نہیں جاؤں گا۔''

''اگر اس کی بہن بلائے تو پھر بھی نہیں؟''

''نہیں، پھر بھی نہیں۔ غصہ مجھے نشا کے جوتے کھا کر نہیں آیا۔ سلمٰی کی گالیاں سن کر آیا۔ وہ بھی تھی وہاں، سب کچھ اسی کے سامنے ہوا۔ میں نے کہا سلطان اب بس کر، معشوق کے منہ سے گالی کھا لی۔ اب اس کے در سے روٹی کھانے مت بیٹھ۔''

''یعنی محبت ختم ہوگئی؟'' زینی نے جیکھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''نہیں، محبت ختم نہیں ہوئی، توقع ختم ہوگئی۔'' سلطان نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے کام کرو گے؟''

زینی نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے پوچھا۔ سلطان بول نہیں سکا۔

☆☆☆

سلطان کو اپنے لیے کام کی دعوت دیتے ہوئے زینی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ وہ مہرہ آگیا جو باقی ہر مہرے کو پیٹ دے گا۔ اس نے فلم انڈسٹری میں اور فلم انڈسٹری سے باہر بہت ہیجڑے دیکھے تھے۔ ماڈلنگ میں بھی اس کے آدھے اسٹائلسٹ اسی صنف سے تعلق رکھتے تھے مگر اس نے سلطان سے زیادہ شاطر اور ذہین ہیجڑا نہیں دیکھا تھا۔ وہ پاکستان فلم انڈسٹری کا واحد ہیجڑا تھا جس کی جنس جاننے کے باوجود انڈسٹری کے بڑے اس کا نام عزت سے لیتے تھے۔ کیوں؟ یہ زینی کو اس کے ساتھ رہنے سے پتہ چل گیا تھا۔

☆☆☆

''یہ نعیم صاحب کا گھر ہے؟'' ڈرائیور نے دروازہ کھولنے پر نعیم سے پوچھا کہ دروازہ بجنے پر دروازہ کھولنے آیا تھا۔

''ہاں، میں نعیم ہوں۔'' اس سے پہلے کہ ڈرائیور کچھ کہتا، فہمیدہ پوچھتے ہوئے دروازے پر ہی آگئی۔

''کون ہے نعیم؟''

''پتہ نہیں ابھی تو میں پوچھ رہا تھا۔'' نعیم نے ماں کو اطلاع دی۔

''مجھے زہرہ بی بی نے بھجوایا ہے۔ آپ کی بچی کی طبیعت خراب ہے۔ انہوں نے گاڑی بھیجی ہے کہ آپ آ کر اپنی بچی کو دیکھ جائیں۔'' ڈرائیور نے بے حد مودب انداز میں کہا۔

''گاڑی.....'' نعیم کو جیسے کرنٹ لگا اس نے شاک کے عالم میں ماں کو دیکھا۔

''ارے پیچھے ہٹ..... میں بھی تو دیکھوں، کس نے گاڑی بھیج دی؟'' فہمیدہ نے اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا اور پھر دروازے سے باہر جھانکنے لگی۔

''یہ گاڑی زہرہ نے بھیجی ہے؟'' فہمیدہ باہر کھڑی نسان سنی کو دیکھ کر جیسے دنگ رہ گئی تھی۔

''جی۔'' ڈرائیور نے مختصراً جواب دیا۔

''ارے زہرہ کے پاس یہ گاڑی کہاں سے آگئی؟'' فہمیدہ نے ہکا بکا انداز میں پلٹ کر نعیم سے پوچھا۔

''یہی تو میں حیران ہو رہا ہوں۔ تم جاؤ، مجھے نہیں آنا۔'' نعیم نے پہلا جملہ ماں سے اور دوسرا ڈرائیور سے کہا۔

''ارے کیوں نہیں جانا۔ جا کر دیکھتے تو ہیں کہ آخر ایسی گاڑی کہاں سے لے لی۔ سنا ہے زینی اپنے پاس لے گئی ہے سب گھر والوں کو۔

دیکھتے ہیں، کہاں لے گئی ہے۔" فہمیدہ نے بے حد تجسس کے عالم میں کہا۔

ایک گھنٹہ کے بعد گاڑی انہیں لے کر جس بنگلے میں داخل ہوئی تھی، اس کے سائز اور نقشے نے انہیں خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ نعیم اور وہ منہ کھولے ہونقوں کی طرح گاڑی کو پورچ میں رکتے دیکھتے رہے پھر ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا۔

گاڑی سے باہر نکل کر ان کی رہی سہی قوت گویائی بھی سلب ہو گئی تھی۔ پورچ میں کوئی ان کے استقبال کے لیے نہیں تھا مگر ڈرائیور لاؤنج کا دروازہ کھول کر انہیں اندر لے گیا۔

اور لاؤنج میں جاتے ہی نفیسہ سے ان کا سامنا ہو گیا جو ان دونوں کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

"ارے نعیم بیٹا فہمیدہ آپا آپ آپ لوگ آئیں آئیں بیٹھیں بیٹھیں۔ زہرہ زہرہ دیکھو کون آیا ہے۔"

نفیسہ انہیں دیکھ کر بالکل ہی بوکھلا گئی تھیں اور ان کی بوکھلاہٹ نے نعیم اور فہمیدہ کے اوسان جیسے بحال کر دیے۔ انہیں یک دم یاد آ گیا تھا کہ وہ "کون" تھے۔

"آپ لوگ بیٹھیں، میں۔ " نفیسہ کی بات مکمل نہیں ہو سکی۔ اس سے پہلے ہی زہرہ لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور نعیم اور فہمیدہ کو دیکھ کر ماں ہی کی طرح بدحواس ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم پھوپھو " اس نے بمشکل فہمیدہ سے کہا۔

"ہمیں گاڑی بھجوائی تھی تم نے کہ بچی بیمار ہے، ہم آ کر دیکھ جائیں۔" فہمیدہ نے اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ اس سے کہا۔ ڈیفنس میں آ گئے تھے تو کیا، وہ دونوں اب بھی محلے کے اسی گھر کی طرح ان کے تلوے چاٹنے کو تیار نظر آ رہی تھیں اور فہمیدہ یہ کام کروانے کا موقع کیسے ضائع کرتی۔

"میں نے ؟" زہرہ نے الجھ کر نعیم کو دیکھا۔ "میں نے تو گاڑی نہیں۔"

"ارے دیکھو ربیعہ بھی آ گئی۔ سلام کرو بہنوئی اور پھوپھو کو اور جا کر جلدی سے چائے پانی کا انتظام کرو۔" نفیسہ نے بیچ میں ہی ربیعہ کے آ جانے پر زہرہ کی بات اچکی۔

وہ ان ہی قدموں پر انہیں سلام کر کے واپس پلٹ گئی۔

"آپ لوگ بیٹھیں تو سہی۔" نفیسہ نے ان دونوں سے کہا۔ نعیم اور فہمیدہ بظاہر بڑے کروفر کے عالم میں صوفہ پر بیٹھ گئے۔

"تم نے گاڑی نہیں بھیجی تو گاڑی بھیجی کس نے؟" فہمیدہ نے صوفے پر بیٹھتے ہی پوچھا۔

"میں نے۔" زینی اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا اور وہ ایک جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھی۔ فہمیدہ اور نعیم ساکت و صامت اسے دیکھتے رہ گئے۔ ٹی وی یا اخباروں میں اسے دیکھنا اور بات تھی مگر اسے اپنی نظروں کے سامنے اس حیے میں دیکھنا اور بات۔ وہ تو چوبیس گھنٹے دوپٹہ لپیٹے رکھنے والی زینی سے واقف تھے۔ اب جو آ کر بالکل ان کے سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سگریٹ

کے کش لے رہی تھی، اس سے وہ بالکل ناواقف تھے۔

"میں نے بلایا تھا انہیں۔ کچھ ضروری باتیں کرنی تھیں ان سے۔" زینی نے ماں سے کہا۔ "آپ کھڑی کیوں ہیں زہرہ آپا آرام سے بیٹھ جائیں۔"

زینی نے زہرہ سے کہا جو بالکل حواس باختہ انداز میں کھڑی تھی۔ زینی کو ایک لمحہ کے لیے لگا وہ آج بھی اس کے باپ کے گھر کے صحن میں کھڑی ہے۔ سوپر نگتی انتظار کرتی کہ وہ اسے لے کر جاتا ہے یا نہیں۔

زہرہ کچھ ہچکچاتے ہوئے ایک صوفہ پر بیٹھ گئی لیکن زہرہ کی طرف اب کوئی متوجہ نہیں تھا۔

نعیم اور فہمیدہ زینی پر نظریں جھکائے ہوئے تھے بلکہ زینی پر نہیں، اس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کے درمیان پھنسے سگریٹ پر جسے وہ بڑے اطمینان سے پی رہی تھی۔ ان کے محلے میں تو کوئی مرد بھی یوں بے دھڑک سگریٹ نہیں پیتا تھا جس طرح وہ پی رہی تھی۔

ملازم ایک ٹرے میں جوس کے دو گلاس رکھ کر لے آیا اور اس نے ٹرے فہمیدہ کے سامنے کی۔

"ہم پر تو اس گھر کا پانی تک حرام ہے اور — " فہمیدہ نے ہمیشہ کی طرح وہی واویلا کرنا چاہا۔ زینی نے اس کی بات کاٹ کر ملازم سے کہا۔

"ایک گلاس مجھے دے دو اور دوسرا واپس لے جاؤ۔"

ملازم نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی ہدایت پر عمل کیا، فہمیدہ اور نعیم نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا، منتیں ہوتی تھیں۔ انہیں بے حد برا لگا۔ اتنا ہی برا نفیسہ کو لگا۔ وہ واقعی جوس پلانے کے لیے منت وسماجت کے سلسلے کا آغاز کرنے لگی تھیں مگر زینی نے ان کے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔

ایک ہاتھ میں سگریٹ لے کر دوسرے ہاتھ میں جوس کے گلاس سے دو سپ لینے کے بعد زینی نے گلاس پاس پڑی میز پر رکھ دیا۔

"میں اب اس مسئلے کا حل چاہتی تھی اور آپ لوگوں سے ملے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل سکتا تھا۔" زینی نے بات کا آغاز کیا اور فہمیدہ نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

"حل ہم نکال چکے ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کا رشتہ کر دیا ہے۔ بس چند دنوں میں شادی کرنے والے ہیں ہم لوگ۔"

اس کی بات پر نفیسہ اور زہرہ کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے مگر زینی اسی طرح بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی جوس کے سپ لیتی رہی۔

"لڑکی والوں نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ بڑی دھوم دھام سے شادی کریں گے۔ گھر بھر دیں گے جہیز سے۔ میرے بیٹے پر جان چھڑکتے ہیں وہ لوگ۔"

زینی نے فہمیدہ کو مزید بات نہیں کرنے دی۔

"بہت اچھا کرتے ہیں، اگر وہ یہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے اگر داماد کا کاروبار سرے سے ہو ہی نا اس کی دکان کا سامان پھنکوا کر پولیس نے اسے بند کروا دیا ہو تو جہیز اور سسرال کے جان چھڑکنے کی تو بہت ضرورت پڑتی ہے۔"

زیبی نے گلاس رکھتے ہوئے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔نعیم اور فہمیدہ بے اختیار ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔وہ یہ سب کیسے جانتی تھی۔خاندان میں سے کسی نے اسے یہ سب کچھ بتایا ہوگا۔انہیں پہلا خیال یہی آیا تھا مگر خاندان میں سے کون بتا سکتا تھا۔انہوں نے نعیم کی شادی وقتی طور پر ملتوی کی تھی مگر ہر ایک سے یہ بات چھپائی تھی کہ اسے دکان سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔نعیم آج کل صرف یہی دوڑ دھوپ کرنے میں مصروف تھا کہ کسی طرح اسے وہ دکان یا آس پاس کوئی اور دکان مل جاتی۔شادی اس کے ذہن سے مکمل طور پر غائب ہو گئی تھی اور اب وہ سامنے بیٹھی بڑے اطمینان سے اُسے یوں یہ قصہ سنا رہی تھی، جیسے یہ سب کچھ اس کے سامنے ہوا تھا۔

"تم سے کس نے کہا؟" نعیم نے بے ساختہ اس سے پوچھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے کہ کس نے کہا۔"

"جھوٹ ہے یہ سارا۔پولیس کا کیا تعلق ہے اس سارے معاملے میں۔وہ دکان میرے بیٹے ہی کے پاس ہے۔وہ تو شادی کی تیاریوں کی وجہ سے کچھ دنوں کے لیے بند کر دی ہے۔" فہمیدہ نے مداخلت کی تھی۔

"اچھا، میری دکان ہے مگر مجھے پتہ ہی نہیں کہ میرے بہنوئی کی دوسری شادی کی تیاریوں کے لیے اسے بند کیا گیا ہے۔حیرت ہے۔"

زیبی کے جملے پر نعیم کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"وہ دکان تم نے خریدی ہے؟"

"ہاں۔" زیبی نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"میرا سامان وہاں سے تم نے پھنکوایا؟"

"ہاں۔"

"تم نے جان بوجھ کر مجھے ذلیل کروایا؟" نعیم اب بھڑک اٹھا تھا۔

"ہاں۔" زیبی کے اطمینان میں ذرا برابر فرق نہیں آیا تھا۔

"اب ساری عمر بہن کو گھر بٹھا کر رکھنا کیونکہ میں اسے طلاق دے دوں گا۔"

نعیم نے اس دھمکی کا استعمال کیا جو ہمیشہ کارگر ثابت ہوئی تھی۔

"اگر بات طلاق کی ہے تو پھر یہ کام ابھی اور اسی وقت ہونا چاہیے۔کاغذ پین لے کر آؤ۔"

زیبی نے چائے کی ٹرالی اندر لاتے ہوئے ملازم سے کہا۔اس کے ساتھ اندر آتی ربیعہ نے زیبی کو بے حد ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔چند لمحوں کے لیے نعیم کچھ نہیں کہہ سکا۔یہی حال فہمیدہ کا ہوا تھا۔زیبی اس قدر دھڑلے سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔طلاق کے نام پر پہلے جو خوف اور سراسیمگی ضیاء کے خاندان کے ہر فرد کے چہرے پر نظر آنے لگتی تھی۔اب وہ یک دم غائب ہو گئی تھی یا کم از کم زیبی کے چہرے پر انہیں نظر نہیں آئی تھی اور یہ بات جاننے میں نعیم اور فہمیدہ کو دیر نہیں لگی کہ وہ ضیاء کی بیٹی تھی مگر ضیاء نہیں تھی۔

وہ ضیاء کے گھر کے صحن میں بیٹھے ہوتے تو زہرہ کو طلاق دے کر ہی اٹھتے مگر یہ زینی کے ڈیڑھ کنال کے گھر کا کمرہ تھا۔ یہاں انہیں بات تول کر کرنی تھی۔ ترازو پہلے بھی برابر نہیں تھا۔ پلڑا ان کی طرف جھکا ہوا تھا۔ ترازو اب بھی برابر نہیں تھا۔ پلڑا زینی کی طرف جھکا ہوا تھا۔

''طلاق ہوگی تو پھر نعیم اپنی تینوں بچیوں لے جائے گا۔'' فہمیدہ نے ایک اور حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی۔ وہ زہرہ کو آزمانا چاہتے تھے۔

''تینوں بچیوں کو ساتھ لیتے آنا۔'' زینی نے فہمیدہ کو بات مکمل بھی نہیں کرنے دی اور ٹرالی رکھ کر جاتے ہوئے ملازم سے کہا۔ ''آپ بڑی خوشی سے بچیاں اپنے ساتھ لے جا سکتی ہیں۔ نہ لے کر جائیں تو طلاق کے بعد ہم خود بھجوا دیں گے۔'' زینی نے سابقہ انداز میں کہا۔

''ہم ساری عمر بچیوں کو ماں سے ملنے نہیں دیں گے۔'' نعیم نے ایک اور دھمکی دی۔

''یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ ویسے بھی طلاق کے بعد زہرہ آپا یہاں گھر تھوڑی بیٹھی رہیں گے۔ وہ بھی دوسری شادی کر کے چلی جائیں گی۔ ان کے اپنے بچے ہو جائیں گے۔ ساری عمر ان بچیوں کا سوگ تھوڑی منائیں گی وہ۔''

فہمیدہ اور نعیم کے چہرے پر پہلی بار ہوائیں اڑنے لگی تھیں۔

''چائے تو یقیناً آپ لوگ نہیں پئیں گے کیونکہ اس گھر کی ہر شے حرام ہے آپ پر۔''

زینی نے بڑے اطمینان سے ٹرالی کھینچتے ہوئے اپنے لیے چائے بنانی شروع کی۔ اس کی پوری توجہ اس طرح چائے پر لگی ہوئی تھی جیسے وہ اسی ایک کام کے لیے ان سب کے بیچ بیٹھی ہو۔ کمرے میں اس کے علاوہ بیٹھا ہوا ہر شخص مکمل طور پر ہکا بکا تھا۔ نفیسہ، زہرہ اور ربیعہ کو خوف تھا کہ نعیم، کہیں طلاق دے ہی نہ دے اور نعیم اور فہمیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ طلاق کی دھمکی کیسے واپس لیں۔

''تم یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہو؟'' نعیم نے بالآخر جیسے تھک کر کہا تھا۔

''اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں، آپ کے پاس ہے۔ اس شہر میں آپ کہیں کوئی کام کرنا چاہیں گے، میں کام نہیں کرنے دوں گی۔ جو کچھ اب کروایا ہے وہی پھر کرواؤں گی اور یہ تب تک ہوتا رہے گا جب تک میری بہن میرے گھر بیٹھی ہے۔'' زینی نے اس بار دوٹوک انداز میں جیسے اعلان کیا تھا۔

''تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟'' نعیم نے بے یقینی سے کہا۔

''ہاں۔'' چائے میں چینی ڈالتے ہوئے اس کا لہجہ اتنا ہی ٹھنڈا تھا۔

''نفیسہ! تم کچھ کیوں نہیں بولتیں یہ ......'' فہمیدہ نے اس بار نفیسہ کو مخاطب کیا۔

''امی کچھ نہیں کہیں گی جو کہوں گی، میں کہوں گی۔ کاغذ اور پین آ گیا۔ طلاق لکھ دیں۔''

زینی نے ملازم کو اندر آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ کمرے میں بیٹھے ہر شخص کی جان پر بن گئی تھی۔ ملازم نے کاغذ پین لا کر نعیم کے سامنے رکھ دیا۔ زینی کیک کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اپنی پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔ وہ واقعی بہت مزے دار تھا۔ یہ اس کا فیورٹ کیک تھا۔ آلمنڈ کیک۔

''اگر کریم ہے تو تھوڑی کریم لا دو۔ میں کیک پر ڈالوں گی۔'' اس نے ملازم سے کہا۔ ملازم سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔

"آپ لوگ چائے پئیں گے، بنا دوں؟"

زینی نے نفیسہ سے پوچھا انہیں لگا اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے۔ نعیم ان کی بیٹی کو طلاق لکھ کر دینے والا تھا اور وہ کیک پر کریم ڈال کر کھاتے ہوئے ان سے چائے کا پوچھ رہی تھی۔ یوں جیسے وہ کوئی فلم یا اسٹیج پلے دیکھنے بیٹھے تھے۔ زینی نے ٹرالی کے نچلے حصے میں کوئی اور چیز بھی تلاش کرنی شروع کی، بہت عرصے کے بعد اسے اپنے گھر میں بیٹھ کر اتنی بھوک لگ رہی تھی۔

ملازم تب تک کریم لے آیا تھا۔ زینی نے کریم کے دو چمچے کیک کے سلائس پر ڈالے اور ملازم کو اپنا سیل فون لانے کے لیے کہا۔

"بیگ بھی لے آنا۔ مجھے ذرا نکلنا ہے اور ڈرائیور سے کہنا، گاڑی نکال دے۔ بچیوں کا سامان بھی پیک کروا دینا۔" اس نے ملازم کو آخری ہدایت دی اور کانٹے سے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے نعیم کو دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ زینی کی آنکھوں میں کتنی بے خوفی، دلیری اور اس کے لیے تضحیک تھی، یہ جاننے کے لیے نعیم کو بہت دیر نہیں لگی تھی۔ جس بلی کو دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا تھا، وہ شیر پر جھپٹ پڑنے کے لیے تیار تھی۔

نعیم نے آنکھیں چرا لیں اور ماں کو دیکھا پھر پین اور کاغذ ایک طرف کرتے ہوئے بے حد کمزور آواز میں کہا۔

"کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے؟"

زینی کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ڈالتے رک گئی پھر اس نے ملازم سے کہا۔

"چائے سرو کریں ان لوگوں میں۔"

☆☆☆

اکبر اور نسیم اپنی تینوں بیٹیوں کے ساتھ اگلا پورا ہفتہ اس ہوٹل میں رہے اور شیراز ایک ایسے کرائے کے گھر کی تلاش میں جہاں وہ ان سب کو رکھ سکے اور پھر کسی کو بغیر شرم کے یہ بتا سکے کہ اس کے ماں باپ اس علاقے میں مقیم تھے۔ اگر وہ اپنا گھر چھوڑتے ہوئے اپنے خاندان اور محلے کے لوگوں کے سامنے اتنی بڑی بڑی باتیں کر کے نہ آئے ہوتے تو شاید کچھ عرصے کے لیے اپنے گھر واپس ہی چلے جاتے لیکن اپنا گھر چھوڑ کر آتے ہوئے وہ جو کچھ کہہ آئے تھے، اس کے بعد واپس جانا جیسے کنوئیں میں ڈوب مرنے کے مترادف تھا۔

اس ابتدائی جھٹکے کے بعد وہ اگلے کچھ دنوں میں نارمل ہوتے گئے۔ خاص طور پر جب شیراز نے انہیں ہوٹل سے ایک اچھے علاقے میں کرائے کے ایک گھر میں منتقل کر دیا۔ وہ شینا کے ہاتھوں ہونے والی اس بے عزتی کو تقریباً مکمل طور پر ہی بھول گئے۔ جو بھی تھا جیسا بھی تھا، بہر حال سعید نواز کا داماد بننے نے شیراز ہی کی نہیں، ان سب کی قسمت بدل دی تھی، ورنہ وہ اس جیسے کرائے کا گھر بھی کہاں لے سکتے تھے۔ چند دنوں کے لیے انہیں زینی یاد آئی تھی مگر آسائشات کی بہتات نے اسے ان کے ذہن سے ایک بار پھر فراموش کر دیا۔

شیراز ہر روز شام کو آفس سے واپسی پر ان کے پاس آتا اور اکثر رات کا کھانا وہیں کھا کر جاتا۔ وہ چاہتا تو رات بھی وہیں گزار سکتا تھا کیونکہ کم از کم شینا کے گھر میں اس کے وجود کی ضرورت نہیں تھی۔

شینا، سہ پہر میں جاگتی اور شام کے وقت تیار ہو کر باہر نکل جاتی پھر اس کی واپسی رات کے پچھلے پہر ہوتی تھی اس وقت تک شیراز حق سو وتری بیویوں کی طرح اس کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو چکا ہوتا۔ صرف ویک اینڈ ایسا ہوتا تھا جب دن کے وقت ان کا آمنا سامنا ہوتا اور ایسا جب بھی ہوتا شینا کسی نہ کسی بات پر اس کی بے عزتی کرنے سے نہ چوکتی۔ شیراز کی ساری احتیاط، سارے لحاظ کے باوجود اسے کوئی نہ کوئی وجہ مل ہی جاتی تھی۔

وہ شروع کے دنوں میں دم سادھے سب کچھ سنتا رہتا تھا۔ اس کا خیال تھا، اس طرح آہستہ آہستہ اس کا غصہ اور ناراضی ختم ہوتی جائے گی مگر بعد میں اسے احساس ہوا کہ یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ اس کی خاموشی اسے اور شیر کر رہی تھی۔ پھر وہ جھگڑے کے وقت گھر سے باہر جانے لگا۔ مگر یہ طریقہ بھی ناکام رہا۔ شینا اب اسے بزدلی کے طعنے دینے لگی تھی۔ شیراز خون کے گھونٹ پیتا مگر یہ جان نہیں پایا کہ شینا کا اس کے بارے میں ہر اندازہ سو فیصد ٹھیک تھا، وہ عمر میں اس سے ایک آدھ سال چھوٹی سہی مگر اس جیسے انسان کو سمجھنے کے لیے درکار عقل اور تجربے کی بہر حال اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔

وہ گھر میں ہوتی تو شیراز دبے پاؤں پورے گھر میں اس سے بچتا پھرتا اور جس وقت وہ گھر سے باہر نکل جاتی، شیراز کی جیسے جان میں جان آجاتی۔

مگر اس ساری بے عزتی کے باوجود شیراز کو یہ زندگی پسند تھی۔ گھر کے اندر اس کے ساتھ جو بھی ہو رہا تھا مگر سوسائٹی میں اس کی کلاس اور اسٹیٹس بدل چکا تھا۔ وہ اب سعید نواز کا داماد تھا اور سوسائٹی اسے سعید نواز کے داماد والا پروٹوکول ہی دے رہی تھی۔

وہ اب ایک مختلف کلاس کے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور چلتا پھرتا تھا۔ کوئی اس کی عدم موجودگی میں اس کے بارے میں جو چاہے کہتا ہو، بہر حال اس کے سامنے ہر ایک اس کی عزت کرتا تھا۔

اپنے کامن کے مڈل کلاس ساتھیوں اور افسروں کے ٹولے کو چھوڑ کر اس نے ایک لمبی اڑان بھری تھی اور اسے یقین تھا، وہ سب ساتھی اس کی قسمت پر اسی طرح رشک اور حسد کر رہے ہوں گے جس طرح اس کے رشتہ دار اور پرانے محلے کے لوگ کرتے تھے۔

سعید نواز کے کہنے پر وہ دھڑا دھڑ ان فائلز کو سائن کرنے میں جت گیا تھا، جنہیں سائن کرنے پر ملنے والا ''معاوضہ'' اوپر اور نیچے کے مختلف افسروں اور ملازمین میں تقسیم ہونے کے باوجود لاکھوں میں ہوتا۔ حکومت پاکستان اسے مہینے کے 26 دن ہر روز آٹھ گھنٹے کام کرنے کا معاوضہ چند ہزار روپے کی صورت میں دیتی تھی اور پاکستان کے چند لوگ صرف چند سیکنڈز میں ایک دستخط کرنے کا معاوضہ لاکھوں کی صورت میں۔

لیکن ان لاکھوں میں، وہ کتنے اپنی مرضی سے خرچ کر سکتا تھا، یہ اسے بہت جلدی پتا چل گیا تھا۔

پہلی فائل کو سائن کرنے کا معاوضہ ملتے ہی ایک ویک اینڈ پر شینا نے اس سے کہا تھا۔

''مجھے کل شاپنگ کے لیے جانا ہے۔

I need some money'' وہ بہت دنوں کے بعد اکٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میرے والٹ سے لے لینا۔'' شیراز نے فوراً اس سے کہا۔

''شاپنگ کے یہ پیسے۔'' شینا نے کھانا کھاتے کھاتے رک کر تیکھے تیوروں کے ساتھ اس سے کہا۔

"شاپنگ کے لیے پیسے۔" شیراز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے اس بار ناراض ہونے والی کیا بات کہی تھی۔

"تمہارے والٹ میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ ہوگا؟" شینا کے سوال پر حیران ہوا۔ "نہیں مگر تمہیں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تو ضرورت نہیں۔ تمہیں تو شاپنگ کے لیے رقم چاہیے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، میں کہاں شاپنگ کرتی ہوں گی؟ جمعہ بازار میں یا اچھرہ اور انارکلی کی سیلوں میں؟ کبھی تو اپنی لوئر مڈل کلاس ذہنیت مت دکھایا کرو۔" شینا نے بے حد ناراضی سے کہا۔

"مگر شینا! لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی شاپنگ۔ میری Pay تو صرف...." شیراز نے ہکلاتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر شینا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہاری Pay کی بات کون کر رہا ہے؟ میرے باپ نے تمہاری Pay دیکھی ہوتی تو تمہیں اپنا داماد بنایا ہوتا؟ آج جو فائل سائن کر کے تمہیں آٹھ لاکھ ملے ہیں، میں ان کی بات کر رہی ہوں۔" شیراز منہ کھول نہیں سکا۔ اسے یقیناً سعید نواز نے یہ انفارمیشن دی تھی مگر وہ پھر بھی پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ بینک میں میرا اور اپنا ایک جوائنٹ اکاؤنٹ کھلواؤ تاکہ مجھے پتا چلے کہ تم پیسے کا کیا کر رہے ہو؟" شینا نے بے حد بلند آواز میں اس سے کہا۔

"شینا! میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی فیملی کے لیے ایک گھر خرید لوں کیونکہ...."

شینا نے اس کے مصالحانہ انداز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

"کیوں، تمہاری فیملی کو اس پرانے گھر میں رہتے ہوئے کیا تکلیف ہوتی ہے؟ ساری عمر انہوں نے وہاں گزاری ہے۔ اب چار دن اس گھر میں رہ کر ان سے وہاں رہا نہیں جا رہا۔" اس کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ میرا بھی تو کوئی فرض بنتا ہے۔ اپنے ماں باپ اور بہنوں کے لیے۔"

شینا نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"پہلے تم ان فرائض کو دیکھو جو تمہارے میری طرف بنتے ہیں پھر اپنے ماں باپ کو دیکھنا۔"

وہ چیخ بیل پر تقریباً پھینکتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔ شیراز کو اس وقت پہلی بار سعید نواز پر غصہ آیا۔ شینا کے مزاج کو جاننے کے باوجود انہوں نے اسے ان آٹھ لاکھ روپوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔ شیراز کو غصہ نہ آتا تو کیا ہوتا۔

☆☆☆

ہر گزرے دن کے ساتھ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کے ہاتھ کس حد تک بندھے ہوئے تھے وہ اگر یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی پوسٹنگ کے پہلے ہی سال کروڑوں کی جائیداد بنائے گا تو یہ اس کی خوش فہمی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔ صرف شینا کے کہنے پر وہ کبھی بھی جوائنٹ اکاؤنٹ نہ کھلواتا مگر شینا کے مطالبے کے دوسرے ہی دن سعید نواز نے بھی اس سے یہی کہا تھا نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے بینک کا ایک فارم بھی اسے بھجوا دیا تھا۔ اور یہ جیسے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف تھا۔

شیراز کو نہ چاہتے ہوئے بھی جوائنٹ اکاؤنٹ کھولنا پڑا اور اکاؤنٹ کھولنے کے کچھ عرصہ میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے اکاؤنٹ میں اتنی تیزی سے روپے آ نہیں رہے تھے جتنی تیزی سے روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ شینا اس کی اس طرح کی آمدنی کا آدھے سے زیادہ حصہ ہر ماہ خرچ کر دیتی تھی اور ہر ماہ کے آخر میں اکاؤنٹ میں صرف چند لاکھ رہ جاتے۔ شیراز خون کے گھونٹ پیتا رہتا اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شکایت کرے تو کس سے کرے؟

سعید نواز کے نزدیک یہ چیز قابل اعتراض سرے سے تھی ہی نہیں۔ یہ وہ بہت پہلے جان چکا تھا۔ اس پیسے کو اس طرح اڑانا اگر قابل اعتراض ہوتا تو سعید نواز خود اسے لاکھوں کی گاڑی اتنی لاپروائی سے نہ تھماتے نہ ہی ڈھیروں روپیہ اس کے اس گھر پر لگا دیتے جہاں وہ شینا کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ بڑے لوگوں کا لائف اسٹائل تھا اور وہ سعید نواز سے ایسی کوئی بات کہہ کر اپنی تذلیل نہیں کروانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ روپیہ اس کی خون پسینے کی کمائی نہیں تھی پھر بھی اسے یوں خرچ ہوتے دیکھ کر اسے ایسی تکلیف ہوتی تھی جیسے اس کے لیے اس نے جان ماری ہو۔ اس نے شروع شروع میں شینا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس سے یہ کہنے کی بجائے کہ وہ شاپنگ پر اس طرح روپیہ نہ لٹائے اس نے اسے یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ انہیں روپیہ جمع کرنا چاہیے تاکہ مشکل وقت میں کام آئے۔

شینا پلکیں جھپکائے بغیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

”کون سا مشکل وقت؟“

شیراز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ فوری طور پر مشکل وقت کی وضاحت کس طرح کرے۔

”مشکل وقت سے بچنے کے لیے ہی میں نے جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوایا ہے تاکہ مجھے پتا ہو کہ تمہارا پیسہ کہاں جا رہا ہے۔ پھر تم مجھے کس مشکل وقت کے لیے تیار کر رہے ہو؟ اگر تمہارا خیال ہے کہ میں ایک ایک روپیہ جمع کروں گی تاکہ کل تمہاری کسی حماقت کی وجہ سے اگر کوئی مصیبت آئے تو میں پلیٹ میں رکھ کر یہ سارا روپیہ تمہیں پیش کر دوں تو اپنی اس خوش فہمی کو تم جتنی جلدی دور کر لو اتنا بہتر ہے۔ جس کلاس سے میرا تعلق ہے وہاں روپیہ خرچ کرنے کے لیے کمایا جاتا ہے۔ بچت کے لیے نہیں، ہمارے یہاں عورتیں روپیہ جمع کرتے ہوئے تمہاری کلاس کی عورتوں کی طرح زندگیاں نہیں گزارتیں اس لیے دوبارہ مجھے کبھی مشورہ مت دینا، سمجھے؟ یہ مشورے تم اپنے خاندان کی عورتوں کو دو تو زیادہ بہتر ہے۔“

شینا نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

شیراز کو دوبارہ اسے یہ مشورہ دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ شینا سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس تذلیل سے ڈرتا تھا جو وہ بلا جھجک چند منٹوں میں کسی

کے سامنے بھی کر سکتی تھی۔ وہ تیز مزاج کی تھی۔ ماں باپ کی بگڑی ہوئی اولاد تھی۔ یہ تو اسے سمجھ میں آتا تھا مگر وہ اس سے اتنی خار کیوں کھاتی تھی؟ یہ شیراز کو سمجھ میں نہیں آتا تھا اور اسے اتنا ناپسند کرنے کے باوجود اس نے اس سے شادی کیوں کر لی تھی؟ یہ بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

سعید نواز اس پر زبردستی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شادی سے پہلے اور بعد میں کبھی بھی سعید نواز کو شینا کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بعض دفعہ تو وہ اسے شینا کے سامنے اپنے سے زیادہ مجبور اور بے بس لگتا۔ مگر فرق یہ تھا کہ شینا بہرحال باپ سے محبت کرتی تھی اور اس کا بے دھڑک اظہار بھی کرتی تھی اور خود اس کے لیے وہ دل میں کیسے جذبات رکھتی تھی، یہ جاننے کے لیے شیراز کو کسی نجومی یا جوتشی کی ضرورت نہیں تھی۔

اور پھر اس کی یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سب کے بعد بھی آخر شینا نے اس سے شادی کیوں کی تھی۔ وہ کئی بار اس معمے کو حل کرنے کے لیے سر پٹختا رہتا اور پھر جب ناکام ہوتا تو اسے اپنی خوش قسمتی کے علاوہ اور کچھ نہ سمجھتا۔

☆☆☆

اس دن زبیدہ، اکبر اور نسیم سے ملنے آئی تھیں اور یہ جان کر کچھ حیران ہوئی تھیں کہ شیراز اور شینا ان سب سے الگ رہ رہے تھے۔

محلے کا گھر چھوڑتے ہوئے ان سب نے ہر ایک سے یہی کہا تھا کہ وہ شیراز کے ساتھ اس نئے گھر میں منتقل ہو رہے ہیں اور اب انہیں بیٹے اور بہو سے الگ رہتا دیکھ کر اگر حیرانی ہوئی تھی تو یہ ایسی حیرت کی بات نہیں تھی۔ اکبر اور نسیم انہیں وضاحتوں پر وضاحتیں دیتے رہے ان میں سے کتنی وضاحتیں زبیدہ کو مطمئن کر سکی تھیں۔ وہ نہیں جانتے تھے۔

زبیدہ، ربیعہ کے ساتھ عمران کی منگنی ختم کرنے کے بعد اب عمران کے لیے نزہت کے رشتے کی خواہش مند تھیں اور اکبر اور نسیم خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ نسیم جو وقتاً فوقتاً زبیدہ کو ربیعہ کے ساتھ عمران کا رشتہ ختم کرنے کے لیے اکساتی رہی تھیں اس کے پس پشت ان کا یہی ارادہ کارفرما تھا جو اب ان کے سامنے پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

مگر شیراز کے سامنے اکبر اور نسیم نے اس شام جیسے ہی زبیدہ کی آمد اور عمران کے رشتے کی بات کی تو وہ بری طرح جھتے سے اکھڑ گیا۔

''اب ایک چپڑاسی کے ساتھ میں اپنی بہن کی شادی کروں گا اور اپنے سسرال والوں اور ملنے والوں کو کس منہ کے ساتھ بتاؤں کہ کس کے ساتھ رشتہ داری ہونے والی ہے میری؟ میں نے کتنی مشکل سے اس محلے اور خاندان سے جان چھڑائی ہے اور آپ لوگوں کو ایک بار پھر وہی سب کچھ کھینچنے لگا ہے۔ صاف صاف بتا دیں خالہ زبیدہ کو کہ ہمیں ان کے بیٹے کے ساتھ نزہت کا رشتہ نہیں کرنا، وہ جہاں چاہیں رشتہ کریں۔''

شیراز نے تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے ماں باپ سے کہا۔

اکبر اور نسیم بے حد تشویش کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

''مگر بیٹا! خاندان میں ایک زبیدہ اور اس کا بیٹا ہی ہیں جو کچھ بہتر ہیں اکلوتا بیٹا ہے زبیدہ کا اور وہ بھی کویت میں۔ گھر بار بھی اپنا ہے، میری تو برسوں سے خواہش تھی کہ نزہت کی شادی عمران سے ہو یہ تو زبیدہ کے سر پر ربیعہ کو بہو بنانے کا بھوت سوار ہو گیا تھا، ورنہ میں تو اشارے کنائے میں کئی بار زبیدہ کو نزہت کے بارے میں جتاتی رہی ہوں۔ ابھی بھی میرے کہنے پر ہی ربیعہ کے ساتھ رشتہ ختم کیا ہے اس نے اور نزہت کا

ہاتھ مانگا ہے۔" نسیم نے شیراز کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں اب وہ اس لیے آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگ رہے ہیں کیونکہ آپ کا بیٹا افسر ہے اور آپ اس گھر میں بیٹھے ہیں۔ میں دیکھتا اگر میں افسر نہ ہوتا تو زبیدہ خالہ کس طرح نزہت کے رشتے کی بات کرتیں۔ آپ انکار کر دیں انہیں۔ جب مجھے اپنی بہنوں کو لاکھوں کا جہیز دینا ہے تو پھر میں اپنی مرضی کے خاندان ان کے لیے منتخب کروں گا۔ آپ اس خاندان کو بھول جائیں۔"

شیراز نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"لیکن بیٹا! تمہارے سامنے کتنے لوگ نزہت کو دیکھ کر گئے اور پھر واپس نہیں آئے اب "

شیراز نے نسیم کی بات کاٹ دی۔

"وہ تب ہوتا تھا جب ہماری جیب خالی تھی امی! اب کوئی ایک افسر کی بہن کو ریجیکٹ کرتے ہوئے دوبار سوچے گا۔"

شیراز نے بے حد تفخر سے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا اس نے جو کچھ کہا غلط نہیں تھا۔

اگلے تین ماہ میں سعید نواز کے توسط سے ایک بہت اچھی جگہ پر نزہت کا رشتہ ہو گیا تھا۔ اس کی کم تعلیم اور واجبی شکل وصورت کے باوجود وہ ایک بزنس مین فیملی تھی اور اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے۔

اکبر اور نسیم پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نزہت کے لیے ایسے خاندان میں رشتہ کا نہیں سوچا تھا۔ ورنہ زبیدہ کو انکار کرنے کے بعد وہ دونوں اندر ہی اندر خاصے متفکر تھے اور اس پریشانی میں مختلف لوگوں سے ان باتوں کو سن کر اضافہ ہو رہا تھا جو خاندان کے لوگ ان کے بارے میں کر رہے تھے۔ زبیدہ کو خاص طور پر ان پر بہت غصہ تھا۔

شیراز کی شادی جتنی خاموشی اور سادگی سے ہوئی تھی نزہت کی شادی اتنی ہی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور اس دھوم دھام کا سہرا بلاشبہ شیراز کے سر ہی تھا۔ اس نے نزہت کی شادی پر دونوں ہاتھوں سے پیسہ خرچ کیا تھا۔

زندگی میں پہلی دفعہ یہ پورا خاندان کل کی فکر کیے بغیر پیسہ خرچ کر رہا تھا اور کچھ اس لیے بھی کیونکہ یہ دھوم دھام نزہت کے سسرال والوں کی ڈیمانڈ بھی تھی۔

اگرچہ ان لوگوں نے باقاعدہ طور پر شیراز یا اکبر اور نسیم سے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا کہ انہیں نزہت کے گھر والوں سے کس قسم کے جہیز کی توقع تھی مگر شیراز نے ان کی ہر توقع پوری کی تھی۔

شادی کے انتظامات پر خرچ ہونے والی رقم کا ایک بڑا حصہ سعید نواز نے دیا تھا۔

شیراز کی شادی کی طرح نزہت کی شادی پر بھی اکبر اور نسیم نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو مدعو کیا تھا نہ خاندان کے افراد کو، نہ ہی محلے میں اپنے شناسا گھروں کے افراد کو۔ یہ سب شیراز کے کہنے پر ہوا تھا۔ شادی کی تقریب میں صرف شیراز کے ملنے والے افراد تھے اور یہ سب وہ لوگ تھے جن سے اکبر اور نسیم واقف نہیں تھے۔ مگر ان میں سے کسی کو اس بات پر کوئی شرمساری نہیں تھی کہ وہ سب اپنے خاندان سے کٹ گئے تھے۔

وہ اس بات پر بے حد مطمئن تھے کہ وہ بالآخر اس ماضی اور اس خاندان کو چھپانے میں کامیاب ہو گئے تھے جو ان سب کے لیے شرمندگی کا باعث تھا۔

شینا نزہت کی شادی پر شیراز اور اس کے گھر والوں کی منتوں اور اصرار کے باوجود شامل نہیں ہوئی تھی اور صرف یہی نہیں اس نے شادی کے بعد بھی نزہت کے شوہر یا سسرال کو گھاس نہیں ڈالی تھی۔ یہاں تک کہ تب بھی نہیں، جب شیراز نے اپنے گھر پر نزہت اور اس کے شوہر کو کھانے پر بلایا تھا۔ شیراز کے لیے اتنا ہی کافی تھا شینا نے ان دونوں کو اپنے گھر کھانے کے لیے بلانے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

نزہت کے شوہر اور سسرال والوں کو اگر منہ مانگا جہیز نہ ملا ہوتا اور شیراز ایک سی ایس پی آفیسر نہ ہوتا تو شینا کی یہ بے اعتنائی اور یہ رویہ نزہت کو خاصا مہنگا پڑتا مگر فی الحال اس کے سسرال والے اس کی جی حضوری میں لگے ہوئے تھے اور شینا کی وجہ سے شیراز اور نزہت کو محسوس ہونے والی خفت کو مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھے۔

☆☆☆

تقریباً چھ ماہ بعد شیراز بالآخر اپنے ماں باپ کے لیے ایک گھر خریدنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس گھر کی خریداری کے لیے ایک بار پھر اس نے سعید نواز کے سامنے جھولی پھیلائی تھی اور سعید نواز نے ہمیشہ کی طرح اسے اس بار بھی خالی ہاتھ نہیں بھیجا تھا۔ اگرچہ وہ گھر شیراز کی حسب خواہش کسی پوش علاقے میں نہیں خریدا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اچھے علاقوں میں سے ایک تھا اور اس گھر میں منتقل ہوتے ہی اکبر اور نسیم نے ایک بار پھر اپنے خاندان کے کچھ قریبی لوگوں اور چند پرانے محلے داروں سے میل جول دوبارہ شروع کر دیا تھا۔

وہ جب سے اس محلے کو چھوڑ کر آئے تھے ان کی زندگی بے حد عجیب اور بے رنگ ہو گئی تھی۔ گھر میں اب ایک آدھ ملازم کے ہونے کی وجہ سے گھر کا کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکبر اور نسیم سارا دن ٹی وی دیکھتے یا اپنی بیٹیوں سے باتیں کرتے جو شروع میں تو ان ہی کی طرح اس گھر میں آ کر خوشی سے پھولے نہ سماتی تھیں لیکن پھر آہستہ آہستہ بولائی پھرتی تھیں۔ آس پاس کے گھروں میں رہنے والے لوگوں سے ان کا رابطہ نہ ہونے کے مترادف تھا۔

ان میں اور آس پاس رہنے والے لوگوں کی کلاس اور مزاج میں بہت زیادہ فرق تھا۔ وہاں زیادہ تر ورکنگ کلاس کے گھر تھے جہاں گھروں میں پیسے کی افراط نہ سہی مگر تعلیم کی افراط تھی اور گھر کے تقریباً سب ہی افراد تو جاب کرتے تھے یا پھر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ صرف ان ہی کا گھر ایسا تھا جہاں تین لڑکیاں میٹرک کے بعد گھر میں بیٹھ گئی تھیں۔

نزہت کی شادی کے بعد یہ تعداد دو رہ گئی تھی اور گھر تبدیل ہو گیا تھا مگر علاقہ ایک بار پھر ویسا ہی تھا اور اس علاقے میں اکبر اور نسیم کے لیے اپنی عمر کے افراد کو تلاش کرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا اسی طرح کے افراد کو ڈھونڈنا۔

ان کے محلے میں شیراز ایک ہی افسر تھا اور وہ واحد افسر کے والدین۔ اس علاقے میں تقریباً ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی سرکاری ملازمت میں کم و بیش اس گریڈ میں تھا جس میں شیراز۔ اس لیے کوئی افسر بیٹے کے تعارف پر بھی کسی خاص اور غیر معمولی جوش اور رشک کا اظہار نہیں کرتا تھا۔

جس اعزاز نے ان کے قد میں اضافہ کیا تھا۔ وہ اعزاز اس علاقے میں کئی لوگوں کے پاس تھا۔ وہ سب ایک بار پھر خود کو بونا محسوس کرنے لگے تھے اور اس حالت میں ایک بار پھر یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ان لوگوں سے ملتے جنہیں مل کر انہیں اس کی ذہنی کیفیت سے نجات ملتی۔

اس میل جول کے بارے میں شیراز کو پتا نہیں تھا۔ اگر پتا ہوتا تو وہ ہنگامہ برپا کر دیتا۔ اکبر اور نسیم بڑی ہوشیاری سے اس سے یہ بات چھپائے ہوئے تھے کہ وہ ایک بار پھر اس محلے میں جانے لگے ہیں اور وہاں کے لوگ ان کے گھر میں وقتاً فوقتاً آنے بھی لگے ہیں۔

اکبر اور نسیم اگر خاندان کے لوگوں سے دوبارہ رابطے بڑھانے میں مشغول تھے تو دوسری طرف شیراز اپر کلاس میں قدم جمانے میں۔ جن چیزوں کو اس نے سب سے پہلے چھوڑا تھا۔ ان میں سے ایک اپنی زبان تھی۔ وہ ساری زندگی پنجابی بولتا رہا تھا اور اب اگر بھولے سے بھی پنجابی کا کوئی لفظ اس کی زبان سے نکل جاتا تو اسے جیسے کرنٹ لگتا۔ شینا اور سعید نواز اور ان کے رشتہ دار اور دوست احباب آپس میں زیادہ تر انگریزی میں بات کرتے تھے۔ وہ لوگ اردو بھی بولتے تو انگریزی نما اردو۔

خود شیراز کے آفس میں بھی یہی زبان بولی جاتی تھی۔ سول سروسز اکیڈمی اور اس کا ڈیپارٹمنٹ زبان کے معاملے میں اسے اتنا محتاط نہیں کر سکا تھا جتنا شینا اور اس کے سسرال والوں نے کر لیا تھا۔

وہ انگلش روانی سے بول سکتا تھا مگر اس طرح کی اور اس لہجے میں نہیں جو وہ شینا اور اپنے سسرال والوں سے سنتا تھا اور وہ ان جیسا بننے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ وہ، وہ پرندہ تھا جس نے دوسرے پرندوں کے پروں کے خوب صورت رنگوں کو دیکھ کر ان جیسا بنانے کے لیے اپنے پروں کو مصنوعی رنگوں میں ڈبونا شروع کر دیا تھا اور ہر بار پانی پڑتے پر اس کا سارا رنگ دوسرے پرندوں کے سامنے اتر جاتا اور وہ کوئی سبق حاصل کرنے یا شرمندہ ہونے کے بجائے ایک بار پھر اپنے جسم کو رنگنے میں مصروف ہو جاتا۔

وہ اب ان کلبز اور جگہوں پر جاتا جہاں پہلے جانے کے وہ صرف خواب دیکھتا تھا۔ سعید نواز کے داماد کے لیبل نے جیسے اسے اپر کلاس کے سوشل سرکلز میں وائلڈ کارڈ انٹری دے دی تھی۔

شینا کی ساری بدتمیزیوں اور تذلیل کے باوجود شیراز کو شینا جیسی بیوی کا شوہر ہونے پر فخر تھا۔ اس کے اعتماد، لباس اور شخصیت نے جیسے شیراز کے اندر سارے کمپلیکس کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا لباس جتنا قابل اعتراض بھی ہوتا شیراز کو وہ ہمیشہ اسٹائلش لگتا تھا کیونکہ وہ اس سوشل سرکل کو اسٹائلش لگتا تھا، جس میں وہ موو کرتے تھے۔

شینا بہت کم ہی اس کے ساتھ کسی پارٹی میں جاتی تھی۔ شیراز زیادہ تر سعید نواز کے ساتھ ہی پارٹیز میں جایا کرتا تھا۔ مگر جس پارٹی میں شینا اس کے ساتھ جاتی اس میں شیراز کو واقعی یہ لگتا کہ اس کے قد و قامت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے لگتا ایسی ہر پارٹی میں ہر کوئی شینا کے شوہر کو دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتا تھا۔ شیراز کو ایک عجیب سا غرور ہوتا تھا۔

وہ لاہور کی سب سے زیادہ اسٹائلش اور ماڈرن لڑکیوں میں سے ایک کا شوہر تھا مگر وہ زیادہ عرصے تک اپنے آپ کو یہ فریب بھی نہیں دے سکا تھا۔

شادی کے چھٹے ماہ ایک سہ پہر وہ کسی کام سے گھر سے نکلا تھا جب پورچ میں ایک گاڑی سے اترتے ایک بے حد ہینڈسم لڑکا اسے دیکھ کر مسکرایا اور پھر اس بچے کو گاڑی سے اتارنے لگا جو ہاتھ میں ایک کھلونا پکڑے ہوئے تھا۔

شیراز نے بے حد حیرانی اور الجھے ہوئے انداز میں اس لڑکے کو دیکھا۔ وہ کون تھا شینا کا کوئی کزن ؟ کیونکہ جتنے اطمینان سے وہ شیراز کو مکمل طور پر نظرانداز کیے گاڑی سے اترا تھا اس انداز میں کوئی اجنبی تو نہیں اتر سکتا تھا۔

"جی میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

شیراز نے بے حد شائستہ انداز میں اس لڑکے کو متوجہ کیا۔ وہ چونک کر اس کی طرف پلٹا پھر بے حد خوشگوار اور بااخلاق انداز میں آگے بڑھ کر شیراز سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"سوری، میں اپنا تعارف کروانا تو بھول ہی گیا۔ میں سہیل ہوں۔"

"سہیل کون؟ میں نے ابھی بھی نہیں پہچانا۔" شیراز نے قدرے معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا۔ وہ اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے سہیل نامی کسی کزن کو برآمد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ نے اس لیے نہیں پہچانا کیونکہ ہم دونوں کبھی ملے ہی نہیں۔" اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں اسی لیے۔" شیراز اس بار مسکرایا۔

"میں شینا کا ایکس ہزبینڈ ہوں۔" اس لڑکے نے اسی خوشگوار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

کسی نے شیراز کے سر پر جیسے بم دے مارا تھا۔

شیراز کو کچھ دیر کے لیے لگا جیسے اسے سننے میں کچھ غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح سہیل کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی غلط فہمی دور کرنے کے لیے گلا صاف کیا اور پوچھا۔

"آپ نے کیا کہا؟"

"میں شینا کا ایکس ہزبینڈ ہوں، سہیل...."

سہیل نے اسی فراٹے سے کہا۔ لیکن اس بار وہ قدرے محتاط لہجے میں بولا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیراز کو اس کے "محل وقوع" کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔

شیراز کے سر میں اس بار صحیح معنوں میں آندھیاں چلنے لگی تھیں۔ اس نے سہیل سے نظریں ہٹا کر اس کے ساتھ کھڑے اس چھوٹے سے بچے کو دیکھا، جو اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

اس نے اس صورت حال میں اس کلاس کے ہر ممکنہ ردعمل کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی جس سے اس کا تعلق تھا۔

سابقہ شوہر اور موجودہ شوہر کا آمنا سامنا ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے محلے، اس کے خاندان اور اس کے طبقے میں یہ صورت حال پیش

آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ کوئی شوہر کبھی بھی اپنی سابقہ بیوی کے گھر نہ جاتا اور نہ ہی جا سکتا تھا۔ مگر سوال یہ نہیں تھا کہ وہ وہاں کیوں آیا تھا؟ سوال یہ تھا کہ وہ تھا ہی کیوں؟ شینا کا پہلا شوہر؟ دھوکا، فریب، کوئی اور معاملہ ہوتا تو اس کے اندر غصے کا آتش فشاں بھڑک اٹھنا چاہیے تھا، مگر اس کے لیے یہ شاک اتنا شدید تھا کہ اشتعال بھی اس کے اندر پیدا ہی نہیں ہو رہا تھا۔

اسے بے حد خوبصورتی کے ساتھ بے وقوف بنایا گیا تھا اور اسے اندازہ بھی نہیں ہوا تھا وہ ساکت کھڑا سہیل کی شکل دیکھ رہا تھا اور سہیل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب اس سے کیا کہے۔ وہ وہاں اس سے ملنے نہیں آیا اور شیراز کا ردعمل اسے ''بور'' بھی کر رہا تھا۔

اسے گونگے لوگوں سے ملنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

اس سے پہلے کہ دونوں کے درمیان آنے والی خاموشی ٹوٹتی۔ شینا اندر راونج سے نکل آئی تھی اور سہیل کو دیکھتے ہی بے حد گرم جوشی سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

''ارے سہیل تم! کب آئے؟'' شیراز نے اپنے عقب میں اس کی آواز سنی تو پلٹ کر اسے دیکھا مگر وہ تب تک آگے بڑھ کر سہیل کے گلے لگ گئی۔

''بس ابھی آیا ہوں۔'' سہیل نے اس سے گلے ملتے اور اس کے گال چومتے ہوئے کہا۔

اور شیراز کے جسم میں جیسے کاٹو تو لہو نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ ناقابل تصور بات تھی کہ دو طلاق یافتہ افراد ایک دوسرے کے ساتھ اتنی گرم جوشی کے ساتھ مل رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا اسے ڈوب کر مر جانا چاہیے۔ لیکن اگلے لمحے لگنے والے کرنٹ کے ایک اور جھٹکے نے جیسے اس کے ذہن سے یہ خیال بھی نکال دیا تھا، سہیل کے قریب کھڑا بچہ اب بڑی بے تابی کے ساتھ شینا سے لپٹا تھا اور یہ اس کے منہ سے نکلنے والا ''ممی'' کا لفظ تھا، جس نے شیراز پر ایک اور قیامت ڈھائی تھی۔ آخر ایک دن میں کتنی قیامتیں ٹوٹ سکتی تھیں کسی پر؟

شینا اب اس بچے کو چومنے اور اس سے باتیں کرنے میں مصروف تھی اور سہیل ہنستے ہوئے شینا اور اس بچے کو دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شیراز کو لگا، وہ تینوں اب بھی فیملی تھے، صرف ایک وہ تھا جو وہاں غیر ضروری تھا۔

''تم ابھی تک یہاں کیوں کھڑے ہو؟ اندر آؤ نا۔''

شینا کو جیسے ایک دم خیال آیا۔ اور پھر وہ سہیل کا بازو تھامے اور اس بچے کو دوسرے ہاتھ سے انگلی سے پکڑے وہ اندر چلی گئی۔ اس نے شیراز کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی اور شیراز کو اگر اس کے چہرے پر کوئی ندامت شرمندگی یا جھوٹ کھل جانے کے بعد والے تاثرات دیکھنے کی موہوم سی بھی امید تھی تو وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔

وہ تینوں اب گھر کے اندر والے حصے میں غائب ہو چکے تھے۔ صرف وہی تھا جو وہیں کھڑا تھا۔ شینا کی شادی اس سے کیوں ہوئی تھی۔ اب یہ راز راز نہیں رہا تھا۔ شیراز چند منٹوں کے اندر اندر آسمان سے زمین پر گر پڑا تھا۔

سابقہ شوہر، ایک دو سالہ بچہ، اور کیا تھا شینا کے ماضی میں، وہ آتش فشاں جو اس کے اندر پھٹنا تھا اب پھٹ رہا تھا۔ سادگی سے شادی

کیوں ضروری تھی؟ تاکہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکی جاسکے۔ اور جواد کیا کر رہا تھا؟ سب کچھ جانتے ہوئے بھی شیراز کے لیے چارہ تیار کر رہا تھا۔ اور وہ بے حد آرام سے اس میں پھنس گیا تھا۔ اسے سعید نواز پر غصہ آ رہا تھا۔ شدید غصہ۔

وہاں غصے میں ابلتے وہ کتنی دیر بے مقصد کھڑا رہا۔ اسے اندازہ نہیں ہوا۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ اسے کہیں جانا تھا۔

سہیل جلد ہی باہر نکل آیا تھا۔ شینا باتیں کرتے ہوئے اس کے ساتھ تھی اور وہ بچہ شینا کے ساتھ۔

"اچھا شیراز See you۔" سہیل نے باہر نکلتے ہوئے شیراز سے کہا۔ اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شیراز نے اس بار اس کا ہاتھ نہیں پکڑا وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ اسے کھا جانے والے انداز میں گھورتا رہا۔ اسے بالآخر یاد آ گیا تھا کہ اس کی کلاس ایسی صورت حال میں کس طرح react کرتی تھی۔ سہیل نے چند لمحے انتظار کیا پھر وہ شینا سے پہلے کی طرح گلے ملا، اپنے بچے سے ملا، اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ شینا وہیں کھڑی بڑی محبت کے عالم میں اسے جاتا دیکھتی رہی۔ گاڑی کے گیٹ سے نکلتے ہی وہ شیراز کی طرف مڑی اور اس نے بے حد تلخی سے چلاتے ہوئے کہا۔

"کسی کو کس طرح سی آف کرتا ہے۔ کم از کم یہ تو سیکھ لو تم۔"

"یہ تمہارا سابقہ شوہر تھا؟" شیراز نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔

"تم مجھے بتا رہے ہو یا مجھ سے پوچھ رہے ہو؟" شینا نے بے حد دبنگ انداز میں اس سے کہا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں؟" شیراز نے بے حد غصے سے کہا۔

"ہاں۔ جواب مل گیا؟"

"اور یہ تمہارا بچہ ہے؟" شیراز نے اس کے ساتھ کھڑے بچے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ کھڑا ہے تو میرا ہی بچہ ہوگا۔ تمہارا تو نہیں۔" وہ اسی دوبدو انداز میں بولی۔

"اور یہ تمہاری دوسری شادی ہے۔"

"میں صرف پہلی شادی کو شادی مانتی ہوں۔ جو رشتہ تمہارے ساتھ ہے۔ وہ مذاق ہے۔" شینا کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"اور تم لوگوں نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ مجھ کو دھوکا دیا۔" شیراز اس بار بے اختیار چلایا۔

"یہ تم جا کر پاپا سے پوچھو، مجھ پر چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی تم سے شادی کی۔ تمہیں زبردستی میرے سر پر تھوپا انہوں نے۔ کیونکہ تم میرے عشق میں مر رہے تھے۔" شینا نے اس سے زیادہ بلند آواز میں کہا۔

"تمہارے عشق میں؟ تمہارے باپ نے مجھ سے کہا تھا کہ تم میرے عشق میں پاگل ہو رہی ہو۔" شیراز بھی اسی انداز میں چلایا۔ چند لمحوں کے لیے وہ واقعی بھول گیا تھا کہ شینا سے یہ ساری باتیں کرنا اسے کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے۔

"عشق میں پاگل؟ شکل دیکھی ہے تم نے اپنی؟ ساری دنیا کو چھوڑ کر میں تمہارے پیچھے خوار ہوں گی۔"

وہ حلق کے بل چلائی اور پھر اپنے بچے کو لے کر اندر چلی گئی۔ شیراز کو بہت عرصے کے بعد آج اس طرح کا غصہ آیا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا

تھا کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا۔

گھر کے اندر جا کر شینا سے مزید لڑنے کے بجائے وہ وہیں سے سیدھا سعید نواز کے گھر چلا آیا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ سعید نواز اس وقت اسے گھر پر مل گئے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح بڑے تپاک کے ساتھ شیراز کا استقبال کیا مگر شیراز کے تیوروں نے انہیں کچھ حیران کیا تھا۔ مگر ان کی یہ حیرانی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی تھی۔ شیراز نے چھوٹتے ہی انہیں سہیل کی آمد کی اطلاع دی۔

اس کا خیال تھا سہیل اور بچے کا نام سنتے ہی سعید نواز کا رنگ اڑ جائے گا اور وہ بے حد نادم ہوں گے۔ مگر اس کا یہ اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔ سہیل اور شینا کے بچے کے نام پر سعید نواز کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں آئے تھے۔ شرمندگی یا ندامت تو دوسری بات تھی وہ بڑے آرام سے یوں اسے دیکھتے رہے، جیسے کوئی بڑا کسی بچے کو دیکھتا ہے۔ شیراز کے اشتعال میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔

''اتنا بڑا دھوکا کیا آپ لوگوں نے میرے ساتھ۔'' اس نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

''اتنا چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلی شادی چھپائی ہے۔ کوئی گناہ نہیں کیا۔'' سعید نواز نے بالآخر بے حد سرد لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''آپ لوگوں نے مجھے سہیل اور شینا کے بچے کے بارے میں بھی اندھیرے میں رکھا۔''

''تم نے ہمیں اپنی منگنی کے بارے میں بتایا تھا کیا؟'' شیراز سعید نواز کے سوال پر چند لمحوں کے لیے بول نہیں سکا۔ یعنی انہیں اس کی منگنی کے بارے میں علم تھا اور وہ سوچتا رہا وہ انہیں بے خبر رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔

''منگنی اور شادی میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' اس نے بالآخر سنبھل کر کہا۔ اس کی آواز خود بخود دھیمی ہوگئی تھی۔

''ہوتا ہوگا مگر دھوکے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔'' سعید نواز نے اسی انداز میں کہا۔

''مجھ سے پوچھیں میرے دل پر کیا گزر رہی ہے اس کے شوہر اور بچے کو دیکھ کر، ایک بچے کی ماں سے شادی کرلی میں نے۔''

شیراز کو ایک بار پھر غصہ آنے لگا۔ اور اس بار اس کے جملے نے سعید نواز کو آپے سے باہر کر دیا۔

''وہ ایک بچے کی ماں سعید نواز کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اور سعید نواز کون ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور تم... کیا ہو تم...؟ کیا ہے تمہارا باپ؟... ایک ریٹائرڈ کلرک کا جونیئر افسر بیٹا جو سعید نواز کا داماد نہ ہوتا، تو تنخواہ کے چند ہزار روپوں کو گن گن کر زندگی گزار رہا ہوتا۔ تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ ہمارے جیسے خاندان کے ساتھ تعلق ہوگا تمہارا۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس قدر احسان فراموش نکلو گے۔ ابھی اور اسی وقت میری بیٹی کو طلاق دے دو اور پھر دیکھو میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔ دو دن میں تمہیں جاب سے terminate نہ کروایا تو میرا نام سعید نواز نہیں۔ مگر اس سے پہلے تمہیں وہ ساری رقم اور چیزیں واپس کرنا پڑیں گی جو شادی سے پہلے اور بعد میں تم مجھ سے لیتے رہے ہو۔ مجھے اپنا ایک ایک پیسہ واپس چاہیے۔''

شیراز دو منٹوں میں آسمان سے زمین پر واپس آ گیا تھا۔ وہ زینی کا خاندان نہیں تھا۔ شینا کا خاندان تھا وہ ان سے سوال نہیں کر سکتا تھا۔

انہیں کٹہرے میں کھڑا نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس کی کلاس کے لوگ نہیں تھے جو داماد نام کی "شے" سے خوفزدہ ہوتے۔ شیراز بے اختیار پچھتایا۔ اسے اس وقت سعید نواز کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا اور اگر آ بھی گیا تھا تو ان سے یہ ساری باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سعید نواز ان دھمکیوں کے بغیر بھی اگر شیراز کو طلاق کا آپشن دیتے تو وہ اسی طرح ہکا بکا ہوتا جس طرح اب ہوا تھا۔ وہ شینا کو طلاق دے دیتا تو خود کہاں جاتا۔

"پاپا! میں نے طلاق کی بات تو کبھی نہیں کی۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ لوگ مجھے پہلے بتا دیتے تو کوئی مس انڈرسٹینڈنگ نہ ہوتی۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے گلا کھنکھار کر صاف کرتے ہوئے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ ایک بار پھر پہلے والا شیراز تھا۔

"ہم لوگوں نے اسے اتنا اہم سمجھا نہیں اس لیے تمہیں نہیں بتایا۔ اور پھر ہمیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ تم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس طرح ری ایکٹ کرو گے۔" سعید نواز کی آواز بھی یک دم دھیمی ہوگئی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ میں کچھ جذبات میں آکر الٹی سیدھی باتیں کر گیا۔" شیراز نے بے ساختہ معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں، مگر آئندہ کے لیے محتاط رہنا۔ شینا کو پہلے ہی تم سے بہت شکایتیں ہیں مگر یہ صرف میری وجہ سے ہے کہ وہ ابھی تک تمہارے ساتھ ہے۔ میں اس سے کہتا رہتا ہوں کہ خاندان اچھا نہیں ہے تو کیا ہوا۔ شریف لڑکا ہے۔ عزت کرنے والا مودب"

سعید نواز اب اسے بھگو بھگو کر مار رہے تھے۔ شیراز اگلے دو گھنٹے چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا۔ مگر اس کا ذہن صرف سٹیل اور اس کے بچے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سعید نواز سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ بچہ اب اس کے گھر میں رہنے والا تھا۔ مگر وہ اس وقت ایک اور احمقانہ سوال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

واپسی کے سفر میں شیراز صرف ایک بات سوچتا رہا تھا۔ کہ جب اس کے گھر والوں کو شینا کی پہلی شادی اور بچے کے بارے میں پتہ چلے گا تو کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا ... کچھ نہیں ہوگا ... کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ میں ابھی بھی سعید نواز کا داماد ہوں، ابھی بھی پورا شہر میری عزت کرتا ہے۔" وہ اپنی گرتی ہوئی عزت نفس کو رسیوں سے باندھ کر کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سے ابھی بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ جواد کو جا کر اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دے۔ اس نے ایک بار بھی اسے شینا کے ماضی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

☆☆☆

زینی کو اگر سلطان نہ ملتا تو وہ فلم انڈسٹری میں آنے والی ہر نئی ہیروئن کی طرح اوپر نیچے ایک کے بعد ایک غلطیاں کرتی اور پھر شاید ان غلطیوں کی وجہ سے چند سالوں میں فلم انڈسٹری سے نکل بھی جاتی مگر سلطان کی شکل میں اسے جیسے فلم انڈسٹری میں ایک "گاڈ فادر" مل گیا تھا۔ گاڈ فادر یا گرو؟

زینی کبھی یہ طے نہیں کرسکی کہ وہ سلطان کو کیا درجہ دے۔ اس کے رابطوں اور اثر و رسوخ پر حیران ہو یا اس کی چالوں اور ذہانت پر عش عش کرے۔ اس ذہن کے ساتھ وہ کسی بھی شعبے میں ہوتا اسی درجے میں ہوتا جس درجے پر اسے فلم انڈسٹری نے رکھا تھا مگر دوسرے کسی شعبے میں وہ کچھ

بھی کرلیتا، اس کی شناخت اس کا ''جسم'' ہوتا، اس کا ذہن نہیں۔ اس کی شناخت صرف اس کا تیسری جنس ہونا ہوتا۔

اور اتنا شاطر ہونے کے باوجود سلطان بنیادی طور پر برا آدمی نہیں تھا۔ اس کے اندر وہ مکاری نہیں تھی جو شوبز کی ہیروئنوں کے سیکرٹری میں ہوتی تھی۔ زینی کو بعض دفعہ نشا کی بے وقوفی پر حیرت ہوتی۔ اس نے کس طرح سلطان جیسے آدمی کو گنوا دیا تھا اور اس نے کئی بار اس کا اظہار سلطان سے کیا بھی مگر سلطان جواب میں کچھ نہیں کہتا تھا۔

اس نے نشا کا کام چھوڑنے کے بعد نشا کے بارے میں زینی سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ کوئی برائی، کوئی راز، اس کی زبان پر کچھ نہیں آیا تھا۔ اور زینی اس کی اس بات کی قدر کرتی تھی اور اس کا سلطان پر اعتماد اس لیے بھی بڑھتا گیا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ کل کو وہ اگر اسے چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تو وہ وہاں جا کر نشا کی طرح اس کے بارے میں بھی کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا۔

زینی اور سلطان کے درمیان پہلا اختلاف سفیر خان کے حوالے سے ہوا تھا۔ زینی اپنی پہلی فلم میں اس کے ساتھ کام کر رہی تھی مگر اسے سفیر کی شکل سے بھی نفرت تھی کہ وہ پانی کی طرح شراب پینے کا عادی تھا اور اکثر سیٹ پر بھی شراب کے نشے میں دھت رہتا اور زینی اسے ناپسند کرتی تھی یہ بات سفیر خان سے زیادہ دن چھپی نہیں رہی تھی۔ وہ اس کی فلمی پارٹیز میں اس کے مدعو کرنے کے باوجود نہیں آئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے نہ جاتی۔ اس کی موجودگی میں ایک بے تاثر چہرے کے ساتھ خاموش بیٹھی رہتی۔ وہ تبریز پاشا کی پسند پر اس فلم میں نہ ہوتی تو اس رویے پر سفیر خان اب تک اسے فلم سے نکلوا چکا ہوتا یا پھر بقول اس کے، زینی کا دماغ ساتویں آسمان سے زمین پر آ چکا ہوتا۔

لیکن وہ تبریز پاشا کی ہیروئن تھی اور فی الحال سفیر خان کو ناکوں چنے چبوا رہی تھی اور سفیر اس احساس کے ساتھ اکیلا نہیں تھا۔ انور حبیب بھی زینی کے بارے میں یہی سب کچھ محسوس کرتا تھا۔ زینی کا رویہ اس کے ساتھ بھی ایسی ہی بے اعتنائی لیے ہوئے تھا جو سفیر خان کے ساتھ رکھتی تھی لیکن انور حبیب، سفیر خان کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھا تھا۔

اس کی ابتدائی پیش قدمی کو روکنے پر انور حبیب نے اسے دھمکایا تھا کہ وہ تبریز پاشا سے اسے فلم سے نکالنے کے لیے کہے گا۔ اس سے بڑی دھمکی وہ فلم انڈسٹری میں آنے والی کسی نئی ہیروئن کو نہیں دے سکتا تھا۔ زینی نے اس کے جواب میں اسے تبریز پاشا کا نمبر فون پر ملا کر دے دیا تھا۔ یہ انور حبیب کے منہ پر چانٹا مارنے کے مترادف تھا کم از کم انور حبیب نے یہی محسوس کیا تھا۔

زینی سے اس کی نفرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ویسے بھی فلم میں کام کرنے والی عورتوں کو ''عورت'' نہیں سمجھتا تھا اور اس پر اسی عورتیں اگر اس طرح کے نخرے دکھاتیں جو زینی دکھا رہی تھی تو کم از کم انور حبیب کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ مگر سفیر خان کی طرح وہ بھی تبریز پاشا کی وجہ سے مجبور تھا۔

وہ نہ فلم چھوڑ سکتا تھا نہ زینی کو فلم سے کٹ کروا سکتا تھا مگر اس نے تبریز پاشا کے سامنے زینی کے خلاف زہر اگلنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور دوسری طرف وہ زینی کو شوٹنگ کے دوران تنگ کرنے لگا۔ زینی کے لیے غیر مہذب سے غیر مہذب ترین لباس اس کے کہنے پر تیار کیے گئے۔ کوریوگرافر اس کے کہنے پر بے حد قابل اعتراض ڈانس اس سے کرواتا اور انور حبیب کیمرہ مین سے کہہ کر بے حد نامناسب اینگلز سے زینی کو مختلف سین میں

شوٹ کرتا رہا۔

پہلی دونوں چیزوں کو زینی نے فوراً محسوس کر لیا تھا۔ صرف تیسری چیز ایسی تھی جس کے بارے میں اسے کبھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ اگر انور حبیب اور سفیر خان پہلی ہی فلم میں اسے ناپسند کرنے لگے تھے تو خود زینی بھی ان دونوں سے نفرت کرنے لگی تھی۔ یہ صرف تبریز پاشا تھا جو فی الحال اس کے لیے اچھا خاصا سوفٹ کارنر رکھتا تھا مگر یہ سوفٹ کارنر وہ انڈسٹری میں آنے والی ہر اس نئی ہیروئن کے لیے رکھتا تھا جس کے ساتھ اس کے تعلقات ہوتے۔

جس دن وہ اس کے دل سے اتر تیں۔ وہ نرم گوشہ بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا پھر انڈسٹری کے غلیظ ترین مردوں کی ٹاپ ست میں وہ سب سے اوپر کھڑا نظر آتا۔ کم از کم فلمی ہیروئنوں کی "زبان" اور "نظر" میں۔

اور سلطان فی الحال زینی کے ساتھ سفیر اور انور حبیب کے معاملے پر خوش نہیں تھا۔ انڈسٹری میں زینی کے رویے اور مستقبل کے بارے میں پہلے ہی باتیں ہونے لگی تھیں۔ افواہیں پھیل رہی تھیں اور خدشات کا اظہار ہونے لگا تھا اور ان سب کا ذریعہ سفیر اور انور حبیب تھے جو نہ صرف دوسرے پروڈیوسرز کو زینی کو اپنی فلم میں کاسٹ کرنے سے منع کر رہے تھے بلکہ دھمکانے کی حد تک منع کر رہے تھے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک ایسا کرتا تو شاید زینی کے لیے اتنا نقصان دہ نہ ہوتا لیکن اگر انڈسٹری کا اکلوتا سپر اسٹار اور کامیاب ترین ڈائریکٹر اس طرح مشترکہ حریف بن جائیں تو حالات واقعی سنگین ہو سکتے تھے۔ اور سلطان کو اس کا اچھی طرح اندازہ تھا جو زینی کو نہیں تھا۔

اسے یہ پتا نہیں تھا کہ پہلی فلم میں بننے والا امیج لوگوں کے ذہنوں سے مٹانا بے حد مشکل ہوتا ہے اور انور حبیب انتقاماً جس انداز میں اسے ایکسپوز کر رہا تھا وہ زینی کے لیے پبلک اور میڈیا کی تنقید اور اعتراضات کے سیلاب کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اور ہیروئن پر ایسی تنقید کا مطلب فلم کے فلاپ ہونے کی صورت میں نکلتا تھا۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اتنی بڑی فلم کے فلاپ ہونے کی صورت میں زینی پر پبلک اور میڈیا کی تنقید کی بھرمار ہوتے ہی تبریز پاشا اپنی اگلی کسی فلم میں اسے نہیں لیتا۔

وہ اپنی ہیروئنوں کے امیج کے بارے میں بڑا حساس تھا۔ ایک خوبصورت سیدھی سادی، بھولی بھالی ہیروئن پاشا پروڈکشنز کی فلموں کی ایک امتیازی خصوصیت تھی اور انور حبیب زینی کے اس امیج کو بگاڑنے پر تلا ہوا تھا جو اس کے خیال میں اسے مزید شہرت اور مقبولیت دے سکتا تھا۔

وہ زینی کو اپنے قدموں پر گرا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے ایک فلم، ایک چانس کی بھیک مانگتے ہوئے۔ اس کی اکڑی ہوئی گردن، اس کا تنا ہوا جسم جیسے ہر وقت سفیر خان اور انور حبیب کو چیلنج کرتا محسوس ہوتا تھا۔

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

ہر بار پری زاد پر نظر پڑتے ہی ان کے ذہن میں صرف ایک جملہ گونجتا تھا۔

سلطان کو انڈسٹری میں زینی کے بارے میں کہی جانے والی ہر بات کی بھنک پڑ جاتی تھی۔ انڈسٹری کے لوگوں کے تبصرے، ان کی پیش گوئیاں وہ جیسے انڈسٹری کے "کرسٹل بال" کو دیکھ کر کسی کا بھی مستقبل دیکھ سکتا تھا اور وہ زینی کے مستقبل میں بھی جھانکنے لگا تھا اور مستقبل کی وہ جھلک

اسے خوفزدہ کر رہی تھی۔ زینی کے ساتھ گزارے جانے والے ہر دن کے بعد وہ زینی سے پہلے سے زیادہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اور وہ ایک سیکریٹری سے زیادہ ایک دوست کی حیثیت سے زینی کے لیے پریشان ہوتا تھا۔ زینی کا مسئلہ کیا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ اور شاید یہی وہ چیز تھی جو زینی کے بارے میں اسے پریشانی کا شکار کیے رہتی تھی۔

وہ انڈسٹری کی ہر ہیروئن کی ذہنی حالت اور جذباتی کیفیت سے واقف تھا۔ ان کے مسائل جانتا تھا، ان کے ردعمل کو پہلے سے بوجھ سکتا تھا۔ ان کی زبان سے نکلنے والے لفظوں سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ مگر پری زاد پری زاد جیسی عورت اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ کبھی اپنے ارادوں، اپنے خیالات کو اپنے فیصلوں کا اظہار وقت سے پہلے نہیں کرتی تھی۔ وہ جیسے ہر ایک کو تاریکی میں رکھ کر ہر فیصلہ کرنے اور ہر قدم اٹھانے کی عادی ہو گئی تھی۔

سلطان نے ایسی بے خوفی، ایسی دلیری اور ایسی جرأت انڈسٹری کی کسی عورت میں تو کیا کسی مرد میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اور وہ جانتا تھا شوبز میں ان تین خصوصیات کے ساتھ آپ دوست نہیں بناتے، دشمن بناتے ہیں۔ اور ایسے دشمن جن کی تعداد کو کوئی نہیں پہنچتا زینی اندھیرے میں چل رہی تھی اور اندھیرے کے دشمن بنا رہی تھی۔ اور سلطان اسے ہر سمت سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں ہلکان ہوتا جا رہا تھا۔

''آپ کل سفیر کی پارٹی میں جا رہی ہیں؟''

زینی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلطان نے اس سے کہا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی باہر سے آئی تھی اور اب اپنے سینڈل اتار رہی تھی۔

''مجھے اس کنگڑے کی پارٹی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' زینی نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں قدرے سرد مہری سے کہا۔

''پچھلی بار بھی آپ کے نہ جانے پر وہ ناراض ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اگلے تین دن کے سینز شوٹ کرواتے ہوئے اس نے آپ کو کتنا تنگ کیا۔ یاد ہے آپ کو؟'' سلطان نے اسے جیسے تنبیہ کی۔

''میری یادداشت بہت اچھی ہے سلطان!'' وہ اپنے کام میں مصروف سلطان کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''پری جی! سفیر کی ضرورت ہے آپ کو۔ انڈسٹری میں پیئر بنانا ہے آپ کو آگے جانے کے لیے ... اور سفیر سے زیادہ اچھا کون سا ہیرو مل سکتا ہے آپ کو جان دیتا ہے وہ آپ پر۔''

سلطان نے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا اور پھر نیچے کارپٹ پر بیٹھ کر ٹیبل پر رکھے زینی کے پاؤں دبانے لگا وہ اب سگریٹ سلگا رہی تھی۔

''وہ عورت نام کی ہر چیز پر جان دیتا ہے۔'' زینی نے جیسے سلطان کی کہی ہوئی بات کا مذاق اڑایا۔

''میں نے آپ سے کہا ہے آپ کو پیئر بنانے کی ضرورت ہے۔ ہر ہیروئن کو پیئر بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے بغیر کامیابی نہیں ملتی۔''

''میں کسی کے ساتھ بھی پیئر بنا لوں گی مگر سفیر کے ساتھ نہیں۔'' زینی نے جیسے دوٹوک انداز میں کہا۔

''سفیر اچھا آدمی ہے۔'' سلطان یہ کہہ کر بے اختیار پچھتایا۔

زینی اس کی بات پر یک دم کھلکھلا کر ہنسی۔

"مجھے اچھے آدمی اچھے نہیں لگتے، یہ میرا مسئلہ ہے۔" اس نے جیسے سلطان کا مذاق اڑایا۔

"وہ بڑے مسئلے پیدا کرے گا آپ کے لیے پری جی! میں بتا رہا ہوں آپ کو۔" سلطان کو اس کا ہنسنا اس وقت اچھا نہیں لگا۔

"پوری انڈسٹری سفیر کی سنتی ہے اور انڈسٹری میں پہلے ہی ہر ایک کہنے لگا ہے کہ سفیر آپ کو ناپسند کرتا ہے، آپ کے ساتھ کام نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو اس میں جھوٹ کیا ہے، بالکل سچ ہے یہ۔ انڈسٹری کو سننا چاہیے اسے۔" زینی سگریٹ پیتے ہوئے اب بھی اتنی ہی غیر سنجیدہ تھی۔

"اور ایسی ہی باتیں انور حبیب بھی ہر ایک سے کہہ رہا ہے۔"

"کہنے دو۔"

"ان کے بغیر بننے والی انڈسٹری کی ہر فلم بی کلاس فلم سمجھی جاتی ہے اور بی کلاس فلموں کی کوئی ہیروئن کبھی سپر اسٹار نہیں بنتی۔" سلطان اب اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں نے کب کہا کہ میں سپر اسٹار بننا چاہتی ہوں۔ میں صرف پیسہ کمانا چاہتی ہوں اور میں یہ جان چکی ہوں کہ وہ فلموں سے نہیں کمایا جاتا، کس طرح کمایا جاتا ہے یہ بھی جانتی ہوں۔"

وہ صاف لفظوں میں اسے بتا رہی تھی کہ وہ کیا کرنے وہاں آئی تھی اور اس وقت اسے پہلی بار زینی احمق لگی۔

"آپ کا خیال ہے کہ آپ کی فلموں کی آمد کے بغیر اور سپر اسٹار کہلانے بغیر بھی مرد آپ کے آگے پیچھے اسی طرح پھیریں گے جس طرح آج کل پھر رہے ہیں؟ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو یہ آپ کی بڑی غلط فہمی ہے۔ آج انڈسٹری اس لیے آپ کے پیچھے کھڑی ہے پری جی کہ ہر ایک کو لگ رہا ہے آپ کی پہلی فلم ہٹ ہو جائے گی اور اس کے بعد آپ ایک ہاٹ پراپرٹی بن جائیں گی۔ ہر ایک سپر اسٹار پری زاد کے ساتھ وقت گزارنے کی خواہش رکھتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو بتا سکے کہ اس نے انڈسٹری کی اس سپر اسٹار کے ساتھ وقت گزارا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پاکستان کا ہر مرد پاگل ہو رہا ہے۔ فلاپ فلموں کی ہیروئنوں کے ساتھ انڈسٹری کے مرد کیا سلوک کرتے ہیں اس کا اندازہ آپ کو ابھی نہیں ہے اور اللہ نہ کرے آپ کو کبھی اندازہ ہو۔"

سلطان نے اس بار ہر لحاظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ زینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ سگریٹ کے کش لگاتی رہی۔

"پھر میں سفیر کو بتا دوں کہ آپ کل اس کی پارٹی میں آ رہی ہیں؟" سلطان کو اس کی خاموشی سے جیسے کوئی امید بندھی۔

زینی نے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں اچھال دیا اور سلطان کی طرف دیکھا۔

"نہیں، میں کل اشتیاق رندھاوا کی پارٹی میں جا رہی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ سلطان ایک لفظ نہیں کہہ سکا۔ اشتیاق رندھاوا پاکستان کا وزیر داخلہ تھا۔

☆☆☆

"منگنی توڑ دی؟ مجھ سے پوچھے بغیر؟" اسے یقین نہیں آیا تھا۔

"تم سے بات کرنی تھی میں نے۔ ابھی چیزیں واپس نہیں ہوئیں مگر "

اس نے ماں کی بات کاٹ دی۔ "مگر یہاں تک نوبت کیسے آئی؟ پاکستان آنے سے پہلے میری بات ہوئی ہے پچھلے ہفتے عافی سے۔ اس نے کہا تھا "

"ہماری کون سی خواہش تھی کہ منگنی ٹوٹے مگر بہت زیادہ تنگ کر رہے ہیں تین سال سے یہ لوگ۔ ہر وقت انہیں عافی کی پڑی رہتی ہے کہ تمہیں بلائیں اور عافی کی شادی کریں۔ تمہیں بلائیں اور عافی کی شادی کریں۔ ناک میں دم کر دیا یہ کہہ کہہ کر کہ ہماری لڑکی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ کل بھی ایسے ہی ہوا ہمیں بلا کر کہنے لگے کہ اب تم آ رہے ہو تو عافی کو بیاہ کرلے جائیں۔ میں نے کہا کہاں تم سے بیاہ کرے جائیں۔ ابھی تو بمشکل دو بیٹیوں کی شادی کی ہے۔ گھر بنوایا ہے، ابھی تو آصف نے اپنا کاروبار سیٹ کرنا ہے۔ کچھ بچت کرنی ہے، ایسے کیسے ہم اپنے بڑے بیٹے کی خالی ہاتھ شادی کر دیں۔ مگر مجال ہے وہ لوگ بات سنتے ہوں، طوفان اٹھا دیا انہوں نے کہ بڑے رشتے ہیں عافی کے لیے ہم اسے بیاہ کرلے جائیں ورنہ وہ اس کی کہیں اور شادی کر دیتے ہیں۔ میں نے کہا کر دیں ہم کوئی ڈرتے نہیں ہیں کسی کی دھمکیوں سے۔" اس کی ماں نے کھڑے کھڑے اسے تفصیل سنا دی۔

"میں عارفہ سے خود جا کر ملوں گا۔ میں خود بات کرتا ہوں اس سے۔" اس نے ماں کی بات کاٹ دی۔

"کیوں؟ کس لیے ملنا ہے؟ جب منگنی توڑ دی تو توڑ دی۔ تم کیا جا کر اس کی منتیں کرو گے؟ وہ تو پہلے ہی انتظار میں بیٹھے ہیں کہ تم آؤ اور وہ ہمارے خلاف تمہارے کان بھریں۔" اس کی ماں نے خفگی سے کہا۔

"کوئی میرے کان نہیں بھرے گا، کوئی کچھ نہیں کہے گا مجھ سے۔ مجھے جا کر بات کرنی ہے۔"

کرم علی نے حتمی انداز میں کہا اور پھر ماں کی ناراضی کی پروا کیے بغیر عارفہ کے گھر چلا گیا۔ اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ یہ سب کچھ ہونے پر اس طرح آرام سے بیٹھا رہتا۔

عارفہ کے گھر اس کا استقبال بے حد سرد مہری سے ہوا تھا۔ شاید وہ لوگ واقعی اس کی آمد کی توقع کر رہے تھے اور پہلے سے اس کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ کرم علی کی ماں کا دعویٰ ٹھیک تھا۔ ان کے پاس الزامات کا ایک ڈھیر تھا۔ کرم علی کے گھر والوں کے خلاف اور خود کرم علی کے خلاف۔ کرم علی وہاں آ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ گزرتے ہوئے سالوں نے دونوں خاندانوں کے درمیان اتنی دراڑیں ڈال دی تھیں اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ لاکھوں میل کے فاصلے پر بیٹھ کر اسے اندازہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کا ہر الزام، ہر شکایت غلط تھی۔

بہت سی باتیں ایسی تھیں جن پر کرم علی انہیں حق بجانب سمجھتا تھا۔ مگر بہت سی باتیں ایسی بھی تھیں جنہیں صرف کرم علی نہیں ہر کوئی بے تکا سمجھتا اور اس کے اپنے گھر والوں کے خلاف ان کے بہت سارے الزامات ایسے تھے جن پر کرم علی کبھی یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آخر وہ عارفہ اور اس کے گھر والوں کے خلاف ایسی حرکتیں یا ایسی باتیں کیوں کہتے جب وہ یہ جانتے تھے کہ عارفہ، کرم علی کی ہونے والی بیوی تھی اور وہ اس کا

ہونے والا سسرال تھا۔

مگر اس نے بے حد خاموشی، بڑے تحمل کے ساتھ ان کی سب کی باتیں سنی تھیں۔ اس نے انہیں کوئی وضاحت دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب اس کے تایا اور تائی بالآخر خاموش ہوئے تو کرم علی نے ان سے معذرت کی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی معذرت ان کے غصے کو ٹھنڈا کر دے گی۔

"معافی تمہیں نہیں تمہارے ماں باپ کو مانگنی چاہیے۔" اس کی تائی نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اور صرف معافی نہیں وہ تمہارے یہاں ہونے کے دوران تمہاری شادی کریں۔ ہم اب اپنی بیٹی کو مزید گھر نہیں بٹھا سکتے تم یا تو مستقل طور پر پاکستان آ جاؤ یا پھر اس دفعہ شادی کر کے واپس جاؤ۔"

کرم علی کو ان کا پہلا مطالبہ قدرے نامناسب لگا تھا دوسرا نہیں۔ وہ ماں باپ سے معذرت نہیں کروانا چاہتا تھا مگر جہاں تک شادی کا تعلق تھا۔ وہ اتنا مشکل کام نہیں تھا۔ یہ عارفہ کے گھر بیٹھے اس کا خیال تھا جو واپس اپنے گھر پہنچ کر بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔

"میں عارفہ سے مل سکتا ہوں؟" تین گھنٹے کے بعد ماحول کی کشیدگی کچھ کم ہونے پر اس نے بالآخر جھجکتے جھجکتے پہلی بار عارفہ کا نام لیا۔

"یہ تب تک ممکن نہیں جب تک تمہارے گھر والے آ کر معذرت کر کے شادی کی تاریخ طے نہیں کرتے۔" اس کے تایا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ کرم علی نے دوبارہ عارفہ کا نام نہیں لیا۔ اسے پانی پلایا گیا تھا پھر چائے سے اس کی تواضع کی گئی اور پھر کھانا بھی کھلایا گیا۔ مگر اس تمام وقت کے دوران اس نے ایک بار بھی عارفہ کو کہیں نہیں دیکھا۔ اسے مایوسی ہوئی تھی۔ وہ ایک نظر اسے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ رات گئے جب وہاں سے واپس آیا تو اس کے اپنے گھر کا ماحول بے حد کشیدہ ہو چکا تھا۔ اس کے لیے دن کے وقت جو گرمجوشی دکھائی جا رہی تھی، وہ اب غائب ہو چکی تھی۔ اس کی دونوں شادی شدہ بہنیں گھر پر آ چکی تھیں۔ بظاہر وہ اس سے ملنے آئی تھیں مگر اس سے علیک سلیک کے ساتھ ہی ان دونوں نے عارفہ اور عارفہ کے گھر والوں کے خلاف شکایت کا ایک انبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ ان کے ساتھ، اس کے بھائی اور ماں باپ بھی عارفہ کے گھر والوں کے خلاف بول رہے تھے۔ وہ اگر کچھ گھنٹے پہلے عارفہ کے گھر والوں کے انداز پر ششدر تھا تو اب اپنے گھر والوں کا انداز دیکھ کر بھی گنگ رہ گیا تھا۔

دونوں خاندانوں کے ہر فرد کو ایک دوسرے خاندان کے کسی نہ کسی فرد کے رویے پر اعتراض یا شکایت تھی اور اس اعتراض اور شکایت کی بنیاد پر ہر ایک وہ رشتہ ختم کرنا چاہتا تھا، جس سے دو دوسرے لوگوں کی زندگیاں اور مستقبل جڑے ہوئے تھے اور جس رشتے سے کسی دوسرے کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

"لیکن میں عارفہ کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گا۔"

جب اس کی طویل خاموشی سے ہر ایک کو یہ یقین ہونے لگا کہ کرم علی کو ان کی باتوں پر اعتبار آ گیا ہے تب کرم علی نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے بے حد دوٹوک انداز میں کہا۔ کمرے میں بیٹھا ہر شخص ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا۔

"اتنے سالوں سے وہ میرے نام پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس بے معنی اور فضول اعتراضات کی وجہ سے میں اس رشتہ کو توڑ دوں جس کی وجہ سے اس نے زندگی کے اتنے سال ضائع کیے ہیں۔"

وہاں بیٹھے کسی شخص کو اگر کوئی خوش فہمی تھی بھی تو اب ختم ہو گئی تھی۔ کرم علی کی ماں کو یقین تھا۔ عارفہ کے گھر والوں نے کرم علی پر کوئی جادو کیا تھا ورنہ ان کا اتنا فرماں بردار اور سعادت مند بیٹا ایک معمولی سی لڑکی کے لیے یوں ان سب کے اعتراضات کو بلا جواز قرار نہ دیتا۔

عارفہ اور اس کے گھر والوں سے سب کی نفرت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ کرم علی اگر شادی سے پہلے اپنی منگیتر اور اس کے گھر والوں کے اتنے زیر اثر تھا تو شادی کے بعد وہ انہیں کتنی اہمیت دیتا۔ اور پھر جب اس کی بیوی اس کے پاس چلی جاتی تب کیا ہوتا۔

اس کے گھر کے ہر فرد کی زندگی کرم علی کے کمائے جانے والے روپے کی بنیاد پر کھڑی تھی یا کھڑی کی جا رہی تھی۔ اور کرم علی کے ہٹ جانے کا کیا مطلب ہوتا یہ ہر ایک بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ماں کبھی بیٹے کی زندگی میں بیٹے کی ''پسندیدہ عورت'' کا دخل نہیں چاہتی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک ملکہ کو کسی کنیز کے لیے تخت خالی کرنا پڑے۔

کرم علی، زینت اور اس کی بیٹیوں کی پسند کی کسی لڑکی سے شادی کرتا تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا مگر کرم علی اپنی پسند کی لڑکی کو زندگی میں بہت سی ایسی رعایتیں اور اہمیت دیتا جو وہ اس لڑکی کو کبھی نہ دیتا جو اس کی ماں اور بہنوں کی مرضی سے اس کی زندگی میں شامل ہوتی۔

''آپ لوگ عارفہ کے گھر جائیں اور شادی کی تاریخ طے کر دیں۔ میں واپس امریکہ جانے سے پہلے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

کرم علی نے دانستہ معذرت کرنے کا ذکر نہیں کیا۔ اسے اس طرح اپنے سب بہن بھائیوں کے درمیان بیٹھ کر ماں باپ کو معذرت کا کہنا مناسب نہیں لگا۔ لیکن علی کے گھر والوں پر اس کا یہ نیا مطالبہ ایک بم کی طرح پھٹا تھا۔

''کیا مطلب ہے شادی کی تاریخ طے کر دیں۔ تم تو صرف چند ہفتوں کے لیے آئے ہو۔'' اس کی ماں نے بے حد سراسیمہ انداز میں اس سے کہا۔

''چند ہفتے، چند گھنٹے نہیں ہیں امی! جن میں شادی نہیں ہو سکے۔ بہت دن ہیں۔'' کرم علی نے بے حد سنجیدہ انداز میں کہا۔

''مگر شادی کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟ اور پھر تیاری میں بھی وقت لگتا ہے۔'' اس بار اس کے باپ نے کہا تھا۔

''کوئی بڑی دھوم دھام سے شادی نہیں کرنی۔ جس طرح کی شادی مجھے کرنی ہے اس کے لیے میرے پاس پیسے ہیں۔'' کرم علی نے کہا۔

''مگر ابھی تو تمہاری چھوٹی بہن کی شادی پر جو قرض لیا ہے اسے واپس کرنا ہے، آصف کو بزنس میں گھاٹا ہوا ہے۔ اس نے ابھی پچھلے دنوں کسی سے پانچ لاکھ روپیہ لیا ہے۔ تمہارے پاس اگر پیسہ ہے تو بہتر ہے پہلے یہ قرض اتار دیں پھر اس کے بعد اگلی بار تم پاکستان آؤ تو تمہاری شادی کر دیں اور تم فکر مت کرو۔ میں بھائی جان سے بات کر لوں گا۔ میں انہیں منا لوں گا۔'' اس کے باپ نے فوراً کہا تھا۔

''میں تو کسی صورت عارفہ کے گھر نہیں جاؤں گی۔ نہ ہی اسے بہو کے طور پر قبول کروں گی۔ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو اگر وہاں رشتہ کرنا ہے تو پھر میرے بغیر ہی جا کر کرنا ہوگا۔''

زینت نے بے حد ناراضی کے عالم میں جہاں داد اور کرم علی کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کر وہاں سے چلی گئی اور صرف وہی نہیں اٹھی تھی۔ باری باری کرم علی کے سارے بہن بھائی بھی وہاں سے چلے گئے تھے۔ صرف کرم علی اور اس کا باپ وہاں بیٹھے رہ گئے تھے۔

کرم علی کو ماں اور بہن بھائیوں کے اس رویے سے دھچکا لگا تھا۔ اس کا خیال تھا اس کی پسند، اس کی خواہش ان سب کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی مگر ان کے رویے نے اسے بتا دیا تھا کہ ایسا نہیں تھا۔

"کتنی رقم ہو گی تمہارے پاس؟" جہاں داد نے بے حد اشتیاق سے اس سے پوچھا۔

کرم علی نے بے حد رنج سے باپ کو دیکھا۔ اس کے وجود اور زندگی میں اس کے خونی رشتوں کی واحد دلچسپی یہ تھی کہ اس کی جیب میں کتنے پیسے تھے جو وہ ان پر خرچ کر سکتا تھا۔

"آپ نے شادی کے لیے قرض کیوں لیا؟" میں نے رقم بھجوائی تھی پھر قرض کی ضرورت کیوں پڑی آپ کو؟" اس نے جہاں داد کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے پوچھا۔

"بیٹا، شادی بیاہ پر قرضہ لینا پڑتا ہے، اتنے خرچے نکل آتے ہیں۔ تم یہاں ہوتے تو تمہیں پتا چلتا کہ کتنے اخراجات ہوتے ہیں شادی کے۔ جتنی بھی رقم ہو کم پڑ جاتی ہے۔"

"لیکن میں تو بہت عرصے سے شادی کے لیے رقم بھجوا رہا تھا۔ وہ سارا روپیہ "

اس کے باپ نے اس بار بے حد ناراضی کے عالم میں اس کی بات کاٹی۔

"ٹھیک ہے پورے سال سے روپیہ بھیجتے رہے ہو شادی کے لیے۔ بیچ میں درجنوں دوسرے کام نپٹائے، اب کیا ہر بار تمہیں فون کر کے تم سے پوچھتے، اب پیسہ دے دیا ہے تم نے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم حساب مانگنا شروع ہو جاؤ۔ اللہ کسی کو بھی اولاد پر بوجھ نہ بنائے۔ کسی کو اولاد کو حساب نہ دینا پڑے۔"

کرم علی بھونچکا، باپ کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ حساب نہیں مانگ رہا تھا۔ وہ صرف پوچھ رہا تھا اور اس کا خیال تھا وہ کم از کم اتنا پوچھنے میں حق بجانب تھا کہ پورا سال شادی کے لیے الگ سے روپیہ بھجوانے کے باوجود انہیں شادی کے لیے قرض لینے کی ضرورت کیوں پڑی تھی۔ اور آصف کے کاروبار کا گھاٹا آصف کی ذمہ داری ہونا چاہیے تھا اس کی نہیں..... اگر آصف کے کاروبار کی آمدنی میں اس کا یا گھر کا کوئی حصہ نہیں تھا تو اس کے گھاٹے کا بوجھ بھی کسی دوسرے پر نہیں ہونا چاہیے تھا۔

وہ کہنا تو اور بھی بہت کچھ چاہتا تھا، لیکن کہہ نہیں سکا۔ جہاں داد سے مزید کچھ کہے بغیر وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ صابر کی موت یک دم سے اس کے ذہن سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اس کی اپنی زندگی کچھ اور الجھنوں کا شکار ہو گئی تھی۔

اگلے چند دنوں میں اس کے دباؤ پر اس کے ماں باپ عارفہ کے گھر گئے تھے لیکن معاملات سلجھنے کے بجائے اور زیادہ بگڑ گئے تھے۔ عارفہ کے گھر میں عارفہ کی امی کی کسی بات پر زینت مشتعل ہو گئی اور انہوں نے عارفہ کے ماں باپ پر یہ الزام لگایا کہ وہ کرم علی کا روپیہ ہڑپ کرنے کے لیے اپنی بیٹی کو استعمال کر رہے ہیں۔

یہ جیسے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف ثابت ہوا۔ عارفہ کے ماں باپ نے جواباً کرم علی کے گھر والوں اور اس کے ماں باپ پر

وہ بول رہی تھی، وہ مفلوج ذہن اور جسم کے ساتھ اسے سن رہا تھا۔

''تمہاری جیب میں جب روپے کی بجائے ڈالر آنے لگے تو تمہیں عارفہ ایک غیر ضروری چیز لگنے لگی۔ تمہارے لیے میری محبت ایک فضول چیز بن گئی۔ اور تم نے مجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے مجھ پر اور میرے گھر والوں پر لالچی ہونے کا الزام لگایا۔ ابھی چھ گھنٹے کے بعد جس کے ساتھ میرا نکاح ہو رہا ہے۔ وہ بھی امریکہ میں ہے۔ اس کے پاس بھی دولت روپوں کی شکل میں نہیں ڈالر کی شکل میں ہے۔ تم نے کیا سوچا تھا کہ تم عارفہ کو چھوڑ دو گے تو عارفہ کو کوئی اور نہیں ملے گا؟''

اس کی آواز میں آگ تھی یا پانی، کرم بوجھ نہیں پایا مگر کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا، جس نے کرم کو کاٹا تھا۔

''بڑا مان ہے تمہارے گھر والوں کو تمہاری دولت پر... میں دیکھوں گی جب تم اس دولت سے اپنے لیے عارفہ جیسی محبت خریدو گے۔ کوئی میری طرح تمہارے لیے اپنی زندگی کے چھ سال ضائع کر کے بازار میں اپنے دام گرائے، میں دیکھوں گی کرم علی کوئی عورت تمہیں میری طرح اپنے سر پہ بٹھائے۔''

وہ اب رو رہی تھی۔

''بات یہ نہیں ہے کہ زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہیں ملتا، مل جاتا ہے... مسئلہ صرف یہ ہے کہ جو دل مانگتا ہے، وہ نہیں ملتا۔ جیسے مجھے نہیں مل رہا۔ اللہ کرے تمہیں بھی کبھی وہ نہ ملے جس سے تمہیں محبت ہو یا جو تم سے محبت کرے۔''

وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی، پھر اس نے کسی دوسرے کی آواز سنی پھر فون بند ہو گیا اور اس کے بعد اس نے دوبارہ کبھی عارفہ کی آواز نہیں سنی۔

وہ فون کا ریسیور لیے اسی طرح کھڑا رہا۔ شاید ایک گھنٹہ یا شاید ایک سے بھی زیادہ... آخر یہ کیسے ہو گیا کہ اس نے اتنی آسانی سے اسے کھو دیا، اتنی آسانی سے... اتنی آسانی سے تو اس نے کبھی پیسہ بھی نہیں کھویا تھا... پھر عارفہ کو کیسے؟ کیسے...؟

اور کیسے کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ شاید سوال غلط تھا اس لیے۔

وہاں کھڑے کچھ دیر کے لیے اسے لگا جیسے اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہو۔ پوری دنیا مکمل طور پر خالی لگی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے پوری دنیا ایک سپاٹ اور سیدھا میدان بن گیا تھا۔ جہاں وہ دوڑتا جا رہا تھا۔ اور میدان ختم ہونے پر ہی نہیں آ رہا تھا۔ کوئی رشتہ اتنی آسانی سے ختم ہو جائے اور رشتہ محبت اور صرف محبت کا ہو تو انسان کیا کرے، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

اگلے چھ گھنٹے وہ نیویارک کی سڑکوں پر اکیلا پھرتا رہا تھا کس کی تلاش میں...؟ پتہ نہیں کس کی تلاش میں؟ وہ ہر اس جگہ گیا جہاں وہ عارفہ کے ساتھ آنا چاہتا تھا۔ اور لاشعوری طور پر جیسے اس گھنٹے کا انتظار کرتا رہا جب پاکستان میں عارفہ کا نکاح ہو رہا تھا۔ اور اس گھنٹے میں داخل ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ کویت میں ہر ہفتے موت کا انتظار کرنا آسان تھا وہ گھنٹہ گزارنا مشکل تھا۔ اس رات زندگی میں پہلی اور آخری بار وہ ایک بار میں بیٹھا شراب پیتا رہا اور پھر بار میں بیٹھی طوائف میں سے ایک کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ پر چلا گیا۔

ڈیڑھ سو ڈالر شراب اور عورت پر ضائع کرنے کے بعد بھی عارفہ کو اس کے ذہن سے نہیں نکلنا تھا۔ وہ اس کے ذہن سے نہیں نکلی۔

☆☆☆

یہ الزام لگایا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اس لیے نہیں کر رہے کیونکہ وہ اس کا روپیہ صرف اپنے تسلط میں چاہتے ہیں۔ زینت کے لیے جیسے انہوں نے وہاں سے چلے جانے کا جواب دے دیا تھا۔

کرم علی گھر میں ان کے تمام معاملات ٹھیک کر کے واپسی کا منتظر تھا اور وہ سب معاملات ٹھیک کرنے کے بجائے روتے ہوئے واپس گھر آ ئے تھے۔ زینت نے اپنی اس بے عزتی کا ذمہ دار کرم علی کو ٹھہرایا تھا اور اسے خود غرض قرار دیا تھا۔ کرم علی وقتی طور پر سب کچھ بھول کر صرف ماں باپ کی ناراضی کو دور کرنے میں مصروف رہا۔ اسے عارفہ اور اس کے گھر والوں سے بھی شکایت ہوئی تھی۔

اصل وجہ جانے بغیر اسے اس وقت اپنے ماں باپ ہی بے قصور لگے تھے جو اس کے اصرار پر عارفہ کے گھر والوں کو منانے گئے اور انہوں نے ان کی تذلیل کی۔ اسے اس سے بھی زیادہ اس بات سے رنج پہنچا تھا کہ اس کے روپے کا ذکر کیوں ہوا۔ وہ اگر اپنے گھر والوں اور ماں باپ پر روپیہ خرچ کر رہا تھا تو یہ اس کا مسئلہ تھا، عارفہ کے گھر والوں کا نہیں۔

وقتی رنج اور اشتعال میں وہ عارفہ سے بات کیے بغیر پاکستان میں اپنے چند ہفتے کے قیام کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے واپس امریکہ چلا آیا۔

امریکہ آنے کے بعد اس کی زندگی ایک بار پھر اپنی اسی روٹین پر واپس چلی گئی تھی مگر عارفہ اس کے ذہن سے نہیں نکلی تھی۔ وہ جانتا تھا چند ہفتے گزرنے کے بعد آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لاشعوری طور پر وہ عارفہ کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس بار اسے وہ فون کرے اور اسے یقین تھا وہ اسے فون کرے گی، وہ اپنی ندامت کا اظہار کرے گی۔ اپنے گھر والوں کے نامناسب رویے پر اس سے معذرت کا اظہار کرے گی۔ اور وہ ایک بار پھر اپنے گھر والوں اور عارفہ کے گھر والوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کرے گا۔

اور اس کا اندازہ بالکل ٹھیک ثابت ہوا تھا۔ عارفہ نے اسے فون کیا تھا اس کے امریکہ چلے جانے کے پورے پانچ ہفتے کے بعد وہ ہفتے کا دن تھا وہ کچھ دیر پہلے ہی سو کر اٹھا تھا اور ناشتہ کرنے کے بعد ابھی باہر جانے ہی والا تھا۔

فون پر اس کی آواز سنتے ہی کرم کا دل جیسے خوشی سے اچھلا تھا۔

''تم کیسی ہو؟'' اس کی ساری خفگی ساری ناراضی، سارا رنج ساری شکایتیں غائب ہو گئیں۔ عارفہ کی آواز سنتے ہی جیسے غائب ہو گئی تھیں۔

''بہت اچھے حال میں ہوں۔'' اسے عارفہ کا جواب کچھ عجیب لگا۔

''مجھے یقین تھا تم فون کرو گی۔'' کرم علی نے اس کے لہجے پر غور کیے بغیر کہا۔

''ہاں تمہیں تو فون کرنا ہی تھا مجھے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں تمہیں اپنے نکاح کے بارے میں نہ بتاتی۔''

کسی نے خنجر لے کر کرم علی کے دل میں گھونپ دیا تھا۔ اس وقت اس کے اس جملے پر اسے ایسا ہی لگا تھا۔ سانس لینا، بول پانا بے حد مشکل کام لگا اسے۔

''تم نے مجھے بہت ذلیل کیا کرم علی بہت زیادہ۔ میں نے اپنی زندگی کے چھ سال ایک جھوٹے آدمی کے پیچھے ضائع کیے۔ اور مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ مجھے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا''

"یہ کون تھا؟"

"میرا شوہر ..." شینا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

شیراز کے قدم بے اختیار ٹھٹھکے۔ شینا اپنی کسی دوست کے سوال کے جواب دے رہی تھی، شیراز ابھی کچھ دیر پہلے آفس سے لوٹا اور خلاف معمول اس نے شینا کو اپنی کسی دوست کے ساتھ گھر کے لاؤنج میں پایا۔

شینا نے شیراز اور اپنی دوست کو متعارف کروانے کا تکلف نہیں کیا وہ اپنی دوست سے باتوں میں مصروف رہی اور شیراز قدرے نادم انداز میں وہاں سے نکل آیا۔ مگر کوریڈور میں اپنے عقب میں اس نے ان دونوں کی آوازیں سن لی تھیں۔ اور وہ کچھ تجسس آمیز انداز میں ٹھٹھک کر ان دونوں کی باتیں سننے لگا۔

"شوہر ...؟" اس کی دوست نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں ... پچھلی برتھ ڈے پر پاپا نے مجھے ایک کتا تحفے میں دیا تھا۔ اس بار ایک شوہر ..."

شینا نے بے حد روانی سے کہا۔ اس کی دوست نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

شیراز کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ واپس پلٹ کر لاؤنج میں جائے اور شینا کو دو ہاتھ لگا کر آئے۔ مگر یہ خیال تو اسے ہر ہفتے تین چار بار آتا تھا۔ اور جس طرح آتا تھا اسی طرح چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہونٹ بھینچے چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شینا نام کا پھندا سعید نواز نے اس کے گلے میں کیوں باندھا تھا؟ کم از کم شیراز اب سمجھنے کے قابل ہوگیا تھا۔ دیر سے ہی سہی مگر اس کی آنکھوں سے یہ پٹی اتر گئی تھی کہ شینا یا سعید نواز اس کی قابلیت یا شخصیت سے متاثر ہوگئے تھے۔

شینا نے سہیل سے سعید نواز کی مرضی کے خلاف اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ سہیل بھی شینا کی طرح ایک بڑے سرکاری افسر کا بیٹا تھا۔ اور بدقسمتی سے ایک ایسے سرکاری افسر کا بیٹا جو سعید نواز کا سینئر تھا اور جس سے سعید نواز کی کئی بار چپقلش ہو چکی تھی۔

سہیل کو ناپسند کرنے کی یہ بنیادی وجہ ضرور تھی مگر اکلوتی وجہ نہیں تھی اس وجہ کے علاوہ بھی اور بہت سی باتیں تھیں جن کی وجہ سے سعید نواز سہیل کو ناپسند کرتا تھا مگر شینا کی ضد پر اس نے گھٹنے ٹیک دیے تھے اور شینا کی شادی سہیل سے کر دی تھی۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی مگر شادی کے چوتھے دن ہی شینا اور سہیل کا جھگڑا ہوا اور شینا سعید نواز کے گھر آگئی۔ پھر یہ جیسے ایک مستقل روٹین بن گئی تھی۔ وہ ایک ہفتہ سہیل کے ساتھ رہتی اس کے گن گاتی اور اگلے ہفتے باپ کے گھر رہ کر اس کی برائیاں کرتی۔

سہیل بھی شینا جیسا ہی مزاج رکھتا تھا۔ اور اس کے گھر والے شینا کو شدید ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے بھی سعید نواز کی طرح سہیل کی ضد پر اس کی شادی شینا سے کر تو دی تھی مگر اس سے پہلے شینا کے سارے زمانے کے افیئرز کے بارے میں بیٹے کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ سہیل پر اس وقت تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ مکمل طور پر شینا کی محبت میں گرفتار تھا اور شینا کی طرح اس کی زیادہ تر تعلیم بھی مغربی طرز زندگی سکھانے والے تعلیمی اداروں میں ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک اس وقت شینا کے پچھلے افیئرز یا بوائے فرینڈز کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

مگر بیاسے شادی کے فوراً بعد احساس ہوا کہ وہ کچھ نہ کچھ معنی ضرور رکھتے تھے۔ کم از کم اتنا ضرور کہ وہ انہیں شینا سے سوگز کے فاصلے پر دیکھنا چاہتا تھا شینا مشرق میں رہتے ہوئے فطرتاً مغرب کی عورت کی طرح آزاد خیال تھی اور وہ مردوں کے ساتھ تعلقات میں بھی اتنی ہی آزادی کا مطالبہ کرتی تھی جتنی مرد عورتوں کے ساتھ۔

شادی سے پہلے وہ سہیل پر جان دیتی تھی اور سہیل جانتا تھا۔ وہ واقعی اس سے محبت کرتی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس مزاج اور عادتوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھی جو سہیل یا اس کے گھر والوں کو ناپسند تھے۔ شادی کے پہلے سال ہی بے شمار مسائل کا شکار ہونے کے بعد دونوں نے جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنے کے بجائے گھر والوں سے الگ رہنے کا فیصلہ کیا اور دونوں سعید نواز کے دیے ہوئے اس گھر میں منتقل ہو گئے جس میں شیراز اب شینا کے ساتھ رہ رہا تھا۔

کچھ عرصے تک سب کچھ ٹھیک رہا اور دونوں کو لگا کہ اب ان کی شادی ٹھیک ہو رہی ہے۔ اس عرصے میں ان کے ہاں ایک بچہ بھی پیدا ہو گیا۔ اور اس بچے کی پیدائش کے بعد ان دونوں کی ازدواجی زندگی کا سب سے برا دور شروع ہوا تھا۔ دونوں کے درمیان پہلے جو جھگڑے تو تو میں، میں، پر ختم ہوتے تھے اب وہ ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھانے تک پہنچ گئے تھے، نہ سہیل شینا کی زبان درازی پر ہاتھ اٹھانے سے چوکتا اور نہ ہی شینا ہاتھ اٹھانے میں پہل کرنے پر اور پھر ایسے ہی ایک جھگڑے کا نتیجہ شینا کی طرف سے طلاق کے مطالبے پر اور سہیل کی طرف سے یہ مطالبہ فوری طور پر پورا کرنے کی صورت میں نکلا تھا۔

طلاق کے بعد کچھ عرصہ کے لیے شینا کو ایک بار پھر سے ملنے والی یہ آزادی بہت اچھی لگی اور وہ پہلے کی طرح دوبارہ سرگرم ہو گئی۔ مگر کچھ عرصہ گزرتے ہی اسے دوبارہ سہیل کی یاد ستانے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ سہیل سے دوبارہ رابطے کی کوشش کرتی سہیل کے والدین نے سہیل کی شادی اس کی کسی پرانی دوست کے ساتھ کر دی۔

شینا کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی وہ سہیل سے ایک بار پھر ملنے لگی تھی، اور یہی وہ وقت تھا جب سعید نواز نے شیراز کو اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ ان کے پورے سوشل سرکل میں ہر ایک شینا اور اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔

سعید نواز اچھی طرح جانتے تھے کہ سب کچھ جانتے ہوئے کوئی بھی شینا کو اپنے خاندان کا حصہ بنانا نہیں چاہے گا۔ اور اگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنے جیسے کسی خاندان میں شینا کی شادی کر بھی دیتے تو وہ چار دنوں کے اندر ایک بار پھر طلاق لے کر ان کے پاس آ جاتی۔

ان کی کلاس کا کوئی لڑکا شینا جیسی بدمزاج اور آزاد خیال لڑکی کے ساتھ دو دن تو گزار سکتا تھا "چار" نہیں۔ سعید نواز کو شینا کے لیے ایسے داماد کی ضرورت تھی جو شینا کے سامنے منمنائے، بات نہ کرے۔ اونچی آواز کرنا تو خیر اس سے بھی بری بات ہوتی اور ایسا داماد ان کی اپنی کلاس میں کسی صورت نہیں مل سکتا تھا۔

کہاں مل سکتا تھا سعید نواز جانتے تھے کیوں کہ وہ خود بھی اسی کلاس سے تعلق رکھتے تھے جس کلاس سے شیراز تعلق رکھتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ انہوں نے شیراز کے جیسی غربت نہیں دیکھی تھی۔ اور ان کی زندگی میں دوسری بہت ساری آسانیاں شامل رہی تھیں۔

شیراز سے وہ جواد کے ذریعے ملے تھے جوان کے کہنے پر شینا کے لیے ایک عدد دولہا ڈھونڈ رہا تھا۔ اور شیراز کی صورت میں اسے وہ شخص مل ہی گیا تھا جس کے کندھے پر رکھ کر یہ بندوق چلائی جا سکے۔

اپنے گھر پر جواد کے ساتھ اس سے ملنے سے بہت پہلے وہ شیراز کے بارے میں بہت ساری معلومات کروا چکے تھے۔ لیکن انہوں نے بھی شیراز پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ شیراز کی قیمت کیا تھی یہ سعید نواز اس کے ساتھ پہلی ملاقات میں ہی جان گئے تھے۔ اور وہ قیمت زیادہ نہیں تھی اگر وہ اپنے کارڈز ہوشیاری سے کھیلتے تو

شیراز نے سعید نواز کے گھر آنے جانے پر شینا کے ساتھ اپنی متوقع شادی کو راز رکھ کر اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری تھی۔ وہ اکیڈمی میں کسی اور سے اس سارے معاملے کے بارے میں بات کرتا تو شینا کے بارے میں یہ سب کچھ اسے بہت پہلے پتا چل جاتا جو اسے آج پتا چل رہا تھا۔ وہ اس وقت یہ سمجھتا تھا کہ اکیڈمی میں اس کے کامن کے لوگوں کو شینا کے ساتھ اس کی شادی کا پتہ چلا ہو گا وہ تو اس پر رشک کرتے ہوں گے۔ مگر اسے آج احساس ہو رہا تھا کہ وہ دراصل اس پر ہنستے ہوں گے، خاص طور پر وہ لوگ جو شینا، اس کی پہلی شادی اور اس کے افیئرز کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج کے بارے میں جانتے ہوں گے اور ان سب کو شیراز سے کیسی ہمدردی ہوئی ہو گی۔

یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا مگر شیراز ان تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکتا رہتا تھا۔

"زندگی میں ہر ایک کوئی نہ کوئی کمپرومائز ضرور کرتا ہے۔ اور میرا شینا سے شادی میرا کمپرومائز ہے۔" وہ اکثر اپنے آپ کو تسلی دیتا۔

"اور اس کمپرومائز میں میں نے سب کچھ کھویا نہیں، بہت کچھ پایا بھی ہے۔"

وہ مزید سوچتا اور اس کی یہ سوچ غلط بھی نہیں تھی۔ شادی نے اس کی عزت نفس اور خود اعتمادی بے شک ختم کر دیے ہوں مگر اسے ایک لائف اسٹائل اور زندگی کی بہت ساری آسائشیں ضرور دے دی تھیں۔ اور شیراز کے نزدیک یہ کوئی بڑی قیمت نہیں تھی۔

اسے سبیل اور اس کے بچے کے بارے میں جان کر بھی کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ کاش اس نے یہ کچھ نہ کیا ہوتا اسے صرف یہ خیال آتا تھا کہ کاش اسے کوئی شینا سے زیادہ اچھی لڑکی مل جاتی۔ اور "اچھی" کا شیراز کے نزدیک کیا مفہوم تھا۔ یہ اسے جاننے والا کوئی بھی شخص بوجھ سکتا تھا۔

شینا کی پہلی شادی اور اس کے بچے کے بارے میں شیراز اپنے گھر والوں کو بتانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اور پھر اسے احساس ہوا کہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، وہ اس کے ساتھ نہیں رہتے تھے کہ وہ انہیں اس ایشو کے بارے میں لاعلم نہ رکھ سکتا۔ اور اسے یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہ کبھی اس کے گھر اچانک آ کر کچھ جان جاتے جتنی دیر وہ یہ بات چھپا سکتا تھا اسے چھپانا چاہیے تھا۔

سعید نواز سے اس گفتگو کے بعد شیراز نے دوبارہ سعید نواز یا شینا سے سبیل یا شینا کی پہلی شادی کے بارے میں بات نہیں کی۔ اور شینا کا انداز اس کے بعد جیسے ہر وقت اس کا مذاق اڑانے جیسا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سعید نواز نے شیراز کے ان کے پاس جا کر شکایت کرنے پر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا۔

اور اس سے کیا کہا ہو گا اور یہ اندازہ شیراز کو بھی تھا کہ سعید نواز نے شینا کو شیراز کے اپنے پاس آنے کے بارے میں بتایا ہو گا۔ شینا کا بیٹا

اب شینا کے پاس ہی رہتا تھا۔

شیراز کچھ ہفتے منتظر رہا کہ سہیل اسے واپس لے جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا شاید شینا کی شادی کی وجہ سے سہیل اس بچے کو اپنے پاس لے گیا تھا ورنہ وہ یقیناً اس سے پہلے شینا کے پاس ہی ہوتا ہوگا۔ بچے کے آتے ہی بچے کو سنبھالنے والی ایک نینی بھی شینا کے گھر آ گئی تھی۔ بچہ زیادہ اس نینی کے پاس ہی رہتا اور شینا کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں جس طرح اس بچے کی آمد سے پہلے تھیں۔

واحد تبدیلی جو ہوئی تھی وہ اس گھر میں سہیل کی آمدورفت تھی۔ سہیل اب اکثر اس گھر میں آنے لگا تھا۔ اور یہ واحد بات تھی جو شیراز کے لیے ہضم کرنا مشکل تھا۔ مسئلہ صرف سہیل کے اس گھر میں آنے جانے کا نہیں تھا، مسئلہ شینا کا رات گئے اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کا تھا۔

کئی بار نینی گھر پر نہیں ہوتی اور شیراز، شینا کی عدم موجودگی میں اس کے بچے کو سنبھالتا پھرتا اور یہ ایسا وقت ہوتا تھا کہ اسے اپنے آپ پر ترس آتا اور وہ خود کو بے بس محسوس کرتا۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا، وہ شینا کے بچے کا گلا دبا دے اور بعض دفعہ اس کا دل چاہتا وہ شینا کا ہی گلا دبا دے۔ مگر یہ دونوں کام کرنے سے زیادہ آسان خود کا گلا دبانا تھا اور بہرحال ابھی حالات اتنے خراب نہیں ہوئے تھے کہ شیراز اپنا گلا دبانے کی سوچتا۔

اس رات بھی وہ خون کے گھونٹ پیتے ہوئے شینا کے بچے کو بہلا رہا تھا۔ شینا حسب معمول غائب تھی۔ دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد وہ بالآخر بچے کو سلانے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کا خود نیند سے برا حال ہو رہا تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے باہر پورچ میں کسی گاڑی کے آ کر رکنے کی آواز سنی تھی شینا بالآخر گھر واپس آ گئی تھی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا اور وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ شینا سہیل کی گاڑی سے اتر رہی تھی۔ وہ غصے کے عالم میں کمرے سے نکلا مگر جب تک وہ پورچ میں پہنچا سہیل جا چکا تھا اور شینا اندر آ رہی تھی۔

"تم کس کے ساتھ آئی ہو؟" اس نے تیز آواز میں شینا سے پوچھا جو اطمینان کے ساتھ اس پر ایک نظر ڈالے بغیر اندر جا رہی تھی۔

"سہیل کے ساتھ۔" اس نے رکے یا شیراز کو دیکھے بغیر اس سے کہا اور اندر چلی گئی۔ شیراز بے حد غصے میں اس کے پیچھے آیا۔

"سنی سو گیا؟" شینا نے پلٹ کر دیکھے بغیر اس سے یوں پوچھا جیسے وہ اسے سنی کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ کر گئی تھی۔

"تمہارا بیٹا میری ذمہ داری نہیں ہے۔" شیراز نے بلند آواز میں کہا شینا نے بالآخر پلٹ کر اسے دیکھا اور صرف دیکھا نہیں تھا اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ایک تیز کاٹنے والی نظر کے ساتھ۔

"کیوں؟ کیا تم اس گھر میں نہیں رہتے؟"

"رہتا ہوں مگر تمہارے پہلے شوہر کی اولاد پالنے کے لیے نہیں۔"

"مائنڈ یور لینگویج۔" شینا نے بلند آواز میں اس کے جملے پر ری ایکٹ کیا تھا۔

"تمہیں سنی کی اتنی پروا ہے تو اسے اس کے باپ کے پاس بھجوا دو۔" شیراز نے اس کی بلند آواز سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"اوہ، ناؤ آئی گیٹ اٹ۔ تم چاہتے ہو کہ میں اپنی اولاد اس گھر میں نہ رکھوں کیونکہ اس سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے لیکن میں تمہیں صاف صاف بتا رہی ہوں کہ میں اس گھر سے تمہیں تو نکال سکتی ہوں سنی کو نہیں۔"

"تو پھر تم گھر بیٹھ کر اسی کو دیکھو جیسے ایک ماں کو گھر پر ہونا چاہیے۔"

"اس کو دیکھنے کے لیے نینی ہے۔ تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔" شینا نے دوبدو کہا۔

"مجھے تمہارا سہیل کے ساتھ گھومنا پھرنا پسند نہیں ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد شیراز بالآخر اس موضوع پر آ گیا جس پر وہ بات کرنا چاہتا تھا۔

"اور مجھے تمہاری پسند اور ناپسند کی کوئی پروا نہیں۔ آئی لو سہیل۔" اس کے آخری جملے نے شیراز کو ایک بار پھر تپایا تھا۔

"تو پھر طلاق لینے کی کیا ضرورت تھی تمہیں اسی کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔"

"آئی ایگری۔ طلاق نہیں لینا چاہیے تھی۔ مجھے اسی کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ میری بے وقوفی تھی وہ۔" شینا نے شیراز کو مزید تپایا۔

"تو پھر اب کر لو تم اس سے شادی۔"

"ڈونٹ وری۔ میں پہلے ہی اسے منانے کی کوشش کر رہی ہوں وہ اپنی بیوی کو چھوڑنا نہیں چاہتا جب چھوڑنے پر تیار ہو جائے گا تو میں ایک دن بھی نہیں لگاؤں گی اس سے شادی پر۔"

شینا نے جیسے اعلان کیا تھا اور پھر رکے بغیر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی وہ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ سہیل نے کیوں اپنے سر سے شینا نام کی بلا اتار پھینکی تھی۔ یہ وہ بہت اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ شینا کسی بھی مرد کی گرل فرینڈ کے طور پر ایک آئیڈیل پارٹنر تھی۔ لیکن کسی مرد کی بیوی کے طور پر واقعی بلا سے کم نہیں تھی، وہ کسی بھی شوہر کا ذہنی توازن خراب کر سکتی تھی۔ وہ اپر کلاس کی ٹیپیکل بگڑی ہوئی لڑکی تھی جسے سعید نواز نے لوئر مڈل کلاس سے ایک گھوڑا فراہم کر دیا تھا، جسے اس طبقے کی کوئی بھی عورت آسانی سے سدھا سکتی تھی اور سدھا نہ بھی پاتی تو بھی یہ وہ گھوڑا تھا جو ٹانگیں مارنے کے لیے گدھے جیسی جرأت بھی نہیں رکھتا تھا۔ سعید نواز داماد کے طور پر شیراز سے بہتر انتخاب واقعی نہیں کر سکتے تھے۔

وہ کئی دنوں کے وقفے کے بعد اکبر اور نسیم سے ملنے آیا تھا اور وہاں جاتے ہی اکبر اور نسیم نے اس کے نہ آنے پر شکایتوں اور گلوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا وہ بے اختیار جھنجھلایا۔ وہ اس وقت کم از کم یہ سب کچھ سننے نہیں آیا تھا۔

"میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہوتا کہ میں ہر وقت آپ لوگوں کے پاس بیٹھا رہوں۔ آپ کو احساس ہونا چاہیے کہ میں ایک سرکاری افسر ہوں سو کام ہیں میرے، سو مصروفیات ہیں میری، گھر ہے بیوی ہے مجھے ہر ایک کو وقت دینا پڑتا ہے اور آپ لوگوں کو ہر وقت صرف اپنی پڑی ہوتی ہے کل نہیں آئے پرسوں نہیں آئے فون نہیں کیا، پورا ہفتہ گزر گیا۔ ہم نے کتنا یاد کیا ہم کتنے بے چین رہے دماغ خراب کر دیا ہے ایک بات کر کر کے، اس سے تو اچھا تھا میں یہاں آتا ہی نہیں۔"

وہ بے حد غصے میں بولتا اٹھ کر چلا گیا اکبر اور نسیم اسے جاتا دیکھتے رہے۔

شیراز نے کبھی ان سے اس طرح بات نہیں کی تھی جس طرح اس نے آج کی تھی۔ وہ ان کی محبت بھری شکایتوں اور گلوں سے بھی چڑنے لگا تھا یہ وہ نہیں جانتے تھے مگر انہیں یہ خدشہ ضرور ہوا کہ وہ بیوی کے رنگ میں رنگنے لگا ہے۔ اسی لیے اتنا بداخلاق ہو گیا ہے۔ بڑھاپے میں ان کا اکلوتا

سعادت مند اور تابعدار بیٹا سرکش ہو گیا تھا اور اکبر اور نسیم کو جتنا رنج ہوتا کم تھا۔

اگلے کچھ دن انہوں نے شیراز کی واپسی کا انتظار کیا کہ شاید وہ اپنی غلطی کو محسوس کرے اور شرمندہ ہو کر معذرت کے لیے آئے مگر وہ نہیں آیا تھا۔ اکبر اور نسیم کچھ مضطرب ہو کر اس شام اس سے ملنے کے لئے اس کے گھر چلے گئے۔ شیراز گھر پر نہیں تھا مگر ملازم نے انہیں لاؤنج میں بٹھا دیا شیراز تھوڑی ہی دیر میں وہاں آنے والا تھا اکبر اور نسیم انتظار کر سکتے تھے۔

مگر شیراز کے آنے سے پہلے شینا سنی کے ساتھ وہاں آ گئی تھی۔ وہ سنی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھی اور واپسی پر لاؤنج میں بیٹھے اکبر اور نسیم کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر یک دم بہت سارے بل آ گئے تھے۔ اکبر اور نسیم اسے دیکھ کر بری طرح حواس باختہ ہو گئے۔ اکبر نے آگے بڑھ کر شینا کے سر پر ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی۔ جسے شینا نے بری طرح ان کا ہاتھ جھٹک کر ناکام کر دیا۔

''کیا کام ہے آپ کو؟ گھر لے دیا گاڑی لے دی۔ پھر بھی آپ دونوں کو اس بڑھاپے میں اپنے گھر میں چین نہیں آتا بھاگتے پھرتے ہیں یہاں آنے کے لیے۔''

شینا نے بے حد تلخی سے ان دونوں سے کہا۔

اکبر اور نسیم کو بے حد تذلیل محسوس ہوئی۔

''بیٹا ہم شیراز سے ملنے آئے تھے۔'' نسیم نے کمزور آواز میں وضاحت دینے کی کوشش کی۔

''تو اس کے آفس جاتے یہاں کیوں آئے۔ یا پھر فون کر کے اسے اپنے گھر بلا لیتے لیکن نہیں، شوق ہے یہاں آنے کا کچھ نہ کچھ چاہیے ہوگا۔''

''ممی... ممی... لیٹس گو۔''

وہ ابھی کچھ اور بھی کہتی لیکن سنی نے مداخلت کر کے اس کی شرٹ کھینچنے کی کوشش کی تھی۔ شینا اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اپنے پاس کھڑے سنی کی طرف متوجہ ہوئی اور اس نے اس کو گود میں اٹھاتے ہوئے بے حد تلخی سے اکبر اور نسیم سے کہا۔

''ناؤ گیٹ آؤٹ اور دوبارہ کبھی میرے گھر نہ آئیں، ورنہ مجبوراً مجھے آپ دونوں کے بیٹے کو بھی آپ لوگوں کے پاس بھیجنا پڑے گا۔''

وہ یہ کہہ کر وہاں نہیں رکی تھی۔ مگر اس کے ان لفظوں نے اکبر اور نسیم پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی تک صرف اس بچے کے منہ سے نکلنے والے لفظ سن کر بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ وہ شینا کو ممی کہہ رہا تھا۔ کیوں؟ اور اس کیوں کا جواب دنیا کا بے وقوف سے بے وقوف آدمی بھی دے سکتا تھا۔

☆☆☆

اگلے کئی ہفتے کرم علی نے گونگوں کی طرح دن رات گزارے تھے۔ اپارٹمنٹ میں اس کے دوسرے ساتھی اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئے تھے پھر سب کو لگا اس پر صبر قوم کی موت کا اثر ہو گیا ہے۔ مجاہد اور تنویر نے جتنی تسلیاں ہو سکتی تھیں اسے دی تھیں۔ پھر انہیں لگا وہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں اور نیویارک میں کوئی وقت ضائع نہیں کرتا، زندگی ضائع کرنا ایک الگ چیز تھی۔

کرم علی کی سمجھ میں نہیں آ تا تھا وہ بات کرے تو کس چیز کے بارے میں بات کرے، دنیا میں یک دم وہ ساری چیزیں ختم ہو گئی تھیں جن کے بارے میں اسے سوچنا اسے بات کرنا اچھا لگتا تھا یا وہ بات کر سکتا تھا۔ خاموشی اور تنہائی کا مکسچر تیزاب کی طرح اسے اندر سے گلاتا رہا۔

اس کے گھر والوں نے عارفہ سے نکاح کے اگلے ہی دن اسے بڑے خوشی اور جوش کے عالم میں اس کے نکاح کی خبر سنائی تھی، وہ شاید ان کی زندگی کا پرمسرت ترین دن تھا۔ راستے کی واحد رکاوٹ خود بخود دور ہو گئی تھی۔ ان کے بیٹے کو اب کوئی ان سے نہیں چھین سکتا تھا کرم علی نے دس منٹ تک فون پر عارفہ کے بارے میں ماں کی باتیں سنی تھیں پھر اس نے فون رکھ دیا۔

اگلے کئی ہفتے اس نے پاکستان میں کسی سے فون پر بات نہیں کی۔ صدمہ، دکھ، رنج، تکلیف، اذیت، بے یقینی میں سے کون سی چیز تھی جس نے اس کے سوچنے اور سمجھنے کی حسیات کو یوں مفلوج کر دیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

فون پر اس کے کہے ہوئے الفاظ بار بار اس کے ذہن میں گونجتے تھے بار بار صبح اٹھتے ہی، رات کو سوتے ہوئے، گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کھانا کھاتے ہوئے، نہاتے ہوئے۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھے دنیا میں موجود، ہر قسم کی آواز صرف ایک آواز میں تبدیل ہو گئی تھی عارفہ کی آواز۔

تین مہینے کے بعد اس کی رخصتی بھی ہو گئی تھی۔ یہ خبر اسے اس کی ماں نے تب دی، جب اس نے کئی ہفتوں کے بعد ایک بار پھر نارمل ہونے کی پہلی کوشش کرتے ہوئے اپنے گھر والوں کو فون کیا تھا۔ اس بار کرم علی بار نہیں گیا اس دفعہ کرم علی نے کسی عورت کو نہیں خریدا۔ وہ صرف اگلے تین دن کچھ کھانا بھول گیا۔

تیسرے دن اس کی ملاقات شوکت زماں سے ہوئی تھی۔ وہ ٹیکسی چلا رہا تھا اور شوکت زماں نے اس سے کہیں چلنے کے لیے کہا تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں پہچانا تھا۔ شوکت زماں پہلے کی طرح اس بار بھی شراب کے نشے میں تھا اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا مسلسل مزید شراب اپنے اندر انڈیلتا رہا، کرم علی سڑک پر دوڑتی بھاگتی ٹریفک میں خالی ذہن کے ساتھ اس راستے کو ڈھونڈنے میں مصروف رہا جس پر جانے کے لیے اسے شوکت زماں نے کہا تھا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد جب بالآخر وہ شوکت زماں کو اس کے بتائے ہوئے پتے پر لے کر آیا اور اس نے شوکت زماں سے مطلوبہ کرایہ مانگا تو شوکت زماں دس منٹ اپنے لباس کی ہر جیب چھان مارنے کے باوجود اپنا والٹ برآمد نہیں کر سکا تھا۔ اور یہ ایسا وقت تھا جب کرم علی نے شوکت زماں کو پہچان لیا تھا۔ اور صرف اسی نے نہیں شوکت زماں نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔

"اوئے کرم علی! یہ تو ہے" شوکت زماں نے بے اختیار اس کا نام لیا کرم علی کو حیرت ہوئی۔ اتنی شراب پینے کے باوجود اس کے اعصاب ٹھیک کام کر رہے تھے۔ وہ کئی ماہ پہلے ملے ہوئے ایک شخص کو اس کے پورے نام سے پکار رہا تھا۔

"کیا حالت بنالی ہے تو نے؟ کیا ہو گیا ہے تجھے؟ ہڈیاں کیوں نکل آئی ہیں تیری؟ اوئے تو نے کہیں میری طرح شراب وغیرہ پینا تو نہیں شروع کر دی؟ یا کوئی بیماری وغیرہ تو نہیں لگ گئی تجھے؟"

وہ کسی سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر پے در پے سوال کر رہا تھا کرم علی چپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر اسے چھوڑ کر جانے لگا۔

"اوئے شوکت زماں کو کتا سمجھ رہا ہے جو خوامخواہ بھونکتا جا رہا ہے اور اس کو کسی جواب کی ضرورت ہی نہیں۔"

شوکت زماں نے اس کے اس طرح پلٹنے کا برا مانا تھا۔ کرم نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، وہ شراب کے نشے میں دھت اس شخص سے کس طرح بات کرے۔ وہ ہمیشہ اسی حالت میں ملتا تھا۔ شوکت زماں اب اس کی خاموشی پر کچھ اور گرم ہو رہا تھا۔

"اور کرایا اس طرح چھوڑ کر جا رہا ہے جیسے کسی رئیس کی اولاد ہے تو"

شوکت زماں نے اس جملے کے ساتھ اسے تین چار ناقابل اشاعت گالیاں بھی دی تھیں۔ کرم علی نے زندگی میں بہت لوگوں سے بہت دفعہ گالیاں سنی تھیں۔ اسے کبھی غصہ نہیں آیا تھا۔

وہ نہیں جانتا شوکت زماں کے سامنے کھڑے اس وقت اسے کیوں شدید غصہ آیا اس کی خاموشی اس بار بھی نہیں ٹوٹی تھی مگر اس نے آگے بڑھ کر پوری قوت کے ساتھ شوکت زماں کے جبڑے پر ایک گھونسہ مار دیا۔ منہ اور ناک سے نکلتے ہوئے خون کے فواروں کے ساتھ شوکت زماں نے اسے بے یقینی سے دیکھا پھر کرم علی نے اسے زمین پر گرتے دیکھا، کرم علی کو تب اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ وہ بے حد گھبراہٹ میں زمین پر گرے شوکت زماں کو ہلاتا جلاتا رہا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ ٹیکسی میں ڈال کر کسی قریبی ہاسپٹل لے جاتا، وہاں سے گزرتے کسی آدمی نے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک پولیس والے کو اس واقعہ کی اطلاع دے دی تھی۔

پندرہ منٹ کے اندر کرم علی ہتھکڑیوں کے ساتھ ایک پولیس اسٹیشن میں لایا گیا۔ لاک اپ میں بیٹھے ہوئے بھی اسے اس بات کی تشویش نہیں تھی کہ وہ لاک اپ میں بند ہو جائے گا۔ اسے صرف شوکت زماں کی فکر تھی۔ پتا نہیں اسے کتنی چوٹ آئی تھی۔

"تم واقعی پاگل ہو گئے ہو کرم علی؟ تم واقعی پاگل ہو گئے ہو۔"

اس نے کئی بار خود کو دھتکارا تھا اور شاید لعنت وملامت کا یہ سلسلہ مزید طویل ہو جاتا، اگر وہاں آنے کے پورے دو گھنٹے کے بعد ایک پولیس والا اس کے پاس آ کر اسے یہ اطلاع نہ دیتا کہ اس پر چارجز ختم کر دیے گئے تھے اس آدمی نے جس پر اس نے حملہ کیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ بیان دیتے ہوئے شرمندگی کا اظہار کیا تھا کہ اس نے شراب کے نشے میں کرم علی کو گالیاں دیتے ہوئے اپنے آپ پر حملے کے لیے اکسایا۔ وہ ایسا نہ کرتا تو وہ کبھی مشتعل ہو کر ایسی حرکت نہ کرتا۔

کرم علی بے حد ندامت کے عالم میں لاک اپ سے نکلا اور اس کی ندامت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب اس نے شوکت زماں کو جبڑے پر لگی ہوئی پٹیوں کے ساتھ لاک اپ کے باہر اپنا منتظر پایا۔

اس بار وہ مکمل ہوش میں تھا اور کرم علی کو دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش بھی کی تھی، جو جبڑے پر لگی پٹیوں کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوئی۔

کرم علی نے اس کے قریب آ کر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بول نہیں پایا۔ اس نے جواباً شوکت زماں کو کچھ کہنے کی کوشش کرتے پایا۔

کرم نے کان اس کے قریب لے جا کر اس کی بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی اور وہ کامیاب رہا تھا۔ شوکت زمان اسے ایک بار پھر وہی گالیاں

دے رہا تھا، جن گالیوں کو سننے پر اس نے اس کے جبڑے پر گھونسہ مارا تھا۔

کرم علی بے اختیار گہرا سانس لے کر سیدھا ہو گیا۔ اس لاک اپ میں کھڑے اس کا احسان مند ہوتے ہوئے اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی کے اگلے چند سال اس کے ساتھ اسی طرح گالیاں کھاتے گزارے گا شوکت زمان کینیڈا کے امیر ترین ایشیائی افراد کی لسٹ میں چوتھے نمبر پر تھا اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کینیڈا کا پہلا ایشیائی ایڈز پیشنٹ تھا۔

☆☆☆

انور حبیب اور سفیر نے سینما میں داخل ہوتے ہوئے ٹکٹ لینے کے لیے کھڑے تماشائیوں کی لمبی قطاریں دیکھی تھیں۔ انہیں اس چیز نے پریشان نہیں کیا پاشا پروڈکشنز کی فلم کا کوئی بھی پہلا شو کم از کم اسی طرح ہاؤس فل جاتا تھا۔ کم از کم شہر کے اس سب سے پرانے سینما میں جہاں کسی فلم میں ٹکٹوں کی تعداد نہیں تماشائیوں کا رد عمل کسی فلم اور ایکٹر کی قسمت کا فیصلہ کرتا تھا اور آج ان میں سے کوئی بھی وہاں اپنی قسمت کا فیصلہ سننے نہیں آیا تھا، پری زاد کی قسمت کا فیصلہ ہوتے دیکھنے آیا تھا۔ وہ اس فلم کو پٹتے دیکھنا چاہتے تھے۔

انڈسٹری کا اکلوتا سپر اسٹار اور کامیاب ترین ڈائریکٹر سال کی سب سے بڑے بجٹ کی فلم کو فلاپ ہوتا دیکھنے کے لیے وہاں آئے تھے۔ پچھلے پانچ سالوں میں کبھی اپنی کسی فلم کا پہلا شو دیکھنے کے لیے جاتے ہوئے ان کے دلوں کی دھڑکن اتنی بے ترتیب نہیں تھی، جتنی آج تھی۔ انور حبیب نے کسی فلم کو اس سے زیادہ برا بنانے پر اس طرح کی محنت نہیں کی تھی اور سفیر خان کو یقین تھا، اپنی پچھلی تمام فلموں میں اس نے اس سے زیادہ بری اور ناقص اداکاری نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ تبریز پاشا بھی فلم کے رشز دیکھ کر پہلی بار کسی فلم کے بارے میں اتنا خائف ہوا تھا۔ وہ فلم ویسی نہیں بنی تھی جیسی وہ بنانا چاہتا تھا مگر وہ فلم ویسی ہی تھی جیسی انور حبیب اور سفیر خان اسے دیکھنا چاہتے تھے اور اب سینما میں بیٹھے چند ہزار تماشائی تین گھنٹے میں اس فلم اور اس کے بعد کی قسمت کا فیصلہ سنانے والے تھے۔

وہ پری زاد کی فلم تھی، صرف پری زاد کو ڈوبنا یا تیرنا تھا اس فلم کے ساتھ۔ باقی کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ سفیر سپر اسٹار تھا۔ ایک فلم کا فلاپ ہونا اس پر اثر نہ ڈالتا، یہی حال انور حبیب، اور تبریز کا تھا اور یہی حال اس فلم سے منسلک باقی تمام افراد کا تھا۔

گیلری میں فلم انڈسٹری اور میڈیا کے چیدہ لوگ تھے اور وہاں پر پری زاد کے آنے سے پہلے پری زاد کے مستقبل کی بات ہو رہی تھی۔

فلم کا شو شروع ہونے سے پانچ منٹ پہلے زینی سلطان کے ساتھ گیلری میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ نروس تھی یا نہیں۔ اگر نروس تھی بھی تو اس نے گھبراہٹ کو مکمل طور پر چھپایا ہوا تھا۔ یہ میڈیا کے لوگوں کا اندازہ تھا۔ یہ صرف سلطان جانتا تھا کہ وہ بالکل نروس نہیں تھی۔ اس نے آج تک کسی ہیروئن کو، اتنا بے فکر اور بے پروا ہو کر اپنی فلم کے پہلے شو کو دیکھنے کی تیاری کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

اس کے گیلری میں داخل ہوتے ہی کچھ لوگوں نے اسے مبارک باد دی تھی۔ صرف دو افراد اس کے قریب نہیں آئے تھے، سفیر اور انور۔ وہ دور سے اسے گیلری میں موجود دوسرے مردوں سے ملتے دیکھتے رہے۔ وہ اس نیم تاریکی میں بھی اتنی ہی ہوش ربا لگ رہی تھی، جتنی روشنی میں لگتی تھی۔ گیلری میں بیٹھا ہوا ہر مرد اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

ہال کی لائٹس آف ہو گئی تھیں۔ پری زاد کی پہلی فلم کا پہلا شو شروع ہو گیا تھا۔ پہلے دس منٹ تک پری زاد کی انٹری نہیں تھی، صرف سفیر اور سیکنڈ لیڈ کی کہانی چل رہی تھی اور ڈائریکشن اور اداکاری کے جھول سینما کی قد آدم اسکرین پر بے حد واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ سفیر نے ہال میں اپنے کچھ سینز پر اپنے بارے میں بلند آواز میں کچھ تبصرے بھی سنے اور ان تبصروں کے بعد اس نے گیلری میں بیٹھے میڈیا کے لوگوں کو آپس میں سرگوشیاں کرتے بھی دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے اسے بے یقینی ہوئی تھی مگر پھر اس نے اپنے ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

''وہ یہ سب کچھ پری زاد کے لیے کر رہا تھا۔'' اس نے نیم تاریکی میں ایک مدھم مسکراہٹ کے ساتھ خود کو یقین دلایا۔

پہلے دس منٹ میں فلم اور ایکٹرز ہوٹ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انور حبیب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے بہت جتانے والے انداز میں دو چار بار گردن گھما کر زینی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ پتھر کے بت کی طرح اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

اس وقت اس ہال میں شاید وہی تھی جو فلم دیکھ رہی تھی۔ باقی سب باتیں کر رہے تھے، اسموکنگ کر رہے تھے۔ دھیمی آواز میں ہنس رہے تھے یا پھر فلم کے مختلف سین پر بلند آواز میں تبصرے کرنے میں مصروف تھے۔ تبریز پاشا کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا اور سلطان کی ہتھیلیوں پر۔ پری زاد کے علاوہ وہ دو لوگ تھے جن پر اس فلم کی کامیابی یا ناکامی سے کوئی اثر پڑنے والا تھا۔

گیارہویں منٹ میں زینی کی پہلی انٹری ہوئی تھی اور اسکرین پر اس کا چہرہ نظر آتے ہی پہلے چند لمحوں کے لیے گہری خاموشی ہوئی۔ پھر ہال میں بیٹھے تماشائیوں نے زوردار تالیوں کے ساتھ جیسے پری زاد کا استقبال کیا تھا۔ وہ اس فلم کے کسی بھی ایکٹر کو پچھلے گیارہ منٹ میں ملنے والی پہلی داد تھی۔

سفیر خان اور انور حبیب نے بے اختیار پہلو بدلے اور تبریز پاشا کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نظر آئی۔

وہ فلم کا وہ پہلا سین تھا، جسے تماشائیوں نے ابتدائی داد کے بعد بالکل خاموش ہو کر دیکھا تھا اور سین کے اختتام پر پری زاد کی آمد کے ساتھ ہی اسے ایک بار پھر داد ملی تھی۔

تبریز پاشا اور سلطان کے تنے ہوئے جسم پرسکون ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اب سفیر اور انور حبیب کے جسم تناؤ کا شکار ہونے لگے تھے۔ اگلے سات منٹ میں وہ جتنی بار اسکرین پر نظر آئی۔ تماشائیوں نے اسے تالیاں بجا کر داد دی تھی۔ یہ صرف اس کی خوبصورتی نہیں تھی۔ اداکاری بھی تھی جسے سراہا جا رہا تھا۔ اس کے سامنے کھڑا سفیر بے حد بونگا اور بعض سینز میں بھدا لگ رہا تھا اور رہی سہی کسر اس کی بری اداکاری پوری کر رہی تھی۔

کیمرہ جب پری زاد کے چہرے پر آتا پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھتا اور جب سفیر کے چہرے پر آتا۔ ہال میں بے ہودہ آوازے کسے جاتے۔ سفیر کے ماتھے پر اب پسینہ آ رہا تھا۔

فلم کے سترہویں منٹ میں پری زاد کا پہلا گانا اور ڈانس آیا تھا۔ پری زاد نیم عریاں لباس میں اسکرین پر بے حد بے ہودہ مگر مشکل ڈانس بہت خوبصورتی سے کر رہی تھی۔ مرد تماشائی اپنی سیٹوں پر کھڑے ہو کر ناچ رہے تھے۔ ہال میں شور برپا تھا۔

انور حبیب اور سفیر کے چہرے فق ہو رہے تھے۔ پری زاد بھی ان ہی کی طرح بے حس و حرکت اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔

☆☆☆

سینما کی اسکرین پر پری زاد ناچ رہی تھی۔ گیلری میں بیٹھی زینی کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ وہ ہال میں مرد تماشائیوں کی سیٹیوں کی آواز سن سکتی تھی۔ ان کی زبان سے نکلنے والے جملے سن سکتی تھی۔ نیم تاریک سینما میں مرد تماشائیوں کے ہاتھوں میں پکڑی لیزر لائٹ کی beam کو اسکرین پر ناچتے اپنے جسم کے نیم برہنہ حصوں پر پڑتے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے جسم پر چیونٹیاں رینگتی محسوس ہوتی تھیں۔

اس کا جسم کپکپانے لگا تھا۔ اس نے یہ کیسے سوچ لیا تھا کہ وہ اب کسی بات پر ذلت محسوس نہیں کرے گی۔ ذلت کی آخر کتنی شکلیں ہو سکتی ہیں

اور اس کے حصے میں کون کون سی آئی تھی۔ کب ...؟ کب ...؟ کس وقت ...؟ کس موڑ پر ...؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اپنے چہرے پر میک اپ کی گہری تہوں کے باوجود اسے اپنا چہرہ پسینے سے شرابور ہوتا محسوس ہوا۔ صرف چہرہ نہیں، پورا جسم۔ اس کے جسم پر لپٹی شفون کی ساڑھی بھیگنے لگی تھی۔

فلم کی سکینڈ ہیروئن ہال میں ناچتے مرد تماشائیوں کی تالیاں سن کر خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ تبریز پاشا اور انور حبیب گلے مل رہے تھے۔ پری زاد کی پہلی فلم کا پہلا شو ہاؤس فل گیا تھا۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری پر ایک نئی ملکہ راج کرنے کے لیے آ گئی تھی۔

سلطان اس "نئی ملکہ" کے دائیں جانب بیٹھے بار بار اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے فلم انڈسٹری کی کسی ہیروئن کو پہلی clap ملنے پر اس طرح گم صم بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے آس پاس بیٹھے سب لوگوں سے ملی تھی لیکن سلطان نے بہت بہت شکر ادا کیا کہ وہاں نیم تاریکی میں کوئی بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ فلم کے ختم ہونے تک زینی کے موبائل پر ایک کے بعد ایک فون آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ فون سلطان اٹینڈ کر رہا تھا۔

"یہ میں نہیں ہوں، یہ پری زاد ہے۔" وہاں بیٹھے اپنے آپ کو سینما کی اسکرین پر دیکھتے ہوئے زینی نے زندگی میں پہلی بار اپنے عکس، اپنے وجود، اپنی زندگی سے چھپنے کی کوشش کی۔ تین گھنٹے کے اس شو میں اس نے اسکرین پر پری زاد کی فلم نہیں دیکھی تھی۔ اس نے ایک بار پھر زینب ضیاء کی پوری زندگی دیکھی تھی۔ اور وہاں بیٹھے بہت دنوں کے بعد اسے شیراز یاد آیا تھا۔ ان درجنوں مردوں کے بیچ میں اس نیم عریاں لباس میں بیٹھے اسے وہ یاد آیا تھا اور صرف وہی نہیں، اسے بہت کچھ یاد آیا تھا۔

اس سینما میں اس شام وہ کسی شناخت کے بغیر آئی تھی مگر وہاں سے نکلتے وقت اس کی حیثیت تبدیل ہو چکی تھی۔ کون اس کی تصویر لینا چاہتا تھا کون اس سے آٹوگراف لینا چاہتا تھا، کون اسے ہاتھ لگانا چاہتا تھا اور کون اس پر فریفتہ ہونا چاہتا تھا۔ اسے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ سجائے وہ لوگوں کی اس بھیڑ میں سے گزرتی گئی جو سینما کے باہر اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ سلطان، تبریز پاشا، انور حبیب اور چند دوسرے مردوں کو اس کے لیے راستہ بنانا پڑ رہا تھا تاکہ وہ ان سب سے بچ بچ کر گزر جائے اور وہ اپنے کانوں میں پری زاد اور فلم کے بارے میں تماشائیوں کے جملے سن رہی تھی۔ سلطان برق رفتاری سے اس کے آگے چلتا ہوا اس کے لیے راستہ بنا رہا تھا۔ وہ ساری زندگی یہی کام کرتا رہا تھا۔ ہیروئنوں کے آگے چلتے ہوئے رستہ بنانا، آج پھر وہ وہی کام کر رہا تھا۔

گاڑی سے سینما میں جاتے ہوئے زینی کو دو منٹ لگے تھے۔ واپس گاڑی تک پہنچتے ہوئے دس منٹ لگے تھے۔

گاڑی کا دروازہ بند ہوتے ہی ہجوم چھٹ گیا تھا جس کے بیچ سے گزر کر وہ گاڑی تک آئی تھی اور گاڑی کے سینما سے باہر نکلتے ہی زینی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اوندھے منہ گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ڈرائیور اور سلطان نے حواس باختہ انداز میں پیچھے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ ڈرائیور دوبارہ ونڈ اسکرین کی طرف متوجہ ہو کر گاڑی چلانے لگا۔ سلطان اسی حواس باختہ انداز میں پچھلی سیٹ پر اوندھے منہ گری زینی کو دیکھتا رہا۔ وہ کیوں رو رہی تھی؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر وہ خوشی کے آنسو نہیں تھے، یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

خوشی کے آنسو کوئی دھاڑیں مار مار کر نہیں بہاتا اور یہ بھی نہیں تھا کہ سلطان نے کبھی کسی ہیروئن کو روتے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے جن دو ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا تھا، انہیں اسی طرح کئی بار روتے دیکھا تھا مگر ان کے رونے اور زینی کے رونے میں بہت فرق تھا۔ کیا فرق تھا؟ یہ سلطان سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

گھر کے گیٹ پر پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی روکتے ہوئے ہارن دیا۔ اس سے پہلے کہ چوکیدار گیٹ کھولتا، زینی یک دم پچھلی سیٹ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم چلے جاؤ، مجھے کہیں جانا ہے۔"

وہ اب دروازہ کھول کر نیچے اتر رہی تھی۔ جب وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ گئی تو سلطان نے دروازے کے ہینڈل پر رکھا اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ اس سے مخاطب نہیں تھی، وہ ڈرائیور سے بات کر رہی تھی۔ ڈرائیور دروازہ کھول کر اتر گیا۔

زینی نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور گاڑی کو دوبارہ مین روڈ پر لے آئی۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں اب بھی آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے لیکن وہ اب پہلے کی طرح نہیں رو رہی تھی۔ سلطان سے کوئی بات کیے بغیر وہ سڑک پر گاڑی دوڑاتی رہی۔ کافی دیر تک گاڑی میں خاموشی رہی پھر بہت دیر تک وہ اسی طرح سنسان سڑکوں پر گاڑی دوڑاتی رہی۔ سلطان نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ وہ کہاں جا رہی تھی مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ گاڑی کسی رستے پر نہیں تھی۔ زینی بھی کسی رستے پر نہیں تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ بے مقصد لاہور کی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتی رہی۔

کسی بھی فلم کے ہٹ ہونے کے بعد یہ وہ وقت ہوتا تھا جب ہیروئن، پروڈیوسر یا ڈائریکٹر کے گھر پر جشن کا سماں ہوتا تھا۔ شراب پی جا رہی ہوتی، رقص جاری ہوتا تھا، نئی فلموں کی آفرز اور ڈیلز حاصل کرنے کے لیے جدوجہد ہو رہی ہوتی تھی۔

تبریز پاشا کے گھر پر بھی اس وقت جشن جاری تھا اور پری زاد کو بلانے کے لیے فون پر فون کیے جا رہے تھے۔ مگر پری زاد کا فون بند تھا۔ وہ کہاں تھی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ سوائے ایک شخص کے جو اس کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا اس کے ساتھ رات کے اس پہر شہر کی سڑکوں پر خوار ہو رہا تھا۔ کئی گھنٹوں بعد زینی نے بالآخر گھر کی طرف گاڑی موڑی۔ سلطان نے خدا کا شکر ادا کیا، وہ بالآخر نارمل ہو رہی تھی۔

گھر کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے سلطان سے کہا۔

"تم یہیں بیٹھو، میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔"

سلطان گاڑی سے نیچے نہیں اترا۔ اس نے فون آن کر کے تبریز پاشا کو آدھ گھنٹے میں اس کے گھر پہنچنے کی اطلاع دی۔ اس کا خیال تھا، زینی اس لیے کپڑے بدلنے گئی تھی لیکن پانچ منٹ کے بعد گھر سے برآمد ہونے والی پری زاد کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ وہ میک اپ سے بے نیاز چہرے میں کاٹن کے ایک معمولی سوٹ اور چادر میں ملبوس پاؤں میں ایک سستی چپل پہنے ہوئے تھی۔ ایک بار پھر گاڑی میں بیٹھ کر وہ گاڑی ڈرائیو کرنے لگی تھی۔ سلطان نے کچھ پوچھنے کے بجائے ایک بار پھر موبائل آف کر دیا۔ وہ اس بار بجنے لگتا تو اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

پری زاد کو آج رات کسی پارٹی میں نہیں جانا تھا، یہ سلطان جان گیا تھا۔

ایک گھنٹہ ڈرائیو کرنے کے بعد وہ کسی پرانے محلے میں آئی تھی۔ سلطان سے کچھ کہے بغیر وہ گاڑی سے اتر گئی تھی۔ سلطان بھی اس کے پیچھے اتر گیا تھا۔ اسے تجسس ہو رہا تھا، وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ وہاں کون تھا؟ جس کے لیے وہ رات کے اس پہر یوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں آ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں سوچیں آ رہے تھے، وہ ہزار اندازے لگا رہا تھا مگر وہ جہاں جا کر رکی تھی، اس جگہ نے سلطان کے وجود میں جیسے بجلی کا کرنٹ دوڑا دیا تھا۔ وہ ایک قبرستان تھا، وہ رات کے پچھلے پہر اس گھپ اندھیرے قبرستان کی ایک ٹوٹی ہوئی عقبی دیوار کو پھلانگ کر داخل ہوئی تھی اور پھر سلطان نے اسے ایک چھوٹی ٹارچ جلاتے دیکھا۔ وہ گنگ اس کے پیچھے چلتا رہا۔

وہ قبروں کے بیچ میں چلتے ہوئے کوئی قبر ڈھونڈ رہی تھی اور پھر سلطان نے اسے ایک قبر کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے دیکھا۔ اس نے ٹارچ بجھا دی۔ سلطان کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ قبرستان ایک بار پھر اندھیرے میں ڈوب گیا تھا مگر سلطان کو اب کوئی تجسس نہیں رہا تھا۔

وہ جانتا تھا، وہ وہاں کیا کرنے آئی تھی۔ زینی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی لیکن اس نے ضیاء کی قبر کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ باپ کے پاس وہ سب کچھ پہن کر آئی تھی جو ضیا کے "رزق حلال" سے خریدا گیا تھا۔ مگر یہ صرف اس کا اپنا وجود تھا جو اب اسے ایک آلائش لگ رہا تھا۔ وہ اس قابل نہیں رہی تھی کہ ضیا کی قبر کی مٹی کو بھی ہاتھ لگانے کی جرأت کر سکتی وہ پھر بھی ضیا کے پاس ایک آخری بار رونے آئی تھی۔ آخری بار کچھ کہے بغیر باپ کو اپنے دل کا حال بتانے آئی تھی۔ اس کے بعد دنیا نے اسے کھا جانا تھا۔ وہ ساری رات وہاں بیٹھی روتی رہی تھی۔ یہ فلم انڈسٹری میں اس ملکہ کی تاج پوشی کی رات تھی جس نے اگلے نو سال اس فلم انڈسٹری پر بلا شرکت غیرے حکومت کرنا تھی۔

☆☆☆

"یہ کس نے بھیجے ہیں؟" زینی نے اس بے نام پیلے گلابوں کے گلدستے پر نظر ڈالتے ہوئے مڑ کر سلطان سے پوچھا۔
آج تک اسے کسی نے پیلے گلاب نہیں بھیجے تھے۔ اسے ہمیشہ سرخ گلاب ہی ملتے تھے۔ خون کی طرح سرخ گلاب یہ شاید کوئی نہیں جانتا تھا کہ زینی کو صرف پیلے گلاب پسند تھے اس کو کبھی بھی گلاب کا سرخ پھول اچھا نہیں لگا تھا اور اب اس کے گھر پر بھجوائے جانے والے پھولوں میں سرخ گلابوں کی بھرمار ہوتی تھی زینی ایک نظر بھی ان میں سے کسی بکے پر نہیں ڈالتی تھی۔ صرف یہ ایک بکے تھا جس پر اس کی نہ صرف نظر ٹکی ہوئی تھی بلکہ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا تھا۔

"پتا نہیں، ساتھ یہ لفافہ آیا تھا۔"

سلطان نے ایک بند لفافہ اس کی طرف بڑھایا زینی نے پھول رکھتے ہوئے بے حد دلچسپی سے اس لفافے کو کھولا۔ اندر ایک چھوٹے سے کارڈ پر صرف دو لفظ لکھے تھے۔

"For Zaini"

ایک لمحہ کے لئے زینی کا ہاتھ کپکپایا۔ یہ زینی کو پھول بھیجنے والا کون تھا؟ کون تھا جو نہ صرف اس کا نام جانتا تھا، بلکہ اس کی پسند سے بھی واقف تھا۔ ذہن کی اسکرین پر ابھرنے والا چہرہ ایک ہی تھا، شیراز کا چہرہ مگر وہ ہینڈ رائٹنگ شیراز کی ہینڈ رائٹنگ نہیں تھی۔

وہ چند لمحے خالی خالی نظروں سے اس کارڈ کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کارڈ کو دوبارہ لفافے کے اندر رکھ دیا اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔ وہ خوش فہمیوں کے جال سے آزاد ہو چکی تھی۔

اپنے جوتے اتار کر وہ صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگی۔ سلطان اسے اخبارات میں آنے والے ریویوز پڑھ کر سنا رہا تھا جو اس کی فلم کے متعلق تھے۔ زینی بے حد سنجیدگی سے ان ریویو کو سنتی رہی۔ اسے کسی تنقید یا تعریف میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن سلطان کو تھی وہ باقاعدگی سے اس کے بارے میں کسی بھی اخبار میں آنے والی ہر خبر ہر تبصرے کو اس تک پہنچاتا۔

اور زینی کا رد عمل اسے حیران کرتا یہ فلم انڈسٹری کی پہلی ہیروئن تھی جسے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ لوگ اور اخبار والے اس کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے۔

زینی کے ساتھ گزرنے والا ہر دن اسے زینی کے کسی نئے رخ سے آشنا کرتا تھا وہ اس کے گھر کے افراد سے واقف تھا۔ ان کی زندگیوں کے بارے میں جانتا تھا مگر جس ایک لڑکی کے ساتھ وہ دن رات گزار رہا تھا وہ کسی بھید کی طرح تھی اس کے لئے، فلم انڈسٹری میں وہ کیوں آئی تھی؟ یہ سلطان جانتا تھا۔

پیسہ کمانے کے لئے۔

مگر وہ پیسہ کس لیے کما رہی تھی۔ یہ سلطان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس نے زینی کو کبھی اپنے پیسے اپنے زیورات اپنی قیمتی چیزوں کو کسی لاکر

کسی تالے میں رکھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ باہر پڑی ہوتیں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر، بیڈ کی درازوں میں۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبلز پر، لیکن باہر ..... سامنے دعوت عام دیتے ہوئے سلطان اس کے زیورات اور پیسے کو سنبھالتے سنبھالتے تنگ آ جاتا۔ لیکن ہر روز اس کا کسی نہ کسی سیٹ کا کچھ نہ کچھ گم ہوتا رہتا۔ اور یہ صرف اور صرف زینی کی لاپروائی کی وجہ سے ہوتا تھا۔ لیکن سلطان کو حیرت ہوتی تھی کبھی کسی رقم، کسی زیور، کسی قیمتی چیز کے گم ہونے پر اس نے زینی کو پریشان نہیں دیکھا تھا، بجائے تھی کہ اس کے ماتھے پر ایک سلوٹ تک آ جاتی، یوں لگتا جیسے اسے پرواہ نہیں تھی اس کی کیا چیز کھو رہی ہے۔

''جب پیسے کو حفاظت سے نہیں رکھنا تو اسے حاصل کرنے کے لئے ہلکان کیوں ہو رہی ہیں پری جی؟''

سلطان نے اس دن جھنجلا کر اس کے ایک سیٹ پر شوٹنگ کے دوران کہا تھا۔ زینی کا پرس گم ہو گیا تھا اور اس میں صبح ہی سلطان نے بینک سے ایک چیک کیش کروا کر پچاس ہزار رکھے تھے۔

''پیسے کی ضرورت ہے مجھے، اس سے محبت نہیں۔'' وہ زینی کے جواب پر بول نہیں سکا تھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی چیزیں کھوتا پھرے؟'' سلطان نے کچھ دیر کے بعد خفگی سے کہا۔

''جو کھویا ہے میں نے، وہ اگر گنوا دوں تمہیں تو ان کے سامنے یہ ساری چیزیں کچھ لگیں ہی نا۔''

اس نے ہنس کر سلطان سے کہا تھا۔

سلطان کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے کیا کہے۔ وہ سننے اور سمجھنے والی شے نہیں تھی۔ وہ پری زاد تھی۔ اور وہ، وہ کرتی تھی جو اس کے دل میں آتا تھا۔

پہلی فلم کی کامیابی کے بعد اس کے سامنے آفرز کے انبار لگ گئے تھے اور زینی نے وہی کیا تھا جو اس صورت حال میں کوئی بھی ایکٹریس کرتی اس نے 25 فلمیں سائن کر لی تھیں۔ فلم انڈسٹری کے ہر بڑے چھوٹے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی فلم اس نے سائن کی تھی۔

تبریز پاشا اس پر بڑا جز بز ہوا تھا۔ وہ اگلے پانچ سالوں تک زینی کو صرف اپنی فلموں میں کام کرتے دیکھنا چاہتا تھا اور وہ بار بار زینی کو یہ بات جتانا نہیں بھولتا تھا کہ زینی کو فلم انڈسٹری میں اس کی فلم کی وجہ سے کامیابی ملی تھی۔ اس پر سب سے زیادہ ''حق'' اس کا تھا۔ مگر وہ بہر حال زینی پر پہرے نہیں لگا سکتا تھا۔

اس نے فلم انڈسٹری کی ہر ہیروئن کو ایک ہٹ فلم کے بعد ایگریمنٹ توڑتے دیکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ زینی بھی یہی کرے گی، کامیابی سیلاب کی مانند ہوتی ہے اس کے سامنے بند باندھنے والا احمق ہوتا ہے اور تبریز پاشا بہر حال احمق نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اسے ٹھوکر مارنے کے لئے زینی کو کوئی اور زینہ مل جائے اور وہ جانتا تھا کہ اس وقت انڈسٹری کا ہر پروڈیوسر زینی کے لئے سیڑھی کا پائیدان بننے کا خواہش مند تھا۔

اور زینی کے اس طرح دھڑا دھڑ فلمیں سائن کرنے پر جز بز ہونے والا وہ اکیلا نہیں تھا۔ سلطان نے بھی زینی کو بے حد روکنے کی کوشش کی تھی۔

اس چھوٹی فلم انڈسٹری میں سال میں دو چار فلموں سے زیادہ فلموں کے ہٹ ہونے کا امکان کم تھا اور پچیس فلموں میں سے بیس فلموں کے فلاپ ہونے کا مطلب ایک نئی ہیروئن کے لئے کیا تھا۔ یہ سلطان جانتا تھا زینی نہیں۔ لیکن زینی اس معاملے میں اس کی بات سننے پر تیار نہیں تھی۔

مجبوراً سلطان نے اسے ان فلموں کو سائن کرنے دیا مگر زیبی کو ڈیٹس دینے کے سلسلے میں اس نے بے حد ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان میں سے بہت سے پروڈیوسرز کو دوسرے۔اور تیسرے سال کی ڈیٹس دیں۔

ان میں سے کچھ پرانے پروڈیوسرز نے اس پر کچھ ہنگامہ ضرور کیا۔ مگر نئے پروڈیوسر جو صرف ایک فلم کے پروڈیوسر کے طور پر اپنا نام اور ہیروئن کے ساتھ تصویر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ تھوڑی سی چوں چرا کے بعد ان ڈیٹس پر رضا مند ہو گئے تھے۔

پہلے سال میں پری زاد کی صرف دس فلمیں سیٹ پر تھیں اور ان میں سے کسی فلم میں سفیر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ پہلے سفیر لوگوں کو پری زاد کو اپنے ساتھ کاسٹ کرنے سے منع کرتا تھا۔ اب یہ کام پری زاد نے کیا تھا۔ اس نے ہر پروڈیوسر سے ہیرو کا نام تبدیل کروا کر فلم سائن کی تھی۔ اور سلطان اس پر بھی خوش نہیں تھا۔

سفیر کے علاوہ باقی سارے ہیرو سیکنڈ لیڈ سمجھے جاتے تھے اور سیکنڈ لیڈ ایکٹرز کے ساتھ ہیروئن کے طور پر فلم کرنا سلطان کے نزدیک پروفیشنل خودکشی تھی اور سلطان خائف تھا کہ جیسے ہی اس کی ابتدائی کچھ فلمیں فلاپ ہوئیں پروڈیوسر نام کے پرندے اس کی دیواروں سے غائب ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس وقت اس کو سفیر کے ساتھ فلم کی ضرورت پڑتی اور سلطان جانتا تھا کہ سفیر جیسا منتقم مزاج آدمی اس وقت پری زاد کے ساتھ کبھی فلم نہ کرتا۔

پری زاد اس وقت گرتی ہوئی دیوار ہوتی اور سفیر گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دینے کی شہرت نہیں رکھتا تھا۔ خاص طور پر اس صورت حال میں جب ہر پروڈیوسر سفیر کو یہ بتاتا کہ وہ اسے فلم سے اس لیے کٹ کر رہا تھا کہ پری زاد اس کے ساتھ اس کے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتی۔ سفیر یہ سب کچھ بھولنے والا نہیں تھا اور سفیر ہی کیا اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہ سب کچھ نہیں بھولتا۔ مگر پری زاد کو سفیر سے کتنی چڑ تھی۔ یہ سلطان کو پتہ نہیں تھا اس کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے کیریئر کی دو بڑی غلطیاں ایک ہی وقت میں کر رہی تھی اور ایک ہی وقت میں دو غلطیاں بہت تھیں، سلطان کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ "بہت" زیبی کے لئے "بہت" نہیں تھیں۔

"میں انور حبیب کی ڈائریکشن میں کام نہیں کروں گی۔ تم صبح اخبار میں میرا بیان لکھوا دو۔"

وہ اس وقت گاڑی میں تبریز پاشا کے گھر ہونے والی ایک فلمی پارٹی سے واپس آ رہے تھے جب راستے میں زیبی نے سلطان کے سر پر بے حد آرام سے ایک اور بم پھوڑا۔

☆☆☆

"تو کہاں غائب ہو گیا تھا کرم علی؟ میں نے تجھ سے کہا تھا میرے ساتھ واپس چلنا مگر تو پہلے کیوں چلا گیا؟ میں نے اتنی بار فون کیا تیرے گھر۔ اتنی دفعہ پیغام چھوڑا تیرے بیٹے مگر مجال ہے تو نے ایک دفعہ بھی جواب میں کال کی ہو۔ تجھے کوئی خدا کا خوف ہے بھی یا نہیں؟"

شوکت زمان گاڑی میں اب اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھے مسلسل بول رہا تھا اور کرم علی صرف خاموشی سے اس کے ایک کے بعد دوسرے سوال کو سن رہا تھا۔

"مجھے کسی کام سے جلدی واپس آنا پڑا تھا۔" اس نے بالآخر شوکت زمان کی ایک گھنٹہ کی تقریر کے درمیان مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کیوں؟"

ایک لحہ کو کرم علی کو اپنے زخم دوبارہ رستے ہوئے محسوس ہوئے۔ سب کچھ ایک بار پھر سے یاد آنے لگا تھا۔

"بس تھی کوئی وجہ۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔ وہ شوکت زمان جیسے آدمی کے ساتھ اپنا دکھ شیئر نہیں کر سکتا تھا کم از کم اس وقت اس کا یہی خیال تھا۔

"چل نہ بتا، کبھی نہ کبھی تو بتائے گا۔ میں تو روز پوچھوں گا تجھ سے۔"

شوکت زماں اسے بہت احمق لگا۔ آخر وہ روز اس کا سامنا کہاں کرنے والا تھا وہ تو صرف اسے اس کی بتائی ہوئی جگہ پر چھوڑ کر واپس آجانے والا تھا اور وہ جگہ قریب ہی تھی پھر شوکت زماں سے اس کی جان چھوٹ جانی تھی۔

"کتنی زور سے مارا ہے تو نے ..." شوکت زماں نے ایک گالی کے ساتھ اپنا جبڑا اور پھر اپنا ناک باری باری چھوا۔ "اور میں تجھے کتنا شریف آدمی سمجھتا تھا۔" شوکت زمان نے ایک اور گالی دی۔

کرم علی کو بے اختیار شرمندگی ہوئی اسے یقین تھا شوکت زمان کو واقعی بہت تکلیف ہو رہی ہوگی۔

"گاڑی کیوں روکی تو نے؟" شوکت زمان کے بتائے ہوئے ایڈریس پر گاڑی روکنے پر شوکت نے بے حد حیرانی کے ساتھ اسے دیکھا پھر گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔

"آپ کے اپارٹمنٹ والی جگہ پر آ گیا ہوں۔" کرم علی نے جیسے اسے یاد دہانی کرائی۔

"تو میں کیا کروں؟" شوکت زمان نے بے حد اطمینان سے کہا۔

"آپ نے یہی ایڈریس بتایا تھا۔" کرم علی نے جیسے کچھ جتانے والے انداز میں کہا۔

"ہاں تو ایڈریس بتایا تھا یہ تو نہیں کہا تھا کہ مجھے یہاں لے کر آ جاؤ۔" شوکت نے بے حد اطمینان سے کہا۔

"آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ کچھ دیر اگر سو جائیں گے تو آپ کے لئے مناسب رہے گا۔" کرم علی نے بے حد طریقے سے اس سے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک کہا تو نے۔" شوکت زمان نے کچھ دیر جیسے اس کی بات پر غور کیا اور پھر سر ہلایا۔

کرم علی سے مزید کچھ کہے بغیر وہ گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر نیچے اترا اور اس کے ساتھ ساتھ کرم علی بھی اپنا دروازہ کھول کر اسے خدا حافظ کہنے کے لیے نیچے اترا لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ کہہ پاتا۔ شوکت زمان بڑے اطمینان کے ساتھ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر دوبارہ گاڑی کے اندر داخل ہوا اور سیٹ پر لیٹتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا۔

کرم علی نے بڑبڑا کر اسے جھک کر اپنی طرف والی کھڑکی سے دیکھا مگر شوکت زماں بے حد اطمینان سے آنکھیں بند کیے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ کرم علی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ چند لمحے اسی طرح گاڑی سے باہر کھڑے اسے دیکھ کر وہ اپنی سیٹ سے اندر آیا اور اس نے شوکت زمان سے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ آپ اگر اپنے گھر جا کر آرام کرتے تو آپ کو زیادہ فائدہ ہوتا۔" کرم علی نے اپنا حلق کھنکار کر صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں پتا ہے۔ بہت فائدہ ہوتا مگر "اپنا گھر" کہاں سے لاؤں؟"

شوکت زماں نے یک دم آنکھیں کھول کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ کرم علی کو لگا جیسے وہ نشے میں ہے۔ حالانکہ اسے یقین تھا وہ کم از کم اس وقت کسی قسم کے نشے میں نہیں ہو سکتا۔ انجکشن یا میڈیسن کی غنودگی ایک الگ چیز تھی۔

"یہ اس بلڈنگ میں آپ کا اپارٹمنٹ ہے۔ آئیں میں آپ کو اپارٹمنٹ تک چھوڑ آؤں۔" کرم علی نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"تو اپارٹمنٹ ہے نا۔ گھر تو نہیں، اس طرح کے تو کئی اپارٹمنٹ ہیں میرے پاس نیویارک میں، واشنگٹن میں، لاس اینجلس میں، شکاگو میں۔"

وہ اب اسے روانی سے امریکہ اور کینیڈا کے وہ سارے شہر گنوا رہا تھا جہاں اس کے اپارٹمنٹ تھے۔

"میں نے تمہیں دوبئی والے اپارٹمنٹ کا بتایا؟" بات کرتے کرتے اسے یاد آیا۔

"نہیں" کرم علی نے بے ساختہ کہا۔

"دوبئی میں بھی ہے میرا ایک اپارٹمنٹ۔" شوکت زماں نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

"اس وقت اس کی مارکیٹ ویلیو ... ایک منٹ ٹھہرو ذرا ..." شوکت زمان بات کرتے کرتے رکا، پھر سیٹ پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے کیلکولیٹر نکال کر کچھ حساب کتاب شروع کر دیا۔ کرم علی کو بے حد کوفت ہوئی۔ آدھا دن پہلے ہی پولیس اسٹیشن جانے اور وہاں سے آنے میں ضائع ہو چکا تھا اب وہ اس کا بقیہ دن بھی ضائع کر رہا تھا۔

"مجھے دلچسپی نہیں ہے آپ کے اپارٹمنٹ اور اس کی مارکیٹ ویلیو میں۔ آپ براہ مہربانی میری کیب سے اتر جائیں۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔"

" کرم علی نے اس بار قدرے ترشی سے کہا۔

شوکت زماں نے قدرے حیران نظروں سے اسے دیکھا اور پھر کیلکولیٹر کو اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں نے تو یہاں نہیں اترنا مجھے تو کہیں اور جانا ہے۔"

اس بار کچھ کہے بغیر کرم علی اندر بیٹھ گیا۔

"بتائیں۔ کہاں جانا ہے آپ کو؟" اس نے شوکت زماں سے کسی حجت کے بغیر کہا۔

"پولیس اسٹیشن۔" کرم علی کو اس پر بے حد غصہ آیا وہ جیسے دھمکا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پولیس اسٹیشن کی دھمکی دے گا تو وہ اس سے ڈر جائے گا اور یقیناً کرم علی اگر کچھ ماہ پہلے کے حالات سے نہ گزرا ہوتا تو ڈر ہی جاتا۔ مگر اب بات دوسری تھی۔ ایک بھی لفظ کہے بغیر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر ہوا کی رفتار کے ساتھ اڑاتے ہوئے اسی پولیس اسٹیشن لے آیا جہاں چند گھنٹے پہلے وہ لاک اپ میں تھا۔ پولیس اسٹیشن کی عمارت کے سامنے آتے ہی شوکت زمان بڑے اطمینان سے کپڑے جھاڑتے ہوئے ٹیکسی سے اتر آیا۔ کرم علی بھی غصے کے عالم میں ٹیکسی سے اتر آیا تھا۔

پولیس اسٹیشن کی عمارت کے اندر داخل ہونے والے شوکت زماں نے کرم علی کو چند بار مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ اب شوکت زماں سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ متعلقہ پولیس آفیسر تک پہنچتے پہنچتے کرم علی اپنے ذہن میں وہ تمام جملے تیار کر رہا تھا جو اسے شوکت زماں اور اس کے رویے کے بارے میں پولیس والے سے کہنے تھے مگر شوکت زماں کے بولتے ہی کرم علی کو لگا وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق تھا۔

شوکت زماں پولیس آفیسر کو اپنے والٹ، اس میں موجود کاغذات، رقم اور چند دوسری چیزوں کے گم ہو جانے کی رپورٹ کروانے کے لئے آیا تھا۔ وہ پولیس والے کو اس بار کے بارے میں بتا رہا تھا جہاں اس نے آخری بار والٹ نکالا تھا اور اسکے بعد اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے والٹ اپنی جیب میں واپس ڈالا یا اسے وہیں چھوڑ دیا یا اس کی جیب میں والٹ ڈالتے ہوئے وہ وہاں گر گیا یا کسی نے اس کی جیب سے نکال لیا۔

شوکت زماں کو اس بار آدھ گھنٹہ لگا تھا اور کرم علی ہونقوں کی طرح کبھی اس کی اور کبھی پولیس والے کی شکل دیکھتا رہا تھا جو اس سے سوال کر رہا تھا۔ اس کا غصہ ایک بار پھر بھاپ بن کر غائب ہو گیا تھا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد شوکت زماں فارغ ہو کر جب اس کے ساتھ باہر تک آیا تو کرم علی نے اس سے حفظ ماتقدم کے طور پر پوچھا "آپ کو کہاں جانا ہے؟"

"تمہارے گھر۔" بہت برجستہ جواب دیا۔ کرم علی کا دل چاہا وہ اس سے کہے کہ میرا ابھی کوئی گھر نہیں ہے۔ مگر اس سے بڑی حماقت وہ نہیں کر سکتا تھا اگر شوکت زماں سے یہ کہہ دیتا۔

"مجھے تو ابھی رات گئے تک کیب چلانا ہے پھر کہیں گھر جاؤں گا۔"

کرم علی نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"تو بس ٹھیک ہے تو کیب چلا میں تیرے ساتھ بیٹھوں گا۔"

شوکت زمان نے بڑے اطمینان سے کہا اور دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس بار کرم علی نے بھی کچھ کہے بغیر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔

''کتنے ڈالر بنا لیتے ہو روز کے؟'' شوکت زماں نے گاڑی کے سڑک پر آتے ہی اس سے یوں پوچھا، جیسے وہ اس کا پرانا دوست ہو۔

''پتا نہیں، بہت عرصہ ہوا ہے حساب کتاب رکھنا چھوڑ دیا۔''

کرم علی نے اسی انداز میں کہا۔ شوکت زماں نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ پھر کہا۔

''تو بڑا بدل گیا ہے کرم! پہلے جیسا نہیں ہے۔ لگتا ہے امریکہ کی ہوا لگ گئی ہے تجھے۔''

کرم علی خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ شوکت زماں اس کے چہرے پر پتا نہیں کیا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''شادی ہو گئی تیری؟'' کرم علی کا پاؤں بے اختیار بریک پر پڑا۔ بعض دفعہ پتہ نہیں کیوں ہر چیز رک جاتی ہے مگر گاڑی رکی نہیں صرف لمحے بھر کے لئے اس کی اسپیڈ کم ہوئی۔

''پچھلی دفعہ بتایا تھا تو نے کہ تیری منگنی ہو چکی ہے۔ کیا نام بتایا تو نے اپنی منگیتر کا ؟ ہاں عارفہ۔''

کسی نے جیسے کرم علی کے دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ کئی ماہ بعد ملے تھے اور اسے یقین تھا شوکت زماں کے استفسار پر اس نے پچھلی ملاقات میں صرف ایک بار اس سے اپنی منگنی کا ذکر اور عارفہ کا نام لیا تھا۔ پھر بھی شوکت زماں کو وہ نام یاد آ گیا تھا۔ شوکت زماں کی یادداشت بلاشبہ کمال کی تھی۔

''نہیں پر شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ تیری۔ تو تو صابر قیوم کی تدفین کے لئے گیا تھا پاکستان اور پھر جلدی آ بھی گیا۔ ان چند مہینوں میں دوبارہ تو نہیں گیا ہو گا پاکستان۔''

شوکت زماں اندازے لگانے میں مصروف اور کرم علی اس کی یادداشت پر حیران اسے صابر قیوم کا نام بھی یاد تھا۔

''کیسی ہے منگیتر تمہاری؟'' شوکت زماں نے ایک بار پھر بڑی بے تکلفی سے اس سے پوچھا۔

''منگنی ٹوٹ گئی میری'' کرم نے بالآخر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

شوکت زماں جیسے اس کے زخموں کے کھرنڈ کھرچنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔

''ہیں... کیا کہا؟ منگنی ٹوٹ گئی کیسے ٹوٹ گئی؟ کیوں ٹوٹ گئی؟ تو نے تو مجھے بتایا تھا پانچ چھ سال ہو گئے تھے تیری منگنی کو۔'' شوکت زماں اب ایک کے بعد ایک سوال کر رہا تھا۔

''بس توڑ دی۔''

شوکت زماں نے کرم کو اس کی بات مکمل نہیں کرنے دی۔ دس بارہ گالیوں کے بعد اس نے کرم سے کہا۔

''تجھے شرم نہیں آئی منگنی توڑتے ہوئے۔ اوئے تجھے کوئی خوف خدا نہیں آیا۔ ویسے کتنی نمازیں پڑھتا تھا تو اور ایک لڑکی کا دل توڑتے تجھے حیا نہیں آئی۔ دیکھ لی ہو گی یہاں کوئی گوری چمڑی والی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی عورت، لٹو ہو گیا ہو گا تو امریکن نیشنلٹی کے لئے اس پر تم سب پاکستانی ''

شوکت زماں نے جملے کے اختتام پر ''ہو'' لگانے سے پہلے تقریباً پندرہ گالیوں کی ایسی تراکیب کا استعمال پاکستانی کے ساتھ کیا تھا کہ کرم

علی کا جی چاہا وہ ایک بار پھر اس کے جینڈ تج زدہ جبڑے پر اسی طرح کا ایک گھونسہ مارے جیسا اس نے چند گھنٹے پہلے مارا تھا۔ مگر اس بار اس نے تحمل سے کام لیا اور اس کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

جب شوکت زماں نے بالآخر سانس لینے کے لئے توقف کیا تو کرم علی نے اس سے کہا۔

"منگنی میں نے نہیں، اس نے توڑی۔" شوکت زماں چند لمحوں کے لئے بھونچکا رہ گیا۔

"اس نے توڑ دی؟" وہ جیسے گڑبڑایا۔ "پر اس نے کیوں توڑی؟ تیرے جیسا شریف، فرشتہ سیرت نیک، باکردار، باحیا لڑکا کیوں چھوڑ دیا اس نے؟"

شوکت زماں نے بے ساختہ کہا۔ پھر کرم علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں دباتے ہوئے بولا۔

"میں نے خواہ مخواہ تجھے برا بھلا کہا۔ ویری سوری یار، پر اس نے منگنی کیوں توڑی، اتنی پرانی منگنی؟"

"آپ کو کہاں اتاروں؟" کرم علی نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواباً کہا۔

شوکت زماں کچھ دیر ترحم بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"چل سینٹرل پارک چلیں مجھے جب رونا ہو تو میں وہیں جاتا ہوں۔"

کسی میکانکی انداز میں کرم علی نے گاڑی سینٹرل پارک کی طرف موڑ دی۔ وہ شوکت زماں سے کہنا چاہتا تھا کہ اسے وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر وہاں پہنچ کر وہ اسی میکانکی انداز میں شوکت زماں کے ساتھ چل پڑا تھا۔ حیران کن طور پر شوکت زماں اس کو سینٹرل پارک چلنے کا کہہ کر خاموش ہو گیا تھا اور پارک میں پہنچ کر بھی خاموش ہی تھا۔ وہ دونوں کتنی دیر پارک کی لمبی روش پر بے مقصد چلتے آس پاس مختلف جوڑوں کو دیکھتے رہے۔ پاس سے گزرتے ان کے قہقہوں ان کی باتوں کو سنتے رہے پھر ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گئے۔

بہت لمبی خاموشی کا ایک وقفہ تھا جو ان کے وہاں بیٹھنے کے بعد ان دونوں کے بیچ آیا۔ پھر کرم علی نے سامنے سے گزرتے ایک نوجوان جوڑے کو دیکھتے ہوئے بے حد مدھم آواز اور شکست خوردہ آواز میں شوکت زمان کو سب کچھ بتانا شروع کر دیا۔ شوکت زمان بے حد خاموشی سے اس کی ساری باتیں سنتا رہا۔ اس نے بیچ میں ایک لفظ نہیں کہا۔ اس وقت زندگی میں پہلی بار کرم علی کو شوکت زماں اتنا احمق نہیں لگا جتنا وہ اسے سمجھتا تھا۔

"تو کر لیتا شادی پانچ چھ سال لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ کوئی اتنا غلط مطالبہ تو نہیں تھا، ان لوگوں کا۔"

اس کے خاموش ہونے پر شوکت زمان نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

"میں ابھی سیٹ نہیں ہوں، بڑی ذمہ داریاں ہیں میرے کندھوں پر۔" کرم علی نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ سیٹ ہونا کیا ہوتا ہے کرم علی اللہ پر بھروسہ نہیں تھا تجھے کیا؟ ارے نکاح کرتا تو وہ رزق دیتا، تیری بیوی کو تیرا رزق بڑھتا تیری بیوی کے لئے۔ یہ جو مرد چیزیں جمع کرتے رہتے ہیں کہ گھر بنا لیں، گاڑی لے لیں، قرضہ اتار لیں، فلاں کام کر لیں، پھر شادی کریں گے، ان کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔"

کرم علی بول نہیں سکا اس نے شوکت زمان کو کبھی اس طرح کی باتیں کرتے نہیں سنا تھا۔

"شادی کا ہی کہہ رہی تھی نا تو کر لیتا۔ تیرے نام پہ بیٹھی تھی اتنے سالوں سے۔"

"اتنے سال انتظار کیا تھا تو پھر اب کیا جلدی تھی۔ ایک سال اور انتظار کر لیتی۔" کرم علی نے بے ساختہ کہا۔

"کر لیتی اگر تو کہتا تو.... تو نے بات کی تھی اس سے.... تو تو ناراض ہو کر آیا تھا اس سے۔"

"اس نے کون سا منایا مجھے؟ ایک بار ناراض ہوا میں اس سے۔ اور اس نے منایا تک نہیں۔ فون کیا، نکاح کے بارے میں بتانے کے لئے۔ یہ بتانے کے لئے کہ اس نے بھی امریکہ میں کوئی میرے جیسا ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ تھی محبت اس کی؟" کرم علی نے بے حد تلخی کے ساتھ کہا۔

"منانے کی کوشش تو کی تھی اس نے۔" کرم علی نے سر اٹھا کر شوکت کو دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں کی تھی۔ میں انتظار کرتا رہا۔ ایک بار صرف ایک بار وہ فون کر دیتی تو میں، میں سب کچھ بھول کر اپنے ماں باپ کو اس کے گھر بھیج دیتا وہ نہ جاتے تو خود پاکستان چلا جاتا۔ ایک بار وہ فون تو کرتی۔"

"کیا تو تھا اس نے.... تیرا کیا خیال ہے تجھے نکاح کی خبر دینے کے لئے فون کیا تھا اس نے....؟" شوکت زماں نے بے حد عجیب لہجے میں کہا۔ "نکاح کی خبر دینا ہوتی تو نکاح کے بعد دیتی وہ نکاح سے پہلے فون تو وہ تجھے منانے کے لیے کر رہی تھی۔ بھیک مانگ رہی تھی تجھ سے اپنی محبت کے صدقے۔ بتا رہی تھی وہ تجھے کہ وہ اب بھی تیری ہے۔ اب بھی تیری ہو سکتی ہے تو سمجھا ہی نہیں، چپ چاپ بیٹھا رہا ایک بار کہہ دیتا اس سے کہ نکاح سے انکار کر دے تو کر دیتی وہ۔ صرف اسی آس میں فون کیا تھا اس نے کہ تو اسے نکاح سے انکار کرنے کے لیے کہے گا۔ تو بولا ہی نہیں۔ گونگا بن گیا۔ گنوا دیا اسے تو نے۔"

شوکت زماں نے تاسف آمیز انداز میں کہا۔ کرم علی دم سادھے بے حس و حرکت اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سانس لینے کی ایک کوشش کی پھر ہاتھوں کی انگلیاں سیدھی کرنے کی، یہ بات اسے سمجھ میں کیوں نہیں آئی کہ وہ اس سے.... اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ صرف ایک جملہ کہنا تھا اسے اس دن عارفہ سے اور وہ دونوں اس اذیت سے بچ جاتے۔ وہ آج بھی اسی کی ہوتی۔ صرف ایک جملہ.... اس کے ہاتھ کپکپانے لگے، جسم لرزنے لگا۔ پھر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنے مہینے اس نے ایسے آنسو کہاں بہائے تھے۔ جو وہ آج بہا رہا تھا، کیا زیاں سا زیاں تھا جو ہو گیا تھا۔

"یہ عورت ہے کرم علی.... سیدھی بات کیسے کرے۔ کیسے کہہ دے تجھ سے کہ تیرے بغیر مر جائے گی۔ تیرے علاوہ کچھ نہیں چاہیے اسے۔ یہ ساری باتیں تو مرد کہتا ہے۔ عورت تو ساری عمر پہیلیوں میں ہی باتیں کرتی ہے۔ تجھے تو بوجھ لینا چاہیے تھی اس کی پہیلی تو پانچ چھ سال سے اس عورت کے ساتھ تھا۔"

شوکت زماں نے اس کے کندھے کو ہمدردانہ انداز میں تھپکا لیکن اس کو چپ کروانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے رونے دیا۔

پہلی بار کرم علی کا جی چاہا شوکت زماں اسے پہلے مل جاتا، عارفہ کے اس کی زندگی سے نکلنے سے پہلے۔ یا پھر اب بھی نہ ملتا یہ سب کچھ بتانے

کے لئے جو وہ اسے بتا رہا تھا۔ پہلے رنج تھا جو اس کے وجود کو بوجھل کیے ہوئے تھا اب پچھتاوا بھی شامل ہو گیا تھا اس بوجھ میں۔

سینٹرل پارک شوکت زماں چاہے رونے کے لیے آتا تھا مگر کرم علی نے وہاں بیٹھ کر زندگی میں پہلی اور آخری بار آنسو بہائے تھے اور اس نے صرف آنسو نہیں بہائے تھے۔ اس دن وہاں اس نے اپنے اندر سے اور بھی بہت کچھ بہا دیا تھا۔ اندر ایک دم صاف اور خالی ہو گیا تھا۔ اتنا خالی کہ اب کوئی آواز آتی تو گونج اٹھتی۔

"بہت بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے شوکت زماں!" اس نے بہت دیر کے بعد اپنے چہرے کو صاف کرتے ہوئے نم آواز میں کہا۔

"ہاں... اندازے کی غلطی۔" شوکت زماں نے کہا۔ "چل اب چھوڑ، جو ہو گیا۔" شوکت زماں نے پہلی بار اس کا کندھا تھپک کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"ہر چیز اتنی آسانی سے چھوڑی نہیں جاتی۔" کرم علی نے رنجیدہ انداز میں کہا۔

"پتہ ہے مجھے، شوکت کو مت بتا یہ سب کچھ... اب مجھے فلاسفی پڑھائے گا تو۔"

کرم علی اس کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ کیوں اس طرح غصے میں آ گیا تھا۔ اس نے ایسی کیا بات کی تھی۔

"نہیں چھوڑی جاتی تو عارفہ نام کا تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لے۔ شاید تجھے اس سے کوئی فائدہ ہو جائے۔"

کچھ دیر پہلے والا شوکت زماں غائب ہو چکا تھا۔ اب ایک بار پھر وہی اس کے پاس بیٹھا تھا، جس سے کرم علی کی ہمیشہ ملاقات ہوتی تھی۔

"آپ نے اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

کرم علی کو یاد آیا۔ وہ ہمیشہ اس کے بارے میں بات کرتا تھا۔

"اپنے بارے میں کیا بتاتا تجھے؟" شوکت زماں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"اپنے گھر، اپنے خاندان، اپنے بیوی بچوں کے بارے میں۔" کرم علی نے کہا۔

"چل چلتے ہیں کرم بڑے کام کرنے ہیں مجھے۔ سارا دن ضائع کر دیا تو نے میرا۔"

شوکت زماں ملامتی انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ یقیناً اب کرم علی کے سوالوں کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ کرم علی کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی، لیکن اس نے اصرار نہیں کیا۔ وہ اٹھ کر شوکت زماں کے ساتھ چل پڑا۔

واپسی کا راستہ بھی ایک عجیب سی خاموشی سے کٹا۔ دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ مگر شوکت سارا راستہ کچھ نہ کچھ گنگناتا رہا۔ کرم علی نے اعتراف کیا کہ نہ صرف اس کی آواز اچھی تھی بلکہ اسے سر اور لے کا پتا بھی تھا۔

اس کے اپارٹمنٹ پہنچنے پر جب شوکت زماں گاڑی سے نکلا تو اس نے گاڑی سے اتر کر گاڑی کی کھڑکی پر دونوں بازو ٹکاتے ہوئے دوبارہ اندر جھانکا۔ اور کرم علی سے کہا۔

"میرے ساتھ کینیڈا چلے گا کرم؟"

"کس لیے؟" وہ حیران ہوا۔

"تجھے نیاگرافال دکھانا ہے۔" شوکت زمان نے بے حد ناراضی سے کہا اور پھر اسی انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"تجھے مستقل طور پر کینیڈا چلنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرا کام سنبھال لے وہاں آکر، مجھے آدمی کی ضرورت ہے۔"

"لیکن آپ تو یہاں نیویارک میں رہتے ہیں۔" کرم علی نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں وہ تو آج کل رہتا ہوں، جب دل چاہے یہاں آجاتا ہوں۔ جب دل چاہے چلا جاتا ہوں۔ پر کاروبار سارا کینیڈا میں ہے میرا۔" شوکت زماں نے کہا۔

"کیا کاروبار ہے؟" کرم علی نے بے حد محتاط انداز میں کہا۔ شوکت زماں کے حلیے سے اسے کبھی یہ نہیں لگا تھا کہ وہ کوئی امیر آدمی ہے اور پھر وہ اس طرح اچانک اسے اپنے ساتھ چلنے کا کیوں کہہ رہا تھا۔ اتنا اعتبار۔

"اسمگلنگ کرتا ہوں میں" شوکت زماں نے اس بار پہلے سے بھی زیادہ خفگی کے ساتھ کہا۔

"یہاں کھڑے کھڑے تجھے کاروبار کی تفصیل بتادوں؟ وہاں چلے گا تو خود دیکھ لینا۔ کیا کرتا ہوں میں۔ چلے گا؟"

شوکت زماں نے غصے میں اپنی بات ختم کرتے ہوئے آخری جملہ کہا۔

"نہیں۔" کرم علی نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ شوکت زماں نے وہی کیا جس کی کرم توقع کر رہا تھا۔ اس نے کرم علی کو کچھ اور گالیاں دی تھیں، مگر کرم علی نے ان میں سے صرف آدھی سنی تھیں، وہ گاڑی تیزی سے بڑھا کر وہاں سے چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کی شوکت زماں سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس کا شوکت زماں کے پاس دوبارہ جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

رات کو دس بجے کے قریب وہ تھکا ہارا اپنے اپارٹمنٹ پر پہنچا۔ اندر سے باتوں اور قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے چابی لگا کر دروازہ کھولا اور جیسے ساکت رہ گیا شوکت زماں سامنے اس کے اپارٹمنٹ کے باقی مکینوں کے ساتھ بیٹھا قہقہے لگاتا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔

☆☆☆

"امی کو گھر دکھا کر آیا ہوں آج۔ بہت خوش ہو رہی تھیں وہ بھی۔ بڑی دعائیں دے رہی تھیں زینی کو۔ بس ہفتے دس دنوں میں رنگ و روغن کا کام ختم ہو جائے گا پھر شفٹ ہو جائیں گے ہم۔ میں نے پرانے گھر کو بیچنے کے لیے بھی ایک دو لوگوں کو کہہ دیا ہے۔"

نعیم بڑے جوش کے عالم میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا سب کو بتا رہا تھا، اور وہاں آتے ہی اس نے اس گھر کی تفصیل انہیں بتانا شروع کر دی تھی جو زینی کے پیسے سے زہرہ کے نام خریدا گیا تھا اور اب اس میں صرف رنگ و روغن کا تھوڑا بہت کام رہ گیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے سب لوگ اس کوٹھی کی تفصیل سن کر خوش ہو رہے تھے۔ صرف زینی تھی جو بالکل بے تاثر چہرے کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف تھی بس درمیان میں کبھی کبھار وہ نظریں اٹھا کر نعیم کو دیکھ کر مسکرا دیتی۔ جو ساری گفتگو صرف زینی کو دیکھتے ہوئے کر رہا تھا اور اس کے لہجے میں اطاعت اور فرمانبرداری جیسے کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔

"پرانا گھر بیچ دیں گے تو پھوپھو کہاں جائیں گی؟ کیا آپ کی بہنوں میں سے کسی کے ہاں شفٹ ہو رہی ہیں؟" زینی نے ایک گھنٹے میں پہلی بار سوال کیا وہ اپنا کھانا ختم کر چکی تھی اور اب اپنی پلیٹ میں کچھ ڈیزرٹ لیے بیٹھی تھی۔ نعیم کے چہرے کا سارا جوش پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا تھا۔

"وہ... وہ امی تو ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔"

نعیم نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

اس کی چھوٹی سالی یک دم اتنی قدآور ہو گئی تھی کہ وہ اس سے بات کرتے ہوئے خواہ مخواہ نروس ہو جاتا تھا۔ حالانکہ اس گھر میں پہلی بار آنے اور اس جھگڑے کے بعد کبھی زینی سے اس کی کسی بات پر تلخ کلامی نہیں ہوئی تھی۔ زینی ہمیشہ سامنا ہونے پر اسے بڑی خوش دلی اور عزت کے ساتھ مخاطب کرتی تھی۔ حتیٰ کہ کاروبار اور گھر کے لئے رقم دیتے ہوئے بھی اس نے نعیم کو اپنے کسی رویے سے شرمندہ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کچھ جتایا تھا۔

لیکن اس واقعے کے بعد صرف ایک فرق آیا تھا جو نعیم نے شروع میں محسوس کیا تھا مگر اس نے اسے لاپروائی سے نظر انداز کر دیا تھا۔ زینی اب اس کا نام لے کر اسے مخاطب کرتی تھی پہلے کی طرح اس کے نام کے ساتھ بھائی نہیں لگاتی تھی۔

"آپ لوگوں کے ساتھ کس لیے رہیں گی؟" وہ بڑی سنجیدگی سے باری باری نعیم اور زہرہ کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"امی اکیلی کیسے رہیں گی؟" نعیم نے قدرے فکرمند انداز میں کہا۔

"اکیلے کیوں؟ پورا محلّہ ہے، وہ پہلے بھی محلے میں آتی جاتی تھیں اور محلے والے ان کے پاس آتے تھے۔ اب بھی ان کا میل جول رہے گا۔ پھر ان کی بیٹیاں آتی رہیں گی ان کے پاس۔"

زینی نے پانی پیتے ہوئے کہا۔ اس نے ٹیبل پر بیٹھی نفیسہ اور ربیعہ کی تیز نظروں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔

"پر میں... میں اکلوتا بیٹا ہوں میرا فرض ہے ان کو اپنے پاس رکھنا۔" نعیم نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"تو پھر گھر بدلنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ لوگ وہیں رہیں ان کے پاس۔ زہرہ آپا کے گھر کو میں کرائے پر چڑھا دیتی ہوں یا ایسا کرتے ہیں کہ آپ پھوپھو کے پاس رہیں اور کبھی کبھار زہرہ آپ کے پاس آ جایا کریں۔ لیکن پھوپھو زہرہ آپا کے گھر نہیں جائیں گی۔"

اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ڈائننگ ٹیبل پر یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ نعیم چند منٹ مزید بیٹھا پھر بے حد کھسیانے اور پریشان انداز میں زہرہ اور بچیوں کو لے کر چلا گیا۔

"اس طرح کی بات کیوں کی تم نے؟ اس بڑھاپے میں کوئی تو رہنا چاہیے تمہاری پھوپھو کے ساتھ خدمت کے لئے۔"

نعیم کے جاتے ہی نفیسہ نے بے حد ناراضی کے عالم میں زینی سے کہا۔

"انہیں اگر اپنے بڑھاپے کا خیال ہوتا تو وہ اپنی بہو کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرتیں۔" زینی نے ایک سیب کاٹتے ہوئے کہا۔

"بدلہ لینے والے لوگ بے وقوف ہوتے ہیں۔" ٹیبل کے ایک طرف بیٹھی ہوئی ربیعہ نے بے حد ترشی سے کہا۔ زینی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا پھر مسکرائی۔

"سانپ کو گھر سے باہر رکھنا بے وقوفی نہیں ہے۔"

"سانپ اور انسان میں فرق ہوتا ہے۔"

"ہاں شکل و صورت کا۔"

"ان سے خونی رشتہ ہے ہمارا۔"

"اسی لیے تو یہ سلوک کر رہی ہوں ان سے۔"

"تمہاری وجہ سے زہرہ آپا کا گھر بھی ٹوٹتے ٹوٹتے بچا ہے اب پھر۔"

اس بار زینی نے ربیعہ کی بات کاٹ دی۔ "میری وجہ سے نہیں غربت کی وجہ سے اور تم بے فکر رہو۔ اب کچھ نہیں ہوگا زہرہ آپا کے گھر کو۔ کم از کم میرے ہوتے تو کچھ نہیں ہوگا۔ پہلے وہ زینب ضیاء کی بہن تھی اب پری زاد کی بہن ہے، نعیم سو دفعہ سوچے گا زہرہ آپا سے کچھ کہتے ہوئے۔"

"کتنا غرور ہے تمہیں اپنے آپ پر۔" ربیعہ نے تلخی سے کہا۔

"غرور نہیں ہے، اپنی طاقت کا پتا ہے۔ جیسے پہلے اپنی کمزوری کا پتا تھا۔"

اس نے توقف کے بعد جملہ پورا کیا۔

"تم مانو نہ مانو پیسے نے بہت طاقت ور کر دیا ہے مجھے۔"

"پیسے سے تم ہر چیز نہیں خرید سکتیں۔"

"تم مجھے وہ چیز دکھاؤ جسے میں پیسے سے نہ خرید سکوں۔"

"تم انسانوں کو پیسے سے نہیں خرید سکتیں۔"

"تم اپنے آس پاس کے دس ایسے انسانوں کے نام بتاؤ جنہیں میں پیسے سے نہیں خرید سکتی۔" اس نے بے حد اطمینان سے کہا۔

"پیسے نے تمہیں پاگل کر دیا ہے۔" ربیعہ نے نفرت سے کہا۔

زینی نے سیب کا آخری ٹکڑا منہ میں رکھا اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"مجھے نہیں دنیا کو۔"

"یہ دولت تمہیں خوشی نہیں دے گی۔"

"خوشی کس کو چاہیے۔" وہ کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"ساری عمر مجھ سے کوئی اس طرح نہیں بولا جس طرح تیری بیوی نے بات کی مجھ سے۔" نسیم نے روتے ہوئے دوپٹے کے پلو سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے سامنے بیٹھے ہوئے شیراز سے کہا۔

"امی! میں معافی مانگ تو رہا ہوں" شیراز نے لجاجت سے کہا۔

"تیرے معافی مانگنے سے کیا ہوتا ہے۔ تیری بیوی نے تو ہمارے بڑھاپے کا بھی لحاظ نہیں رکھا۔ نوکروں کے سامنے ہمیں ذلیل کیا۔" اس بار اکبر نے کہا۔

"ارے ہم رہنے تھوڑا آئے تھے تیرے گھر میں، ملنے آئے تھے تجھ سے۔" نسیم نے یک دم غصے میں آتے ہوئے کہا۔

"امیر باپ کی بیٹی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ دوسروں کی عزت نہ کرے، ہمیں بھکاری سمجھ کر احسان جتائے کہ تم ہمیں پیسے دیتے رہو۔" نسیم کا دل بھر آیا۔

"ایک زینی تھی۔ کتنی خدمت کرتی تھی میری، خالہ خالہ کہتے منہ سوکھتا تھا اس کا۔" نسیم کو پتہ نہیں کیوں زینی یاد آئی اور وہ اب انہیں اکثر یاد آتی تھی۔

"اب زینب کی بات نہ کریں اس سارے معاملے سے اس کا کیا تعلق ہے؟" شیراز بے اختیار خفا ہوا۔

"اور وہ بچہ کس کا تھا؟" اکبر نے بالآخر وہ سوال کیا جس کا جواب انہیں اس وقت سے ہولا رہا تھا جب سے وہ شینا کے گھر سے واپس آئے تھے۔

"کون سا بچہ؟" شیراز بے اختیار پچھتایا آخر اسے اس وقت یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔

"جو تمہاری بیوی کو ممی کہہ رہا تھا؟" اکبر نے بے ساختہ کہا۔

"سچ سچ بتا دے شیراز، وہ تیری بیوی کا ہی بچہ ہے نا؟" اس کی خاموشی پر نسیم نے جیسے بگڑ کر کہا۔

"ہاں شینا کی پہلے ایک شادی ہو چکی ہے۔" شیراز نے بالآخر کچھ تامل کے بعد کہا۔ جھوٹ بولنا اب بے کار تھا۔

نسیم نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "میرے اللہ ایک بچے کی ماں سے شادی کر لی تو نے؟"

"مجھے نہیں پتا تھا اس کی پہلی شادی کا۔" شیراز نے بے ساختہ کہا۔

"انہوں نے دھوکا دے کر......" نسیم نے کچھ کہنا چاہا، شیراز نے فوراً اس کی بات کاٹی۔

"چھوڑیں یہ ساری باتیں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر وہ شادی شدہ بھی تھی تو۔ اس سے شادی کر کے ہماری قسمت بدل گئی ہے۔ کسی اور لڑکی سے شادی کر کے اتنا پیسہ ملتا مجھے؟"

اس نے جیسے صاف صاف لفظوں میں اپنے ماں باپ کو یاد دلایا کہ زندگی میں اس کی ترجیح کیا تھی۔

"پیسہ سب کچھ نہیں ہوتا۔" نسیم نے بے ساختہ کہا اور پھر بے اختیار پچھتائی۔ آخر یہ جملہ وہ کیسے بول سکی تھی۔ پر یہ جملہ کہاں سے آیا تھا اس کی زبان پر۔

شیراز عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھتا رہا اور تب ہی اکبر نے بروقت مداخلت کی۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی اسے ......" شیراز نے اکبر کو بات ختم کرنے نہیں دی۔

''آپ کو اس طرح بن بتائے آنے کی ضرورت کیا تھی۔ جب آپ کو پتا ہے کہ وہ چڑتی ہے میرے گھر والوں سے۔''

''تو پھر اس کی حمایت کر رہا ہے؟'' اکبر کو بھی اس بار اس کی بات بری لگی۔

''حمایت نہیں کر رہا۔ سمجھا رہا ہوں ابو آپ کو۔ میرے اور شینا کے گھر میں اب بڑے بڑے لوگ آتے ہیں کوئی کیا کہتا اگر آپ کو وہاں دیکھتا۔ کوئی پوچھ لیتا میرے اور آپ لوگوں کے خاندان کے بارے میں تو شینا کیا کہتی۔ آپ ذرا اس بات کا اندازہ تو کریں۔''

''کیوں ہمیں کون سی چھوت کی بیماری لگ گئی ہے؟'' نسیم نے بے ساختہ چڑ کر کہا۔

''آپ لوگوں کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔''

اس دفعہ شیراز بھی جھلایا۔ وہ ان سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کا رکھ رکھاؤ ان کے طور طریقے سب کچھ اس کلاس کی چغلی کھاتے تھے جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا اور جو پھر اسٹیکر کی طرح اس کے ماں باپ کے وجود کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ وہ کچھ بھی کر لیتا۔ ان کو بدل نہیں سکتا تھا۔ مگر انہیں چھپا ضرور سکتا تھا۔ اور کم از کم یہ وہ چیز تھی جس میں اسے شینا سے زیادہ گلہ نہیں تھا۔ وہ اس شرمندگی کو بخوبی سمجھ سکتا تھا جو شینا کو اس کے ماں باپ کو اپنے گھر پر دیکھ کر ہوتی ہوگی۔

''شرمندگی ''نہیں اس کا شاید کوئی اور نام ہوتا ہوگا جو وہ محسوس کرتی ہوگی اور اس کا بھی کچھ اور ہی نام تھا جو شیراز محسوس کرتا تھا۔ جب وہ اس کے ماں باپ کا ذکر شروع کرتی۔

اکبر اور نسیم کو شینا کے بارے میں پتا چلنے کے اگلے کئی ہفتے تک شیراز نے ان کا سامنا نہیں کیا تھا۔ مگر دوسری طرف وہ بے حد مطمئن بھی تھا، کم از کم اب اسے کچھ چھپانا نہیں پڑ رہا تھا، وہ اس بوجھ سے آزاد ہو چکا تھا۔

شینا کے ساتھ اس کی زندگی، ''ذلت اور آسائش'' کی زندگی تھی وہ ہمیشہ اس تذلیل کا جو شینا اس کی کرتی تھی اس آسائش کے ساتھ موازنہ کرتا جو شینا کی وجہ سے اسے مل رہی تھی تو خود بخود ہی سارے گلے ختم ہو جاتے۔ وہ بے حد مطمئن ہو جاتا۔ اس کے گھر کے اندر اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا یہ آخر کتنے لوگ جانتے تھے، البتہ سوسائٹی اب اسے اپر کلاس کے ایک فرد کا پروٹوکول دیتی تھی اور اس پروٹوکول کی قیمت اگر گھر میں روزانہ چند گھنٹوں کی تذلیل بھی تھی تو یہ کوئی اتنی بڑی قیمت نہیں تھی، کم از کم شیراز اکبر کے لیے ..... اسے یقین تھا چند سال گزرنے کے ساتھ ساتھ شینا کے رویے میں تبدیلی آئے گی۔ وہ اسے شوہر جیسی عزت نہ سہی مگر انسان جیسی عزت ضرور دینا شروع کر دے گی۔

اور یہ اس کی ایک اور بہت بڑی خوش فہمی یا غلط فہمی تھی۔ شینا کو جب تک سٹیل نظر آ رہا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ کسی دوسرے کو دیکھتی۔ اور اس کی زندگی میں سٹیل نہ بھی ہوتا تب بھی اسے اپنے اور شیراز کے درمیان اتنا فرق محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایک خوش گوار ازدواجی زندگی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی جس میں وہ ایک فرمانبردار بیوی بن کر اپنے ''مجازی خدا'' کی خدمت کرتی نظر آتی، شیراز میں کوئی ایسی خوبی نہیں تھی جو شینا کو اس میں دلچسپی لینے پر مجبور کرتی۔ اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی کہ شینا جیسی لڑکی اسے اپنے حلقہ احباب میں فخریہ اپنے شوہر کے طور پر متعارف کروا سکتی۔

شینا کے لئے وہ ایک چیلنج بیگ تھا جو اس کے باپ نے اس لیے اسے لا دیا تھا تا کہ وہ اپنے اندر کا سارا ڈپریشن، ساری فرسٹریشن اس پر نکال سکے اور اس نے کم از کم اس معاملے میں اپنے باپ کو مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ شیراز کے ساتھ وہی کر رہی تھی۔ اور صرف یہی نہیں ہر بار شیراز کی کسی شکایت پر جب سعید نواز شینا کو سمجھانے کی کوشش کرتا تو شینا اس کے سامنے سہیل اور شیراز کا ''تقابلی جائزہ'' پیش کر دیتی۔ سعید نواز جانتے تھے کہ سہیل کا پلڑا ہر لحاظ سے بھاری تھا لیکن شیراز ان کی پسند، ان کا انتخاب تھا۔ ان کا خیال تھا، شینا کو اس کی اطاعت اور فرماں برداری ضرور متاثر کرے گی۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں وہ تھیں جو سہیل میں نہیں تھیں۔ سہیل انہیں ذاتی طور پر بے حد ناپسند تھا کیونکہ وہ اسے ایک مغرور اور بدتمیز باپ کا مغرور اور بدتمیز بیٹا سمجھتے تھے اور کچھ یہی رائے سہیل کے باپ اور گھر والوں کی سعید نواز اور شینا کے بارے میں تھی۔ اب یہ سعید نواز کی بدقسمتی تھی کہ شینا کو شیراز کی فرماں برداری متاثر کن لگنے کے بجائے بری طرح چڑانے لگی۔ وہ ان تمام نوازشات سے واقف تھی جو سعید نواز شیراز اور اس کے گھر والوں پر کرتا آ رہا تھا۔ اور اسے ان کی غربت سے شاید اتنی نفرت نہ ہوتی جتنی ان کے لالچ اور حریص پن سے تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار کسی غریب خاندان کی زندگی کو اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی اور جو کچھ اس نے اس غریب خاندان کے افراد کو پیسے کے لئے کرتے دیکھا تھا، اسے ان سے گھن آنے لگی تھی۔

سہیل سے شادی کے وقت بھی سعید نواز نے اسے بہت کچھ دیا تھا نہ صرف اسے بلکہ سہیل کو بھی، لیکن شینا اچھی طرح جانتی تھی کہ سہیل اور اس کے گھر والے سعید نواز کی دولت کے محتاج نہیں تھے۔ شیراز اور اس کے گھر والوں کا مسئلہ بالکل دوسرا تھا۔ اور پھر یہ ناممکن تھا کہ شینا کے جو دل میں آتا، وہ اسے زبان پر نہ لاتی، وہ واقعی شیراز میں اور اس کتے میں فرق نہیں سمجھتی تھی جو سعید نواز نے اس کے لئے امپورٹ کیا تھا۔ بلکہ بعض حوالوں سے وہ اس کتے کو شیراز سے زیادہ بہتر سمجھتی تھی اس کتے کو شینا اور سعید نواز کی جائیداد میں دلچسپی نہیں تھی۔ شیراز کو تھی اور شینا اس بات سے بخوبی واقف تھی۔

☆☆☆

''میں تمہارا کتنا بڑا فین ہوں، تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے پری زاد۔''

اشتیاق رندھاوا مدہوشی کے عالم میں اس سے کہہ رہا تھا، زینی اپنے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو دیکھتے ہوئے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''تم سے ملنے کے لئے کتنی جدوجہد کرنی پڑی ہے مجھے، تمہیں تو احساس بھی نہیں ہوگا۔'' اشتیاق رندھاوا سے یہ اس کی چوتھی ملاقات تھی۔ وہ دونوں اس وقت ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں تھے۔

''مجھ سے ملنا اتنا مشکل تو نہیں ہے۔'' زینی نے گلاس سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہونا تو نہیں چاہیے تھا اور آج تک کبھی مشکل پیش بھی نہیں آئی مجھے کسی ہیروئن سے ملنے کی کوشش میں۔ لیکن تم میں کچھ ہے پری زاد۔ کہ آدمی مرجاتا ہے تم پر۔''

''کیوں کیا، کیا ہوں میں؟'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔

''تم قیامت ہو۔'' اشتیاق نے بے ساختہ کہا۔

"وہ تو صرف ایک بار آتی ہے۔"

"تم روز روز آنے والی قیامت ہو۔"

"پھر تو ڈرنا چاہیے آپ کو مجھ سے۔"

"روز آنے والی قیامت سے کون ڈرتا ہے۔" زینی اس کی بات پر ہنس پڑی۔

"سنا تھا، آپ دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ آپ نے ثابت بھی کر دیا۔"

"آج سورج مغرب سے نکلا ہوگا۔"

"کیوں؟"

"ایک حسین عورت میری تعریف کر رہی ہے۔"

"حسین عورت کی تعریف پر مت جائیں۔ اس کے قہر سے ڈریں۔" زینی نے مسکراتے ہوئے عجیب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آج تک کسی حسین عورت کا قہر دیکھا نہیں ہے میں نے۔"

"خوش قسمت ہیں پھر آپ۔"

"تم سے ملاقات کے اتفاق کے بعد ہوا ہوں۔"

"مجھ سے ملاقات کو اتفاق سمجھتے ہیں آپ؟"

"نہیں اعزاز۔"

"دیکھتے ہیں۔ یہ اعزاز کب تک آپ کے پاس رہتا ہے۔"

"ہم تو ہمیشہ کے لئے اس عزاز کو پاس رکھنا چاہتے ہیں۔" اس بار اشتیاق کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"پاس رکھنا چاہتے ہیں یا قید کرنا چاہتے ہیں؟"

"آج تک شوبز کی کسی عورت نے مجھ سے اس طرح کی باتیں نہیں کیں۔" اشتیاق بے اختیار مسکرایا تھا۔

"آپ کو بری لگیں میری باتیں؟" زینی نے بے حد تیکھے انداز میں کہا۔

"نہیں، اچھی لگیں۔" اشتیاق یک دم مسکرایا۔ "مجھ سے شادی کرو گی پری زاد؟"

"کتنے دنوں کے لئے؟" اس بار اشتیاق نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"تم کو ڈر نہیں لگتا مجھ سے؟"

"کیوں لگے گا؟"

"پاکستان کا وزیر داخلہ ہوں میں۔ میرے ایک اشارے پر تخت سے تختہ ہو جاتا ہے لوگوں کا۔" اشتیاق نے بے حد غرور سے کہا۔

"میں پاکستان کی وزیرداخلہ نہیں ہوں، لیکن میرے بھی ایک اشارے پر تخت سے تختہ ہو جاتا ہے لوگوں کا۔ آپ میں اور مجھ میں ایک چیز تو مشترک نکلی۔"

اس بار اشتیاق کا قہقہہ پہلے سے زیادہ بلند تھا۔ زینی گلاس لیے قدِ آدم کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"تم بازار سے نہیں ہو پری زاد۔" اس بار اشتیاق کے انداز میں بے حد دلچسپی تھی۔ زینی پلٹے بغیر کھڑکی سے باہر دسویں منزل سے شہر کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے گلاس سے چسکیاں لیتی رہی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" اس نے کچھ دیر بعد پلٹے بغیر باہر دیکھتے ہوئے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں اس سے فرق تو کوئی نہیں پڑتا۔ لیکن میں نے آج تک شوبز میں کوئی ہیروئن نہیں دیکھی جس کا تعلق اس بازار سے نہ ہو۔" اشتیاق نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"اب دیکھ لی ہے نا۔" زینی استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"تم کیوں شوبز میں آئیں؟ شہرت کے لیے؟ پیسے کے لیے؟" اشتیاق اب سنجیدہ تھا۔

"پیسے کے لیے!" زینی اب کھڑکی کے شیشے سے پشت ٹکائے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے بات کر رہی تھی۔

"دکھ ہوا یہ بات سن کر۔" اشتیاق نے افسوس کے انداز میں سر ہلایا۔

"زینی کو ہنسی آئی۔ "کیوں؟"

"بس تمہارے منہ سے یہ جواب سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ آج تک جتنی ہیروئنوں کے ساتھ تعلقات رہے ہیں میرے، سب پیسے کے لیے ہی آتی رہی ہیں فلموں میں۔ میں نے سوچا شاید تمہارے پاس کوئی بہتر وجہ ہو۔"

"آ... بہتر وجہ؟ میں عوام کی خدمت کے لیے شوبز میں آئی ہوں۔ اب ٹھیک ہے؟"

اس نے طنز کیا۔ اشتیاق کو اس بار اس پر پیار آیا تھا۔ اس نے پری زاد کے بارے میں جو سنا تھا۔ ٹھیک ہی سنا تھا۔ وہ پاکستانی فلم انڈسٹری کی پہلی حسین، ذہین اور خطرناک حد تک نڈر ہیروئن سے مل رہا تھا۔

"دیکھو پری زاد! کبھی کہیں مشکل میں پڑو تو صرف ایک بار اشتیاق رندھاوا کو یاد کر لینا۔ تمہارے منہ کھولنے سے پہلے آؤں گا تمہاری مدد کے لیے۔"

وہ اس سے یہ کیوں کہہ رہا تھا یہ اشتیاق رندھاوا خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے آج تک ایسی آفر کسی دوسری عورت کو نہیں کی تھی۔ کم از کم یہ نشہ نہیں تھا جو اس سے ایسی بات کہلوا رہا تھا۔ یہ کھڑکی کے سامنے کھڑی اس پانچ فٹ سات انچ لڑکی کا جادو بھی نہیں تھا جو اس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ یہ کچھ اور تھا... اور کیا تھا؟

اشتیاق رندھاوا نے خود کو اپنے سے آدھی عمر کی اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

"یہ فلم انڈسٹری تمہارے جیسی لڑکی کے لئے اچھی جگہ نہیں ہے۔" اشتیاق کی بات پر وہ ہنسی۔

"آپ ہر ہیروئن کو یہی مشورہ دیتے ہیں۔" وہ اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"یہ مشورہ صرف دوستوں کو دیا جاتا ہے۔" اشتیاق نے بے حد سنجیدہ انداز میں کہا۔

"دوست.... ؟میں دوست کب بنی آپ کی؟" وہ اس بار پھر ہنسی۔

"کوئی تو نام ہوگا تمہارے اور میرے رشتے کا۔تم کیا کہو گی اسے؟"

"میں آپ کو بتاؤں گی تو آپ مجھے اس کمرے سے باہر پھنکوا دیں گے اس لئے چھوڑیں، کوئی اور بات کریں۔"

زیبی نے لاپروائی سے کہا۔ اشتیاق نے اپنے آپ کو کچھ اور بے بس پایا۔

☆☆☆

"لو جی۔ کرم بھی آ گیا۔ آ جا کرم آ جا، آ بیٹھ، کھانا کھا۔"

شوکت زماں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ کرم علی کو یقین تھا اس نے اسے گھر کا پتہ نہیں بتایا تھا، اسے سو فی صد یقین تھا لیکن اسے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ اس کی کیب کا نمبر شوکت زماں کو اس کے گھر تک پہنچانے کے لئے کافی تھا۔

"اگلے دو ہفتے شوکت زماں جونک کی طرح اس سے چمٹا رہا تھا۔ کرم علی جتنی تہذیب، مروت یا لحاظ کر سکتا تھا وہ کر رہا تھا اس کے باوجود شوکت زماں کو برداشت کرنا آسان کام نہیں تھا۔

دو ہفتے کے بعد بالآخر وہ شوکت زماں کے مجبور کرنے پر ایک ہفتے کے لئے اس کے ساتھ کینیڈا گیا تھا۔ اور اوٹاوا پہنچ کر اسے صرف شوکت زماں کے پھیلے ہوئے کاروبار نے دنگ نہیں کیا تھا، وہ شوکت زماں کی گرگٹ کی طرح بدلتی ہوئی شخصیت کو بھی دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

نشے میں ہر وقت غرق رہ کر احمقانہ اور بے ہودہ باتیں کرنے والا وہ جھگڑالو آدمی ایک نفیس، مہذب، با اخلاق، مہربان اور شفیق انسان کے طور پر وہاں لوگوں میں جانا جاتا تھا۔ وہ بدرنگے، جینز ٹراؤزرز، سویٹرز اور سستے شکن آلود کوٹ سے برانڈڈ تھری پیس سوٹوں پر آ گیا تھا۔ اس کا لب و لہجہ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔

وہ اپنے ماتحتوں سے بات کرتے ہوئے شاندار انگلش بولتا اور کہیں پر ضرورت پڑنے پر فرنچ کا استعمال بھی کر لیتا۔ کرم علی ایک ہی دن میں اس کے اس بدلتے ہوئے روپ سے خائف ہو گیا تھا۔ پہلے والے شوکت زماں نے کم از کم اسے کبھی خائف نہیں کیا تھا۔ دوسری رات اس نے کھانے کی ٹیبل پر شوکت زماں کو اپنی واپسی کے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔

"کیوں؟ تو تو ایک ہفتہ کے لئے آیا ہے یہاں۔ ابھی تو میں نے صرف تجھے اپنی کمپنی دکھائی ہے۔ سپر اسٹورز اور گیس اسٹیشن تو دکھائے ہی نہیں۔ پھر تو نے مجھے بتانا تھا کہ تو کب آ کر میرے ساتھ کام کرے گا۔"

وہ ایک بار پھر پہلے والے لہجے میں اس سے بات کر رہا تھا۔ اس کے باوجود کرم علی کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ پہلے والی بے تکلفی سے اس سے

بات کر سکے۔ دولت نے دونوں میں ان کے درمیان ایک دو نہیں کئی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔

''نہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی آپ کے پاس آ کر کام کر سکوں گا۔ میں ساری زندگی جس طرح کے کام کرتا رہا ہوں، یہ اس طرح کا کام نہیں ہے۔'' کرم علی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''تو کیا یہ ضروری ہے کہ ساری عمر مزدوری ہی کرنا ہے تو نے، مزدوری کرتے ہوئے پیدا ہوا، وہی کرتے کرتے مر جائے گا، اوئے کرم علی! میں اپنا منیجر بنانا چاہتا ہوں۔ تجھے سارا کاروبار تیرے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں اور تو ہے کہ گھوڑوں کا فارم رکھنے کے بجائے تانگہ چلانے پر اصرار کر رہا ہے۔''

کرم علی کچھ بول نہیں سکا۔ اسے گھوڑوں اور فارم کے ذکر پر پتا نہیں کیا کیا یاد آیا تھا۔ اس کی خاموشی نے شوکت زمان کو اس خوش فہمی میں مبتلا کیا کہ شاید وہ آمادہ ہو گیا تھا۔

''شاباش اے بھئی۔ اب سمجھ میں آئی تجھے میری بات۔ زندگی بدلنے کا موقع مل رہا ہے تجھے۔ کرم علی! اور یہ موقع روز روز نہیں ملتا۔''

''مجھے ایسے موقع بہت بار ملے ہیں۔'' کرم علی نے مدھم آواز میں کہا۔

''شاید پھر یہ آخری موقع ہو۔'' کرم علی اس کی بات پر چونکا۔

''ہاں ہاں ایسے آنکھیں پھاڑ کر مت دیکھ مجھے۔ اللہ نے کوئی ٹھیکہ نہیں لیا تیری زندگی کا۔ اور بڑے لوگوں کی ذمہ داریاں ہیں اس پر۔ تو خود ہی شرم کر کچھ۔ اللہ بھی کیا کہتا ہوگا تیرے بارے میں۔''

شوکت زماں اب اس پر ملامت کر رہا تھا۔

''لیکن میں پڑھا لکھا نہیں ہوں اور مجھے ان کاموں کا کوئی تجربہ۔'' شوکت زماں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تیرا کیا خیال ہے، میں نے کوئی ہارورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے؟ اوئے آ جائے گا تجھے سب کچھ میرے جیسے الو کے پٹھے کو آ گیا ہے تو تجھے کیوں نہیں آئے گا، وہ میں سکھا دوں گا۔ اب اور کس لئے بیٹھا ہوں یہاں۔''

''لیکن آپ آخر مجھے اتنے بڑے کاروبار کا انتظام کیوں دینا چاہتے ہیں۔ آپ تو مجھے جانتے تک نہیں اور آپ کو تو اس کام کے لئے ہزاروں لوگ مل سکتے ہیں پھر میں کیوں؟'' کرم علی نے بالآخر اپنی اس الجھن کا اظہار کر ہی دیا جس نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

''نہ گھبرا اوئے! میری کوئی معذور بیٹی نہیں ہے جسے تیرے ساتھ بیاہ کر میں نے تجھے گھر جوائی رکھنا ہے۔''

اس کے جملے پر کرم علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ایسا ہی کوئی خیال آ رہا تھا اور شوکت زماں نے جیسے راڈار کی طرح اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔

''نہ ہی میں تیرا حسن دیکھ کر تجھ پر فدا ہو گیا ہوں۔''

اس کے اگلے جملے نے کرم علی کو مزید نادم کیا۔ وہ اب سوفٹ ڈرنک کا گلاس اٹھائے ہنس رہا تھا۔ کرم علی کچھ بول نہیں سکا۔

''بس تو اچھا لگا ہے کرم مجھے بڑا کھرا اور نیک بندہ لگا ہے مجھے جب بھی لگا تھا جب میں صابر قوم کی باڈی لے جاتے ہوئے تجھ

سے ملاتھا۔ میں تو قربان ہوگیا تجھ پر یار! کون اس طرح کسی جاننے والے کی لاش پاکستان لانے کے لئے اپنا وقت...... میں نے سوچا شوکت زمان بھی وہ بندہ ہے جو کل کو تیری باڈی بھی اٹھا کرے جائے گا تیرے ملک دفن کرنے۔"

کرم علی کو اس کے عجیب سے لہجے میں کہے ہوئے جملے نے حیران نہیں پریشان کیا، وہ اس سوفٹ ڈرنک کے گلاس کو منہ لگائے مشروب نہیں پی رہا تھا اپنی آنکھوں کی نمی پی رہا تھا مگر کرم علی دیکھ چکا تھا۔

"اور دیکھ، کتنے لوگ ہوں گے جو تیری طرح میرے پاس آ کر میری دوست دیکھ کر اس سے گھبرا کر بھاگیں گے۔ ارے لوگ تو رالیں ٹپکاتے چپک جاتے مجھ سے۔ پیروں میں پڑ جاتے کہ کسی طرح انہیں اپنے پاس کسی بھی کام کے لئے رکھ لوں۔ اور تجھے تو میں پورا کاروبار پلیٹ میں رکھ کر دے رہا ہوں اور تو سوال پر سوال کر رہا ہے مجھ سے۔ تو بڑا ایسا بندہ ہے یار ...... بڑا اچھا، بڑا ایسا بندہ، اس لیے لایا ہوں تجھے اپنے پاس، تیرے ساتھ دل لگتا ہے میرا۔"

کرم علی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کی باتوں پر یقین کرے یا نہ کرے۔ وہ اپنے آپ کو کسی دوسرے شخص سے زیادہ اچھی طرح جانتا تھا اپنی ظاہری اور باطنی خامیوں اور خوبیوں سے کسی دوسرے کی نسبت زیادہ بہتر طور پر آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی شخصیت میں ایسا کچھ نہیں ہے جو اسے کسی دوسرے انسان کے لیے متاثر کن بناتا اور دوسرا انسان بھی وہ جو کروڑوں کی جائیداد کا مالک اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے تھا۔

مگر وہ یہ سب کچھ شوکت زمان سے نہیں کہہ سکتا تھا شاید شوکت زمان کی اتنی لمبی تقریر اور دلائل سننے کے باوجود وہ اسی طرح اٹھ کر چلا جاتا مگر شوکت کے ایک جملے نے اسے پوری گفتگو کے دوران باندھے رکھا تھا۔

"شاید یہ آخری موقع ہو شاید یہ آخری موقع ہو۔" وہ جملہ اس کے ذہن میں بار بار گونج رہا تھا اور کرم علی نے زندگی میں اس آخری نظر آنے والے چانس کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اس نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔

زندگی میں آخری بار اس نے ٹھیک وقت پر فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆

"آج زبیدہ نے فون کیا تھا۔" نفیسہ نے بے حد جوش اور خوشی کے عالم میں بتایا تھا۔

زینی اپنے سیل پر ایک کال ملاتے ملاتے رک گئی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی باہر سے آئی تھی۔

"کس لیے؟" اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"ملنے کے لئے آنے کا کہہ رہی تھی۔ تمہارا پوچھ رہی تھی کہ جب زینی گھر آئے گی تب آؤں گی۔ میں نے کہا، اپنا گھر ہے جب چاہے آؤ۔ بلکہ گاڑی بھیج کر بلوالوں گی۔ ورنہ یہاں ڈیفنس میں ہمارا گھر کہاں ڈھونڈتی پھرے گی۔" نفیسہ اس سے یوں کہہ رہی تھیں جیسے زبیدہ اور ان کے درمیان کبھی کوئی مسئلہ ہوا ہی نہیں تھا۔

''عمران کی شادی کر دی انہوں نے؟'' زینی نے بے حد سنجیدہ لہجے میں ماں سے پوچھا۔

''ارے نہیں کہاں... مجھ سے بڑی معافی مانگ رہی تھی، کہہ رہی تھی، تسنیم کی باتوں کی وجہ سے اس کا دل خراب ہو گیا تھا۔ مگر اب بڑا افسوس ہے اسے جو کچھ اس نے کیا۔ بتا رہی تھی مجھے کہ عمران تو کہیں شادی کے لیے تیار ہی نہیں۔ وہ ربیعہ کے علاوہ کسی کی بات ہی نہیں کرتا۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں نے ربیعہ کا رشتہ تو کہیں طے نہیں کیا؟ میں نے بتایا اسے کہ فی الحال تو نہیں کیا۔ مجھے لگتا ہے، وہ عمران اور ربیعہ کے رشتے کی بات دوبارہ کرنے کے لیے آنا چاہتی ہے۔''

نفیسہ بے حد خوشی کے عالم میں اس سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ نے ربیعہ کو بتایا؟'' زینی کے انداز میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''ہاں... ہاں... اس کے سامنے ہی تو فون آیا تھا۔ اس سے بھی بات کی زبیدہ نے۔ خوش تھی وہ بھی بڑی۔'' نفیسہ نے کہا۔

''زبیدہ سے تو بڑی محبت تھی اس کو۔ بڑا پیار تھا زبیدہ کے ساتھ اس کا۔ تم کو تو پتہ ہی ہے۔''

نفیسہ نے بے حد سادہ لہجے میں کہا۔ زینی بے اختیار ہنسی۔

''ہاں، مجھ سے زیادہ کون جانتا ہو گا۔ کتنی جان چھڑکتی ہیں وہ ربیعہ پر، میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں، اور پہلے نہیں بھی چھڑکتی تھیں تو اب چھڑکیں گی۔ انہیں پتا ہے، اب وہ کس گھر میں ربیعہ کا ہاتھ مانگنے آ رہی ہیں۔'' زینی نے تلخی سے کہا۔

''اچھی عورت ہے زبیدہ، غلطی ہو گئی اس سے تب... غلطیاں ہو جاتی ہیں انسانوں سے۔ پر بڑی نیک عورت ہے، کتنی پرہیزگار اور تہجد گزار ہے۔ سارا محلہ اپنے لیے دعا کرانے آتا ہے اس سے۔'' نفیسہ اب زینی کا دل صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''مجھے کسی ایسے انسان کی پرہیزگاری اور عبادت نہ گنوائیں جو پیسے کے لیے دم ہلاتا ہوا کسی کی بھی چوکھٹ پر جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔''

''ایسے نہیں کہتے زینی!'' نفیسہ اس تبصرے پر بڑبڑا گئی تھیں۔

''تم تو خالہ کی بڑی تعریف کرتی تھیں۔ نماز روزے کے بارے میں سب ان ہی سے پوچھا کرتی تھیں۔''

''تعریف تو میں اور بھی بڑے لوگوں کی کیا کرتی تھی۔'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ انہیں صرف نماز روزے کا پتہ ہے دین کا نہیں۔ یہ جو بظاہر نماز روزے کی پابند، سیدھی سادی عورتیں ہیں نا گھروں میں مائیں بن کر بیٹھی ہوئی۔ بڑی جانیں بچاتی ہیں۔ یہ دوسروں کی زندگیوں میں۔ بڑا کھوٹ، میل اور لالچ ہوتا ہے ان کے دلوں میں۔ آپ کی بہن جب آئے گی یہاں تو دیکھیے گا کس طرح رال ٹپکاتی نظر آئے گی وہ۔ آپ کی نیک پرہیزگار بہن زبیدہ۔''

وہ طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اور اٹھتے ہوئے اس نے نفیسہ کے عقب میں کھڑی ربیعہ کو دیکھا۔ وہ یقیناً اس کی اور نفیسہ کی ساری باتیں سن چکی تھیں۔

''تم سمجھتی ہو، وہ تمہارا پیسہ دیکھ کر آ رہی ہیں؟'' اس کے لہجے میں بے حد تلخی تھی۔

"تم مجھتی ہو، وہ تمہاری محبت میں آرہی ہیں وہ؟" زینی نے جواباً سوال کیا۔

"انہیں پچھتاوا ہے، اس لیے آرہی ہیں۔" ربیعہ نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"فکر مت کرو، اس گھر میں آکر، اسے دیکھ کر انہیں اپنے کیے پر اور پچھتاوا ہوگا۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"انہیں اس گھر میں نہیں رہنا۔ یہاں صرف میرے لیے آرہی ہیں وہ۔"

"ہاں، انہیں اس گھر میں نہیں رہنا مگر اس گھر سے بہت کچھ ملنا ہے انہیں۔ تمہارے علاوہ بھی۔" زینی نے اپنے جملے کے آخری حصے پر زور دیا۔

"کچھ نہیں چاہیے۔ نہ انہیں یہاں سے نہ مجھے، خالی ہاتھ جاؤں گی میں یہاں سے۔ صرف وہی چیزیں لے کر جاؤں گی جو میرے باپ نے میرے لیے بنائی تھیں۔" ربیعہ نے بے حد تلخی سے کہا۔

"یہ تم خالہ زبیدہ کو ان کے آنے پر بتا دینا۔ پھر تمہاری نیک، تہجد گزار ہونے والی ساس تم کو لے کر جانے میں کتنی دلچسپی رکھتی ہیں، تمہیں پتا چل جائے گا۔" زینی نے سرد آواز میں کہا۔

"یہ جو نعیم کو گھر اور کاروبار کے لیے پیسہ دیا ہے تمہارا کیا خیال ہے، خاندان والوں کو اس کا پتا نہیں چلا ہوگا؟ سب کو پتا چل گیا ہوگا۔ اب سب آئیں گے یہاں پر اپنے بیٹے لے کر، ان کی بولی لگوانے کے لیے۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں زبیدہ خالہ سے فون پر بات تک نہ کرتی۔ نہ یہ کہ انہیں یہاں آکر دوبارہ جال بچھانے کی دعوت دیتی۔"

وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ اس نے ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو امڈتے دیکھے تھے۔

"تو یہ کام تم نے کیوں نہیں کیا۔ جب نسیم خالہ نے تم پر دروازے بند کیے تھے تو تم کیوں نہیں آگئیں، چپ چاپ وہاں سے۔ تم کیوں ان کا دروازہ بجاتی رہیں۔ جب ابو نے تم سے کہا کہ تم منگنی ٹوٹنے پر صبر کر لو تو تم کیوں انہیں زبردستی شیراز کے گھر بھجواتی رہیں۔" زینی کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوگیا۔

"تمہارے لیے اگر آج شیراز اور اس کی ماں یہاں آجائیں تو تم کیا کرو گی؟" ربیعہ نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ بے حد تلخی سے پوچھا۔

زینی چپ چاپ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

"بڑا غرور ہے تمہیں اپنے پیسے پر، ایک وقت آئے گا جب تمہارے پاس صرف پیسہ ہی ہوگا اور کچھ نہیں۔" ربیعہ کہہ کر روتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

"ایک وقت ....؟" زینی بے حد مدھم آواز میں بڑبڑائی "وہ وقت کب سے آگیا۔"

"تم ربیعہ کی باتوں کا برا مت ماننا۔ ایسے ہی بولتی رہتی ہے وہ۔" نفیسہ بے حد پریشانی کے عالم میں اب اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

☆☆☆

شینا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا شیراز کا فون بجنا شروع ہوا تھا، وہ کچھ دیر تک فون کے بند ہونے کا انتظار کرتی رہی لیکن جب اسے اندازہ ہو گیا کہ کال ریسیو کیے جانے کے بغیر وہ فون بند نہیں ہوگا تو اس نے اٹھ کر کال ریسیو کی۔ اس کے ہیلو کہتے ہی دوسری طرف سے فون ڈس کنیکٹ ہو گیا تھا۔ شینا نے فون تقریباً پھینکنے والے انداز میں بیڈ پر ڈالا اور دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف آ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہیر برش اٹھاتی، فون ایک بار پھر بجنے لگا تھا۔ اس بار وہ قدرے جھنجھلاتی ہوئی فون کی طرف گئی اور اس نے فون اٹھا کر بے حد بدتمیزی سے "ہیلو" کہا۔ فون ایک بار پھر ڈس کنیکٹ ہو گیا۔

اس بار شینا نے فون بیڈ پر نہیں پھینکا، اس نے فون میں ریسیوڈ اور ڈائلڈ کالز کا ریکارڈ چیک کیا۔ ریکارڈ میں ابھی کی ہوئی اس نمبر سے آنے والی کال کے علاوہ اور کوئی کال نہیں تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ سیل فون کی فون بک بھی کھولتی۔ شیراز تولیے سے بالوں کو رگڑتے ہوئے باتھ روم سے باہر آ گیا۔ شینا نے فون کو دوبارہ بیڈ پر پھینک دیا فون دوبارہ بجنے لگا تھا۔ شیراز کو یک دم جیسے کرنٹ لگا۔ اس نے لپک کر فون اٹھا لیا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ شینا کال ریسیو کرنے کی کوشش کرے گی۔ مگر شینا نے اس بار کال ریسیو نہیں کی۔ وہ شیراز کو کال ریسیو کرنے دینا چاہتی تھی۔

"ہیلو... اوہ ہائے... میں کچھ بزی ہوں، ابھی تھوڑی دیر میں کال کرتا ہوں تمہیں، نہیں نہیں، بس ابھی کروں گا پندرہ منٹ میں۔ او کے بائے۔" اس نے پھولے ہوئے سانس اور گھبرائی ہوئی آواز میں کال ریسیو کرنے اور بند کرنے میں پندرہ سیکنڈ بھی نہیں لگائے تھے۔ اس کے اتنے قریب سینے پر بازو باندھے عجیب سی نظروں سے گھورتی ہوئی شینا کی موجودگی اسے بے حد پریشان کر رہی تھی۔

"کس کا فون تھا؟" شینا نے فون بند ہوتے ہی بے حد سرد آواز میں اس سے پوچھا۔

"وہ... ایک... ایک دوست کا تھا۔" شیراز اس کے اتنے ڈائریکٹ سوال پر گڑبڑایا۔

"تھا یا تھی؟" شینا نے بے حد تیکھے انداز میں کہا۔

"دوست تھا۔" شیراز نے اپنے لہجے میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"کال ملاؤ اور میری بات کراؤ اپنے اس دوست سے جو مجھے اپنی سریلی آواز سناتے ہوئے ڈرتا ہے۔"

"شینا....." شیراز کی جیسے جان نکل گئی۔

"دو بار میں نے کال ریسیو کی۔ دونوں بار تمہارے اس دوست کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی۔ تم میرے سامنے اس سے بات نہیں کر سکے۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ دوست تھا۔"

شینا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تم چھوٹی سی بات کو ایشو بنا رہی ہو۔" شیراز نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"Don't you dare cheat on me."

وہ غرائی۔ "میرے باپ نے اس لیے نہیں خریدا تمہیں کہ تم میرے گھر میں رہ کر میرا کھاتے رہو اور دوسری عورتوں کے ساتھ فلرٹ کرتے پھرو۔"

"کون سا فلرٹ؟ کیسا فلرٹ میں" شیراز کی جان پر بن گئی تھی۔

"میں کیوں دھوکا دوں گا تمہیں۔"

"اپنے خاندان اور کلاس کی وجہ سے۔" شینا نے ترکی بہ ترکی کہا۔ شیراز کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"بار بار خاندان کا طعنہ مت دو مجھے۔"

"طعنہ نہیں حقیقت ہے، پچھلے چند ہفتوں سے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ سب دیکھ رہی ہوں میں۔"

"کیا کر رہا ہوں میں؟"

"یہ جو سارا سارا دن کالز آتی ہیں تمہیں اور یہ جو تم نے آج کل راتوں کو دیر سے گھر آنا شروع کر رکھا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟"

"تم بھی راتوں کو دیر سے آتی ہو۔" شیراز نے کچھ ہمت کرتے ہوئے کہا۔

"میں جو کچھ کرتی ہوں۔ کھلے عام کرتی ہوں، تمہاری طرح جھوٹ بول کر اور چوری چھپے نہیں کرتی۔" شینا نے چلا کر کہا۔

"مجھے کچھ کام ہے، اس لئے میں رات کو دیر سے۔"

شینا نے اسے بات پوری کرنے نہیں دی۔

"تمہارے سارے کاموں کو پاپا اچھی طرح دیکھ لیں گے، انہیں بتا نا یہ سب کچھ۔"

"تم... تم مجھ پر خواہ مخواہ شک کر رہی ہو۔" وہ ہکلایا۔

"شک؟... مسٹر شیراز! مجھے چیلنج مت کرو کہ میں تمہیں ان عورتوں کے Whereabouts (کوائف) بھی بتانے شروع کر دوں جن کے ساتھ تم آج کل اپنے دل کا حال شیئر کرتے ہو۔"

شینا نے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھتے ہوئے تیکھے تیوروں کے ساتھ کہا۔

"یہ سب کچھ کرنا ہے تمہیں تو اپنے ماں باپ کے گھر جا کر کرو۔ یہاں نہیں۔" وہ بے حد ترشی سے کہہ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

شیراز بہت دیر تک فق چہرے کے ساتھ وہیں کھڑا رہا۔ شینا کے شبہات بالکل ٹھیک تھے اور وہ واقعی آج کل چند لڑکیوں کے ساتھ افیئر چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اسے اندازہ نہیں تھا اس کا کہ اس کا یوں ہنڈیا بیچ بازار میں پھوٹے گا اور اب اس کی حالت واقعی بہت خراب ہو رہی تھی شینا نے اگر یہ دھمکی دی تھی کہ وہ سعید نواز کو سب کچھ بتائے گی تو اس کا واقعی یہ مطلب تھا کہ وہ سب کچھ سعید نواز کو بتا دیتی اور اس کے بعد سعید نواز اس کا کیا حال کرتے شیراز کو اس کے بارے میں زیادہ خوش فہمی نہیں تھی۔

اور اس کا یہ اندازہ بالکل ٹھیک ثابت ہوا تھا وہ اب آنکھیں بند کر کے بھی اپنے سسرال والوں کے بارے میں اندازہ لگاتا تو وہ ٹھیک نکلتا وہ انہیں اتنی اچھی طرح جاننے لگا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد ہی سعید نواز کے سامنے اس کی طلبی ہو گئی تھی اور سعید نواز اس سے یوں ملے تھے جس طرح وہ سیکرٹریٹ کے کسی کلرک یا اپنے دفتر کے کسی چپراسی سے ملتے تھے۔

''پاپا شینا کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' شیراز ہکلایا تھا جب سے وہ اپر کلاس کے اس خاندان کا حصہ بنا تھا اکثر ان لوگوں کے سامنے وضاحتیں کرتے ہوئے وہ ہکلانا شروع ہو جاتا اور اس وقت تو وہ خیر وہ جھوٹ بولنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

''ہو سکتا ہے شینا کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو مگر مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی میں نے خود تمہیں اس ہوٹل سے ایک لڑکی کے ساتھ نکلتے دیکھا ہے۔''

''پاپا وہ۔ وہ صرف ایک دوست تھی۔ اتفاقاً مل گئی تو میں اسے چائے کے لئے لے گیا۔''

''اتفاقاً یا جان بوجھ کر مجھے دلچسپی نہیں ہے تم سعید نواز کے داماد ہو اور تم باہر جو کچھ کرو گے مجھ تک پہنچ جائے گا۔'' سعید نواز نے جیسے اسے دھمکی دی۔

''تمہارا کیا خیال ہے شینا کے پہلے شوہر سے کیوں کروائی میں نے ڈائی وورس اس کی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے۔'' سعید نواز نے اس بار بھی جھوٹ بولا۔ ''میں جانتا ہوں پاپا۔''

''جانتے ہو تو پھر تمہیں یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ تمہاری ان حرکتوں کی وجہ سے میرے خاندان کا نام خراب ہو رہا ہے۔''

''پاپا میں.....!''

''میں تمہیں پیسہ بنانے کا موقع اس لیے نہیں دے رہا کہ تم دو ٹکے کی عورتوں پر اسے لٹاتے پھرو۔''

''میں...''

''اور اس پر تم شینا سے یہ کہتے ہو کہ وہ بھی یہ سب کچھ کرتی ہے۔''

''میں'' ''میں تمہیں اس گندے محلے سے اٹھا کر یہاں اس لیے نہیں لایا تھا کہ تم ہمارے سامنے تن کر کھڑے ہو جاؤ۔''

شیراز نے اس بار کوئی وضاحت نہیں دی کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''آئی ایم سوری'' اس نے بے حد ندامت بھرے انداز میں کہا۔

''میں نے دوبارہ اگر تمہیں کسی عورت کے ساتھ دیکھا تو وہ میرے خاندان میں تمہارا آخری دن ہوگا۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم ساری عمر یاد رکھو گے۔''

''آئی ایم سوری؟ آئی ایم سوری پاپا۔'' شیراز کی لجاجت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

سعید نواز مزید کچھ کہنے کے بجائے پھنکارتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تھے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے اور اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے شیراز کو یاد آیا وہ اس کی شادی کی دوسری سالگرہ تھی۔

☆☆☆

خالہ زبیدہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ربیعہ کی بات کا کیا جواب دیں۔ وہ کم از کم اس سوال کی توقع لے کر یہاں نہیں آئی تھیں۔

"بیٹا! زینی بہن ہے تمہاری، اتنی قربانیاں دی ہیں اس نے..." انہوں نے کچھ سنبھل کر کہنا شروع کیا۔

"جانتی ہوں خالہ! وہ میری بہن ہے۔ لیکن مجھے اس کی ان قربانیوں سے اکٹھی کی ہوئی دولت میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ دوبارہ میرا رشتہ مانگ رہی ہیں دو کپڑوں میں چار گواہوں اور نکاح خواں کے ساتھ اس گھر سے لے جانے کو تیار ہیں آپ؟"

"یہ بڑوں کی باتیں ہیں ربیعہ! تمہیں ضرورت نہیں ہے بیچ میں بولنے کی۔"

نفیسہ نے مداخلت کی۔ انہیں خدشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں زبیدہ کو اس کی بات بری نہ لگے۔

"بالکل... بالکل یہ بڑوں کے طے کرنے والے معاملات ہیں۔ اگر تم لوگ سادگی سے شادی کرنا چاہو گے تو ٹھیک ہے ہم سادگی سے کر لیں گے۔ اپنے گھر کی بات ہے۔" خالہ زبیدہ نے کچھ سنبھلتے ہوئے کہا۔

"اور میں اس گھر میں شادی نہیں کروں گی۔ اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہوں گی۔"

"یہ ربیعہ کو کیا ہو گیا ہے؟ اس طرح تو کبھی نہیں بولتی تھی۔" زبیدہ خالہ نے اس بار کچھ تشویش کے ساتھ نفیسہ سے کہا۔

"کچھ نہیں ایسے ہی بک بک کر رہی ہے۔" نفیسہ نے ربیعہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں میری بچی تو بڑی سمجھدار ہے غصہ تھوک دو... آخر زینی بے چاری نے کیا، کیا ہے یہ تو سارا شیراز اور اس کے ماں باپ کا قصور ہے پھر تم کیوں بہن کے اتنا خلاف ہو رہی ہو۔ اللہ نے عزت دی ہے اسے، پیسہ دیا ہے، آج ضیاء بھائی ہوتے تو کتنا خوش ہوتے اپنی اولاد کی اتنی ترقی دیکھ کر۔"

زبیدہ خالہ نے ایک گہری آہ بھرتے ہوئے کہا وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ربیعہ کو موضوع سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کے منہ سے نکلنے والا ہر جملہ ربیعہ کو اذیت کا شکار کر رہا تھا۔

زینی نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ دوبارہ ربیعہ کی محبت میں نہیں آئی تھیں۔ اس مال و دولت میں اپنا حصہ لینے آئی تھیں جو انہیں اپنی بہن کے گھر میں نظر آنے لگا تھا۔ اسے صدمہ ہوا تھا۔ شدید صدمہ، اسے بھی خوش فہمی تھی کہ شاید وہ عمران کے کہنے اس کے مجبور کرنے پر وہاں آئی تھیں۔ مگر ان کے ہر دوسرے جملے میں کوئی نہ کوئی سوال تھا۔

"یہ بنگلہ زینی نے خرید لیا ہے؟"

"کتنے کا خریدا ہے؟"

گیراج میں کھڑی ساری گاڑیاں اپنی ہیں؟"

"گھر میں کتنے نوکر ہیں؟"

"نوکروں کو کتنی تنخواہیں دیتے ہیں؟"

''زہرہ کا گھر زیبی نے کتنے میں خریدا؟''

''نعیم کو کاروبار کے لیے کتنی رقم دی؟''

''اپنی ایک فلم کے کتنے پیسے لیتی ہے؟''

''ماڈلنگ کے کتنے پیسے ملتے ہیں اسے؟''

''اس نے نفیسہ کے نام کوئی بینک اکاؤنٹ کھولا؟''

ان کا ہر جملہ زیبی کے نام پر ختم ہو رہا تھا۔ اس میں ابتدائی چند معذرتی جملوں کے علاوہ ربیعہ کہیں تھی ہی نہیں اور وہاں ان کے پاس بیٹھے ان کی باتیں سنتے ہوئے ان کے ہر جملے کے ساتھ ربیعہ کا دل کچھ اور ڈوبا تھا اور صرف دل ہی نہیں ڈوبا تھا وہ ساری خوش فہمیوں اور امیدوں کے محل بھی دھڑام سے آن گرے تھے، جو اس نے پچھلے کئی دنوں سے تعمیر کیے تھے۔

عمران سے شادی کا مطلب اس کے لئے کیا ہوتا اس کے لیے، ربیعہ کو حساب کے کسی فارمولے کی ضرورت نہیں تھی۔

''میں شادی نہیں کروں گی عمران سے آپ اس کا رشتہ کہیں اور کر دیں۔''

اس نے بالآخر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ زبیدہ خالہ کو جیسے دھچکا لگا تھا۔

''ربیعہ بیٹی کیا کہہ رہی ہو تم؟ ارے میں تو کتنی آسوں کتنے ارمانوں کے ساتھ آئی ہوں۔'' انہوں نے گڑبڑائے ہوئے انداز میں کہا۔

''آپ صرف لالچ لے کر آئی ہیں۔ پچھتاوا اور شرمندگی نہیں اور آسوں اور ارمانوں کی تو بات بھی نہ کریں۔'' اس نے تلخی سے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

اس کی عدم موجودگی میں زبیدہ نے نفیسہ کی منتیں کی تھیں اور نفیسہ نے ان سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ربیعہ کو منا لیں گی۔ وہ ابھی غصے میں تھی ٹھیک ہو جائے گی۔ ربیعہ نے اس رات کھانا نہیں کھایا وہ ساری رات کمرے میں بیٹھی روتی رہی تھی۔

زیبی کو سب کچھ اگلی رات کو پتہ چلا جب نفیسہ نے ربیعہ کی زبیدہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں اسے بتایا۔ اگرچہ وہ چاہتی تھی کہ ربیعہ اس بار انکار کر دے، اس کے باوجود زیبی کو اس کے انکار کے بارے میں سن کر رنج ہوا تھا۔

''مبارک باد دینے آئی ہو؟''

اس نے ربیعہ کے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا، جب ربیعہ نے اس سے کہا۔ وہ اپنی وارڈ روب کے کپڑے ٹھیک کر رہی تھی۔ زیبی کو اس کی بات چبھی۔

''میں کیوں مبارک باد دینے آؤں گی تمہیں؟''

''تمہاری باتیں جو سچ ثابت ہوئی ہیں۔'' وہ تلخی سے بولتی رہی، زیبی کو دیکھے بغیر وارڈ روب میں کپڑے رکھتے ہوئے۔

''سب لوگ ویسے ہی نکل رہے ہیں جیسے تم کہتی ہو۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ تم تو لوگوں کے دلوں کا حال جاننے لگی ہو۔'' وہ اس پر چوٹ

کر رہی تھی۔

''تمہیں خالہ کو انکار نہیں کرنا چاہیے تھا؟'' ''تمہاری بھی تو یہی خواہش تھی۔'' وہ اسی طرح بولتی رہی۔

''میری خواہش کو چھوڑو۔ لیکن تم عمران کو پسند کرتی تھیں، تمہیں اگر اس سے شادی کا موقع مل رہا تھا تو تمہیں اس سے شادی کر لینی چاہیے تھی۔''

''میرے لیے نہیں آئے تھے وہ یہاں تمہاری دولت کی خاطر آئے تھے۔'' ربیعہ نے رنج اور غصے سے کہا۔

''تو انہوں نے کیا الگ کیا؟ کوئی بھی تمہارا رشتہ لینے آئے گا تو یہی کرے گا۔ انہوں نے ایسا کہا تو کیا ہوا؟''

''اور میں کسی ایسی جگہ شادی نہیں کروں گی، جہاں میں تمہارا پیسہ لے کر جاؤں۔''

زینی اس بار بول نہیں سکی، ربیعہ کے لہجے میں زہر تھا۔

''اس گھر میں رہنا مجبوری ہے میری لیکن کسی ایسے گھر میں جانا میری مجبوری نہیں جہاں مجھے ساری عمر رہنا ہے اور وہ گھر میں تمہارے حرام کے پیسے سے نہیں بناؤں گی۔''

وہ زینی کے منہ پر جیسے طمانچے مار رہی تھی۔ زینی چپ چاپ کھڑی اسے دیکھتی اسے سنتی رہی۔

''میں تمہاری طرح ایک آدمی کے نہ ملنے پر مر نہیں جاؤں گی۔ تمہیں دکھاؤں گی انسان کیسے جیتا ہے تم میرے بارے میں فکر مند مت ہو، میں اپنی فکر تم سے بہتر کر سکتی ہوں۔''

''اب تم یہاں سے جاؤ گی یا میں جاؤں؟''

زینی اسی طرح خاموشی سے اس کے کمرے سے نکل آئی۔ اس کے پاس ربیعہ کی ہر بات کا جواب تھا مگر یہ موقع سوال جواب کا نہیں تھا۔ وہ اس سے کچھ کہہ کر اسے مزید رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

نیویارک چھوڑ کر واپس آتے ہوئے کرم علی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ امریکہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ آیا تھا نہ ہی اسے وہ پتہ تھا جو زندگی اس کے لئے آگے طے کر بیٹھی تھی۔

وہ شروع میں ایک اپارٹمنٹ لے کر رہا تھا مگر چند ہفتوں کے بعد شوکت زماں کے اصرار پر وہ اس کے گھر منتقل ہو گیا تھا۔ بعض دفعہ اسے شبہ ہوتا کہ وہ اسے ایک بیٹے کی طرح ٹریٹ کرتا ہے۔ پھر اسے لگتا وہ اسے ایک دوست سمجھتا ہے اور پھر یک دم اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے ایک ملازم سے زیادہ کچھ نہیں، یہ سائیکل چلتی رہتی تھی۔

شوکت زماں ایک عجیب آدمی تھا۔ اس کی زندگی کے عجیب ترین انسانوں میں سے ایک۔ اس نے کسی دولت مند آدمی کو پیسے سے اتنی نفرت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نشے میں ہوتا تو باقاعدہ گالیاں گا کر دولت اور دولت مند لوگوں کو گالیاں دیتا اور جب ہوش میں ہوتا تو کرم علی کو سڑک پر ہر چھوٹا بڑا کام کرتا شخص دکھا کر اس کی قسمت پر رشک کرتا۔

"اللہ نے مجھے سویپر کیوں نہیں بنایا کرم علی' کیا کہتے ہو تم اسے پنجابی میں ہاں جمعدار ... دیکھو کیا زندگی ہے اس کی کام چوری کرے گا تو زیادہ سے زیادہ اس کی نوکری جائے گی۔ کروڑوں کا نقصان نہیں ہوگا اسے۔" وہ کف افسوس ملتا ہوا کہتا۔

"یا پھر اللہ مجھے یا اخبار بیچنے والا بنا دیتا۔ دیکھو کتنی مزے کی زندگی ہے اخبار ختم، کام ختم جو کچھ کمایا اسی دن اڑا کر اگلے دن پھر اخبار کے ساتھ وہیں۔۔۔"

وہ کرم علی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا ہوتا اور فٹ پاتھ پر نظر آنے والے ہر شخص کے کام کو اپنے کام سے بہتر کہتا پھر اچانک اسے کرم علی کی خاموشی کا احساس ہوتا۔

"اب تو سمجھے گا میں پاگل ہوں یا ہونے والا ہوں جو جی چاہتا ہے سمجھ لے۔" وہ اطمینان سے کہتا کرم علی ویسے ہی چپ رہتا۔

"دیکھو کرم علی پیسے سے کبھی پیار مت کرنا۔" وہ یک دم کرم علی کو نصیحت کرنے لگتا کرم علی کو غصہ آتا پیسہ تھا کہاں اس کے پاس جس سے اس کو پیار کرنے کی فرصت مل پاتی۔

"یہ جو پیسہ ہے نا اس کی گنتی اربوں کھربوں تک جاتی ہے بلکہ اس سے بھی آگے جو چیز اربوں کھربوں تک جائے نا اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ ویلیو اسی کی ہوتی ہے جو انگلیوں کی پوروں سے شروع ہو کر پوروں پر ہی ختم ہو جائے جیسے خون کے رشتے بہت بھی ہوں نا تو بس دونوں ہاتھوں کی پوریں ہی بھر پاتی ہیں۔ ایک آدمی کا پیسہ اربوں کھربوں ہو سکتا ہے رشتے اربوں کھربوں نہیں ہو سکتے۔ تو بس یاد رکھنا جو چیز کم تعداد یا مقدار میں ملے اس کی ویلیو زیادہ، جو ڈھیروں کے حساب سے ملے اس کی ویلیو کم۔"

وہ جب سنجیدہ ہوتا تو مدبروں کی طرح باتیں کرتا۔ ایک بے ہودہ لفظ یا گالی کے بغیر۔ شاندار انگلش میں خوبصورت تلفظ کے ساتھ گھمبیر لہجے میں متاثر کن انداز کے ساتھ بے حد موزوں اور مناسب ترین الفاظ کے انتخاب کے ساتھ۔ اس وقت شوکت زماں شوکت زماں نہیں لگتا تھا کسی یونیورسٹی کا پروفیسر لگتا تھا۔ کرم علی کو افسوس ہوتا اس نے شادی کیوں نہیں کی۔ کر لیتا تو آج اس کی فیملی ہوتی جو شوکت زماں جیسے انسان کو پا کر خود کو خوش قسمت تصور کرتی۔

اس نے شوکت زماں سے زیادہ فیاض آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر مہینے لاکھوں روپیہ پاکستان اور کینیڈا میں مختلف خیراتی اداروں کو دیتا تھا اور یہی نہیں وہ اپنے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافوں اور بونس کے معاملے میں بھی اتنا ہی سخی تھا بہت کم ایسا ہوا تھا کہ شوکت زماں کے اداروں سے منسلک کوئی شخص کسی مالی ایشو کی وجہ سے نوکری چھوڑ کر گیا ہو۔

کرم علی نے کبھی ایسا دن نہیں دیکھا تھا جب شوکت زماں نے اس کے ساتھ سفر کیا ہو اور رستے میں بے مقصد اس نے کسی نہ کسی کو کچھ نہ کچھ دیا ہو۔ وہ یہ کیوں کرتا تھا؟ اس کا جواب کرم علی کو کیا ملتا اسے لگتا اس کا جواب شوکت زماں کے پاس بھی نہیں تھا۔

وہ پاکستان سے شاعر بلوا بلوا کر کینیڈا میں مشاعروں پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتا۔ گلوکار بلواتا اور ان کے آگے پیچھے پھرتا۔ کبھی کرکٹ یا ہاکی کے کھلاڑیوں کے لئے تقریبات منعقد کرتا تو انہیں تحائف سے لاد دیتا۔ اور وہ یہ سب کچھ دس سے کرتا تھا۔ وہ شاعروں کو ان کے تیس تیس سال پرانے وہ

اشعار سنا کر حیران کر دیتا تھا جو وہ خود بھی بھول چکے ہوتے گلوکاروں کے پاس بیٹھتا تو انہیں ان کی ان غزلوں اور گیتوں کے حوالے دیتا جو انہوں نے دس، دس سال پہلے کبھی ایک آدھ بار گائی ہوں۔ کھلاڑیوں کے ساتھ ہوتا تو ان کے ہر چھوٹے بڑے ریکارڈ کی تفصیلات اسے ازبر ہوتیں اور کرم علی چپ چاپ دوسرے لوگوں کی طرح مرعوب اس کا چہرہ دیکھتا رہتا۔ کوئی کیسے یقین کرتا کہ شوکت زماں نے پانچویں جماعت سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔

وہ صرف اونٹاریو میں نہیں بلکہ کینیڈا کی ایشین کمیونٹی کے چند بااثر اور بارسوخ ترین مردوں میں شامل تھا جو حکمران جماعت کے ہر فنڈ ریزنگ ڈنر کا حصہ ہوتا اور اگر اسے دلچسپی ہوتی تو یقیناً وہ اس وقت کینیڈین پارلیمنٹ کا ہی نہیں کینیڈین گورنمنٹ کا بھی حصہ ہوتا۔

کرم علی کو اس زندگی پر رشک آتا تھا اور اس نے پہلی بار اس کا اظہار شوکت زماں سے کر بھی دیا تھا۔ شوکت زماں نے جواباً اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اسے توبہ کرنے کو کہا تھا۔

"جیسی زندگی میں جی رہا ہوں کرم علی ایسی زندگی اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دے۔"

کرم علی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ آخر شوکت زماں کا مسئلہ کیا تھا۔ اس وقت اسے لگا تھا وہ بے حد ناشکرا انسان ہے۔

یہ اسے بعد میں احساس ہوا تھا کہ شوکت زماں سے زیادہ شکر کرنے والا آدمی وہ دوبارہ کبھی دیکھنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

"برص ہے تجھے؟" شوکت زماں نے اس دن اچانک اس کی پنڈلیوں سے کچھ اوپر اس کی جینز کے مڑے ہوئے پائنچوں کے نیچے سے جھلکتے برص کے داغوں کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

شوکت زماں کے ساتھ رہتے ہوئے اسے یہ تیسرا سال ہو چکا تھا اور ان تین سالوں میں برص اس کے تقریباً سارے جسم پر پھیل چکا تھا۔ صرف وہ حصہ بچا تھا جو سب سے باہر رہتا تھا اس کی کلائیوں سے کچھ اوپر تک اس کے ہاتھ، ٹخنوں سے کچھ اوپر تک اس کی پنڈلیاں کالربون سے کچھ نیچے اوپر تک اس کا سینہ اور گردن اور اس کے چہرے کے سوا اب اس کا پورا جسم برص کے سفید بدنما دھبوں سے ڈھک چکا تھا اور کرم علی اب ان دھبوں کے اپنے چہرے، گردن، ہاتھوں اور پیروں پر نمودار ہونے کا منتظر تھا۔

عجیب بات تھی جو خوف اور صدمہ اسے لڑکپن میں ان دھبوں کو دیکھ کر ہوا تھا اور جو بعد میں ہمیشہ ان دھبوں کے نظر آنے پر محسوس ہوتا رہا تھا وہ ان تین سالوں میں نہیں ہوا تھا۔ وہ عارفہ کے اس کی زندگی سے نکل جانے کے بعد بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ عام شکل و صورت کا مرد تھا صرف عارفہ کا وجود تھا، جس نے اس کی زندگی کے کچھ سال اسے اپنی نظروں میں بہت خوب صورت، بہت اہم کر دیا تھا۔ اتنا خوب صورت کہ وہ چاہتا تھا وہ برص اس کے وجود کو داغدار نہ کرے۔ تاکہ عارفہ کو کبھی اس سے گھن نہ آئے۔ وہ اپنے وجود کو ان دنوں عارفہ کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا اور اب جب وہ اس کی زندگی سے نکل گئی تھی تو کرم علی کو جیسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا کہ برص کے وہ داغ اسے بدصورت بنا دینے والے تھے۔

"ہاں؟" کرم علی نے مختصراً کہا وہ شوکت زماں کے ساتھ اس کے لان میں موجود گھاس کاٹ رہا تھا۔

"علاج کروایا تو نے؟" شوکت زماں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"پہلے پیسے نہیں تھے۔"

"اور اب؟"

"اب پروا نہیں ہے۔"

"کیوں پروا نہیں ہے؟ یہ مرض پھیلتا ہے۔ تیرا سارا چہرہ خراب ہو جائے گا کرم" خاموشی سے گھاس کاٹنے والی مشین چلاتا رہا۔

"میں کیا کہہ رہا ہوں تجھ سے۔ نوکری سے نکال دوں گا میں تجھے۔ اگر میری بات نہ مانی تو نے۔" شوکت زمان نے غرا کر اس سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" آرام سے کہہ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"اوئے کرم علی تو کس طرح کا بندہ ہے یار تجھے احساس ہی نہیں ہے کوئی خیال ہی نہیں ہے اپنا۔" شوکت زماں یک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔

"خیال تو آپ کو بھی نہیں ہے اپنا" کرم علی نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

شوکت زماں کچھ دیر کچھ نہیں بولا پھر اس نے کہا۔

"ہاں نہیں ہے پر بعض دفعہ سوچتا ہوں کرنا چاہیے تھا۔ تو جوان آدمی ہے ابھی میرے جیسی غلطیاں مت کرنا زندگی برباد کرنا بڑا آسان کام ہوتا ہے۔ پر زندگی کو سنبھال سنبھال کر رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ تو مشکل کام کرنا آسانی کی طرف مت جانا۔"

"زندگی کو برباد کرنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ اپنی زندگی کو۔"

کرم علی نے گھاس کاٹنے والی مشین روکتے ہوئے کہا۔

"میں علاج کرواؤں گا تیرا۔" شوکت زماں نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ کیا کہتے ہیں یہ داغ مجھے کچھ بھی نہیں۔"

"داغ داغ ہوتا ہے کرم علی۔ کچھ نہ بھی کہے تو بھی بہت کچھ کہتا ہے تو مٹا سکتا ہے اب تو تجھے مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

شوکت زماں نے جیسے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔

"اتنی نوازشیں کیوں کرتے ہیں آپ مجھ پر، مجھ سے کیا ملے گا آپ کو؟" کرم علی نے قدرے مضطرب انداز میں کہا۔

"ہر آدمی ہر کام کسی بدلے کی آس میں نہیں کرتا۔" شوکت زماں پھر بدتمیزانہ موڈ میں آ گیا تھا۔

"تو میرے ساتھ نیکی کے بدلے نیکی کرے گا۔ اس کی مجھے امید اور توقع ہے، وہ بھی تو نہیں کرے گا تو میں کچھ نہیں کہوں گا تجھ سے، میں نے تو اپنے گھر والوں کو بھی کچھ نہیں کہا تو تو پھر پرایا آدمی ہے کرم علی۔"

اس نے شوکت زماں کے منہ سے پہلی بار گھر والوں کا ذکر سنا تھا۔ اس کا چونکنا لازمی تھا۔ "گھر والے؟ گھر والے ہیں آپ کے؟" شوکت

زماں چپ چاپ بیٹھا شراب کا پیگ بناتا رہا۔ ایک لفظ بولے بغیر جب تیار ہوگیا تو اسے اٹھانے سے پہلے اس نے کہا۔

''میں ہی گھر والے کہتا ہوں وہ تو کوئی رشتہ نہیں بناتے مجھ سے۔'' اس کی آواز میں دکھ نہیں تھا کوئی اور چیز تھی۔

''خاندان ہے میرا وہ۔'' وہ ''میرا ہے'' پر اٹکا۔ اس نے شراب کا پیگ حلق سے انڈیل لیا۔ کرم علی ساکت بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اب وہ شوکت زماں سے کیا کہانی سننے والا تھا۔

''کہاں ہیں؟'' کرم علی نے بڑے محتاط لہجے میں کہا۔

''ادھر امریکہ میں ہیں۔ ایک بیٹا ٹیکساس میں ایک آئل ریفائنری میں انجینئر ہے۔ دوسرا نیویارک میں ایئر فرانس کا اسٹیشن منیجر ہے۔ بیوی نے دوسری شادی کرلی تھی۔ دوسرے شوہر سے بھی چار بچے ہیں اس کے۔'' وہ اب بتا رہا تھا کرم علی کے کسی سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر۔

''بیوی پسند کی نہیں تھی میری، میرے خاندان کی ہے وہ مگر میں اپنی ایک کزن سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ پورا خاندان جانتا تھا۔ میری بیوی بھی جانتی تھی۔ لیکن ماں باپ نے اس کزن سے رشتہ نہیں کیا۔ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھی۔ یہ تھی، انہوں نے اس کے ساتھ کر دیا۔ میں نے شادی تو کرلی ماں باپ کے اصرار پر، پر شروع کے سالوں میں بڑا تنگ کیا اسے۔ یہاں کینیڈا تو لے آیا مگر یہاں آکر بہت مارتا پیٹتا تھا اسے، پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا تب مجھے میں ماں باپ کا سارا غصہ اس پر نکالتا تھا۔ ایک گرل فرینڈ بھی رکھی تھی میں نے اس کی ضد میں، کئی کئی دن گھر نہیں آتا تھا۔ دس سال اسی طرح گزرے پھر مجھے اس پر غصہ آنا کم ہوگیا تھا۔ شرم آنے لگی تھی جو کچھ میں کرتا رہا تھا اس کے ساتھ پھر بس اس نے ڈائیوورس لے لی بچے بھی لے لیے، بعد میں دوسری شادی کرلی۔''

بات کرتے کرتے وہ پھر اٹکا۔ اس نے بے ربط انداز میں بات ختم کی پھر یکے بعد دیگرے بے حد تیزی سے نئے پیگ چڑھائے کرم علی اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے شوکت زمان پر ترس آیا تھا اس کے لیے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ وہ واقعی بدقسمت تھا کم از کم اس کے خیال میں۔ مگر وہ اسے بدقسمت ہی سمجھا تھا ظالم نہیں، اس نے غلطیاں کی تھیں اور ان غلطیوں کی سزا بھگت رہا تھا۔

''آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کرلی؟'' کرم علی نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''بس نہیں کی۔'' شوکت زماں نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''بیٹوں سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں؟''

''انہیں ضرورت نہیں ہے اب میری، نہ میری نہ میری دولت کی۔ وہ کہتے ہیں میری زندگی میں انہیں میرا پیسہ نہیں چاہیے ہاں میرے مرنے کے بعد دیکھیں گے۔''

شوکت نے بھرائی آواز میں کہا پھر شراب کا ایک اور پیگ چڑھایا۔ کرم کو اس پر اور ترس آیا۔ اس کی اولاد سے اس کو نفرت ہوئی کوئی باپ کو اس طرح کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

اگلے سال کے آخر تک اسے پتہ چل گیا تھا کہ کوئی باپ کو اس طرح کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ شوکت زماں نے اس کا علاج کروایا تھا۔ پھیلتا ہوا برص رک گیا تھا۔ لیکن کرم علی کو ابھی یقین نہیں تھا کہ اس رکنے کی وجہ علاج تھا یا پھیلنے میں وقفہ آیا تھا مگر جو بھی تھا وہ شوکت زماں کا مشکور تھا۔ اس نے اس کے علاج پر بھاری رقم خرچ کی تھی اور یہ اسی علاج کے دوران تھا جب شوکت زماں یک دم بیمار پڑ گیا تھا اور یہ بھی کرم علی کو اسی دوران پتہ چلا کہ وہ بہت عرصے سے کسی مرض کے علاج کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔

شوکت زماں کو کیا مرض تھا۔ یہ کرم علی نہیں جانتا تھا مگر اس کی ایک دم بگڑتی ہوئی حالت اور اس کے ہاسپٹل جانے سے اجتناب نے کرم علی کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے شوکت زمان کو زبردستی ہاسپٹل لے جانے کی کوشش کی اور تب ہی شوکت زمان نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ ایچ آئی وی پازیٹو تھا اور پچھلے پندرہ سالوں سے اس مرض میں گرفتار تھا۔

پندرہ سال تک اپنے بیوی بچوں کے لیے شدید ذہنی اور جسمانی اذیت کا باعث بنے رہنے کے بعد یہ اس بیماری کا انکشاف ہی تھا جس نے شوکت زماں کو یک دم موت کے خوف سے متعارف کروایا تھا بیماری کیا تھی؟ کیوں تھی؟ اور اس کا علاج کیا تھا؟ شوکت زماں نے علاج کے لیے سرتوڑ کوشش شروع کر دی تھیں اور جوں جوں وہ اس بیماری کے علاج کے لیے دنیا میں پھرتا رہا اسے احساس ہوتا گیا کہ اس کی بیماری لاعلاج ہے۔ لیکن بیماری اسے کب ہڑپ کرے گی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ ڈاکٹر تک نہیں۔

شوکت زماں نے اس وقت زندگی میں پہلی بار شاید اپنے بچوں اور بیوی پر رحم کھایا پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ اس کی وجہ سے اسی کی طرح موت کا شکار ہو سکتے تھے اور شوکت زماں نے انہیں بیماری کے بارے میں آگاہ کرنے کے بجائے یک دم غائب ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بیوی اور بچوں کو روپے بھجواتا رہا مگر خود وہ اگلے کئی سال تک ان کے پاس نہیں آیا اور یہ وہ سال تھے جب اس کے دونوں بیٹے بڑی بڑی یونیورسٹیز میں چلے گئے اور یہی وہ وقت تھا جب اس کی بیوی نے اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ وہ کینیڈا میں ہی کسی دوسرے پاکستانی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ شوکت نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس کا یہ مطالبہ بھی پورا کر دیا۔ تب تک علاج کی پے در پے کوششوں کے بعد کم از کم اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کے اپنی اولاد کے پاس جانے سے ساتھ رہنے سے کم از کم ان میں سے کسی کو یہ بیماری نہیں ہو سکتی تھی مگر شوکت زماں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس نے اپنے اندر اتنی ہمت اور جرأت پیدا کرنے اور اپنے خوف سے لڑنے میں جتنا وقت لیا تھا وہ وقت ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔

اس کے دونوں بیٹے اس سے شدید نفرت کرتے تھے۔ اس سے ملاقات میں اس کی بیماری کے انکشاف نے اس کے لیے کسی ہمدردی کو پیدا کرنے کی بجائے ان کی اس سے نفرت کو بڑھا دیا تھا۔ ان کا یقین تھا کہ باپ اس بیماری کے خوف سے اب اپنی خدمت کے لیے ان کے پاس رہنا چاہتا تھا یا انہیں پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اگلے پانچ سال شوکت زماں کو کاروبار میں ریکارڈ منافع ہوا اور شوکت زماں اپنے بیٹوں کی محبت اور دل جیتنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتا رہا۔

اس میں ان دونوں کو ہر ماہ لاکھوں کے حساب سے پیسے بھجوانا بھی شامل تھا۔ وہ دونوں اس کے چیک لے لیتے تھے اور زیادہ سے زیادہ یہی احسان تھا جو وہ شوکت زمان پر کرنے پر تیار تھے اور شوکت زماں اپنی فرسٹریشن میں ایک دن اپنی سابقہ بیوی کے ہاں جھگڑا کرنے پہنچ گیا کیونکہ اس کو

یقین تھا کہ وہ اس کے خلاف مسلسل ان کے اندر زہر بھر رہی تھی۔ اس جھگڑے کے بعد اس کے بیٹوں نے دوبارہ کبھی اس کے چیک وصول نہیں کیے نہ ہی شوکت زمان کی کوششوں کے باوجود اس سے ملنے پر تیار ہوئے۔

کرم علی پتھر کے بت کی طرح اس دن بیٹھا شوکت کے انکشاف سنتا رہا تھا۔

اس نے اس دن کرم علی سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ پچھلی بار کی طرح کرم علی نے اس دن شوکت زماں کی اولاد کے لیے اتنی نفرت محسوس نہیں کی جتنی وہ پہلے کرتا رہا تھا، ان کا قصور نہیں تھا۔ قصور شوکت زماں کا بھی نہیں تھا۔ قصور کس چیز کا تھا۔ قسمت کا؟ حالات کا؟ پیسے کا؟ یہ کرم علی کو اس روز سمجھ میں نہیں آیا۔ شوکت زماں کی اس بیماری کا اس کے حلقہ احباب میں کسی کو پتہ نہیں تھا، پتہ ہوتا تو وہ سب شوکت سے کتراتے یا شاید بھاگنے لگتے۔

''اب کیا ہوگا؟'' کرم علی نے شوکت زماں سے پوچھا تھا۔ اس کے زرد، مدقوق اور بیمار چہرے کو دیکھ کر۔ اگر کوئی علاج نہیں ہے تو پھر کیا ہو گا؟ کرم علی کو بے حد تشویش تھی، شوکت کی موت کا خیال اسے ہولا رہا تھا۔

''یہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔ اسی طرح... اسی طرح میرا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا جائے گا، ہر طرح کی بیماری لگے گی مجھے اور میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر سسک سسک کر مر جاؤں گا'' شوکت زماں نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ کرم علی کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ شوکت کو اتنی آسانی سے اس اذیت ناک موت کا سامنا کرنے دیتا۔

''کیا؟ واقعی کچھ نہیں ہو سکتا؟'' اس نے بے بسی کے ساتھ شوکت سے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے... اگر تم مجھے مار ڈالو۔'' وہ اس کی تجویز پر دھک سے رہ گیا تھا۔ اسے لگا شاید شوکت اس کے ساتھ مذاق کر رہا تھا۔

''میں بڑا بزدل آدمی ہوں کرم علی اتنی ہمت نہیں ہے مجھ میں کہ اپنے ہاتھوں زہر پی لوں، اپنے ہاتھوں پھندہ ڈال لوں۔ یا خود کو گولی سے اڑا لوں تو مجھ پر یہ احسان کر دے۔ سمجھ کہ یہ احسان کر کے تو میرے سارے احسانوں کا صلہ دے دے گا۔''

شوکت زمان اب گڑگڑا رہا تھا۔

''میں، میں یہ نہیں کر سکتا آپ کو قتل نہیں کر سکتا۔'' کرم علی نے خوف کے عالم میں کہا۔

''یہ قتل نہیں ہے یہ رہائی ہے، تو پانچ وقت کا نمازی ہے۔ نیک مومن آدمی ہے۔ میرا گلا گھونٹ دے گا تو تیرا کیا جائے گا؟'' وہ پھر گڑگڑایا۔

کرم علی کچھ کہنے کے بجائے اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ وہ شوکت زماں کو کیسے مار سکتا تھا اور شوکت زماں کو کیا وہ تو کسی کو بھی نہیں مار سکتا تھا۔ پھر شوکت زماں نے اسے کیا سمجھ کر یہ بات کہی تھی۔ اسے شوکت زمان پر رحم بھی آیا اور غصہ بھی۔

اگلے کئی مہینے شوکت اسی طرح گڑگڑاتا اس سے رحم کی بھیک مانگتا رہا تھا، ہر بار اس کے انکار پر وہ اسے گالیاں دیتا رہا بعض دفعہ بے بسی کے عالم میں رونا شروع ہو جاتا۔ ان مہینوں میں کرم علی کے علاوہ اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ شوکت زماں کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی اور پھر وہ وقت بھی آگیا تھا جب وہ اپنے بستر سے اٹھ کر کہیں چلنے پھرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ سارا سارا دن بستر پر پڑا کراہتا رہتا یا پھر کرم علی

کو گالیاں دیتا رہتا۔ اس نے ایسی موت کی خواہش نہیں کی تھی۔ کرم علی نے اس کے سارے پلانز پر پانی پھیر دیا تھا۔

کینیڈا میں اس کے تمام حلقہ احباب کو اس کی بیماری کے بارے میں پتہ چل چکا تھا اور اس کی بیماری کے انکشاف نے یک دم اسے جیسے سب کے لیے اچھوت بنا دیا تھا۔ اس کے غیر ملکی دوستوں کے علاوہ کسی نے شوکت کی عیادت کے لیے، ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سارے کھلاڑی، شاعر ادیب، گلوکار جنہیں شوکت اپنا دوست کہتا تھا اور جن پر تحائف کی بارش کیا کرتا تھا اور جو شوکت کو شوکت زماں نہیں ''شوکت بھائی'' کہا کرتے تھے ان میں سے کسی ایک نے بھی شوکت سے آ کر ملنے کی کوشش تو ایک طرف اسے فون کال کرنے کی زحمت تک نہیں کی تھی۔ شوکت زماں جب تک ''میلہ'' لگاتا تھا سب ''ٹھیہ'' لگانے کے لیے آ جاتے تھے جب وہ بازار سجانے کے قابل نہیں رہا تو دنیا کسی اور شوکت زماں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تھی۔

کرم علی کو لوگوں کے رویے پر دکھ تھا مگر شوکت زماں کو نہیں تھا۔ وہ جیسے اپنے مستقبل کا حال بہت پہلے جان چکا تھا اور مستقبل کے اس حال میں لوگوں کے یہ سارے رویے بھی شامل تھے۔ اس کے باوجود اسے کسی سے گلہ نہیں تھا۔ سارے شکوے کرم علی سے تھے جس کے اس نے اتنے کام کیے جس پر اس نے اتنے احسان کیے مگر وہ اس کا ایک ''چھوٹا سا'' معمولی سا کام کرنے پر تیار نہیں تھا۔

''کوئی قیمت لے لے مجھ سے اس کام کی۔'' شوکت زماں اس دن پھر گڑگڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا اور پھر اس نے کرم علی کو وہ آفر کی تھی جس نے کرم کے ہاتھ پاؤں پہلی بار ٹھنڈے کر دیے تھے۔

''دیکھ کرم علی! میں اپنی ساری جائیداد تیرے نام لکھ دیتا ہوں۔ یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ میں اپنی مرضی سے خودکشی کر رہا ہوں میری موت کا ذمہ دار کسی کو نہ ٹھہرایا جائے تو بس زہر لا کر مجھے پلا دے۔ سارا کچھ تیرے نام کر دوں گا! ایک ایک چیز، تو سوچ مرتو میں نے ویسے بھی جانا ہے پر تو مرنے میں مدد کر دے گا تو تیری زندگی بدل جائے گی۔ ورنہ میرے بعد پھر دھکے کھاتا پھرے گا۔ وہ کرم علی سے Mercy Killing کی بھیک مانگ رہا تھا۔

کرم علی دم سادھے اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا آج سے پہلے اس نے کرم علی کو یہ آفر نہیں کی تھی۔

☆☆☆

پیلے گلابوں کا وہ سلسلہ صرف پیلے گلابوں پر نہیں رکا تھا۔ کسی نام اور ایڈریس کے بغیر زینی کے لیے انہیں دو لفظوں For Zaini کے ساتھ بہت کچھ آتا رہا تھا۔ اس کی ہر پسندیدہ چیز اس کے پسندیدہ رنگ... ہر بار ایسا کوئی تحفہ کچھ دیر کے لیے زینی کو الجھا دیتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں ہر بار ایسے کسی تحفے کو ہاتھ میں لینے پر اسے سب سے پہلا خیال شیراز کا ہی آتا تھا۔ ایک عجیب سی چبھن عجیب سی تکلیف کا احساس ہوتا تھا اسے، وہ جانتی تھی وہ شیراز کا بھیجا ہوا تحفہ نہیں تھا۔ اور یہ یقین اسے کیوں تھا وہ اس کی بھی وجہ جانتی تھی۔

اس نے کبھی یہ پتہ کروانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ تحفے اسے کون کہاں سے بھجواتا تھا۔ نہ ہی سلطان نے اس پر توجہ دی تھی اداکاراؤں کو بہت سے لوگ بہت کچھ اسی طرح بھیجا کرتے تھے۔ پہلے بے نام پھر اپنے وقت پر وہ سامنے آ جاتے تھے۔ سلطان کو بھی انتظار تھا کہ تحفے بھیجنے والا وہ شخص کب اور کس وقت سامنے آتا ہے۔

ایک لمبے عرصے کے بعد اس نے بالآخر پہلی بار چاکلیٹس کی ایک ٹرے کے ساتھ اپنا ایڈریس اور فون نمبر بھیجا تھا۔ وہ اسی شہر کا تھا۔ سلطان نے اپنی ڈائری میں وہ ایڈریس اور فون نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اسے یقین تھا بہت جلد وہ شخص اپنا نام بھی اپنے تحفے پر لکھ بھیجتا۔ آخر کوئی کب تک یوں خاموشی سے تحفے بھجوا سکتا تھا۔

اور وہ ابھی اس ایڈریس اور فون نمبر کو لکھ کر فارغ ہوا تھا جب زینی نے اس کے پاس آ کے چاکلیٹس کی ٹرے اٹھالی۔

"یہ بھی اس نے بھیجے ہیں؟" زینی نے مسکراتے ہوئے چاکلیٹ کی ٹرے کھولی۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟" سلطان نے حیرانی سے زینی کو دیکھا جو ایک چاکلیٹ اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ وہ اب دوسرا چاکلیٹ نکال کر سلطان کو دے رہی تھی۔

"ایڈریس اور فون نمبر ہے اس بار نام نہیں۔" وہ مزید بولی۔

"لیکن آپ نے بتایا نہیں آپ کو کیسے پتہ چلا؟" سلطان نے اپنا سوال دہرایا۔

"بتادوں گی۔" زینی نے ٹرے لاپروائی سے میز پر رکھ دی۔

"ایڈریس پتہ لگ گیا ہے تو شکریہ ہی ادا کر دیں۔"

"کس چیز کا؟ میں نے اس سے نہیں کہا کہ مجھے یہ سب کچھ بھیجے۔"

"زینی اب سگریٹ سلگاتے ہوئے کمرے میں چکر لگا رہی تھی۔

"لیکن جب کوئی اتنی محبت کرنے لگے تو۔" سلطان کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یک دم غصے میں کیوں آ گئی تھی۔

"میرے سامنے کبھی محبت کا نام مت لینا۔" وہ جیسے غرائی تھی۔

"میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ یہ شخص اپنے دل میں کوئی خاص گوشہ تو رکھتا ہوگا آپ کے لیے کہ اتنے تحائف بھجوا رہا ہے۔" سلطان نے گڑبڑا کر کہا۔

"ہاں، یہ مرد بھی مجھے اسکرین پر دیکھ کر مجھ پر فدا ہو گیا ہوگا۔ اس کی جیب میں بھی چار پیسے ہوں گے اور اب یہ ان تحفوں کے ذریعے میرے لیے جال بچھا رہا ہے تاکہ میں کانٹا نگلنے والی مچھلی کی طرح پھنس جاؤں۔" زینی نے تلخی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے اس کو واقعی آپ سے محبت ہو۔"

"کوئی محبت کی حقیقت کو پری زاد سے بہتر نہیں جان سکتا۔" اس نے سلطان کی بات کاٹ دی۔

سلطان نے چونک کر زینی کا چہرہ دیکھا۔

"کبھی کی ہے محبت؟"

وہ کمرے کے چکر لگاتے لگاتے رک گئی۔ بہت دیر خاموشی سے سلطان کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''محبت کی ہوتب ہی کوئی محبت سے اتنی نفرت کرتا ہے۔'' سلطان نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔ زینی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''یہ جو بازار میں ٹکے ٹکے کے مردوں کے سامنے آ کر بیٹھ گئی ہوں۔ یہ محبت کی وجہ سے ہی ہے۔''

سلطان کچھ بول نہیں سکا۔ وہ اتنے مہینوں میں پہلی بار اس کے سامنے کھل رہی تھی۔

''کون تھا وہ؟'' سلطان نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

''ایک بڑا افسر ہے۔ ایک بہت بڑے آدمی کا داماد جس کی دولت مند بیٹی کو اپنانے کے لیے اس نے زینب کے وجود کو بے مول کر دیا۔''

وہ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل رہی تھی۔ سلطان بہت دیر کچھ نہیں بولا۔

''یاد آتا ہے؟'' بہت دیر بعد اس نے زینی سے پوچھا۔

''وہ سگریٹ کے ادھ بجھے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں بار بار مسلتی رہی۔

''بہت آتا ہے۔ ہر بار جب کوئی مرد میرے قریب آتا ہے۔ ہر بار جب میں کیمرہ کے سامنے لباس کے نام پر چیتھڑے پہن کر کھڑی ہوتی ہوں ہر بار جب میں نشے میں مدہوش کسی مرد کے منہ سے جھوٹا اظہار محبت سنتی ہوں تو بہت یاد آتا ہے، مجھے بار بار یاد آتا ہے۔''

اس کے لہجے میں آگ تھی اور آنکھوں میں نمی۔

''اس نے چھوڑ دیا یا دھوکا دیا؟''

''دونوں کام کیے۔''

''کس لیے؟'' سلطان نے بے ساختہ کہا۔

زینی نے جواب نہیں دیا۔ وہ صوفے پر پڑا اپنا شولڈر بیگ کھولنے لگی پھر اس میں سے نوٹوں کی بہت سی گڈیاں نکال کر اس نے سلطان کے سامنے ٹیبل پر پھینک دیں۔

''اس کے لیے۔'' اس نے تلخی سے کہہ کر ایک اور سگریٹ سلگانا شروع کر دیا۔

سلطان نے بے حد رنج سے اسے دیکھا پھر نوٹوں کی گڈیاں سمیٹنے لگا۔ اس نے پری زاد کو کبھی اس موڈ میں نہیں دیکھا تھا۔

''کینیڈا سے کوئی پروڈیوسر پانچ کروڑ کی فلم بنا رہا ہے اس سال۔''

سلطان نے نوٹوں کی گڈیاں ایک بار پھر اس کے پرس میں رکھنی شروع کر دی تھیں۔ زینی اسی طرح سگریٹ پیتے ہوئے کمرے کے چکر لگاتی رہی۔

''ہر ہیروئن اس فلم میں کاسٹ ہونے کے لیے اپروچ کر رہی ہے۔'' سلطان نے اسے مزید بتایا۔

''کون پروڈیوسر ہے جو کینیڈا سے اپنا پانچ کروڑ ڈبونے آ رہا ہے یہاں؟'' زینی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"میں نے تو پہلے کینیڈا کے کسی پروڈیوسر کا ذکر نہیں سنا۔"

"ہاں یہ پہلی فلم ہے اس کی۔ ساری شوٹنگ بھی وہیں ہونی ہے اس کی۔" بہت بڑا ایونٹ جائے گا وہاں۔" وہ اسے بتا رہا تھا۔

"تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" زینی نے ایک دم چونک کر کہا۔

"بے وقوف ہوں اس لیے۔" سلطان جھلا کر بولا۔ "کہا بھی ہے کہ فلم انڈسٹری کی ہر ہیروئن اس فلم کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔"

"اور تم چاہتے ہو۔ میں بھی اس رائن میں لگ جاؤں۔"

"پانچ کروڑ کی فلم ہے پری جی! اگر اس میں آپ کے بجائے کوئی اور کاسٹ ہوگئی اور یہ فلم ہٹ ہوگئی تو مصیبت پڑ جائے گی آپ کو۔ اور مجھے بھی۔ کشتی ڈولنے لگے گی ہماری۔ یہ فلم آپ کو اور صرف آپ کو ملنی چاہیے۔ میں اس پروڈیوسر سے کانٹیکٹ کی کوشش کر رہا ہوں پھر آپ کی بات بھی کرواؤں گا۔" سلطان نے کہا۔

"کون ڈائریکٹ کر رہا ہے اس فلم کو؟" وہ اسی طرح کمرے میں ٹہلتے ہوئے سلطان کی بات پر غور کر رہی تھی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اسے اس فلم کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے چاہیے تھے۔

"نواز پراچہ۔" سلطان نے بتایا۔

"شکر ہے انور حبیب نہیں کر رہا۔" زینی نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"نواز پراچہ کے ساتھ تو میں پہلے ہی دو فلمیں کر رہی ہوں۔" وہ تو ویسے ہی مجھے اس فلم میں لے لے گا۔ اچھے تعلقات ہیں میرے اس کے ساتھ۔" زینی نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

"اس غلط فہمی میں مت رہیے گا پری جی!" سلطان نے اسے خبردار کیا۔

"نواز سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ اس نے کہا ہے کہ پروڈیوسر ہیروئن اپنی مرضی کی رکھے گا۔" سلطان نے بتایا تو زینی سگریٹ منہ سے نکال کر بے اختیار ہنسی۔

"اپنی مرضی کی۔" اس نے سلطان کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"فکر مت کرو سلطان! اس فلم میں میرے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔ کیا نام ہے اس پروڈیوسر کا؟"

"کرم علی!" سلطان نے اس کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔

"کرم علی۔" وہ اس کا نام دہراتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

☆☆☆

وہ اس رات سول سروسز اکیڈمی کے کسی سالانہ فنکشن میں شرکت کے لیے سعید نواز کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ شینا کو بھی اس فنکشن میں آنا تھا مگر ہمیشہ کی طرح اس نے آخری لمحات میں یہاں آنے کے بجائے کہیں اور جانا "پسند" کیا۔ وہ سعید نواز کا داماد نہ ہوتا تو شاید اسے تقریب میں آنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ وہ سینئر آفیسرز کی گیدرنگ تھی۔ وہاں جونیئر آفیسر وہی تھے جو اپنے خاندانوں کی وجہ سے وہاں موجود تھے اور سعید نواز

کبھی اسے ایسی جگہوں پر رانا نہیں بھولتا تھا اور وہ بھول بھی جاتا تو شیراز خود اسے یاد کروا دیتا۔ وہ جتنے تعلقات اور شناسائیاں ایک کیڈ رنگ سے بنا سکتا تھا۔ پورے سول میں بھی نہیں بنا پاتا۔

"میں آج صرف پری زاد کی وجہ سے آیا ہوں۔"

شیراز کے ہاتھ سے ڈرنک کا گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ وہ جس ڈنر ٹیبل پر تھا، وہیں پر کچھ آگے اس نے تقریباً اپنی ہی عمر کے لیکن اس سے ایک دو کلاس سینئر آفیسرز میں ایک کو کہتے سنا۔

چند لمحوں کے لیے اسے لگا تھا، اس کا دل اچھل کر باہر آ گیا ہے۔

"پری زاد کا وہاں کیا کام تھا؟" اس کے دل میں بے اختیار خیال آیا پھر جیسے اس نے تصحیح کی۔ "زیبی وہاں کیا کرنے آ رہی تھی؟"

"تو تمہارا کیا خیال ہے۔ میں کس لیے آیا ہوں؟ سب پری زاد کے لیے ہی آئے ہیں یہاں۔ کتنی دیر ہے اس کی پرفارمنس میں؟" دوسرے آفیسر نے جواباً کہا تھا۔

"پتہ نہیں، میں نے پروگرام چیک نہیں کیا لیکن ظاہر ہے سب سے لاسٹ ہی ہوگی۔"

شیراز نے اپنے سامنے ڈنر ٹیبل پر پڑے پروگرام کارڈ کو کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔ پری زاد کی پرفارمنس واقعی پروگرام کے اختتام پر تھی۔

"پاپا بتا رہے تھے، دس منٹ کی پرفارمنس کا دس لاکھ روپیہ دیا گیا ہے پری زاد کو۔"

وہ آفیسر کسی ایڈیشنل سیکرٹری کا بیٹا تھا۔ شیراز نے پروگرام کارڈ دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس نے پاس سے گزرتے ویٹر سے سوفٹ ڈرنک کا ایک اور گلاس لیا۔ اسے یقین تھا، اس کے چہرے پر کہیں نہ کہیں پسینے کے قطرے ضرور نمودار ہو رہے ہوں گے۔ اس کے کان ان دونوں آفیسرز کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ وہ دونوں کافی جوش و خروش کے عالم میں پری زاد کو ڈسکس کرنے میں مصروف تھے۔

یہ نہیں تھا کہ شیراز کو پتہ ہی نہیں تھا کہ زیبی کیا کر رہی تھی۔ وہ ماڈلنگ سے لے کر فلم انڈسٹری تک اس کے بارے میں ہر چیز سے واقف تھا۔ سڑکوں پر لگے بل بورڈ پر اس کا چہرہ بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں تھا۔ وہ شوبز میں اس کی مقبولیت اور اس کے اسٹارڈم سے بھی واقف تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کے لیے پری زاد کبھی نہیں بن سکی۔ وہ اب بھی اس کے لیے زینب ضیاء یا زیبی تھی۔ اس کے چچا کی بیٹی۔ اس پر جان چھڑکنے والی بے وقوف منگیتر جسے اس نے شینا کے لیے چھوڑا تھا۔

وہ اس کے لیے "سابقہ" تھی اور اس کے بیک گراؤنڈ کو جانتے ہوئے یہ بہت مشکل اور ناممکن تھا کہ وہ پری زاد سے اس طرح نفسی تیت ہوتا جس طرح دوسرے لوگ ہوتے تھے یا میڈیا ہوتا تھا لیکن آج سول سروسز اکیڈمی میں بیٹھ کر اپنے ہی جیسے آفیسرز کے منہ سے پری زاد کا نام سن کر اسے کرنٹ لگا تھا۔ کیا وہ اتنی اہم ہو گئی تھی کہ اسے سول سروسز ڈسکس کرنے لگے تھے؟ اس کو اور اس کی پرفارمنس کو دیکھنے کے لیے مرنے لگے تھے؟

اور کیا زیبی کا وقت اتنا قیمتی تھا کہ وہ اپنے کچھ منٹوں کا معاوضہ لاکھوں میں لینے لگی تھی۔ شیراز کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اور پھر اسے وہی خیال آیا تھا جو اسے سب سے پہلے آنا چاہیے تھا۔ کیا وہ وہاں اسے دیکھنے پر اسے پہچانے گی اور پہچانے گی تو کس ردعمل کا اظہار کرے گی؟

☆☆☆

وہ چیف سیکریٹری کی سبز پلیٹ والی گاڑیوں میں سے ایک سیاہ سرکاری گاڑی تھی جس کی پچھلی سیٹ پر زینی اس وقت بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر وہ آدمی بیٹھا تھا جو پروٹوکول کے طور پر اسے لینے آیا تھا۔

دو سال میں سرکاری آفیسرز کے لیے یہ پہلا فنکشن تھا جس میں وہ پرفارم کر رہی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے وہ ہر آفر ریجیکٹ کر رہی تھی۔ اسے سول سرونٹس سے نفرت تھی۔ اس کے باوجود اس نے جب سے اشتیاق رندھاوا کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کیا تھا۔ اس کا سرکاری آفیسرز سے دن رات سامنا ہوتا تھا۔ لوگ ان کو باہر سے جانتے تھے، وہ انہیں اندر سے جاننے لگی تھی۔

اس بار چیف سیکریٹری نے اس فنکشن میں پرفارمنس کے لیے اس سے رابطہ کیا تھا اور چیف سیکریٹری کیا پاکستان کا ہر چھوٹا بڑا آفیسر جانتا تھا کہ وہ اشتیاق رندھاوا کی منظورِ نظر ہے۔ کوئی دوسری ایکٹریس یا اسٹار ہوتی تو اس کو پرفارم کروانے کے لیے سول سرونٹس دوسرے حربے استعمال کرتے لیکن اس کے پیچھے اشتیاق رندھاوا کھڑا تھا۔ اس کے سامنے دانت پیسنے کے لیے نہیں، صرف مسکرانے کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔

اور پری زاد سے چیف سیکریٹری نے پہلے خود بات کی تھی۔ اس سے نیچے کے کسی آفیسر کے لیے پری زاد سے بات کرنا تو ایک طرف، اس سے رابطہ کرنا بھی دشوار تھا اور چیف سیکریٹری نے اس سے بات کرنے سے پہلے اشتیاق رندھاوا سے بات کی تھی۔

اور اب پری زاد وہاں پرفارم تو کر رہی تھی مگر اپنے منہ مانگے معاوضے پر اور پورے ''سرکاری پروٹوکول'' کے ساتھ جو اشتیاق رندھاوا کے کہنے پر اسے دیا جا رہا تھا اور جو پری زاد سے پہلے کسی ایکٹریس کو نہیں دیا گیا تھا۔

زینی نے سیل فون پر آنے والا نمبر دیکھا پھر کال ریسیو کرنے کے بجائے فون آف کر کے گاڑی کے شیشوں سے باہر دیکھا۔ بہت کچھ یک دم یاد آنے لگا تھا۔ بہت ساری کرچیاں ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی تھیں۔

وہ اکیڈمی کی طرف جاتے ہوئے اس تھڑے کے سامنے سے گزر رہی تھی، جہاں چند سال پہلے وہ شیراز سے ایک بار ملنے کے لیے آ کر بیٹھ گئی تھی۔ جہاں سے اس کا باپ اسے بچوں کی طرح روتے ہوئے واپس لے کر گیا تھا۔

گاڑی سیکنڈ سیکنڈ سے بھی کچھ کم وقت میں وہاں سے گزر گئی تھی، مگر زینی نہیں۔ سب کچھ جیسے سمندر کی ایک پلٹ کر آنے والی موج کی طرح اس پر آن گرا تھا۔ چند منٹوں کے لیے، صرف چند منٹوں کے لیے اس کا جی چاہا تھا، کوئی آج بھی اسے وہاں سے واپس لے جانے کے لیے ہوتا۔

گاڑی اب اکیڈمی کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اسے بہت دور ریسپشن پر کھڑے لوگ نظر آ رہے تھے۔ جو یقیناً صرف اسی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس وقت پہلی بار اسے خیال آیا، شیراز کا خیال کیا وہ بھی یہاں تھا؟

☆☆☆

سلائی اسکول سے باہر قدم رکھتے ہی زری نے چاروں طرف دیکھا پھر اسے جیسے مایوسی ہوئی۔

"ذلیل، کہہ رہا تھا کل پیسے لے کر آؤں گا اور آج سرے سے ہی غائب ہے۔" چند گالیاں دیتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی پھر وہ گلی کے کونے پر کھڑے بھٹے والے کی ریڑھی کے پاس چلی گئی جس کے چہرے پر زری کو اپنی طرف آتے دیکھ کر رونق آ گئی تھی۔ زری کے چہرے پر بھی بڑی خوبصورت سی مسکراہٹ تھی۔ چند لمحے پہلے کے بل اس کے ماتھے سے غائب ہو چکے تھے۔

"اگر تو یہاں ریڑھی نہ لگاتا تو میں تو اس سلائی اسکول میں آنا ہی چھوڑ دوں۔" اس نے ریڑھی پر سے مکئی کے کچھ دانے اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ریڑھی والے سے کہا۔

"اور اگر اس سلائی اسکول میں تو نہ آتی ہوتو فیقا یہاں ریڑھی لگا کر کیوں کھڑا ہو" ریڑھی والے نے بے حد محبوبانہ انداز میں اس سے کہا۔ وہ ساتھ ساتھ زری کے لیے بھٹہ تیار کر رہا تھا اور یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

زری روز اسی طرح اس کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی، کچھ دیر اس کے ساتھ معنی خیز باتیں کرتی۔ اس سے دو تین بھٹے لیتی اور پھر قیمت ادا کیے بغیر وہاں سے چلی جاتی اور وہ ریڑھی والا اس اعزاز پر اترا تا نہیں تھکتا تھا کہ اس سلائی اسکول کی سب سے خوبصورت لڑکی اس سے نہ صرف بات کرتی ہے بلکہ شاید آہستہ آہستہ اس کی محبت میں بھی گرفتار ہو رہی ہے۔ وہ بخوشی اسے ہر روز چند بھٹے مفت میں تھمانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا تھا۔

یہ اس کے نزدیک اس محبت کی قیمت تھی جو وہ زری سے کرتا تھا۔ زری نے ہمیشہ کی طرح اس سے بھٹوں کا لفافہ پکڑا، اسے ایک قاتلانہ مسکراہٹ سے نوازا اور آگے چل پڑی۔ ریڑھی والا تب تک وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا جب تک وہ گلی کا موڑ نہیں مڑ گئی پھر ایک گہرا سانس لے کر وہ کچھ اور بھٹے تیار کرنے لگا۔

گلی کا موڑ مڑتے ہی زری دودھ دہی کی دکان پر کھڑی ہو گئی۔ یہ اس کے رستے کا دوسرا اسٹاپ ہوتا تھا۔

"کچھ پینے کو ملے گا یا زری پیاسی ہی چلی جائے تمہاری دکان سے؟"

اس نے دوپٹے کے پلو کو دونوں ہاتھوں سے پنکھے کی طرح جھلتے ہوئے دکان کے تھڑے پر بیٹھے اس سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے سے کہا جس نے باپ کے مرنے کے بعد ابھی کوئی مہینہ بھر سے یہ دکان سنبھالی ہوئی تھی اور وہ آج کل خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا کہ محلے کی سب سے خوبصورت لڑکی اس کے عشق میں گرفتار ہر روز اس سے ملنے اس کی دکان پر رکتی تھی۔

اسے یہ نہیں پتہ تھا کہ یہ خوبصورت لڑکی پچھلے تین سالوں سے اس کے باپ سے لسی پینے کے لیے بھی رکتی رہی ہے اس کا باپ بھی اس خوش فہمی کو لیے قبر میں جا پہنچا تھا جو خوش فہمی اب بیٹا دل میں بسائے بیٹھا تھا۔

وہ زری کے آنے سے پہلے ہی لسی تیار کر کے رکھ دیا کرتا تھا اور پھر جیسے اس کے آنے کی گھڑیاں گنتا تھا۔ محلے کی اس دکان سے زری صرف لسی ہی نہیں پیتی تھی بلکہ اس کے گھر میں ہر روز دودھ بھی یہیں سے آتا تھا اور سال میں ایک آدھ بار کے علاوہ اس نے دودھ کی قیمت کبھی پیسوں سے

ادا نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی مسکراہٹوں، ناز و ادا اور خوبصورت آنکھوں کے ساتھ ساتھ اپنی میٹھی زبان کا استعمال کرتی تھی اور بعض دفعہ اس لڑکے کے باپ کو اپنا ہاتھ پکڑا دینے میں بھی تامل نہیں کرتی تھی۔ یہ نہ ہوتا تو اس کے گھر کا دودھ بند ہو جاتا، وہ ہر روز دودھ جیسی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

دودھ، دہی کی اس دکان سے تقریباً دو سوفٹ کے فاصلے پر اس محلے کا "ڈپارٹمنٹل اسٹور" تھا۔ چھ بائی بارہ کی اس دکان میں دالوں سے لے کر کاسمیٹکس کے سامان تک سب کچھ بکتا تھا۔ اگرچہ دالوں سے لے کر کاسمیٹکس تک ہر چیز کی کوالٹی ناقص تھی، اس کے باوجود وہ اس محلے کی مصروف ترین دکان تھی جسے 65 سالہ ایک بوڑھا چلا رہا تھا اور جس نے زری کی وجہ سے بیس سال بعد اپنے سر پر موجود چودہ بالوں کو دوبارہ سے رنگنا شروع کر دیا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس سے اس کی عمر میں کم از کم پندرہ سال کی کمی آئی تھی جبکہ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ اس سے اس کی عمر میں تقریباً دس سال کا اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پہلے سے زیادہ گھٹیا، مکار اور خبیث نظر آنے لگا تھا۔

اور زری اس رائے سے سو فیصد متفق تھی۔ البتہ اس نے زبان سے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا، وہ اس بوڑھے کو دیکھ کر مسلسل مسکراتی رہتی اور وہ دونوں مسلسل ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتے رہتے اور اس کام کے دوران زری کاؤنٹر پر بکھرے جیولری یا کاسمیٹکس کے سامان سے کچھ نہ کچھ پار کر لیا کرتی تھی۔

یہ اس سامان کے علاوہ ہوتا جو وہ بوڑھا خوش دلی سے زری کو کبھی ادھار دیتا اور کبھی مستقل طور پر دے دیا کرتا تھا۔ آج بھی اس نے زری کو جھمکوں کی ایک جوڑی تحفے میں دی تھی۔ زری کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

دکان سے اترتے ہوئے وہ جھمکے اس کے کانوں میں ہلکورے لے رہے تھے۔ زری بلاشبہ اس محلے کے تمام مردوں کی جان تھی۔ وہ جتنی بار بھی اپنے گھر سے نکلتی محلے کے مردوں کے دل کے تار چھیڑ دیتی تھی۔

اس تنگ و تاریک ٹوٹی پھوٹی گلی کے اس حصے میں ہمیشہ بہت رش ہوتا تھا، جہاں زری کا گھر تھا۔ لڑکے بغیر کسی وجہ کے اس کے گھر کے سامنے سے گزرتے پھر بار بار گزرتے اور ہر بار ان کی نظریں گھر کے دروازے کے سامنے لٹکے پھٹے ہوئے پردے سے اندر جھانکتی زری کو تلاش کرتیں جو کبھی کسی کو سامنے سے گزرتا دیکھ کر دروازے تک آ ہی جاتی تھی اور بعض دفعہ تحفوں اور رقعوں کا تبادلہ زری کے گھر کے دروازے پر ہوتا تھا۔

زری دن میں کم از کم دس سے پندرہ چکر بڑی گلی کی دکانوں کے لگاتی اور وہاں ایک ہی وقت میں بہت سے مردوں کو اپنی آنکھوں اور مسکراہٹوں سے محبت کا یقین دلاتی ہوئی گھر آتی۔ پھر اسے محلے کے کسی ایسے گھر میں کام پڑ جاتا، جہاں پر کوئی نہ کوئی ایسا لڑکا ہوتا جو اس پر کچھ خرچ کرنے کے قابل ہوتا یا اور کچھ نہیں تو اس کو کوئی تحفہ ہی دے دیتا اور جب وہ یہ راؤنڈ بھی پورا کر چکی ہوتی تو پھر وہ اپنے دروازے میں کھڑی ہو کر محلے میں آنے والے ہر سبزی اور پھلوں کی ریڑھی والے کے ساتھ کچھ میٹھی میٹھی باتیں کرنے کے بعد اس کی ریڑھی سے کچھ نہ کچھ اٹھا لیتی۔

اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ کر اس نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا۔ اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک ہتھیلی کے کونے سے رگڑی پھر پردے کو ہٹاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ پہلا قدم اندر رکھتے ہی کسی نے اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ مارا تھا۔

چند لمحوں کے لئے زری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ تھپڑ اتنا ہی زوردار تھا مگر تھپڑ سے زیادہ وہ یہ شاک تھا جس نے اسے حواس

ہ خستہ کیا تھا۔ اپنے گال پر ہاتھ رکھے اس نے اگلے ہی لمحے دوسرے بازو سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ ورنہ اس کے باپ کا اگلا تھپڑ اس کے دوسرے گال پر پڑتا۔ اس کے باپ نے اس کے چہرے کو نشانہ بنانے میں ناکام رہنے کے بعد اسے بالوں سے پکڑ لیا تھا۔

روزمرہ کے معمول کے مطابق وہ مغلظات کے ابلتے طوفان کے ساتھ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اسے سلائی اسکول سے گھر واپس آنے میں اتنی دیر کیوں لگی تھی اور زری ہمیشہ کی طرح جھوٹ پر جھوٹ بول رہی تھی۔ سچ وہ بتا نہیں سکتی تھی اور اس کے جھوٹ اس کے باپ کے لیے ناقابل یقین تھے۔ نتیجہ وہی پٹائی تھی جو اس کی ہفتے میں دو تین دفعہ ہوتی تھی۔ اور جس کی وہ بچپن سے عادی تھی۔ باپ سے اس کا تعلق گالیوں اور مار کٹائی کا تھا اور یہ رشتہ ہر گزرتے دن کے ساتھ "مضبوط" ہوتا جا رہا تھا۔

زری سات بہنیں تھیں اور وہ بہنوں میں چوتھے نمبر پر تھی۔ اس کی بڑی تینوں بہنیں شادی شدہ تھیں اور ویسی ہی زندگی گزار رہی تھیں جیسی وہ اپنے باپ کے گھر میں گزارتی تھیں۔ ان کے شوہر انہیں ویسے ہی پیٹتے تھے جیسے ان کا باپ انہیں پیٹتا تھا اور ویسے ہی ایک ایک روپے کے لیے ترساتے تھے جیسے ان کا باپ ترساتا تھا۔ اس لیے شادی نے شادی کے دو دن کے اچھے کھانے اور چند ناز نخرے اٹھائے جانے کے علاوہ ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔

شادی سے پہلے بھی باپ کے گھر وہ سلائی اور اسی طرح کے دوسرے چھوٹے موٹے کام کر کے اپنے اور گھر کے اخراجات میں مدد کرتی تھیں اور شادی کے بعد بھی ان کی زندگی کے معمولات میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود روتے سسکتے وہ اپنی زندگی سے خوش تھیں کیونکہ بالآخر وہ خود پر شادی شدہ کا لیبل لگوانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ باپ کے سر سے آہستہ آہستہ تین پہاڑوں کا بوجھ سرک گیا تھا جس نے اسے اپنے گھر کی "عورتوں" کے لیے ببول کا پیڑ بنا دیا تھا۔

دس منٹ تک اسی طرح بکتے جھکتے اور زری کو پیٹتے ہوئے اس کا باپ بالآخر ہانپنے لگا تھا۔ زری بہت ڈھیٹ تھی۔ وہ اپنی دوسری بہنوں کی طرح پٹتے ہوئے بآواز بلند روتی چلاتی یا معافیاں نہیں مانگتی تھی۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ مار کھاتی تھی اور اس کی ڈھٹائی کی وجہ سے اس کے باپ کا پارہ اور ہائی ہوتا تھا۔

"اب اگر گھر سے قدم باہر نکالا تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

اس کے باپ نے بالآخر آخری گالی دے کر اس کے بال چھوڑتے ہوئے کہا۔ یہ جملہ زری نے معمول کی طرح سنا تھا۔ اس کا باپ اسے ایک دن گھر میں بٹھا کر تین وقت کا کھانا نہیں کھلا سکتا تھا۔ کہاں یہ کہ وہ گھر بیٹھ کر مستقل اس پر بوجھ بنتی۔ وہ ایک فیکٹری میں چوکیدار تھا اور اپنی تنخواہ میں سے صرف پانچ سو روپے اپنی بیوی کو گھر چلانے کے لیے دیتا تھا۔ اگر اس نے سات بیٹیوں کے ساتھ ایک بیٹا بھی پیدا کر لیا ہوتا تو یقیناً اس رقم میں کچھ اضافہ ہو جاتا مگر فی الحال یہی کافی تھا کہ وہ پانچ سو روپے دے دیتا تھا۔ زری کی ماں خود تین گھروں میں صفائی اور برتن دھونے کا کام کرتی تھی۔ اور کچھ رقم اس کی بیٹیاں چھوٹے موٹے کاموں اور سلائی سے کما لیتی تھیں۔ مہینہ مشکل سے گزرتا تھا لیکن گزر جاتا تھا۔

زری نے باپ کے دروازے سے باہر نکلتے ہی صحن کے فرش پر پڑے وہ جھٹے اٹھائے جو وہ لے کر آئی تھی۔ دوپٹے کے کونے سے اپنے آنسو

صاف کیے جو سر کے بال بار بار کھینچے جانے کی تکلیف کی وجہ سے نکل آئے تھے۔ پھر اپنی ڈھیلی ڈھالی چٹیا کے بل کھولتے ہوئے اندر کمرے میں چلی آئی۔

اسے اندازہ تھا آج بھی بالوں کے بہت سارے گچھے اتنی زور سے اور بار بار کھینچے جانے کی وجہ سے اتر جائیں گے۔ مگر یہ بھی معمول تھا، کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کی ماں اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ باپ آج کل نائٹ شفٹ کر رہا تھا اور اس لیے دن کے وقت اکثر گھر پر ہوتا اور جب تک وہ گھر پر رہتا ہر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد اس کی کسی نہ کسی بیٹی کی شامت آئی رہتی۔

"ابا چلا گیا؟" کمرے میں اس کے داخل ہوتے ہی اس سے چھوٹی بہن گلشن نے پوچھا۔

"باہر صحن میں خاموشی ہے۔ گالیوں کی آواز نہیں آرہی تو اس کا کیا مطلب ہے؟" زری نے تلخی سے کہا۔ اور اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ کر بھٹہ کھانے لگی۔

اس کے انداز میں عجیب سی بے حسی تھی۔ اس کی باقی تینوں بہنیں بھی اپنے کاموں میں مصروف تھیں یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ جیسے اس ذلت، اور اذیت سے بے حس ہو چکی تھیں۔ یا پھر شاید بہت سی دوسری چیزوں کی طرح انہوں نے اسے بھی اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

اس نے سکون سے بیٹھ کر بھٹہ کھایا پھر دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا اور چارپائی پر اطمینان سے چت لیٹ گئی۔

"سونے لگی ہو کیا؟" گلشن نے اسے لیٹتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"یہ سونے کا وقت ہے کیا؟" زری نے چڑ کر جواب دیا۔

"تو پھر لیٹی کیوں ہو؟"

"اب تم میرے لیٹنے پر بھی پابندی لگا دو۔" زری نے اسی انداز میں کہا۔

"خالدہ دو چکر لگا کے جا چکی ہے اپنے کپڑوں کے لیے۔ بڑی ناراض ہو کر گئی تھی اس بار۔ کہہ رہی تھی کہ آئندہ وہ سلائی کرنے کے لیے کپڑے نہیں دے گی۔ تم وقت پر کپڑے نہیں دیتیں۔" گلشن نے تفصیل بتائی۔

"تو وہ وقت پر سلائی دیتی ہے؟" زری نے بھنا کر کہا۔

"سو سو نقص نکالتی ہے میرے سلے ہوئے کپڑوں میں۔ بیس بیس دفعہ ادھڑواتی ہے پھر سلائی یوں دیتی ہے۔ جیسے میری سات پشتوں پر احسان کر رہی ہو؟"

زری تلخی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی اور اپنی سلائی مشین نکالنے لگی۔ خالدہ کے تیسری بار آنے کا مطلب کیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ بہت بار اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ سلائی کے لیے آنے والے ان کپڑوں کو ان عورتوں سمیت آگ لگا دے۔ ہر دو ہفتے کے بعد اپنے جسم پر چڑھنے والی چربی کی تہوں سے بے خبر اس کے ہاتھ کی سلائی میں عیب تلاش کرتیں۔ وہ اس کے محلے کی امیر خواتین تھیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا شوہر پاکستان سے باہر دن رات پیسے کمانے کے لیے مشین بنا ہوا تھا۔

زری کو کبھی ان عورتوں پر رشک آتا تھا اور کبھی غصہ وہ جانتی تھی اس کی سلائی میں اتنی خامیاں نہیں ہوتی تھیں جتنی ان عورتوں کے دماغ میں تھیں۔ اور کئی بار اس کا دل چاہتا کہ وہ سلائی کی رقم ان کے منہ پر اسی طرح دے مارے جس طرح وہ کئی بار اس کے سلے ہوئے کپڑے پھینک کر گئی تھیں۔ لیکن کپڑوں اور پیسوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔

گلشن اور اس کی دوسری دو بہنوں نے اس کی بڑبڑاہٹ کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اس گھر میں صرف زری تھی جسے وقتاً فوقتاً اور وجہ بے وجہ بڑبڑانے کی عادت تھی اور اس کی اس بڑبڑاہٹ پر بھی اب کوئی دھیان نہیں دیتا تھا۔ جیسے سب کے لئے بے کار چیز تھی۔ اگر باتوں سے قسمت بدل سکتی تو دنیا میں ہر آدمی اپنی قسمت بدلنے پر قادر ہوتا اور چوبیس گھنٹے بولتا رہتا۔

زری حسب معمول ایک گھنٹہ سلائی مشین چلانے کے دوران مسلسل بولتی رہی تھی مگر ساتھ ساتھ اس نے خالدہ کے سوٹ کی سلائی مکمل کر لی تھی۔

جس وقت اس کی ماں گھر میں داخل ہوئی۔ زری ہمیشہ کی طرح خالدہ کا سوٹ اس کے گھر پہنچنے سے پہلے پہن کر آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ مہنگے کپڑے پہننے کا شوق اسی طرح پورا کیا کرتی تھی۔

”کتنی بار تجھ سے کہا ہے سلائی کے لیے آنے والے کپڑوں کو مت پہنا کر۔ اگر کوئی کپڑا خراب ہو گیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی ہمارے لیے۔“ اس کی ماں نے اسے جھڑکا۔

”میں کپڑے پہن کر نہیں دیکھتی اماں! دوسرے کی قسمت پہن کر دیکھتی ہوں۔ یہ دیکھو۔ یہ جوڑا مجھ پر کیسے سج رہا ہے۔ بھلا اس طرح یہ خالدہ پر جچے گا، اس کالی کلوٹی موٹی بھدی خالدہ پر؟“

”پانچ دس منٹ پہننے سے دوسرے کی قسمت اپنی نہیں ہو جاتی۔“ اس کی ماں نے حسرت سے کہا۔

”اتار دے اب یہ کپڑے۔“

”جانتی ہوں دوسرے کی قسمت اپنی نہیں ہو جاتی۔ پھر بھی بھلا کتنی قیمت ہو گی اس جوڑے کی؟“

”تجھے کپڑے کی قیمت کی کیوں پڑی رہتی ہے ہر وقت۔ تو نے کون سا خریدنا ہے؟“ اس کی ماں نے کھانے کی وہ چند چیزیں گلشن کو پکڑاتے ہوئے کہا جو وہ اس گھر سے لے کر آئی تھی جہاں وہ کام کرتی تھی۔

”کبھی تو وقت آئے گا اماں! جب میں بھی اس طرح کے کپڑے پہنا کروں گی۔“ زری نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ہر وقت خیالی پلاؤ نہ پکایا کر۔ باپ تیرا چوکیدار ہے، ماں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہے اور تو ان ہزار ہزار کے جوڑوں کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ رکھ اتار کر۔ ابھی خالدہ لینے آ گئی تو قیامت مچا دے گی۔“

اس کی ماں تھکے تھکے انداز میں چارپائی پر لیٹ گئی اور ایک بیٹی سے اپنے پاؤں دبانے کے لیے کہا۔

”میں تو تنگ آ گئی ہوں اماں! سلائی کے اس کام سے۔ ایک ایک روپے کے لیے لڑتے لڑتے۔ یہ بھی کوئی کام ہے۔ بھکاریوں سے بھی بدتر تیس چالیس روپے کے لیے ساری ساری رات لگا کر کپڑے سیئوں اور اس پر بھی سو سو باتیں سنوں۔“

زری کپڑے بدل کر واپس کمرے میں آئی تھی اور آتے ہی ماں سے خفگی کے عالم میں کہا تھا۔

"اچھا تو پھر نہ کر کام۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر بیٹھ جا۔ رئیس باپ کی اولاد ہے تو کیوں کرے گی اس طرح کے چھوٹے موٹے کام۔ ماں ہے نا تیری نازبرداری کرنے اور جوتیاں اٹھانے کے لیے۔"

زری نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اس گھر کے اکلوتے کمرے سے نکل جانا بہتر سمجھا تھا۔ اسے پتا تھا اس کی ماں اب اگلے دو گھنٹے اسی طرح بولے گی۔ اور یہ بھی امکان تھا کہ جوتا اتار کر اسے دے مارتی۔

تین گھروں میں صفائی اور برتنوں کا کام کرنے کے بعد گھر آتی تو اپنی زندگی اور گھر سے اتنی ہی بے زار اور اکتائی ہوئی لگتی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا پچھیس سال کا معمول تھا۔

زری کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی تھی۔ اور سیڑھیوں کے نیچے بنے چھوٹے سے باورچی خانے میں جا کر اس نے نگشن سے ان روٹیوں میں سے ایک روٹی اور پلیٹ میں سالن لیا جو اس کی ماں کہیں سے لے کر آئی تھی۔ اور اسے کھاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتی چھت پر آ گئی۔ اسے پتا تھا جمال اس وقت تک چھت پر آ چکا ہوگا۔ اور چھت پر پہلا قدم رکھتے ہی اس نے جمال کو دیکھ لیا تھا وہ ساتھ والے گھر کی چھت پر کھڑا تھا۔ مگر زری کے گھر کی طرف پشت کیے ہوئے تھا۔

عام طور پر وہ دونوں گھروں کی چھتوں کو ملانے والی چھوٹی دیوار پر بیٹھا ہوتا تھا، مگر اس کا زری کے گھر کی طرف پشت کر کے کھڑا ہونا۔۔ زری کے حلق میں روٹی کا لقمہ اٹکنے لگا۔ وہ آج پھر کسی بات پر ناراض تھا۔ یہ اس کے معمول میں شامل تھا۔ ہفتے میں دو یا تین بار وہ کسی نہ کسی بات پر اس سے ناراض ہوا کرتا تھا اور زری اسی طرح بوکھلاتی تھی۔ وہ واحد شخص تھا جس کی وہ پروا کرتی تھی اور جس کی ناراضی اس کے لیے کچھ معنی رکھتی تھی۔

"جمال۔۔ جمال! کیا ہوا ہے تجھے؟ اس طرح منہ موڑے کیوں کھڑا ہے؟"

زری نے روٹی پلیٹ میں رکھ کر پلیٹ منڈیر پر رکھی اور اسے پکارنے لگی۔ جمال نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ یعنی صورت حال سنگین تھی۔

زری اگلے لمحہ سوچے سمجھے بغیر دونوں چھتوں کی درمیانی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کودی اور پلک جھپکتے میں اس کے پاس پہنچ گئی۔

"میری چھت پر کیوں آئی ہے؟ چل اپنے گھر جا؟" جمال نے اس کے پاس آتے ہی بگڑ کر کہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تجھے؟ اس طرح کیوں بول رہا ہے؟" زری نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بڑی بے تابی سے کہا۔

"تجھے کیا فرق پڑتا ہے میرے اس طرح بولنے سے؟"

"کیوں فرق نہیں پڑتا؟ فرق پڑتا ہے تو پوچھ رہی ہوں۔" زری نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"تو نے اختر سے جھمکے لیے ہیں؟"

جمال نے کڑی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ چند لمحوں کے لیے زری کچھ بول نہیں سکی۔ لیکن پھر اس نے اسی انداز میں کہا۔

"میں پاگل ہوں کہ اس سے کچھ لوں۔"

''اس نے سب لڑکوں کے بیچ کھڑے ہو کر کہا ہے۔''

''اور تو نے اعتبار کر لیا؟'' زری نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ جھوٹ بولنے کے سوا اس وقت اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

''نہ کروں تو اور کیا کروں۔ سارے محلے کے لڑکے کہتے ہیں کہ وہ تجھے چیزیں دیتے ہیں اور تو ان سے فرمائشیں کرتی ہے۔''

''کبھی تجھ سے کوئی فرمائش کی میں نے؟'' زری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ جمال پہلی بار کچھ کنفیوژ ہوا۔

''نہیں پر.....''

''تو پھر تو محلے کے لڑکوں کی بات پر کیسے یقین کرتا ہے؟'' زری نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

''مجھے غصہ آتا ہے جب کوئی تیری بات کرتا ہے۔''

اس کے آنسوؤں نے یک دم جمال کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

''سب کو پتا ہے زری تجھ پر مرتی ہے، اس لیے حسد کرتے ہیں سب تجھ سے۔''

''وہ تو جانتا ہوں میں۔''

''پھر بھی لڑتا ہے مجھ سے؟''

''پیار بھی تو کرتا ہوں۔'' جمال نے پہلی بار مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن جھگڑا زیادہ کرتا ہے۔'' زری نے آنسو پونچھتے ہوئے شاکی نظروں سے دیکھا۔ اس کے آنسو ہمیشہ کی طرح کارگر ثابت ہوئے تھے۔

''اچھا اب نہیں کروں گا۔'' جمال نے جلدی سے کہا۔

''روز وعدہ کرتا ہے، روز توڑ دیتا ہے۔'' وہ ناراضی سے بولی۔

''تیری قسم، اب ایسا کچھ نہیں کروں گا۔''

''پہلے کس کی قسم کھائی تھی؟'' زری نے یاد دلایا۔

''تیری۔'' وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

''تو پھر بس رہنے دے۔ ہر بار میری قسم کھاتا ہے، وہ بھی جھوٹی۔ لگتا ہے جان سے مارے گا مجھے کسی دن۔'' زری نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ جمال کچھ کہتا ایک کوا منڈیر پر پڑی پلیٹ سے روٹی کا وہ بچا ہوا ٹکڑا اٹھا کر اڑ گیا جو زری کھاتے ہوئے آئی تھی۔

''دیکھا..... اور لڑ مجھ سے۔ تو مجھ سے لڑتا رہا اور کوا روٹی لے گیا۔'' زری نے بے حد خفگی سے منڈیر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''اب تو اس کا الزام بھی میرے سر ڈال دے۔'' جمال نے جیسے اس کا مذاق اڑایا۔

''کوے سے چھین کر لا دوں روٹی؟'' وہ اب زری کو چھیڑ رہا تھا۔

''اس کے لیے تجھے پر لگا کر اڑنا پڑے گا۔'' زری نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں۔ اڑ لوں گا۔"

"ہاں لوگ آسمان سے چاند تارے توڑ کر لاتے ہیں، تو میرے لیے روٹی توڑ کر لائے گا۔ رہنے دے، کھا لوں گی نیچے جا کر۔" زری نے منڈیر سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"میں نے اماں سے بات کی ہے۔" جمال نے اس کے پاس کھڑے ہو کر اسی کی طرح منڈیر سے ٹیک لگائی۔

"کیسی بات؟" زری ٹھٹھکی۔

"اپنی اور تیری شادی کی بات۔ وہ اس ہفتے آنا چاہتی ہے تیرے گھر۔"

"تیرا دماغ خراب ہے جمال!" زری نے بے ساختہ کہا۔

"کیوں، اس میں دماغ خراب ہونے والی کیا بات ہے؟ تجھے اعتراض کیا ہے اگر میں اپنی ماں کو تیرے گھر بھیجوں گا؟" جمال نے کچھ بگڑ کر کہا۔

"ہے اعتراض مجھے۔ ابا دو دن میں مجھے تیرے ساتھ رخصت کر دے گا۔"

زری نے سنجیدگی سے پلیٹ میں پڑا سالن انگلی سے چاٹتے ہوئے کہا۔

"تو اچھا ہی ہے نا۔ تو نہیں چاہتی کہ تو میرے گھر آ جائے؟"

"چاہتی ہوں۔ مگر اس سے پہلے یہ چاہتی ہوں کہ تو کوئی کام کر۔"

"ڈھونڈ تو رہا ہوں کام۔" جمال نے بے حد بیزاری سے کہا۔ یہ واحد موضوع تھا جس کا ذکر اسے زری کی زبان سے بھی برا لگتا تھا۔

"ایسے ڈھونڈتے ہیں کام؟ سارا سارا دن آوارہ لڑکوں کے ساتھ پھرتا ہے، پتے کھیلتا ہے۔" زری نے اسے گھر کا۔

"تو اور کیا کروں۔ کام نہیں ملتا تو وقت تو گزارنا ہے مجھے۔"

"اور اس پر تو شادی کرنا چاہتا ہے۔ بیوی اور گھر چلانے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے تیرے پاس؟"

"آ جائیں گے، پہلے بیوی تو آ جائے؟" جمال نے اسی بے فکری سے کہا۔

"میں اسی لیے شادی نہیں کرنا چاہتی ابھی۔ میں نہیں چاہتی کہ پہلے میں اپنا خرچ اٹھاتی ہوں پھر گھر کا بھی اٹھانا پڑے۔" زری نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"میں نے کب کہا کہ تو گھر کا خرچ اٹھا۔" جمال نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"کہا تو نہیں پر ہو گا ایسے ہی۔"

"مجھے تیری ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"اچھا چل، نہیں کرتی ایسی باتیں۔" زری نے جلدی سے کہا۔

"تیرا باپ تیری شادی کے لیے اتنا تیار بیٹھا ہے کہ کسی کے ساتھ بھی کر دے گا تیری شادی۔ پھر روتی رہنا مجھے یاد کر کے۔" جمال نے

جیسے اسے ڈرایا۔

"ایسے ہی کرے گا۔شادی تو میں تجھ سے ہی کروں گی جمال! پر کروں گی تب جب تو کوئی کام کرے گا میں نے اپ گلے میں کوئی اور پھندا ڈال کر نہیں بیٹھنا۔" زری نے صاف گوئی سے کہا۔

"اچھا چل چھوڑ۔کوئی اور بات کر۔" جمال کو خدشہ ہوا کہ وہ کام کے بارے میں اسے پھر کوئی لمبا لیکچر دے گی۔

"زری کو جمال اپنے باپ کی کاپی لگتا تھا مگر اس کے باوجود وہ پاگلوں کی طرح اس پر جان چھڑکتی تھی۔وہ گلی کے سولڑکوں کے ساتھ فلرٹ کرتی تھی مگر یہ صرف جمال تھا جس کے عشق میں وہ واقعی مبتلا تھی۔وہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے اور زری کی طرح جمال بھی نکما، نکھٹو سہی مگر شکل وصورت کے اعتبار سے محلے کا سب سے خوب صورت لڑکا تھا اور زری ہی کی طرح دل پھینک بھی تھا۔مگر زری کے برعکس وہ یہ کام اپنے محلے سے کچھ دور کرتا تھا۔کیونکہ وہ جانتا تھا کہ زری اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لے گی۔وہ ایسی ہی تیز تھی۔اور اس کے بعد وہ زری سے تو جاتا ہی ساتھ ہی اس مالی امداد سے بھی جاتا جو وہ وقتاً فوقتاً اس کی کرتی تھی۔

وہ زری کا ہمسایہ تھا اور پانچویں کے بعد اسکول سے بھاگ گیا تھا۔وہ اگلے پانچ سال بھی وہاں رہتا تو تعلیم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔وہ محلے میں ہونے والے چھوٹے موٹے جرائم میں بھی شریک رہتا تھا اور واقعی خوش قسمت تھا کہ ابھی تک جیل نہیں پہنچا تھا۔

اور ان تمام حرکات کے باوجود زری اس کے عشق میں پاگل تھی۔جمال کو دیکھ کر جیسے اس کی سانس چلتی تھی، اس کا دل دھڑکتا تھا اور جمال اس بات سے بخوبی واقف تھا۔نہ صرف اس کی اس کمزوری سے بلکہ اس کمزوری کو استعمال کرنے کے طریقے سے بھی۔

اسے زری کی محبت سے زیادہ محلے کی سب سے خوب صورت لڑکی کو تمغے کے طور پر اپنے سینے پر سجانے اور دنیا کی ستائش سمیٹنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔اگرچہ وہ زری سے محبت کرتا تھا مگر یہ محبت زری کی اس سے کی جانے والی محبت جتنی طاقتور نہیں تھی۔

اور جہاں تک زری کا تعلق تھا۔وہ جمال کے عشق میں پاگل ہونے کے باوجود شادی کے نام پر بری طرح بدک جاتی تھی۔جمال کے گھر میں غربت کا وہی عالم تھا جو وہ خود اپنے گھر میں دیکھ رہی تھی۔وہ ایک جہنم سے دوسرے جہنم کا قصد کم از کم اپنی مرضی سے طے نہیں کرنا چاہتی تھی اور جمال کا گھر فی الحال اس کے لیے ایک دوسرا جہنم ہی تھا۔اس کے باوجود وہ دن میں خواب دیکھنے کی عادی تھی۔ایسے خواب جن میں جمال کو وہ محنت سے کام کرتا دیکھتی اور پھر چند مہینوں اور چند سالوں میں ایک کے بعد ایک ترقی کے زینے طے کرتے دیکھتی۔پھر ایک پرآسائش گھر، ایک آرام دہ خوب صورت زندگی، ویسی زندگی جیسی وہ محلے کے ان گھروں میں دیکھتی تھی جہاں کوئی نہ کوئی مرد کمانے کے لیے بیرون ملک گیا ہوتا۔اس کا بس چلتا تو وہ جمال کو بیرون ملک بھی پہنچا دیتی مگر وہ جانتی تھی صرف یہ ایک ایسا خواب تھا جس کا حقیقت میں بدلنا مشکل تھا۔

زری اور جمال، دونوں کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ ایسا ممکن ہوسکتا اور ایسا ممکن ہو بھی جاتا تو زری کو یہ احساس تھا کہ جمال سہل پسند تھا۔وہ کبھی زندگی میں آگے بڑھنے کی جدوجہد میں اس طرح ہاتھ پاؤں نہیں مار سکتا تھا جس طرح زری اسے مارتا دیکھنا چاہتی تھی۔وہ زندگی میں چور دروازے ڈھونڈنے اور استعمال کرنے پر یقین رکھتا تھا اور اس کے اور زری کے درمیان محبت کے علاوہ یہ واحد مشترک خصوصیت تھی۔

☆☆☆

شیراز نے سانس روک کر اسے اسٹیج پر نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ اور وہ اسے پہچان نہیں پایا تھا۔ وہ جس زینی سے واقف تھا اس میں اور اس اسٹیج پر کھڑی پری زاد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ بل بورڈز اور میگزینز میں بھی کبھی نظر آنے پر اسے پہچان نہیں پاتا تھا مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اسے حقیقی زندگی میں اپنے سامنے دیکھ کر اس کے لیے اس میں زینی کی شباہت ڈھونڈنا مشکل ہو جائے گی۔

یہ اس کا چہرہ نہیں تھا جسے پہچاننے میں اسے دقت ہو رہی تھی۔ یہ کوئی اور چیز تھی جو اسٹیج پر کھڑی پری زاد کو اس کے لیے اجنبی بنا رہی تھی۔ اس کا چہرہ نہیں انداز بدل گئے تھے۔ اس نے دوپٹے اور چادر میں لپٹی جس زینی کو ساری عمر گھر میں چار دیواری میں دیکھا تھا وہ کہیں غائب ہو گئی تھی۔ یہ جو اسٹیج پر سینکڑوں مردوں کے سامنے نیم عریاں لباس میں ناچ رہی تھی، یہ کوئی اور تھی۔ شیراز کے چہرے پر خون سمٹ آیا تھا۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ وہ اسے ناچتی اچھی نہیں لگی تھی مگر وہ اس سے نظریں بھی ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ اس کے نیم عریاں جسم پر گڑی وہاں بیٹھے ہوئے مردوں کی نظریں اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھیں مگر خود اس کی نظریں بھی اس کے جسم کے خدوخال کی پیمائش میں مصروف تھیں۔

اسے اگر اسٹیج پر تھرکتا اس کا وجود اچھا نہیں لگ رہا تھا تو اس کا اٹھتا ہر قدم اور جسم کی ہر حرکت اس کے دل کی دھڑکن کو تیز بھی کر رہی تھی۔

پری زاد کو اگر پاکستان کی "Most wanted woman" کہا جا رہا تھا تو وہ اس ٹائٹل کی حقدار تھی۔ اس نے اپنی دس منٹ کی پرفارمنس میں وہاں بیٹھے مردوں کے وجود کو جیسے ڈوری سے جکڑ کر اپنی انگلیوں سے باندھ لیا تھا۔ وہ چاہتی تو سول سروسز اکیڈمی میں پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا کٹھ پتلی تماشا شروع کر سکتی تھی۔

اس رات کا پروگرام One woman show تھا۔ وہ پری زاد کی رات تھی۔ مگر وہ پرستان نہیں تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں زینی اگر آتی تو شیراز کی بیوی بن کر، اس سے دو قدم پیچھے رہ کر چلتے ہوئے آتی۔ اسے وہاں بھابھی اور بہن بن کر آنا تھا اور جو بن کر یہاں اس وقت آئی تھی، یہ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا۔ یہاں بیٹھے مردوں کی آنکھوں میں اس کے لیے جو کچھ تھا، وہ دیکھنے کے لیے وہ یہاں کبھی نہ آنا چاہتی جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کی قسمت تھی یا اس کا انتخاب۔ کوئی زینی سے پوچھتا تو وہ اسے اپنی بدقسمتی کہتی اور کوئی دنیا سے پوچھتا تو وہ اسے اس کا انتخاب کہتی۔

اسٹیج پر دس منٹ کی پرفارمنس کے دوران اس نے سامنے بیٹھے مردوں میں صرف ایک مرد کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی اور وہ شیراز اکبر تھا۔ اور وہ اسے وہاں نظر نہیں آیا تھا۔ وہ اسٹیج سے بہت دور بیٹھا تھا اور زینی اسے اتنی دور دیکھ نہیں سکتی تھی اور دیکھ بھی لیتی تو کیا ہوتا۔ وہ کیا کرتی، یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

وہ پرفارمنس کے بعد نیچے آ کر جس ٹیبل کے گرد بیٹھی تھی۔ شیراز اکبر کو اس ٹیبل کے پاس سے بھی گزرنے پر پسینہ آ جاتا۔ اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے تمام افسران میں سے کوئی بیس گریڈ سے نیچے کا نہیں تھا۔ صرف پری زاد تھی جو وہاں Wild card entry تھی جس کا کوئی گریڈ، کوئی اسٹیٹس، کوئی بیک گراؤنڈ نہیں تھا مگر وہ اس ٹیبل پر جیسے چیف گیسٹ کے طور پر موجود تھی۔ اور وہ تمام سرکاری افسر جو ماتھے پر شکنوں کے ساتھ اور سپاٹ چہرے اور سرد آواز اور انداز کے ساتھ اپنے ہر ماتحت اور اپنے پاس کام سے آنے والے افراد سے ملتے تھے۔ ان کے کلف لگے وجود اس وقت پری زاد کے لیے موم کے بن گئے تھے۔ وہ پری زاد کے لیے خوشامدی قہقہے اور مسکراہٹیں چہروں پر لیے ہوئے اس سے جاننا چاہ رہے تھے کہ وہ اس کے لیے کیا کر

سکتے ہیں۔ ہر ایک پری زاد سے ذاتی آشنائی چاہتا تھا۔ ہر ایک پری زاد کی یادداشت کا اور پھر اس کی زندگی کے کچھ لمحوں کا حصہ دار بننا چاہتا تھا۔

وہ پاکستان کے ذہین، قابل اور طاقت ور ترین گدھوں کا ایک ٹولہ تھا جو انڈسٹری کی ایک بدنام لیکن خوب صورت ترین عورت کے قدموں میں بچھنے کو تیار تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس ملک کا نظام چلانے کے لیے تیار کیے جاتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ طبقہ اشرافیہ کا فرد۔ ان میں سے ہر ایک پاکستان اور بیرون ملک کے بہترین اداروں سے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ تھا۔ ان میں سے کئی ایک سے زیادہ زبانیں بولنے میں مہارت رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے گھر میں ان ہی جیسے بڑے خاندان کی کوئی خوب صورت اور اعلیٰ اداروں سے تعلیم یافتہ عورت بیوی کے طور پر موجود تھی۔ جو سوسائٹی میں ان کے ساتھ قدم ملا کر چلتی اور لوگ اس کے شوہر کی قابلیت اور عہدے کی وجہ سے رشک کرتے۔

اور اس سب کے باوجود وہ اپنے بچوں کی عمر کے برابر لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی اور بے حد ہی تعلیم پانے والی شوبز کی اس بدنام زمانہ ہیروئن کے مداحوں اور عشاق کی فہرست میں اپنا نام چاہتے تھے جس کا حسن اور جس کی شہرت اس کی واحد کوالیفیکیشن تھی اور شوبز میں اتنے سال گزارنے کے بعد زینی جانتی تھی کہ یہ کوالیفیکیشن اس طرح کی کسی بھی عورت کے لیے بہت کافی تھی۔

وہ پندرہ منٹ اس ٹیبل پر ان سات افراد کے ساتھ بیٹھی تھی اور وہ جانتی تھی کہ وہاں موجود ہر ٹیبل پر بیٹھے مرد کی نظریں ان پندرہ منٹ کے دوران اسی ٹیبل پر لگی رہی تھیں۔ ہر ایک نے پری زاد کو اسٹیج پر دیکھا تھا۔ مگر ہر ایک پری زاد کو قریب سے بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کیسے ہنستی تھی۔ اس کی آواز کیسی تھی۔ وہ قریب سے دیکھنے میں کیسی لگتی تھی۔ ان میں سے زیادہ باہمت مرد بہانے بہانے سے اٹھ کر دو چار بار اس ٹیبل کے پاس سے ایک چکر لگا گئے تھے اگرچہ اس ٹیبل کے پاس آ کر پری زاد سے متعارف ہونے کی ہمت کسی میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

سعید نواز بھی اسی ٹیبل پر تھا اور زینی کی تعریف میں سب سے زیادہ پیش پیش بھی۔ شیراز نے بہت دور بیٹھے ہوئے بھی سعید نواز کی نظروں اور انداز کو بھانپ لیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنا سسر برا لگ رہا تھا۔

کیوں برا لگ رہا تھا؟

اور اسے صرف سعید نواز نہیں، اس وقت وہاں بیٹھا ہر وہ مرد برا لگ رہا تھا جس کی نظریں زینی پر تھیں۔ وہ پری زاد کے بارے میں کیے جانے والے تبصرے سن رہا تھا اور ان تبصروں کے ساتھ لگائے جانے والے قہقہے بھی۔ بعض پر اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بعض پر اس کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا اور بعض پر اس کو کرنٹ لگ رہا تھا۔ مگر اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے مختلف مردوں کی زبان سے پری زاد کی ''ہسٹری'' سن لی تھی۔

وہ شہر اور ملک کے کس کس مرد اور بیوروکریسی کے کس کس فرد کے ساتھ ''انوالوڈ'' رہی تھی یا انوالوڈ تھی۔ کس کس مرد نے اسے ''تحائف اور قیمت'' کے طور پر کیا کیا دیا تھا۔ کس کس کا گھر توڑنے میں پری زاد کا ہاتھ رہا تھا۔ شوبز میں اور شوبز سے باہر مرد اسے کس کس نام سے پکارتے تھے۔

وہاں بیٹھا ہر مرد پری زاد کی زندگی کے پچھلے چار سالوں کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ مگر زینب ضیاء کی زندگی کے ابتدائی بیس سالوں کے بارے میں وہاں بیٹھا ہوا صرف ایک مرد جانتا تھا جو اس کا نام بھی اپنی زبان پر لانے سے ڈرتا تھا۔ کیونکہ اسے لگتا تھا پری زاد کی زندگی کے وہ بیس سال اور اس سے اس کا تعلق اسے ڈبونے کے لیے کافی تھے۔ وہ اس کی چچا زاد تھی۔ وہ اس کی خالہ زاد تھی۔ وہ اس کی محبت تھی۔ وہ اس کی منگیتر تھی۔ اور

وہ اس کی متروکہ..... اور یہ سب اس زمانے کے قصے تھے جب وہ زینب ضیا تھی۔ ایک باحیا، بات بات پر ہنسنے رونے والی لڑکی جس نے زندگی میں شیراز کے چہرے کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے چہرے کو کبھی غور سے دیکھا نہیں تھا۔ کسی کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنا تو دور کی بات تھی۔ اس زینب ضیاء کے اندر پری زاد کہاں چھپی بیٹھی تھی اس کے اندازوں میں کہاں کوئی فاش غلطی ہوئی تھی فاش غلطی؟ یا پھر اس نے زینب کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے جو فارمولا اپلائی کیا تھا وہ غلط تھا۔

وہاں بیٹھے اسے دیکھتے ہوئے شیراز کو پہلی بار کسی غلطی کا احساس ہوا تھا اور وہاں بیٹھے اسے دیکھتے ہوئے شیراز زندگی میں پہلی بار اس کے قد و قامت سے خائف ہو رہا تھا۔ پیسے کی جس دوڑ میں اس نے زینی سے بہت پہلے دوڑنا شروع کیا تھا۔ اس میں وہ اسے فی الحال بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ شیراز نے اعتراف کیا تھا۔

"سر! آپ کو سعید نواز صاحب بلا رہے ہیں۔" ایک ویٹر نے اس کے قریب آ کر کہا۔

شیراز کو جیسے لگا کسی نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں گھونسہ دے مارا تھا۔ سعید نواز اسے کیوں بلا رہا تھا؟ اور اس وقت اس ٹیبل پر زینی کے سامنے جانا اس ٹیبل پر بیٹھے افراد کے سامنے زینی کے ذریعے پہچانا جانا

"میرے خدا!" شیراز کا دل ڈوبا۔ اس نے بے اختیار اس ٹیبل کی طرف دیکھا جہاں سعید نواز بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نے سر کے اشارے سے جیسے ویٹر کے اس بلاوے کی تصدیق کرتے ہوئے شیراز کے لیے راہ فرار اور مسدود کر دی۔ وہ جس پناہ گاہ میں چھپا بیٹھا تھا۔ اسے اس میں سے نکلنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ شیراز کو لگ رہا تھا اس کا دل اس کے جسم سے باہر آ جائے گا۔ وہ اتنی ہی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا اپنا وجود یک دم پتے کی طرح کانپنے لگا تھا۔

اسے پہلی بار روز قیامت پر یقین آیا تھا۔ کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اسے اپنی ٹانگیں جواب دیتی محسوس ہوئی تھیں۔ جیب سے رومال نکال کر اس نے سعید نواز کی ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے اپنے ماتھے پر پسینے کی بوندوں کو صاف کیا۔ گلے میں باندھی ہوئی ٹائی اب اسے پھندے کی طرح لگ رہی تھی اور اپنے کپڑے اسے پسینے سے بری طرح بھیگتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے ڈنر جیکٹ نہ پہنی ہوتی تو اس کی سفید شرٹ اس کے جسم سے چپکی صاف نظر آ جاتی۔

اس ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے اس نے آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی۔ زینی زندگی میں پہلی بار اسے کوئی بلا کوئی عفریت لگ رہی تھی۔

وہ ٹیبل سے کچھ قدم کے فاصلے پر تھا جب اس نے زینی کو اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ شاید جا رہی تھی اور شیراز اس وقت اس گول ٹیبل کی دوسری طرف تقریباً اس کے بالمقابل تھا۔ صرف ایک سیکنڈ کے لیے اس کی اور زینی کی نظریں ملی تھیں لیکن اس کی آنکھوں میں پہچان کا کوئی رنگ نہیں آیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ چیف سیکرٹری کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ کہہ کر ہنسی تھی اور اس سے اگلے لمحے میں ٹیبل کے گرد اس طرف بیٹھے ہوئے افسران اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے اور زینی کے درمیان لوگوں کی دیوار آ گئی تھی۔ زینی اب اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ شیراز نے برق رفتاری سے زینی کی ٹیبل کی طرف پشت کر لی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کے اپنی کرسیوں سے ہٹنے کی صورت میں وہ ایک بار

پھر زینی کی نظروں میں آتا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے چلی جائے۔ وہ واقعی جا رہی تھی۔ زینی نے اپنے سامنے ٹیبل کے دوسری طرف کھڑے ایک افسر سے بات کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے اپنی طرف پشت کیے کھڑے اس مرد کو دیکھا۔

پھر اس نے اپنے سامنے ٹیبل پر پڑے سوفٹ ڈرنک کے گلاس کا ایک لمبا گھونٹ لے کر گلاس دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا۔

وہ سرخ دھاریوں والی شرٹ نیلی ٹائی لگائے ہوئے تھا اور وہ ٹائی تھوڑی سی ڈھیلی تھی۔ اس کی ٹائی پر لگی ٹائی پن میں یقیناً ڈائمنڈ لگے ہوئے تھے۔ اسے یقین تھا وہ ڈائمنڈز ہوں گے۔ اس کے ڈنر جیکٹ کی کالر کی جیب میں سرخ رومال کا کچھ حصہ بے حد خوب صورت انداز میں باہر نکلا ہوا تھا۔ اسے یہ یقین نہیں تھا کہ وہ اب بھی ہیوگو باس پرفیوم استعمال کرتا ہوگا۔ چار سال دو ماہ اٹھارہ دن اور بائیس گھنٹوں کے بعد اس نے شیراز کے وجود پر صرف یہی چیزیں نہیں دیکھی تھیں۔

اس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں خود پر پڑنے والی اس کی آنکھوں کا خوف چہرے سے پھوٹتی پسینے کی دھاریں اور ہاتھ میں پکڑا اسفید رومال بھی دیکھ لیا تھا۔ جس سے وہ یقیناً اپنا پسینہ صاف کرتے ہوئے آ رہا تھا وہ اگر چیف سیکرٹری کے بازو پر ہاتھ نہ رکھتی تو لڑکھڑا جاتی۔ ایک لمحہ کے لئے اس کا وجود بری طرح سے کانپ تھا۔ اس کے بدترین خدشات ٹھیک ثابت ہوئے تھے۔ وہ وہیں موجود تھا۔ مگر وہ وہاں اس وقت اس ٹیبل کی طرف کیوں آ رہا تھا۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے لیے نہیں آیا ہوگا۔ ورنہ اس کی آنکھوں میں خوف اور چہرے پر وہ پسینہ نہ ہوتا۔ وہ پہچانے جانے سے خوفزدہ تھا۔ آج بھی اپنے اور اس کے تعلق کے آشکار ہو جانے سے شرمسار تھا۔ زینی نے اس شناخت کو کسی اور وقت کے لیے محفوظ کر لیا۔

اس کی دوسری نظر شیراز پر جب پڑی تھی تب تک وہ اس کی طرف پشت کر چکا تھا۔ وہ جانتی تھی، وہ اب اس کے چلے جانے کا منتظر تھا۔ وہ اس وقت ایسا کبوتر بنا ہوا تھا جو بلی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر کے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ بلی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ اس کی طرف پشت نہ کرتا تب بھی وہ اسے پہچاننے کی غلطی کبھی نہ کرتی۔ وہاں ٹیبل کے آس پاس کھڑے مردوں میں وہ واحد مرد تھا جو اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ اور اس نے یہ غلطی کر کے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔

چیف سیکرٹری اور چند دوسرے افسران پری زاد کو گاڑی تک چھوڑنے گئے تھے۔ زینی کو یقین تھا کہ وہ اس کی ٹیبل تک آیا تھا اور یہ صرف تب ممکن تھا جب ٹیبل پر بیٹھے کسی شخص کے ساتھ اس کا کوئی تعلق یا رشتہ ہوتا۔ اس ٹیبل پر اس کے ساتھ نو افسران بیٹھے تھے۔ زینی کو یقین تھا کہ وہ ان نو لوگوں میں سے کسی کا داماد تھا اور اس ٹیبل پر بیٹھے نو افراد میں سے تین انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ سعید نواز، شفاعت علی شاہ اور سلیم نورانی۔

گاڑی تک پہنچتے ہوئے وہ نو افراد سے تین افراد تک پہنچ چکی تھی۔ اور ان تینوں میں سے وہ کس کا رشتہ دار تھا۔ یہ جاننا اب اس کے لیے دشوار نہیں تھا۔

☆☆☆

شیراز نے یقیناً اس کے نہ پہچاننے پر خدا کا سینکڑوں دفعہ نہیں تو دسیوں بار ضرور شکر ادا کیا تھا۔ قیامت آتے آتے ٹل گئی تھی۔

مگر اس رات گھر جا کر اس نے پہلی دفعہ زینی کے بارے میں سوچا تھا۔ وہ آخر اسے پہچان کیوں نہیں سکی تھی۔ کیا اس کا چہرہ اب اس کے

لیے اتنا غیر اہم ہو گیا تھا کہ وہ چند گز کے فاصلے پر کھڑے ہو کر بھی اسے نہیں پہچان سکی تھی۔ یا پھر اس نے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کیا تھا۔ لیکن وہ پہچان کر اسے نظر انداز کیسے کر سکتی تھی۔

وہ بے چین ہو کر کمرے میں پھرتا رہا وہ جس زینی سے واقف تھا۔ وہ پروانوں کی طرح اس کے گرد گھومنے کی عادی تھی اور آج جسے دیکھ کر آیا تھا، اس کی بے اعتنائی اسے جیسے سوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔

"لیکن اس نے صرف ایک نظر ڈالی تھی مجھ پر اور اتنے عرصے کے بعد صرف ایک نظر ڈالنے پر وہ کیسے پہچان جاتی مجھے۔" شیراز نے جیسے خود کو سمجھانے کی کوشش کی پھر جیسے تصدیق کے لیے آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ہیر اسٹائل، لباس، انداز سب کچھ بدل چکا تھا۔ یہاں تک کہ صحت اور رنگت بھی پہلے کی نسبت بہت اچھی ہو چکی تھی۔ پھر ایک نظر میں زینی کیسے اسے پہچان سکتی تھی۔ شیراز نے اپنے آپ کو بہلایا۔

لیکن زینی ان تمام بہلاوؤں کے باوجود اس کے ذہن سے نہیں نکل سکی تھی۔

ایک بے عرصے کے بعد وہ اس طرح زینی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسی طرح جس طرح وہ تب سوچا کرتا تھا جب وہ اس کی زندگی کا حصہ تھی۔ اسے اس کا لباس، اس کا انداز، اس کی بے باکی کچھ بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کے باوجود اس سے مرعوب تھا۔ اسے ملنے والی اس اہمیت سے خائف ہو گیا تھا جو اس نے وہاں اپنے سینئر افسران کو اسے دیتے ہوئے دیکھی تھی۔ وہ ہر اس مرد کے بارے میں سوچ کر اس سے حسد محسوس کر رہا تھا جس کے ساتھ اس نے لوگوں کے منہ سے پری زاد کے کسی اسکینڈل کے بارے میں سنا تھا۔

چار سال میں پہلی بار اس نے شینا کے بجائے زینی کے لئے کمرے میں ٹہل ٹہل کر رات گزاری تھی۔ اسے زینی کے ساتھ گزارا ہوا ہر پل یاد آ رہا تھا۔ ہر وہ یاد جسے وہ آسائشوں اور تعیشات کے ڈھیر کے نیچے دفن کیے بیٹھا تھا۔ یک دم پتہ نہیں کیسے ایک بار پھر وہ زندہ ہو گئی تھی۔ بہت عرصے کے بعد اس رات پہلی بار اس کا دل زینی سے ملنے کو چاہا تھا۔ وہ اس کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔ سامنا کر کے وہ کیا کرنا چاہتا تھا یہ اس کے ذہن میں واضح نہیں تھا۔

شاید اس نے اس کا فیصلہ زینی کے ردعمل پر چھوڑ دیا تھا اور زینی کا ردعمل شیراز کے لیے غیر متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ بچپن سے اسے جانتا تھا۔ اس کے مزاج اور کمزوریوں کو سمجھتا تھا اور دنیا میں فی الحال وہی ایک عورت تھی جس کے بارے میں شیراز کو یقین تھا وہ ہزار غلطیاں کرنے کے باوجود جب چاہے اسے ایموشنلی بلیک میل کر سکتا تھا۔

اور وہ غلط نہیں تھا۔ اس کا زینی کے بارے میں ہر اندازہ ٹھیک تھا۔ صرف پری زاد کے بارے میں اس کا ہر اندازہ غلط تھا۔

☆☆☆

سلطان نے کمرے کی لائٹ آن کی۔

"لائٹ آف کر دو۔ مجھے اندھیرے میں رہنے دو۔"

وہ بیڈ پر چت لیٹی ہوئی بے اختیار غصے میں چلائی تھی۔

سلطان نے گھبرا کر لائٹ آف کر دی اور اس کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھتے ہوئے بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔

"کپڑے بدلے بغیر آتے ہی لیٹ گئی ہیں پری جی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

سلطان نے تشویش کے عالم میں اس کا ہاتھ پکڑ کر جیسے نبض چیک کرنے کی کوشش کی۔

"بس طبیعت ٹھیک ہے۔ باقی سب کچھ خراب ہے۔"

وہ عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے بڑبڑائی۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائی۔ پھر اس نے بیڈ ٹیبل پر پڑا سگریٹ کیس کھولا اور ایک سگریٹ نکالی۔ اس کے لائٹر اٹھانے سے پہلے سلطان نے لائٹر اٹھا لیا تھا۔

زینی نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر سلطان کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لائٹر سے سگریٹ سلگایا۔

"کیا ہوا ہے؟ مجھے نہیں بتائیں گی تو کس سے کہیں گی پری جی؟"

سلطان نے ہمدردی سے لائٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ زینی اس کی بات پر ہنس پڑی۔

"ٹھیک کہتے ہو تم تمہیں نہیں بتاؤں گی تو اور کس کو بتاؤں گی۔ اب وہ زمانہ تو نہیں رہا کہ ہر بات اللہ سے کہتی تھی میں۔"

سلطان نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سگریٹ کے کش لے رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

"آج شیراز کو دیکھا میں نے۔" اس کی آواز میں کرچیوں سی چبھن تھی۔

"کہاں؟" سلطان کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔

"جہاں گئی تھی وہیں۔"

"وہ ملا آپ سے؟" سلطان نے محتاط لہجے میں کہا۔

"ملا؟" وہ بے اختیار ہنسی۔ "مجھے دیکھ کر اس نے میری طرف پشت کرلی۔ پہچانے جانے کا خوف ہوگا اسے۔ وہ آج بھی میرا سامنا کرنے سے کترا گیا۔ اتنی شرم آئی اسے مجھ کو دیکھ کر۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے تلخی سے کہا۔

"دفع کریں پری جی۔" سلطان نے اسے جیسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"ہر چیز دفع نہیں ہوتی سلطان! ہر چیز دفع نہیں کی جاسکتی۔" وہ سگریٹ کو اب ایش ٹرے میں مسل رہی تھی۔

سلطان نے بہت بار اسے اسی حالت میں دیکھا تھا۔ جب وہ ساری ساری رات سگریٹ پیتے ہوئے کمرے میں ٹہلتی رہتی۔ سلطان کو بعض دفعہ پری زاد پہیلی کی طرح لگتی تھی جسے کوئی دوسرا سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ ایسی الجھی ہوئی ڈور تھی جس کا سرا تلاش کرتے کرتے آپ اس ڈور کو اور الجھا ہوا پاتے ہیں۔

"کس چیز کا خوف تھا اسے مجھ سے؟ کس چیز کے جانے کا خدشہ تھا اسے؟" وہ دوسرا سگریٹ نکالتے ہوئے تلخی سے کہہ رہی تھی۔

"وہ کیا سمجھتا ہے کہ میری طرف پشت کر کے کھڑا ہو جائے تو میں اسے پہچان نہیں پاؤں گی؟"

وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے ہنسی۔ سلطان نے اس کی آنکھوں کو بھیگتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک بار پھر دھواں اڑانے لگی تھی۔

"کیوں یاد کر رہی ہیں اسے؟ بھول جائیں سب کچھ ... وہ آپ کے قابل نہیں تھا پری جی ..."

سلطان نے اسے دلاسہ دینا شروع کر دیا تھا۔ زینی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ سگریٹ کے کش لیتی رہی۔ اس کی خاموشی سے سلطان کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اس کی خاموشی جیسے خطرے کا الارم ہوتی تھی اس کے لیے۔ وہ جب تک بولتی رہتی سلطان کو فکر نہیں ہوتی تھی مگر جب اس طرح چپ ہوتی تو ...

"پراچہ نے آج فون کیا تھا۔" سلطان نے جیسے اس کی سوچ کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے کش لگاتے لگاتے رک کر اسے دیکھا۔

"کہہ رہا تھا کینیڈا والی فلم کا پروڈیوسر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہاں کینیڈا بلانا چاہتا ہے آپ کو، چند ہفتوں کے لیے۔"

"اور کس کس کو بلا رہا ہے وہاں وہ؟" زینی نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

"ابھی تو آپ ہی کو بلا رہا ہے وہ۔ آپ پسند نہ آئیں تو پھر کسی دوسری ہیروئن کو بلوائے گا، وہ پراچہ کہہ رہا تھا۔" سلطان نے اسے بتایا۔

"بڑی تعریف کر رہا تھا وہ کرم علی کی۔ کہہ رہا تھا فن اور فنکار کا صحیح مداح ہے وہ آدمی۔"

"فن اور فنکار ...؟" وہ زہریلے انداز میں ہنسی۔ ادھ جلا سگریٹ ایش ٹرے میں پھینکتے ہوئے وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے بیڈ روم میں رکھے ریفریجریٹر سے بیئر کا کین نکالتے ہوئے اس نے کہا۔

"مداح اور پرستار ہونے کے لیے اس فنکار کا عورت ہونا ضروری ہے۔ فن اور فنکار۔" وہ بیئر کے گھونٹ لیتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"یہ کرم علی نام کا مداح ساری عمر وہاں کینیڈا میں کتوں کی طرح کام کر کے پیسہ جوڑتا رہا ہوگا۔ ساری جوانی اس نے پائی پائی جوڑنے میں لگائی ہوگی اور اب جب چار پیسے اس بڑھاپے میں اس کے پاس اکٹھے ہو گئے ہوں گے تو اسے پاکستان کا فن اور فنکار نظر آنے لگے ... اور فنکار کو سراہنے کے لیے یہ تو بہت ضروری ہے نا کہ اسے بلوا کر کینیڈا میں اپنے گھر پر بلکہ اپنے بیڈ روم میں رکھ جائے اور اپنے ہی قماش کے "جانوروں" میں بڑے فخر سے اس کی نمائش کی جائے کہ دیکھو جیسے میں ارمانی، ورساچی اور گوچی کی چیزیں خرید کر اپنے گھر لا سکتا ہوں اسی طرح میں انڈسٹری کی ایک بڑی ہیروئن کو بھی اپنے گھر پر منگوا سکتا ہوں ... تم میں سے کوئی منگوا سکتا ہے؟ نہیں نا؟"

وہ بیئر کے گھونٹ لیتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔ سلطان کو چند لمحوں کے لیے لگا جیسے اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں تھا۔

"اور بڑھاپے میں اپنی ساری احساس کمتری اور احساس محرومیوں سے نجات حاصل کرنے کا اس سے اچھا طریقہ کیا ہو سکتا ہے کہ فلم انڈسٹری کی سب سے مقبول اور سب سے خوب صورت ہیروئن کو گلے میں ڈالنے والے مفلر کی طرح خرید کر اپنے گلے میں کچھ دیر کے لیے ڈال لیا جائے تاکہ ساری دنیا آپ پر رشک کرے کہ کوئی تو بات ہوگی نا آپ میں کہ وہ اتنی مشہور اور اتنی خوب صورت ہیروئن آپ پر مر رہی ہے ... یہی سب کچھ جا کر کرنا ہے نا مجھے کینیڈا میں ... تاکہ مرنے سے پہلے وہ بڈھا زمین پر اپنی بنائی ہوئی جنت میں کسی حور کے ساتھ رہ سکے۔"

وہ اب بیئر کا دوسرا کین نکال رہی تھی۔

"اور اس کے بدلے وہ مجھے دے گا ایک عدد فلم ... زیورات، تحائف، سیر و تفریح کے ڈھیروں مواقع اور ڈھیر سارا پیسہ ... تو سودا کوئی

برا تو نہیں، میرا آخر کیا جاتا ہے۔ اسے میری محبت تھوڑی چاہیے اسے میرا دل تھوڑی چاہیے؟ اسے تو میرا وقت چاہیے۔ میرا جسم چاہیے — فن اور فنکار ....اور مداح۔"

فریج سے بیئر کا تیسرا کین نکالا۔

سلطان کا دل چاہا، وہ اٹھ کر اسے روک دے۔ مگر اس میں ہمت نہیں تھی۔

"اور یہ سارے مداح وہ ہوتے ہیں جن کی بیویاں اپنے شوہروں کی پارسائی کی قسم کھا رہی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کے نیک، پاک باز شوہر ہر سال لاکھوں روپیہ خیرات میں دیتے ہیں کئی غریب لڑکیوں کی شادی کے لیے جہیز کا سامان دیتے ہیں اور یہ ساری خاندانی عورتیں ٹی وی اور فلم کی اسکرین پر میرے جیسی عورتوں کو دیکھ کر یا ان پر ہنستی ہیں یا تھوکتی ہیں اپنے ان ہی شوہروں کے پاس بیٹھ کر۔ یہ جانے بغیر کہ ہم چاہیں تو ان کے شوہر ہمارے تلوے بھی چاٹتے پھریں۔"

وہ کیا کہہ رہی تھی؟ کیوں کہہ رہی تھی یہ نہ سلطان کی سمجھ میں آ رہا تھا نہ خود زینی کو۔ مگر یہ سب کچھ شراب کے نشے کی وجہ سے نہیں ہو رہا تھا۔ اسے آج کچھ اور ہو گیا تھا۔

"اور مت پیئیں۔" سلطان نے اسے بیئر کا چوتھا کین نکالتے دیکھ کر بالآخر ٹوکا۔

"اور تم جانتے ہو کہ مجھے ہر قیمت پر یہ فلم ملنی چاہیے۔ چاہے مجھے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔" وہ چوتھا کین کھول کر اب سلطان پر برسنے لگی تھی۔

"کیونکہ یہ بڑی فلم ہے۔ ایک سپر ہٹ فلم ضروری ہے تاکہ تم ایک کامیاب ہیروئن کے سیکرٹری بنے رہو۔ تمہیں پیسہ ملتا رہے انڈسٹری کے لوگ تمہیں اپنے سر پر بٹھائے رکھیں۔ میں مارکیٹ سے آؤٹ ہو جاؤں گی تو تم مارکیٹ سے آؤٹ ہو جاؤ گے۔"

سلطان ہکا بکا رہ گیا۔ یہ سب باتیں اس کے لیے نئی نہیں تھیں۔ وہ جس ہیروئن کے ساتھ بھی کام کرتا رہا اس سے یہ سب کچھ سنتا رہا تھا مگر زینی کے منہ سے آج وہ یہ سب کچھ پہلی بار سن رہا تھا۔ اسے ان ہیروئنوں کے منہ سے بھی وہ سب کچھ سن کر دکھ ہوا تھا اسے زینی کی زبان سے بھی یہ سب کچھ سن کر تکلیف ہو رہی تھی۔

زینی اب فریج سے پانچواں کین نکال رہی تھی۔

"اس طرح کی باتیں کیوں کر رہی ہیں پری جی؟"

سلطان کو بے اختیار رونا آیا۔ کسی نے زینی کے اندر جلتی ہوئی آگ پر جیسے پانی کا چھینٹا مارا تھا۔ کین کھولتے کھولتے وہ رک گئی۔

واقعی وہ اس طرح کیوں کر رہی تھی، اسے کیا ہو رہا تھا؟ اس نے جیسے اپنے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ہر وجہ، ہر راستہ ہر سراغ جیسے ایک آدمی کے وجود پر آ کر ختم ہو گیا تھا۔

"تم جاؤ سلطان! یہاں سے۔"

اس نے ہچکیوں سے روتے ہوئے سلطان سے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ اس سب میں اس کا قصور نہیں تھا۔ اس سب میں صرف اس کا اپنا قصور تھا۔ سلطان کچھ کہے بغیر روتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

وہ کین پکڑ کر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی... ریفریجریٹر میں پڑا یہ آخری کین تھا اور رات ختم ہونے میں ابھی کئی گھنٹے تھے۔ سول سروسز اکیڈمی ایک بار پھر اس کے سامنے تھی اور وہ اسی طرح منہ موڑے کھڑا تھا۔ ہتک سی ہتک تھی۔

اس نے بیئر پیتے ہوئے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ غصہ اب رنج میں بدلنے لگا تھا۔ بادل اب گڑگڑانے کے بعد برسنے لگے تھے۔ اسے اس وقت وہاں بیٹھے اب شیراز کا خیال نہیں آ رہا تھا۔ اس خوش قسمت لڑکی کا خیال آ رہا تھا جو اس کی بیوی تھی۔ جو مسز شیراز اکبر تھی۔ جو اس محفل میں بھی اور بہن کے نام سے پکاری جا رہی ہوگی جہاں وہ پری زاد تھی۔

"بیوی تھی تو بچہ ہوگا... یا ہوں گے ایک پرفیکٹ فیملی جس میں اس کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی وہ اس کی طرف منہ موڑ کر نہ کھڑا ہوتا تو آخر کیا کرتا۔

زینب ضیاء آخر اس کی تھی کون، ایک مسترد کی گئی منگیتر۔ اس نے آخر اس پر ایسی کون سی قیامت توڑ دی تھی وہاں اس سے چھپ کر... وہ کیا چاہتی تھی وہ آ کر اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتا وہ اب اس کو Justify کرنے لگی تھی۔

اس نے کین اور سگریٹ بجھاتے ہوئے میز پر رکھ دیے... زندگی اس طرح کیسے ہو جاتی ہے جیسے اس کی ہو گئی تھی۔ لگتا تھا وہ کسی بھیانک خواب سے گزر رہی ہے۔ کسی طویل خواب سے بس فرق یہ تھا کہ یہ خواب وہ جاگتے میں دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

کرم علی نے زینی کو پہلی بار دبئی میں کیٹ واک کرتے ہوئے اس شو میں دیکھا تھا جو زینی کا بیرون ملک پہلا شو تھا... اور وہ اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکا تھا۔ وہ حیرت انگیز حد تک عارفہ سے مشابہت رکھتی تھی اور اسے دیکھ کر کرم کو پہلا خیال عارفہ کا ہی آیا تھا۔

زینی اگر اس رات شیراز کی شادی کے بارے میں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی تو کرم علی اسے دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا... وہاں ریمپ پر اسے دیکھ کر عارفہ نام کا جو باب وہ بند کر آیا تھا کئی سالوں بعد وہ ایک بار پھر کھل گیا تھا زخم ایک بار پھر ادھڑنے لگے تھے۔

زینی جتنی دیر تک ریمپ پر رہی کرم علی جیسے کسی ٹرانس میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ زندگی میں پہلی بار کوئی فیشن شو دیکھ رہا تھا۔ زینی کے بیک اسٹیج جاتے ہی وہ بے تابی سے اس کے پیچھے وہاں گیا تھا۔ وہ زینی سے ملنا چاہتا تھا اس سے تعارف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر زینی اس وقت وہاں جو کچھ کر رہی تھی اور جس ذہنی کیفیت میں نظر آ رہی تھی۔ کرم کے لیے اس حالت میں اس کی طرف کوئی پیش قدمی کرنا بے حد مشکل تھا۔ واحد چیز جو وہاں اس کے بارے میں جان پایا تھا وہ اس کے دو نام تھے۔ زینی اور پری زاد۔

اسے اس رات وہاں سے واپس کینیڈا چلے جانا تھا اور وہ جانے سے پہلے ایک بار زینی سے ملنا چاہتا تھا مگر وہ اس کوشش میں بھی ناکام ہو رہا تھا۔ البتہ اس نے زینی کو ایک بار پھر ہوٹل کی لابی میں بے حد ابتر ذہنی کیفیت کے ساتھ چکر کاٹتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس وقت سگریٹ پی رہی تھی اور

بے حد اپ سیٹ تھی۔ وہ جانتا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں تھی۔ یہ بھی پوچھنا کرم کے لیے مشکل نہیں تھا۔

مگر اسے پریشانی کیا تھی؟

یہ واحد سوال تھا جس کے جواب میں اسے دلچسپی تھی۔ وہ زینی کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ ہر طرح کی مدد اور اسی لیے اس نے ہوٹل سے چیک آؤٹ کرتے ہوئے کسی موہوم سی امید میں زینی کے لیے ریسپشن پر اپنا وزیٹنگ کارڈ چھوڑا۔

موہوم سی امید امید ہی رہی تھی۔ اگلے کئی ہفتے بے تابی سے انتظار کرنے کے باوجود زینی نے اس سے کوئی کانٹیکٹ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس چیز نے کرم کے حوصلے کو پست نہیں کیا تھا۔

پری زاد کے بارے میں تب تک میڈیا میں بہت کچھ نہیں لکھا جا رہا تھا مگر جو کچھ لکھا جا رہا تھا۔ وہ کرم کی نظروں سے گزر رہا تھا۔ یہ صرف پری زاد تھی جس کی وجہ سے اس نے شوبز میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ زینی کے بارے میں کسی میگزین میں کچھ شائع ہوتا اور کرم علی اسے حاصل نہ کرتا۔

شروع میں وہ اس کے لیے عارفہ کا ہی ایک تسلسل تھی مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا تھا۔ وہ اس کے لیے عارفہ سے ہٹ کر بھی ایک وجود ایک اہمیت رکھنے لگی تھی۔ وہ ان دنوں طوفانی رفتار سے شہرت کے زینے چڑھ رہی تھی اور اس کی بڑھتی ہوئی شہرت نے کرم کو کسی حد تک خائف کر دیا تھا۔ اس کا ایڈریس حاصل کرنے کے باوجود وہ اس سے رابطہ کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا۔ زینی اس رابطے کو کیا مفہوم دے گی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا تھا کرم کے دل میں اس سے ملنے، اس سے بات کرنے کی خواہش بڑھتی گئی تھی اور اس سے ملنے اور اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس نے وہی حربہ استعمال کیا تھا جو پری زاد جیسی ہیروئن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی آدمی کرتا۔ فلم پروڈیوس کرنے میں اس کی دلچسپی زیرو تھی۔ اور اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ وہ اتنے بڑے بجٹ کی فلم پر اپنا پیسہ ضائع کرے گا۔ کسی تجربہ اور ذاتی دلچسپی کے بغیر۔

اس نے فلم کا ڈائریکٹر منتخب کرتے ہوئے اسے صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ وہ اس فلم میں کس کو کاسٹ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ پری زاد سے ملنے کی خواہش رکھتا تھا، اور کرم علی کو اندازہ بھی نہیں ہوا تھا کہ انڈسٹری کے ان بڑے ڈائریکٹرز میں سے ایک نے اس کی اس خواہش اس فلم اور پری زاد سے ملنے کے حوالے سے اس کے بارے میں وہی رائے بنائی تھی جو کوئی بھی بنا سکتا تھا اور اس رائے نے پراچہ کو بالکل اسی انداز میں زینی سے رابطے پر مجبور کیا تھا جس طرح ایسے کام کے لیے ڈائریکٹر کسی ہیروئن کو کسی پروڈیوسر سے ملنے کے لیے تیار کرتا۔

☆☆☆

"سلمان کو کسی سے کہہ کر امریکہ بھجوا دو زینی!"

وہ اس صبح شوٹنگ کے لیے نکلنے سے پہلے ناشتے کی ٹیبل پر تھی جب نفیسہ نے اس سے کہا۔

زینی ناشتہ کرتے کرتے رک گئی۔ "کیوں؟ امریکہ کس لیے؟ وہ پڑھ رہا ہے یہاں۔ یہ بیٹھے بٹھائے آپ کو اسے باہر بھجوانے کی کیا دھن

سوار ہو گئی ہے؟"

"وہ بڑا پریشان رہتا ہے آج کل۔" نفیسہ نے کہا۔

"کیوں؟"

"وہاں امریکہ میں کچھ دوست ہیں اس کے۔ کہہ رہا تھا کسی طرح وہاں پہنچ جائے تو پھر کچھ نہ کچھ کرلے گا وہاں..... میں نے کہا میں زینی سے بات کر کے بتاؤں گی۔"

"آپ نے بتایا نہیں وہ پریشان کیوں ہے؟" زینی نے ماں کی بات کاٹ دی تھی۔

"تم کو پتہ ہے زینی۔" نفیسہ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"مجھے پتہ ہوتا تو میں آپ سے کیوں پوچھتی۔ مجھے نہیں پتا اسی لیے پوچھ رہی ہوں۔"

"تمہاری وجہ سے پریشان رہتا ہے۔ پرسوں بھی کالج میں لڑکوں کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہاں کالج میں لڑکے تمہاری وجہ سے باتیں کرتے ہیں اسے..... پرسوں بھی کچھ لڑکوں نے تمہاری کچھ خراب تصویریں کالج کی دیواروں پر لگا دیں۔ سلمان لڑ پڑا پھر گھر آ کر کمرے میں بند ہو گیا دو دن کچھ کھایا نہیں اس نے، ہر دوسرے تیسرے ہفتے یہی ہوتا ہے۔ مجھے تو اب سلمان سے ڈر لگنے لگا ہے۔ وہ بھی کیا کرے لوگوں سے کہاں تک چھپتا پھرے کہ تم اس کی بہن ہو حالانکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ غصہ کرنے یا لڑنے کے بجائے تم صاف مکر جایا کرو تمہارے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

نفیسہ کی سادگی میں کہی ہوئی بات اسے خنجر کی طرح چبھی تھی۔ نفیسہ نے زینی کے فق ہوتے ہوئے چہرے کو نہیں دیکھا وہ سلمان کے بارے میں پریشان بولتی رہیں۔

"کئی بار اس نے جھوٹ بولا۔ پر پرانے محلے کے بہت سارے لڑکے اسی کالج میں ہیں، سب نے وہاں تمہارے بارے میں سب کچھ بتایا ہوا ہے۔ ربیعہ نے تو چلو یونیورسٹی میں ہر ایک سے تمہیں چھپا لیا ہے۔ لیکن سلمان بے چارہ کیا کرے۔ پہلے وہ چھوٹا تھا۔ اتنی سمجھ نہیں تھی اُسے۔ لیکن اب تو ہر بات کی سمجھ ہے اسے زینی! لڑکے کہاں برداشت کرتے ہیں۔ بہنوں کے بارے میں ایسی باتیں۔"

"تم نے ناشتہ کیوں چھوڑ دیا؟" نفیسہ نے اچانک بات کرتے کرتے پہلی بار اس کی پلیٹ کو دیکھا۔

"بھوک نہیں ہے۔" وہ ٹیبل سے اٹھ گئی۔ وہ ربیعہ اور سلمان سے کتنے فاصلے پر چلی گئی تھی۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا۔ ان سالوں میں ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی اس کا ان کے ساتھ سامنا کئی کئی ہفتوں کے بعد ہوتا تھا اور وہ بھی بے حد رسمی اور سرسری۔ یہ وہ بہن بھائی تھے جن کے ساتھ وہ اپنے پرانے چھوٹے گھر میں بیٹھ کر روزانہ گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی..... اور اب اس بڑے گھر میں اسے ان دونوں کی شکلیں دیکھنا بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ وہ عجیب زندگی جی رہی تھی..... اور اس کا خیال تھا کہ اس کی زندگی نے کم از کم اب اس کے علاوہ کسی اور کے لیے کوئی مسئلے پیدا نہیں کرنے تھے۔

وہ غلط تھی، ایک بڑا گھر، پرآسائش زندگی اور بے پناہ دولت بھی اس کے اور اس کی فیملی کے ماتھے پر "عزت دار" کا وہ لیبل نہیں لگا سکے تھے جو

پہلے لگا ہوا تھا۔ جب عزت تھی تو معاشرہ انہیں دولت کے حوالے سے تنگ کر رہا تھا۔ اب دولت تھی تو معاشرہ ان سے باعزت ہونے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

وہ ان چار سالوں میں بہت کم اس طرح کسی کی باتیں سن کر چپ ہوئی تھی، جس طرح آج نفیسہ کی باتوں نے اسے چپ کروا دیا تھا۔ اس کی اپنی ماں نے کتنی آسانی کے ساتھ اس کے بہن بھائی کو اس سے اپنا رشتہ چھپا دینے کے لیے کہہ دیا تھا۔

اس کی فراہم کی گئی آسائشیں ان سب کی ضرورت تھیں مگر خود اس کا وجود ان کے لیے رسوائی کا سبب تھا۔ اور اس وجود کے ساتھ ہونے والی شناخت ان میں سے کسی کے لیے بھی ضروری نہیں تھی۔

زندگی کا ہر نیا دن زینب ضیاء کو ایک نیا سبق سکھا رہا تھا۔ وہ سبق جو اسے کوئی اور نہیں سکھا پایا تھا۔

پیسہ اس سے اپنے ہونے کی قیمت وصول کر رہا تھا اور یہ قیمت، ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

لیموزین سے پہلا قدم اتارتے ہی زینی نے اس گھر کے حدود اربعہ پر نظر ڈالی تھی جس کی ڈرائیو وے کے ذریعے وہ ابھی چند منٹ پہلے گاڑی پر وہاں پہنچی تھی۔ وہ پاکستان اور دبئی میں جن لوگوں کے گھروں پر جاتی رہی تھی، ان کے مقابلے میں یہ گھر کچھ بھی نہیں تھا مگر یہ گھر کینیڈا میں تھا اور یہاں اتنے بڑے گھر کا مطلب کیا تھا، یہ زینی سمجھ سکتی تھی۔ جو آدمی پانچ کروڑ ڈبو رہا تھا، اس کا گھر ایسا تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

ایک مڈل ایجڈ ہاؤس کیپر عورت نے آگے بڑھ کر اسے خوش دلی سے ریسیو کیا۔ زینی اس کے ساتھ چلتے ہوئے گھر کے اندر آ گئی تھی۔

"کرم علی صاحب کو یک دم کوئی کام پڑ گیا، اس لیے وہ خود آپ کو ریسیو کرنے یہاں نہیں آ سکے لیکن وہ ابھی تھوڑی دیر میں آ رہے ہیں، راستے میں ہیں۔"

اس پاکستانی عورت نے ایک کمرے میں اسے بٹھاتے ہوئے چائے کافی کے لیے پوچھا۔

"فی الحال کچھ نہیں۔" زینی نے کہا۔

"اس عورت کے جانے کے بعد اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک بہت خوبصورتی سے آراستہ کمرے میں ایک طرف بار بھی تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے اس آرام دہ صوفے پر بیٹھی رہی۔ کینیڈا آئے یہ اس کا دوسرا دن تھا اور ابھی تک کرم کے ساتھ اس کی فون پر بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ صرف اس کے پی اے نے اسے اور سلطان کو ائیر پورٹ پر ریسیو کرنے کے بعد اوٹاوا کے فائیو اسٹار ہوٹل میں انہیں ٹھہرایا تھا۔

زینی کا پہلا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا، وہ ائیر پورٹ پر اسے خود ریسیو کرنے آیا تھا، نہ ہی اس نے اسے اپنے گھر یا کسی اپارٹمنٹ میں ٹھہرایا تھا۔

پی اے نے اس وقت بھی کرم علی کے بارے میں یہی کہا تھا کہ وہ کسی کام میں مصروف ہے۔ اس لیے خود اسے لینے نہیں آ سکا۔ پھر اس کا پی اے ہی وقفے وقفے سے سلطان کو فون کر کے زینی کی خیریت دریافت کرتا رہا اور مختلف معاملات اور شیڈول کے حوالے سے کوآرڈینیٹ کرتا رہا۔

کرم علی نے وہاں پہنچنے کے بعد پہلی رات ذاتی طور پر کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ زینی کا دوسرا اندازہ بھی غلط ثابت ہوا تھا۔ زینی کچھ جزبز ہوئی

تھی۔ وہ مصروف تھا۔ اسے اس پر یقین نہیں تھا، وہ اتنا مصروف ہوتا تو اسے وہاں کیوں بلواتا اور اب بلوالیا تھا تو ہر بار پی اے کے ذریعے مصروفیت جتانے کا کیا مطلب تھا۔ وہ پاکستان میں کرم علی سے زیادہ ''مصروف'' مردوں کے پاس جاتی رہی تھی، جو اس کے بے دیدہ و دل فرش راہ کیے بیٹھے ہوتے تھے۔ اپنے سب کام چھوڑ کر، ہر مصروفیت کو ترک کر کے۔ اور یہ ایک ایسا مرد تھا جو اسے وہاں بلوا کر یہ جتا رہا تھا کہ اس کا وقت، اس کا کام اور اس کی زندگی تو بہت اہمیت کی حامل تھی لیکن خود زینی اس کے نزدیک کوئی بے کار شے تھی جسے اس نے آرڈر کر کے منگوا تو لیا تھا لیکن استعمال کرنے کے لیے اسے اپنے مصروف شیڈول سے وقت نہیں مل رہا تھا۔ کرم علی کے خلاف زینی کے دل میں زہر بھرنے لگا تھا۔ اسے وہاں آ کر ہتک کا احساس ہو رہا تھا اور اس نے سلطان سے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔

اور اب یہاں دوسرے دن لنچ پر اس کا استقبال بھی تقریباً اسی انداز میں ہوا تھا۔ ایک پاکستانی ہاؤس کیپر اور کرم علی کی مصروفیت کا بہانہ۔ زینی کو یقین تھا، وہ اس سٹنگ روم میں اسے گھنٹوں انتظار کروائے گا۔

وہ صوفے سے اٹھ کر فرنچ ونڈوز کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی سے باہر نظر آنے والے منظر نے کچھ دیر کے لیے اسے جیسے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ گھر کے اردگرد وسیع اور خوبصورت لان تھا جس نے بھی اس کی لینڈ اسکیپنگ کی تھی، اس نے کمال کی لینڈ اسکیپنگ کی تھی۔

وہ دور کہیں لگے فوارے سے گرتے ہوئے پانی کو دیکھتی رہی۔ قد آدم فرنچ ونڈوز کے سامنے کھڑے اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ دیر کے لیے لان کے بیچ میں جا کھڑی ہوئی ہے۔ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کتنے سالوں کے بعد صرف یوں سبزے کو دیکھنے کے لیے کھڑی ہوئی ہے۔ چند لمحوں کے لیے وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ کس کے گھر میں کس لیے کھڑی ہے۔ چند لمحوں کے لیے وہ پری زاد کو بھی بھول گئی تھی۔

اور پھر اس نے اچانک اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی تھی۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ کرم علی اور اس کا پہلا آمنا سامنا ہوا تھا وہ ابھی ابھی کھلے دروازے سے اندر آیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے زینی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔

اسے یقین نہیں تھا کہ وہ کرم علی تھا یا کرم علی کا بھیجا ہوا کوئی آدمی، کسی اور بہانے کے ساتھ

''السلام علیکم۔ میں کرم علی ہوں۔ سوری آپ کو انتظار کرنا پڑا۔''

کرم علی نے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اس سے کہا۔ زینی کے کچھ اور اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ اس نے اسے گھنٹوں انتظار نہیں کروایا تھا۔ نہ وہ عمر رسیدہ تھا نہ ہی اس کے چہرے پر وہ خباثت نظر آ رہی تھی جو وہ اس سے پہلے اس طرح کے تمام مردوں کے چہروں پر دیکھتی آئی تھی۔ وہ چھتیس سینتیس سال کا ایک عام شکل و صورت کا لیکن بے حد شریف اور مہذب نظر آنے والا مرد تھا۔ ایک برانڈڈ آفس سوٹ میں ملبوس اس وقت کرم علی کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی مشکل وقت دیکھا تھا۔

اس کے مصافحہ کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر زینی پہلی بار کنفیوز ہوئی۔ پہلی بار اس طرح کے کسی مرد نے اس سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ ایک نظر کرم علی کے چہرے پر ڈالتے ہوئے اس نے ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کرم علی سے ہاتھ ملا لیا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' زینی نے ہمیشہ ہر ایک سے کہا جانے والا جملہ اس سے بھی دہرایا۔

"لیکن مجھ سے زیادہ خوشی نہیں ہوگی آپ کو۔" کرم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پلیز بیٹھیں۔" اس نے زینی سے کہا اور بار کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"آپ کیا پئیں گی؟"

"جو آپ پلائیں گے۔" زینی نے بے ساختہ کہا۔ (یہاں پینے پلانے ہی تو آئی ہوں میں۔)

کرم علی اب بار کی دوسری طرف پہنچ گیا تھا۔ زینی دوبارہ کھڑکی کی طرف چلی آئی۔

"آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے۔"

کرم علی نے ڈرنک تیار کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آپ کو خوبصورت لگا تو واقعی خوبصورت ہوگا۔"

"کب سے ہیں یہاں پر؟"

"دس گیارہ سال سے۔"

"بہت لمبا عرصہ ہے۔"

"اب نہیں لگتا۔"

"اور آپ کی فیملی؟"

"وہ بھی سب یہیں ہیں۔ میرے ساتھ اس گھر میں نہیں رہتے، لیکن اس شہر میں ہیں۔ میرے والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ بہن بھائی ہیں، ماں ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتی ہیں۔" کرم علی بتا رہا تھا۔

"آپ کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟" زینی نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"میرے ساتھ رہ کر کیا کریں گی؟ اس اکیلے گھر میں سارا دن اکیلے بیٹھ کر۔ میں تو صبح کا گیا رات کو آتا ہوں۔ اکثر سفر کرتا رہتا ہوں۔ وہ میرے پاس رہ کر کیا کرتیں؟"

"آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟"

"میں نے شادی نہیں کی؟"

(جھوٹ۔ شادی نہیں کی بیوی کو کچھ دن کے لیے کہیں بھجوا دیا ہوگا۔ شاید پاکستان ...شاید کہیں اور۔ اب پری زاد کو منگوایا جا رہا ہے تو بیوی کی گنجائش کہاں سے نکلتی... لیکن جھوٹ بولنا تو ضروری ہے نا، ورنہ میری ہمدردیاں کیسے سمیٹی جائیں گی۔)

"کیوں شادی نہیں کی؟"

(اور اب یہ کہے گا کہ آج تک صحیح عورت ملی ہی نہیں۔) زینی نے سوال کرتے ہی جواب ڈھونڈ لیا تھا۔

"ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔"

ایک لمحے کے لیے زینی بول نہیں سکی۔ اس نے بے حد تحمل بھرے انداز میں جیسے اس پر ٹھنڈا پانی انڈیل دیا تھا۔ وہ اب دونوں گلاس لیے اس کے پاس آ گیا۔

"آپ جیسے مردوں کو شادی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کیا اس لیے کیونکہ آپ کی زندگی میں بہت سی عورتیں آتی جاتی رہتی ہیں؟"

زینی اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے، چاہتے ہوئے بھی خود کو طنز کرنے سے نہیں روک سکی۔ کرم علی نے چونک کر اسے دیکھا پھر بے اختیار مسکرایا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے، میری زندگی میں بہت سی عورتیں آتی ہوں گی؟"

وہ اس کے سوال پر حیران ہوئی پھر اس نے کہا۔

"کوئی نہ کوئی تو آئی ہو گی۔"

کرم علی کے چہرے سے مسکراہٹ ایک لمحہ کے لیے غائب ہوئی پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کوئی نہ کوئی تو ہر ایک کی زندگی میں ہوتا ہے۔ آپ کی زندگی میں نہیں ہے کیا؟"

زینی کے چہرے سے مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی۔ اس نے جیسے اسے برفیلے پانی میں دھکا دے دیا تھا۔ کرم علی سے نظریں چراتے ہوئے اس نے جیسے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ہاتھ میں پکڑے گلاس میں موجود ڈرنک کی طرف پہلی بار متوجہ ہو کر اس سے سپ لیا اور ڈرنک کا پہلا سپ پیتے ہی اسے زبردست اچھو لگا۔ گلاس کو حیرت سے دیکھتے ہوئے اس نے کرم علی سے کہا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ لیمونیڈ ہے۔"

کرم علی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ٹشو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کچھ حیرانی سے کہا۔

زینی نے ٹشو پکڑتے ہوئے بے ساختہ کرم علی کے عقب میں نظر آنے والے بار کو دیکھا، جہاں سے وہ یہ ڈرنک لایا تھا پھر اس نے بے حد الجھی ہوئی نظروں سے کرم علی کو دیکھا اور ٹشو سے اپنے ہونٹوں کو صاف کرتے ہوئے اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"میں نے کسی میگزین میں پڑھا تھا کہ آپ کو لیمونیڈ بہت پسند ہے۔"

زینی نے کچھ کہنے کے بجائے لیمونیڈ کا اگلا سپ لیا۔ یوں جیسے اس کے ذائقہ کو محسوس کرنا چاہتی ہو۔ کرم علی لیمونیڈ کے سپ پیتے ہوئے اس کے تاثرات کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔

"حیرت ہے، یہ آپ کا فیورٹ ڈرنک ہے اور آپ اس کے ذائقے کو پہچان نہیں سکیں۔"

"بہت عرصے کے بعد میں یہ پی رہی ہوں۔"

"کیوں؟" کرم علی کو تجسس ہوا۔ زینی نے جواب نہیں دیا۔ چار سال کے بعد پہلی بار کوئی مرد اسے پریشان کر رہا تھا۔ وہاں کھڑکی کے سامنے کھڑے اس کے ساتھ لیمونیڈ پیتے ہوئے اسے اپنا آپ احمق لگا۔ وہ کینیڈا لیمونیڈ پینے نہیں آئی تھی۔

وہ کرم علی سے پہلے اور الجھی تھی۔

"آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا مجھے؟" کرم علی نے کچھ دیر خاموش رہ کر اس سے پوچھا۔

"مثلاً کیا؟" اس نے چونک کر کرم علی کو دیکھا۔

"اپنی فیملی کے بارے میں۔"

"گلاس کہاں رکھنا ہے مجھے؟" زینی نے لیمونیڈ کا آخری سپ لیتے ہوئے کرم علی سے کہا۔

"مجھے دے دیں۔" کرم علی نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ زینی نے بات بدل دی تھی۔ کرم علی نے محسوس کر لیا تھا۔ اس نے دوبارہ زینی سے فیملی کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔

"آیئے، آپ کو گھر دکھاتا ہوں۔" بار کے کاؤنٹر پر گلاس رکھتے ہوئے کرم علی نے پلٹ کر اس سے کہا۔ آخری چیز جس میں زینی کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ اس گھر کو دیکھنا تھا۔

"اوہ ضرور..." اس نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور کرم علی کے ساتھ چل پڑی۔

(آخر گھر اور گھر میں رکھی ہوئی چیزیں نہیں دکھاؤ گے تو مجھے پتہ کیسے چلے گا کہ تمہارے پاس کتنا پیسہ ہے۔ مجھے مرعوب کیسے کرو گے تم؟)

اس نے کرم علی کے ساتھ چلتے ہوئے سوچا تھا وہ اسے گھر دکھاتے ہوئے مختلف کمروں اور چیزوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بہت زیادہ دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اسے آج واپسی پر پاکستان کس کس کو کال کرنا تھی۔ کل کا شیڈول کیا تھا؟ دو ہفتے کینیڈا میں قیام کے دوران اسے کیا کیا کرنا تھا اور دو ہفتے کے بعد پاکستان کے بعد اس کی کون سی فلم کی ڈیٹس تھیں اور اس کی ایک کمرشل کی شوٹنگ، وہ اس کے ساتھ گھر میں پھرتے ہوئے اپنے اگلے مہینے کا شیڈول پلان کرتی رہی۔ اس گھر میں اس کی عدم دلچسپی کا یہ عالم تھا۔

وہ اب گھر کے اوپر والے فلور پر تھا۔ وہ اسے ٹیرس پر لے گیا اور وہ اس لاؤنج کی کھڑکی کے بعد وہ دوسری جگہ تھی، جہاں جا کر کھڑا ہونا زینی کو اچھا لگا تھا۔

"آپ کو پتہ ہے، میں نے آپ کو پہلی بار کہاں دیکھا تھا؟"

وہ کچھ دیر چپ چاپ وہاں کھڑے وہاں سے نظر آنے والے منظر کو دیکھتے رہے پھر کرم علی نے یک دم خاموشی توڑی۔

(کسی اشتہار میں، کسی میگزین میں، ٹی وی کے کسی انٹرویو میں، کسی فلم کی اسکرین پر، کسی سینما کی ہورڈنگز پر) زینی نے جواب جانتے ہوئے بھی اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کہاں؟"

''دوبئی۔ ای پی بی پی کے ایک فیشن شو میں آج سے چند سال پہلے۔'' اس نے اسے تاریخ بتائی۔

زینی کے پیٹ میں جیسے کسی نے گھونسہ دے مارا تھا۔ وہ اس دن، اس تاریخ اور اس فیشن شو کو بھول جانا چاہتی تھی۔

''نیچے چلیں۔'' کرم علی کچھ اور کہہ رہا تھا، جب زینی نے یک دم اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور پھر مزید انتظار کیے بغیر پلٹ کر نیچے جانے لگی۔ کرم علی نے بے حد حیرت کے ساتھ اسے دیکھا مگر کچھ کہنے کے بجائے اس کے پیچھے آگیا۔

''آپ کو میری کوئی بات بری لگی زینی؟''

زینی کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے پلٹ کر کرم علی کو دیکھا۔ اس کے تاثرات نے کرم علی کو کچھ کنفیوز کیا۔

''کیا ہوا؟''

''آپ نے کیا کہا مجھے؟''

''کیا؟'' کرم علی کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''کیا نام لیا آپ نے میرا؟''

''زینی!'' کرم علی نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

''آپ کو میرا نام کیسے پتہ چلا؟''

''میں نے اس فیشن شو میں کسی کو آپ کو اس نام سے پکارتے سنا تھا۔'' کرم علی نے قدرے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''میں بیک اسٹیج گیا تھا تو کوئی آپ کو اس نام سے بلا رہا تھا۔ مجھے یہ نام اچھا لگا۔'' زینی پلکیں جھپکائے بغیر اس کو دیکھتی رہی۔ وہ اس رات بیک اسٹیج کب آیا تھا؟ اور وہ اسے کس حد تک جانتا تھا۔ وہ اور الجھی تھی۔

''آپ مجھ کو پری زاد کے نام سے پکاریں۔''

اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد یک دم کرم علی سے کہا اور پلٹ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی وقت وہاں سے چلی جائے۔ وہ کرم علی کے پاس مزید نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ اس کی موجودگی اور باتیں اسے بے حد عجیب انداز میں ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ وہ کوشش کے باوجود اس سے نرمی سے بات نہیں کر پا رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو رہی تھی۔

''شاید یہ کل کے سفر کی وجہ سے ہے۔''

سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے سوچا، ورنہ بظاہر آج ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس طرح ری ایکٹ کرتی جس طرح وہ کر رہی تھی۔ اس کے باوجود کہ ابھی کرم علی نے اسے فلم میں کاسٹ کرنے کی ہامی نہیں بھری تھی۔

''کھانا لگ گیا ہے۔'' سیڑھیوں کے سامنے کھڑی ہاؤس کیپر نے ان دونوں کو آگے پیچھے نیچے اترتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔

زینی کا دل چاہا، وہ اس سے کہے کہ اسے بھوک نہیں ہے اور کم از کم اس وقت تو ـــ لیکن اس نے خاموش رہ کر خود کو ایک مرتبہ پھر کمپوز

کرنے کی کوشش کی۔

اس کا رویہ صرف اس کی نہیں، کرم علی کی بھی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ اس کی باتوں پر مسلسل الجھ رہی ہے اور کرم علی کا خیال تھا کہ وہ ان باتوں پر خوشی کا ظہار نہ بھی کرتی تو کم از کم اس طرح اپ سیٹ نہ ہوتی۔ پری زاد کا مسئلہ کیا تھا؟ یا اگر اسے چند سال پہلے سمجھ میں نہیں آیا تھا تو آج بھی نہیں آیا تھا۔ شاید اس کے حسن، خوبصورتی اور شہرت نے اسے مغرور کر دیا تھا۔ کرم علی نے وہی اندازہ لگایا تھا جو زینی کے اس رویے سے کوئی بھی لگاتا۔

کھانے کی میز پر شروع کے چند منٹ بے حد خاموشی سے گزرے تھے پھر کرم علی کو احساس ہوا کہ وہ اس کی مہمان ہے۔ اسے اس کی مہمان نوازی کرنی چاہیے تو دوسری طرف زینی کو احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے کرم علی کے ساتھ ضرورت سے زیادہ رکھائی کا مظاہرہ کیا ہے۔

''آپ نے مجھ سے فلم اور شوبز کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔''

زینی نے بالآخر کچھ دیر کے بعد گفتگو کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے بارے میں پھر کسی دن بات کریں گے، ابھی تو آپ بہت دن یہاں ہیں۔'' کرم علی نے مسکرا کر خوش دلی سے کہا۔

''بہت دن نہیں، صرف دو ہفتے۔'' زینی نے اسے جتایا۔

''ایک ہفتے میں سات دن ہوتے ہیں اور دو میں چودہ۔ بہت وقت ہے ابھی۔'' کرم علی نے برجستگی سے کہا۔

''آپ بریانی لیں، آپ کو پسند ہے نا؟'' اس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ زینی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میری پسند اور ناپسند کے بارے میں کتنا جانتے ہیں آپ؟''

''آپ امتحان لینا چاہتی ہیں؟'' کرم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلیں یونہی سمجھ لیں۔'' زینی بھی مسکرائی۔

''اس محفل پر رنگی ہر ڈش آپ کی پسندیدہ ہے۔ اگر میگزینز میں شائع ہونے والی انفارمیشن کو ٹھیک سمجھا جائے تو۔'' وہ کرم علی کی بات پر بے اختیار ہنسی۔

''بس صرف یہی پتہ ہے آپ کو کہ میں کیا کھانا اور کیا پینا پسند کرتی ہوں؟''

''اور کیا پتا ہونا چاہیے مجھے؟'' کرم علی نے دلچسپی سے کہا۔

''یہ کہ مجھے کیسے مرد پسند ہیں۔'' زینی نے بے حد بے باکی سے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی سے وہ بری طرح محظوظ ہوئی۔

''کیسے مرد پسند ہیں آپ کو؟'' کرم علی نے کچھ دیر کے بعد بے حد سادہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ جیسے۔'' زینی نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بڑی بے ساختگی سے کہا۔

''میرے جیسے؟ یعنی میں نہیں۔'' اس بار کرم علی بھی مسکرایا۔

"میں آپ۔"

"آپ نے کباب لیے؟" اس سے پہلے کہ زینی کچھ کہتی۔ کرم علی نے بات کا موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی۔

زینی نے مسکراتے ہوئے کرم علی کو دیکھا تھا، یوں جیسے اسے جتانا چاہ رہی ہو کہ جانتی ہے کہ وہ بات بدل رہا تھا۔

"کھانے کے بعد باہر لان میں چلیں گے۔ آپ کو اچھا لگ رہا تھا میرا لان؟"

کرم علی نے اس کی مسکراہٹ اور انداز کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے کہا مگر اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ یہ کام بے حد مشکل تھا۔ وہ واقعی خطرناک حد تک خوبصورت تھی۔

"ویسے مجھے اس بات پر حیرانی ہے۔" اس بار زینی نے اس کے سوال اور مشورے کو مکمل طور پر نظرانداز کیا تھا۔

"کیا؟ کس بات پر؟" کرم علی نے چونک گیا۔

"آپ نے مجھے یہاں اپنے گھر میں کیوں نہیں ٹھہرایا؟ ہوٹل میں کیوں ٹھہرایا جبکہ آپ کے گھر پر کوئی نہیں رہتا۔"

کرم علی اس بار کچھ الجھا۔

"میں نے سوچا، آپ اسے مناسب نہیں سمجھیں گی۔"

اس نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

"میں کیوں مناسب نہیں سمجھوں گی؟" اس نے بے ساختہ سوال کیا۔ کرم علی ایک بار پھر کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکا۔ زینی کا دل پہلی بار بے اختیار کھلکھلا کر ہنسنے کو چاہا۔ وہ جانتی تھی، وہ اس کی بے باکی سے پریشان ہو رہا تھا اور وہ اسے پریشان کرنا چاہ رہی تھی۔ اس وقت کھانے سے زیادہ اسے اس کام میں مزہ آنے لگا تھا۔

"ویل ... اگر آپ ... آپ یہاں میرے گھر پر آ کر رہنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ خوشی ہوگی۔"

کرم علی نے قدرے گڑبڑا کر بے حد نارمل انداز میں اس سے کہا۔

"اور آپ کی خوشی سے بڑھ کر تو میرے لیے دوسری کوئی چیز اہم نہیں۔" زینی نے بے ساختہ اس کی بات کاٹی۔

"کب شفٹ کروں؟ کل یا آج؟" اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ کرم علی بول نہیں سکا۔ زینی بے حد سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھتی رہی پھر کرم علی نے اسے یک دم قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے دیکھا۔ کرم کا چہرہ بے اختیار سرخ ہوا۔ اسے اس وقت احساس ہوا تھا کہ وہ اس کے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔

"گھبرائیں مت کرم علی صاحب! میں آپ کے گھر شفٹ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔"

"میں کیوں گھبراؤں گا؟"

"یہ تو آپ کو پتہ ہوگا۔"

زینی کچھ اور ہنسی۔ یک دم اجنبیت اور تکلف کی وہ دیوار انہیں اپنے درمیان گرتی ہوئی محسوس ہوئی جو پچھلے چند گھنٹوں میں ان کو پریشان کرتی آ رہی تھی۔

''بہت ساری وجوہات ہو سکتی ہیں گھبرانے کی لیکن بہر حال اب میں ان وجوہات کے بارے میں آپ سے بات نہیں کروں گی۔''

''مجھے آپ کے اپنے گھر پر آ کر رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی یہ بات میرے لیے پریشان کن ہے۔'' کرم علی نے بلا آخر بڑے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''لیکن اگر مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ میرے گھر کا ذکر آپ کے موڈ کو اس قدر خوشگوار کر دے گا تو میں یہ ذکر آپ سے پہلے کرتا۔''

زینی اس کے ساتھ کیا کر رہی ہے۔ کرم علی اب تک سمجھ چکا تھا۔

''اب تک کتنی موویز دیکھی ہیں آپ نے میری؟'' زینی نے ایک بار پھر موضوع بدلا۔

''ایک بھی نہیں۔''

کرم علی کا خیال تھا، وہ اس کی بات پر چونکے گی مگر وہ چونکی نہیں تھی، وہ مسکرائی تھی۔ ''اس کے باوجود آپ مجھے فلم میں ہیروئن کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے۔'' کرم علی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔

''باہر چلیں۔''

وہ فلم کا ذکر آتے ہی بات بدل دیتا تھا۔

کیوں؟ وہ فلم بنا رہا تھا پھر فلم کے تذکرے سے اتنا بھاگ کیوں رہا تھا؟

زینی نے بے حد سنجیدگی سے اس کے چہرے کو دیکھا پھر اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آ گئی۔ لان میں چلتے ہوئے وہ اسے وہاں پودوں اور پھولوں کی ورائٹیز اور ناموں کے بارے میں بتاتا رہا۔ زینی نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ آخری بار کسی مرد نے اسے اتنا بور کب کیا تھا۔ اسے کوئی دوسرا مرد یاد نہیں آیا تھا۔ اسے آج تک بہت سے مردوں سے نفرت محسوس ہوئی تھی، گھن بھی آئی تھی۔ مگر کرم علی سے وہ بور ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ اس سے کہے کہ وہ اسے گھر میں آئے ایک عام مہمان کی طرح نہیں ''پری زاد'' کی طرح ٹریٹ کرے۔ شرافت کا جو لبادہ اپنے اوپر چڑھا کر پھر رہا ہے، اسے اتار کر اصلی روپ میں آ جائے۔ اس سے ملنے والا کوئی مرد اپنی اصلیت دکھانے میں اتنی دیر نہیں لگاتا تھا، جتنی دیر کرم علی لگا رہا تھا۔

شام کی چائے کے بعد وہ اسے لانگ ڈرائیو پر لے گیا۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی باہر کسی ریسٹورنٹ میں کھایا اور اس سارے وقت کے دوران وہ بڑے سادہ لہجے میں اسے ان جگہوں کے بارے میں بتاتا رہا، وہ جیسے زینی کی برداشت کا امتحان لے رہا تھا۔ وہ ساری باتیں زینی کے لیے بے معنی تھیں۔ وہ اوٹوا کی تاریخ جاننے کے لیے اور وہاں کی ٹورسٹ اٹریکشنز دیکھنے کے لیے وہاں نہیں آئی تھی۔

اسے صرف ایک چیز میں دلچسپی تھی۔ پانچ کروڑ کی اس فلم میں لیڈنگ رول اور کرم علی کو جس چیز میں سب سے کم دلچسپی تھی، وہ وہی فلم تھی۔

ساڑھے دس بجے رات وہ اسے ہوٹل واپس چھوڑ گیا تھا۔ وہ اس وقت تک بری طرح اپ سیٹ تھی اور اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہاں بیٹھے ہوئے سلطان نے اس کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے پری جی؟''

''تم نے نواز پراچہ سے کنفرم کیا تھا کہ کرم علی مووی بنا بھی رہا ہے یا نہیں؟'' اس نے چھوٹتے ہی سلطان سے پوچھا۔

''آپ سے اس بارے میں کوئی بات کی کیا؟'' سلطان کو بھی تشویش ہوئی۔

''بات ہی تو نہیں کی، اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں میں۔ بہت سارے نئے پروڈیوسر فلم اناؤنس تو کر دیتے ہیں، بناتے نہیں۔''

اس نے صوفے پر بیٹھ کر اپنی جیولری اتارنا شروع کر دی تھی۔

''آپ کہتی ہیں تو میں نواز پراچہ سے دوبارہ پوچھ لوں گا۔ ویسے مجھے تو اس نے بتایا تھا کہ اس نے فلم کی سیٹنگ اور کاسٹنگ شروع کر رکھی ہے۔ کرم علی نے اسے ابتدائی رقم بھیج دی ہے۔ خود کرم علی کا کوئی آدمی بھی نواز کے پاس آ کر سارا پیپر ورک کر کے گیا ہے۔'' سلطان نے بتایا۔

''آپ کو کرم علی اچھا آدمی نہیں لگا؟'' سلطان نے اس سے پوچھا۔

وہ سگریٹ سلگا رہی تھی، اس کی بات پر جیسے چونکی۔

''اچھا آدمی؟'' وہ کچھ الجھی۔ ''عجیب آدمی ہے وہ۔''

''کیوں، عجیب کیوں؟'' سلطان کو تجسس ہوا۔

''شاید وہ مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چاہتا ہے میں سمجھوں کہ وہ شریف آدمی ہے۔'' زینی نے وہاں بیٹھے بیٹھے جیسے خود ہی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن وہ یہ کیوں چاہتا ہے؟'' سلطان نے حیرانی سے کہا۔

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ یہ کیوں چاہتا ہے۔'' زینی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اگلا دن بھی تقریباً اسی طرح گزرا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار کرم علی نے لنچ کے بجائے اسے ڈنر پر بلایا تھا اور ڈنر گھر کی بجائے کسی ریسٹورنٹ میں رکھا تھا۔ پچھلے دن کی طرح اس نے اس رات بھی فلم کے بارے میں بات نہیں کی تھی لیکن اس رات زینی پہلے دن کی نسبت زیادہ پر سکون تھی۔ وہ جیسے بڑے تحمل اور برداشت سے اسے کھلنے کا موقع دے رہی تھی۔ آخر اس نے اسے کینیڈا میں صرف گھمانے پھرانے اور کھانا کھلانے کے لیے ہی تو نہیں بلایا ہوگا۔ کبھی نہ کبھی تو وہ اپنے مطلب پر آتا۔

اس رات بھی وہ اسی طرح ڈنر کے بعد اسے واپس چھوڑ گیا تھا۔

تیسرے دن وہ اسے وہاں کے کچھ مشہور شاپنگ مال دکھانے لے گیا تھا اور ایسے ہی ایک مال میں ایک شاپ پر زینی نے ایک لیدر بیگ پر پرائس ٹیگ دیکھ کر اسے چھوڑ دیا۔

''کیا ہوا؟'' کرم علی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بیگ اسے اچھا لگا تھا۔

''کچھ نہیں، بہت Expensive (مہنگا) ہے۔''

زینی لاپروائی سے دوسرا بیگ دیکھنے لگی۔ اسے وہ بیگ اچھا لگا تھا مگر اتنا نہیں کہ وہ اس پر اتنی رقم خرچ کر دیتی۔

"آپ کو اچھا لگا ہے تو آپ لے لیں I will pay for it (میں اس کی ادائیگی کردوں گا)۔" کرم علی نے خوش دلی سے آفر کی۔

"مجھے تو اس شاپنگ مال کی ہر چیز اچھی لگ رہی ہے آپ کس کس چیز کے لیے پے کریں گے؟" زینی نے بے حد تیکھے انداز میں اس سے کہا۔

"آپ کو جو اچھا لگ رہا ہے لے لیں۔ اس کی فکر نہ کریں کہ Pay کون کرے گا۔"

"تھک جائیں گے۔" زینی نے عجیب سے انداز میں کہا۔

وہ ہنس پڑا "چوبیس سال نہیں تھکا تو آپ کے چند گھنٹوں سے کیا تھکوں گا۔ آئیں، دیکھتے ہیں آپ شاپنگ کرتے ہوئے تھکتی ہیں یا میں کرواتے ہوئے تھکتا ہوں۔"

زینی اس کے پہلے جملے کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس پر کچھ غور کرتی، کرم علی کے اگلے جملے نے جیسے اس کو چیلنج کر دیا تھا۔

"چلیں، دیکھتے ہیں۔" زینی نے ہنس کر کہا۔ کرم علی کو زچ کرنے کا ایک موقع اس کے ہاتھ آ رہا تھا، وہ کیسے جانے دیتی۔

اگلے سات گھنٹے کے دوران اس نے بے مقصد اور بلا ضرورت ہر شاپ میں جا کر مہنگی سے مہنگی برانڈڈ چیزیں خریدی تھیں۔ ان میں سے آدھی سے زیادہ چیزیں اس کے لیے بے کار تھیں۔ وہ جانتی تھی، وہ انہیں کہاں استعمال کر سکتی تھی مگر وہ کرم علی کو زیادہ سے زیادہ مالی نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔

پاکستان میں جس مرد سے اسے جان چھڑانا ہوتی، وہ اس کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتی تھی۔ بار بار اسے مہنگے مالز اور برانڈڈ پروڈکٹس کی شاپس میں لے جا کر بے مقصد خریداری کرتی۔ بہت جلد وہ ان مردوں کے لیے خود اتنی مہنگی پروڈکٹ ہو جاتی تھی جسے ہر کوئی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جانتی تھی، کرم علی کے پاس جتنی دولت تھی، وہ فوری طور پر شاید ہونے والے نقصان کا تخمینہ لگانے نہ بیٹھے لیکن بہرحال اس شاپنگ سے اسے پہلا جھٹکا ضرور لگے گا۔ آج تک کوئی عورت اس کو لاکھوں کی نہیں پڑی ہوگی۔

زینی دل ہی دل میں جلتی رہی تھی۔ شاپنگ پر توجہ دینے کے بجائے وہ سات گھنٹے کرم کے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہی تھی اور ان تاثرات نے اسے مایوس کیا تھا۔ کرم علی اگر اس کی اس قدر مہنگی شاپنگ سے اپ سیٹ ہوا بھی تھا تو اس کا اظہار اس کی زبان یا چہرے سے نہیں ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ آخر تک برقرار رہی تھی۔ کسی بھی جگہ یا موقع پر اس کے ماتھے پر ہلکی سی بھی شکن نہیں آئی تھی۔ ہر دکان میں اس کی شاپنگ کے اختتام پر بل بننے کے بعد وہ بے حد پرسکون انداز میں کارڈ نکال کر ادائیگی کرتا، شاپنگ بیگز پکڑتا اور مسکراتے ہوئے اس سے پوچھتا کہ وہ اب کہاں جانا چاہتی ہے۔

ساتویں گھنٹے کے اختتام پر جب زینی بالآخر تھک کر واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تب تک کرم علی کے تین کریڈٹ کارڈز کی لمٹ ختم ہو چکی تھی۔ وہ اب اپنا debit card استعمال کر رہا تھا۔

اس کی مرسڈیز کا مختلف شاپنگ بیگز اور ڈبوں سے تقریباً بھر چکی تھی صرف آگے کی وہی دو سیٹیں خالی تھیں جس پر وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔

اس رات بھی انہوں نے ایک نئے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ زینی نے اس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی،

وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ یقیناً بہت گہرا آدمی تھا۔

''آپ کو ایک مشورہ دوں؟'' اس نے واپسی کے سفر میں بالآخر کرم علی سے کہا۔

''کیا؟'' کرم علی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کبھی کسی ہیروئن کو شاپنگ کی آفر زندگی میں دوبارہ مت کیجیے گا۔''

کرم علی نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ''کیوں؟''

''وہ آپ کا گھر تک بکوا دے گی۔ فٹ پاتھ پر آ جائیں گے آپ تو۔''

کرم علی بے اختیار ہنسا۔ زینی کو لگا جیسے اس نے اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔

''یہ آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟ ہمدردی ہو رہی ہے کیا آپ کو مجھ سے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ترس آ رہا ہے۔'' زینی نے بے ساختہ کہا۔

کرم علی نے بے اختیار قہقہہ لگایا یوں جیسے اس کی بات سے بے حد محظوظ ہوا ہو۔

''چلیں، کوئی جذبہ تو محسوس کیا آپ نے میرے لیے۔''

زینی نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرنے میں مصروف تھا یا کم از کم ظاہر یہی کر رہا تھا۔

زینی کچھ دیر منتظر رہی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی وہ آگے کیا کہتا ہے۔ لیکن کرم علی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

ہوٹل کی انٹرنس پر زینی کو ڈراپ کرتے ہوئے اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''یہ تو صرف ایک شاپنگ مال تھا۔ اس شہر میں کچھ اور بھی اچھے شاپنگ مال ہیں اگر آپ کے پاس فرصت ہو تو کل ان میں سے کہیں پر لے جاؤں آپ کو۔''

زینی کچھ دیر تک بول نہیں سکی۔ اسے چند لمحوں کے لیے لگا تھا کہ وہ اس پر طنز کر رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہاں سنجیدگی تھی۔

''کل نہیں پھر سہی، جلدی کیا ہے؟''

زینی نے بے حد ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

کرم علی نے اسٹیئرنگ سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بے حد اطمینان سے کہا۔ ''مجھے کوئی جلدی نہیں۔''

زینی کچھ کہنے کے بجائے گاڑی سے اترنے لگی۔ کرم علی گاڑی سے نکل کر باہر کھڑا ہو گیا۔ زینی نے پلٹ کر اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ ہوٹل کی اینٹرنس میں داخل ہو گئی تھی۔ چند پورٹرز گاڑی سے شاپنگ بیگز نکال کر اندر لے جا رہے تھے۔ کرم علی کچھ دیر وہاں کھڑا اندر دور جاتی زینی کو دیکھتا رہا جس نے ہوٹل کے اندر جانے کے کچھ دیر بعد جھک کر اپنے ہائی ہیلڈ جوتوں کو اتارا۔ جن کو پہنے وہ سات گھنٹے چلتی ہوئی شاپنگ کرتی رہی تھی۔

کرم علی کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔ زینی کو یقیناً اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی دور سے اسے دیکھ سکتا تھا ورنہ وہ کبھی اس طرح جوتے نہ اتارتی۔

کرم نے شاپنگ مال میں کئی بار اسے اپنے جوتے بدل لینے کا مشورہ دیا تھا مگر زینی نے لاپروائی سے اسے رد کر دیا تھا، وہ کرم کو یہ امپریشن نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ شاپنگ کرتے ہوئے تھک رہی تھی۔ کرم علی نے اصرار نہیں کیا تھا۔

وہ عجیب لڑکی تھی۔ کرم علی اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ اس کے ایک جملے سے اس کے بارے میں ایک نتیجہ اخذ کرتا اور اس کا اگلا جملہ اس نتیجے کو غلط ثابت کر دیتا۔ وہ جانتا تھا، محسوس کر سکتا تھا کہ وہ اس سے چڑ رہی تھی۔ اسے زچ کرنا چاہتی تھی۔ وہ بعض دفعہ اس پر طنز کرتی بعض دفعہ اس کا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی اور بعض دفعہ لگتا کہ اس سے فلرٹ کی کوشش کر رہی ہے مگر اس نے کسی بھی لمحے زینی کو اپنے آپ سے متاثر ہوتے نہیں پایا تھا۔ کرم علی کو یہ توقع تھی بھی نہیں۔ اسے زینی میں دلچسپی تھی۔ زینی کا اس میں دلچسپی لینا یا نہ لینا اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ وہ خود اپنے لیے کرم علی کے جذبات اور احساسات کو کسی غلط طریقے سے نہ لے۔ جب سے اس سے ملاقات ہوئی تھی وہ جیسے کرم علی کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ الجھانے اور پریشان کرنے کے باوجود کرم علی کو عارفہ کے بعد پہلی بار کسی عورت نے اس طرح اٹریکٹ کیا تھا اور وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی جس کے ساتھ وہ اتنا وقت گزار رہا تھا۔ اور سالوں کے بعد اسے اپنی زندگی اچھی لگنے لگی تھی۔

اور یہ صرف اس لیے تھا کیونکہ وہ ہر روز زینی سے مل رہا تھا۔

☆☆☆

وہ اس رات بھی بے حد اپ سیٹ کمرے میں پہنچی تھی۔ اگلے پندرہ منٹ تک دونوں پورٹرز وہ سامان اس کے کمرے میں پہنچاتے رہے جو انہوں نے کرم علی کی گاڑی سے نکالا تھا اور سلطان بے حد خوشی اور اشتیاق کے عالم میں ان شاپنگ بیگز کو کھول کھول کر دیکھ رہا۔

"یہ پکی بات ہے پری جی! کہ کرم علی آپ کو اپنی فلم میں لے رہا ہے۔"

سلطان نے ان پورٹرز کے آخری چکر کے بعد جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ اب زینی کے پیروں کا مساج کرنے میں مصروف تھا۔

"ورنہ اس طرح کون لاکھوں کی شاپنگ کرواتا ہے۔"

سلطان کو ان چیزوں کی اصل قیمت کا اندازہ نہیں تھا نہ ہی زینی کو یہ پتا تھا کہ اس نے مجموعی طور پر آج کرم علی کی کتنی رقم خرچ کروائی تھی۔ لیکن اسے یہ اندازہ ضرور تھا کہ کینیڈین ڈالرز میں بھی وہ آج تک کی جانے والی اس کی زندگی کی سب سے مہنگی اور بے مقصد شاپنگ تھی۔

اس نے کرم علی کا بیس پچیس لاکھ روپیہ ڈبویا تھا مگر اسے تسلی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس نے کرم علی کو پریشان نہیں دیکھا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنے سات گھنٹے بے مقصد ضائع کیے۔

"مجھے لگتا ہے پری جی! یہ آدمی آپ کے عشق میں مبتلا ہے۔" سلطان جیسے دور کی کوڑی لایا تھا۔

"تم اپنی بک بک بند کرو گے؟" زینی اس کے جملے پر بری طرح چڑی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں پری جی! مجھے تو اچھا آدمی لگنے لگا ہے یہ، دیکھیں ابھی تک اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ کتنی عزت اور احترام سے ہر روز رات کو یہاں چھوڑ جاتا ہے آپ کو۔''

''ابھی دن کتنے ہوئے ہیں مجھے یہاں۔''

''پھر بھی پری جی! اس کو بھی تو اندازہ ہے کہ آپ کو چلے جانا ہے، ایسا ویسا آدمی ہوتا تو تین دن بہت ہوتے ہیں اس کے لیے۔'' سلطان اب اس کے پیروں کا مساج کرتے ہوئے بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

''ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے سلطان! یہ سب کچھ جو تمہیں نظر آ رہا ہے نا میرے ارد گرد بکھرا ہوا اس سب کی قیمت ادا کرنی پڑے گی مجھے اس لیے مجھے کرم علی نہ تو فیاض لگ رہا ہے نہ عاشق۔ عیاش آدمی ہے اور عیاش آدمی کی جیب جتنی بڑی ہوگی، وہ اپنی عیاشیوں پر اتنا ہی پیسہ خرچ کرے گا۔'' وہ تلخی سے کہہ رہی تھی۔

''کبھی کبھی مرد دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھی کرتا ہے یہ سب کچھ۔'' سلطان نے مدھم آواز میں کہا۔

''مرد کا دل نہیں ہوتا سلطان!'' اس نے تلخی سے کہا۔

''عورت کا ہوتا ہے؟'' سلطان نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ اسے پتہ نہیں کیا یاد آیا تھا۔

''عورت کا بس دل ہی ہوتا ہے۔ اس کا تو پورا وجود دل پر مشتمل ہوتا ہے۔'' اس نے سلطان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''کرم علی اچھا آدمی ہے۔'' سلطان نے ایک بار پھر جیسے اصرار کیا۔

''مجھے برے آدمیوں کی نسبت اچھے آدمیوں سے زیادہ ڈر لگتا ہے سلطان!''

سلطان اس بار بول نہیں سکا، وہ صرف زینی کے پاؤں دباتا رہا۔

☆☆☆

''یہ کیا ہے؟'' زینی نے بے اختیار اس کی شرٹ کی آستین سے جھانکتے نشانات کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں بوٹنگ کر رہے تھے اور پیڈل بوٹنگ کے دوران ہی زینی کی نظر ان نشانات پر پڑی تھی۔ کرم علی نے کچھ گرمی محسوس کرنے کی وجہ سے گاڑی سے اترتے ہوئے اپنی جیکٹ اتار کر گاڑی میں چھوڑ دی تھی۔

زینی اب غیر محسوس طور پر اس کے کف پر لگا بٹن کھول رہی تھی۔ کرم علی نے مزاحمت نہیں کی۔ اس کے ہاتھ کی سانولی رنگت اور برص کے سفید داغوں میں اتنا فرق نہ ہوتا تو شاید زینی کی نظر آستین سے نظر آنے والے ان داغوں پر جاتی ہی نا۔

''برص ہے آپ کو؟'' وہ آستین کا بٹن کھولنے کے بعد اب اس کی کلائی پر ہاتھ رکھے بڑی ہمدردی سے پوچھ رہی تھی۔ کرم علی نے ان تمام دنوں میں پہلی بار اس کی آواز اور انداز میں اپنے لیے ہمدردی کا عنصر دیکھا تھا لیکن اس سے زیادہ اچھا اسے اپنی کلائی پر اس کے ہاتھ کا لمس لگ رہا تھا۔

''ہاں، کئی سالوں سے۔'' کرم نے لاپروائی سے کہا۔

''صرف بازوؤں پر ہے؟'' وہ اس نے پوچھا۔

''نہیں پورے جسم پر، صرف چہرہ گردن سینے کا اوپر کا کچھ حصہ اور یہ ہاتھ بچے ہوئے ہیں۔''

''آپ نے علاج کیوں نہیں کروایا؟'' زینی نے سنجیدگی سے کہا۔

''علاج کروانے کی وجہ سے ہی میرا چہرہ اور ہاتھ آپ صحیح سلامت دیکھ رہی ہیں۔'' کرم علی نے کہا۔ زینی اب اس کی آستین کا بٹن بند کر رہی تھی۔

''نہیں، ان داغوں کو ختم کرنے کے لیے۔''

''مجھے نہیں پتا انہیں ختم کیا جا سکتا ہے یا نہیں، میں نے کبھی اس کے لیے کوشش نہیں کی۔'' کرم علی نے کہا۔

''کیوں؟''

''ضرورت کیا ہے؟ انسان کو بعض داغوں کی عادت ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی ہو گئی ہے۔'' کرم علی نے لاپروائی سے کہا۔

زینی نے اس کی کلائی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

''آپ کو بہت برے لگے ہیں یہ داغ؟'' کرم علی کو یک دم جیسے کوئی خیال آیا۔

''نہیں، بہت برے تو نہیں لگے۔ اگر آپ کو ان سے کوئی پریشانی نہیں ہے تو مجھے کیوں ہو گی۔ آفٹر آل، یہ آپ کا جسم ہے۔ آپ کی زندگی ہے۔''

کرم علی نے جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ بوٹنگ کرتا رہا۔

''آپ بعض دفعہ مجھے بہت عجیب لگتے ہیں۔''

کرم علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ زینی شاید پہلی بار اس سے اپنے اندر کے احساسات کی بات کر رہی تھی۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ میں شاید ہر وقت آپ کو بہت عجیب لگتا رہتا ہوں۔''

زینی کو لگا۔ اس نے اس کی رائے کو مذاق میں اڑا دیا تھا۔ زینی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کرم علی نے چند لمحوں کے بعد اس سے کہا۔

''آپ کو میری بات بری لگی ہے کیا؟''

''آپ کو کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟'' اس نے گردن موڑ کر کرم علی کو دیکھا۔

''بہت زیادہ فرق پڑتا ہے مجھے، میں یہاں آپ کو ناراض کرنے کے لیے لے کر نہیں آیا۔''

اس کی طرف دیکھتے ہوئے زینی کو بے حد عجیب سا احساس ہوا تھا۔ کرم علی کی آواز یا انداز میں کچھ ایسا تھا جس نے زینی کو عجیب انداز میں پریشان کیا تھا۔ اس نے نظریں چرا کر کہا۔

''واپس چلنا چاہیے، بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''آپ دوبارہ کب آئیں گی؟'' کرم علی نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

''بوٹنگ کے لیے؟'' زینی نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''نہیں یہاں کینیڈا؟''

''جب کوئی کام پڑے گا۔''

''اور کام کب پڑے گا آپ کو؟''

زینی کے پاس اس سوال کے بہت سارے جواب تھے، وہ ہر ایک تلخی میں ایک سے بڑھ کر ایک تھا لیکن اس وقت اسے کرم پر ترس آیا یا پتہ نہیں کیا کہ اس نے اسے ان میں سے کوئی جواب نہیں دیا۔

''یہ تو وقت بتائے گا۔''

''میں آپ کو بہت مس کروں گا۔''

وہ بہت دیر تک کچھ بول نہیں سکی۔ وہ بہت ساری دیواروں کو گرانے میں کامیاب ہو گیا تھا جو ہنوز رہ گئی تھیں، اب ان میں دراڑیں ڈال رہا تھا۔ بہت ضروری تھا اس کے لیے کہ وہ اس وقت اس کی طرف نہ دیکھتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ باقی ماندہ دیواریں بھی ڈھے جائیں۔

اس رات سلطان نے زینی کو غیر معمولی طور پر خاموش پایا تھا۔ روز کی طرح آج آ کر اس نے کرم علی کی بات نہیں کی تھی۔ سلطان کے پوچھنے پر بھی نہیں۔ وہ صرف کمرے میں بیٹھ کر ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگاتی رہی تھی۔

''کرم علی نے کچھ کہا ہے آپ سے؟'' سلطان نے سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے تنگ آ کر اس سے پوچھا۔

''نہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا ہے؟''

''تم جاؤ سلطان! جا کر سو جاؤ'' اس نے جواب دینے کے بجائے کہا تھا۔ سلطان کچھ دیر کھڑا اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر کمرے کے دروازے تک گیا۔ اسے کھول کر باہر نکلنے سے پہلے اس نے پلٹ کر زینی سے کہا۔

''مجھے لگتا ہے پری جی! آپ کو کرم علی اچھا لگنے لگا ہے۔''

سلطان کمرے سے نکل گیا تھا۔ زینی دم بخود وہاں بیٹھی رہی۔ وہ سلطان سے یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ اسے بھی یہی اندیشہ پریشان کر رہا تھا۔ اسے کرم علی کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگنے لگا تھا۔ ان ساری تند و ترش باتوں کے باوجود جو وہ کرم علی سے کہتی تھی، اسے کرم علی سے بات کرنا کسی دوسرے مرد سے بات کرنے سے بہت مختلف لگتا تھا۔ وہ غیر محسوس طور پر ہوٹل آنے کے بعد بے چینی سے اگلے دن کا انتظار کرتی تھی۔ کرم علی کے فون کا انتظار کرتی تھی اور یہ سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ یہ سب کچھ غلط ہو رہا تھا۔ یہ محبت نہیں تھی۔ اسے یقین تھا مگر یہ کیا تھا، وہ یہ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ مردوں سے نفرت کرتی تھی اور وہ مردوں سے نفرت ہی کرتے رہنا چاہتی تھی۔ یہ وہ ڈھال تھی جس سے وہ اپنے آپ کو بچا رہی تھی لیکن کرم علی

☆☆☆

''تم ایسا کرو تم کسی... یتیم خانہ کے ذریعے کوئی بچہ اڈاپٹ کرلو۔'' وہ شینا کے مشورے پر بھونچکا رہ گیا تھا۔

''کیونکہ میرے پاس تو بچہ ہے اور میرے لیے ایک بچہ بہت کافی ہے۔ لیکن ضرور تمہارے ماں باپ کو تکلیف ہو رہی ہوگی تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر۔ تو تم اپنے لیے کہیں سے ایک بچہ اڈاپٹ کرو۔''

شینا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ شیراز نے واقعی اکبر اور نسیم کے کہنے پر ہی شینا سے اپنی فیملی اسٹارٹ کرنے کی بات کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب ان کی شادی کو خاصا وقت گزر چکا ہے۔ شینا کو یقیناً اس کی تجویز بری نہیں لگے گی۔ شینا کو واقعی اس کی تجویز بری نہیں لگی تھی، اسی لیے اس نے فوراً ایک جوابی تجویز اس کے سامنے پیش کر دی تھی۔

''لیکن شینا! وہ میرا بچہ تو نہیں ہوگا۔'' شیراز کو بے اختیار غصہ آیا۔

''تو کیا ہوا؟ تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم بھی مرنے سے پہلے دنیا میں کوئی اچھا کام کر کے جاؤ تاکہ پیچھے دنیا میں کوئی تو تمہیں اچھے لفظوں میں یاد کرے۔'' شینا نے ترکی بہ ترکی کہا تھا۔

''میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میری اپنی اولاد نہیں ہوگی تو میری نسل آگے کیسے چلے گی؟''

شیراز کو پتا تھا اس کی اس طرح کی بات پر شینا اس کی کتنی بے عزتی کرنے والی تھی مگر وہ مجبور تھا، وہ واقعی اب اس بات پر بہت سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا اسے یہ خوش فہمی بھی ہو رہی تھی کہ وہ اس کے بچوں کی وجہ سے شاید اس گھر میں اپنے اور اس کے اسٹیٹس کو تھوڑا بہت برابر کر دے یا کم از کم وہ گھر سے باہر اپنی سرگرمیوں اور مصروفیات کو کچھ کم ضرور کرے گی۔ حالانکہ اسے سَنی کو دیکھ کر اس طرح کی خوش فہمی دل میں نہیں پالنی چاہیے تھی۔

''تمہارا اگر یہ خیال ہے کہ میں تمہارے خاندان کی نسل کو آگے بڑھاؤں گی۔ تو تم احمقوں کی جنت میں رہ رہے ہو، میں تمہیں کس طرح برداشت کر رہی ہوں یہ میں جانتی ہوں اور تم چاہتے ہو کہ اس گھر میں تمہارے جیسے دو چار اور آ جائیں۔ No way۔ اور ویسے بھی تمہیں اپنی نسل کو آگے بڑھا کر کرنا کیا ہے؟ تمہارے ماں باپ تمہیں پیدا کر کے دنیا میں کون سا revolution (انقلاب) لے آئے ہیں؟'' وہ ہمیشہ کی طرح بنا کسی لحاظ کے کہہ رہی تھی۔

''پہلے میرا باپ تمہیں پال رہا ہے۔ اس کے بعد تمہارے بچوں کو بھی پالنا شروع کر دے گا۔'' شیراز کو بے اختیار غصہ آیا۔

''مجھ سے اس طرح بات مت کیا کرو۔''

''نہیں کروں گی، جب مجھے لگے گا کہ تم ایک Parasite نہیں ہو۔''

''مجھے لگتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ایک جہنم میں رہ رہا ہوں۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ اس لیے میرے پاپا کے پاس جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ تم کس تکلیف سے گزر رہے ہو تاکہ میری جان تم سے چھوٹ سکے۔'' شینا نے تلخی سے کہا اور اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

شیراز بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا رہا وہ یہ کام ہی تو نہیں کر سکتا تھا جو وہ بتا کر گئی تھی، شینا کو طلاق دینے کا مطلب کیا تھا۔ یہ کسی کو سمجھانے

کی ضرورت نہیں تھی۔

زینی اب اسے پہلی بار صحیح معنوں میں یاد آ رہی تھی۔ اس نے اکبر اور نسیم کے پاس اسی لیے جانا کم کر دیا تھا کہ وہ اب اکثر زینی کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ شینا اور زینی کا موازنہ کرتے رہتے تھے اور شیراز اس بات سے بری طرح چڑ تا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ اس کی اچیومنٹ کو پاؤں کے نیچے روندنے لگے تھے۔

شینا ایک غلط انتخاب ہو سکتی تھی مگر زینی اس کے لیے کبھی بھی ایک صحیح انتخاب نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں شینا کی جگہ شامل ہوتی تو اس کی زندگی بھی اسی طرح مسئلوں میں گھری ہوتی۔

اس کی دونوں بہنیں ابھی بھی اس کے گھر بیٹھی ہوتیں اور اس کے ماں باپ ابھی بھی اسی پرانے محلے کے اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں بیٹھے ہوتے۔

لیکن اب اس فنکشن میں زینی کو دیکھ لینے کے بعد وہ خود اسے اپنے ذہن سے نکال نہیں پا رہا تھا۔ بہت عرصے کے بعد پہلی بار اس نے اکبر اور نسیم کے گھر زینی کے ذکر پر خاموشی اختیار کی تھی، اس طرح برہمی اور جھنجلاہٹ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ دو بیٹیاں اچھے گھروں میں بیاہنے کے بعد اکبر اور نسیم اب چھوٹی بیٹی کا رشتہ تلاش کر رہے تھے اور ساتھ اس بات سے خوفزدہ بھی تھے کہ تیسری بیٹی بیاہ دینے کے بعد وہ اتنے بڑے گھر میں تنہائی کی زندگی کیسے گزاریں گے۔ وہ بھی اس صورت میں جب شیراز کئی کئی ہفتوں کے بعد ان کے پاس آتا تھا اور وہ بھی اکثر صرف انہیں گھر کے اخراجات کے لیے رقم دینے۔

ایک بری بہو شاید اب انہیں اتنا بڑا مسئلہ نہیں لگ رہی تھی جتنی یہ خوفناک حقیقت کہ پوتے، پوتی کی شکل میں آگے بھی ان کے پاس کوئی ایسا سہارا نہیں آئے گا، جس سے وہ کوئی امید وابستہ کر سکیں۔

ایسی صورت حال اگر انہیں اپنے پرانے سیٹ اپ میں پیش آتی تو وہ اب تک شیراز کی دوسری شادی کر چکے ہوتے یا کم از کم دوسری شادی کی تیاریاں شروع کر چکے ہوتے لیکن یہاں پر شیراز کو ایسا مشورہ دینا اور شیراز کا اس مشورے پر عمل کرنے کا مطلب ان تمام آسائشوں سے محروم ہونا تھا جو اس وقت انہیں حاصل تھیں۔ ایک بار اس آرام دہ اور پرتعیش لائف اسٹائل کا عادی ہو جانے کے بعد اکبر، نسیم اور ان کی بیٹیوں کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ پہلے جیسی زندگی گزار سکیں تو آسائش اور سکون میں سے انہوں نے آسائش کا انتخاب کر لیا تھا۔ اور وہ اس انتخاب کی ذمہ داری اپنے کندھوں کے بجائے شیراز کے سر پر ڈال رہے تھے۔ اس سے کم از کم ان کے ضمیر کے بوجھ میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"آپ کو موویز دیکھنا پسند ہے؟"

اس شام وہ زینی کو لے کر ایک انڈین فلم دیکھنے کے لیے سینما گیا تھا۔ جب پاپ کارن کھاتے کھاتے زینی نے اس سے پوچھا۔

"سچ کہوں یا جھوٹ؟" کرم علی نے بے اختیار کہا۔

"سچ۔"

"نہیں۔" زینی بے اختیار ہنسی۔

"اس کے باوجود کہ آپ ایک فلم پروڈیوسر ہیں۔"

"ایک نیا پروڈیوسر اور یہ فلم میری پہلی اور آخری فلم بھی ہو سکتی ہے۔" کرم علی نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"فلم بنانے کا خیال کیوں آیا آپ کو؟"

"اگر میں کہوں آپ کو دیکھ کر آیا تو آپ کو یقین آئے گا؟" کرم علی نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں!"

"اچھا... آپ تو بہت جلدی مان گئیں۔ کوئی ثبوت بھی نہیں مانگا آپ نے؟"

"پہلے کس کس بات کا ثبوت مانگا ہے میں نے؟" زینی نے قدرے تیکھے انداز میں اس سے پوچھا۔

"مانگا تو نہیں مگر انداز ایسا ہی ہوتا ہے آپ کا۔"

"دیکھیں کرم علی صاحب—" زینی نے کچھ کہنا چاہا کرم علی نے اس کی بات کاٹی۔

"آپ مجھے کرم کیوں نہیں کہتیں؟"

"کیوں کہوں؟" زینی نے بے ساختہ کہا۔

"آپ مجھے پری زاد کیوں نہیں کہتے؟"

کرم علی بے اختیار مسکرایا۔ وہ اس کا نام لیے بغیر اس سے مخاطب ہوتا تھا اور زینی نے یہ بات نوٹس کر لی تھی۔

"کیونکہ وہ آپ کا نام نہیں ہے۔" کرم علی نے بے ساختہ کہا۔ "اور جو آپ کا نام ہے وہ آپ کو میری زبان پر برا لگتا ہے۔"

اسکرین پر نظر جمائے اس نے کرم علی کو مکمل طور پر نظر انداز کیا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ جو کہہ رہا تھا وہ سن رہی تھی کچھ دیر دونوں خاموشی سے فلم دیکھتے رہے پھر زینی نے گردن موڑ کر کرم علی سے کہا۔

"مجھے کینیڈا آئے دس دن ہو گئے ہیں۔" اس کا انداز جتانے والا تھا۔

"یہ کیوں بتا رہی ہیں؟"

"اور میری واپسی میں صرف چار دن باقی ہیں۔" اس نے کرم علی کی بات کا جواب دیے بغیر جیسے اُسے اطلاع دی۔

"یہ بری خبر ہے۔ آپ اپنا stay کیا extend کر سکتی ہیں؟"

"نہیں، مجھے واپس جانا ہے میری فلم کی شوٹنگ اسٹارٹ ہو رہی ہے۔"

کرم علی نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا، زینی نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"کچھ سوچ رہے ہیں؟" اس نے کرم علی کو مخاطب کیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"کل رات ڈنر کرتے ہیں۔"

"یہ کام پچھلے دس دن سے روز کر رہے ہیں۔" زینی نے جیسے اسے جتایا۔

"لیکن کل رات کا ڈنر میرے گھر پر ہوگا۔"

صرف چند سیکنڈ کے لیے زینی کو جیسے ایک دھچکا لگا تھا، اس طرح خاص طور پر اپنے گھر پر انوائٹ کرنے کا اب کیا مطلب تھا۔ وہ آسانی سے سمجھ سکتی تھی لیکن کرم علی کے منہ سے پھر بھی یہ سن کر اسے دھچکا لگا تھا اور یہ دھچکا کیوں لگا تھا یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ یک دم فلم میں اس کی دلچسپی ختم ہوگئی تھی۔

☆☆☆

"آج تو بڑی تیاری کر رہی ہیں آپ؟" سلطان نے اسے جیولری نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"آج اس نے گھر پر ڈنر کے لیے بلایا ہے۔"

سلطان کو اس کا لہجہ بجھا بجھا لگا۔

"گھر پر ڈنر کے لیے بلایا ہے تو پھر آپ کو خوش ہونا چاہیے پری جی! آپ اسی وقت کا تو انتظار کر رہی تھیں۔ روز اسی بات پر غصہ آتا تھا آپ کو کہ وہ مطلب کی بات کیوں نہیں کرتا۔"

سلطان اس کی بات پر جیسے حیران ہوا تھا۔

"دیکھ لیجیے گا آج وہ فلم کی بات بھی کرے گا۔"

"نہیں کرے گا تو بھی میں خود کروا لوں گی۔ بہت کھیل تماشا ہو گیا ہے۔" زینی نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے بالوں میں برش کرتے ہوئے کہا۔

کرم علی نے اس رات اسے اپنے گھر کے پورچ میں ریسیو کیا تھا۔ وہ ایک خوبصورت سیاہ ساڑھی میں ملبوس تھی اور آج غیر معمولی طور پر حسین لگ رہی تھی۔

"آپ آج بہت خوب صورت لگ رہی ہیں۔"

کرم علی کچھ دیر کے لیے واقعی اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکا تھا۔ وہ واقعی radiant (تاباں) نظر آ رہی تھی۔

وہ اسے ساتھ لے کر اسی کمرے میں آیا تھا جہاں وہ پہلی بار اس کے گھر آنے پر بیٹھی تھی۔

"پلیز بیٹھیں۔" اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بار کی طرف جانے لگا۔

"میں آج لیمونیڈ نہیں پیوں گی۔" زینی نے اسے وہیں روک دیا۔

کرم علی نے قدرے حیرانی سے مڑ کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔ "کچھ اور پینا چاہتی ہیں آپ؟"

"ہاں۔"

"کیا؟"

''آپ لیمونیڈ کے علاوہ کیا پیتے ہیں؟''

''بہت کچھ، چائے، کافی، سوپ، سوفٹ ڈرنکس، جوسز ''

زینی نے یک دم اسے ٹوکا۔ ''میں شراب میں آپ کی چوائس پوچھ رہی ہوں۔''

چند لمحوں کے لیے کرم علی کو جیسے جھٹکا لگا۔ زینی کے منہ سے اس طرح شراب کے تذکرے نے جیسے اسے کچھ حیران کیا تھا۔

''اوہ... میں شراب نہیں پیتا۔'' زینی نے ایک لمحے کے لیے حیران ہو کر اسے دیکھا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''آپ مذاق اچھا کرتے ہیں۔''

''یہ مذاق نہیں ہے۔'' کرم علی سنجیدہ تھا۔

''اگر نہیں پیتے تو کیوں نہیں پیتے؟'' زینی نے بے ساختہ کہا۔

''آپ پیتی ہیں؟'' کرم علی نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

''ہاں۔'' اس نے بے دھڑک کہا۔

کرم علی کو اندازہ تھا پھر بھی اس کے منہ سے یہ انکشاف سن کر چند لمحوں کے لیے اسے شاک ضرور لگا۔

''مگر میں نہیں پیتا۔''

''یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیوں نہیں پیتے؟''

''کیونکہ یہ میرے مذہب میں حرام ہے۔'' زینی بے اختیار قہقہہ مار کر ہنسی اور پھر بہت دیر تک ہنستی ہی رہی۔ کرم علی محظوظ نہیں ہوا وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آج رات میں اتنا ہنسوں گی۔''

زینی نے بالآخر اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ کرم علی نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے کہا۔

''کیا پئیں گی آپ؟''

''کم از کم آج رات میں یہاں لیمونیڈ پینے نہیں آئی '' زینی بھی یک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''یہ کھانا پینا، گھومنا پھرنا سب ٹھیک ہے مگر کچھ کام بھی ہونا چاہیے۔ کیا کینیڈا صرف یہ سب کچھ کرنے کے لیے بلایا ہے آپ نے۔''

''نہیں، کام کے لیے ہی بلایا ہے۔'' کرم علی نے بے ساختہ کہا۔

''تو پھر کام ہونا چاہیے۔ یہ فلم میرے لیے بہت اہم ہے کرم علی صاحب۔ ! صرف اس فلم میں کاسٹ ہونے کے لیے میں پاکستان میں اپنے سارے کام چھوڑ کر یہاں آئی ہوں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' کرم علی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''ظاہر ہے آپ فلم کے لیے ہی آئی ہوں گی۔ میرے لیے تو نہیں آئیں۔''

وہ نہیں جانتا تھا یہ جملہ اس کے منہ سے کیوں نکلا۔

''آئی تو آپ ہی کے لیے ہوں یہ اور بات ہے کہ آپ اپنا اور میرا دونوں کا وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' کرم علی کو اس کی بات نے حیران کیا۔

''ڈنر کی بات کر رہی ہیں؟'' کرم علی کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی اور زینی کو اس کی۔

''کس ڈنر کی؟'' وہ جھنجلائی۔ ''آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اتنا سج سنور کر آپ کے ہاں ڈنر کرنے آئی ہوں؟ میں یہاں آپ کے ساتھ رات گزارنے آئی ہوں۔''

اس نے بے حد صاف لفظوں میں کہا اور پھر کرم علی کا چہرہ دیکھا۔

کرم علی کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی تھی۔

''ایکسکیوز می۔'' کرم علی نے شاکڈ ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا میں اپنی بات دہراؤں؟'' زینی نے اسی انداز میں کہا۔ کرم علی کے چہرے کے تاثرات اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ آخر اس نے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ کرم علی اس طرح ری ایکٹ کر رہا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کو اس لیے یہاں نہیں بلوایا۔'' کرم علی نے بمشکل کہا۔ بہت سارے بت ایک بار پھر کرچی کرچی ہونا شروع ہو گئے تھے اور ان کی ساری کرچیاں کرم علی کو زخمی کر رہی تھیں۔

''یہ فلم میرے لیے بہت امپورٹنٹ ہے اور میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔''

زینی نے ایک بار پھر اپنی بات کو مختلف الفاظ میں دہراتے ہوئے کہا۔ وہ اس چوہے بلی کے کھیل سے واقعی اکتا چکی تھی جو اس کے خیال میں کرم علی اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

''اس فلم میں کاسٹ ہونے کے لیے آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

کرم علی کوشش کے باوجود اپنے لہجے کو تلخ ہونے سے نہ بچا سکا اور زینی نے اس تلخی کو نوٹ کیا تھا۔ اس نے وہاں آنے کے بعد پہلی بار کرم علی کے لہجے میں تلخی محسوس کی تھی۔

''تو پھر اور کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟'' وہ بے اختیار الجھی۔ کرم علی کی تلخی نے کچھ عجیب سا اثر کیا تھا اس پر۔

''کچھ بھی نہیں۔'' زینی چند لمحے کرم علی کا چہرہ دیکھتی رہی پھر بے اختیار ہنسی۔

''کچھ بھی نہیں تو پھر کینیڈا آپ نے مجھے کس لیے بلوایا ہے؟''

''اس کام کے لیے بہرحال نہیں بلوایا۔'' کرم علی نے بے ساختہ کہا۔

''اور یہ سیر و تفریح، شاپنگ، کھانا پلانا۔ یہ سب کس لیے؟ کوئی نہ کوئی تو ہو گی وجہ اس کی۔'' وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

''آپ سے ''یہ قیمت'' میں نہیں چاہتا۔ میں آپ کی بہت عزت کرتا تھا۔'' وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

''تھا؟'' زینی نے ہنس کر جیسے سوال کیا۔

کرم علی نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور آپ اتنے دنوں یہ سمجھتی رہیں کہ میں آپ سے ... مائی گاڈ۔'' کرم علی کو جیسے سوچتے ہوئے بھی تکلیف ہوئی۔

''یہ فلم انڈسٹری ہے کرم علی صاحب! یہاں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جتنا بڑا رول، اتنی بڑی قیمت۔'' زینی بھی یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

''میری فلم کے لیے آپ کو کسی سودے بازی کی ضرورت نہیں۔ مین رول آپ کا ہے۔ آپ کو ہی ملے گا۔'' ''ایسے ہی؟'' زینی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ہاں، ایسے ہی۔''

''کیوں؟''

''اس کیوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔''

''ہونا چاہیے۔''

کرم علی چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''میں ''جانور'' نہیں ہوں۔''

زینی نے اس کی بات پر بے اختیار قہقہہ لگایا، یوں جیسے کرم علی نے اسے کوئی لطیفہ سنایا تھا۔

''ہر مرد کے اندر ایک جانور ہوتا ہے۔''

''یہ آپ سے کس نے کہا؟'' کرم علی کو اس کی بات جیسے چبھی۔

''میرا تجربہ ہے۔'' اس نے کرم علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کی نظروں میں بے باکی نہیں تھی۔ اس کی نظروں میں آگ کی چپتیں تھیں۔ کرم علی کو آنچ آئی۔

''زندگی کو تجربوں کی نذر نہیں کرنا چاہیے۔'' کرم علی نے اس سے نظریں چرائیں۔ وہ راہ فرار تھی جو اس نے ڈھونڈی تھی۔

''تو کس کی نذر کرنا چاہیے؟'' وہ اس کے اگلے سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ وہ اسے ہر بات پر لاجواب نہیں کر سکتا تھا۔

''آپ ایک عجیب آدمی ہیں۔ پانچ کروڑ کی ایک فلم میں لیڈ رول کے لیے آپ کو مجھ سے کچھ نہیں چاہیے۔ سوال پیدا ہوتا ہے، کیوں؟'' زینی نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد کہا۔

''سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ ہر چیز کی قیمت کیوں دینا چاہتی ہیں؟'' کرم علی نے قدرے ترش انداز میں کہا۔

''میں کسی کا احسان نہیں لینا چاہتی۔''

''اور آپ اس احسان کی قیمت اپنی عزت کے ساتھ اتارنا چاہتی ہیں۔'' کرم علی نے کسی لحاظ کے بغیر کہا۔

زینی کا چہرہ ایک لمحے کے لیے سرخ ہوا۔ اسے کرم علی کی بات گالی کی طرح لگی تھی کیونکہ آج تک کسی مرد نے اس سے ایسی بات نہیں کی تھی۔

''عورت کی ''عزت'' بہت ''قیمتی'' ہوتی ہے۔'' کرم علی نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ زینی کا رنگ کچھ اور بدلا۔ اس نے اسے دوسری گالی دی تھی۔

''عورت کی ''عزت'' کے بارے میں مجھے لیکچر ایک ایسے مرد کی زبان سے نہیں سننا جس نے کسی رشتے کے بغیر رات کے اس وقت مجھے اپنے گھر بلایا ہوا ہے۔''

کرم علی چپ رہ گیا، وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس نے بھی اسے ایک ایکٹریس سمجھ کر ہی اتنی دیدہ دلیری سے بلوا لیا تھا۔ ایک شریف لڑکی سمجھ کر اس طرح کیسے بلوا سکتا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔''

اس بار چپ ہونے کی باری زینی کی تھی۔ وہ یہ توقع نہیں رکھتی کہ وہ اتنی آسانی سے فوری طور پر اپنی غلطی کو تسلیم کرے گا۔

''میں پھر بھی یہی کہتا ہوں۔ عورت کی عزت بہت قیمتی ہوتی ہے۔'' کرم علی نے اپنے دہرائی۔

''اسی لیے دنیا میں سب سے ''زیادہ'' اور سب سے ''کم'' قیمت اس کی ''عزت'' ہی کی لگتی ہے۔''

زینی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں الاؤ تھا اور اس الاؤ میں کیا کیا جل رہا تھا۔ کرم علی کیسے جانتا۔

''مجھے جانا چاہیے۔ خدا حافظ۔'' اس نے یک دم دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں باہر تک چھوڑنے آتا ہوں آپ کو۔'' کرم علی نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہا۔

''ابھی بھی؟'' زینی نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کو دیکھا۔

کرم علی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ کچھ کہنے اور سننے کے لیے اب باقی کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ عارفہ نہیں تھی۔ ویسی ہی عورت تھی جن سے وہ پچھلے کئی سالوں سے بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس کے ساتھ باہر پورٹیکو تک آتے ہوئے کرم علی نے جیسے سارے ''نتائج'' اخذ کیے۔

''کیا میں سمجھوں کہ یہ فلم مجھے ہی ملے گی؟'' باہر پورٹیکو میں کھڑی گاڑی کے پاس آ کر زینی نے کرم علی سے کہا۔

''صبح میرا منیجر آپ سے ایگریمنٹ سائن کروا لے گا اور آپ کی واپسی کی ٹکٹ بھی کنفرم کروا دے گا۔'' کرم علی نے ایک ہی جملے میں دونوں کام کیے۔

''میں کبھی نہ کبھی آپ کے اس احسان کا بدلہ بھی اتار دوں گی۔'' زینی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بے حد عجیب لہجے میں کہا۔

''وہ تب ہوگا جب ہم دوبارہ کبھی ملیں گے۔'' کرم علی نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''یہ مت کہیں۔ زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔ کب کس کو کس کے سامنے لے آئے کوئی نہیں جانتا۔''

''لیکن میری خواہش ہے کہ میں آپ سے دوبارہ کبھی نہ ملوں پری زاد!''

اس نے ان سارے دنوں میں پہلی بار اس کا نام نہیں لیا۔ پہلی بار اسے پری زاد کہا اور اس کے منہ سے اپنے لیے پری زاد کا لفظ سن کر زینی کی زبان پر آئے بہت سارے لفظ غائب ہو گئے۔

اس نے اسے اس کی حیثیت جتائی تھی۔ وہ اس کے لیے ایک ایکٹریس تھی اور بس اور وہ اس کا ایک مداح تھا اور بس سینما میں بیٹھ کر اس کا کام دیکھ کر تالی بجانے والا اس کے کام کی ستائش میں تفریحی جملے بولنے والا اور بس۔ اس سے زیادہ تو اس نے زینی کے بارے میں سوچا تک نہیں ہوگا پھر وہ اس سے کیا بحث کر رہی تھی؟ کیوں بحث کر رہی تھی؟ یہ اس کی مہربانی تھی کہ وہ اس کے "فن" ہی کا دلدادہ تھا اور اسے کسی اور "کام" کے بغیر وہ فلم دے رہا تھا۔ پھر کرم علی سے کیا توقع لگا رہی تھی۔ اسے کیا جتانا چاہ رہی تھی۔ ان چند لمحوں میں کرم علی کے سامنے کھڑی زینی نے ہر چیز کو ایک بار پھر سے ارینج کر لیا تھا۔ وہ "پری زاد" تھی۔ "زینی" نہیں۔ اس کو "پری زاد" کی طرح پیش آنا تھا "زینی" کی طرح نہیں۔

وہ کسی کو اسے ڈراپ کرآنے کی ہدایات دینے میں مصروف تھا۔ زینی نے اس کے گھر پر ایک آخری الوداعی نظر ڈالی۔ ان دونوں کے درمیان مزید کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سلام دعا کا تبادلہ تک نہیں۔

☆☆☆

اس رات کرم علی کے گھر سے واپس آکر وہ ساری رات ہوٹل میں اپنے کمرے میں بیٹھی جاگتی رہی اور سگریٹ پھونکتی رہی تھی۔ کرم علی کی باتیں چاہنے کے باوجود وہ اپنے ذہن سے نکال نہیں پا رہی تھی۔ وہ نیزے کی انیوں کی طرح اسے چبھ رہی تھیں۔

"عجیب آدمی ہے۔" سلطان نے صبح زینی سے رات کا قصہ سننے کے بعد کہا تھا۔

"ہاں، عجیب آدمی ہے لیکن اچھا آدمی ہے۔" اس نے پہلا جملہ کہنے کے بعد کچھ توقف کرتے ہوئے کہا۔

سلطان نے کچھ حیران ہو کر زینی کو دیکھا، وہ پہلی بار اس کے منہ سے کسی مرد کی تعریف سن رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا لفظ اچھا کہنے کے لیے زینی کو کتنا تردد کرنا پڑا ہوگا، اسے صرف سلطان ہی جان سکتا تھا اور وہ اسی لیے اس لفظ کو کرم علی کے لیے استعمال کرتے ہوئے سن کر حیران ہوا تھا۔

"واقعی اچھا لگا آپ کو؟" سلطان نے بے حد دلچسپی سے پوچھا۔

"شوبز میں آئے اتنا عرصہ گزر گیا ہے، یہ پہلا مرد ملا ہے مجھے، جس نے میرا ہاتھ تک نہیں پکڑا۔ برا لگنا چاہیے کیا؟" زینی نے جواباً سوال کیا۔

سلطان بول نہیں سکا۔

"ہو سکتا ہے آج فون کرے۔" اس نے کچھ دیر کے بعد زینی سے کہا۔ وہ اپنا سامان پیک کرنے میں مصروف تھی۔

"نہیں کرے گا۔" زینی نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"آپ سے محبت کرتا ہے تو" سلطان نے کچھ کہنا چاہا۔

"کس نے کہا محبت کرتا ہے؟" زینی کے ہاتھ رک گئے۔

"آپ نے دیکھا، کس طرح سال بھر سے آپ کو تحائف بھجواتا رہا۔ یہاں بھی آپ کو سر پر اٹھائے پھرا۔" سلطان نے کرم علی کی حمایت کی۔

"سر سے گرادیا ہے اب اس نے مجھے۔ تسلی رکھو، اب کوئی تحفہ نہیں آئے گا۔" زینی نے ہنس کر استہزائیہ انداز میں کہا۔

"کیوں، ایسا بھی کیا کر آئی ہیں پری جی؟"

سلطان جیسے ہول کر رہ گیا۔ زینی نے جواب نہیں دیا۔ وہ سامان پیک کرتی رہی۔

"میں فون کروں اسے؟" سلطان کو پتہ نہیں کیا فکر لاحق ہو گئی تھی۔

"کیوں؟" زینی نے برہمی سے اسے دیکھا۔ "تمہیں پریشانی ہے کہ کہیں فلم ہاتھ سے نہ نکل جائے۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"آپ کو لگتا ہے، مجھے بس یہی پریشانی ہے۔" سلطان نے رنجیدگی سے کہا۔

"راستے بند کر کے کیوں جا رہی ہیں پری جی! اگر اچھا آدمی ہے، محبت کرتا ہے تو شادی کر لیں اس سے۔ آج نہیں تو دو سال بعد۔"

زینی کو بے اختیار غصہ آیا۔ "تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"میں نے کیا غلط کہا۔" سلطان سہم گیا۔

"کبھی سوچنا بھی مت کہ ..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی زبان پر کوئی بات آتے آتے رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ رات صرف زینی ہی نے جاگ کر نہیں گزاری تھی، کرم علی بھی ساری رات نہیں سویا تھا۔ زینی کے ساتھ چند گھنٹے پہلے کی ملاقات جیسے ایک بھیانک خواب بن کر اسے بار بار یاد آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ یہ سب کچھ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا۔ فریب، اشتباہِ نظر اور اس کے بعد سفاک حقیقت۔ اس رات اسے عارفہ یاد نہیں آئی تھی لیکن اس کی بددعا بہت یاد آئی تھی۔

وہ اتنے سالوں سے کسی آسیب کی طرح اس کی زندگی سے چمٹ گئی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ اس کی قسمت میں سب کچھ تھا۔ محبت نہیں تھی۔ وہ عورت نہیں تھی جسے وہ چاہتا، اور وہ اسے اس طرح چاہتی جس طرح عارفہ نے اسے چاہا تھا۔ بے لوث محبت ... اس نے اقرار کیا تھا۔ عارفہ جیسی لگنے والا چہرہ عارفہ نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ باہر سے، نہ اندر سے۔

وہ عارفہ کے فریب میں پری زاد کے پاس گیا تھا اور پھر عارفہ کے بجائے اسے زینی سمجھ کر اس کے قریب ہوتا گیا تھا۔ وہ اس کے لیے عارفہ سے الگ وجود رکھنا شروع ہو گئی تھی۔ ایسا وجود جو اسے عارفہ کی یاد نہیں "دلاتا" تھا۔ اس کی یاد "بھلاتا" تھا۔ لیکن ایک جھٹکے میں پری زاد نے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ کر اسے ہوا میں معلق کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کی کشتی اب بھی بھنور کے بیچ میں ہی رہی تھی۔

شوبز کی "عورت" کے ساتھ کرم علی کی یہ پہلی اور آخری شناسائی تھی۔ اس نے اس رات پری زاد کو اپنے گھر اور دنیا سے ہی نہیں جھٹکا تھا، اس کا خیال بھی اس نے اپنے ذہن اور دل سے نکال دیا تھا اور اس وقت اس نے یہ کام بے حد آسانی سے کر لیا تھا۔ اسی رات اس نے منیجر کو پری زاد کے پے کا کنٹریکٹ پیپرز سائن کروانے کی بھی ہدایت کر دی تھی۔

اگلے تین دن جو زینی نے وہاں گزارے، اس دوران ان کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ کرم علی رابطہ چاہتا بھی نہیں تھا اور اسے اطمینان رہا کہ زینی نے بھی ایسی کوشش نہیں کی۔

جس دن زینی کی فلائٹ تھی، اس شام اس کے منیجر نے کرم علی کو ایک بند لفافہ دیتے ہوئے مطلع کیا کہ زینی نے روانہ ہونے سے پہلے ایئر پورٹ سے منیجر کو فون پر اطلاع دی تھی کہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں کچھ سامان اور ریسپشن پر کرم علی کے لیے ایک لفافہ چھوڑ رہی ہے، وہ انہیں اس تک پہنچا دے۔

لفافہ کھولنے تک کرم علی کو اس سامان اور اس خط کے مضمون کے بارے میں تجسس تھا۔ وہ اس کے لیے کیا چھوڑ کر گئی تھی؟ وہ اس سے کیا کہنا چاہتی تھی؟

لفافے کے اندر خط نہیں تھا۔ صرف کاغذ پر چند جملے تحریر تھے۔ اس کا نام اور کسی القاب کے بغیر۔

''آپ کے ساتھ کی گئی شاپنگ کی چیزیں چھوڑ کر جارہی ہوں۔ مجھے مفت میں کچھ بھی لینے کی عادت نہیں ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا، آپ ''جانور'' نہیں ہیں۔ مدت کے بعد ایک ''انسان'' سے مل کر خوشی ہوئی۔''

اس تحریر کے آخر میں زینی نے اپنا نام بھی نہیں لکھا تھا۔ کرم علی نے اس کاغذ کے ٹکڑے کر کے اسے ویسٹ پیپر باسکٹ میں پھینک دیا۔ اسے وہ تحریر بری لگی تھی۔

گھر واپسی پر اس نے اپنے بیڈ روم کو اس سامان سے بھرا ہوا پایا تھا۔ ہاؤس کیپر نے شاید یہ سوچ کر وہ ساری چیزیں اس کے کمرے میں اسٹاک کردی تھیں کہ وہ اس کی شاپنگ تھی جو منیجر نے گھر پہنچائی تھی لیکن ان شاپنگ بیگز اور ڈبوں کے انبار کو دیکھ کر کرم علی کا موڈ بری طرح آف ہوا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی اس کی چیزیں اس کے منہ پر مار گیا تھا۔ کم از کم کرم علی کو اس وقت زینی کی یہ حرکت ایسی ہی لگی تھی۔ کرم علی کو اگر آج تک لوگوں کے اپنے آپ سے بے دھڑک مطالبوں اور خود غرضانہ فرمائشوں سے تکلیف پہنچی تھی تو آج ان تحائف کی واپسی بھی اسی طرح کی تکلیف پہنچا رہی تھی۔ ان میں سے ہر چیز تقریباً اسی طرح جوں کی توں واپس آگئی تھی۔ کچھ چیزوں کو شاید دیکھنے کے لیے ان کی پیکنگ کھولی گئی تھی مگر کسی بھی چیز کو استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

ان چیزوں کو وہاں سے اٹھوا کر دوسرے کمرے کی خالی وارڈ روبز اور Closets میں رکھواتے ہوئے کرم علی کو آدھ گھنٹہ لگا تھا۔ یہ اطلاع بھی مل گئی تھی کہ وہ جانے سے پہلے ہوٹل کے دونوں کمروں کے ڈیوز ادا کر گئی تھی۔ اس ایڈوانس کے علاوہ جو ان کمروں کو بک کرواتے ہوئے کرم علی کی کمپنی نے ادائیگی کی تھی، اگر پلین کی ٹکٹس پہلے خریدی نہ گئی ہوتیں تو اس وقت وہ شاید ان کی خریداری کی ادائیگی کے بارے میں بھی سن رہا ہوتا۔ کرم علی کو اس پر مزید غصہ آیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتی تھی؟ وہ اس کو کیا جتانا چاہتی تھی؟ یہ کہ وہ بڑی خوددار تھی۔

''خوددار؟ جو ایک معمولی فلم کے لیے کسی بھی مرد کے ساتھ...؟''

کرم علی نے تلخی سے سوچا۔

''اس میں اور ایک طوائف میں کیا فرق ہے'' کرم علی اسے معاف کرنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ اس کے بارے میں جتنا برا سوچ سکتا تھا، سوچ رہا تھا۔ جتنا بدظن ہو سکتا تھا، ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اگر کرم علی کے بے زیبی کی کینیڈا سے روانگی کے بعد یہ قصہ ختم ہو گیا تھا تو اس کی فیملی کے لیے یہ اس معاملے کا آغاز تھا۔

اس کی ساری فیملی آہستہ آہستہ پچھلے کچھ سالوں میں کینیڈا منتقل ہو چکی تھی۔ اگرچہ کرم علی نے ان کو ماں باپ کے اصرار کے باوجود اپنے بزنس میں ڈائریکٹ حصہ دار بنانے کے بجائے انہیں اپنا اپنا الگ بزنس شروع کرنے میں مدد کی تھی لیکن اپنا بزنس ہونے کے باوجود ان میں سے ہر کوئی ابھی بھی سال میں آنے والے تمام بڑے اخراجات کے لیے کرم علی کا دروازہ ہی کھٹکھٹاتا تھا اور اس کو ان میں سے کوئی بھی کرم علی کا احسان نہیں سمجھتا تھا۔ ان سب کے نزدیک یہ کرم علی کی ذمہ داری تھی۔ وہ شوکت زمان سے ملنے والی دولت میں ان سب کی ذمہ داریاں اٹھاتا اور کرم علی نے یہ سب کچھ جیسے بخوشی قبول کر لیا تھا۔

یہ سب وہ پچھلے کئی سالوں سے پہلے ہی کر رہا تھا۔ تب بھی جب مہینے میں کمائے جانے والے سو روپے پیسے پاکستان بھیج کر خود وہ اکثر ادھار لے کر گزارا کرتا تھا اور اب تو خیر اس کی زندگی ہی بدل چکی تھی۔ وہ انہیں ان کے مطالبات سے بہت زیادہ بھی دیتا تب بھی اس کے اپنے لائف اسٹائل اور زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔

کرم علی کی فیملی کو پری زاد کے بارے میں پہلی بار پتہ تب چلا تھا، جب کرم علی کے بھائی کی منیجر کے ساتھ ہونے والی ایک ''اتفاقی'' ملاقات میں آصف کو یہ پتہ چلا کہ پانچ کروڑ روپے کی ایک بڑی رقم پاکستان کسی پروجیکٹ کے لیے مختص کی جا رہی تھی۔

وہ پروجیکٹ کیا تھا، آصف کو یک دم یہ کرید لگ گئی تھی اور اس پروجیکٹ کے بارے میں جاننے میں اسے زیادہ وقت نہیں ہوئی تھی لیکن وہ ہکا بکا ضرور رہ گیا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس کے گھر والے اور خاص طور پر کرم علی کی ماں اس فلم کا سن کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ کرم علی کو زندگی میں کبھی بھی فلموں یا ایسی دوسری چیزوں میں دلچسپی نہیں رہی تھی اور اب ایک دم ایک ایسی پاکستانی فلم پر پانچ کروڑ روپے لگانا۔

ابھی وہ سب اسی معمے کو حل کرنے میں مصروف تھے کہ آصف کے ذریعے ہی انہیں پری زاد کی کینیڈا آمد اور پھر کرم علی کے ساتھ اس کی روزانہ کی مصروفیت اور سرگرمیوں کا پتہ چلنے لگا۔ کرم علی سیر و تفریح کے لیے جاتا، انہیں یہی چیز دنگ کر دیتی اور کہاں یہ کہ وہ ایک غیر عورت کے ساتھ اور وہ بھی ایک فلم ایکٹریس کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے آفس چھوڑ کر جا رہا تھا۔ ان سب کے ہاتھ پاؤں نہ پھولتے تو اور کیا ہوتا۔

عارفہ سے منگنی ختم ہونے کے اگلے چند سالوں میں کرم علی کے گھر والوں نے وقتاً فوقتاً اس پر شادی کے لیے دباؤ ڈالا تھا۔ اس وقت وہ عارفہ کی شادی ہو جانے کے بعد... خاندان کو دکھانے کے لیے فوری طور پر کرم علی کی کہیں نسبت ٹھہرانا چاہتے تھے۔ لیکن ان کا دباؤ اور حربے کرم علی پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ وہ اگلے کئی سال پاکستان آیا ہی نہیں اور اس نے اپنے والدین کو دو ٹوک الفاظ میں یہ بات کہہ دی تھی کہ وہ اب شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ اس وقت ہر ایک کا خیال تھا کہ یہ فیصلہ وقتی دکھ اور اشتعال کا نتیجہ ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کرم علی اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کرے گا لیکن شوکت زمان سے ملنے والی لمبی چوڑی جائیداد کے بعد اگلے کچھ سالوں میں اس کے کاروبار کو مزید پھیلا دینے کے باوجود کرم علی نے جب شادی میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی تو اس کے گھر والوں کو بالآخر یہ یقین آ گیا تھا کہ وہ واقعی شادی کرنا نہیں چاہتا۔ تب تک اس کے باقی بہن بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور ہر ایک اپنی زندگی میں مصروف ہونے کے بعد کرم علی کی زندگی یا متوقع شادی میں پہلے کی طرح دلچسپی لینا چھوڑ چکا

تھا بلکہ اس کے بہن بھائی اب کرم علی کی شادی کے ذکر پر الٹا اپنے والدین کو منع کرتے کہ اگر بھائی جان شادی نہیں کرنا چاہتے تو انہیں شادی کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ بات شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتی۔

اپنی طرف سے ہر ایک یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ کرم علی کے فیصلے اور جذبات کی کتنی پروا کرتا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ سب ایک ہی خوف اور عدم تحفظ کا احساس پالے ہوئے تھے۔ کرم علی کی شادی کی صورت میں اس کے رویے میں آنے والی کسی متوقع تبدیلی کے نتیجے میں ان مالی مراعات اور آسائشات سے محروم ہونے کا خدشہ، جو وہ اب کرم علی سے حاصل کر رہے تھے۔ بیوی اور پھر اپنے بچے ہو جانے کے بعد کرم علی یقیناً اپنے بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کے مطالبات اس طرح سنتا نہ مانتا جس طرح وہ اب مانتا تھا اور یہ جیسے سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل جانے کے مترادف ہوتا۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے یہ تصور بھی سوہان روح تھا۔ وہ آپس میں اس خدشے کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر اندر ہی اندر وہ بے حد خود غرض ہو کر بھی چاہتے تھے کہ کرم علی شادی نہ کرے۔

وہ ساری زندگی اسے اپنی اولاد کے لیے گاڈ فادر کا رول ادا کرتے دیکھتے رہنا چاہتے تھے اور کہیں نہ کہیں ان میں سے ہر ایک یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کرم علی کی شادی نہ ہونے کی صورت میں اس کی ساری جائیداد اس کے بہن بھائیوں اور ان کی اولاد کے حصہ میں ہی آنے والی تھی اور اس جائیداد کے کئی حصے ہونے کے باوجود وہ اتنی زیادہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنی باقی زندگی رئیسوں کی طرح گزار سکتا تھا۔

اور اب 37 سال کی عمر میں کرم علی، اچانک کسی عورت میں دلچسپی لیتا نظر آنے لگا تھا اور عورت بھی ایک فلم ایکٹریس۔ ہنگامی طور پر کینیڈا میں ہی آصف کے گھر پر کرم علی کے سارے بہن بھائیوں کا "اجلاس" منعقد ہوا۔ ہر ایک نے جس حد تک ممکن تھا، اپنی ماں کی مزید برین واشنگ کی کیونکہ باپ کی وفات کے بعد وہی ایک "چابی" تھی جسے وہ کرم علی کو استعمال کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ چابی یا ہتھیار... وہ بہ وقت ضرورت ماں کے رول کو بدل لیا کرتے تھے اور وہ پوری دل جمعی سے ان کے ہاتھ میں استعمال ہوتی تھیں۔ ان کا واقعی یہ خیال تھا کہ بڑا بھائی ہونے کے ناتے کرم علی پر ان سب کا "حق" ہے اور اسے یہ "حق" ہر وقت ادا کرنا چاہیے کیونکہ اللہ نے اسے بے حد و حساب ماں باپ کی دعاؤں کی وجہ سے نوازا ہے۔ کرم علی ہمیشہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ کر سر جھکائے یہ سب کچھ خاموشی سے سنتا تھا، کسی بت کی طرح۔

اور اب اس کی ماں کو ایک بار پھر ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کو یقین ہو گیا تھا کہ کرم علی اس ایکٹریس میں اس لیے دلچسپی لے رہا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ "اپنی" مرضی سے ایک "ایکٹریس" کے ساتھ "شادی"... ایسا ہو جاتا تو یہ دو قیامتیں تھیں جو ان سب پر بیک وقت ٹوٹتیں۔

ان میں سے کوئی یہ نہیں چاہتا تھا کہ کرم علی عمر کے کسی بھی حصہ میں "اپنی پسند" کی شادی کرے اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک ایکٹریس کے ساتھ شادی کر لیتا جس سے ان کا خاندان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ "ایک ناچنے گانے والی آوارہ عورت" ان میں سے ہر ایک نے کئی کئی بار اپنی ماں کے سامنے یہ الفاظ دہرائے۔ اتنی بار کہ اس کی ماں واقعی تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔

تو اب کیا کیا جائے؟

یہ وہ سوال تھا جس پر وہ سب بالآخر اپنا سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ لمبی سوچ بچار کے بعد حل یہ نکالا گیا تھا کہ کرم علی کے لیے ایمرجنسی میں کوئی خوبصورت، کم عمر اور لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی لڑکی کو ڈھونڈا جائے اور پھر کرم علی کی ماں اسے جذباتی طور پر مجبور کر کے اس کے ساتھ شادی کروا دے۔

لڑکی کا خوبصورت ہونا اس لیے ضروری تھا تا کہ کرم علی کے سر سے اس ایکٹریس کا بھوت اتارا جا سکے اور ان کا خیال تھا کہ وہ کسی بہت ہی خوبصورت لڑکی کے ساتھ ماں کے مجبور کرنے پر فوری طور پر شادی کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس کی خوبصورتی، کم عمری کرم علی کے لیے جیسے ایک چارہ ہوتی۔

لڑکی کا کم عمر ہونا اس لیے ضروری تھا تا کہ اس کو ذہنی طور پر کرم علی کی فیملی آسانی سے اپنی مرضی کے مطابق ہینڈل کر سکتی۔ انہیں کسی ''سمجھ دار'' لڑکی کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک ناسمجھ، کسی حد تک احمق، کمزور اور امیچور لڑکی کی ضرورت تھی۔ جس کی خامیاں اور کمزوریاں وہ بہ وقت ضرورت اپنے مفاد کے لیے کرم علی کے سامنے لا کر رکھتے رہتے۔ ان سب کو یقین تھا کہ ایسی کسی لڑکی کی ناسمجھی اور بے وقوفی کرم علی جیسے آدمی کی نظروں میں کبھی بھی اسے ''پسندیدہ بیوی'' کا درجہ حاصل نہ کرنے دیتیں۔

اور اس کا لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنا اس لیے ضروری تھا تا کہ اس کا خاندان اور خود وہ ہمیشہ کرم علی کے خاندان کے دباؤ میں رہتے۔ کسی اچھے خاندان کی لڑکی کو کرم علی کے لیے لانے میں اتنے رسک فیکٹرز تھے کہ اس پر تو ان سب کے درمیان متفقہ اتفاق رائے تھا کہ لڑکی کو کسی بہت ''غریب گھرانے'' سے ہونا چاہیے۔ وہ کرم علی کے لیے کوئی ایسا خاندان نہیں چاہتے تھے جس کے ساتھ کسی رشتہ میں منسلک ہونے کے بعد کرم علی کی زندگی میں ایک دوسرے خاندان کی گنجائش، اہمیت یا قدر ہوتی۔ اگر کرم علی کے گھر والوں کے لیے ممکن ہوتا تو وہ ایسی لڑکی کو یتیم خانے سے لانا زیادہ پسند کرتے۔

اب واحد مسئلہ جو رہ گیا تھا، وہ ایسی لڑکی کا ''فوری'' انتخاب تھا اور اس فوری انتخاب نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے پرانے گھر کے آس پاس کے گھروں اور ان خاندانوں پر نظر دوڑائیں جن کے ساتھ کبھی ان کے تعلقات تھے اور اس ''ریسرچ'' نے کرم علی کی ماں کی توجہ ''زری'' کے خاندان کی طرف دلائی۔ وہ کبھی ان ہی کے محلے میں رہتے تھے اور زری کا گھر اس پورے محلے میں لڑکیوں کی خوبصورتی کی وجہ سے مشہور تھا۔ کسی زمانے میں عارفہ سے منگنی ختم ہونے کے بعد کرم علی کی ماں کو ایک دو بار کرم علی کا رشتہ طے کرنے کے لیے اس گھر کی لڑکیوں کا خیال آتا رہا تھا لیکن بعد میں وہ علاقہ اور پھر پاکستان چھوڑنے کے بعد وہ سارے حوالے اور خیالات ختم ہو گئے تھے۔

زری کا خاندان اب کس حالت میں تھا، اب کون سی بیٹی شادی کے قابل تھی؟ اور اس لڑکی کی شکل و صورت اور عمر کیا تھی؟ اب یہ معاملات زیر غور آنے تھے لیکن اس سے پہلے کسی کا پاکستان جانا ضروری تھا کہ زری کے گھر جایا جا سکے۔

اور اس اہم کام کے لیے پاکستان میں مقیم کرم علی کی واحد بہن سے رابطہ کیا گیا جس نے پہلے تو کرم علی کی شادی کے سوال پر ناراضی کا اظہار کیا۔ آخر اس عمر میں بھائی جان کو شادی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے بعد اس نے ان معیاروں کے بارے میں شور واویلا کیا جو کرم علی کی ماں لڑکی اور اس کے گھر والوں میں چاہتی تھی، لیکن جب اسے اوڈو اسٹن کرم علی اور اس ایکٹریس کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا گیا تو اس کے تمام

اعتراضات منٹوں میں ختم ہو گئے۔ صورت حال واقعی بہت سنگین تھی۔

کرم علی کی بہن اگلے دن اس پرانے محلے میں جہاں اس نے پورا بچپن گزارا تھا، زری کا گھر ڈھونڈنے کے لیے چکراتی پھری لیکن بالآخر اس نے زری کا گھر تلاش کر لیا تھا۔

دروازہ زری نے کھولا تھا اور کرم علی کی بہن کا دل دروازے پر زری کی شکل دیکھتے ہی سجدہ شکر بجالانے کو چاہا۔ نہ صرف گھر کی حالت ویسی تھی جیسی وہ چاہتے تھے بلکہ لڑکی بھی ویسی ہی تھی جیسی ان لوگوں کی خواہش تھی۔ کرم علی کی بہن زری کو نہیں پہچانتی تھی۔ وہ زری کی بڑی بہنوں سے واقف تھی اور زری اس وقت بہت چھوٹی تھی جب اس کی شادی ہوگئی تھی اور وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔ زری کے گھر میں اس وقت وہ اور اس کی دو دوسری بہنیں موجود تھیں مگر اس کے ماں باپ میں سے کوئی بھی گھر پر نہیں تھا، اس لیے بڑے حوالے دینے کے باوجود زری یا اس کی بہنوں کو شکیلہ، کرم علی کے گھر یا جہاں داد اور اس کے خاندان کے بارے میں کچھ یاد نہیں آیا لیکن انہوں نے بہر حال شکیلہ کو گھر کے اندر ہی اپنی ماں کا انتظار کرنے کے لیے بٹھا لیا تھا۔ شکیلہ اس کی بہنوں کا نام لے رہی تھی تو یقیناً زری کی اماں سے بھی واقف ہوگی۔ زری نے یہی سوچا تھا۔ ایسی کوئی واقفیت اسے نہ بھی نظر آتی تو بھی وہ شکیلہ کے حلیے اور خاص طور پر اس کے سونے کے زیورات سے اس حد تک مرعوب ہو چکی تھی کہ اسے بخوشی اندر بٹھا لیتی۔

پہلی بار ان کے گھر میں کوئی ایسا آیا تھا جو ان سے شناسائی کا دعویٰ کر رہا تھا اور سونے سے لدا ہوا تھا۔ زری نے نہ صرف شکیلہ کو فوری طور پر اندر بٹھایا تھا بلکہ وہ اور اس کی بہنیں اس کی جتنی خاطر تواضع کر سکتی تھیں، انہوں نے کی تھی۔

شکیلہ اس خاطر تواضع سے تو خیر کیا متاثر ہوتی لیکن اس نے وہاں ان چند گھنٹوں کے قیام میں ان تینوں بہنوں کے ساتھ گھر میں موجود باقی افراد کا بھی تفصیلی بائیو ڈیٹا حاصل کر لیا تھا اور اس کے تجزیے کے مطابق زرینہ عرف زری کرم علی کے لیے ان تمام معیار پر پوری اترتی تھی جو کینیڈا سے اس کی ماں نے اسے ڈکٹیٹ کروائے تھے۔ زری اسے اپنی دوسری دونوں بہنوں سے زیادہ خوبصورت تو لگی ہی تھی مگر زیادہ سیدھی، بھولی، فرمانبردار، سگھڑ، بااخلاق اور کم گو لگی تھی۔

☆☆☆

"میں کسی ایسی فلم میں کام نہیں کروں گی جس میں سفیر خان ہو اور جسے انور حبیب ڈائریکٹ کرے۔"

زینی نے دوٹوک انداز میں تبریز پاشا سے کہا۔

"پاشا پروڈکشنز کی فلم میں کام کرتے ہوئے کوئی ہیروئن شرطیں نہیں رکھتی۔" تبریز پاشا نے بے حد ناگواری سے اس سے کہا۔

"نہیں رکھتی ہوگی۔ میں رکھ رہی ہوں۔ میں نے آپ کو پہلے ہی بتایا تھا، میں تب کام کروں گی جب اس میں سفیر اور انور دونوں نہیں ہوں گے۔"

"ان کو تو میں فلم میں لوں گا۔ میری ضرورت ہے۔ سفیر تو پروڈیوس بھی کر رہا ہے یہ فلم۔ انور کو ہٹا بھی دوں سفیر کو نہیں ہٹا سکتا۔" تبریز پاشا نے بے حد صاف لفظوں میں اسے بتا دیا۔

"تو پھر مجھے مت لیں، کسی دوسری لڑکی کو لے لیں۔ ویسے بھی چار ہیروئنز تو پہلے ہیں اس میں۔ میں کیا کروں گی اس فلم میں۔"

"تم اور سفیر لیڈ ہو اس فلم کی۔"

"فلم کی لیڈ مت کہیں، چندہ سین اور چار گانوں کی لیڈ کہیں۔" زینی ہنسی۔ تبریز کو اس کی ہنسی کھلی۔

"بہت غرور آ گیا ہے تم میں۔ چار فلمیں سائن کر لی ہیں تو تم سمجھ رہی ہوں کہ سرخاب کے پر لگ گئے ہیں تمہیں۔"

"سرخاب کے پر تو کسی کو بھی نہیں لگے ہوتے۔ مجھے نہیں لگے تو تبریز پاشا کو بھی نہیں لگے۔"

چند لمحوں کے لیے زینی کے ڈرائنگ روم میں خاموشی چھا گئی تھی۔ تبریز پاشا نے آج تک فلم انڈسٹری میں آنے والی بڑی سے بڑی ہیروئن کے نخرے اٹھائے تھے۔ انہیں دولت سے مالا مال کیا تھا۔ ان کی قسمتیں بھی بدلی تھیں لیکن اس نے کسی ہیروئن کو "دو ٹکے کی طوائف" سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی تھی کیونکہ وہ فلم انڈسٹری میں آنے والی ہر ہیروئن کے پورے شجرہ نسب کو جانتا تھا۔ وہ بازار کے کس گھر کے کس کوٹھے کی، کس عورت کی پیداوار تھی۔ اس کی ماں، نانی، پرنانی کون تھی اور اس کے مستقل گاہک کون تھے؟

سامنے بیٹھی ہوئی ہیروئن کا شجرہ بھی وہ جانتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا تعلق بازار سے نہیں، اس کے خاندان میں سے کوئی بھی وہاں کا نہیں۔ وہ اس کی ماں اور بہنوں کا نام نہیں جانتا تھا لیکن یہ جانتا تھا کہ پری زاد کے مستقل گاہک کون تھے۔ اس کی قیمت کیا تھی پھر وہ اسے "دو ٹکے کی طوائف" نہ سمجھتا تو کیا سمجھتا اور کسی طوائف کی زبان پر تبریز پاشا کا ذکر اس طرح آتا، یہ وہ کیسے برداشت کرتا۔

"پری زاد کو پچھلے دو تین دن سے بخار ہے، طبیعت خراب ہے ان کی۔ اسی لیے آج کل چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ پڑتی ہیں۔ میں سمجھاتا۔"

سب سے پہلے سلطان نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی، یہ جاننے کے باوجود کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کے باوجود اس نے تبریز کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ تبریز پاشا نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ اس نے نہ صرف سلطان کی بات کاٹی بلکہ اسے چند منٹوں میں انڈسٹری میں استعمال ہونے والی غلیظ ترین گالیوں سے بھی نوازا تھا۔ سلطان چپ رہا تھا، زینی نہیں اور یہ اس کی دوسری فاش غلطی تھی۔ وہ گالیاں جو پہلے تبریز سلطان کو دے رہا تھا، اب اسے دینے لگا تھا۔ اس کی آواز بے حد بلند تھی۔

"میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تم گالی مت دو۔" زینی چلائی۔

تبریز پاشا اس سے زیادہ بلند آواز میں چلایا۔ "تمہارا ڈرائنگ روم ـــــ؟ تمہارے باپ نے دیا ہے تمہیں یا بھائی نے؟ یا کسی شوہر نے؟ میرا گھر ہے یہ جو تمہیں رہنے کے لیے دیا ہے میں نے۔"

اس نے یہ چند جملے کہنے سے پہلے بعد میں اور بیچ میں بے تحاشا گالیوں کا استعمال کیا تھا۔

زینی اس بار کچھ بول نہیں سکی تھی، وہ واقعی اسی کا گھر تھا۔

"میں آج ہی اس گھر کو خالی کر دیتی ہوں۔ تم سنبھال رکھو اپنے گھر کو اپنے پاس اور اپنا منہ بند کرو۔" زینی نے بالآخر اس سے کہا۔

"ہاں، خالی کرو اس گھر کو لیکن اس فلم میں تم کیا، تمہاری ماں اور بہن بھی کام کریں گی۔ تم پاشا کی فلم میں کام نہیں کرو گی تو میں دیکھوں گا تم

اس گھر سے نکل کر کسی دوسری فلم کے سیٹ پر بھی کس طرح پہنچو گی۔ تم نے تبریز پاشا کو سمجھ کیا رکھا ہے؟ میں تو تمہیں زمین میں زندہ گاڑ کر تم پر کتے چھوڑ دوں تو اس پورے ملک میں کوئی ایک آدمی آ کر مجھ سے سوال نہیں کر سکتا اور تم اشتیاق رندھاوا کی رکھیل بن کر یہ سمجھنے لگی ہو کہ جو چاہو گی کرو گی، کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ فلم انڈسٹری ہے، بڑی بڑی ہیروئنیں آ کر چلی گئیں یہاں سے۔ بہتوں کو فارغ کر دیا میں نے بہتوں کو دن دہاڑے سڑک پر مروا دیا میں نے کوئی انگلی تک نہیں اٹھا سکا تبریز پاشا پر اور تم میں آج تیزاب پھنکوا دوں تمہارے چہرے پر تو ہیروئن تو کیا کوئی مرد تمہیں اپنے جوتے صاف کرنے کے لیے بھی نہیں بلائے گا۔ کل رات آٹھ بجے میری فلم کا مہورت ہے۔ وہاں خود آ جانا، ورنہ میرے آدمی آ کر تمہیں لے جائیں گے۔"

تبریز پاشا مزید کچھ کہے بغیر ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

زینی سرخ چہرے کے ساتھ وہاں کھڑی رہی۔ وہ پاکستان فلم انڈسٹری کی کامیاب ترین، معروف ترین اور مقبول ترین ہیروئن تھی اور اس نے اپنے ڈرائنگ روم میں کھڑے ہو کر انڈسٹری کے طاقتور ترین مردوں کے تکون میں سے ایک سے وہی کچھ سنا تھا، جو اس سے پہلے انڈسٹری کی ہر معروف ہیروئن سن چکی تھی یا پھر کسی نے اس لیے نہیں سنا ہو گا کیونکہ کسی نے بھی تبریز پاشا کو وہ سب کچھ کہنے کی جرأت نہیں کی ہو گی جو اس نے کہا تھا۔

"آپ کو کتنی بار سمجھایا ہے میں نے پری جی! لیکن آپ نے میری بات نہیں سنی۔ ان ہی باتوں کی وجہ سے ڈرتا تھا۔"

سلطان نے اسے مخاطب کیا۔ "آخر کیوں اس طرح بات کی آپ نے تبریز پاشا کے ساتھ۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے کیوں بیر لے رہی ہیں آپ؟"

سلطان بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ پاشا جو کچھ کہہ کر گیا تھا، سچ کہہ کر گیا تھا۔ سلطان جانتا تھا، فلم انڈسٹری کی کئی ہیروئنیں نہ صرف پاشا نے گھر بٹھا دی تھیں بلکہ فلم انڈسٹری کی کم از کم دو ابھرتی ہوئی ہیروئنوں کے قتل میں بھی پاشا کا ہی نام لیا جاتا رہا تھا۔ سلطان فلم انڈسٹری کو اندر سے جانتا تھا۔ انڈسٹری کے ہر "بڑے" اور "چھوٹے" کو اور پری زاد کچھ بھی سمجھنے اور دیکھنے پر تیار ہی نہیں تھی۔

وہ اگر کہہ کر گیا تھا کہ پری زاد پر تیزاب پھینکا جا سکتا تھا تو پھینکا جا سکتا تھا۔

مارا جا سکتا تھا تو واقعی مارا جا سکتا تھا۔

سلطان کے لیے یہ دھمکیاں نہیں تھیں، نہ ہی گیدڑ بھبکیاں کیونکہ کہہ کر جانے والا تبریز پاشا تھا۔

سلطان مسلسل بولتا رہا تھا اور زینی نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ وہ وہاں ڈرائنگ روم کے سینٹر میں کھڑی اسی طرح گم صم تھی جس طرح تبریز کے جاتے ہوئے تھی۔ بہت دیر بعد سلطان سے کچھ بھی کہے بغیر اس نے کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ سلطان جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے؟ کس نتیجے پر پہنچی ہے؟ اب کیا کرنے والی ہے؟

کیا مہورت پر جائے گی؟ مگر پری زاد چپ تھی اور سلطان کو اس کی چپ ہولا رہی تھی۔

ڈرائنگ روم سے باہر لاؤنج میں قدم رکھتے ہی زینی نے نفیسہ اور ربیعہ کو دیکھ لیا تھا۔

وہ دونوں بے حد پریشانی کے عالم میں لاؤنج کے ایک صوفہ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ یقیناً ان دونوں نے تبریز پاشا کی ''گفتگو'' سنی تھی۔ اگر اسے ''گفتگو'' کہا جا سکتا تو۔

اگر کچھ دیر پہلے ڈرائنگ روم میں تبریز پاشا کی گالیاں سننا اذیت ناک تھا تو اس وقت نفیسہ اور ربیعہ کا سامنا کرنا اس سے زیادہ اذیت ناک تھا۔ وہاں کسی کو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خاموشی سب کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ نفیسہ اور ربیعہ سے نظریں ملائے بغیر وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سلطان اس کے پیچھے گیا تھا مگر کمرے کا دروازہ بند تھا۔

پہلی بار اس نے سلطان پر کمرے کا دروازہ بند کیا تھا۔ سلطان کو چین کیسے آتا۔ وہ نفیسہ اور ربیعہ کے پاس بوکھلایا ہوا آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ان سے کچھ کہہ پاتا، انہوں نے اس سے پوچھنا شروع کر دیا تھا۔

تبریز پاشا جو کچھ کہہ رہا تھا۔ زینی کو کیوں دھمکا رہا تھا۔

سلطان کو بروقت صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس نے ان دونوں کو تسلیاں دینا شروع کر دیں۔

پتہ نہیں ان دونوں کو اس کی باتوں پر کتنا یقین آیا، کتنا نہیں مگر ان دونوں نے سوال کرنے بند کر دیے تھے۔

سلطان ساری رات اس کے کمرے کے دروازے کے باہر بیٹھا رہا تھا۔ کمرے میں جلتی ہوئی لائٹ اور اندر وقفے وقفے سے ہونے والی آہٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ وہ باہر بیٹھے ہوئے بھی جانتا تھا کہ وہ کس طرح کمرے کے چکر کاٹ رہی ہوگی۔ بیئر کا کین پکڑے، سگریٹ انگلیوں میں دبائے۔ سلطان کو دکھ ہو رہا تھا۔ اس نے رات کا کھانا تک نہیں کھایا تھا۔

رات کا کھانا... صبح کا ناشتہ... دوپہر کا کھانا... کوئی چائے، کافی جوس... کچھ نہیں... وہ اس طرح تو کمرے میں بند نہیں ہوتی تھی۔ صرف سلطان ہی کو نہیں، نفیسہ اور ربیعہ کو بھی فکر ہونے لگی تھی۔ دستک پر دروازہ نہیں کھولتی تھی۔ انٹرکام، ریسیور وہ اٹھاتی نہیں تھی اور دروازہ وہ لوگ توڑ نہیں سکتے تھے۔

واحد اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ اندر ٹھیک تھی۔ شاید اندر سے آنے والی آہٹیں بند ہو جاتیں تو انہیں زینی کی زندگی کے بارے میں تشویش لاحق ہو جاتی۔

اور پھر بالآخر وہ ٹھیک ساڑھے سات بجے کمرے سے نکل آئی تھی۔ خوبصورت کپڑوں میں ملبوس بھاری میک اپ کیے اور شاندار جیولری سے آراستہ۔

وہ جیسے کہیں جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ سلطان اسے دیکھ کر پہلے بھونچکا ہوا تھا پھر خوش۔

زینی کے چہرے پر کہیں پچھلی شام کے واقعات تحریر نہیں تھے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھیں بالکل صاف۔ ان میں کسی بھی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا پری جی! ایسا کیوں کرتی ہیں آپ؟'' سلطان نے جیسے اس سے گلہ کیا۔

زینی نے جواب نہیں دیا۔ سلطان نے اپنی جیب سے ڈائری نکالتے ہوئے اس کا شیڈول چیک کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو ڈرائیور کو بتایا تک نہیں۔ گاڑی لگواتا ہوں۔ ذرا اپارٹمنٹ چیک۔۔'' زینی نے اس کی بات کاٹی۔

''ہم مہورت پر جا رہے ہیں۔'' کوریڈور میں لگے ہوئے آئینہ میں اپنے بال سنوارتے ہوئے زینی نے بے حد عام سے انداز میں کہا۔

''کون سی مہورت؟'' سلطان چونکا۔

''تبریز پاشا کی فلم کی مہورت۔'' سلطان کو جیسے اس کی بات پر سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ اب اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک ٹھیک کر رہی تھی۔

''آپ تبریز پاشا کی فلم کی مہورت میں جا رہی ہیں؟''

''ہاں، اتنے مہینے پہلے فلم سائن کی تھی، اب مہورت میں تو جاؤں گی ہی یا پھر اس میں اپنی جگہ تمہیں بھجوا دوں۔''

زینی نے جیسے مذاق کیا تھا اور اس مذاق پر کسی کو بھی ہنسی نہ آئی مگر سلطان بے اختیار ہنسنے لگا۔ بات ہنسنے والی ہی تھی۔ پری زاد نے سمجھوتے کا فیصلہ کیا تھا۔ سلطان نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔ یہی فیصلہ کرنا چاہیے تھا ان حالات میں کیا، ہر قسم کے حالات میں۔

وہ دونوں چلتے ہوئے باہر آ گئے۔ جب زینی نے بے حد معمول کے انداز میں اس سے کہا۔

''تم کوئی گھر دیکھو ڈیفنس میں'' سلطان نے بے حد حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

''کس لیے؟''

''میں گھر بدلنا چاہتی ہوں، اس ہفتے نہیں تو اس مہینے ضرور۔''

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اور یہ بات کہتے ہوئے اس کا انداز بے حد عام تھا مگر سلطان کی چھٹی حس نے جیسے اسے کسی خطرے کا سگنل دیا تھا۔

''لیکن گھر کیوں بدلنا ہے پری جی آپ نے؟''

''کیونکہ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ تبریز پاشا کا گھر ہے۔''

اس نے مسکراتے ہوئے برابر والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے سلطان سے کہا جس کو ایک لمحہ کے لیے جیسے چکر آ گیا تھا۔ اگر وہ مہورت پر کمپرومائز کر کے جا رہی تھی تو پھر تبریز پاشا کا گھر کیوں بدل رہی تھی اور اگر وہ کمپرومائز نہیں کر رہی تھی تو مہورت پر کیوں جا رہی تھی؟

''مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی پری جی؟'' سلطان نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''آخر گھر بدلنے کی کیا ضرورت آن پڑی ہے؟''

زینی چپ بیٹھی باہر دیکھتی رہی۔

''آپ کے دل میں کیا ہے پری جی؟'' سلطان نے کچھ دیر بعد بے چین انداز میں پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔''

☆☆☆

"میں کسی صورت میں جمال کے علاوہ کسی دوسرے سے شادی نہیں کروں گی۔ میں تم کو بتا رہی ہوں اماں؟"

زری جتنی بلند آواز میں احتجاج کر سکتی تھی، اس نے کیا تھا۔

شکیلہ دو روز قبل نہ صرف زری کی ماں سے مل کر گئی تھی بلکہ اس نے کرم علی کے لیے زری کا رشتہ بھی مانگ لیا تھا۔

زری کی ماں کے ہاتھ پیر تو شکیلہ کو اپنے گھر دیکھ کر پہلے ہی پھولے ہوئے تھے۔ اس پر یہ کہ وہ ان سے رشتہ داری کرنے آئی تھی۔ وہ بری طرح حواس باختہ ہو گئی تھی۔

وہ جہاں داد کے خاندان کو تب سے جانتی تھی، جب سے وہ اس محلے میں بیاہ کر آئی تھی۔ اس نے ان کی غربت دیکھی تھی اور پھر کرم علی کی وجہ سے ان کے بدلتے ہوئے دن دیکھے تھے۔ کرم علی اس زمانے میں جیسے پورے محلے کے لڑکوں کے لیے ایک رول ماڈل ہو گیا تھا کرم علی کے گھر والوں کی قسمت کرم علی کے امریکہ پہنچنے کے چند سالوں میں ہی بدل گئی تھی۔ جب تک وہ کویت میں تھا، تب تک اگرچہ اس کے گھر والوں اور محلے کے لوگوں کے لائف اسٹائل میں بہت فرق آ چکا تھا لیکن اس کے امریکہ پہنچنے کے بعد کرم علی کے گھر والوں کا صرف لائف اسٹائل ہی نہیں، ان کی ذہنیت اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ بھی بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ اب وہ ہر ایک سے یہ چاہنے لگے تھے کہ کوئی بھی ماضی میں ان کی غربت زدہ زندگی کو نہ تو یاد رکھے، نہ ہی انہیں اس زندگی کے حوالے دے کر ان کی قسمت پر رشک کرے۔ نتیجتاً انہوں نے محلے والوں سے بچنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا سوشل سرکل اب نئی رشتہ داریوں کی وجہ سے بدلنے لگا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ ان کا یہ رویہ محلے والوں کو صحیح معنوں میں چبھنا شروع ہوتا۔ وہ محلہ چھوڑ کر ڈیفنس چلے گئے تھے۔ اس کے بعد کرم علی کی فیملی نے کبھی مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں کبھی کبھار جہاں داد اس محلے میں اپنے رشتہ داروں کے گھر آتا تو محلے کے کچھ دوسرے لوگوں سے بھی اس کی علیک سلیک ہو جاتی اور اس کی موت کے بعد یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ کرم علی کی ساری فیملی کینیڈا چلی گئی تھی۔ فاصلے اور بڑھ گئے تھے اور ان فاصلوں نے کرم علی کی فیملی کو اس محلے میں "دیومالائی حیثیت" دے دی تھی۔

اب ایسی کسی فیملی کا زری کے گھر آ کر سی آدمی کے لیے رشتہ کی بات کرنا۔۔۔۔ زری اور اس کے گھر والوں کی خوش قسمتی ہی تھی۔

زری کی ماں نے فوری طور پر تو شکیلہ کو ہاں نہیں کی۔ اس نے زری کے باپ سے بات کرنے کے لیے کچھ مہلت مانگی لیکن شکیلہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ زمین پہلے ہی ہموار ہے۔ انہیں اس کو ہموار کرنے کے لیے کوئی محنت نہیں کرنا پڑے گی۔

رشتہ کی بات زری کے سامنے ہی ہوئی تھی اور وہ بھی اپنی بہنوں کی طرح وہاں بیٹھے شکیلہ کے اس اچانک مطالبے پر بھونچکا رہ گئی تھی اور جب تک اس کے اوسان بحال ہوئے شکیلہ وہاں سے جا چکی تھی۔

لیکن جب شکیلہ کے جانے کے بعد زری کی ماں نے اس سے فوری طور پر اس حوالے سے اس سے کوئی بات نہیں کی تو زری مطمئن ہو گئی تھی۔ ایسے رشتے اس کے گھر بہت آتے رہتے تھے۔ کئی بار سلائی کروانے کے لیے آنے والی عورتیں بھی زری کو دیکھ کر کسی نہ کسی کے لیے رشتہ کا ذکر ضرور چلاتیں لیکن یہ پہلی بار ہوا تھا کہ شکیلہ جیسی رکھ رکھاؤ والی کسی عورت نے کسی ایسے آدمی کے لیے رشتہ کی بات کی تھی جو کینیڈا میں رہتا تھا۔

اگرچہ زری کو حیرت ہوئی تھی کہ اس کی ماں نے فوری طور پر اس رشتے کے سلسلے میں اس سے بات کیوں نہیں کی تھی لیکن اگر اس کی ماں خاموش رہی تھی تو زری نے بھی اس معاملے پر بات نہیں کی۔

زری کی ماں نے اسی رات اپنے شوہر سے اس رشتہ کی بات کی تھی اور حمید کو جیسے یقین نہیں آیا تھا اور جب یقین آیا تو کسی تامل اور تعرض کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہیں بیٹھے بٹھائے کرم علی کی عمر کا اندازہ لگایا گیا۔ سینتیس اڑتیس سال اور زری ابھی انیس کی نہیں ہوئی تھی۔ عمر کا فرق بے معنی تھا۔ اتنی دولت کے ساتھ اگر کرم علی پچاس کا بھی ہوتا تب بھی یہ رشتہ بے حد مناسب تھا۔ شکل وصورت کا تو خیر موازنہ کیا ہی نہیں گیا۔ کرم علی معمولی صورت کا سہی لیکن بدصورت نہیں تھا اور اگر بدصورت بھی ہوتا تو بھی اس کلاس میں مرد کی صورت پر بات کرنا کسی بھی خاندان کے لیے انتہائی ہتک آمیز بات تھی۔

زری کی ماں کو کرم علی کی اس زمانے کی ایک منگنی اور پھر اس منگنی کا ٹوٹنا یاد آیا لیکن ایک منگنی کا ہونا یا ٹوٹنا دونوں بے کار اعتراضات ہوتے۔ شکیلہ کے بقول کرم علی نے اب تک شادی نہیں کی تھی اور یہ وہ چیز تھی جو حمید اور اس کی بیوی دونوں کو ذرا ناقابل یقین لگ رہی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ کرم علی نے وہاں باہر کسی غیر ملکی عورت سے شادی وغیرہ ضرور کی ہوگی اور بعد میں اسے چھوڑ دیا ہوگا اور اب اس کے گھر والے اس کی شادی پاکستان میں اسی لیے ان جیسے گھرانے میں کر رہے تھے کیونکہ کسی اپنے جیسے گھرانے میں رشتہ کرتے ہوئے لوگ اس طرح کی چیزوں پر ضرور اعتراضات کرتے۔

کرم علی کا کردار کیا تھا؟

اس کے بارے میں بھی حمید اور اس کی بیوی کو شبہات تھے۔ جہاں داد کے خاندان کی شہرت بھی ایسی نہیں تھی کہ وہ لڑکے کو خاندانی طور پر ہی شریف سمجھتے لیکن یہ بھی وہ چیز تھی جو کم از کم حمید جیسے کردار کے آدمی کے لیے قابل اعتراض نہیں تھی۔

کرم علی کا رشتہ ان دونوں میاں بیوی کی نظر میں اب تک ان کی کسی بھی بیٹی کے لیے آنے والے رشتوں میں سب سے زیادہ موزوں تر تھا اور دونوں نے متفقہ طور پر زری کو خوش قسمت قرار دیا۔

ان دونوں کو اس رات وہاں بیٹھے بیٹھے یہ یقین بھی ہو گیا کہ اس رشتہ کی وجہ سے ان کی اپنی قسمت بھی بدلنے والی تھی۔

بیٹی اتنے دولت مند آدمی کی بیوی بنتی تو کیا ماں باپ اور بہنوں کو اس غربت میں رہنے دیتی۔ قسمت کی اگر واقعی کوئی دیوی تھی تو وہ ان پر مہربان ہو گئی تھی۔ رشتے کو فوری طور پر قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

اور یہ فیصلہ زری نے بھی سن لیا تھا۔ اس نے نہ صرف یہ فیصلہ سنا تھا بلکہ ماں باپ کی ساری باتیں بھی سنی تھیں اور ان کی گفتگو نے اس کا خون کھولا دیا تھا۔ ایک بڑی عمر کا کم شکل آدمی جس کی اگر باہر کہیں شادی ہوئی تھی تو بچے بھی ہو سکتے تھے، وہ اس کے ماں باپ کو اس کے لیے بے حد موزوں بر لگ رہا تھا کیونکہ اس کی جیب میں سونے کے سکے تھے۔

زری چراغ پا ہو رہی تھی۔ اگر اسے حمید کا خوف نہ ہوتا تو وہ اسی وقت اٹھ کر ان دونوں کے سامنے اس رشتہ سے انکار کر کے جاتی۔ لیکن اس

نے بہر حال یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اگلے دن ماں کو دو ٹوک انداز میں اپنا انکار پہنچائے گی۔

اگلے دن صبح ماں اس کا انکار سننے سے پہلے ہی کام کے لیے گھر سے نکل چکی تھی اور شام کو جب وہ واپس آئی تو وہ اکیلی نہیں تھی، اس کے ساتھ شکیلہ بھی آئی تھی اور شکیلہ کے ساتھ مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے بھی آئے تھے۔ وہ رشتہ طے کرنے آئی تھی۔

زری کا خون ایک بار پھر کھول کر رہ گیا۔ حمید بھی اس وقت گھر پر تھا۔ وہ نہ ہوتا تو زری اس وقت جس موڈ میں تھی، وہ شکیلہ کو خود اس رشتہ سے انکار کر دیتی لیکن حمید کی موجودگی میں اس نے نہ صرف شکیلہ کے ہاتھ سے پیسے لیے بلکہ مٹھائی بھی کھائی۔ شکیلہ جاتے ہوئے اس کی چوڑیوں اور انگوٹھی کے ساتھ ساتھ کپڑوں کا سائز بھی لے گئی۔ انہیں شادی کی جلدی تھی۔

زری اس رات بھی نہ ماں سے بات کر سکی، نہ ہی جمال سے۔ البتہ اس نے اپنی چھوٹی بہنوں کو صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ وہ کرم علی جیسے بڈھے سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی لیکن اس کی بہنوں نے اس کی اس دھمکی میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی، نہ ہی ان کے دل میں کوئی خدشات پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے زری سے بڑی تینوں بہنوں کو بھی ان ہی دھمکیوں کے بعد ان ہی جگہوں پر شادیاں کرتے دیکھا تھا جہاں حمید نے ان کے رشتے طے کیے تھے تو اس طرح کا انکار اور دھمکی جیسے ان کے گھر کی روایت بن گئی تھی لیکن ان میں سے ہر ایک زری کی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔ یہ پہلی شادی تھی جس پر ان میں سے ہر ایک واقعی خوش تھا۔ ان کی ایک دولت مند آدمی سے رشتہ داری ہونے والی تھی۔

زری کی ماں نے نہ صرف اس شام نسبت ٹھہرائی تھی بلکہ شکیلہ کی طرف سے لائی جانے والی مٹھائی زری کے شدید احتجاج کے باوجود محلے اور رشتہ داروں میں بانٹ دی تھی۔ مٹھائی کی تقسیم کے ساتھ ہی محلے کی عورتوں کی مبارکباد کے لیے آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور یہ خبر بجلی کی رفتار کے ساتھ محلے بھر میں پھیلی تھی۔

جمال کو زری کی منگنی کی اطلاع محلے کے تھڑے پر پتے کھیلتے کسی دوسرے لڑکے نے دی تھی اور جمال نے ہنس کر مذاق میں اس کی بات اڑائی تھی۔ ہر مہینے ہی زری کی کسی نہ کسی کے ساتھ منگنی کی افواہیں اڑتی رہتی تھیں لیکن اس بار خبر لانے والا لڑکا اپنے گھر میں زری کے گھر سے آنے والی مٹھائی کھا کر آیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ کرم علی کے بارے میں اپنی ماں سے ساری معلومات بھی لے آیا تھا۔ کرم علی کے نام اور اس کے خاندان سے زبانی طور پر محلے کی یہ نوجوان نسل بھی واقف تھی حتیٰ کہ جمال بھی اور شاید کرم علی کا نام ہی تھا کہ جمال پہلی بار پتے کھیلنا بھول گیا۔ وہ بے حد بے چینی کے عالم میں اٹھ کر گھر آیا تھا اور گھر میں اس کے بدترین خدشات کی تصدیق مٹھائی کی اس پلیٹ سے ہوئی تھی جو اس کی ماں نے باورچی خانے میں رکھی ہوئی تھی۔ جمال کا دل چاہا، وہ اسی وقت جا کر زری کو گولی مار دے۔

اور زری جانتی تھی کہ جمال کو نہ صرف اب تک اس کے کرم علی کے رشتے کے بارے میں اطلاع مل چکی ہوگی بلکہ وہ اس وقت بے حد جنونی انداز میں اسے مارنے کے لیے غصے میں پاگل ہوا پھر رہا ہوگا۔ وہ اس شام ہمیشہ کی طرح چھت پر نہیں گئی۔ چھت پر جانے کے لیے اس شام نہ وقت تھا اور نہ موقع اور اگر یہ دونوں چیزیں ہوتیں بھی تو زری میں ہمت نہیں تھی کہ وہ فوری طور پر جمال کا سامنا کرتی۔

صبح حمید کے جانے کے بعد زری نے ماں کو کام پر جانے نہیں دیا اور اب وہ ماں کو بہانگ دہل بتا رہی تھی کہ اسے کرم علی سے شادی نہیں

کرنی، جمال سے شادی کرنی ہے۔

زری کی ماں نے بے حد اطمینان سے اس کا واویلا سنا۔ اس کی ہر بیٹی نے اپنی پسند کے کسی لڑکے کے لیے اسی طرح واویلا مچایا تھا، اس کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔

"ہوش کے ناخن لے زری! تو کیوں اس نکھٹو کے پیچھے مر رہی ہے۔"

"وہ نکھٹو ہو جو مرضی ہو، میں اس سے پیار کرتی ہوں۔ مر جاؤں گی، پر اس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کروں گی۔" زری نے ماں کو بات پوری نہیں کرنے دی۔

"کیوں گھر آئے رزق کو لات مار رہی ہے زری! ارے ایسا رشتہ تو ہماری سات پشتوں میں کسی لڑکی کا نہیں آیا۔ ارے کروڑ پتی لڑکا ہے، کروڑ پتی۔"

"تم کو شرم نہیں آئی اماں! اس بڈھے کو لڑکا کہتے ہوئے۔ پتہ نہیں کتنی شادیاں کر چکا ہے وہ اب تک اور تم کو لگتا ہے مجھے تو اس سے اچھا رشتہ مل ہی نہیں سکتا۔" زری نے ماں کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔

"پہلی شادی ہے اس کی۔ میں نے خود فون پر بات کی ہے اس کی ماں سے اور فرض کر، پہلی نہ بھی ہوئی۔ پھر بھی دیکھ زری! کتنا پیسہ ہے اس کے پاس۔ ارے دن رات بھی خرچ کرے گی تو ختم نہیں ہوگا۔ ایک کے بجائے دو شادیاں بھی ہوں تو بھی تجھے ان سے کیا لینا دینا۔"

"ہاں مجھے کسی بات سے کیا لینا دینا۔ اس کی عمر زیادہ ہے تو ٹھیک ہے۔ دوسری شادی ہے تو ٹھیک ہے۔ شکل و صورت اچھی نہیں ہو تو بھی ٹھیک ہے۔ میں تمہاری سوتیلی بیٹی ہوں کیا ماں؟" زری تڑپ کر بولی۔

"مرد کی شکل و صورت نہیں دیکھتے جیب دیکھتے ہیں۔ جو اس آدمی کی بھری ہوئی ہے اور جمال کی خالی جیب ہے۔ سوتیلی بیٹی ہوتی تو یہ رشتہ چھوڑ کر جمال سے شادی کرتی تیری تاکہ ساری عمر تو بھی میری طرح لوگوں کے گھر صفائیاں کر کے گھر چلاتی۔ بھوکی مرتی اور پھر جمال کے جوتے بھی کھاتی۔" اس کی ماں کو اب غصہ آنے لگا تھا۔

"جوتے کھاتی لیکن اپنی مرضی کے آدمی کے ساتھ تو رہتی۔ کچھ تو اچھا ہوتا اس آدمی سے۔ کماتا نہیں ہے بس لیکن میری عمر کا ہے۔ اچھی شکل کا ہے۔ میرے پہ جان دیتا ہے وہ۔" اس کی ماں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

"ابھی جان دیتا ہے۔ بعد میں جان لے لے گا۔ پورا محلہ بھرا پڑا ہے ایسے جان دینے والوں سے جن کی بیویاں روتی پھرتی ہیں۔ خود تیرے باپ نے مجھ سے پسند کی شادی کی تھی۔ سو سو وعدے کیے اور خواب دکھائے تھے مجھے اور اب۔ اب کیا ہے؟ صبح سے لے کر شام تک جانوروں کی طرح محنت کر کے گھر چلاتی ہوں تب بھی نہ تیرے باپ کی زبان بند ہوتی ہے، نہ ہاتھ رکتا ہے۔ ساری عمر ہڈیاں تڑوائی ہیں میں نے۔ گھر سے لے کر گلی تک ہر جگہ جوتے کھائے ہیں میں نے تیرے باپ کے اور میں نے کیا تو اپنی بہنوں کو دیکھ، کیا حال ہو رہا ہے ان کا۔ غربت کی چکی نے آٹا نہیں بنایا، بھوسہ بنا کر رکھ دیا ہے انہیں تجھے قسمت ایک موقع دے رہی ہے تو کیوں ضائع کر رہی ہے اسے۔ ارے محلے کا کوئی بھی گھر کرم علی کو

اپنی بیٹی دینے کو منتوں میں تیار ہو جائے گا۔ یہ تو خوش قسمتی ہے ہماری کہ اس کی بہن یہاں آ گئی۔"

"تم ہزار دفعہ کہو یا لاکھ دفعہ، میں نے اس آدمی سے شادی نہیں کرنی تو نہیں کرنی۔"

زری پر ماں کی کہی ہوئی بات نے اثر نہیں کیا تھا۔ اس کی ماں کو اب اس پر شدید غصہ آیا۔ پاؤں سے جوتا اتار کر دور کھڑی زری پر پھینکتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ سب باپ سے کہنا اپنے، وہ گلا نہ گھونٹ دے تو پھر کہنا۔" اس نے زری کو دھمکایا۔

"گھونٹتا ہے تو گھونٹ دے۔ روز مرنے سے ایک بار کا مرنا اچھا ہے۔"

زری کی ماں نے مزید کچھ کہنے کے بجائے گھر سے چلے جانا زیادہ بہتر سمجھا۔

"اماں! میں بات کر رہی ہوں تجھ سے؟"

زری نے ماں کو دروازے سے نکلتے دیکھ کر گلا تقریباً پھاڑتے ہوئے کہا۔ زری کی ماں نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہیں کی۔ زری دروازے تک ماں کے پیچھے آئی تھی اور شاید گلی میں بھی آ جاتی لیکن اس نے ساتھ والے گھر کے دروازے پر جمال کو کھڑے دیکھ لیا تھا جو شاید اس کے انتظار میں وہاں کھڑا تھا۔ زری کو دیکھتے ہی اس نے درشت انداز میں اسے چھت پر آنے کے لیے کہا تھا اور ساتھ ہی اسے یہ دھمکی بھی دی کہ وہ اگر چھت پر نہ آئی تو وہ اس کے گھر آ جائے گا۔

زری بے حد حواس باختہ چھت پر پہنچی تھی اور جمال نے اسے دیکھتے ہی اس پر برسنا شروع کر دیا۔ وہ بے حد غصے میں تھا۔ زری نے لاشعوری طور پر جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جمال! صرف رشتہ آیا ہے ابھی اور..."

جمال نے بے حد غصے میں اس کی بات کاٹی۔ "تیری ماں پورے محلے میں مٹھائیاں بانٹتی پھر رہی ہے اور تو کہہ رہی ہے کہ صرف رشتہ آیا ہے۔ دھوکا دے رہی ہے تو مجھے۔ جھوٹ بول رہی ہے مجھ سے بلکہ ہمیشہ بولتی رہی۔"

وہ پہلی بار زری سے اس طرح بات کر رہا تھا۔ لڑتا وہ پہلے بھی تھا مگر اس طرح کا غصہ اس نے جمال میں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ زری کی سمجھ میں فوری طور پر جو حل آیا، وہ آنسو بہانا تھا اور اس نے یہی کیا۔ اس نے روتے ہوئے جمال سے کہا۔

"اماں اور ابا نے زبردستی میرا رشتہ طے کر دیا ہے وہاں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تو ابھی اماں سے لڑی ہوں۔ تیری خاطر جوتے کھائے ہیں اس کے اور تو بھی مجھ ہی کو الزام دے رہا ہے۔" جمال اس کے آنسوؤں سے متاثر نہیں ہوا۔

"تو تو کہتی تھی کہ تجھ سے کوئی زبردستی نہیں کر سکتا اور اب منگنی کرا کے بیٹھ گئی ہے۔ کل کو اسی طرح اس کی ڈولی میں بھی بیٹھ جائے گی۔"

"مجھ سے ایسی بات مت کر جمال! میں نے اگر کہا ہے کہ میں تجھ سے شادی کروں گی تو میں تجھ ہی سے شادی کروں گی۔ یہ زری کی زبان ہے۔" زری نے یک دم رونا بند کر دیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت رونے سے جمال پر الٹا اثر ہو رہا تھا۔

''تیری زبان ...؟ تیری کوئی ایک زبان ہو تو میں اس پر اعتبار کروں؟ کتنی بار تجھ سے کہا میں نے کہ اماں کو رشتے کے لیے بھیجوں، پر تو نے ایک دفعہ میری بات نہیں مانی۔ اب دیکھ لیا نتیجہ، اسی دن سے ڈرتا تھا میں۔'' جمال کا غصہ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

''تو اعتبار کیوں نہیں کرتا۔'' جمال نے زری کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

''میں تجھ سے کہہ رہی ہوں ناکہ میں تیرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی تو نہیں کروں گی۔ زہر کھالوں گی مگر کرم علی کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔''

''زہر مت کھا، تو میرے ساتھ گھر سے بھاگ چل۔'' جمال کو یک دم جیسے کوئی خیال آیا۔

''ضرورت پڑی تو یہ بھی کروں گی لیکن ابھی تو رشتہ تڑوانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ابھی بڑا وقت ہے جمال!''

''رشتہ تڑوانے کی کوشش ...؟ تیرا باپ مانے گا تیری بات؟'' حمید کو جمال ہی نہیں، پورا محلہ جانتا تھا۔

''تو مجھے تھوڑا وقت تو دے۔ میں ٹھیک کرلوں گی سب کچھ۔ اگر ابھی تک شادی نہیں ہوئی کسی دوسرے کے ساتھ تو اب بھی نہیں ہوگی۔''

''پورے محلے کے لڑکے مذاق اڑا رہے ہیں میرا۔''

''اڑانے دے۔ مجھے محلے کے لڑکوں کی باتیں مت بتایا کر۔'' زری اب جمال کو کمزور پڑتا دیکھ کر شیر ہو رہی تھی۔

''تجھے پتا ہے زری! میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر یہ کرم علی یہاں ہوتا تو میں جاکر اس کو مار دیتا لیکن اب میں خود کو مار سکتا ہوں اور میں اپنی جان دے دوں گا اگر تو نے اس سے رشتہ کو ختم نہ کروایا۔''

جمال کی آنکھوں میں اب آنسو آ گئے تھے۔ زری کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ کرم علی سے اس کی نفرت میں یک دم شدید اضافہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شکیلہ دو دن بعد پھر وہاں آن موجود ہوئی تھی اور اس بار وہ یہ پیغام لے کر آئی تھی کہ انہیں دو ہفتے کے اندر اندر کرم علی کی شادی کرنی تھی۔ حمید اور اس کی بیوی نے بخوشی اس کا یہ مطالبہ قبول کرلیا تھا، وہ جانے سے پہلے شادی کے انتظامات کے لیے حمید کو کچھ رقم دینے کے ساتھ انہیں یہ بھی بتا گئی تھی کہ انہیں صرف سادگی سے نکاح اور رخصتی چاہیے۔ وہ شادی کی باقی تقریبات خود ہی کینیڈا میں منعقد کرلیں گے۔ حمید اور اس کی بیوی کے لیے یہ ایک اور نعمت غیر مترقبہ تھی۔ وہ پہلے ہی شادی چار کپڑوں میں کرنے والے تھے۔ لیکن اب شکیلہ کی اس آفر کا صاف صاف مطلب یہ تھا کہ حمید اس رقم کو بھی بچا لیتا جو بظاہر شادی کے انتظامات کے لیے رکھی گئی تھی۔

پہلی بار صحیح معنوں میں زری کے ہاتھوں کے طوطے اڑے تھے دو ہفتے میں شادی کا مطلب تھا کہ اس کے پاس انکار کرنے اور ماں باپ کو منانے کے لیے وقت نہ ہونے کے برابر تھا۔ پہلے اگر وہ ماں سے جھگڑ کر اسے منا رہی تھی تو اب وہ منتوں پر آ گئی تھی مگر اس کی ماں ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ زری کا سلائی اسکول جانا بند کر دیا گیا تھا۔ اور حمید کی بیوی اب چوبیس گھنٹے گھر میں رہنے لگی تھی۔ اس نے ان تمام گھروں کا کام وقتی طور پر چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں ویسے بھی شکیلہ کی شادی کے انتظامات کے لیے دیے گئے پیسے اتنے تھے کہ وہ اگلے کئی ماہ اطمینان سے گھر میں بیٹھ کر کوئی کام کیے

بغیر کھا سکتے تھے۔

شکیلہ دو دن کے بعد ایک بار پھر آ گئی تھی۔ اس دن وہ زری کو کپڑوں جوتوں اور دوسری چیزوں کی شاپنگ کروانے کے لیے آئی تھی اور اس دن زری نے زندگی میں پہلی بار اس گاڑی میں سفر کیا جسے اس سے پہلے اس نے ٹی وی پر دیکھا تھا۔ ان ڈراموں کے کردار ان گاڑیوں میں سفر کرتے تھے یا پھر سڑک پر ویگن کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا تھا جس میں آج وہ شکیلہ کے ساتھ سفر کر رہی تھی اور اس نے پہلی بار اس گاڑی کے اندر بیٹھ کر اس کے شیشوں سے باہر نظر آنے والی دنیا اور اس دنیا کے پیدل، سائیکل سوار اور بسوں ویگنوں میں لٹکتے لوگوں کو دیکھا۔ اسے ان پر ترس آیا۔ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی کے اندر کی دنیا ایسی ہوتی ہے۔ اسے ایک عجیب سی مسرت ہوئی تھی۔ الجھن اضطراب، بے چینی اور کرم علی سے نفرت کے باوجود اسے گاڑی میں بیٹھنا اچھا لگا تھا۔

شکیلہ مسلسل باتیں کر رہی تھی پچھلی سیٹ پر اس کے برابر بیٹھی ہوئی اسے کینیڈا میں کرم علی کی پرتعیش زندگی کے بارے میں بتا رہی تھی اس کے گھر کا سائز، کمروں کی تعداد، گاڑیوں کے ماڈل، گاڑیوں کی تعداد، وہ کہاں کہاں سفر کر چکا تھا وغیرہ۔ لیکن زری کی توجہ اس وقت کسی وغیرہ پر نہیں تھی۔ وہ صرف اس گاڑی کی آرام دہ سیٹ اور ایئر کنڈیشنر کی خنکی سے محظوظ ہو رہی تھی۔

سڑک کے کنارے کھڑی اس کی عمر کی کسی بھی لڑکی کی نظر سے اس کی نظر ٹکراتی تو وہ بڑی آسانی سے اس کی آنکھوں میں وہ حسرت اور رشک پڑھ سکتی تھی جو کبھی خود اس کی آنکھوں میں ایسی گاڑیوں میں بیٹھنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر جھلکتا تھا۔

ایک عجیب سا نشہ تھا جو اس وقت زری کو اپنے اعصاب پر سوار ہوتا محسوس ہو رہا تھا اور یہ صرف آغاز تھا، شکیلہ اس دن صبح سے شام تک اسے شہر کی مہنگی ترین دکانوں پر لے جا کر خریداری کرواتی رہی تھی۔ ایسی دکانوں پر جس کو اس نے سڑک سے گزرتے ہوئے بھی غور سے دیکھا تک نہیں تھا کیونکہ اسے یقین تھا، وہ زندگی میں کبھی ان دکانوں پر جا کر کچھ خریدنے کے قابل نہیں ہو سکتی تھی۔

زری کو پہلے چپ لگی تھی تو اب سکتہ ہو گیا تھا۔ اس کے سامنے جو کپڑا خریدنے کے لیے پسند کرنے کو دکھایا جا رہا تھا، اسے ان میں انتخاب کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر کپڑا پہلے سے اچھا، مہنگا اور نفیس تھا۔ زری کو اس کپڑے کو ہاتھ لگاتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شکیلہ دھڑا دھڑ کیسے ان کپڑوں میں نقص نکالتے ہوئے انہیں رد کر رہی تھی۔ زری نے بہت دفعہ ان ایئر کنڈیشنڈ دکانوں میں اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔

شکیلہ اسے جیسے کسی اور دنیا میں لے آئی تھی۔ کپڑے جوتے کاسمیٹکس زیورات وہ ہر دکان میں جا کر بوکھلا رہی تھی۔ اور ہر دکان میں خریداری کے بعد بھی اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس نے وہاں سے اپنے لیے کچھ خریدا تھا۔

رات کے دس بجے سامان کے انبار کے ساتھ جب شکیلہ اسے اس کے گھر چھوڑ کر گئی تو زری کے طور اطوار بدلے ہوئے تھے۔ اس کی ماں اور بہنیں خریدی ہوئی چیزوں کو کھول کھول کر دیکھتے ہوئے بالکل اسی طرح سکتے میں آ رہی تھیں، جس طرح وہ ان چیزوں کو دکانوں میں دیکھ کر ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سی مرعوبیت تھی جو اب ان سب کے انداز میں زری کے لیے آ گئی تھی۔

وہ رات کے پچھلے پہر تک ان چیزوں کو اوڑھ اور پہن کر دیکھتی اور خوش ہوتی رہی تھی لیکن ان چیزوں کے سمیٹے جانے اور اس کی نظروں

کے سامنے سے غائب ہونے کے بعد اس کے ذہن میں اس دن پہلی بار جمال کا خیال آیا تھا۔۔۔ وہ یک دم بے چین ہو گئی۔ اسے لگا جیسے ان چیزوں کی خریداری کر کے اس نے جمال سے بے وفائی کی تھی۔ وہ سارا دن اس کا چھت پر انتظار کرتا رہا ہو گا اور ہو سکتا ہے اب بھی چھت پر بیٹھا ہو۔ اسے جب نیند نہیں آتی تھی تو وہ اس طرح رات کو چھت پر آ کر بیٹھا رہتا تھا۔

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" گلشن نے اسے ٹوکا۔

"کہیں نہیں۔" زری نے بات گول کرنے کی کوشش کی۔

"ابا آج چھت پر ہی سو رہا ہے۔" گلشن نے بے حد جتانے والے انداز میں اسے بتایا۔

وہ جھنجلا کر واپس کمرے میں کونے میں پڑی اپنی چارپائی پر آ گئی۔

"بڑی خوش قسمت ہے تو زری! سچی مجھے بڑا رشک آ رہا ہے تجھ پر۔"

"مجھے نہیں چاہیے ایسی قسمت۔۔۔ میں جمال کے بغیر مر جاؤں گی۔" زری نے بے حد غصے سے کہا۔

"انسان روٹی کے بغیر مر جاتا ہے، دوائی کے بغیر مر جاتا ہے۔ محبت کے بغیر کوئی نہیں مرتا۔" گلشن نے بے حد اطمینان سے کہا۔

"تو تم کیوں نہیں کر لیتیں کرم سے شادی؟" زری نے تڑخ کر کہا۔

"اگر وہ لوگ مجھے پسند کر کے گئے ہوتے تو جھٹ کر لیتی میں اس سے شادی۔" گلشن نے دوبدو کہا۔

"چاہے وہ بڈھا ہوتا، بدشکل ہوتا، شادی شدہ ہوتا؟"

"جو مرضی ہوتا میں کر لیتی اس کے ساتھ شادی، تجھے پتہ ہے کہ کرم علی سے تیری شادی سے ہمارے دن پھر جائیں گے۔ یہ جو بھوک اور ذلت کی زندگی ہے اس سے ہم سب نکل جائیں گے تو اپنا نہیں تو ہمارا ہی سوچ لے۔"

"اور جمال اس کا کیوں نہ سوچوں۔"

"کیا ہے جمال میں؟ صرف اچھی شکل۔۔۔ نہ گھر بار نہ کام دھندا اور تو اس سے شادی کے لیے مر رہی ہے۔" گلشن نے تلخی سے کہا۔

"ساری عمر یوں نہیں رہے گا، وہ کام کرنے لگے گا۔"

"کیا کام کرے گا؟ اور کتنے دن کرے گا؟ جس مرد کو کام کی عادت نہ ہو وہ بیوی کو گھر بٹھا کر روٹی نہیں کھلا سکتا۔"

"میں خود کروں گی کام۔ باپ کے گھر میں کرتی ہوں تو شوہر کے گھر میں بھی کر لوں گی۔"

"باپ کے گھر میں ساری زندگی نہیں کرنا پڑتا۔ شوہر کے گھر میں کام کرنے لگو تو پھر ساری عمر ہی کرنا پڑتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں کر لوں گی میں۔" زری بضد تھی۔

"ساری عمر کام کر کر کے اماں جیسی حالت ہو جائے گی تیری۔۔۔ جوانی میں بوڑھی ہو جائے گی۔"

''گلشن تو......'' گلشن نے ایک بار پھر زری کی بات کاٹی۔

''دیکھ زری! یہ جو محبت ہے نا، یہ انسان کو بڑا رلاتی ہے اور پیسہ جو ہے نا، یہ وہ رومال ہے جو ہر آنسو پونچھ دیتا ہے۔'' گلشن اس وقت اپنی طرف سے جتنی عقل کی باتیں سمجھا سکتی تھی سمجھا رہی تھی۔

''تو میری ایک بات یاد رکھنا گلشن! اماں اور ابا نے میری بات نہ مانی تو میں عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گی۔ میں دوسری بہنوں کی طرح خوشی خوشی شادی کر کے اس گھر سے نہیں جاؤں گی۔ کرم کے ساتھ جانے کے بجائے جان دے دوں گی یہاں۔''

گلشن نے بے اختیار اپنا سر پکڑ لیا۔ زری کو سمجھانا اس وقت بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ گلشن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے جمال میں ایسا کیا نظر آ رہا تھا، جو وہ اس کے لیے یوں جان دینے پر تیار تھی اور اسے کرم علی کا پیسہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جبکہ وہ تو پیسے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی اور اب جب واقعی اُسے کچھ بھی کیے بغیر پیسہ حاصل کرنے کا موقع مل رہا تھا تو اسے جمال اور اس کی محبت نظر آنے لگی تھی۔

☆☆☆

سلطان مہورت کی تقریب میں شرکت کے لیے پاشا پروڈکشنز کے اسٹوڈیو میں زینی کے ساتھ داخل ہونے تک خوف زدہ رہا تھا۔ لیکن زینی اور تبریز پاشا کا آمنا سامنا ہوتے ہی اس کا حلق میں اٹکا ہوا سانس بحال ہو گیا تھا۔ دونوں بے حد گرم جوشی سے ملے تھے۔ زینی کو دھمکانے کے باوجود تبریز پاشا نے پری زاد کو وہاں پا کر سکون کا سانس لیا تھا۔ سلطان کو اگر زینی کی طرف سے کسی غیر معمولی رویے یا حرکت کی توقع تھی تو وہ بہرحال وہاں نظر نہیں آئی تھی اور اس وقت تو صرف سلطان کو ہی نہیں سفیر خان کو بھی جیسے شادیٔ مرگ ہو گیا تھا جب زینی مسکراتے ہوئے خود اس کے پاس گئی اور... فلم کے سیٹ کے علاوہ پہلی بار زینی سفیر سے گلے ملی تھی۔ نہ صرف اس سے بلکہ انور حبیب سے بھی۔

انور حبیب اور سفیر نے الجھی ہوئی نظروں کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا۔ پری زاد کے انداز میں یک دم آ جانے والی گرم جوشی ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ لیکن جو بھی تھا۔ سفیر خان کو پری زاد سے ملنے والی توجہ اچھی لگی تھی۔ وہ مہورت میں اس کے ساتھ رہی تھی۔ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور قہقہوں کا تبادلہ بھی...... اور میڈیا کے لوگ ان کے درمیان اچانک نظر آنے والی اس ''کیمسٹری'' کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ پری زاد اور سفیر خان کے درمیان صلح...... یہ یقیناً اگلے دن کے اخباروں میں شوبز کے صفحات کی مین ہیڈ لائن بننے والی تھی۔

اور اس صلح یا مفاہمت کی وجوہات کیا تھیں اگلے کئی دنوں اس پر اخباروں میں بحث اور قیاس آرائیاں ہونے والی تھیں لیکن فلم انڈسٹری کے لوگوں نے مہورت کی اس تقریب میں پری زاد اور سفیر کے درمیان ہونے والی اس صلح کو انڈسٹری کے لیے ایک اچھا شگون قرار دیا تھا۔

مہورت سے واپسی پر گاڑی میں سلطان مسلسل چہکتا رہا تھا۔ وہ واقعی بے حد خوش تھا۔ پری زاد نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ اس انڈسٹری میں ہمیشہ وہی ہیروئن سب سے لمبے عرصے تک راج کرتی رہی ہے جس کے کسی ہیرو، ہیروئن یا ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کے ساتھ تنازعات نہیں رہے اور جو ہیروئن اسکینڈلز اور تنازعات میں انوالو ہوتی رہی ہے وہ صرف چند سالوں سے زیادہ اس انڈسٹری سے غائب نہیں ہوئی بلکہ لوگوں کی یادداشت سے بھی غائب ہو گئی۔

زینی سگریٹ پیتے ہوئے بے حد خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھی اور سلطان کو پورا یقین تھا کہ وہ اس کی باتوں پر غور بھی کر رہی ہے وہ کچھ اور پرجوش ہوتے ہوئے زینی کو نصیحتوں پر نصیحتیں کرنے لگا۔ وہ ہر چیز پر خوش تھا سفیر خان سے صلح پر، انور حبیب کے ساتھ بات چیت پر تبریز پاشا کے ساتھ کی جانے والی ڈیل پر۔ وہ پری زاد کو اسی طرح کے رویے کا مظاہرہ کرتا دیکھنا چاہتا تھا۔

''کرم علی کی فلم کی ڈیٹس آ گئیں؟''

اس نے سلطان کی تمام نصیحتوں، تمام مثالوں، تمام شاباشیوں کے جواب میں سگریٹ کا ٹکڑا گاڑی کی ایش ٹرے میں پھینکتے ہوئے پوچھا۔ ایک لمحہ کے لیے سلطان کچھ شرمندہ ہو گیا اسے یوں لگا جیسے پری زاد نے اس کی ایک بات بھی نہیں سنی تھی۔

''ہاں ڈیٹس آ گئی ہیں۔ اس کی شوٹنگ اسٹارٹ ہو رہی ہے اگلے ماہ کی آٹھ سے۔ کرم علی سے کوئی رابطہ ہوا آپ کا؟'' سلطان نے بات کرتے کرتے اچانک پوچھا۔

''کیوں ہوتا؟'' زینی نے جواباً بے حد تیکھے انداز میں اس سے پوچھا۔

''بڑا پتھر دل آدمی ہے۔'' سلطان نے بے ساختہ کہا۔

''پتھر دل نہیں ہے۔ بس غرور ہے اسے اپنی دولت پر اور ہونا بھی چاہیے۔ اگر اتنا پیسہ پاس ہو کہ انسان دوسرے کی زندگی اور وجود تک خریدنے پر قادر ہو تو غرور تو ہونا ہی چاہیے۔'' اس نے بے حد لاپروائی سے کہا۔

پر مجھے تو مغرور نہیں لگا پری جی! مجھے تو بڑا عاجز آدمی لگا ہے وہ عاجز مگر تیکھا'' سلطان نے کرم کی طرف داری کی۔

''عاجز...؟'' وہ بے ساختہ ہنسی ''کرم اور عاجز''... اس نے نیا سگریٹ سلگاتے سلگاتے چھوڑ دیا۔ وہ اب کچھ سوچنے لگی تھی۔

سلطان نے بہت گہری نظروں سے زینی کا چہرہ دیکھا۔ وہاں اب کچھ ایسا تھا جو پہلے نہیں تھا۔ وہ بعض دفعہ اسے پری زاد نہیں لگتی تھی پری لگتی تھی۔

☆☆☆

ایک لمحہ کے لیے کرم علی کو لگا اس کی ماں اس کے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔ لیکن وہاں ان کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نہیں تھے، جس سے اس کی خوش فہمی کی بھی تصدیق ہوتی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اسے وضاحت طلب کرنا ضروری لگا۔

"مطلب یہی ہے جو تم نے سنا ہے، میں نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔" اس کی ماں نے اطمینان سے کہا۔

"کیوں؟" اس نے بے ساختہ الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیوں کا کیا مطلب ہے؟ تم اولاد ہو میری، سب سے بڑی اولاد میری خواہش ہے تمہارا گھر بسا دیکھنے کی۔"

"لیکن میں نے آپ کو بتایا ہے مجھے شادی میں دلچسپی نہیں ہے۔"

"شادی میں دلچسپی ہے یا نہیں ہے اب تمہاری شادی طے کر دی ہے لڑکی والے تیاری کر رہے ہیں۔ دو ہفتوں میں جا کر بیاہنا ہے ہمیں اسے۔"

کرم علی کو لگا جیسے یہ واقعی کوئی مذاق تھا ورنہ اس طرح بیٹھے بٹھائے اس کی ماں اس کی شادی جیسا بڑا فیصلہ اس سے بات کیے بغیر خود اپنے آپ کیسے کر سکتی تھی۔

"مجھ سے پوچھے بغیر آپ نے میری شادی طے کر دی؟" کرم علی کو جیسے شاک لگا تھا۔ "کرم علی لڑکی اتنی خوب صورت ہے کہ تم دیکھو گے تو تمہیں ماں کے انتخاب پر فخر ہوگا۔"

"بات لڑکی کی خوب صورتی کی نہیں ہے میری مرضی کی ہے۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا، چاہے وہ خوب صورت لڑکی ہو یا بد صورت۔"

"شادی نہیں کرنا چاہتے اور اس ایکٹریس کے ساتھ آوارہ پھرنا چاہتے ہو۔"

کرم علی کی ماں، اپنی اولاد کی سخت ہدایات کے باوجود پری زاد کا ذکر چھیڑے بغیر نہیں رہ سکی۔ چند لمحوں کے لیے کرم علی کچھ بول ہی نہیں سکا تھا۔ پری زاد کو وہاں سے گئے کئی ہفتے ہو چکے تھے۔ اس وقت ان حالات میں اس کا ذکر کیوں کر رہی تھیں وہ؟... اس سوال سے بھی زیادہ جو بات اسے ناگوار لگی تھی وہ یہ تھی کہ کسی نے ماں کو اس کے اور پری زاد کے میل جول کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ بتانے والے سے بھی واقف تھا اور میل جول کی تفصیلات کس انداز میں بتائی ہوں گی اسے بھی جانتا تھا۔ وہ اس کے بھائیوں میں سے کوئی ایک تھا۔ یقیناً آصف۔"

"کون سی ایکٹریس؟" کرم علی نے بالآخر اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تم کو اچھی طرح پتا ہے کون سی ایکٹریس ــــ میرا منہ نہ کھلواؤ تم۔ تم کو سوچنا چاہیے تھا کہ چھوٹے بہن بھائی کیا سوچیں گے کیا کہیں گے جب بڑا بھائی ایک بدنام زمانہ ایکٹریس کو پہلے کینیڈا بلوائے گا پھر اسے ساتھ لے کر دن رات پھرے گا۔"

اس کی ماں اب وہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ جو اسے مختلف اولادوں کی طرف سے کرم علی اور پری زاد کے بارے میں بتایا گیا تھا یا کہا گیا تھا۔

"میں ساری عمر کرم علی کی مثالیں دیتی رہی دوسرے بچوں کو اور کرم علی آخر میں اس طرح کا کام کرنے لگا۔"

کرم علی نے شدید رنج سے ماں کی بات کاٹی۔ "وہ میری ایک فلم میں کام کرنے کے سلسلے میں یہاں آئی تھی۔ میرے لیے ایک ایکٹریس ہے اور کچھ نہیں۔"

"تمہاری فلم؟ کیوں بنا رہے ہو تم یہ فلم؟ تعلق کیا ہے آخر تمہارا اس فلم سے؟ آج تک ہمارا خاندان کبھی کسی اسٹوڈیو کے پاس سے بھی نہیں گزرا اور تم فلم بنانے بیٹھ گئے۔ ٹھیک ہے یہاں کینیڈا میں آ کر رہتے ہیں مگر پیچھے پورا خاندان ہے، بہنوں کے سسرال ہیں، بھائیوں کے سسرال میں کیا کیا باتیں نہیں کریں گے لوگ۔ جب فلم پاکستان میں لگے گی تمہاری، لوگوں کو پتہ چلا کہ تم ایسا کوئی کام کر رہے ہو۔"

"آپ کیا سمجھتی ہیں کہ ہر کوئی جو فلم بناتا ہے وہ دنیا سے منہ چھپا کر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے عزت دار فلمیں بناتے ہیں اور میں تو صرف شوق کے لیے بنا رہا ہوں کوئی بزنس شروع نہیں کر رہا۔"

اس نے نہ چاہنے کے باوجود ماں کو وضاحت دینا شروع کی لیکن اس کی ماں اس وقت اس کی کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھی۔

"شوق کے لیے بنا رہے ہو یا جیسے بھی بنا رہے ہو اب یہ شادی کے بعد ہی بنانا تم۔"

"آپ میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتیں آپ جانتی ہیں میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"شادی نہیں کرنا چاہتا اور اس چڑیل کے لیے جوگ لے کر بیٹھنا چاہتا ہوں۔" کرم علی کی ماں کا اشارہ اس بار عارفہ کی طرف تھا۔

"اس کا نام نہ لیں۔" کرم علی نے بے ساختہ کہا۔

"کیوں نام نہ لیں۔ اس نے شادی کر لی بچے ہو گئے اس کے اور تم آج بھی اس کے لیے بیٹھے ہو۔"

"میں کسی کے لیے نہیں بیٹھا ہوں۔" کرم علی نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ میری زندگی ہے میں نہیں چاہتا کسی کو اس میں شامل کروں تو آپ لوگوں کو کیا اعتراض ہے آپ لوگ تو خوش ہیں نا اپنی زندگیوں میں۔"

"میں تو تب تک خوش نہیں ہوں گی جب تک تمہارا گھر نہیں بسے گا کرم علی! میں تب تک بے چین ہی رہوں گی۔ باپ تمہارا تم سے کہتے کہتے مر گیا۔ تم نے اس کی بات نہیں مانی اب کیا ماں کو بھی اسی طرح نامراد کر کے قبر میں اتار دے گا؟"

کرم علی کی ماں نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ کرم علی ٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ ان کے غصے سے لڑ سکتا تھا آنسوؤں سے نہیں اور خاص طور پر ابھی جب وہ ایسی کسی صورت حال کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ اس کی ماں اس سے ملنے ویک اینڈ پر اس کے گھر آئی تھی اور وہ یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ اگلے چند گھنٹوں میں ان دونوں کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی ہو گی۔

"آپ کو کیوں یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ میں ایسا کچھ۔" اس کی ماں نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

"اگر ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر تم میری بات مان لو۔"

"کیسے مان لوں میں آپ کی بات؟ مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔"

''کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے تمہارے پاس شادی نہ کرنے کی۔''

''میں آپ کو وجہ بتادوں گا مگر فی الحال آپ کوئی اور بات کریں۔ میں اس موقع پر بات نہیں کروں گا۔''

''میں صرف اسی ایک چیز کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں، وہاں پاکستان میں ہم نے تاریخ بھی طے کردی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ تم اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتے۔''

کرم علی ہونق بنا ماں کا چہرہ دیکھتا رہا۔

''آپ کیسے مجھ سے بات کیے بغیر میری شادی کی تاریخ طے کرسکتی ہیں۔''

''کیوں؟'' کیا میرا کوئی حق نہیں ہے تم پر؟'' اس کی ماں کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے۔

''حق ہے آپ کا بلکہ سارے حق آپ کو ہی ہیں۔ جب میں شادی کروں گا آپ ہی کی پسند اور مرضی سے کروں گا لیکن فی الحال میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔''

کرم علی نے بے حد نرم آواز میں ماں کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

''اور وہ جو بے چارے شادی کی تیاریاں کر کے لوگوں میں دعوت نامے بھی بانٹ چکے ہیں۔ ان کا کیا ہوگا؟ اس لڑکی کے ماں باپ کیا کریں گے اگر اس وقت ہم نے انہیں تمہارا شادی سے انکار پہنچایا؟ وہ تو جیتے جی مر جائیں گے اور وہ بے چاری لڑکی کرم علی! مجھے بددعاؤں سے بڑا ڈر لگتا ہے میں کسی کی آہ نہیں لینا چاہتی۔''

اس کی ماں نے یک دم پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ ''آپ انہیں سمجھا دیں۔ سارا الزام میرے سر پر ڈال دیں۔ بلکہ میری طرف سے معافی مانگ لیں۔ مجھ سے نہیں ہوگی تو کسی نہ کسی سے تو ہو جائے گی اس لڑکی کی شادی۔'' کرم علی نے کہا۔

وہ واقعی اس صورت حال سے بہت پریشان ہو رہا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت اس کے گلے پڑ گئی تھی۔

''وہ غریب لوگ ہیں امیر ہوتے تو انہیں مسئلہ نہ ہوتا لیکن اب لوگ لاکھ باتیں کریں گے لڑکی کے بارے میں، تمہیں تو پتا ہے ہمارے لوگوں کا۔''

''آپ انہیں کچھ رقم دے دیں بلکہ جتنی بھی رقم وہ چاہیں انہیں دے دیں۔ ہماری غلطی ہے ہمیں اس کا کچھ خمیازہ تو بھگتنا چاہیے۔'' کرم علی نے فوراً سے پیشتر تجویز پیش کی۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ یہ تجویز بے حد نامناسب تھی۔

اس سے پہلے کہ اس کی ماں کچھ کہتی کرم علی وہاں سے اٹھ گیا اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ جب تک وہ وہاں بیٹھا رہے گا یہ بحث اسی طرح چلتی رہے گی مگر یہ اس کی بھول تھی کہ اس کے وہاں سے ہٹ جانے سے معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کی ماں اور گھر والوں کے لیے یہ مسئلہ اب ان کی ناک کا مسئلہ تھا۔ وہ اتنی آسانی اور آرام سے پورے معاملے کو گول کر کے کرم علی کو ایک بار پھر بھاگنے کا موقع نہیں دے سکتے تھے۔

اگلے تین دن اس کی ماں اس کے گھر رہی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے بہن بھائی بھی وہاں آگئے۔ اسے اس بات پر بے حد خجالت اور

بکی کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ سب اس طرح اکٹھے اس سے اس کی زندگی کے ایک ایسے مسئلے پر بات کر رہے تھے جس کا ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

دوسری طرف اسے اس فیملی اور اس لڑکی سے بھی ہمدردی ہو رہی تھی جو خواہ مخواہ اس کے گھر والوں کی جلد بازی کی وجہ سے اس سارے مسئلے میں آ گئی تھی۔ اور کہیں نہ کہیں کرم علی کو احساس جرم بھی ہو رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا تھا جو بے عزتی کی تلافی پیسے کے ذریعے کروانا چاہ رہا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار ایک عجیب مخمصے کا شکار ہو رہا تھا۔

بعض دفعہ اسے لگتا۔ اسے شادی کر لینی چاہیے تھی۔ اب اس صورت حال کا اس سے زیادہ مناسب حل نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ انکار کی صورت میں وہ اپنی ماں اور گھر والوں کی ناراضی کے احساس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں کسی لڑکی کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کا احساس جرم بھی اپنے کندھوں پر لے کر پھرتا اور یہ آخری چیز تھی جو اسے زیادہ پریشان کرنے لگی تھی۔ صرف یہ ایشو تھا جس کے بارے میں وہ اپنے گھر والوں کو ٹھیک سے جواب نہیں دے پاتا تھا اور انہوں نے اس کی کمزوری بھانپتے ہوئے اسی ایک بات پر اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کی ضد کی وجہ سے ایک لڑکی کی زندگی اور نیک نامی خراب ہو جانے والی تھی۔

شادی کی تاریخ سے چار دن پہلے کرم علی بالآخر زری سے شادی پر تیار ہو گیا تھا۔ وہ بے حد خفا تھا لیکن اس کی ماں اور گھر والوں کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ سب کی بات مان گیا تھا۔ شادی پر رضامند ہو جانے کے باوجود وہ فوری طور پر شادی کے لیے پاکستان نہیں جا سکتا تھا۔ اگلے تین ہفتے وہ کینیڈا میں بے حد مصروف تھا۔

اس کے گھر والوں نے شادی کی تاریخ میں کوئی تبدیلی کرنے کے بجائے شادی کی اسی تاریخ کو برقرار رکھا۔ وہ کرم علی کے حوالے سے کوئی رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔

کرم علی اور زری کا نکاح فون پر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت تک کرم علی زری کے بارے میں اس کے نام، خوب صورتی اور غربت کے علاوہ کسی چوتھی چیز سے واقف نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس کی خوب صورتی کی تعریفیں سننے کے باوجود اس نے زری کی تصویر تک نہیں دیکھی تھی۔ اور زری کی عمر اور اس کی مرضی کے بارے میں وہ بالکل بے خبر تھا۔ اگر اس کے گھر والے اسے کہیں پہلے یہ بتا دیتے کہ زری اور اس کی عمر میں اتنا فرق ہے تو کرم علی کسی صورت اس شادی پر تیار نہ ہوتا۔ اسے اس وقت زری قربانی کا ایک بکرا لگتی جو ماں باپ کی مرضی سے قربان کیا جا رہا تھا اور شاید اس شادی سے انکار کرنے کی وجہ لڑکی کی کم عمری ہوتی مگر یہ کرم علی کی بدقسمتی تھی کہ کسی نے اس کے سامنے زری کی عمر کا ذکر نہیں کیا۔

☆☆☆

شیراز، سعید نواز کا داماد تھا۔ یہ جاننے میں زینی کو زیادہ وقت نہیں لگا تھا اور سعید نواز کی بیٹی شینا کے بارے میں اسے معلومات حاصل کرنے میں اس سے بھی کم وقت لگا تھا۔ اسے شینا کی پہلی شادی اور بچے کے بارے میں بھی پتہ چل گیا تھا۔ شیراز نے گھاٹے کا سودا کیا تھا مگر اس سودے میں اسے کتنا گھاٹا ہوا تھا وہ اگر کبھی اس سے ملتی تو ضرور جاننا چاہتی لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس کی شیراز کے ساتھ ملاقات یوں اچانک ہونے والی

تھی، نہ ہی شیراز کے فرشتوں کو یہ خبر تھی کہ وہ قیامت بن کر سعید حاں کے گھر پر اترنے والی تھی۔

وہ اس شام اشتیاق رندھاوا کے ساتھ تھی اور اسے اشتیاق کے ساتھ کسی سرکاری افسر کے گھر ڈنر پر جانا تھا۔ کوئی اور منسٹر ہوتا تو جس اداکارہ کے ساتھ پھرتا، اس کو سات پردوں میں چھپ کر رکھتا کہاں یہ کہ رندھاوا ان دنوں زینی کے ساتھ کھلے عام پھرا کرتا تھا۔ اس نے پریس میں کبھی اپنے اور پری زاد کے افیئر کی تردید نہیں کی تھی۔ اور پرائیویٹ میں وہ بلا جھجک پری زاد کے ساتھ اپنی محبت کا اعتراف کرتا تھا۔

اس رات بھی زینی اس کے ساتھ یہی سوچ کر گئی تھی کہ وہ اسے اپنے کسی واقف کار کے گھر لے جا رہا تھا۔ افسر کا نام کیا تھا اسے اس میں دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اس گھر کے ڈرائیو وے پر گاڑی میں بیٹھے دور پورٹیکو میں استقبال کے لیے کھڑے تین لوگوں میں سے ایک کو دیکھ کر وہ پچھتائی اسے اشتیاق رندھاوا سے اس افسر کا نام پوچھ لینا چاہیے تھا۔ زینی کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ وہ شیراز کا گھر تھا۔ یا پھر شاید سعید نواز کا۔ اگلے چند لمحوں میں اسے پتا چل جاتا۔

شیراز بے حد ہشاش بشاش موڈ میں شینا اور سعید نواز کے ساتھ اشتیاق رندھاوا کو ریسیو کرنے کھڑا تھا۔ وہ اشتیاق کی نجی مصروفیات تھیں اور وہ اپنی سرکاری گاڑی کے بجائے ذاتی گاڑیوں میں سے ایک استعمال کر رہا تھا، جسے اس کا ذاتی ڈرائیور چلا رہا تھا۔

گاڑی ڈرائیو وے پر ان کی طرف آ رہی تھی اور پورٹیکو سے ابھی کچھ فاصلے پر ہی تھی جب شیراز نے بھی زینی کو گاڑی کی عقبی سیٹ پر اشتیاق رندھاوا کے ساتھ دیکھ لیا۔ وہ ایک پل میں برف کا بت بن گیا تھا۔

اشتیاق رندھاوا کو سعید نواز نے اپنی ایکسٹینشن اور ایک پرمٹ کے حصول کے ساتھ ساتھ شیراز کی ایک دوسری جگہ پوسٹنگ کے لیے گھر میں ڈنر پر بلایا تھا۔ سعید نواز کے ساتھ اس کی اچھی علیک سلیک تھی اور سعید نواز نے یہ ڈنر اپنے گھر کے بجائے ان دونوں کے گھر پر ارینج کر لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شیراز کو خاص طور پر اشتیاق رندھاوا سے متعارف کروائے۔

اور اب اشتیاق کے ساتھ گاڑی میں موجود دوسرے فرد نے شیراز کے سارے جوش و جذبے پر وزیر داخلہ کے گھر پر آنے کے احساس تفاخر کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔

وہ اس کے ساتھ کیوں آئی تھی؟ وہاں اس کے گھر اس وقت شیراز کو اشتیاق رندھاوا کی وہ آمد اور ملاقات بھی کوئی سازش لگ رہی تھی۔

"یہ پری زاد کو کیوں اٹھا لایا ہے ساتھ؟" شینا نے بھی اس کی طرح دور سے اسے دیکھ لیا تھا اور اس نے سعید نواز سے بڑبڑاتے ہوئے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ سعید نواز کوئی جواب دیتا گاڑی پورٹیکو میں آ کر رک گئی۔

سعید نواز کے دو ملازمین نے آگے بڑھ کر گاڑی کے دروازے کھولے اشتیاق پہلے گاڑی سے اترا تھا اور اترنے کے بعد وہ سعید نواز سے ملنے کے بجائے دوسری طرف سے اترنے والی پری زاد کا منتظر رہا تھا۔

"دیکھیں سعید صاحب! ہم کس کو اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔" اس نے بڑی خوش دلی کے ساتھ زینی کو ان سے متعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''ارے رندھاوا صاحب! یہ تو خوش قسمتی ہے ہماری کہ آج آپ کے ساتھ ساتھ پری زاد نے ہمارے غریب خانے پر آنے کی زحمت کی۔''

سعید نواز نے شیراز اور شینا کے برعکس بے حد خوش دلی اور گرم جوشی سے آگے بڑھ کر زیبی کا استقبال کیا۔ شیراز اور شینا اب سعید نواز کے عقب میں تھے، شیراز یک دم ہر قسم کا پروٹوکول اور ادب آداب بھول گیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اسے آگے بڑھ کر اشتیاق رندھاوا سے مصافحہ کرنا تھا وہ آگے بڑھتا تو اس کو اشتیاق ہی نہیں زیبی سے بھی علیک سلیک کرنی پڑتی اور یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ زیبی اس بار اسے نہ پہچانتی۔

اپنے سے دوفٹ کے فاصلے پر دیکھ کر وہ کس طرح ری ایکٹ کرتی۔ یہ سول سروسز اکیڈمی نہیں تھی، جہاں وہ لوگوں کے ہجوم میں چھپ جاتا، یہاں وہ ہزار معجزوں کی دعائیں کرتا تب بھی معجزہ ہونے والا نہیں تھا۔

''اور یہ میرے داماد..... شیراز اکبر۔''

سعید نواز اب بیچ میں سے ہٹ گئے تھے۔ وہ اشتیاق سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے بولے۔ زیبی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ شیراز اشتیاق رندھاوا سے ہاتھ ملا رہا تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہونے کے باوجود اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ اشتیاق کے ساتھ کھڑی تھی۔ اشتیاق سے ہاتھ ملانے کے بعد شیراز کے لیے سب سے مشکل ترین مرحلہ تھا۔ اسے زیبی سے علیک سلیک کرنا تھی۔ اس سے نظریں ملاتے ہوئے۔ وہ اسے اب تک پہچان چکی تھی، اس بارے میں تو شیراز کو کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ لیکن پیچھا چھوٹنے کے بعد وہ اس سے اس طرح کیسے مل سکتی تھی جس طرح ملی تھی۔ بے حد خوش دلی کے ساتھ چہرے پر مسکراہٹ لیے۔

شیراز کو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آیا۔ زیبی کے انداز میں کوئی شناسائی نہیں تھی اور پھر اسے خیال آیا کہ اس سے کوئی شناسائی ظاہر کرتا وہ بھی افورڈ نہیں کر سکتی تھی وہ بھی اشتیاق رندھاوا کے ساتھ آئی تھی۔ اکیلے آتی تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ اس خیال نے یکدم جیسے شیراز کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا تھا۔ ابھی وہ اتنا بے بس نہیں ہوا تھا جتنا اس نے خود کو سمجھ لیا تھا۔ اس میں اس کی اور زیبی کی پوزیشن تقریباً ایک جیسی آکورڈ تھی، پھر وہ کیوں اتنا خوف زدہ ہو رہا تھا شیراز نے قدرے مطمئن ہوتے ہوئے سوچا۔

زیبی تب تک شینا سے مل رہی تھی جس نے اس سے ہاتھ یا گلے ملنے کا کوئی تکلف نہیں کیا تھا۔ اس نے بے حد پرتکلف انداز میں اس سے دور کھڑے اسے ہیلو کہنے پر ہی اکتفا کیا۔ ایک بن بلائی ایکٹریس کو وہ اتنی ہی گرم جوشی دکھا سکتی تھی۔

اس نے زیبی کو سر سے پاؤں تک دیکھا ہو نہ دیکھا ہو مگر زیبی نے اسے سر سے پاؤں تک ہی دیکھا تھا۔ یہ وہ عورت تھی جس نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ جس کے بارے میں وہ ہمیشہ سوچتی رہی تھی۔ جس کی خوش قسمتی پر اس نے ہمیشہ رشک کیا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے ''زیبی'' نے ''پری زاد'' کے وجود میں دراڑیں پڑتی دیکھیں۔ پھر اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اسے اس وقت پری زاد کے ماسک کی جتنی ضرورت تھی پہلے کبھی نہیں تھی۔

اشتیاق رندھاوا نے اس کی سوچوں کا تسلسل توڑ دیا۔

اس نے پری زاد کو گھر کے اندر چلنے کے لیے کہا۔ شینا نے بے حد خفگی سے باپ کو دیکھا تھا۔ اسے اشتیاق کی طرف سے پری زاد کو دی

جانے والی یہ توجہ بے حد بری لگ رہی تھی۔ سعید نواز نے آنکھیں چرائی تھیں۔ شینا کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ وہاں واحد نہیں تھی، جسے اشتیاق کا پری زاد پر اس طرح قربان ہونا برا لگ رہا تھا۔ وہ اگر شیراز کے چہرے پر ایک نظر ڈال لیتی تو اسے اندازہ ہو جاتا کہ کم از کم زندگی میں پہلی بار ان دونوں کو ایک ہی چیز بری لگ رہی تھی۔

''گھر بڑا خوبصورت ہے آپ کا۔''

زینی نے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی مشروب کا گلاس اٹھایا اور ڈرائنگ روم پر نظر ڈالتے ہوئے سعید نواز سے کہا۔

''میرا تھا میں نے شادی پر بیٹی کو گفٹ کر دیا ہے۔'' سعید نواز نے بڑے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ تو شیراز صاحب گھر داماد کے طور پر رہ رہے ہیں یہاں۔''

اس کے اگلے جملے نے شیراز کو جیسے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگایا تھا۔ ڈرائنگ روم میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ شینا کے ماتھے پر بلوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جبکہ زینی بے حد آرام سے مشروب کے گھونٹ بھرتی رہی۔ اس خاموشی کو اشتیاق رندھاوا کے قہقہے نے توڑا تھا۔ جو فہمائشی انداز میں ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''گھر دامادی کے بڑے فائدے ہوتے ہیں پری زاد۔ اور نقصان کوئی نہیں۔ کیوں شیراز صاحب؟''

شیراز کو لگا کسی نے اس کے منہ پر جوتا مارا ہو۔

وہ ایک لفظ نہیں بول سکا۔ سرخ چہرے اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ اشتیاق اور سعید نواز کو دیکھتا رہا جو ہنس رہے تھے اور زینی مشروب کا ایک اور گھونٹ لے رہی تھی۔

''ویسے آپ کا اپنا گھر کہاں ہے شیراز صاحب؟ ڈیفنس میں؟''

زینی نے دوسرا گھونٹ لیتے ہوئے ایک بار پھر بڑے اطمینان سے پوچھا۔ شیراز جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر صرف زینی ہی نہیں اشتیاق بھی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے جواب کا منتظر تھا۔

''جی نہیں۔'' شیراز نے مدھم آواز میں کہا۔

''اچھا تو ماڈل ٹاؤن میں؟''

اس نے ایک بار پھر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، سعید نواز نے جیسے شیراز کی مدد کرنے کی کوشش کی اس نے شیراز کے علاقے کا نام بتایا۔ شیراز کی خفت کچھ اور بڑھ گئی۔

''اوہ۔ اچھا۔'' زینی نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے بڑی مایوسی ہوئی ہو۔ ''ویسے پتہ نہیں کیوں آپ کو دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں آپ کو پہلے کہیں دیکھ چکی ہوں۔''

شیراز کی جیسے جان نکل گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہر شخص چونک کر شیراز کو دیکھنے لگا تھا۔

''آپ کے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟'' اس نے دوسرا چابک مارتے ہوئے کہا۔

شیراز کا جسم ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ اس بار مدد وہاں سے آئی جہاں سے وہ زندگی بھر توقع نہیں کر سکتا تھا۔

''آپ کے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟''

یہ شینا تھی جس نے بے حد طنزیہ انداز میں پری زاد سے پوچھا۔

اس کا اگر یہ خیال تھا کہ باپ کے تذکرے پر پری زاد کے منہ سے کوئی جواب نہیں نکل سکے گا۔ تو اسے مایوسی ہوئی تھی۔

''وہ انکم ٹیکس میں کلرک تھے۔ ضیاء نام تھا ان کا۔ بتیس سال سروس کی انہوں نے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے بتایا نہیں شیراز صاحب! آپ کے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟''

مصیبت ٹلی نہیں تھی۔ اس نے ایک سانس میں شینا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بے حد فخریہ انداز میں اپنے والد کے بارے میں بتایا تھا اور پھر اسی سانس میں شیراز سے دوبارہ پوچھ تھا۔

''شیراز کے والد سول سروسز اکیڈمی میں تھے۔ سرکاری افسر تھے۔'' سعید نواز نے بے اختیار مداخلت کی۔ زینی کے سوال اب اسے بھی چبھنے لگے تھے۔ زینی اس کے جواب پر بے اختیار ہنسی۔

''اوہ۔ پھر تو مجھے یقیناً غلطی ہوئی ہے۔'' اس نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''اصل میں ہمارے محلے میں ایک لڑکا ہوتا تھا۔ باپ شاید میٹرک پاس ریٹائرڈ تھا اس کا۔ لڑکا بڑا لائق تھا سی ایس ایس کر لیا تھا اس نے، سنا ہے بڑی اچھی پوزیشن لی تھی اس نے۔ لیکن اس کے بعد اس نے اپنی منگیتر سے منگنی توڑ کر کسی سرکاری افسر کی بیٹی سے شادی کر لی۔''

اس بار صرف شیراز کا رنگ فق نہیں ہوا تھا۔ سعید نواز اور شینا کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ وہ بڑے آرام سے بیٹھی شیراز کی لائف ہسٹری انہیں بتا رہی تھی۔

''ہوتے ہیں ایسے کتے آدمی بھی۔'' اشتیاق چند لمحوں کے لیے یہ بھول گیا تھا کہ وہ کسی کے ڈرائنگ روم میں ہے۔

''لیکن سعید نواز تو ایسے آدمی کو اپنے گھر تک میں نہ گھسنے دیں، کہاں یہ کہ اس سے رشتہ داری کر لیں۔ کیوں سعید صاحب!'' زینی نے اگر جوتا شیراز کے منہ پر مارا تھا تو اشتیاق کی کہی ہوئی بات جوتا بن کر سعید نواز کو لگی تھی۔

''جی۔ جی۔ بالکل۔'' وہ بے حد بوکھلا گیا۔

''میرا خیال ہے کھانا لگ گیا ہے۔ آئیں کھانا کھائیں۔'' اس نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

''آپ لوگ کھائیں۔ میرا تو بالکل موڈ نہیں ہو رہا یہاں سے اٹھنے کا۔'' زینی نے بڑے اطمینان سے مشروب کا خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تو نہیں منگوا لیتے ہیں کھانا۔ اگر سعید صاحب کو زحمت نہ ہو تو۔" اشتیاق بھی دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"نہیں نہیں زحمت کیسی۔ یہیں کھانا سرو کروا لیتے ہیں۔"

سعید نواز نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

جبکہ شینا نے کھا جانے والی نظروں سے زینی کو دیکھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس دو ٹکے کی ایکٹریس کو اٹھا کر اپنے گھر سے باہر پھنکوا دیتی جو ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یوں ادائیں دکھا رہی تھی جیسے وہ وہاں چیف گیسٹ کے طور پر آئی ہو۔ اسے صرف زینی ہی نہیں بلکہ اشتیاق رندھاوا بھی اتنا ہی برا لگ رہا تھا۔

چند لمحوں میں ڈرائنگ روم سے منسلک ڈائننگ روم کی ٹیبل سے ملازموں نے کھانا لا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھے لوگوں کو سرو کرنا شروع کر دیا۔ جیسے ہی نوکر وہاں سے غائب ہوئے۔ زینی نے بڑے انداز سے اپنی ڈنر پلیٹ اٹھا کر شیراز کی طرف بڑھائی۔

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو شیراز صاحب تو اس میں کچھ بریانی لا دیں۔"

اس بار پہلی بار شیراز کا دل چاہا وہ زینی کے چہرے پر ایک تھپڑ کھینچ مارے۔ بے عزتی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ اتنی زحمت نہیں کر سکتی تھی کہ اٹھ کر ٹرالی سے بریانی لے لیتی۔ اور اگر وہ اٹھ نہیں سکتی تھی تو اسے شیراز کو حکم دینے کے بجائے شینا کی مدد مانگنی چاہیے تھی۔

"اور مجھے کچھ کڑاہی گوشت لا دیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اشتیاق رندھاوا نے بھی اس کی طرف اپنی پلیٹ بڑھائی تھی شیراز کا دل چاہا۔ وہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ جائے۔

"میں ملازم کو بلاتا ہوں، وہ سرو کرتا ہے ہمیں۔" سعید نے سائیڈ ٹیبل پر پڑی بیل کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ملازم کی کیا ضرورت ہے۔ میں رندھاوا صاحب سے کہتی تو وہ مجھے کھانا ڈال کر لا دیتے۔ کیوں رندھاوا صاحب؟"

زینی نے جیسے برا مان کر کہا۔

"بالکل۔ تم حکم تو کرو پری زاد۔ کوئی ضرورت نہیں ملازم کی۔ میں خود لا دیتا ہوں کھانا۔" رندھاوا نے زینی کے ہاتھ سے پلیٹ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں رندھاوا صاحب میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔ شیراز سرو کر دے گا ہمیں۔"

سعید نواز نے اندر آتے ہوئے ملازم کو ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کا کہا۔ وہ اندر سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ شیراز نے کچھ کہنے کے بجائے اٹھ کر ان دونوں سے پلیٹیں لے لی تھیں۔

شینا نے اسے کھانا سرو کرتا دیکھ کر اپنی پلیٹ رکھ دی۔ اس کی بھوک یک دم ختم ہو گئی تھی۔ اسے سعید نواز اور شیراز دونوں پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔

اس رات سعید نواز کے ڈرائنگ روم میں صرف زینی اور اشتیاق رندھاوا نے کھانا کھایا تھا۔ شینا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی تھی، اور شیراز کھانا

سرد کرتا رہا تھا۔ زینی نے اتنا کھانا کھایا نہیں تھا لیکن ہر چیز کے بیے شیراز کو دوڑایا ضرور تھا۔

وہ بار بار پلیٹیں بدلتی رہی تھی اور اس کے سامنے بھری ہوئی پلیٹوں کا ایک ڈھیر اکٹھا ہو گیا تھا۔ وہ صرف کھا نا سنگوار رہی تھی اور یہ چیز شینا اور سعید نواز دونوں نے نوٹ کر لی تھی۔

کھانے کے دوران ہی سعید نواز نے اشتیاق رندھاوا سے ان معاملات کے بارے میں بات کی، جس کے لیے اس نے دراصل اسے بلوایا تھا۔ شیراز کو یقین تھا وہ ان معاملات کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہے گی۔ مگر خلاف توقع وہ خاموش رہی تھی۔ صرف شیراز کی پوسٹنگ کی بات پر اس نے بے حد معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے شیراز کو دیکھا تھا۔ جو نظریں چرا گیا تھا۔

جس وقت وہ جانے کے لیے گھر کے پورٹیکو تک پہنچے۔ شیراز نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ سعید نواز کا موڈ بھی بے حد خوشگوار تھا کیونکہ تمام معاملات طے پا گئے تھے۔ اور وہ اب پہلے سے بڑھ کر رندھاوا کے سامنے بچھ رہا تھا۔

لاؤنج کے دروازے سے باہر نکلتے نکلتے زینی رک گئی اور اس نے بے حد معصومیت سے شیراز سے کہا۔

"ارے میں اپنے جوتے تو ڈرائنگ روم میں بھول ہی گئی۔ شیراز صاحب ذرا میرے جوتے تو اندر سے لا دیں۔"

وہ ساڑھی میں ملبوس تھی اور کسی نے بھی اسے ڈرائنگ روم میں جوتے چھوڑتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہ کہتی تو شاید کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ اس وقت جوتوں کے بغیر ہے۔

سعید نواز، شیراز اور شینا تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔ وہ مسکراہٹیں جو چند لمحے پہلے تک ان تینوں کے چہروں پر تھیں، وہ اب غائب ہو گئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ سعید نواز پورچ میں کھڑے کسی ملازم کو جوتے لانے کے لیے اندر بھجواتا اور اپنے داماد کی بکی ہوئی عزت بچانے کی کوشش کرتا۔ اشتیاق نے ہنستے ہوئے شیراز سے کہا۔

"ہاں... ہاں... شیراز صاحب! پری زاد کا جوتا لا دیں۔ بڑے خوش قسمت ہیں آپ کہ آپ کو پری زاد کا جوتا اٹھانے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔"

شیراز نے اس بار کسی کی طرف نہیں دیکھا، اس نے صرف بے حد شاکی نظروں کے ساتھ مسکراتی ہوئی زینی کو دیکھا اور اندر چلا گیا۔

"بہت بری عادت ہے میری، جہاں جاؤں جوتے اتار دیتی ہوں۔ اچھی عادت نہیں ہے نا رندھاوا صاحب؟"

اس نے پہلے معذرت خواہانہ انداز میں سعید نواز سے کہا پھر بڑی ادا سے اشتیاق رندھاوا سے۔

"کیوں، اچھی عادت نہیں ہے پری زاد! ہم غلام ہیں نا جوتے اٹھانے کے لیے۔ تم ایک بار کیا دس بار جوتے اتار دو۔" اس سے پہلے کہ زینی کچھ کہتی، شیراز اس کے سینڈلز لے کر باہر آ گیا۔ اس نے تقریباً پھینکنے والے انداز میں سینڈلز کو زینی کے پیروں میں رکھا اور جیسے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری۔

زینی نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس سے کہا۔

"شیراز صاحب! ذرا انہیں پہنا بھی دیں۔" اس نے اپنی ساڑھی پیروں سے کچھ اوپر اٹھا لی تھی۔ شیراز کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ زینی اتنا ذلیل کیسے کر سکتی تھی اسے۔

"شیراز صاحب! مجھے تو اب حسد ہونے لگا ہے آپ سے۔ ارے ایسے نازتو پری زاد نے کبھی ہم سے بھی نہیں اٹھوائے۔"

اشتیاق نے ہنستے ہوئے سعید نواز کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ سعید نے بھی ہنسنے کی کوشش کی تھی۔ جوتے نہ پہنانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ شیراز نے زمین پر بیٹھ کر زینی کے پیروں میں سینڈلز پہنا دیے۔ اس وقت اس کا دل چاہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

یہ سب کچھ اگلے بہت دنوں تک گھر کے ان نوکروں کی زبان پر رہنا تھا جو اس وقت وہاں آس پاس موجود تھے۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی شیراز صاحب! اب ملتے رہیں گے۔" اس کے سیدھا کھڑا ہونے پر زینی نے اس سے کہا تھا۔ شیراز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گاڑی کے پورٹیکو سے نکلتے ہی شینا پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے اندر چلی گئی تھی۔ شیراز نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ماتھے کو خشک کیا۔ سعید نواز کے چہرے پر اب کسی قسم کی کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ بے حد سرد مہری کے ساتھ باہر جاتی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اور جیسے ہی وہ گاڑی گیٹ سے نکلی، سعید نواز بھی اندر چلا گیا۔

شیراز نے فوری طور پر ان کے پیچھے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ وہاں اس کا کیا حال ہونے والا تھا، وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ اس کی زندگی کی بدترین رات تھی۔ وہاں کھڑے اس نے سوچا تھا۔ یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

☆☆☆

گاڑی گیٹ سے باہر نکلتے ہی اشتیاق رندھاوا نے گردن موڑ کر زینی سے کہا۔

"تم جانتی ہو اسے؟"

چند لمحوں کے لیے زینی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ساکت رہ گئی۔ اسے اشتیاق رندھاوا سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

"کسے...؟" اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر اشتیاق کو دیکھا جو یک دم بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"سعید نواز کے داماد کو؟"

"نہیں۔" زینی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں نہیں مانتا۔ اتنی تذلیل تم کسی انجان آدمی کی نہیں کر سکتیں۔" اشتیاق نے اسے کچھ اور چونکا دیا۔

"تذلیل...؟" زینی نے بے ساختہ کہا۔ وہ اور کچھ دیر آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"آپ کو پتہ تھا کہ اس کی تذلیل کر رہی ہوں تو میرا ساتھ کیوں دے رہے تھے؟" زینی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ ''شاسا'' تھا تم محبوبہ ہو ''مجنوں'' کیا کرتا... لیکن کچھ دیر کے لیے تو میں بھی حواس باختہ ہو گیا تھا۔ تم نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا۔ حیران تھا، آج کیا ہو گیا ہے۔ تم تو کسی اجنبی کو گھاس تک نہیں ڈالتیں۔ کہاں یہ کہ شیراز سے اس کے خاندان کے بارے میں پوچھنے بیٹھ گئیں۔'' وہ اشتیاق کی بات سنتی رہی۔

''سعید نواز چاہتا کیا ہے آپ سے؟'' زینی نے بات بدلی۔

''بہت کچھ... اپنے داماد کی کراچی میں ایک کھانے پینے والی جگہ پوسٹنگ... جاب میں ایکسٹینشن اور ایک پرمٹ۔''

''اور آپ کیا دیں گے اسے؟''

''یہ تو پری زاد طے کرے گی۔'' زینی چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

''دے دیں اسے جو چاہتا ہے۔''

''واقعی؟'' اشتیاق نے دلچسپی سے کہا۔

''ہاں... جوتے اٹھانے کے بعد کچھ تو ملنا چاہیے اسے۔'' اس نے تنفر سے کہا۔ اشتیاق ہنس پڑا۔

''تم نے بتایا نہیں کہ شیراز سے کیا تعلق ہے تمہارا؟''

زینی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''آپ جان کر کیا کریں گے؟''

''تم سے ہمدردی بہر حال نہیں کروں گا۔''

''پھر تو رہنے ہی دیں۔''

''تم اس کی وہ منگیتر ہو جسے اس نے سی ایس ایس کے بعد چھوڑ دیا؟'' زینی کو دھچکا لگا۔ اشتیاق مسکرا رہا تھا۔

''مجھے تو اب آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''معشوق کو کبھی عاشق سے ڈر لگتا ہے؟''

زینی خاموش رہی۔ وہ شیراز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''مجھ سے شادی کرو گی پری زاد؟''

وہ ایک بار پھر چونکی۔ اشتیاق ہفتہ میں ایک بار اسے پرپوز ضرور کرتا تھا۔ کبھی فون پر، کبھی بالمشافہ ملاقات پر لیکن سڑک پر آج وہ پہلی بار یہ بات کر رہا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے بڑی محبت کے ساتھ اشتیاق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کتنے سال انکار کرو گی پری زاد؟''

''جتنے سال زندگی ہے میری۔'' وہ ہنسی۔

وہ جیسے کراہا۔ ”اس کا مطلب ہے، انتظار بہت طویل ہوگا۔“

”یہ بھی ممکن ہے، بہت مختصر ہو۔“

”آج ”عروج“ ہے تمہارا اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں تمہارے ”زوال“ کا انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”زوال میں آپ کے پاس ”پری زاد“ نہیں، کوئی دوسری پری ہوگی۔“ زینی پھر ہنسی۔

”طنز کر رہی ہو؟“

”نہیں، آپ سمجھیں، مشورہ دے رہی ہوں۔“

اس نے لاپروائی سے کہا۔ اشتیاق کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

”سلمان کے پیپرز بنوا دیے ہیں میں نے، ایک دو دن تک بھجوا دوں گا تمہیں۔ وہاں اس کی جاب کا بھی انتظام کر دیا ہے میں نے۔ شروع میں اپنے دوست کے گھر پر ہی رہائش کا انتظام کروایا ہے پھر ایک بار وہ جاب کرنا شروع کر دے تو دیکھوں گا کیا ہوتا ہے۔“

زینی نے بے حد احسان مند نظروں سے اسے دیکھا۔ ”میں “

اشتیاق نے بے نیازی سے اس کی بات کاٹی۔ ”آگے کچھ مت کہنا، تمہاری زبان میں عاجزی آئے گی تو مجھے بُری لگنے لگو گی تم۔ تمہاری زبان کی کڑواہٹ اچھی لگتی ہے مجھے۔“

زینی واقعی بول نہیں سکی۔

☆☆☆

”کیسے جانتی ہے وہ تمہیں، تمہارے باپ کو، تمہارے فیملی بیک گراؤنڈ کو؟“

شینا شیراز کے اندر آنے سے پہلے سعید نواز پر برس رہی تھی۔ شیراز کے نظر آتے ہی جیسے توپوں کو صحیح ٹارگٹ مل گیا تھا۔

”میں... مجھے کیا پتہ میں تو زندگی میں پہلی بار اس سے ملا ہوں۔“ شیراز نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”اور پھر بھی اسے تمہارے بارے میں سب پتہ ہے اور یہ کون سی منگیتر تھی تمہارے جس سے منگنی توڑ کر تم نے مجھ سے شادی کی۔“

”شینا پلیز...“ شیراز نے منت والے انداز میں کہا۔ ”اور آپ... آپ نے اس گھٹیا فنسٹر کو یہاں انوائٹ کیوں کیا؟ وہ آدمی اس قابل تھا کہ یہاں آتا؟ ٹوٹلی ڈرنک تھا وہ... اور ساتھ وہ لے آیا اپنی کیپ کو۔ اس نے کیا سمجھا، کہاں آ رہا تھا وہ؟“

”مجھے کیا پتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کسی ایکٹریس کو لے کر آنے والا ہے۔“

سعید نواز نے بے بسی سے کہا۔ پہلی بار شینا، شیراز کے سامنے ان پر یوں چلا رہی تھی۔

”آئندہ آپ کو اس دو ٹکے کے آدمی کو بلوانا ہوا تو اپنے گھر بلوایئے گا۔ یہ میرا گھر ہے، کوئی نائٹ کلب نہیں ہے، جہاں وہ اپنی ڈیٹ (Date) کے ساتھ آؤٹ (Out) ہو کر آئے۔“

اس نے سختی سے کہا سعید نواز نے اس بار خاموش رہنا بہتر سمجھا۔

"اور تم۔۔"

"Your are in big trouble Mr."

(اور تم مسٹر! ایک بڑی مصیبت میں گھر گئے ہو)

وہ شیراز کو دھمکی دیتے ہوئے لاؤنج سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی سعید نواز کو جیسے موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ اپنا غصہ کسی دوسرے پر نکال سکے اور شیراز ایسے کام کے لیے بہترین انتخاب تھا۔

"کیا رشتہ تھا تمہارا اس سے؟" شیراز اس کے سوال اور انداز پر ہکا بکا رہ گیا۔

"پاپا! میں۔۔ میں اسے نہیں جانتا۔"

"یہ جھوٹ تم شینا سے بولنا۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش مت کرو تم۔ سمجھے؟"

"میں قسم کھاتا ہوں پاپا! میں اسے نہیں جانتا۔"

وہ روہانسا ہو گیا، اس کا بس چلتا تو وہ سعید نواز کے پاؤں پکڑ لیتا۔

"میں چار دن میں پتا کروا لوں گا اس کے بارے میں اور اگر مجھے پتا چلا کہ تمہارا اس کے ساتھ کوئی چکر ہے تو تم دیکھنا، میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔"

وہ اسی طرح دھاڑتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ شیراز نے دل ہی دل میں زینی کو جی بھر کر گالیاں دیں۔ وہ واقعی اس گھر سے جاتے جاتے اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکا گئی تھی۔

"شینا! میری بات سنو۔ پلیز میری بات سنو۔" شیراز نے اندر کمرے میں جا کر شینا کو منانے کی ایک کوشش کی تھی۔ سعید نواز کی انویسٹی گیشن سے بچنے کے لیے یہ بے حد ضروری تھا۔

"Keep your hands off me."

(اپنے ہاتھ پیچھے ہٹاؤ)

وہ حلق پھاڑ کر چلائی اور اس نے شیراز کے ہاتھ کو جھٹکا۔

"پہلے تو مجھے تم سے نفرت تھی لیکن اب مجھے تم سے گھن آتی ہے۔"

وہ چلا رہی تھی۔

"You stink. You really stink."

ان ہی ہاتھوں سے جوتے پہنائے ہیں تم نے اس تھرڈ کلاس ایکٹریس کو، جس کے آدھے شہر کے ساتھ چکر ہیں، کبھی دوبارہ مجھے ہاتھ مت لگانا۔"

"میں کیا کرتا، وہ مہمان تھی تمہارے پاپا کی۔"

شیراز نے سارا ملبہ سعید نواز پر ڈالنے کی کوشش کی۔

"پاپا کی مہمان تھی۔ تمہاری تو نہیں تھی۔ مجھے تو لگتا ہے۔ وہ تم سے پیر چاٹنے کو بھی کہتی تو تم دم ہلاتے ہوئے کتے کی طرح اس کے پیر چاٹنے بیٹھ جاتے۔"

شیراز کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"Now that's enough" (اب بہت ہو چکا) اس نے بے اختیار شینا کو غصے میں ٹوکا۔

" No I dont think that is ہماری کلاس کا حصہ بننے کا شوق ہے ہماری کلاس کا سینس ازم بھی سیکھ آؤ۔ اپنا یہ مڈل کلاسیا پن اسی گٹر میں پھینک آؤ، جہاں تم نے ساری زندگی گزاری ہے۔"

"تم ... تم منع کر دیتیں مجھے، پاپا منع کر دیتے مجھے۔" شیراز نے بے بسی سے کہا۔

"کیوں ہم کیوں منع کرتے تمہیں؟ تمہاری اپنی کوئی ایگو، کوئی self esteem نہیں ہے؟ میرا خیال ہے نہیں ہے۔ ہوتی تو آج نظر آتی۔ اومائی گاڈ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ تم اتنا گر سکتے ہو۔"

شینا نے اپنی کنپٹیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے تو نوکر تم سے زیادہ غیرت مند اور خوددار ہیں۔ اور میں تمہاری، تم جیسے آدمی کی بیوی بن گی۔ مسز شیراز اومائی گاڈ! پاپا نے میری زندگی تباہ کر دی۔" وہ چلاتے ہوئے بولی۔

"اب تم میرے کمرے سے دفعان ہو جاؤ۔"

اس نے یک دم شیراز سے حلق کے بل چلا کر کہا۔ وہ بڑبڑا کر کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

"آج شیراز سے ملی میں۔"

زینی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بتایا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اشتیاق رندھاوا کے ساتھ واپس آئی تھی اور اب سلطان اس کے پاس بیٹھا اسے اگلے دن کا شیڈول بتا رہا تھا جب زینی نے اس کی بات کاٹی۔

"کیا؟... کہاں؟" سلطان چونک گیا۔

"اس کے گھر گئی تھی اشتیاق کے ساتھ، اس لڑکی کو دیکھا میں نے جس کے لیے اس نے مجھے چھوڑ دیا۔"

وہ اسے وہاں ہونے والے واقعات بتانے لگی۔ سلطان ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ صرف وہی ہے جو اس طرح ہنس رہا تھا۔ زینی کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہیں تھی۔

''آپ خوش نہیں ہیں۔'' سلطان بھی یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''کس بات پر خوش ہوتی۔ اس آدمی کو اپنی مرضی سے چند ٹکوں کے عوض بکنے والی شے بنتے دیکھ کر، جسے میں پوری دنیا کے عوض بھی کسی کو نہ دیتی۔ یہ وہ آدمی تھا، سلطان! جس کے جوتوں کی دھول زینی اپنے دوپٹے سے صاف کیا کرتی تھی۔ اسے ایسا درجہ دیا تھا میں نے اور آج مجھے یقین تھا کہ میں اسے اپنے جوتے لانے کو کہوں گی تو وہ مر جائے گا مگر یہ کام کبھی نہیں کرے گا۔ لیکن میں نے شیر کو گھاس کھاتے دیکھ لیا۔''

وہ رو رہی تھی یا ہنس رہی تھی، سلطان سمجھ نہیں سکا۔ بس اسے شیراز پر غصہ آیا۔

''بھول جائیں اسے۔ پری جی! جانے دیں اسے۔ وہ اس قابل نہیں ہے۔''

اس نے ہزار بار کا دہرایا ہوا جملہ پھر زینی کے سامنے دہرایا۔ وہ چپ چاپ سگریٹ پیتی رہی۔

''وہ میں نے آپ کو ربیعہ باجی کے بارے میں بتایا تھا۔''

سلطان نے یک دم جھجکتے ہوئے کہا زینی کو جیسے کرنٹ لگا۔

''کیا؟''

''وہ کسی لڑکے سے مل رہی ہیں آج کل۔'' سلطان نے جھجکتے جھجکتے بتایا۔ زینی نے سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک دیا۔

''کس لڑکے کے ساتھ؟''

''فاروق نام ہے اس کا۔ ربیعہ باجی کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے وہ۔ میں نے پتہ کروایا ہے اس کے بارے میں۔ غریب خاندان سے تعلق ہے اس کا، پر اچھا شریف لڑکا ہے، گھر والے بھی بڑے شریف ہیں اس کے۔ مجھے لگتا ہے کچھ دنوں تک رشتہ آئے گا ان کے گھر سے ربیعہ باجی کے لیے۔''

سلطان مزے سے بتا رہا تھا۔ زینی کو اس کی معلومات پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ سلطان کے ذرائع معلومات کیا تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی لیکن سلطان سے ملنے والی اطلاعات پر کبھی اسے شبہ نہیں ہوا تھا۔

زینی کو اپنے کندھوں پر کا کوئی بوجھ یک دم ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ عمران والے واقعے کے بعد بہت دفعہ اسے ربیعہ سے عجیب قسم کی ندامت محسوس ہوتی تھی بعض دفعہ تو اسے اپنا آپ ربیعہ کا مجرم لگتا۔

''کیا سوچ رہی ہیں پری جی؟'' سلطان نے اسے چونکایا۔

''کچھ نہیں۔'' زینی نے کہا۔ ''اس کے بارے میں مزید پتا کرواؤ۔''

اس نے سلطان کو ہدایت کی۔

''آپ سے پہلے ہی کروا رہا ہوں۔'' سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

زینی نے ایش ٹرے میں سگریٹ کو دیکھا۔ وہ جل چکا تھا۔

☆☆☆

جمال کا دل چاہ رہا تھا، وہ زری کا گلا گھونٹ دے۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ محلے میں کسی سہیلی کے گھر جانے کا کہہ کر اس پارک میں آئی تھی۔ جہاں جمال اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہفتے بعد زری کی شادی کے بارے میں بھی سن لیا تھا۔ اور وہ گاڑی بھی دیکھتا آ رہا تھا جس پر بیٹھ کر زری تقریباً ہر روز شاپنگ کے لیے جاتی اور پھر رات گئے شاپرز کے ساتھ لدی پھندی واپس آتی۔

''تو دیکھنا جمال! میں مولوی کے سامنے نکاح سے انکار کر دوں گی۔ تو دیکھ لینا۔''

''تو انکار کرے گی؟ تو؟ دولت مند لوگ ہیں وہ۔ کروڑپتی بڈھا ہے وہ۔ تو کیسے چھوڑ دے گی یہ سب کچھ۔'' وہ زہریلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''مجھے جھانسہ دے رہی ہے تو میری زندگی برباد کر دی تو نے۔''

زری کے آنسوؤں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

''میں کیا کروں جمال! میری کوئی سنتا ہی نہیں۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔ ابا کو پیسے دے گی ہے اس کی بہن۔ ابا کیسے انکار کرے۔ اب مجھے بیچ رہے ہیں وہ۔'' زری نے جیسے دہائی دی۔

''وہ نہیں بیچ رہے تو خود بک رہی ہے۔ اپنے لالچ کی وجہ سے۔''

''گالی مت دے مجھے جمال'' زری تڑپ کر رہ گئی۔

''گالی؟ کیسی گالی؟ تو روز اس عورت کے ساتھ خوش خوش جاتی ہے اس گاڑی میں اور تو کہتی ہے، یہ زبردستی ہے۔'' وہ آج اس کی کسی بات پر یقین نہیں کر رہا تھا۔

''تو کیا کروں؟ نہ جانے کا کہہ کر ابا کے ہاتھوں ماری جاؤں؟'' زری یک دم رونا بھول گئی۔

''تجھے کہا ہے میں نے، میرے ساتھ بھاگ چل۔'' جمال نے کہا۔

''بھاگ کر کہاں جاؤں؟ کہاں لے جائے گا مجھے بھگا کر، بتا؟ کون سا بنگلہ تعمیر کر رکھا ہے تو نے جہاں تو مجھے رکھے گا؟ چار دن جدا ہی محلے میں واپس آئیں گے اور ابا تجھے اور مجھے دونوں کو مار دے گا۔''

''بنگلے کے طعنے مت دے مجھے۔ پہلے بنگلے میں رہتی ہے کیا تو چار دن گاڑی میں پھر پھرا لیا ہے تو نے۔ اب تو تو بنگلہ ہی مانگے گی رہنے کے لیے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتی دل بھر گیا ہے تیرا مجھ سے، تجھے کوئی امیر آدمی چاہیے تھا گھر بسانے کے لیے..... اور وہ امیر اب مل گیا ہے تجھے۔''

''جو مرضی کہہ لے تو جمال' زری تیری ہے تیری ہی رہے گی۔ تو شادی والے دن گھر کے باہر رہنا۔ میں مولوی کو بتا دوں گی۔ مجھے تیرے ساتھ شادی کرنی ہے۔ پھر ابا کو کرنی پڑے گی تیرے ساتھ میری شادی۔'' وہ کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے گھر کے باہر رہوں گا میں لیکن پستول لے کر اور تو نے اگر نکاح کر لیا نا تو تیرے دروازے کے سامنے گولی ماروں گا اپنے آپ کو پھر میری لاش سے گزر کر تو اس کی گاڑی میں بیٹھے گی۔''

جمال نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ زری بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی وہ جمال کو جانتی تھی، وہ ضد پر اتر آتا تو پھر اٹھنے سے الٹا

کام بھی کر گزرتا تھا۔ اس کے لیے اب پہلی بار آگے کنواں، پیچھے کھائی والی صورت حال آگئی تھی۔

کرم علی سے اس کی نفرت میں کچھ اور اضافہ ہوا، یہ واحد کام تھا جو وہ کسی خوف کے بغیر کرسکتی تھی۔

☆☆☆

"میں اپنے ماں باپ سے بات کروں گا ربیعہ! لیکن مجھے پتہ ہے وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ ایک ایکٹریس کی بہن کے ساتھ وہ کبھی میری شادی نہیں کریں گے۔"

فاروق نے کسی لگی لپٹی کے بغیر اس دن ربیعہ کو بتا دیا تھا۔ وہ پچھلے چند روز سے اس کے لیے رشتہ بھیجنے کی بات کر رہا تھا اور ربیعہ اپنے اندر یہ ہمت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اسے یہ بتادے کہ وہ پری زاد کی بہن تھی۔

دوسری طرف فاروق کو یہ پریشانی تھی کہ وہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا رہن سہن ان لوگوں کے رہن سہن سے بے حد مختلف تھا پتہ نہیں اس کے گھر والے اس رشتہ کو قبول بھی کریں گے یا نہیں اور اس نے ربیعہ سے جھجکتے جھجکتے اس خدشہ کا اظہار کر دیا تھا۔ جس پر ربیعہ نے اسے کھل کر بتا دیا کہ اس کا رہن سہن ان سے بھی برا تھا وہ آج بھی جس گھر میں رہتی تھی وہ اس کی بہن کی ملکیت تھی۔ ان کے ٹھاٹھ باٹھ پری زاد کی وجہ سے تھے اس لیے اسے فاروق کے خاندان کا حصہ بننے میں کوئی دقت نہیں ہوگی نہ ہی اس کی ماں اس بات پر کوئی اعتراض کرے گی۔

لیکن یہ سب کچھ سننے کے بعد فاروق یک دم مزید پریشان ہو گیا تھا اور اب وہ ربیعہ کو اپنی مجبوری بتا رہا تھا کہ اس کے گھر بھیجنے سے پہلے اپنے ماں باپ کو یہ سب کچھ بتانا پڑے گا اور اس کے ماں باپ اس رشتہ پر تیار نہیں ہوں گے۔ ربیعہ پر جیسے کسی نے یک دم منوں مٹی ڈال دی تھی۔

عمران کے بعد وہ پہلی بار کسی لڑکے میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اس نے پہلی بار شادی جیسے رشتہ میں بندھنے کا سوچا تھا اور اب پھر وہی کچھ ہونے والا تھا جو پہلے ہوا تھا۔

دو دن کے بعد فاروق نے رشتہ بھیجنے سے معذرت کرلی تھی۔ اس نے ربیعہ کو اپنی مجبوریوں کی لمبی فہرست سناتے ہوئے کہا تھا کہ وہ کبھی اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکتا لیکن اپنے گھر میں لانے کے لیے اسے اپنے والدین کی رضامندی چاہیے کیونکہ وہ فاروق کا نہیں اس کے والدین کا گھر تھا اور ایک ایکٹریس کی بہن کے ساتھ شادی کی صورت میں خود اس کی بہنوں کی شادیاں نہیں ہو سکیں گی۔ اس لیے وہ یہ قربانی دے رہا تھا۔

ربیعہ اس دن گھر آکر بری طرح روئی۔ اسے لگا تھا۔ وہ ساری عمر زیبی کی وجہ سے اسی گھر میں بیٹھی رہے گی۔ خوشیوں کے لیے اور اپنے گھر کے لیے ترستے اس کے ٹکڑوں پر پلتے ہوئے۔

اگلے دو دن اس نے کچھ نہیں کھایا اور اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی نفیسہ بے حد پریشان ہو گئی تھیں۔ وہ فاروق والے معاملہ سے واقف تھیں اور انہیں فاروق کے انکار سے اتنی تشویش نہیں تھی جتنا ربیعہ کے اس طرح کھانا چھوڑ دینے سے۔ انہوں نے زیبی کو بھی فاروق کے انکار کے بارے میں بتا دیا۔ زیبی کو بے حد رنج ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی ربیعہ اس وقت اس کے بارے میں کس طرح سوچ رہی ہوگی۔ اس کے باوجود وہ اس کے کمرے میں گئی۔

"امی نے بتایا ہے، تم نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا۔"

وہ اس کے پاس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ربیعہ جسم پر چادر تانے بیڈ پر چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔

"تمہیں اس سے مطلب؟" اس نے کاٹ کھانے والے انداز میں زینی سے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا، تم آخر اپنے دل میں میرے لیے کون سی کدورت پال رہی ہو۔"

"ہاں کدورتیں پالنے کا حق تو صرف تم کو ہے، تمہاری وجہ سے لوگوں کی زندگیاں برباد ہوتی رہیں مگر کوئی تم سے کچھ نہ کہے۔" اس نے زہریلے انداز میں کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم اگر فاروق کی وجہ سے۔" ربیعہ نے زینی کی بات کاٹی۔

"تم فاروق کو کیسے جانتی ہو؟"

"بے مقصد سوال ہے یہ۔" زینی نے کہا۔

"اگر اس کے بارے میں جانتی ہو تو یہ بھی جانتی ہوگی کہ اس نے تمہاری وجہ سے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔"

"کیوں کر دیا ہے؟ اگر اس کو تم سے محبت ہے، سچی محبت تو اسے تم سے ہر قسم کے حالات میں شادی کرنی چاہیے۔ وہ بہن کے ایکٹریس ہونے کی وجہ سے تمہیں چھوڑ کر بھاگنا چاہتا ہے۔ یہ محبت ہے اس کی؟"

"تم اس کی محبت کے بارے میں کچھ مت کہو۔ اس کی محبت سچی ہے یا جھوٹی۔ صرف میں جانتی ہوں۔" ربیعہ نے تلخی سے کہا۔

"تم مردوں کے بارے میں بہت کم جانتی ہو۔"

"اور تم ضرورت سے زیادہ۔" ربیعہ نے اسے طعنہ دیا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کر گئی۔

"میں فاروق سے رابطہ کروں گی۔" ربیعہ نے ایک بار پھر بے حد غصے کے عالم میں اس کی بات کاٹی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر اس سے رابطہ کرو گی تو اس کے دل میں میرے لیے اگر کوئی عزت ہے تو وہ بھی ختم ہو جائے گی۔" زینی کو دھچکا لگا۔ "اتنی بری ہوں میں؟" اس نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

"تم بری ہو گئی ہو۔" ربیعہ نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔

"ٹھیک کہتی ہو تم۔" زینی کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

"چھوڑ دو یہ سب کچھ۔" ربیعہ نے یک دم اس سے کہا، پتا نہیں کیوں اسے لگا تھا اس وقت لوہا گرم ہے۔

"فائدہ؟ اس کے بعد کیا نیک نام ہو جاؤں گی؟" زینی نے سر جھٹک کر کہا۔

"مگر دنیا تمہیں یہ سب کچھ نہیں کہے گی جو اب کہہ رہی ہے۔"

"دنیا جو چاہے کہے، مجھے فرق نہیں پڑتا لیکن اگر اپنے برا کہنے لگیں تو برداشت نہیں ہوتا۔" زینی نے رنج سے کہا۔

"اپنوں کو کبھی آزمانا نہیں چاہیے زینی۔"

"تو کس کو آزمائیں، غیروں کو؟" زینی نے تلخی سے کہا۔

"ایک وقت آئے گا جب تم بہت پچھتاؤ گی، یہ سب جو تم کررہی ہو اس پر۔" ربیعہ کو پھر غصہ آنے لگا۔

"ہوسکتا ہے لیکن تب زینب تمہارے کندھے پر سر رکھ کر رونے نہیں آئے گی۔"

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ ربیعہ نے بے بسی سے آنکھیں بند کرلیں۔ زینی کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

☆☆☆

سر جھکائے زری نے فرش پر نظر آنے والے پیروں کو دیکھنا شروع کیا۔ نکاح خواں ایجاب وقبول سے پہلے کے چند جملے ادا کر رہا تھا اور زری وہ جملے تیار کر رہی تھی جو اسے کہنا تھے اس کے اندر جیسے لاوا ابل پڑنے کے لیے تیار تھا۔

زری نے باری باری سر جھکائے ان پیروں کو دیکھنا شروع کیا، وہ سارے ان لوگوں کے پاؤں تھے جو اس کے وجود کو سیڑھی بنا کر اوپر جانا چاہتے تھے۔ اس کا باپ، ماں، بہنیں چند لمحوں کے لیے اسے ایسا لگا جیسے وہ سارے پیر اس کے جسم کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ ہاتھیوں کے کسی جھنڈ کی طرح اسے روندتے، رگیدتے ہوئے۔ چند لمحوں کے لیے اسے اپنا وجود بے حد کچلا اور پامال ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جیسے گہرا سانس لیتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"آخر وہ کیوں ان لوگوں کے لیے سیڑھی بنے؟ انہیں اپنے اوپر سے گزرنے دے؟" اس نے سوچا لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ یہ دوسری سوچ تھی پھر اسے جمال کا خیال آیا۔ خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں سے گزر گئی۔

"تم نے اگر ہاں کی تو میں خود کو گولی مارلوں گا۔ تمہارے گھر سے تمہاری بارات جائے گی اور میرے گھر سے میرا جنازہ۔"

اس کے کانوں میں اس کی دھمکی گونجی۔ وہ پچھلی رات چھت پر ایک بار پھر ملے تھے۔ جمال نے اسے وہ ریوالور بھی دکھایا تھا جو وہ کہیں سے لایا تھا۔ زری کو یقین تھا وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ وہ کیا کرتی، نکاح خواں باہر جاتا اور جمال اپنے آپ کو گولی مار لیتا۔

اس کے میک اپ سے لپے چہرے پر اسے پسینے کے قطرے نمودار ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے اسے باہر بیٹھے اپنے سے بیس بائیس سال بڑے اس بوڑھے آدمی سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی تھی جو چند گھنٹے پہلے اچانک نکاح کے لیے پاکستان پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے اس کا نکاح فون پر ہو رہا تھا، وہ شادی کے نام پر اس کا سودا کرنے آیا تھا۔ اسے اتنی ہی نفرت کمرے میں موجود اپنے خونی رشتوں سے ہو رہی تھی جن کی مرضی سے وہ سودا طے پا رہا تھا۔

پوری دنیا میں صرف جمال تھا اس سے سچی محبت کرتا تھا نہ کرتا ہوتا تو اس وقت اس کے لیے اپنی جان دینے پر تیار نہ ہو جاتا۔

کمرہ اس وقت اس کی ساری رشتہ دار خواتین اور مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ مووی کیمرہ کی تیز جلا دینے والی روشنی رہی سہی کسر پوری کر رہی تھی۔ اس کا سانس جیسے بند ہو رہا تھا۔

''زرینہ حمید الدین ولد حمید الدین! تمہیں سو تولے سونا اور پانچ لاکھ روپے سکہ رائج الوقت کے عوض کرم علی ولد جہاں داد کی زوجیت میں دیا جا رہا ہے تمہیں قبول ہے؟''

نکاح خواں اب بالآخر وہ سوال کر رہا تھا جس کے جواب کی تیاری وہ پچھلے ایک ہفتہ سے کر رہی تھی۔ کمرے میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔

☆☆☆

ایک لمحہ کے لیے زری کو لگا جیسے اس سننے میں کوئی غلطی ہوئی تھی۔ نکاح خواں اب ایک بار پھر نکاح کے جملے دہرا رہا تھا۔

''پانچ لاکھ روپے اور سو تولے سونا؟'' زری نے بے یقینی سے سوچا۔ کیا وہ اتنی قیمتی تھی کہ کوئی مرد اس کی اتنی بڑی قیمت لگا کر اسے گھر لے جاتا۔ وہ اب سو تولے سونے کی قیمت کے حساب کتاب میں مصروف تھی۔ اور جوں جوں وہ حساب کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولتے جا رہے تھے۔ اس کے ذہن سے جمال اس وقت نکل گیا تھا۔ صرف وہی نہیں اس گھر اور اس کمرے میں بیٹھا ہر شخص بھی۔ یاد رہا تھا تو صرف یہ کہ ایک ہاں اسے آج لکھ پتی بنا دینے والی تھی۔ انکار اسے کیا دیتا اسے اس کے بیے کسی حساب کتاب کی ضرورت نہیں تھی۔

''قبول ہے۔'' اس نے بے ساختہ کہا اور پھر دو دفعہ اسے پھر دہرایا ہر دفعہ اس اقرار کے ساتھ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا فنانشل اسٹیٹس بھی تبدیل ہو رہا ہے اور تیسری بار اقرار کرنے کے بعد اس نے خوشی کی ایک عجیب سی لہر اپنے وجود کے اندر دوڑتی محسوس کی۔ اس نے زندگی میں جیک پاٹ ہٹ کر لیا تھا۔ وہ اب اس کمرے میں کھڑی اسے رشک اور حسد بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں کا حصہ نہیں رہی تھی۔

نکاح خواں اور کمرے میں نکاح کے لیے آئے ہوئے دوسرے مرد اب وہاں سے جا چکے تھے۔ زری کی ماں بڑے فخریہ انداز میں عورتوں کی مبارک بادیں وصول کرتے ہوئے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ زری پل بھر میں کرم علی کے بعد اس محلے کا دوسرا Icon بن گئی تھی۔

تھوڑی دیر اور گزری اور اس کے بعد باہر کی طرح اندر بھی نکاح کے چھوہارے بٹنے لگے۔ نکاح ہو گیا تھا اور اب کچھ ہی دیر میں رخصتی ہونے والی تھی اور اس پورے عرصہ میں زری کو پہلی بار جمال کا خیال آیا تھا اور اس کا خیال آتے ہی جیسے اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

کرم علی صرف گھر کے چند افراد کے ساتھ نکاح کے لیے آیا تھا اور وہ لوگ باہر گلی میں ہی ایک ٹینٹ میں بیٹھے تھے۔

زری کو یقین تھا جمال اس ٹینٹ میں ہی کہیں ہوگا اور اس نے کرم علی کی طرف سے ایجاب و قبول دیکھا ہوگا اور اس نے زری کے ایجاب و قبول کے بارے میں بھی سنا ہوگا۔ پھر اس نے کیا کیا؟

''یا پھر وہ کیا انتظار کر رہا تھا صحیح وقت کا کہ'' زری کو زندگی میں پہلی بار جمال سے خوف آیا۔ اس کے کان مسلسل باہر ہونے والے کسی دھماکے اور ہنگامے کے منتظر رہے۔

نکاح کے فوراً بعد رخصتی ہو گئی تھی۔ زری کے گھر والوں نے کھانے کا انتظام کیا تھا مگر کرم علی کے گھر والوں نے کھانے سے منع کر دیا تھا حالانکہ کرم علی کو اب اس طرح کا کھانا اور وہاں کا ماحول معیوب لگ رہا تھا تو وہاں کھانا کھانے پر اور اس طرح کھانا کھانے میں کوئی اعتراض یا جھجک نہیں تھی زری کے والدین جو اس کے سامنے جس طرح بچھ رہے تھے وہ اس پر مسلسل شرمندہ ہو رہا تھا اور اس کی شرمندگی کا آغاز نکاح خواں کے منہ

سے زری کی عمر سنتے ہی ہو گیا تھا۔

وہ چند لمحے تک کچھ بول نہیں سکا۔ ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کے ساتھ شادی۔ کرم علی کی جگہ کوئی بھی دوسرا مرد اس انتخاب پر بے حد خوش ہوتا لیکن کرم علی کا دل ڈوب گیا تھا۔ اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے اور خودکشی کرنے میں وہ کوئی زیادہ فرق نہیں سمجھتا تھا۔

چند لمحوں کے لیے وہاں بیٹھے اسے ایسا ہی لگا تھا جیسے وہ کسی کی بیٹی خریدنے وہاں آیا تھا۔ وہ کسی بھی لحاظ سے اس لڑکی کے قابل نہیں تھا۔

وہ دونوں مکمل طور پر Mismatched تھے، وہ جس قدر خوب صورت تھی۔ اسے کوئی بھی ہم عمر اور اچھی شکل وصورت کا یا کم از کم اس سے بہتر شکل وصورت کا شوہر مل سکتا تھا پھر اس کے ماں باپ نے آخر کیا دیکھ کر کرم علی سے اس کی شادی کر دی تھی۔

صرف اس کی دولت؟

کرم علی کے رنج میں اضافہ ہوا۔

وہ پندرہ منٹ زری کے گھر میں زری کے ساتھ بیٹھا بھی سب کچھ سوچتا رہا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ بھی لانے میں ناکام رہا تھا اور اسے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس کے چہرے کی سنجیدگی اور اس کی خاموشی زری کے گھر میں موجود خاندان اور محلے کا ہر فرد نوٹ کر رہا تھا۔

کرم علی نے زری کو دیکھا تھا مگر زری نے ایک نظر بھی اٹھا کر کرم علی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس نے صرف ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص کے پیروں کو دیکھا تھا جو آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اور جس کے اندر آتے ہی ہلچل مچ گئی تھی۔

ہر ایک کرم علی سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور زری نے کرم علی کی خاموشی نوٹ کی تھی۔ ان کے محلے میں کسی بھی شادی میں کوئی بھی دلہا اس طرح گونگا ہو کر نہیں بیٹھتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے اپنے بہنوئی بھی نہیں بیٹھے تھے۔ مگر اس کے ساتھ شوہر کے طور پر بیٹھا ہوا شخص ہوں ہاں اور چند چھوٹے جملوں کے علاوہ کسی سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔

زری کو کرم علی سے عجیب طرح کی چڑ محسوس ہوئی۔ اس کے کان میں اس کی کسی سہیلی نے کسی رشتہ دار، کسی محلے والی نے کرم علی کے اندر آنے پر دولہا کے بارے میں کوئی تعریفی جملہ نہیں کہا تھا یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس سے دگنی عمر کا اور معمولی شکل وصورت کا تھا۔ زری کی سماعتیں منتظر رہی کہ شاید کوئی کرم علی کے بارے میں کوئی ایک اچھا جملہ کہہ دیتا اور اگر اس وقت اس کے ساتھ جمال بیٹھا ہوتا زری نے تصور کرنا شروع کر دیا تو اس وقت محلے کی ہر لڑکی رشک اور حسد سے مر رہی ہوتی۔ وہ دونوں بلاشبہ چاند اور سورج کی جوڑی تھے۔ (اگر دونوں اپنے منہ بند کر کے بیٹھے رہتے تو)

اور یہی وہ لمحہ تھا جب زری نے کرم علی کو جمال کے ساتھ replace کر دیا تھا اس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص اب کرم علی نہیں تھا جمال تھا۔

پندرہ منٹ بعد گھر سے گاڑی تک کا سفر کرتے اس نے بہت بار کسی فائر کی آواز کا انتظار کیا۔ کرم علی اب آ گیا تھا زری کو یہ اندیشہ بھی ہو رہا تھا کہ جمال خودکشی کرنے کے بجائے کرم علی کو بھی مار سکتا تھا۔ ویسے تو اسے کرم علی کی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن یہاں یہ مسئلہ تھا کہ اس کے پانچ لاکھ اور سو تولے سونا بھی کرم علی کی موت کے ساتھ ہی ڈوب جاتا۔

اس لیے وقتی طور پر گاڑی کی طرف جاتے ہوئے زری نے جمال سے زیادہ کرم علی کی زندگی کے لیے دعا کی۔ گاڑی میں خیروعافیت سے بیٹھ جانے کے بعد اسے حیرت ہونے لگی تھی۔ جمال آخر کہاں غائب ہو گیا تھا؟ اور اس کی یہ حیرت بہت دیر تک قائم نہیں رہی۔

گاڑی کے گلی سے نکل کر سڑک پر آتے ہی اس نے گاڑی کی کھڑکی سے جمال کو دیکھ لیا تھا۔ وہ گلی کے نکڑ پر کھڑا بے حد وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ زری کا دل کسی پرندے کی طرح پھڑپھڑایا۔ وہ رخصتی کے وقت نہیں روئی تھی لیکن اب یک دم اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ گاڑی آگے بڑھ چکی تھی۔ جمال پیچھے رہ گیا تھا۔

برابر بیٹھے کرم علی نے اس کی سسکی سنی پھر چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے دوپٹے کی اوٹ میں تھی اور وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا مگر اسے یقین تھا کہ وہ رو رہی تھی۔

اس نے ٹشو باکس اٹھا کر زری کے سامنے کر دیا۔ "پلیز۔"

زری نے اسے پہلی بار خود سے مخاطب ہوتے سنا۔ دوسری طرف بیٹھی کرم علی کی ماں بھی یک دم زری کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور اس نے زری کو اپنے ساتھ لگا کر تسلیاں دینا شروع کیا تھا۔ زری نے ایک ٹشو نکال لیا تھا لیکن اس نے اسے استعمال نہیں کیا۔ وہ پرفیومڈ ٹشو اس قدر نرم اور ملائم تھا کہ زری کو اس سے آنسو پونچھ کر ضائع کرنا اچھا نہیں لگا۔

زری نے ایک لمحہ کے لیے پھر تصور کیا کہ وہ کرم علی نہیں جمال تھا جو اس کے آنسوؤں سے پریشان ہو گیا تھا اور اس تصور نے اس کے آنسوؤں کو روک دیا تھا۔ کرم علی کی ماں نے فاتحانہ نظروں سے کرم علی کو دیکھتے ہوئے زری کو تھپکی دی۔ وہ یہ سمجھی کہ زری اس کی تسلیاں سن کر چپ ہوئی ہے۔

کرم علی ایک بار پھر گاڑی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کی ماں نے بڑے غور سے اپنے بیٹے کے چہرے کو دیکھا اور دل ہی دل میں عارفہ پر دس لعنتیں بھیجیں۔ اس کے خیال میں وہ یقیناً اس وقت اسی چڑیل کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ کرم علی کا اترا ہوا چہرہ بتا رہا تھا۔ وہ کچھ مایوس بھی ہوئی تھی وہ زری کو دیکھ کر اس طرح خوش نہیں ہوا تھا جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ "اتنی خوبصورت اور کم عمر بیوی دوسرے بیٹوں کے بیاہتی تو وہ خوشی سے پاگل ہو رہے ہوتے اور ایک یہ ہے کہ اب بھی عارفہ کو لے کر بیٹھا ہوا ہے۔" کرم علی کی ماں دل ہی دل میں اس سے گلہ ہونے لگا۔

زری کو کرم علی کے پاکستان والے گھر پہنچتے ہی جیسے غش آ گیا تھا۔ ایک بار پھر جمال اس کے ذہن سے غائب ہو گیا۔ اسے یہ تو اندازہ تھا کہ وہ کسی بنگلے میں رہتے تھے مگر وہ بنگلہ ایسا بھی ہو سکتا ہے یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ویسا ہی گھر جیسا وہ انڈین فلموں یا ٹی وی کے ڈراموں میں دیکھتی تھی۔ زری کو پہلی بار اپنی قسمت پر رشک آیا تھا۔ کرم علی کے گھر میں اس وقت اس کے گھر کے برعکس بالکل سناٹا تھا۔ اس کے جو چند بہن بھائی اس کی شادی میں شرکت کے لیے اس کے ساتھ کینیڈا سے پاکستان آئے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

زری کو انہوں نے چند ابتدائی رسومات کے بعد اس کے کمرے میں پہنچا دیا تھا کیونکہ فی الحال وہ زری کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اسے وہاں اپنے ساتھ بٹھا کے اس کے سامنے اس طرح گفتگو کر سکتے، جیسے وہ اس کی عدم موجودگی میں کر سکتے تھے اور شاید دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ فی الحال سب سے پہلی زری اور اس کے خاندان کی طرف سے منعقدہ شادی کی اس تقریب کو ہی ڈسکس کرنا تھا۔ جس میں سب نے بڑی بیزاری کے ساتھ

شرکت کی تھی۔ اس لیے وہاں سے زری کو بھیجنا ضروری تھا۔

زری کو پہلا غش اگر اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے آیا تھا تو دوسرا اس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے آیا تھا جو اس کا تھا۔ اس کی نند اسے صوفے پر بٹھانے کے بعد اسے بتا گئی تھی کہ وہ کچھ دیر میں اس کے لیے کھانا بھجواتی ہے وہ آرام کرنا چاہے تو کرلے۔

مگر زری آرام کیسے کر سکتی تھی۔ نند کے دروازہ بند کر کے باہر جاتے ہی اس نے خوشی سے مغلوب ہوتے ہوئے کمرے میں چلنا پھرنا اور وہاں پڑی چیزوں کو چھو چھو کر دیکھنا شروع کر دیا وہ جیسے یہ یقین چاہتی تھی کہ وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہے۔ اس پورے تناظر میں جو واحد چیز اسے جمال کی یاد دلاتی تھی وہ کرم علی تھا اور کرم علی فی الحال کمرے سے باہر تھا۔

☆☆☆

"آپ نے زری کی ماں کو دیکھا۔ بیٹی کی شادی پر بھی پھٹا ہوا دوپٹہ پہنے پھر رہی تھی۔ اتنا تو انسان ہوش کرے کہ اپنے کپڑے ہی دیکھ لے۔ اور باپ شادی کے موقع پر دس روپے کی چپل پیروں میں اٹکائے پھر رہا تھا۔ حالانکہ اتنی بڑی رقم دی ہم لوگوں نے کہ شادی کے اخراجات ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو جائیں لیکن انہوں نے تو مجھے لگتا ہے ان پیسوں میں سے ایک روپیہ بھی شادی پر خرچ نہیں کیا۔ ساری کی ساری رقم رکھ لی ہوگی۔ یہ اس طرح کے لوگوں کی ذہنیت ہوتی ہے۔ بیٹی کو بیاہنے پر تو ان کے تین کپڑے بھی نہیں لگے۔ آج تو زری کا پورا گھر شکرانے کے نفل ادا کر رہا ہوگا۔"

شکیلہ کے آخری جملے پر ڈرائنگ روم میں ایک قہقہہ پڑا تھا صرف کرم علی تھا جس کے ماتھے پر شکنیں آئی تھیں۔ اسے شکیلہ کی باتوں سے زیادہ اس قہقہے پر اعتراض ہوا تھا۔ ان سب نے جیسے ایک لفظ کہے بغیر صرف ہنس کر شکیلہ کے بیان کی تائید کی تھی۔

"اور اتنا گندا محلہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ اتنی گندگی اور خود زری کے گھر کی حالت دیکھنے والی تھی۔ مجھے تو اندر بیٹھتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا چھت پر بچے کھیل رہے تھے اور ان کے پیروں کی دھمک سن کر مجھے لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت چھت گر جائے گی۔"

یہ کرم علی کی ماں تھی کرم علی نے بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔ وہ ان کی مرضی سے وہاں بیاہا گیا تھا اور کچھ دن پہلے تک اسی گھر کے ساتھ رشتہ جوڑنے کے لیے وہ اسے اللہ کے واسطے دے رہی تھی۔

"میں سمجھتی تھی کہ چلو کسی ہوٹل یا میرج ہال میں نکاح کی تقریب کریں گے یہ لوگ۔ اس لیے اتنے پیسے بھجوائے میں نے پر پتا نہیں کیسے لوگ ہیں کہاں انہوں نے گلی میں دروازے کے سامنے ٹینٹ لگا کر بٹھا دیا ہمیں میں تو شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ ارے ہمیں کہاں عادت ہے۔ اس طرح گلی میں بیٹھ کر مجمع لگانے کی تم نے کہا نہیں تھا ان لوگوں سے کہ کسی ہوٹل یا میرج ہال میں انتظام کریں؟"

کرم علی کی ماں نے شکیلہ سے قدرے خفگی سے کہا۔

"اب ایسی باتیں بھی کیا میں کہتی ان سے؟" شکیلہ نے جواباً کہا "انہیں خود پتہ ہونا چاہیے تھا پہلی بیٹی تو نہیں بیاہ رہے تھے۔ اپنی حیثیت کا نہ سہی ہماری حیثیت کا تو خیال رکھنا چاہیے تھا انہیں اور پھر آخر پیسے ہم نے خیرات کے طور پر تو نہیں دیے تھے۔ انتظامات کے لیے دیے تھے اب اگر انہیں شادی کے انتظامات کا مطلب گلی میں ایک ٹینٹ، چار کرسیاں، میٹھے اور نمکین چاولوں کے ساتھ بڑے گوشت کے شوربے پر مشتمل سالن لگتا ہے تو

امی اس میں میں کیا کرسکتی ہوں؟" شکیلہ نے بے زاری سے کہا۔

"میں نے اسی لیے منع کیا تھا کہ اس طرح بری اور زیورات پر پیسہ لٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس کے بغیر بھی ان لوگوں سے بہت اونچے ہیں لیکن آپ نے میری ایک بات نہیں سنی اور اس پر بھائی جان نے حد کردی پانچ لاکھ روپے سونا بھی لکھ دیا اسے حق مہر میں، اس پورے محلے کی تمام بیاہی ہوئی لڑکیوں کا حق مہر اکٹھا بھی کرلیں تب بھی وہ اس سے آدھا ہی ہوگا اور ایک آپ بھی۔"

شکیلہ نے اب کرم علی کو مخاطب کرکے بات شروع کردی۔ اب شادی ہوگئی تھی۔ اب وہی کام ضروری تھا جو وہ سب بیٹھ کر رہے تھے شادی والے دن کرم علی کی ضروری برین واشنگ۔ اس کے ذہن میں یہ کوٹ کوٹ کر بھرنے کی کوشش کرنا کہ اس کے سسرال والے کتنے گھٹیا اور کمینے لوگ ہیں۔

"میرا خیال ہے شکیلہ! کہ زری اور اس کے گھر والوں کے بارے میں تم لوگوں کو پہلے ہی سب پتا تھا۔ آنکھیں بند کرکے تو تم لوگوں نے رشتہ نہیں کیا۔ وہ کتنے غریب ہیں یا جیسے بھی ہیں یہ سب تو آپ لوگوں کو شادی سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

کرم علی نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اسے اپنے بہن بھائیوں اور ماں کے لہجے میں جھلکنے والی حقارت بری طرح کھلی تھی۔

"ویسے بھی ہم خود اسی محلے میں رہے ہیں۔ اب یہ گندا ہے۔ یہ بدبودار ہے جیسا بھی ہے ہمارا بچپن یہیں گزرا ہے اور ایک زمانے میں ہمارا گھر زری کے گھر سے زیادہ خستہ حال اور چھوٹا تھا۔ اسی طرح چھتیں ٹپکتی تھیں اس کی اور اس طرح چھت پر کسی کے چلنے سے چھت گرنے کا اندیشہ ہونے لگتا تھا۔" وہ اب اپنی ماں کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

"اور یہاں کوئی غیروں کا مجمع نہیں تھا۔ سب لوگ ہمارے صرف نام نہیں بگڑے ہوئے نام تک جانتے ہیں ٹھیک ہے اب ہم یہاں نہیں رہتے اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت رزق دیا ہے۔ لیکن اسی گندگی میں پرورش پائی ہے ہم سب نے۔"

چند لمحوں کے لیے کرم علی کی بات پر سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر آصف نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"دیکھا بھائی تو پہلے دن ہی سسرال کی حمایت کرنے لگے ہیں، اب تو انہیں ہماری باتیں بری ہی لگیں گی نا۔"

"یہ حمایت یا طرف داری کی بات نہیں ہے، سچائی ہے۔" کرم علی نے اسے ٹوکا۔

"اب سو سال پہلے اگر ہم اس محلے میں رہتے تھے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ ہمیں اسی ایک چیز کے طعنے دینے لگیں۔" شکیلہ نے چڑ کر اور برا مان کر کہا۔

کرم علی کا دل چاہا وہ اسے بتائے کہ اسے یہاں سے گئے جتنے سال ہوئے ہیں۔ وہ اس کے ہاتھوں کی پوروں سے بھی کم ہیں۔ لیکن اس کے ہاتھوں کی لکیروں سے زیادہ گہرا نقش چھوڑے ہوئے ہیں۔

"میں کسی کو طعنہ نہیں دے رہا۔" کرم علی نے نرمی سے کہا پھر ماں سے مخاطب ہوکر بولا۔

"مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔"

اس کی ماں چونک گئی۔ وہ سب کے بیچ بیٹھے بٹھائے اکیلے بات کرنے پر کیوں اتر آیا تھا۔

''خیریت تو ہے؟''

''خیریت ہی ہے۔'' کرم علی نے اٹھتے ہوئے کہا اور ماں کو ساتھ لے کر اس کے کمرے میں آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں ایک بار پھر زری اور اس کے گھر والوں کے بارے میں تمسخر کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

''آپ نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ لڑکی اتنی کم عمر ہے'' کرم علی نے کمرے میں آتے ہی ماں سے کہا۔

''کتنی کم عمر ہے؟ بیس پچیس سال کی ہے۔ یہ کوئی کم عمر ہے؟'' کرم علی کی ماں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''اٹھارہ سال عمر ہے اس کی یا چلیں زیادہ سے زیادہ انیس کی ہو گی۔'' کرم علی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جھوٹ بولتے ہیں اٹھارہ کی کہاں سے لگ رہی ہے۔ لوگ خواہ مخواہ غلط عمریں لکھوا دیتے ہیں۔'' کرم علی کی ماں نے ناگواری سے کہا۔

''امی! میں جب پاکستان سے گیا تھا۔ اس وقت حمید الدین کی صرف تین بیٹیاں تھیں۔'' کرم علی نے سب لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا ایک لمحے کے لیے کرم علی کی ماں خاموش ہو گئی وہ واقعی یہ بھول گئی تھی کہ کرم علی حمید الدین کے خاندان کو ان ہی کی طرح جانتا تھا۔

''تو ہم نے کوئی زبردستی شادی تھوڑی کی ہے۔ انہوں نے اپنی مرضی سے بیٹی دی ہے ہمیں۔'' کرم علی کی ماں نے یک دم بات بدلتے ہوئے کہا۔

''سوال یہ نہیں ہے کہ انہیں اعتراض ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے مجھے پہلے یہ بات کیوں نہیں بتائی؟''

''مجھے دھیان نہیں رہا اور یہ کوئی خاص بات تھی بھی نہیں۔'' کرم علی کی ماں نے حد درجہ لاپروائی سے کہا۔

''خاص بات؟ وہ مجھ سے آدھی عمر کی ہے، امی! میں اتنی کم عمر لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''تم تو شادی ہی نہیں کرنا چاہتے تھے اور خیر اب تو شادی ہو گئی۔ اب چھوٹی یا بڑی عمر سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' کرم علی کی ماں نے اس بار پھر اسی اطمینان سے کہا۔

کرم علی کچھ دیر الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے بالآخر وہ بات کہی جو اس کی پریشانی کی اصل وجہ تھی۔

''آپ نے ان لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ مجھے برص ہے؟''

کرم علی کی بات پر وہ کچھ دیر کے لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے بڑے آرام سے کہا۔

''نہیں۔''

اس بار کرم علی بول نہیں سکا تھا۔

''یہ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تمہارے کون سے چہرے پر برص ہے۔ جسم پر ہے اور جسم کپڑوں میں چھپ جاتا ہے اور پھر یہ کوئی چھوت کی بیماری تو ہے نہیں، جو تمہاری بیوی کو لگ سکتی ہے کہ تمہارے سسرال والوں کو پہلے سے اس کی اطلاع دینا ضروری ہے۔''

''اور اگر کل کو چہرے پر بھی ہو گیا تو؟'' کرم علی نے بے حد تیز آواز میں کہا۔

''پر تم نے تو علاج کروا لیا تھا۔'' کرم علی کی ماں کو ایک لمحے کے لیے تشویش ہوئی۔

”کروایا ہے میں نے لیکن اگر میری قسمت خراب ہوئی تو پھر پڑھنا شروع ہو جائے گا۔“ کرم علی نے جھنجلا کر کہا۔

”اللہ نہ کرے۔“ اس کی ماں نے بے ساختہ کہا۔ ”تمہارے چہرے پر بھی برص ہوتا نا تو تمہارے سسرال والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ وہ تب بھی اپنی بیٹی دیتے تمہیں۔ انہوں نے تمہاری شکل وصورت نہیں دیکھی۔ جیب دیکھی ہے۔ بیٹی کا آرام وآسائش دیکھا ہے۔“

کرم علی کی ماں نے جیسے نیزے کی انی لے کر کرم علی کے دل میں گاڑ دی تھی۔ یعنی وہ یہ جانتی تھی کہ وہ صرف پیسے کے لالچ کے لیے کرم علی کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر رہے تھے اور اس کی ماں نے یہ رشتہ ہونے دیا۔

”میں ایسی بیوی نہیں چاہتا امی! جس کے ماں باپ میری شرافت نہیں صرف میری دولت دیکھ کر مجھ سے اپنی بیٹی بیاہیں۔“

اس نے بے حد رنج سے کہا۔ ”یہ وہ زمانے نہیں ہیں جب کوئی مرد کی شرافت دیکھ کر اس کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر دے۔ اب صرف مرد کا پیسہ ہی دیکھا جاتا ہے۔ اور تو اگر یہ سمجھتا ہے نا کہ عارفہ کے ماں باپ نے تمہاری شرافت دیکھ کر تمہارے ساتھ اس کا رشتہ کر دیا تھا تو یہ بھی بھول ہے تمہاری۔ انہوں نے بھی تب رشتہ کیا تھا تمہارے ساتھ جب تم نے چار پیسے کمانے شروع کر دیے تھے۔“

اس وقت عارفہ کا طعنہ اسے ایک اور برچھی کی طرح لگا۔ وہ وہاں زری کے ماں باپ اور عارفہ کے ماں باپ کا موازنہ کرنے نہیں آیا تھا۔ لیکن ماں سے بات کرنا جیسے بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔

”اور دیکھو، زری کو آج صاف صاف بتا دینا کہ اسے تمہاری ماں اور بہن بھائیوں کی تمہاری طرح عزت کرنی ہے۔ بلکہ اسے صاف لفظوں میں بتا دینا کہ اگر اس کی وجہ سے تمہارے گھر والوں کو کوئی تکلیف ہوئی تو وہ تمہارے گھر میں اس کا آخری دن ہو گا۔“

کرم علی نے بے حد حیرانی سے ماں کی شکل دیکھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ماں کی اس بات کا کیا جواب دے۔ اس کے چہرے پر یقیناً کوئی ایسے تاثرات نمودار ہوئے تھے جنہوں نے اس کی ماں کو یک دم سنبھلنے پر مجبور کیا۔

”میں اس لیے کہہ رہی ہوں بیٹا کہ کل کو تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ اب اسے تو پتہ نہیں ہے نا کہ تم ہمارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تم اسے خود بتا دو گے تو وہ بھی ذرا اچھے طریقے سے بات کرے گی سب سے ورنہ تو میں جانتی ہوں کہ بیٹے بیاہتے ہی پرائے ہو جاتے ہیں۔ صرف بیویوں اور سسرال والوں کو ہی فیض ہوتا ہے ان سے۔ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں وہ۔“

”امی آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“ کرم علی پریشان ہو گیا۔ ”آپ کی ضد پر شادی کر رہا ہوں۔ ورنہ میں تو شادی کرتا ہی نہیں اور اب آپ سمجھ رہی ہیں کہ یہ شادی میرا خون سفید کر دے گی۔“

”میں جانتی ہوں میرا کرم علی بڑا فرمانبردار اور سعادت مند اولاد ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ماں کی نافرمانی کرے مگر پھر بھی تیرے بہن بھائیوں کو بڑا خوف ہے کہ تو اب بدل جائے گا۔“

کرم علی نے بے اختیار گہرا سانس لیا تو اس کی ماں کی زبان پر اس کے اپنے لفظ نہیں تھے وہ اس کے بہن بھائیوں کے خدشات اور خیالات کو زبان دے رہی تھی۔

☆☆☆

زری نے کرم علی کے جسم پر موجود برص کے نشانات اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے دیکھے تھے۔ کرم علی اب شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور اس کی کلائیوں سے اوپر نظر آنے والے بازو اور اس کے کھلے گریبان سے نظر آنے والے برص زدہ جسم کو دیکھ کر زری کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

وہ کچھ دیر پہلے ہی آ کر اس کے سامنے اس ٹیبل پر بیٹھا تھا جس پر کھانا لگا ہوا تھا۔ زری کو عجیب سی کراہیت محسوس ہوئی تھی اس سے۔ اس کی شادی ایک برص زدہ آدمی سے ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں یہ اس کے ماں باپ نے اس سے چھپایا تھا یا کرم علی اور اس کے گھر والوں نے اس کے ماں باپ سے۔ زری کا خون کھولنے لگا تھا تو یہ وجہ تھی اس کے خاندان سے رشتہ جوڑنے کی کیونکہ کرم علی کو کوئی اور معزز اور متمول خاندان اپنی بیٹی دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے کھانا کھاتے ہوئے کرم علی کے آستینوں سے نظر آنے والے بازو اور کھلے گریبان سے نظر آنے والے سینے پر برص کے نشان دیکھ کر جلتی رہی۔

اس کی ساس نند اور گھر کے چند دوسرے لوگ اس کے ساتھ بیٹھے کھانا کھاتے اور باتیں کرتے رہے مگر زری کی بھوک غائب ہو گئی تھی، سب کے اصرار کے باوجود اور اپنی پسند کی چیزیں سامنے ہونے کے باوجود اس نے بہت کم کھایا۔

اسے سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے شدید نفرت ہو رہی تھی۔ اسے جمال شدت سے یاد آنے لگا۔ اسے بری طرح رونا بھی آنے لگا تھا۔

کرم علی اس وقت صرف اسے اپنی خوشیوں کا قاتل لگ رہا تھا اور کچھ نہیں، کھانے کے دوران اس نے کرم علی کی شادی کے سلسلے میں اس کے گھر کے افراد کے کچھ مطالبات سنے جو کرم علی نے بخوشی مانے تھے۔

وہ چند لمحوں کے لیے ہکا بکا رہ گئی تھی آخر اس شخص کے پاس کتنا پیسہ تھا کہ وہ لاکھوں روپے کے تحائف یوں اپنے بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کو دے سکتا تھا اور اتنی آسانی سے؟ زری کو فوراً اپنا حق مہر یاد آ گیا تھا۔ زیور تو پہلے ہی اس کے پاس تھے۔ البتہ اسے کرم سے حق مہر کے پانچ لاکھ روپے لینے تھے اور وہ چاہتی تھی کہ وہ جتنی جلدی یہ رقم لے لیتی اتنا بہتر تھا۔ کرم علی کے خدشات ٹھیک ثابت ہوئے تھے۔ اس کی زندگی میں ایک ایسا رشتہ شامل ہو گیا تھا جسے اسے استعمال کرنے کے علاوہ کسی دوسری شے میں دلچسپی نہیں تھی۔

"یہ شادی آپ کی مرضی سے ہوئی ہے؟"

کرم علی اور اس کے درمیان تنہائی میں یہ پہلا جملہ تھا جو کرم علی نے بولا تھا کچھ دیر کے لیے زری ساکت بیٹھی رہ گئی تھی۔ کیا کرم علی کو کوئی شک ہو گیا تھا؟ کیا جمال نے کرم علی کو کچھ؟ وہ یک دم پریشان ہو گئی تھی اور جب زری پریشان ہوتی تو اس کی ساری حسیات کام کرنے لگتی تھیں۔

"جی!" اس نے بے حد مختصر جواب دیا۔

کرم علی مطمئن نہیں ہوا تھا ایک جی اس کے سوال کا جواب ہوتا اگر وہ اپنے معاشرے کو اچھی طرح سے جانتا ہوتا۔

"میرا مطلب ہے آپ کے والدین نے آپ کو میرے ساتھ شادی کے لیے زبردستی مجبور تو نہیں کیا؟" کرم علی نے اب اپنے سوال کو کچھ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں" زری نے ایک بار پھر اسی طرح نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

''میرے بارے میں سب کچھ بتایا تھا آپ کے والدین نے آپ کو؟ میرا مطلب ہے میری عمر، میری شکل وصورت۔''

زری نے اس بار اس کی بات کاٹ دی، اسے اب کرم علی کی اس بے وقت کی تفتیش پر غصہ آ رہا تھا۔

''صرف آپ کے برص کے بارے میں نہیں بتایا تھا انہوں نے مجھے۔''

کرم علی چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا وہ واقعی نادم تھا۔

''آئی ایم سوری میں نہیں جانتا تھا کہ میری امی اور بہن اس بات کو آپ کے گھر والوں سے چھپائیں گے۔ مجھے آج ہی پتہ چلا اور میں بہت شرمندہ ہوں۔''

زری کا دل چاہا کہ وہ کہے کہ اس کے شرمندہ ہونے کا اسے کیا فائدہ تھا۔

''بہت ساری چیزیں اور بھی ہیں جن کے بارے میں مجھے بھی یہیں آ کر پتہ چلا اور میں اس وجہ سے کافی اپ سیٹ ہوں۔ میں شادی کو ایک بہت ہی مقدس بندھن سمجھتا ہوں اور میں اس میں کسی زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ اگر اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل نہیں ہے اور آپ اس شادی سے ناخوش نہیں تو آپ بلا جھجک مجھے بتا دیں۔ میں بہت اچھے طریقے سے اس سارے مسئلے کا کوئی حل نکال لوں گا اور آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

کرم علی کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کی اس تسلی کے جواب میں اس کے منہ سے کیا سننے والا تھا۔ اسے اندازہ ہوتا تو وہ یقیناً زری سے اس وقت یہ گفتگو نہ کر رہا ہوتا۔

''آپ تو خود اس رشتہ پر خوش نہیں ہیں؟'' زری نے اس بار جھنجلا کر اس سے کہا۔ کرم علی کی ہمدردی کا اس پر الٹا اثر ہوا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ بول نہیں سکا۔ وہ زری سے جواباً اس سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

''آپ سے کس نے کہا میں اس رشتہ سے خوش نہیں ہوں، یہ ضرور ہے کہ میں اس طرح اچانک شادی طے پانے پر کچھ اپ سیٹ تھا لیکن میری مرضی سے ہوئی ہے میری شادی اور میری منگنی کو ختم ہوئے بہت عرصہ ہو گیا۔ اس منگنی کی وجہ سے اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں آپ سے شادی پر معترض تھا تو آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔''

کرم علی کا خیال تھا کہ اس نے یا اس کے گھر والوں نے محلے میں ہی کہیں عارفہ کے ساتھ منگنی کے بارے میں سنا ہوگا کیونکہ عارفہ کے گھر والے ابھی بھی اسی محلے میں مقیم تھے اور زری نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہوگا کہ اتنی طویل مدت سے اس کی شادی نہ کرنے کی وجہ اس کی یہ منگنی ہی ہو سکتی تھی۔ لیکن اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ زری اس کے سر پر اب کون سا بم پھوڑنے والی تھی۔

''میں اس منگنی کی بات نہیں کر رہی ہوں۔'' زری نے کہا۔

''پھر؟'' کرم علی الجھا۔

''میں پری زاد کی بات کر رہی ہوں جس کے ساتھ آپ کا چکر تھا۔''

زری نے بے حد اطمینان کے ساتھ ہر لحاظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے حد عامیانہ انداز میں کہا۔ شکیلہ کو شاید اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ اسے شاپنگ کرواتے ہوئے وہ کرم علی کے بارے میں مذاق یا سنجیدگی میں جو بات کہہ رہی تھی۔ وہ زری کسی کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کی طرح اپنے ذہن میں محفوظ کرتی جارہی تھی اور پری زاد کا تذکرہ بھی شکیلہ ہی کا کارنامہ تھا۔

شاک جیسا شاک تھا جو کرم علی کو لگا تھا۔ عارفہ کی بات دوسری تھی لیکن پری زاد کے بارے میں تو وہ جانتا تھا یا اس کے گھر والے۔ باقی کسی شخص کو پری زاد کا علم نہیں تھا تو کیا اس کے گھر والوں نے زری کو پری زاد کے بارے میں بتایا تھا اور وہ بھی اس وقت جب وہ زری کو اچھی طرح جانتے تک نہیں تھے۔

"آپ سے کس نے کہا ہے یہ؟" بہت دیر تک اپنے حواس بحال کرنے کے بعد کرم علی نے اس سے کہا تھا۔

"میں نے سنا ہے کسی سے؟" زری نے بے حد بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔

"پری زاد ایک فلم ایکٹریس ہے جو میری ایک فلم میں کام کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اس بار کرم علی نے بے حد دوٹوک انداز میں اس سے کہا، اسے اس وقت زری کی زبان پر پری زاد کا اس انداز میں تذکرہ واقعی بری طرح چبھا تھا۔

"اب یہ تو آپ کو پتہ ہوگا یا پری زاد کو۔"

وہ کم عمر تھی لیکن اتنی ہی بے لحاظ تھی، یہ جاننے میں کرم علی کو بہت دیر نہیں لگی تھی لیکن وہ پہلی ہی رات اس کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اپنے اندر کہیں اس کے دل میں زری کے لیے ایک نرم گوشہ ضرور موجود تھا۔ وہ اب بھی سمجھتا تھا کہ زری کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے وہ اس کے لیے مناسب بر نہیں تھا۔ لیکن اب ایک رشتے میں بندھ جانے کے بعد یہ ضروری تھا کہ وہ اس زیادتی کی تلافی کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا اور اس رشتے کو نبھاتا۔

زری کے اس تبصرے پر پھر کوئی مزید تبصرہ کرنے کے بجائے کرم علی نے اپنی جیب سے ایک ڈائمنڈ رنگ نکالی اور زری کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اسے پہنائی۔ زری نے بے حد بیزاری کے ساتھ اس رنگ کو دیکھا اور پھر بے ساختہ کرم علی سے کہا۔

"بس یہی دیں گے آپ مجھے؟"

کرم علی کے اندر کہیں خنکی بڑھی تھی۔ "یہ بہت قیمتی ہے۔" وہ یہ کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے کہنا پڑا۔

"لیکن شکیلہ باجی نے تو کہا تھا۔ آپ مجھے ڈائمنڈ کا سیٹ دیں گے منہ دکھائی میں۔" اس کے لہجے میں استحقاق نہیں تھا۔ لالچ تھا اور کرم علی کو ایسے لہجے پہچاننے میں ملکہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا شکیلہ نے واقعی زری سے ایسا کوئی جھوٹ بولا تھا یا زری اس سے جھوٹ بول رہی تھی۔

"میرا سب کچھ آپ ہی کا ہے آپ کو ڈائمنڈ سیٹ چاہیے تو ڈائمنڈ سیٹ لے دوں گا۔"

کرم علی نے اس بات پر بحث نہیں کی تھی کہ اس نے ایسا کوئی وعدہ کیا تھا یا نہیں۔

''کب لے کر دیں گے؟'' زری نے بے تابی سے کہا۔

''کل لے دوں گا۔ آپ میرے ساتھ چلیے گا میں آپ کی مرضی سے آپ کو سیٹ دلا دوں گا۔''

زری کو تسلی ہوئی۔

''اور وہ پھر احق مہر آپ کب دیں گے؟''

کرم علی چند لمحوں کے لیے اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا تھا۔ پھر کچھ کہنے کے بجائے وہ اٹھ کر وارڈ روب کی طرف گیا۔ اپنا بریف کیس نکال کر اس نے اسے کھولا، اس میں سے اپنی چیک بک نکال کر ایک چیک سائن کیا اور دوبارہ زری کے پاس چلا آیا۔

''یہ آپ کا حق مہر ہے۔ اگر آپ کا اکاؤنٹ ہے تو آپ یہاں میں جمع کروا دیں، ورنہ کل صبح میں آپ کا اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں جمع کروا دیتا ہوں۔''

''نہیں، یہ میں خود کروالوں گی۔''

زری نے بے حد تیزی سے اس سے چیک لے لیا وہ ایسے دھوکے نہیں کھا سکتی تھی کہ اپنا اکاؤنٹ کھلوانے اور اس میں رقم جمع کروانے کی ذمہ داری کرم علی کو سونپ دیتی وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی مگر اس نے تیس عورتیں تین کہانیاں اور خواتین کے ڈائجسٹوں میں ایسے بہت سارے قصے پڑھے تھے جن میں شوہر بیوی کا حق مہر اسی طرح جعل سازی سے غصب کر لیا کرتے تھے۔ کچھ دیر کے لیے تو اس کا یہ بھی دل چاہا تھا کہ کرم علی سے چیک کے بجائے کیش کا مطالبہ کرتی۔ لیکن اسے خیال آیا کہ پانچ لاکھ روپے اتنی بڑی رقم ہے جو اس وقت کرم علی کے پاس نہیں ہوگی اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اگر وہ اس وقت کرم علی سے کیش کا مطالبہ کرتی تو کرم علی کے بریف کیس میں غیر ملکی کرنسی کی شکل میں اس رقم سے بہت زیادہ رقم موجود تھی جو زری کو چاہیے تھی اور کرم علی اس کے اس مطالبے کو بھی اسی طرح پورا کرتا۔

''آپ مجھے ماہانہ کتنا جیب خرچ دیں گے؟''

اس بار کرم علی کو ہنسی آ گئی تھی۔ رونے سے ہنسنا یقیناً بہتر تھا۔

''آپ کو کتنا چاہیے؟'' وہ رشتوں کے معاملے میں خوش قسمت نہیں تھا اسے اس بات پر کبھی بھی شبہ نہیں رہا تھا۔ پھر وہ زری سے کیا توقعات لگاتا۔

زری نے کچھ دیر سوچنے میں لگائی اسے اندازہ نہیں تھا کہ کرم علی اس سے پوچھے گا۔

''آ......دس ہزار ٹھیک ہیں؟''

زری نے ڈرتے ڈرتے کہا اس کی نظر میں دس ہزار بہت بڑی رقم تھی، پتہ نہیں کرم علی کیا کہتا۔

''میں آپ کو ہر ماہ پچاس ہزار روپے دوں گا۔'' زری کو شدید صدمہ ہوا اس نے کرم علی کی مالی حیثیت کا بہت غلط اندازہ لگایا تھا۔ اس نے پچاس ہزار کیوں نہیں مانگے؟ وہ بری طرح پچھتائی ورنہ کرم علی یقیناً اسے ایک لاکھ دیتا۔

وہ پچھتا رہی تھی لیکن خوشی سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول بھی رہے تھے۔ پچاس ہزار روپے ماہانہ یعنی سال میں چھ لاکھ اس کا حلق ایک دم خشک ہو گیا۔ یعنی حق مہر سے بھی زیادہ رقم وہ کرم علی کے ساتھ ایک سال گزار کر اکٹھی کر سکتی تھی اور اگر دو سال رہتی تو بارہ لاکھ۔ لیکن ایک منٹ دوسرے سال میں مجھے کرم علی سے جیب خرچ بڑھانے کا کہنا چاہیے دوسرے سال کم از کم ایک لاکھ یعنی سال کے پورے بارہ لاکھ کو اور اٹھارہ میں اگر میں یہ حق مہر کے پانچ لاکھ جمع کر دوں تو تیس لاکھ اور بارہ تیرہ لاکھ کے تو یہ زیورات ہوں گے ہی۔ تقریباً چھتیس لاکھ کرم کے ساتھ صرف دو سال میں پچیس لاکھ روپیہ لیکن میں نے ابھی اس میں ڈائمنڈ سیٹ کو شامل نہیں کیا۔ ڈائمنڈ سیٹ بھلا کتنے کا ہوگا زری حساب کتاب کرتے ہوئے پہلی دفعہ الجھی مجھے ڈائمنڈ سیٹ کے بجائے اس کے بدلے میں بھی کرم سے کیش ہی لے لینا چاہیے۔ زری نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ کرم علی اس وقت اس کا ذہن کھلی کتاب کی طرح پڑھ رہا ہے۔

''آپ نے جو صبح مجھے ڈائمنڈ سیٹ لے کر دینا ہے اس کے بجائے آپ مجھے پیسے ہی دے دیں۔''

زری نے بالآخر سر اٹھا کر کہا۔ اس کے لہجے میں پہلی بار کرم علی کے لیے پیار بھری نرمی جھلکی تھی۔ پچیس لاکھ روپیہ دینے والا آدمی اب اتنی محبت کا تو حقدار تھا ہی۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ خود ہی بعد میں دو چار دکانیں پھر کر اپنی مرضی سے خرید لوں گی۔''

زری نے کرم علی کو پہلی مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کہا۔ یہ وہ مسکراہٹ تھی جس کا جادو وہ تب چلایا کرتی تھی جب اس محلے کی دکان سے کوئی چیز پیسوں کے بغیر لینا ہوتی تھی۔ کرم علی محلے کی دکان پر بیٹھا وہ مرد نہیں تھا جو زری کی اس مسکراہٹ کے لیے کچھ بھی دے سکتا تھا۔ وہ اس کا شوہر تھا جو اپنی بیوی کو اس کے بغیر بھی کچھ بھی دے سکتا تھا۔ لیکن زری اس چیز کو تب سمجھتی جب اس نے اپنی زندگی میں اپنے آس پاس ایسے مرد دیکھے ہوتے۔ اس نے یہی سیکھا تھا اور جو کچھ اس نے سیکھا تھا وہ اسے استعمال کر رہی تھی۔ لیکن وہ زندگی کے یہ فارمولے غلط آدمی پر استعمال کر رہی تھی۔

اس کے سامنے بیٹھا شخص زندگی کے بازار میں رشتوں کی ہر ٹریڈ میں دلچسپی رکھتا تھا نہ وہ اجناس کا یہ کاروبار کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے میں آپ کو اس کے لیے بھی رقم دے دوں گا۔ یا وہ بھی ابھی چاہیے آپ کو؟'' کرم علی کے لہجے میں اگر غیر محسوس طریقے سے کوئی طنز آیا تھا بھی تو زری نے اسے محسوس نہیں کیا۔

''نہیں، آپ بے شک کل دے دیں۔''

زری کے لہجے میں مٹھاس بڑھ گئی تھی اور ایک عجیب طرح کی فرمانبرداری بھی آ گئی تھی اب پہلے کی طرح اس کی نظر کرم علی کے برص کے داغوں پر بھی نہیں جا رہی تھی نہ ہی کرم علی سے اس طرح کی شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی جو وہ کچھ دیر پہلے تک محسوس کر رہی تھی۔ اور سب سے بڑی بات کہ اسے اس وقت جمال بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔

''کچھ اور؟'' کرم علی نے اس سے پوچھا۔

''نہیں اور کچھ نہیں... کچھ اور چاہیے ہوگا تو میں بتادوں گی آپ کو؟'' زری نے بے حد فرمانبرداری سے کہا۔

''ضرور۔'' کرم علی زری سے کہتا ہوا بیڈ سے اٹھ گیا۔

''آپ تھک گئی ہوں گی چینج کر کے سو جائیں۔''

زری نے بے حد حیرانی سے ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کرم علی کو دیکھا... وہ اس کی بات نہیں سمجھی تھی۔

کرم علی ٹیرس پر پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اندر سے اے سی کی مصنوعی خنکی سے باہر موسم گرما کی رات کی حدت میں اسے عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا جسے وقتاً فوقتاً کسی گاڑی کی آواز توڑتی یا پھر آسمان سے گزرتا کوئی جہاز مگر اندر چھائے ہوئے سکوت کو کوئی چیز نہیں توڑ رہی تھی... وہاں کوئی آواز کوئی سرگوشی کوئی گونج نہیں تھی۔ بس ایک پاتال تھا اور اس کی نہ ختم ہونے والی وسعت تھی۔

کچھ دیر کے بعد اس کے عقب میں موجود شیشے کے سلائیڈنگ ڈور سے آنے والی روشنی بھی ختم ہو گئی تھی۔ زری شاید لائٹ بجھا کر سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔

کرم علی اب مکمل تاریکی میں تھا اور اس تاریکی میں جو چہرہ اس کے ذہن کی اسکرین پر ایک جھمکے کے ساتھ نمودار ہوا تھا اس نے اسے حیران کر دیا تھا۔ کرم علی بے اختیار کراہا۔ یہ کوئی وقت تھا یاد آنے کا؟... یاد بڑی ظالم ہوتی ہے۔ ہمیشہ غلط وقت پر غلط جگہ آتی ہے۔

اس نے اس آخری ملاقات میں زینی کو پرپوز کرنے کے لیے اس رات اُسے اپنے گھر بلایا تھا جس رات زینی نے اسے...

کرم علی نے اس کے لیے خریدی ہوئی انگوٹھی اس کے جانے کے بعد اس ٹیبل سے اٹھائی تھی جہاں وہ اسے لے کر بیٹھنے والا تھا اور زینی نے اگر دھیان دیا ہوتا تو وہ اس ٹیبل پر پڑی اس نازک سی ڈبیا اور اس کے گرد موجود فلورل ارینجمنٹس کو دیکھ چکی ہوتی اور شاید اسے کوئی تجسس ہوتا یا ہو سکتا ہے وہ کوئی سوال پوچھتی۔

ایسا سوال جس کا جواب کچھ دیر کے لیے زینی کے ہونٹوں پر مہر لگا دیتا۔ وہ کچھ نہ کہتی جس نے کرم علی کے ہونٹوں کو سی دیا تھا۔ شاید کوئی بھرم رہ جاتا... کوئی بھرم

لیکن جب کوئی بھرم نہیں رہا تھا جب وہ زینی کی اصلیت اچھی طرح جان چکا تھا۔ جب اس کو زینی سے گھن بھی آئی تھی۔ تب بھی اب تک وہ کیوں اس کے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔ سلگتی ہوئی چنگاری کو کون سی شے ہوا دے رہی تھی۔

عارفہ زینی کی طرح خوب صورت نہیں تھی اس سے کرم علی کا آواز کا رشتہ تھا جو کئی سال چلا تھا۔ زینی سے تعلق کچھ اور طرح کا تھا۔ اتنی لمبی مدت کا نہ سہی لیکن تعلق کی گہرائی عارفہ جیسے تعلق ہی کی طرح تھی۔ اور اب جب ایک تیسری عورت اس کی زندگی میں آ گئی تھی تو اسے عارفہ کی بددعا یاد آئی تھی لیکن زینی خود یاد آئی تھی۔ شاید کہیں نہ کہیں اسے زینی اور زری میں کوئی مماثلت نظر آئی تھی۔ کیا مماثلت تھی؟ اس نے اپنے ذہن سے اس مماثلت کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ اس خیال کو نکالنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں عورتیں اس کی زندگی میں پیسے کے لیے آئی تھیں۔ پہلی ایکٹریس تھی رسوائے زمانہ تھی۔ ان دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن اس کا دل عجیب انداز میں اس کی طرف کھنچتا تھا۔ دوسری اس کی بیوی تھی ایک مقدس رشتے میں

پوری دنیا کے سامنے اس کے ساتھ بندھا تھا وہ ... اور وہ جدوجہد کرنے میں مصروف تھا کہ کسی طرح وہ اپنے دل میں زری کو اس کی ساری خامیوں سمیت جگہ دے سکے۔

اور زینی... اسے شبہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ہر عیب ہر برائی کے ساتھ پہلے ہی اس کے دل کے اندر تھی۔

☆☆☆

اگر شادی کوئی جوا تھا تو پاکستان چھوڑتے ہوئے کرم علی یہ جان چکا تھا کہ وہ یہ جوا ہار چکا تھا۔ زری بالکل ویسی ہی لڑکی تھی جیسی لڑکی کو بیوی بنانے کے تصور سے ساری زندگی خوف آتا رہا تھا وہ کتنی معصوم، سیدھی سادی اور فرمانبردار تھی۔ وہ کرم علی کے گھر والوں کو چند دن میں ہی پتہ چل گیا تھا۔ ایک استحصالی دوسرے استحصالی کو بہت جلدی اور بہت آسانی سے پہچانتا ہے اور زری نے بھی یہ جان لیا تھا کہ کرم علی کے گھر والے اس کا استحصال کر رہے ہیں اور پہلا سبق جو اس نے ان سے سیکھا تھا وہ یہی تھا کہ اسے بھی یہی کرنا ہے۔

کرم علی کے اندر کتنا لحاظ کتنی نرمی تھی وہ یہ بھی جان چکی تھی اور اسے یہ خدشہ بھی نہیں تھا کہ کرم علی اسے چھوڑ دیتا یا اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرتا۔ جس خصوصیت کو دوسری کوئی عورت کرم علی کی خوبی سمجھتی زری نے اسے کرم علی کی کمزوری سمجھا تھا۔

اسے یقین تھا کہ وہ اس کا خیال اس لیے نہیں رکھ رہا کہ وہ طبیعتاً ایک خیال رکھنے والا اور نرم مزاج آدمی ہے۔ بلکہ یہ اس کا حسن اور کم عمری تھی جس نے کرم علی کو اندھا کر دیا تھا۔ جو نتیجے اس کی عمر، مزاج اور ذہنیت کی کوئی بھی لڑکی نکالتی اس نے بھی وہی نتیجے اخذ کیے تھے۔

شادی کے دوسرے تیسرے دن کرم علی کے گھر والوں نے کرم علی سے زری کی شکایتیں شروع کر دی تھیں اور کرم علی بعض باتوں میں واقعی دل ہی دل میں انہیں حق بجانب بھی سمجھتا تھا۔ لیکن وہ دوسری طرف زری کو اس طرح کی ڈانٹ ڈپٹ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا جیسی ڈانٹ ڈپٹ کرم علی کے گھر والے اس سے کروانا چاہتے تھے۔

اس کا خیال تھا کہ زری کینیڈا اس کے پاس آ جائے گی تو ایک ہی گھر میں سب کے ساتھ ہونے کی وجہ سے جو اختلافات جنم لے رہے تھے وہ نہیں ہوں گے۔ وہ وہاں پر زری کو سمجھانے کی کوشش بھی کرتا۔ لیکن سات دن کے مختصر قیام میں وہ زری کو نصیحتوں کے انبار نہیں تھمانا چاہتا تھا۔

ایک ہفتہ کے بعد صرف کرم علی ہی نہیں اس کے ساتھ ہی تقریباً سارے گھر والے واپس آ گئے تھے۔ زری واپس اپنے ماں باپ کے پاس تب تک رہنا چاہتی تھی۔ جب تک کرم علی اس کے پیپرز بنوا کر اسے باہر نہ بلوا لیتا۔

اور یہ واحد بات تھی جس پر کرم علی نے اعتراض کیا تھا۔ ایک ہفتے کے قیام میں ایک دو بار زری کے ساتھ اس کے گھر جا کر اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا سوشل سرکل کس طرح کا ہے اور وہ گھر پر رہنا پسند کرتی ہے۔ دونوں بار اس کے ساتھ گھر جانے پر وہ زری کے ماں باپ کے پاس بیٹھا رہتا اور زری وہاں پہنچتے ہی محلے میں اپنی سہیلیوں سے ملنے کے لیے نکل جاتی۔

اس کے بعد اس کو واپس لانے کے لیے باقاعدہ اسے محلے میں ڈھونڈا جاتا۔ کرم علی اگرچہ پابندیاں لگانے والا مرد نہیں تھا۔ لیکن اسے زری کا اس طرح پھرنا بے حد معیوب لگا تھا۔

اور اسے یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ یہ زری کی عادت تھی۔ وہ وہاں رہتے ہوئے شاید سارا دن یہی کرتی تھی۔

زری کے ناخوش ہونے کے باوجود کرم علی جانے سے پہلے شکیلہ کو اپنے گھر تب تک رہنے کے لیے کہہ گیا تھا جب تک زری کا ویزا نہ آجاتا۔ زری پہلے اس بات پر معترض ہوئی تھی کہ وہ اسے میکے کے بجائے سسرال میں رہنے کو کہہ رہا تھا اور پھر اس پر بری طرح جھنجھلائی کہ وہ اس کے سر پر شکیلہ کو مسلط کر کے جا رہا تھا۔

اس کا اصرار تھا کہ وہ اپنی بہنوں کو اپنے گھر بلا سکتی ہے یا ماں باپ میں سے کسی کو اور شکیلہ باجی کو ان کے گھر منتقل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور کرم علی نے اتنی ہی نرمی سے اس سے کہا تھا کہ وہ بے شک اپنی کسی بہن یا ماں باپ میں سے کسی کو بھی اپنے پاس رکھے لیکن شکیلہ اور اس کی فیملی کا بھی اس گھر میں ہونا ضروری تھا۔

یہ پہلی کلہاڑی تھی جو کرم علی نے اپنے پاؤں پر ماری تھی۔ زری بغض دل میں رکھنے کی عادی تھی اور اس نے کرم علی کو اس چیز کے لیے معاف نہیں کیا۔

تین ماہ کے دوران کرم علی دو یا تین بار پاکستان آیا تھا جب تک زری کا ویزا نہیں لگ گیا اور ہر بار وہ زری سے پہلے سے زیادہ دل برداشتہ اور مایوس ہو کر واپس گیا زری نے اگرچہ شکیلہ کے آجانے کے بعد اپنے گھر والوں میں سے کسی کو مستقل طور پر اپنے ساتھ رہنے کے لیے نہیں بلایا تھا لیکن شکیلہ اور اس کے درمیان ایک محاذ کھل گیا تھا۔ جتنا بغض اور کینہ زری شکیلہ کے لیے رکھتی تھی اتنا ہی وہ زری کے لیے، اب وہ اس وقت کو پچھتاتی تھی جب اس نے اس معصوم، کم گو اور سیدھی سادی لڑکی کو اپنے بھائی کے لیے پسند کیا تھا۔

دونوں کے پاس ایک دوسرے کے خلاف شکایتوں کے انبار ہوتے جو دونوں ہر دوسرے دن فون پر کرم علی کے سامنے رکھ دیتی۔ کرم علی اس صورت حال سے واقعی بری طرح پریشان ہوا تھا۔ شکیلہ نے ایک مہینے کے بعد ہی کرم علی سے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ زری کی چوکیداری کے لیے وہاں نہیں بیٹھ سکتی۔

اور اس کے ساتھ ہی اس نے کرم علی کو پہلی بار زری کو طلاق دینے کا مشورہ بھی دے دیا تھا۔ جس پر کرم علی بے حد مشتعل ہوا تھا۔

شکیلہ پہلی بار اس کے غصے سے خائف ہوئی تھی کیونکہ اس نے زندگی میں پہلی بار ہی کرم علی کو غصے میں دیکھا تھا۔ وہ نہ صرف اگلے دو ماہ بھی وہاں رہی بلکہ اس نے دوبارہ کرم علی کو زری کے بارے میں ایسا کوئی مشورہ نہیں دیا۔

تین ماہ کے بعد کرم علی زری کو اپنے پاس لے آیا تھا۔ اور زری کتنی بڑی مصیبت تھی۔ اس کا اندازہ اسے بھی ہو گیا تھا۔ وہ بے لحاظ تو تھی لیکن بغیر سوچے سمجھے بولنے کی عادی بھی تھی۔ لیکن بات اگر صرف زبان تک رہتی تو کرم علی شاید سنی ان سنی کر دیتا۔ زری بے حد عجیب نیچر کی تھی کم از کم کرم علی کو تو وہ عجیب ہی لگتی تھی۔ اسے اگر کرم علی سے کوئی مطالبہ منوانا ہوتا تو اس کی زبان سے کرم علی کے لیے شیرینی ٹپکتی رہتی اور جب وہ مطالبہ پورا ہو جاتا تو وہ منٹوں میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی تھی۔

وہ اگرچہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن اس نے جس طرح سے مغربی کلچر کو اختیار کیا تھا۔ اس نے کرم علی کو بھی حیران کر دیا تھا۔ اور حیرانی

سے زیادہ یہ شک کہ تھا وہ اتنا عرصہ وہاں گزارنے کے باوجود مغربی طور طریقے نہیں اپنا سکا تھا اور زری کا یہ خیال تھا کہ وہ اگر اسے منع نہ کر رہا ہوتا تو ان مغربی ملبوسات کو پہننے اور پہن کر پھرنے سے نہ چوکتی، جنہیں پہنتے ہوئے کوئی دوسری لڑکی دوبارہ ضرور سوچتی۔

وہاں آنے کے کچھ عرصہ کے بعد زری نے کرم علی سے کچھ رقم قرض مانگی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ بے حد میٹھے انداز میں بات کر رہی تھی۔

''ابو گھر بدلنا چاہتے ہیں۔ کچھ رقم کم پڑ رہی ہے۔ مجھ سے بات کی ہے انہوں نے وہ کہہ رہے تھے بہت جلد رقم واپس کر دوں گا۔''

زری کو یقین تھا کہ کرم علی کبھی رقم واپس نہیں لے گا۔ اسی لیے وہ اتنے آرام سے کہہ رہی تھی۔

''آپ ان سے کہیں گھر دیکھیں جتنی رقم انہیں چاہیے میں بھجوا دوں گا۔''

کرم علی نے گھر سے نکلتے ہوئے کہا زری بے اختیار خوش ہوتے ہوئے دروازے تک آئی۔

''نہیں، میں کوئی احسان نہیں لینا چاہتی بس کچھ دیر کے لیے انہیں رقم قرض چاہیے۔'' زری نے بظاہر بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''احسان والی کوئی بات نہیں وہ آپ کے parents ہیں اور میں انہیں اپنے parents کے برابر درجہ دیتا ہوں۔'' کرم علی نے چلتے چلتے رک کر کہا۔

''چاہے وہ ذرا مہنگا گھر لینا چاہیں تب بھی۔'' زری نے بے ساختہ کہا۔

''جیسا گھر لینا چاہتے ہیں لے لیں۔ جب گھر دیکھ لیتے ہیں تو مجھے بتا دیجیے گا۔ میں انہیں رقم ٹرانسفر کروا دوں گا۔''

کرم علی کو بات کرتے کرتے جیسے کچھ خیال آیا۔

''اور آپ اگر ہر ماہ انہیں کچھ رقم بھجوانا چاہیں تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔''

زری ایک لمحہ کے لیے بالکل چپ ہو کر رہ گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ کرم علی اسے اس طرح کی کوئی آفر دے گا۔

''آپ...'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔ کرم علی منتظر رہا کہ وہ اپنی بات پوری کرے گی لیکن زری نے بات پوری کرنے کے بجائے بڑی محبت سے کرم علی کی ٹائی کی ناٹ کو سیدھا کرتے ہوئے اس کے کوٹ پر ہاتھ یوں پھیرا جیسے وہ اسے جھاڑ رہی ہو۔ کرم علی جانتا تھا وہ ایسا ہی کچھ کرے گی ہر بار کسی فیور کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح اس سے محبت کا اظہار کرتی تھی۔ کرم علی کو وہ سب مصنوعی لگتا پھر بھی اچھا لگتا۔ اس وقت بھی اچھا لگا تھا۔

''آپ بہت اچھے ہیں۔'' زری نے اس سے کہا۔

کرم علی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا۔ وہ صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گھر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

انڈسٹری کے سارے لوگ پری زاد کے رویے میں ایک دم سے آنے والی تبدیلی پر حیران و پریشان تھے وہ سب پری زاد کا ایک نیا چہرہ دیکھ رہے تھے ایک ایسا چہرہ جس سے پہلے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ انور حبیب اور سفیر خان جیسے لوگ بھی اس کے بارے میں رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

پاشا تو خیر پہلے ہی اس سے بہت خوش تھا اور اسے یقین تھا کہ اس دن اس کی دھمکیاں کارگر ثابت ہوئی تھیں۔ وہ گڑ سے مر گئی تھی۔ اس کو زہر دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا وہ اس کے لیے زہر تیار کرنے میں جتی ہوئی تھی کیونکہ وہ گڑ سے مرنے والا نہیں تھا۔

زیبی نے زندگی میں صرف ایک کام ہمیشہ عقلمندی سے کیا تھا۔

اس شاخ کو کاٹنے کا کام۔ جس پر وہ خود بیٹھی ہوتی تھی اور اب بھی وہ یہی کام کرنے والی تھی۔ وہ اس وقت انڈسٹری کی دو بڑی فلموں کی ہیروئن تھی۔ ایک کرم علی کی اور دوسری تبریز پاشا کی۔

پاشا کی فلم بجٹ کے لحاظ سے انڈسٹری کی آج تک بننے والی سب سے بڑی اور مہنگی فلم تھی۔ پاشا اپنی اس فلم کی کامیابی سے فلم انڈسٹری کی تاریخ کو نیا جنم دینا چاہتا تھا اور اسے یقین تھا کہ فلم کامیاب ہوگی۔ پاشا اپنی اس فلم کو صرف پاکستان میں ہی نہیں یو کے میں بھی ریلیز کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا اور پاکستان میں وہ اس فلم کی ریلیز کے لیے پنجاب سرکٹ کے اپنے ذاتی تین سینماز کی بھی ساتھ ساتھ رینوویشن کروا رہا تھا۔ انڈسٹری کے سارے پنڈت پہلے سے ہی فلم کی کامیابی کی پیش گوئیاں کر رہے تھے۔ یہ سپر ہٹ ہوگی۔ اس کے بارے میں کسی کو شبہ نہیں تھا۔ لیکن یہ بزنس کتنا کرے گی۔ اس کا اندازہ بھی کسی کو نہیں ہو رہا تھا اور کیا یہ انٹرنیشنل ریلیز میں کامیابی حاصل کر پائے گی؟

یہ سب سے بڑا سوال تھا۔ فلم پر بجٹ سے زیادہ پیسہ لگ گیا تھا اور اس کے فلاپ ہونے کی صورت میں پاشا پروڈکشنز کو ایک بڑا جھٹکا لگتا۔ پاشا پروڈکشنز جھٹکا سہہ تو جاتا لیکن فوری طور پر چند سالوں کے لیے اگر وہ اس طرح کی کوئی فلم پروڈیوس نہ کر پاتا۔ اور اگر یہ بہت بڑی فلاپ ہوتی تو پھر پاشا پروڈکشنز کے ستارے صحیح معنوں میں گردش میں آ جاتے اور اسی خطرے کو کاؤنٹر کرنے کے لیے مارکیٹنگ کی جو اسٹریٹجز بنائی تھیں ان میں میوزک کو بھی مارکیٹ میں لانچ کرنے کا پلان کیا گیا تھا۔

دوسری طرف کرم علی کی فلم تھی جس کے بارے میں انڈسٹری کو بہت زیادہ توقعات نہیں تھیں ایسے کئی پروڈیوسرز کم فنانسرز وقتاً فوقتاً انڈسٹری میں آ کر کچھ وقت اور پیسہ گنوا کر غائب ہوتے رہتے تھے۔ اگر کرم علی بھی ہو جاتا تو کوئی خاص بات نہ ہوتی۔ واحد دلچسپی جو کسی کو اس فلم میں ہو سکتی تھی وہ پری زاد کی موجودگی تھی۔ اور پچھلے کچھ عرصے میں پری زاد کی وجہ سے کچھ ایسی فلمیں بھی ہٹ ہوئی تھیں جن کے بارے میں انڈسٹری کے پنڈت خدشات کا اظہار کر رہے تھے۔ پری زاد کی موجودگی مکمل طور پر کینیڈا میں شوٹنگ اور بڑا بجٹ مکمل طور پر ان تین چیزوں کے علاوہ دوسرا کوئی پلس پوائنٹ اس فلم میں نہیں تھا کیونکہ اس فلم کے ڈائریکٹر کی آخری دو فلمیں بری طرح فلاپ ہوئی تھیں اور اس فلم میں پری زاد کے ساتھ ہیرو آنے والے لڑکے کی یہ پہلی فلم تھی۔

انڈسٹری میں اگر ایک طرف ان دو فلموں کی بات ہو رہی تھی تو دوسری طرف سفیر اور پری زاد کے بارے میں دھڑا دھڑ خبریں اور افواہیں بھی گردش کر رہی تھیں۔ وہ دونوں اب تقریباً ہر فلمی اور شوبز کی تقریب میں اکٹھے جاتے اور اکٹھے آتے تھے۔ چند ماہ پہلے تک کھلے عام پری زاد کو گالیاں دینے والا سفیر خان آج اس کے گن گاتے نہیں تھکتا تھا۔ ہر دوسرے دن اخبار میں ان کے بارے میں کوئی نہ کوئی بات شائع ہوتی۔ سفیر آن ریکارڈ ہمیشہ ایسی باتوں کی تردید کرتا اور آف دا ریکارڈ پریس والوں کو دھڑلے سے بتاتا کہ وہ پری زاد کے عشق میں بری طرح مبتلا ہے اور صرف اس سے محبت نہیں کرتا۔ اس سے شادی بھی کرنے کا خواہش مند ہے اور صرف وہ ہی نہیں پری زاد بھی اس کی محبت میں گرفتار ہے۔

دوسری طرف پری زاد نے ہمیشہ آن دا ریکارڈ سفیر کے حوالے سے پوچھے جانے والے سوالوں کے معنی خیز جواب دیتی۔ اکثر جواب ایسے ہوتے جو سفیر کی آف دا ریکارڈ باتوں کی مکمل طور پر تصدیق کرتے دکھائی دیتے اور کئی بار وہ اشاروں کنایوں میں یہ اقرار بھی کرتی کہ وہ واقعی سفیر سے شادی کی خواہش مند ہے۔ لیکن وہ کسی کی دوسری بیوی بننے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اگر سفیر پہلے سے شادی شدہ نہ ہوتا تو یقیناً اب تک وہ اس سے شادی کر چکی ہوتی۔

آف دا ریکارڈ ہمیشہ پریس والوں سے ہنس کر ان سب باتوں کی تردید کرتی۔

''ہم دونوں ایک دوسرے سے فلرٹ کر رہے ہیں جیسے انڈسٹری میں دوسرے کئی ہیرو ہیروئن آپس میں کر رہے ہیں اور یہ کمرشلی پاپولر بننے کے لیے ہے۔ ورنہ نہ میں اس کے بارے میں سیریس ہوں نہ وہ۔''

وہ آرام سے ساری باتوں کا نچوڑ جیسے ان لوگوں کے سامنے رکھ دیتی۔

''ہم ساتھ ساتھ اس لیے نظر آتے ہیں کیونکہ عوام ہمیں ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔'' وہ لاپرواہی سے اگلے کسی سوال کے جواب میں کہتی۔

سفیر پری زاد کی آن دا ریکارڈ باتوں پر جیسے قربان ہو جاتا تھا۔ انڈسٹری کی سب سے خوبصورت اور پاپولر عورت اسکے لیے پاگل ہو رہی تھی۔ اس کا ساتھ چاہتی تھی۔ اس کی انا کو بڑھانے کے لیے اس سے بڑی کیا بات ہو سکتی تھی۔ پری زاد کے لیے اس کی محبت میں کچھ اور اضافہ ہوتا گیا۔ پری زاد کی اس جرأت سے وہ اس کی ازدواجی زندگی میں کتنا اور کس طرح کا زہر گھول رہی تھی، اس کا اندازہ پری زاد کو تھا یا پھر سفیر کی بیوی کو۔

سفیر نے لو میرج کی تھی اور اس کی سسرال کا دور دور تک شوبز سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے اس رشتہ کو قبول تو کر لیا تھا مگر سفیر کو اپنے خاندان کے داماد کے طور پر وہ عزت دینے میں انہیں ہمیشہ دقت ہوتی وہ سفیر کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتی تھی لیکن اب سات سال کی شادی میں پہلی بار اس نے سفیر کے یہ مسئلے پیدا کرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ اخبار میں شائع ہونے والا پری زاد کا ہر بیان پڑھتی، ہر اس تقریب کی کوریج پڑھتی جہاں پر وہ اور سفیر اکٹھے ہوتے اور ایسی ہر تقریب کے اخباروں اور میگزینز میں شائع ہونے والے فوٹوز میں کہیں پری زاد نے سفیر کا ہاتھ پکڑا ہوتا، کہیں وہ دونوں بازوؤں میں بازو ڈالے ہوتے، کہیں وہ ساتھ ساتھ بیٹھے ہوتے پری زاد اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی ہوتی یا اس کی طرف جھکی ہوئی۔

ایسا کوئی منظر دیکھ کر سفیر کی بیوی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ پری زاد کو گولی مار دے یا پھر سفیر کا ہی گلا گھونٹ دے۔

زینی سفیر کی زندگی کا اسکرپٹ لکھ رہی تھی اور جس کے لیے لکھ رہی تھی، اس تک بے حد ہوشیاری سے پہنچا بھی رہی تھی۔ سفیر بے وقوف تھا۔ یہ اس سے چند ملاقاتوں کے بعد ہی زینی کو اندازہ ہو گیا تھا۔ اسے اس کے لیے کیسے گڑھا کھودنا تھا۔ یہ وہ جان گئی تھی۔ وہ گڑھے آسانی سے مارا جا سکتا تھا۔ وہ اُسے گڑھی دے رہی تھی۔

''انور صاحب! آپ فلم کیوں نہیں بناتے؟'' وہ اس رات ایک فلمی پارٹی کے ختم ہونے پر انور حبیب کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

''فلم نہیں بنا رہا تو اور کیا بنا رہا ہوں میں؟'' انور بڑے بے ڈھنگے انداز میں ہنسا۔ یوں جیسے پری زاد نے اس سے مذاق کیا ہو۔ وہ اس وقت شراب کے نشے میں دھت تھا۔

''میں فلم پروڈیوس کرنے کی بات کر رہی ہوں۔'' زینی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''فلم پروڈیوسر بننے کا کیا فائدہ ہوگا؟ اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ میں فلم پر لگاؤں۔''

''سرمایہ آ جاتا ہے نیت ہونی چاہیے۔ دو چار فلمز پروڈیوس کر لی ہوتیں تو آج آپ تبریز پاشا کی ٹکر کے آدمی ہوتے۔''

انور حبیب نے بے اختیار دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''پاشا کی ٹکر کا آدمی نہیں ہوں میں۔ میں بڑا چھوٹا آدمی ہوں۔ پاشا کے پیچھے اس کا خاندان ہے۔ جس نے اس انڈسٹری پر کئی سال راج کیا ہے۔ میرے پیچھے تو میرا خاندان تک نہیں ہے۔ ایسے الٹے سیدھے خیال مت ڈالو میرے دماغ میں پری زاد!''

''کبھی نہ کبھی تبریز پاشا کے خاندان میں بھی کسی نہ کسی نے پہلا قدم اٹھایا ہوگا اور آج آپ ان کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگا رہے ہیں۔ آج آپ ایسا کوئی قدم اٹھا لیں گے تو کل کوئی اور آپ کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگا رہا ہوگا۔''

زینی نے سگریٹ کا پیکٹ اپنے پرس سے نکال لیا۔ انور حبیب کے سگریٹ کا پیکٹ وہ ختم کر چکی تھی۔ انور نے اس بار اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر عجیب سی نظروں کے ساتھ زینی کو دیکھتا رہا۔

''تمہارا دماغ خراب نہ ہو گیا پری زاد تو اس انڈسٹری میں اگلے کئی سال تمہارا راج ہوگا۔ تاریخ تم بھی لکھ جاؤ گی اس فلم انڈسٹری میں۔''

زینی نے اس کے ستائشی جملوں کے جواب میں اسے ایک مسکراہٹ سے نوازا پھر بڑے انداز سے کہا۔

''تاریخ جب ایک اکیلا بیٹھ کر لکھتا ہے تو اور ہوتی ہے۔ دو بیٹھ کر لکھتے ہیں تو تاریخ کا مفہوم بدل دیتے ہیں۔ میں فلم پروڈیوس کرنا چاہتی ہوں انور صاحب بلکہ چاہتی نہیں کر رہی ہوں۔''

انور حبیب اس بار اس کی بات پر بری طرح چونکا۔

''تم کیوں فلم پروڈیوس کر رہی ہو۔ یہ تو وہ ہیروئنز کرتی ہیں جن کو انڈسٹری میں کام ملنا بند ہو جاتا ہے۔ تمہارے پاس تو بہت کام ہے پری زاد۔''

''ہاں لیکن میں کچھ اپنی مرضی کا کام کرنا چاہتی ہوں۔ سوچا تھا آپ کے ساتھ مل کر فلم پروڈیوس کروں گی لیکن لگتا ہے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پراچہ اور اصغر صاحب کو ہے۔ ان میں سے کسی کے ساتھ ہی یہ فلم پروڈیوس کرنا پڑے گی مجھے۔''

زینی نے انڈسٹری کے دو دوسرے مصروف ترین ڈائریکٹرز کا نام بے حد لاپرواہی سے لیا۔ انور حبیب بے اختیار بے چین ہو گیا۔

"پراچہ اور اصغر جیسے ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کر کے اپنا روپیہ بھی ضائع کرو گی اور وقت بھی۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"تو پھر کیا کروں، آپ کو تو دلچسپی نہیں ہے، ورنہ تو آپ کے ساتھ ہی فلم کرنا چاہتی تھی ایک بات اور بتاؤں آپ کو۔ ہوسکتا ہے، اس میں کچھ رقم سفیر بھی لگا دے۔ اس سے بھی بات ہوئی ہے میری۔"

انور حبیب پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوا تھا "سفیر کو یہ شوق کہاں سے لگ گیا؟" اس نے بے اختیار کہا۔

"مجھ سے۔" پری زاد نے عجیب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مجھے سوچنے اور مشورہ کرنے کا موقع دو پری زاد! اتنی جلدی پراچہ اور اصغر سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔" انور حبیب نے کہا۔

"مجھے جلدی ہے انور صاحب! آپ کو تو پتہ ہے میں انتظار نہیں کر سکتی لیکن آپ کو وقت دے رہی ہوں، سوچ لیں۔ یہ نہ ہو کل مجھ سے کوئی گلہ ہو آپ کو۔"

زینی نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں جھٹکتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ انور حبیب کو یک دم سمجھ میں آ گیا کہ وہ اس کے اور سفیر کے ساتھ تعلقات ٹھیک کرنے پر کیوں مجبور ہو گئی تھی۔ اسے ان دونوں کی ضرورت پڑ گئی تھی، اس لیے۔ اس نے بھی گدھے کو باپ بنانے کا فن سیکھ لیا تھا۔ اسے اس فلم میں سفیر ایک ایکٹر اور انور حبیب ایک ڈائریکٹر کے طور پر چاہیے تھا مگر وہ ان دونوں کو پروڈیوسر کے طور پر کیوں چاہتی تھی۔ انور حبیب نے یہ سوال اس سے پوچھ بھی لیا۔ زینی نے بڑے آرام سے کہا۔

"اس لیے کیونکہ میرے پاس اکیلے فلم پر لگانے کے لیے اتنا سرمایہ نہیں ہے لیکن کوئی مجبوری نہیں ہے انور حبیب صاحب! آپ کو اگر فلم پروڈیوس نہیں کرنا تو نہ کریں۔ میں نے آپ سے کہا نا میں چند اور لوگوں کے ساتھ رابطے میں ہوں۔" وہ مسکرائی اور اپنا پرس اٹھا لیا۔

انور حبیب اسے باہر تک چھوڑنے آیا اور جیسے ہی زینی کی گاڑی اس کی پورچ سے نکلی، انور نے اپنے سیل پر سفیر کو کال ملا دی۔

"ہاں، اگر پری زاد فلم بنائے گی تو میں اس میں کچھ پیسہ انویسٹ کروں گا۔ پری زاد کو میں انکار تو نہیں کر سکتا اور دوسری بات یہ کہ چند سالوں تک میں ویسے ہی اپنا پروڈکشن ہاؤس بنانے کا سوچ رہا ہوں۔ اب ایک تجربہ کرنے کا موقع مل رہا ہے تو اس میں کیا برج ہے۔"

سفیر نے اس کی بات سنتے ہی زینی کی بات کی تصدیق کی تھی۔

"اور اس نے اگر آپ سے پارٹنر بننے کو کہا ہے تو "آئیڈیا" برا نہیں ہے۔ آپ بھی کب تک دوسروں کی فلمیں ڈائریکٹ کرتے رہیں گے۔ ایک فلم ہٹ ہو گئی آپ کو تو پورے سال فلمیں ڈائریکٹ کر کے اتنا نہیں کمائیں گے، جتنا ایک فلم پروڈیوس کر کے کما لیں گے۔" سفیر نے اسے مشورہ دیا۔

"لیکن اگر فلم فلاپ ہو گئی تو؟" انور حبیب نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"تو بھی کیا ہوگا؟ نقصان بھی تقسیم ہو جائے گا تینوں میں اور تین پارٹنرز ہوں گے تو نقصان برداشت کرنا آسان ہوگا۔ لیکن آپ یہ سوچ ہی کیوں

رہے ہیں کہ نقصان ہوگا۔ آپ فلم بنائیں گے اور ہم دونوں فلم میں ہوں گے تو فلم فلاپ کیسے ہوگی۔ پری زاد کی ابھی تک ایک بھی فلم فلاپ نہیں ہوئی۔"

سفیر اب بے حد سنجیدہ تھا، کسی ہیرو کے لیے یہ اعتراف کرنا بڑا مشکل تھا کہ فلم اس کی وجہ سے نہیں کسی ہیروئن کی وجہ سے ہٹ ہو رہی تھی مگر سفیر یہ اعتراف کر رہا تھا اور یہ وہ چیز تھی جو انور حبیب پہلے ہی جانتا تھا۔

"تم نے تبریز پاشا کے ری ایکشن کے بارے میں سوچا ہے۔ اگر اسے پتہ چلا کہ ہم کوئی فلم پروڈیوس کرنے والے ہیں؟" انور حبیب نے خدشے کے تحت کہا۔

"کیسا ری ایکشن؟" سفیر چونکا۔ "انڈسٹری میں اور کئی ڈائریکٹرز اور ایکٹرز بھی فلمز پروڈیوس کر رہے ہیں۔ ہم کوئی انوکھا کام تو نہیں کر رہے اور تبریز پاشا کس بات پر ناراض ہوگا؟ آپ کو کسی نے اس بارے میں کچھ کہا کیا؟"

"نہیں، کہا تو نہیں لیکن اس کے ساتھ اتنے عرصے سے کام کر رہے ہیں۔ وہ کتنا طاقت ور اور کینہ رکھنے والا آدمی ہے تم جانتے ہو۔ اس کے مقابلے میں کام کرنے لگیں گے تو ناراض نہ بھی ہو، کام دینے کے معاملے میں تنگ کرے گا وہ ہمیں۔ پاشا کی اگلی فلم میں کوئی اور ہیرو اور کوئی اور ڈائریکٹر ہوا اور وہ فلم ہٹ ہوگئی تو تم کو اندازہ ہونا چاہیے کہ ہم دونوں کو نقصان ہوگا۔" انور حبیب نے جیسے اسے خبردار کیا۔

"نقصان تو پری زاد کو بھی ہوگا۔" سفیر نے اس سے کہا۔

"پری زاد کا سکہ چل رہا ہے آج کل۔ اس کو کوئی فلم سے باہر نہیں بٹھائے گا۔ ہم دونوں پر ہی نزلہ گرے گا اس کا اور پری زاد کو باہر بٹھا بھی دیا تو کیا ہوگا۔ وہ ہیروئن ہے۔ اس کی آمدنی کے اور بے شمار "ذریعے" ہیں لیکن ہمیں تو اسی انڈسٹری میں رہ کر اور کام کر کے کھانا ہے۔"

انور حبیب نے کہا، سفیر سوچ میں پڑ گیا، بات غلط نہیں تھی۔ انہیں واقعی نقصان ہو سکتا تھا۔

"اچھا تو پھر پری زاد سے کیا کہوں میں؟ میں نے تو وعدہ کیا ہے اس سے۔" سفیر نے کچھ متفکر ہوتے ہوئے کہا۔

"اب دیکھ لو تم، سوچنے کا تو میں نے بھی کہا ہے اسے لیکن میں تمہیں ممکنہ خطرات سے آگاہ کر رہا ہوں۔ پری زاد کا کچھ نہیں جائے گا۔ ہم دونوں ڈوب سکتے ہیں۔ ہیروئن فلم پروڈیوس کرنے لگے تو اسے کوئی حریف نہیں سمجھتا۔ ڈائریکٹرز اور ایکٹرز کو سمجھنے لگتے ہیں۔"

"اچھا پھر میں کوئی بہانا سوچتا ہوں۔" سفیر نے فوراً انور حبیب سے کہا۔

انور حبیب اور سفیر کے درمیان ہونے والی اس گفتگو سے زینی بے خبر نہیں رہی تھی۔ انور حبیب نے اسے اس آفر کا اگلے کئی ہفتوں میں جواب نہیں دیا تھا۔ زینی نے اس سے دوبارہ پوچھا نہیں اور سفیر نے بات ٹالنے کی کوشش کی تھی اور زینی کے اصرار پر اس نے انور حبیب کے خدشات کو دہرا دیا تھا۔ سفیر نے زینی سے معذرت کی تھی۔ زینی نے اس کی معذرت قبول کر لی۔ شطرنج کی بساط پر اس کی پہلی چال ناکام ہو گئی تھی۔ اب اسے کسی اور مہرے کو آگے بڑھانا تھا۔

دو ہفتوں کے بعد تبریز پاشا نے اپنے اگلے سال کے دو پراجیکٹس کا ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا تھا۔ ان میں سے ایک کی پری زاد co-producer پروڈیوسر تھی۔ پاشا پروڈکشنز پہلی بار کسی کے ساتھ مل کر فلم پروڈیوس کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ انڈسٹری میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئی

تھیں۔ اور انور حبیب اور سفیر خان بری طرح پچھتائے تھے۔ انہوں نے اپنی بزدلی کی وجہ سے ایک سنہری موقع ہاتھ سے گنوا دیا تھا۔ دونوں نے اپنی اپنی جگہ زینی سے پچھتاوے کا اظہار کیا تھا جسے زینی نے بے حد خوش دلی کے ساتھ نظر انداز کر دیا تھا لیکن اس نے ان کے ساتھ اس بات پر بے حد خوشی اور جوش کا اظہار کیا تھا کہ اسے ان سے بہتر ورکنگ پارٹنر مل گیا ہے۔ اور اس کی اس ایکسائٹمنٹ نے انور حبیب کے پچھتاوے میں کچھ اور اضافہ کیا تھا۔ پہلی بار ان دونوں کے درمیان ہلکی سی تلخی بھی پیدا ہوئی تھی۔ کیونکہ سفیر نے انور کو اس معاملے میں مورد الزام ٹھہرایا تھا کہ اس کے خدشات کی وجہ سے وہ نہ صرف یہ کہ پری زاد کے ساتھ پروجیکٹ میں پارٹنر شپ نہیں کر سکا بلکہ اس نے پری زاد سے کیا ہوا وعدہ بھی توڑا لیکن اس وقتی تلخی اور رنجش کو ختم کروانے میں پری زاد نے ہی کردار ادا کیا۔

''اس بار نہیں تو اگلی بار آپ لوگ میری پروڈکشن کو پروڈیوس کر سکتے ہیں۔ یہ میری زندگی کی آخری پروڈکشن تو ہے نہیں کہ دوبارہ آپ میں سے کسی کو چانس نہیں مل سکتا۔ اس لیے میرے پروجیکٹ کی وجہ سے آپ لوگوں کے درمیان کوئی شکوک و شبہات نہیں ہونے چاہئیں۔'' اس نے بڑے دوٹوک الفاظ میں ان دونوں کے سامنے کہا تھا اور اس کے بعد ان کے ساتھ چند دنوں کے وقفے سے ہونے والی الگ الگ ملاقاتوں میں دونوں کو بے حد غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے سے خبردار رہنے کا کہا۔

انڈسٹری کے تین بڑے ستون پہلی بار ایک دوسرے کے بارے میں کچھ تحفظات کا شکار ہونے لگے تھے۔ انور حبیب اور سفیر خان اگر یہ جان جاتے کہ پری زاد نے تبریز پاشا کو کیا کہہ کر اس کے ساتھ اس پروڈکشن میں شراکت کی تھی تو وہ دونوں پری زاد کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹتے۔

''میں ایک فلم پروڈیوس کرنا چاہتی ہوں اور اس سلسلے میں مجھے سرمائے کے لیے ایک اور پروڈیوسر کی ضرورت ہے۔ انور حبیب اور سفیر دونوں مجھے سرمایہ دینے کے لیے تیار ہیں لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کا نام فلم کے پروڈیوسر کے طور پر سامنے آئے کیونکہ وہ دونوں آپ سے خوف زدہ ہیں۔ میں نے سوچا۔ میں اس سلسلے میں سیدھا آپ سے بات کیوں نہ کروں۔ میرے ساتھ فلم پر سرمایہ تو آپ بھی لگا سکتے ہیں اور اس طرح خوف زدہ ہوئے اور چھپے بغیر...''

تبریز پاشا نے انور حبیب کی طرح سوچنے کا وقت مانگا تھا، نہ سفیر کی طرح سرمائے کی امانت۔ اس نے صرف ایک بات کہی تھی۔

''پاشا پروڈکشنز اس فلم کو پروڈیوس کرے گا تم co-producer پروڈیوسر بن جاؤ۔'' زینی نے ایک لمحہ کا توقف کیے بغیر سر ہلا دیا۔

پروڈیوسر اور کو پروڈیوسر کے معاملے پر وہ لڑتا جسے فلم بنانی ہوتی، اس وقت تو صرف وعدے ہو رہے تھے۔

اسی کے اصرار پر تبریز پاشا نے دو ہفتوں کے بعد ایک پریس کانفرنس میں اس فلم کے بارے میں اعلان کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد اسے بہت جلد اپنے گرگوں کے ذریعے اس پارٹنر شپ کے معاملے میں انور حبیب کے درمیان ہونے والے اختلافات کے بارے میں بھی پتہ چل گیا۔ انڈسٹری اتنی چھوٹی تھی کہ وہاں پر کسی کے دل کی بات بھی راز نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ تو ممکنہ پارٹنر شپ کا معاملہ تھا۔

پری زاد جال بچھا رہی تھی یا بارودی سرنگیں۔ اس کا فیصلہ وقت کرنے والا تھا۔

☆☆☆

"زری! میں نے یہاں کچھ رقم رکھی تھی، اب نہیں ہے۔" کرم علی آفس جانے سے پہلے اپنے دراز کو کھول کر اس رقم کو تلاش کر رہا تھا، جو اس نے کسی کام کے لیے کل رات کو نکلوا کر رکھی تھی۔ "تم نے تو کہیں اٹھا کر نہیں رکھ دی؟"

"ہاں، وہ میں نے لے لی ہے۔" زری نے بڑے اطمینان سے کہا۔ وہ اپنے ناخن فائل کر رہی تھی۔ کرم علی کچھ حیران ہوا۔

"تم نے......؟ کس لیے......؟"

"وہ مجھے کچھ شاپنگ کرنا تھی؟" زری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کس چیز کی شاپنگ؟" اس نے پوچھا۔ زری ناخن فائل کرتے ہوئے رک گئی۔

"شاپنگ چیز کی نہیں ہوتی، چیزوں کی ہوتی ہے۔" اس نے بڑے جتانے والے انداز میں کرم علی سے یوں کہا جیسے وہ جاہل ہو۔

"مگر کن چیزوں کی؟"

"اب میں آپ کو ایک ایک چیز گنواؤں کہ میں نے کیا لیا؟" زری یک دم غصے میں آ گئی۔

"دس ہزار ڈالرز تھے وہ زری؟" کرم علی نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے اس سے کہا۔

"دس لاکھ تو نہیں تھے۔" اس کے دوبدو جواب نے کرم علی کو چند لمحوں کے لیے خاموش کر دیا۔

"لیکن تمہارے پاس تو کریڈٹ کارڈ ہے۔ تم اسے استعمال کرتی ہو شاپنگ کے لیے۔"

"ہاں ہے۔ کریڈٹ کارڈ لیکن کیش بھی چاہیے ہوتا ہے مجھے۔ اب میں ماڑی کی ٹکٹس خریدنے کے لیے بھی آپ کا کریڈٹ کارڈ استعمال کروں؟"

"تم نے دس ہزار ڈالرز کے ٹکٹس لیے؟" کرم علی کو جیسے جھٹکا لگا۔

"میں نے کب کہا میں نے دس ہزار کے ٹکٹ لیے۔ میں نے مثال دی ہے آپ کو۔ سو اخراجات ہیں میرے۔ اب ایک ایک ڈالر کے لیے میں آپ کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں۔" کرم علی نے اس سے یہ نہیں کہا کہ وہ وقتاً فوقتاً اس کے مانگنے پر ہی نہیں، مانگے بغیر ہی اسے کافی کیش دیتا رہتا ہے۔ لیکن اس وقت زری کو ایسی کوئی چیز یاد کروانا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔

"پھر بھی زری! دس ہزار ڈالرز کو شاپنگ پر ضائع کرنا ہوش مندی نہیں اور کم از کم تمہیں رقم لینے سے پہلے مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔"

کرم علی نے اپنے بریف کیس میں اپنی کچھ چیزیں رکھتے ہوئے کہا۔ زری یک دم غصے میں کمرے سے نکل گئی۔ چند لمحوں کے بعد دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کچھ رقم کرم علی کے سامنے بیڈ پر پھینک دی۔ کرم علی چونک کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"یہ لیں اپنی رقم، ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے دس ہزار ڈالرز کے لیے آپ نے۔"

"زری! میں نے تم سے رقم واپس نہیں مانگی۔ میں نے تم سے صرف پوچھا ہے اس کے بارے میں۔" کرم علی نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے تحمل سے کہا۔ "یہ رقم اٹھالو یہاں سے۔"

''میں آئندہ آپ کے ایک روپے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ پتہ نہیں ماں باپ نے کیا دیکھ کر میری شادی آپ سے کر دی۔'' زری اب واویلا کر رہی تھی۔

''یہ رقم اٹھا لو یہاں سے۔ میں اس کو ایشو بنانا نہیں چاہتا۔'' کرم علی نے خفگی سے کہا۔

''میں مر جاؤں گی لیکن اتنی بے عزتی کے بعد یہ رقم نہیں اٹھاؤں گی۔''

''بے عزتی؟ بے عزتی میں نے تمہاری کی ہے یا تم میری کر رہی ہو؟'' کرم علی نے بے حد شاکی انداز میں اس سے پوچھا۔

''صحیح کہتی تھیں میری سہیلیاں۔ کبھی بڑی عمر کے مرد سے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بیویوں کی زندگی عذاب کر دیتے ہیں اور عمر کے ساتھ ساتھ اگر شکل و صورت بھی اچھی نہ ہو تو پھر تو جو کر دیں جو کہہ دیں، وہ کم ہے۔''

زری نے بظاہر بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا لیکن اس نے کرم علی کو حرکت کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ عمر کے بارے میں پہلے بھی کئی بار زری کے منہ سے بلاواسطہ طور پر طعنے سن چکا تھا لیکن شکل و صورت کے بارے میں آج پہلی بار سن رہا تھا۔ جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ زری اب مزید کچھ بڑبڑاتے ہوئے بستر پر بکھرے نوٹوں کو سمیٹ رہی تھی۔

کرم علی بے حس و حرکت اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے حد خوبصورت تھا لیکن اس کی زبان اتنی ہی بدصورت تھی۔ اس کی زبان پر زہر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، کم از کم کرم علی کے لیے۔ آج عمر کے بعد وہ شکل و صورت پر آ گئی تھی۔ اب برص تک کب آتی تھی، یہ کرم علی کو دیکھنا تھا۔ وہ اگر یہ سمجھتا تھا کہ وہ زری کے ساتھ حسن سلوک کر کے یا آسائشات سے مالا مال کر کے اس کا دل جیت سکتا تھا تو یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی۔ زری نے اسے غاصب کے علاوہ کبھی کچھ نہیں سمجھا تھا، نہ وہ سمجھ سکتی تھی۔

وہ پورا دن کرم علی آفس میں اپ سیٹ رہا اور شادی کے بعد پہلی بار اس کا دل گھر واپس جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس پورے دن میں اس نے زری کو ہمیشہ کی طرح آفس سے کالز نہیں کیں۔ زری تو خیر اسے پہلے بھی کبھی کال نہیں کرتی تھی۔

وہ رات کو تقریباً دس بجے گھر واپس آیا تھا اور زری تب تک کھانا کھا کر کوئی انڈین فلم دیکھ رہی تھی۔ وہ کرم علی سے بالکل اس طرح پیش آئی تھی جیسے ان دونوں کے بیچ صبح کچھ ہوا ہی نہیں ہو لیکن معمول کا انداز رکھنے کے باوجود اس نے کرم علی سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اتنی دیر سے کیوں آیا ہے۔

کرم علی پوری رات جاگتا رہا اور زری فلم دیکھنے کے بعد بڑے اطمینان سے اس کے برابر گہری نیند سو گئی۔ کئی مہینوں کے بعد اور اپنے آپ سے کیے ہوئے تمام وعدوں کے باوجود کرم علی اس رات ایک بار پھر اس کمرے میں گیا تھا۔ جہاں زینی کی فلمز، میگزینز، پوسٹرز اور تصویروں کا ایک انبار پڑا تھا۔ کئی مہینوں بعد اسے اپنی برص زدہ کلائی پر اس کے ہاتھ کا لمس ''یاد'' آیا تھا۔ یاد آیا تھا یا شاید ''محسوس'' ہوا تھا۔ کئی مہینوں کے بعد اسے اس کی آواز میں یک دم چھلکنے والی نرمی اور ہمدردی مرہم کے کسی پھاہے کی طرح یاد آئی اور کئی مہینوں کے بعد ایک بار پھر اس کا دل چاہا تھا، وہ زینی کو کچھ بھجوائے۔ اسی طرح کسی بے نام شخص کی طرف سے، کسی غلط ایڈریس سے۔

پھر اسے یک دم احساس ہوا، وہ شادی شدہ ہے اور زینی کے ساتھ کوئی تعلق دلی یا جذباتی یا کیسا بھی بددیانتی کی سیڑھی پر پہلا قدم ہوتا اور

پہلا قدم رکھنے کے بعد دوسرا قدم رکھنے میں کتنا وقت لگتا تھا، بہت کم۔

"جو تعلق ٹوٹ گیا، اسے ٹوٹا رہنے دو کرم علی! تعلق پھر سے جڑے گا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ وہ ابھی بھی دل سے نہیں جاتی پھر کیا کیا مصیبتیں پیدا کردے گی تمہارے لیے۔ اس کا اندازہ ہے تمہیں؟ اور پھر ہے تو وہ بھی ایک ایکٹریس جو تمہیں اپنے ایک فین سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔ ایک امیر اور مال دار مداح جو اسے تالی اور ستائش کے علاوہ بھی بہت کچھ دے سکتا ہے۔ زری میں کھوٹ ہے تو کھوٹ ادھر بھی ہے۔ زری میں خود غرضی ہے تو خود غرضی وہاں بھی ہے۔ زری میں بے مہری اور ناقدری ہے تو ادھر بھی اس کی کمی نہیں۔ زری میں زہر ہے تو شہد وہاں بھی نہیں ہے۔ زری بیوی ہے تمہاری، بری سہی مگر پاک باز تو ہے اور وہ کیا ہے۔ آنکھوں دیکھی مکھی جسے تم نگلنا چاہتے ہو۔"

اس کا دل اسے پتہ نہیں کیا کیا جتا رہا تھا اور اس کا ذہن پتہ نہیں کیا کیا بتا رہا تھا۔ وہ اس کمرے سے اٹھ کر اس کمرے میں آ گیا جس کی وارڈ روب اور closests اس شاپنگ سے بھری تھیں جو اس نے زینی کے لیے کی تھی۔ ہر چیز پر نظر دوڑاتے اس کو پتہ نہیں کیا کیا یاد آ رہا تھا۔ وہ سارے دن فلم کی کسی ریل کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔ اس کی زندگی کے بہترین دن۔

☆☆☆

"فاروق کے گھر والے آئے تھے آج۔ ربیعہ کو پسند کر گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے، انہیں جلدی شادی کرنی ہے۔ فاروق پی ایچ ڈی کے لیے باہر جا رہا ہے۔ اسکالرشپ ملا ہے اسے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں وہ شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے کر باہر جائے۔"

نفیسہ نے بے حد خوشی اور جوش کے عالم میں زینی کے ردعمل کو دیکھے بغیر اسے بتاتی جا رہی تھیں۔

"بڑے اچھے لوگ ہیں۔ نیک اور سادہ۔ ذرا بھی بناوٹ اور غرور نہیں ان میں۔ تمہارا بھی کئی دفعہ ذکر کیا انہوں نے اور بڑے اچھے لفظوں میں۔"

نفیسہ نے خاص طور پر اس طرح ذکر کیا جیسے زینی کا اچھے لفظوں میں ذکر ہونا بڑے اچنبھے اور کارنامے کی بات تھی۔ زینی کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اب اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرنا چھوڑ دیا تھا اس نے۔

"میں بس یہ چاہ رہی تھی کہ لڑکے کے بارے میں کچھ تحقیق کروائی جائے اور ..."

اس سے پہلے کہ نفیسہ کچھ اور کہتیں، ربیعہ اندر آ گئی۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے کسی تحقیق کی۔ دو سال اس کے ساتھ تعلیم حاصل کی ہے میں نے۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں اسے۔"

اس نے ماں کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔ زینی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ چند ہفتے پہلے کی مرجھائی اور کملائی ہوئی ربیعہ نہیں تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ کافی عرصے کے بعد اس کے چہرے پر اس نے ایسے رنگ دیکھے تھے۔ زینی کو واقعی خوشی ہوئی۔

"ربیعہ ٹھیک کہتی ہے۔ وہ جانتی ہو گی فاروق کو اچھے طریقے سے۔ تحقیق کروانے میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

زینی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ سلطان بہت پہلے ہی فاروق کے بارے میں جتنی معلومات حاصل کر سکتا تھا، کر چکا تھا۔

"آپ اب لڑکے والوں کے گھر کب جا رہی ہیں؟"

''بس اسی ہفتے۔ وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ کل ہی آ جاؤں میں ان کے گھر لیکن میں نے کہا کہ زہرہ کو ساتھ لے کر جانا ہے۔ وہ اپنے کاموں سے کچھ فارغ ہو جائے تو چلیں گے۔ ویسے بھی پسند تو کر ہی گئے ہیں وہ۔ اب تو صرف رسم ہی باقی ہے۔''

نفیسہ نے زینی سے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ زینی کو ماں پر پیار آیا۔ وہ ربیعہ کی خوشیوں کو اس کے سائے سے بھی اس طرح بچا رہی تھیں جیسے مرغی اپنے پروں کے نیچے اپنے بچوں کو چھپاتی ہے۔ کہیں کچھ ایسا نہ ہو جائے زینی کی وجہ سے کہ ربیعہ کو پھر کچھ کھونا پڑے۔

زینی کو کوئی رنج نہیں ہوا تھا۔ ماں نے بہت عرصے پہلے اسے کمزور سمجھنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ پیسے کی وجہ سے یک دم بہت طاقتور لگنے لگی تھی۔ اتنی طاقت ور کہ انہیں لگا اب اسے کسی کے سہارے اور کندھے کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن باقی بچوں کو تھی۔

''آپ لوگ جا کر شادی کی تاریخ کے بارے میں بھی کچھ طے کر لیں کیونکہ شادی کے انتظامات کے لیے ابھی سے ''

ربیعہ نے زینی کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔ ''شادی کے کوئی انتظامات نہیں کرنے ہیں۔ میں نے فاروق سے کہا ہے کہ بس سادگی سے نکاح ہو جائے تو ٹھیک ہے اور اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں انتظامات کے بارے میں پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے پرانے گھر میں نکاح کروانا چاہتی ہوں اور وہیں سے ہی رخصتی ہوگی۔''

زینی پلکیں جھپکائے بغیر ربیعہ کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''خوامخواہ سادگی سے شادی ہوگی۔ زینی اگر دھوم دھام سے شادی کرنا چاہتی ہے تو شادی دھوم دھام سے ہی ہوگی۔ سسرال والے بعد میں سو سو تمیں کرتے ہیں کہ پیسے بچانے اس طرح شادی کر کے۔ اس لیے زینی کو شادی کے انتظامات کرنے دو۔''

نفیسہ نے اس بار ربیعہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ وہ ایک بیٹی کی سادگی سے شادی کے نتائج کئی سال بھگتی رہی تھیں۔ اب دوسری کی شادی سادگی سے کرنے کے نام سے بھی خوفزدہ تھیں۔

''ابو کے پیسے ہوتے نا تو میں بھی دھوم دھام سے ہی شادی کرتی مگر مجھے اس کے حرام کے پیسے سے اپنے گھر کی بنیاد نہیں رکھنی اور فاروق کے گھر والے صاف صاف بتا بھی گئے ہیں آپ کو کہ انہیں تین کپڑوں میں رخصتی چاہیے اور جہیز کے نام پر بھی کچھ نہیں چاہیے۔''

ربیعہ نے بے حد تحریہ انداز میں بہن کو دیکھتے ہوئے ماں سے کہا۔

''جیسے ربیعہ چاہتی ہے آپ وہی کریں۔ وہ سادگی سے شادی چاہتی ہے تو سادگی سے ہی سہی۔ آپ زیورات اور دوسری ضرورت کی چیزیں...'' ربیعہ نے ایک بار پھر زینی کی بات کاٹ دی۔

''مجھے زیورات اور دوسری چیزیں بھی نہیں چاہئیں۔ میں نے کہا نا مجھے تمہارے کمائے ہوئے پیسے کو اپنی شادی پر خرچ نہیں کرنا۔ اسے تم اپنی شادی کے لیے محفوظ رکھو۔''

''تم خالی ہاتھ اپنے سسرال جاؤ گی تو بہت عزت کریں گے تمہاری۔ دروازے پر ہی تمہارے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالیں گے۔ آخر ایسی بہوئیں روز روز تھوڑی ملتی ہیں۔ جنہیں حرام اور حلال کا فرق پتہ ہوتا اور وہ حرام سے اتنا بچتی ہوں کہ جہیز کے نام پر ایک تنکا بھی سسرال لے کر نہ

جائیں۔ کیونکہ ان کے میکے میں آنے والا روپیہ حرام ہے۔"

زینی نے بے حد اطمینان سے یوں کہا جیسے معمول کی گفتگو ہو رہی ہو۔

"طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چار باتیں سننی پڑیں گی مجھے جہیز نہ لے جانے پر۔ وہ میں سن لوں گی۔" ربیعہ نے برا مان کر کہا۔

"چار باتیں ـــــ؟ اب وہ چار باتیں تمہیں کب تک اور دن میں کتنی بار سنائی جائیں گی۔ یقیناً تمہیں یہ جاننے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہو گی کیونکہ تم "چار باتوں" کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو۔ تم نے ہزاروں بار زہرہ آپا کو وہ "چار باتیں" سنتے دیکھا ہے، اس لیے تمہیں کیا پروا۔"

"دنیا میں سارے لوگ نعیم بھائی اور زہرہ آپا کے سسرال والوں جیسے نہیں ہوتے۔ ہر ایک پیسے کا بھوکا اور کمینہ نہیں ہوتا اور نہ ہر لڑکی کی قسمت ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے فاروق کے گھر والے بالکل مختلف ہوں۔ ضروری تو نہیں ہے کہ ہر مرد نعیم بھائی ہی کی طرح لالچی ہوگا۔"

"جب تمہیں پاکستان میں ایسا مرد ملے جو بیوی کے مال پر نظر نہ رکھتا ہو اور سسرال کی دولت دیکھ کر جس کی رال نہ ٹپکتی ہو اور جس کو ماں باپ سے بیوی اور سسرال سے مانگنے کو اپنا حق سمجھنے کی ہدایت نہ ملی ہو تو مجھے ضرور دکھانا۔ میں اسے چڑیا گھر میں رکھواؤں گی۔"

زینی نے میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے بظاہر عام انداز میں لیکن بے حد تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔

ربیعہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "آپ نے سنا، کیا کہا اس نے مجھے؟ اس کی ایسی ہی باتوں کی وجہ سے۔"

نفیسہ نے ربیعہ کی بات کاٹ دی۔

"وہ ٹھیک کہتی ہے ربیعہ! آج کل کوئی ایسا نہیں ہے جو خالی ہاتھ گھر آنے والی بہو کو ہنس کر گلے لگائے۔ لوگوں کا ظاہر اور باطن بہت مختلف ہوتا ہے۔"

"کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ جوتے ہی کھانا پڑیں گے زہرہ آپا کی طرح، میں کھا لوں گی لیکن نعیم بھائی کی طرح فاروق کو بھکاری نہیں بناؤں گی کہ وہ ایک ایک چیز کے لیے یہاں آئے اور یہاں پر ہاتھ پھیلائے۔"

زینی نے میگزین میز پر پھینکا اور اپنا سیل فون اٹھاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

"ٹھیک ہے، تمہیں اگر یہ سب کچھ پسند نہیں ہے تو نہ سہی۔ یہ تمہاری شادی ہے، اسی طرح ہونی چاہیے جیسے تم چاہتی ہو۔"

زینی نے جیسے بات ختم کرتے ہوئے بحث ختم کی تھی۔

شادی کی ساری تیاری واقعی ویسے ہی ہوئی تھی جیسے ربیعہ نے چاہی تھی۔ بے حد سادگی اور کسی شور ہنگامے کے بغیر۔ البتہ اس کے سسرال کے لیے نفیسہ نے زیورات اور تحائف لیے تھے جن کے بارے میں ربیعہ کو شادی کے دن تک پتا نہیں چلا تھا اور جب اسے پتا چلا تب تک وہ چیزیں اس کے سسرال والوں تک پہنچ گئی تھیں۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی تھی۔

شادی سے ایک رات پہلے زینی رات گئے اس کے کمرے میں آئی تھی۔ ربیعہ تب تک لائٹ بجھا کر سونے کے لیے لیٹنے ہی والی تھی۔ زینی کو اپنے پاس دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔

"کوئی کام ہے؟" اس نے زینی سے پوچھا۔

"نہیں، ایسے ہی کچھ دیر تمہارے پاس بیٹھنا چاہتی ہوں۔"

اسے اس رات زینی بے حد سنجیدہ لگی تھی۔ وہ بہت دیر چپ چاپ ربیعہ کے پاس اس کے بستر پر بیٹھی رہی پھر ربیعہ کے ہاتھ پکڑ کر ان پر لگی مہندی دیکھنے لگی۔

"بہت گہرا رنگ آیا ہے۔" اس نے مدھم آواز میں زینی کو کہتے ہوئے سنا۔ اسے پتا تھا وہ مہندی لگوانے کی بہت شوقین تھی۔

"تمہاری شادی پر تمہارے ہاتھوں پر لگے گی تو تمہارے ہاتھوں پر بھی بہت گہرا رنگ آئے گا۔"

ربیعہ نے پتہ نہیں کیا سوچ کر اس سے کہا۔ زینی ہنس پڑی۔ وہ اس نے ربیعہ کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ ربیعہ منتظر بیٹھی رہی۔ بہت دیر بعد جب اس نے سر اٹھایا تو ربیعہ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اسے تکلیف ہوئی۔

"مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔" اس نے زینی کو کہتے سنا۔ ربیعہ چاہتے ہوئے بھی اس وقت کچھ نہیں کہہ سکی۔

"میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت زیادہ تکلیف اٹھانا پڑی ہے۔" اس نے زینی کو پہلی بار اعتراف کرتے سنا۔

"بعض دفعہ سب کچھ ہاتھ سے نکل جاتا ہے ربیعہ! لاکھ کوشش کرے آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ بہت مدھم آواز میں رک رک کر بول رہی تھی۔ اور اتنے سالوں میں پہلی بار ربیعہ کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ اسے ملامت کر سکے۔ وہ کام جو وہ ہمیشہ کرتی تھی، زینی بہت دیر اس کے پاس چپ چاپ بیٹھی رہی تھی پھر اس نے ربیعہ کا ہاتھ پکڑ کر اس پر کچھ رکھا۔ وہ سونے کا ایک چھوٹا سا لاکٹ تھا۔

"یہ حرام کے پیسے کا نہیں ہے۔ ابو کی پنشن کے پیسوں کا ہے۔"

ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ زینی وہاں رکی نہیں، وہ اسی طرح اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

"آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ آپ نے میرے لیے اتنی شاپنگ کر رکھی ہے۔"

وہ رری کی بات پر حیران رہ گیا۔ وہ حسب عادت اس وقت بے حد میٹھے انداز میں اس سے بات کر رہی تھی اور بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے کرم علی کے آتے ہی اسے آج خاص طور پر اس کے لیے کھانا پکانے کی اطلاع دی تھی اور کرم علی کی چھٹی حس نے اسے خبردار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کھانے کی کوئی وجہ ضرور ہوگی اور وہ وجہ اگلے چند منٹوں میں ہی سامنے آ گئی تھی۔

"کیسی شاپنگ؟" کرم علی نے کچھ حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

"آپ اس طرح انجان نہ بنیں۔ مجھے پتہ ہے آپ یہ سب شادی کی سالگرہ کے لیے اکٹھا کر رہے ہیں لیکن میں نے نکال لی ہیں ساری چیزیں وہاں سے۔" رری نے بے حد لاڈ سے کہا۔

کرم علی کو کرنٹ لگا تھا، وہ جان گیا تھا کہ وہ کن چیزوں کی بات کر رہی ہے۔ وہ یقیناً زینی کی شاپنگ تھی۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں

آیا کہ وہ کیسے ری ایکٹ کرے۔

"اور وہ ایک کمرہ ہے، اس کی چابی نہیں مل رہی مجھے۔ ہاؤس کیپر بتا رہی تھی کہ آپ کے پاس ہے۔" زری اب اس کمرے کی بات کر رہی تھی جس میں زینی کی تصویریں اور فلمز پڑی تھیں۔ "ہاؤس کیپر کہہ رہی تھی کہ آپ نے بہت عرصے سے اسے صاف بھی نہیں کروایا۔ مجھے چابی دے دیں، میں صاف کرواتی ہوں اسے۔ ویسے اس کمرے میں ہے کیا؟"

زری کا انداز بظاہر بہت نارمل تھا لیکن کرم علی جانتا تھا اس کمرے کی چابی اس کے ہاتھ لگنے کا مطلب کیا تھا؟ زری کے ہاتھ میں وہ طعن و طنز کی ایک اور تلوار پکڑا دیتا۔ وہ بہت کم اب اس کمرے میں جاتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ زینی سے متعلقہ تمام چیزیں ضائع کرنے پر اپنے دل کو آمادہ نہیں کر سکا تھا۔

"اس کمرے میں کچھ نہیں ہے اور مجھے اگر اس کمرے کی صفائی کروانی ہوگی تو میں ہاؤس کیپر سے کروا لوں گا۔ آپ زحمت نہ کریں۔"

"نہیں تو نہ سہی۔ میں تو آپ کے لیے ہی کہہ رہی تھی۔" زری نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ وہ فی الحال مکمل طور پر ان چیزوں کو استعمال کرنے کے خیال میں مگن تھی جو وہ اس closet سے نکال کر لائی تھی۔

"مجھے ہر وقت شاپنگ سے ٹوکتے رہتے ہیں اور خود دیکھیں کتنی کتنی مہنگی چیزیں خرید لائے ہیں میرے لیے۔"

زری اب بھی بڑے لاڈ سے خوشی سے جگمگاتی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ کرم علی خاموش رہا۔ ٹھیک تھا، وہ یہ سب کچھ استعمال کر لیتی۔ آخر کتنی دیر تک وہ ساری چیزیں دور رکھ سکتا تھا۔ رکھ کر ضائع کرنے سے بہتر تھا کہ وہ کسی کے استعمال میں آتیں اور اس کی بیوی ہونے کے ناطے اس کا حق کسی بھی دوسری عورت سے زیادہ تھا۔

"چپ کیوں ہیں آپ؟" زری نے بالآخر اس کی خاموشی کو محسوس کیا تھا۔ اب سامان کا استاں اب رہا تھ میں آنے کے بعد فرض تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ تو "محسوس" کرتی۔

"نہیں ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔" کرم علی نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ اسے ٹالا۔ "ایک تو آپ سوچتے بڑا ہیں۔" زری نے بڑے ناز سے کہا۔ "میری سہیلیاں کہتی ہیں بڑی عمر کے آدمی اسی طرح ہوتے ہیں جس طرح آپ ہیں۔ ایسے ہی سنجیدہ اور چپ چپ رہنے لگتے ہیں لوگ اس عمر میں۔"

زری نے بظاہر ہمدردی سے کرم علی کو بتایا تو وہ مسکرایا۔ کرم علی "بڑی عمر کا آدمی" کی تعریفیں سننے کا عادی ہو چکا تھا۔

"میں جب آپ کی عمر کا تھا تو تب بھی اتنا ہی خاموش اور سنجیدہ تھا، جتنا اب ہوں۔" کرم علی نے جیسے اسے اطلاع دی۔

"مجھے کیا پتہ؟ میں تو پیدا بھی نہیں ہوئی تھی تب۔" زری نے بے حد معصومیت سے کہا۔ کرم علی بے اختیار ہنسا۔ زری الجھی۔

"یہ ہنسے کیوں ہیں آپ؟"

"آپ نے بالکل صحیح بات کی، اس لیے؟" زری نے کرم علی کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔ کرم علی ہنسنے یا مسکرانے کا عادی نہیں تھا اور زری اس کی اس سنجیدگی کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اب اگر وہ کبھی مسکراتا بھی تو زری بہت سے شبہات اور خدشات کا شکار ہو جاتی۔

"دو تین دن سے آفس سے آپ سے بات نہیں کر پا رہا۔ جب بھی فون کرتا ہوں، فون بزی ہوتا ہے اور سیل فون آپ اٹھاتی نہیں ہیں۔"

کرم علی نے یک دم خیال آنے پر پوچھا۔

"ہاں... وہ... میں... فون پر بات کر رہی ہوں گی پاکستان... آپ نے کس وقت فون کیا؟ زری یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

میں نے وقفے وقفے سے دو تین بار فون کیا۔ چند گھنٹوں کے فرق سے... ہر بار فون بزی ملا... اور یہ دو تین دن سے ہو رہا ہے۔

پاکستان... اتنی لمبی کال... خیریت تو ہے وہاں؟"

"ہاں، خیریت ہے۔ بس اداس ہوتی ہوں تو کال کر لیتی ہوں۔ اب مجھے کیا پتا تھا آپ اس پر بھی اعتراض کریں گے اور اس طرح جاسوسی کرتے پھریں گے میری۔" زری کا موڈ یک دم بگڑ گیا۔

کرم علی ہکا بکا رہ گیا۔ "جاسوسی... آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں کیوں جاسوسی کروں گا آپ کی؟"

"یہ تو آپ کو پتہ ہو گا کہ آپ کیوں کر رہے ہیں؟ کیا شک ہے آپ کو مجھ پر کہ اس طرح بار بار فون کرتے ہیں آفس سے۔"

کرم علی کے حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔ وہ باتیں جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھیں، وہ دہرا رہی تھی۔

"میں کسی شک کی وجہ سے آپ کو فون نہیں کرتا۔ آپ جانتی ہیں، میں ہمیشہ آفس سے آپ کو فون کرتا ہوں۔" کرم علی نے وضاحت کر دینے کی کوشش کی۔ زری کے الزام پر واقعی اس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

"روز تو نہیں کرتے آپ فون۔"

"ہاں، کبھی بہت مصروف ہوں تو نہیں کرتا یا آپ نے بتایا ہو کہ آپ گھر پر نہیں ہوں گی تو نہیں کرتا، ورنہ تو ایک دو بار فون کرتا ہوں میں آپ کو اور صرف آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے۔"

"کیوں، میری خیریت کو کیا ہوا؟" زری نے تیز آواز میں کہا۔ کرم علی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہے۔

وہ بدتمیزی کا مقابلہ کر سکتا تھا جہالت کا نہیں، اور زری میں دونوں "صفات" بدرجہ اتم تھیں۔ کرم علی لفظ ڈھونڈنے لگا۔

"آپ کو اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ کو آفس سے فون کروں؟" کرم علی نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔" ترخ سے جواب ملا۔

"لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ آپ سے بات کروں۔"

کرم علی نے اپنی ساری عزت نفس کو جیسے کوڑے کے ڈبے میں ڈال کر اس سے کہا۔ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکا تھا کہ زری کو آفس سے فون کرنے کے لیے اسے بھی اپنے دل کو مجبور کرنا پڑتا تھا، ورنہ وہ بھی اس کی آواز اور باتوں سے اسی طرح الجھتا تھا جیسی وہ الجھتی تھی لیکن وہ پھر بھی حتی المقدور یہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ شادی چلے کم از کم اس کی طرف سے زری کو کوئی شکایت نہ ہو کہ وہ اس کا خیال نہیں رکھتا یا اس پر توجہ نہیں دیتا۔

"کیوں بات تو کرتے ہیں آپ روز مجھ سے۔ صبح آفس جاتے ہوئے اور پھر رات کو بھی تو واپس آجاتے ہیں پھر بے وقوفوں کی طرح دو دو تین تین بار فون کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پاکستان تو میں اس لیے کال کرتی ہوں کہ وہ لوگ میرے ساتھ نہیں ہیں۔"

اس نے جیسے کرم علی کے لیے کچھ کہنے کو چھوڑا ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے کا اس کا خوش گوار موڈ اب غائب ہو چکا تھا۔

"ہر کام پر پابندی، ہر بات پر اعتراض۔ یہ کیوں کر رہی ہو؟ وہ کیوں کر رہی ہو؟ پتہ نہیں وہ کون سے مرد ہوتے ہیں جو بیویوں پر اعتماد کرتے ہیں اور انہیں آزادی دیتے ہیں۔ یہاں تو گلے میں رسی ڈال کر کھونٹے سے باندھ دیا ہے مجھے۔ اس سے تو اپنے باپ کے گھر بیٹھی رہتی تو سکھی رہتی میں۔"

وہ اب مسلسل بول رہی تھی۔ کرم علی اب اس وقت کو پچھتا رہا تھا جب اس نے زری سے فون کے بارے میں پوچھا تھا۔

"اب اگر فون کو ہاتھ بھی لگایا میں نے تو میرا نام زری نہیں۔ ماں باپ کو کہہ دوں گی کہ سمجھیں زری مر گئی۔ بڑی عمر کے آدمی سے شادی کر کے دفن تو خیر پہلے ہی کر دیا انہوں نے مجھے۔ اب فاتحہ بھی پڑھ لیں۔"

کرم علی نے کچھ کہنے کے بجائے کمرے سے باہر نکلنا زیادہ بہتر سمجھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس کی سوچ اور ذہنیت کا مورد الزام کس کو ٹھہرائے۔ اس کی کم عمری کو؟ اس کی کم تعلیم کو؟ اس کی غربت کو؟ اس کے ماحول کو؟ اس کے ماں باپ کی تربیت کو یا اپنی بدقسمتی کو؟ زری اس کی زندگی کا وہ بھیانک خواب تھا جسے وہ جاگتے میں دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

سعید نواز نے زینی اور شیراز کے تعلق کے بارے میں پتا کروایا یا نہیں لیکن بہرحال انہوں نے دوبارہ شیراز سے اس سلسلے میں بات نہیں کی تھی اور یہ شیراز کے لیے جیسے معجزے سے کم نہیں تھا اور اس نے اس معجزے کے لیے کتنی دعائیں مانگی تھیں، یہ صرف وہی جانتا تھا۔ اگلے چھ ماہ وہ بے حد مشکور رہا تھا۔

زینی سے رابطے کا تو فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ زینی اس کے خلاف اپنے دل میں کتنا غصہ رکھتی تھی۔ شیراز نے ان چند "گرل فرینڈز" کے ساتھ بھی ہر طرح کا رابطہ منقطع کر دیا جن کے ساتھ وہ پچھلے کچھ عرصہ سے انوالوڈ تھا۔

شینا کی زبان پر کچھ عرصہ تک پری زاد کا ذکر اور اس کے حوالے سے طعنے رہے تھے مگر پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا پری زاد جیسے قصہ پارینہ بنتی گئی۔

شیراز اس عرصہ میں ایک فرمانبردار شوہر بن کر دکھانے کے لیے جتنی کوشش کر سکتا تھا وہ کرتا رہا تھا۔ دفتر اور گھر کے علاوہ اپنی سوشل لائف مکمل طور پر کاٹ دی تھی۔ دوبارہ سے شینا اور سعید نواز کا اعتماد جیتنے کے لیے اسے بہت محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ انہیں یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ اتنا ہی بے ضرر تھا جتنا وہ سمجھتے تھے اور پری زاد والا قصہ ایک اتفاق کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

یہاں تک کہ شیراز نے شینا کے بیٹے پر بھی اس طرح توجہ دینی شروع کر دی جیسے وہ اس کا اپنا بچہ ہو۔ اس کے دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس بچے پر دی جانے والی توجہ ہی کے بدلے میں شینا اسے معاف کر دے اور اس کے رویے میں کچھ بہتری آئے۔

لیکن شینا کے رویے میں بہتری کے لیے کی جانے والی ہر کوشش ڈھاک کے تین پات ثابت ہوئی۔ سہیل کے ساتھ اس کے تعلقات اسی طرح عروج پر تھے اور اب وہ کھلے عام ان کے گھر آنے لگا تھا اور شیراز نے زہر کا یہ گھونٹ بھی پی لیا تھا۔

اس نے جیسے اس بات پر سمجھوتہ کر لیا تھا کہ سہیل کو شینا کی زندگی میں کسی نہ کسی شکل میں ساری زندگی رہنا ہے۔ وہ بعض دفعہ شینا کی سہیل کے لیے محبت دیکھ کر حیران بھی ہوتا تھا۔ حسد کرنا تو خیر اب اس نے کب کا چھوڑ دیا تھا۔

سہیل سے شینا کا تعلق اور محبت اب سعید نواز کے علاوہ اور کسی کو اپ سیٹ نہیں کرتی تھی۔ صرف سعید نواز تھا جسے سہیل اور شینا کا یہ میل جول ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ سہیل کو گولی مار دیتا لیکن اس جذبے میں شیراز سے ہمدردی کا کوئی عنصر نہیں تھا بلکہ سعید نواز کو سہیل اور اس کے گھر والوں سے ذاتی مخاصمت تھی اور بیٹی ایسی تھی کہ وہ اس پر جان چھڑکتا تھا اور وہ اسی طرح سہیل پر مرتی تھی۔

باپ کی ناپسندیدگی ناراضی یا مخاصمت جیسے اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

شیراز کو کبھی تو سعید نواز پر غصہ آتا، کبھی ترس اور کبھی اسے خوشی ہوتی۔ شینا وہ پہاڑ تھی جس کے سامنے سعید نواز آ گیا تھا۔

شیراز کی باقی دونوں بہنوں کی شادی بھی اب ہو چکی تھی۔ اکبر اور نسیم اب بالکل اکیلے تھے۔ شیراز کوشش کے باوجود ان کے پاس جانے اور بیٹھنے پر بھی خود کو آمادہ نہیں کر پاتا تھا۔ اکبر اور نسیم کے پاس بات کرنے والے جو موضوعات تھے ان پر بات کرنے سے شیراز کو بری طرح غصہ آتا تھا۔

وہ اس بات پر صدمے سے بے حال ہوتے کہ ان کے بیٹے کی ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی اولاد کا امکان نظر آتا ہے۔ اپنی اگلی نسل انہیں دور دور تک کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اور صرف یہی سوچ کہ ان کی نسل ان کے بیٹے کے ساتھ ہی ختم ہونے والی ہے۔ اکبر اور نسیم کو بے حال نہ کرتی تو اور کیا کرتی۔

وقتاً فوقتاً وہ اب شیراز کو خفیہ طور پر دوسری شادی کا مشورہ بھی دینے لگے تھے۔ یہ صرف شیراز جانتا تھا کہ وہ اسے دوسری شادی کا نہیں، خود کشی کا مشورہ دے رہے ہیں۔ سعید نواز یا شینا سے دوسری شادی کا چھپا رہنا ناممکن تھا اور اس کے بعد پتا چلنے پر وہ اس کا جو حشر کرتے وہ شیراز کو ایسے کسی ارادے سے باز رکھنے کے لیے کافی تھا۔

جبکہ اکبر اور نسیم کا اصرار تھا کہ وہ دوسری شادی کر کے اپنی دوسری بیوی کو ان کے پاس رکھے۔ انہیں یقین تھا کہ شینا یا اس کے باپ کو اس کی شادی کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ انہیں اب اپنے بڑھاپے اور تنہائی کا خیال بھی پریشان کرتا تھا۔

بعض دفعہ شیراز واقعی دوسری شادی کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ واقعی فرض کر لیتا تھا کہ شینا اور سعید نواز کو اس کی شادی کے بارے میں پتا نہیں چلے گا۔ وہ اپنی بیوی کو یہاں اپنے ماں باپ کے پاس رکھے گا اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوگی۔ اور پھر اسے خیال آتا۔ لیکن اگر ہو گئی تو؟ اور اس تو کے بعد نظر آنے والی تصویر اتنی ہولناک تھی کہ اس کے سارے ارادے لمحہ بھر میں غائب ہو جاتے۔

وہ ایک دلدل میں پھنس چکا تھا جس میں وہ ہاتھ پاؤں مار سکتا تھا لیکن باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ کسی لڑکی کے ساتھ کوئی افیئر چلانا اور کچھ وقت گزارنا دوسری بات تھی لیکن کسی کو مستقل طور پر اپنی زندگی میں شامل کرنا ایک قدم تھا جو وہ اٹھانے کے قابل نہیں تھا اسے اپنے آس پاس ملنے جلنے والے افراد میں اب بہت سارے ایسے مرد نظر آنے لگے تھے جو اس جیسی ہی دوہری تہری زندگیاں گزار رہے تھے۔ بہت سارے ایسے مرد جنہوں نے کامیابی کے زینے چڑھنے کے لیے امیر سسرال کا سہارا لیا تھا۔ اور ان میں سے بظاہر کوئی ناخوش نظر نہیں آتا تھا ہر ایک کامیاب زندگی گزارتا نظر آ رہا تھا۔ ہر ایک کی زندگی میں وہ معجزے ہو چکے تھے جس کے لیے انہوں نے کامیابی کی یہ سیڑھی ڈھونڈی تھی۔ لیکن ہر ایک کی زندگیوں میں کہیں نہ کہیں وہ شگاف بھی نظر آتے تھے جو صرف شیراز یا شیراز جیسے دوسرے لوگ ہی دیکھ سکتے تھے۔ جو ویسی زندگیاں گزار رہے تھے اور جوان ماسک کو پہچان سکتے تھے جو وہ سب پہن کر ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے۔

☆☆☆

"کرم علی کو فون کرنا چاہیے آپ کو۔" سلطان نے اس سے کہا۔ وہ دو دن پہلے کرم علی کی فلم کی شوٹنگ کے لیے اوٹوا آئی تھی اور یہاں آتے ہی سلطان نے اسے بار بار کرم علی سے رابطے کے لیے کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے رابطے کا نہ بھی کہتا تب بھی زینی کو اوٹوا میں اس کے ساتھ گزرے ہوئے وہ دو ہفتے بری طرح یاد آنے لگے تھے اور اس کے ساتھ ہی کرم علی بھی۔

کیوں یاد آ رہا تھا یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"کیوں فون کرنا چاہیے مجھے؟" زینی نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

''آپ کو اچھا لگا تھا وہ پری جی۔'' سلطان نے اس کے کسی زخم کو چھیڑا تھا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے؟'' زینی نے مدھم آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں ہوتا کیا؟'' سلطان نے بے حد چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

''نہیں کچھ نہیں ہوتا۔''

''چلیں میں پراچہ صاحب سے کہوں گا وہی ملاقات کا انتظام کروا دیں۔ کھانا وانا تو کریں گے کرم علی صاحب ہر پروڈیوسر کرتا ہے۔'' سلطان نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''خبردار تم نے پراچہ سے اس سلسلے میں کوئی بات کی میں نے کہا نا مجھے کرم علی سے نہیں ملنا، نہ ہی بات کرنی ہے۔'' زینی نے بے حد سنجیدگی سے کہا اسے سلطان کی بات سے زیادہ اس کے انداز پر غصہ آیا تھا۔ سلطان اس وقت اسے غصے میں دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

اسے منع کرنے کے باوجود زینی کو جیسے کوئی موہوم سی امید تھی کہ وہ اتنے ہفتے کے قیام میں کبھی نہ کبھی اس سے رابطے کی کوشش کرے گا۔ وہ لاشعوری طور پر منتظر تھی کہ وہ کسی نہ کسی دن سیٹ پر شوٹنگ دیکھنے ہی آئے گا تو کرم علی نہیں آیا تھا۔

''آپ کو پتہ ہے کرم علی کی شادی ہو گئی ہے۔'' دو ہفتے کے بعد ایک دن سلطان نے منہ لٹکا کر زینی کو بتایا۔ وہ اس وقت سین کے دوران آنکھوں کے میک اپ کی ری ٹچنگ کر رہی تھی چند لمحوں کے لیے زینی کو ہاتھ میں پکڑے آئی شیڈز کے کلرز کو پہچاننا اور یہ طے کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ کون سا کلر استعمال کر رہی تھی۔ اس کا کوئی تعلق تھا کہ وہ چند لمحوں کے لیے اس طرح سکتے میں آئی تھی۔

''اچھا ہوا، تمہیں کس نے بتایا؟''

چند لمحوں کے بعد جیسے اس نے اس شاک سے خود کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایک بار پھر آئی شیڈز پر نظریں جمائے ہوئے ان کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف تھی۔

''کیا اچھا ہوا پری جی؟ مجھے تو ذرا خوشی نہیں ہوئی ان کی شادی کا سن کر۔'' سلطان نے منہ بسورتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہاری خوشی یا ناخوشی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سلطان کرم علی خوش ہے اپنی شادی سے۔ یہ کافی ہے۔''

اس نے بالآخر شیڈز پہچاننے شروع کر دیے تھے لیکن آواز کی لرزش پر قابو پانے میں اسے ابھی بھی وقت ہو رہی تھی۔

''آپ بھی صحیح کہتی ہیں پری جی؟ سلطان نے گہرا سانس لیا۔

''پر اچھا آدمی تھا اگر آپ '' سلطان نے بات ادھوری چھوڑ دی زینی نے سر اٹھا کر سامنے کوریوگرافر کو ایکٹرز کو ڈانس کی ریہرسل کرواتے ہوئے دیکھا آج اسے ایک ڈانس کی شوٹنگ کروانی تھی۔ زینی کا دل یک دم اچاٹ ہو گیا تھا۔

''سلطان اگر میں آج شوٹنگ نہ کرواؤں تو؟ پیک اپ ہو سکتا ہے کیا؟''

زینی نے سامنے لوگوں کو سین کی تیاری کرتے ہوئے سلطان سے کہا۔

سلطان نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس نے سیٹ پر اسے کرم علی کی شادی کے بارے میں بتا کر غلطی کی تھی لیکن غلطی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ شوٹنگ کے لیے وہاں تھی یہ کرم علی بھی جانتا تھا۔ اس کے پاس اس کے پینتیس دن کی شوٹنگ اور لوکیشنز کا پورا شیڈول تھا۔ وہ جانتا تھا آج وہ کہاں کیا شوٹ کروا رہی ہے۔ بہت دفعہ اس کا دل چاہا کہ وہ ایک بار اسے ملنے جائے یا فون کر کے اس سے بات کرے۔ بہت بار وہ فون ہاتھ میں لے کر بھی بیٹھا رہا اور ہر بار الفاظ تلاش کرتے کرتے فون رکھ دیتا۔

زری سے بات کرنے کے لیے اس کے پاس ہمت تھی الفاظ نہیں تھے۔ بہت دفعہ وہ اپنے آپ کو بار بار یہ بھی سمجھاتا رہا کہ وہ اس طرح مسلسل اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنی بیوی سے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ لیکن ہر بار وہ خود کو بے بس پاتا۔ یہ اس کا ذہن نہیں تھا جس کو وہ سمجھا نہیں پا رہا تھا یہ اس کا دل تھا جو کچھ بھی سننے پر تیار نہیں تھا۔

"سنا ہے آپ کی پسندیدہ ہیروئن پری زاد آئی ہوئی ہے آپ کی فلم کی شوٹنگ کے لیے اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

وہ اس رات سونے کے لیے لیٹ رہا تھا، جب زری کی بات پر ٹھٹھک گیا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے بظاہر ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

کرم علی کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر زری کو زینی کی وہاں آمد کے بارے میں پتا چل جائے گا لیکن یہ سب اتنا جلدی ہوگا۔ یہ اسے اندازہ نہیں تھا۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" کرم علی نے اس سے کہا۔

"اب آپ نے نہیں بتایا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی بھی نہیں بتائے گا۔" زری نے بے حد بے نیازی سے کہا۔

"میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ فلم میں کام کرنے آئی ہے اور کام کر کے چلی جائے گی۔"

"اب یہ تو آپ کو پتا ہوگا کہ وہ کیا کام کرنے آئی ہے اور کیا کام کر کے جائے گی، ویسے ہے خوب صورت ملوا ہی دیتے۔"

وہ اب دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ کرم علی نے جواب دینے کے بجائے خاموشی سے لیٹ جانا بہتر سمجھا، چند منٹوں تک کمرے میں خاموشی رہی۔ زری اب اٹھ کر VCD پر کوئی فلم لگانے میں مصروف تھی۔

چند لمحوں کے بعد اسکرین پر ابھرنے والی ایک آواز پر کرم علی جیسے کرنٹ کھا کر اٹھا تھا، زری اب پری زاد کی کوئی فلم لگانے کے بعد بے حد فاتحانہ انداز میں بیڈ کی طرف آرہی تھی۔ پری زاد اس سین میں ہیرو کے ساتھ بے خبر قابل اعتراض ڈائیلاگ بول رہی تھی۔

"بند کرواسے۔" کرم علی نے بے حد غصے میں زری سے کہا۔

"کیوں آپ کو اچھا نہیں لگا کیا؟" زری نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

کرم علی اشتعال کے عالم میں اٹھا اور اس نے ٹی وی آف کر دیا۔ زری سے ریموٹ مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے بری طرح تنگ کرتی۔

"اوہ! میں سمجھ گئی۔ پری زاد کی ایسی فلمیں تو آپ اکیلے بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔ میرے ساتھ تو اچھا نہیں لگے گا آپ کو اپنی فیورٹ ایکٹریس کو اس حالت میں دیکھ کر۔"

زری کرم علی کی حالت سے بری طرح محظوظ ہو رہی تھی۔

"کہاں سے لی ہے آپ نے یہ فلم؟" کرم علی نے واپس بیڈ پر آتے ہوئے کہا۔

زری نے بے حد ناز اور معصومیت سے آنکھیں گھماتے ہوئے چھت کو دیکھا اور پھر کہا۔

"دنیا میں پری زاد کی فلموں کے سب سے بڑے ذخیرے سے، جو میرے شوہر کے پاس موجود ہے۔"

کرم علی بے حس و حرکت بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ "آپ نے اس کمرے کو کھول لیا؟"

"کھولا نہیں تالا توڑنا پڑا چابی تو آپ کے پاس تھی۔" زری نے بڑے آرام سے کہا۔

"میں نے منع کیا تھا نا؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟" زری کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"زری! میں آج آپ کو آخری بار یہ بات سمجھا رہا ہوں کہ اگر میں یہ کہوں کہ آپ اس کمرے میں نہیں جائیں گی تو آپ نہیں جائیں گی اور اگر میں نے کہا کہ اس چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گی تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ہاتھ نہیں لگائیں گی۔" کرم علی نے شادی کے بعد پہلی بار اس سے اس طرح بات کی تھی۔ زری کو جھٹکا لگا تھا۔

"ورنہ آپ کیا کریں گے؟" "میں آپ کو divorce (طلاق) کر دوں گا۔"

کئی منٹ تک زری کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی وہ جیسے اس وقت سکتے میں آ گئی ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک جو بات معمولی سی تھی، اس پر کرم علی کا اس طرح کا ردعمل کرم علی نے اٹھ کر VCD سے فلم نکالی اور کمرے سے نکل گیا۔ زری نے ایک فلم کے علاوہ وہاں سے کوئی اور چیز نہیں لی تھی۔ البتہ اس نے اس کمرے میں ہر چیز چیک ضرور کی تھی۔ میگزینز بھی بے حد بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے۔ ایک نظر ڈالتے ہی کرم علی کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد وہ جب واپس کمرے میں آیا تو زری سو چکی تھی یا کم از کم سونے کی ایکٹنگ ضرور کر رہی تھی۔

کرم علی بھی سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ فوری طور پر نیند کا آنا مشکل تھا۔ وہ زری کی اس حرکت سے بہت بری طرح اپ سیٹ ہوا تھا۔

اگلے چند دن زری بے حد خاموش رہی جبکہ کرم علی معمول کے انداز میں اس سے بات کرتا رہا۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ زری دوبارہ اس کمرے میں نہیں گئی تھی نہ اس نے پری زاد کا ذکر کیا تھا۔ اس لیے وہ غیر محسوس طور پر زری کی دل جوئی کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ اسے واقعی احساس ہوا تھا کہ اس نے ایک بہت چھوٹی بات پر طلاق کی دھمکی دی تھی۔

اگلے چند دن وہ زری کو بہت اچھی اچھی جگہوں پر کھانا کھلانے لے جاتا رہا۔ اس نے زری کو جی بھر کر شاپنگ کرنے کا موقع بھی دیا تھا۔

کیونکہ وہ جانتا تھا کوئی اور چیز زری کا موڈ ٹھیک کرے یا نہ کرے روپے کو بے دردی سے خرچ کر کے وہ ضرور خوش ہو جاتی تھی اور زری کا موڈ واقعی ٹھیک ہو گیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے کرم علی سے اپنے رویے کے لیے معذرت بھی کر لی تھی۔ شادی کے کئی مہینوں میں یہ پہلی معذرت تھی جو زری کی جانب سے آئی تھی اور کرم علی کے لیے یہ بے حد خوش کن بات تھی۔

لیکن دو ہفتوں کے بعد ہی زری نے کرم علی کی عدم موجودگی میں اس کی ماں کے گھر آنے پر اس کی بے حد بری طرح بے عزتی کرتے ہوئے اسے صاف لفظوں میں اپنے گھر آنے سے منع کیا تھا۔ کرم علی کی ماں کی زری کے ساتھ وقتاً فوقتاً چھوٹی موٹی چپقلش تو ہوتی رہتی تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ زری اور اس کے درمیان اتنا بڑا جھگڑا ہوا۔ کرم علی کی ماں اس وقت گھر سے چلی گئی تھیں لیکن اس نے کرم علی کے آنے پر ہچکیاں لے کر روتے ہوئے اسے زری کی باتیں بتائیں نہ صرف یہ بلکہ اس نے کرم علی سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ اسے ایسی بیوی کو طلاق دے دینی چاہیے جو اس کی ماں کے ساتھ اتنی بدتمیزی کر رہی ہے۔

''اس مصیبت میں آپ نے پھنسایا ہے مجھے۔'' کرم علی نے زچ ہو کر کہا۔ ''آپ کو شوق تھا میرے لیے کم عمر اور خوبصورت بیوی لانے کا اب وہ آ گئی ہے اور میں بھگت رہا ہوں تو آپ بھی بھگتیں۔''

''غلطی ہو گئی مجھ سے کہ جو میں نے تمہاری تب نہ سنی۔ بھک منگوں کے خاندان سے رشتہ جوڑ لیا۔ کیسی سیدھی اور معصوم لگتی تھی اور اب اس کے منہ میں زبان کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں کرم! فارغ کر واسے۔ میں اس سے اچھی جگہ تمہاری شادی کرواؤں گی بلکہ اس بار تمہاری مرضی سے سب کچھ ہو گا جہاں تم کہو گے وہاں شادی ہو گی تمہاری۔'' کرم علی ماں کے چہرے کو دیکھ کر رہ گیا۔

ان کے لیے اس کی شادی کا ہونا اور ختم ہونا اتنی معمولی بات تھی کہ وہ چٹکی بجاتیں اور وہ یہ کر دیتا۔ عجیب سی گھٹن تھی جو وہ اس وقت ماں کی باتیں سنتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

''میں زری کی طرف سے آپ سے معذرت کرتا ہوں بلکہ میں زری کو سمجھاؤں گا۔ وہ بھی معذرت کرے گی آپ سے۔ دوبارہ کبھی اس کی شکایت نہیں ہو گی آپ کو۔'' اس کی ماں اس کی باتوں پر بری طرح برافروختہ ہو گئیں۔

''تمہارا خیال ہے کہ میں نے اس وقت تمہیں زری سے معافی منگوانے کے لیے یہاں بلوایا ہے؟ ماں کی بے عزتی تمہارے نزدیک کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔ ٹھیک کہتے ہیں تمہارے بہن بھائی کہ تم شادی کے بعد بالکل بدل گئے ہو۔ بیوی کے علاوہ تمہیں کوئی نظر ہی نہیں آتا۔''

''کرم علی ان سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ اس نے زندگی میں ہمیشہ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کو خاموشی سے سنا تھا۔ اس وقت بھی سن رہا تھا۔

تقریباً تین گھنٹے وہاں بیٹھنے کے بعد وہ واپس گھر آیا۔ زری کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنی ماں کے پاس سے ہو کر ہی وہاں آئے گا۔ وہ اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔ اور بے حد غصے میں بھی۔

''امی کے ساتھ جھگڑا کیوں کیا آپ نے؟''

"میں نے جھگڑا نہیں کیا؟ آپ کی امی یہاں آئی جھگڑا کرنے کے لیے تھیں۔" زری جیسے منتظر تھی کہ کرم علی بات کرے اور وہ شکایتوں کا انبار لا کر اس کے سامنے رکھ دے۔

"میں تنگ آ گئی ہوں ان کے روز روز کے طعنوں اور باتوں سے۔ ہر وقت ان کی زبان پر یہی ہوتا ہے کہ ان کے بیٹے کا پیسہ میں اپنے گھر والوں کو بھیج رہی ہوں۔ آپ نے میرے باپ کو ایک گھر کیا خرید دیا۔ آپ کے سارے گھر والے پیچھے پڑ گئے ہیں میرے۔ ہر وقت ان کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی ہے۔ میں ان کے بیٹے کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہوں۔"

کرم علی فوری طور پر زری کی باتوں پر بھی کچھ نہیں کہہ سکا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس کے گھر والے وقتاً فوقتاً اپنے سسرال کی، کی جانے والی امداد کو بے حد ناپسند کرتے تھے۔ پاکستان میں زری کے خاندان کا گھر بدلنا اور اس کے بہتر ہوتے ہوئے حالات کرم علی کے خاندان کے مختلف لوگوں کے ذریعے کرم علی کے گھر والوں تک پہنچ جاتے تھے اور یہ کس کے طفیل ہو رہا تھا یہ جاننے میں انہیں دیر نہیں لگتی تھی۔

"میں اپنے خاندان اور خاندان سے باہر جانے والے مستحق لوگوں کو ہر سال لاکھوں روپیہ دیتا ہوں خیرات اور زکوٰۃ میں اگر اپنے سسرال والوں کی تھوڑی بہت مدد کر دیتا ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ مستحق تو وہ بھی ہیں۔ اگر تھوڑی آسانی ان کی زندگی میں میری وجہ سے آ گئی ہے تو کیا ہو گیا ہے۔ میرے بزنس اور بینک بیلنس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔"

وہ جو زری سے سن رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اپنی ماں سے بھی سن آیا تھا اور اس نے اس اعتراض پر ماں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی جس پر اس کی ماں نے برا مانا تھا۔ اب زری دوبارہ وہی الزام دہرا رہی تھی تو کرم علی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اسے کیسے کہے۔ وہ باتیں سن کر کسی کو بھی غصہ آتا۔ اگر زری کو آ گیا تھا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔

"آپ جو کچھ میرے گھر والوں کو دیتے ہیں۔ ایک ایک چیز کے بارے میں اپنی ماں کو بتاتے ہیں۔ یہ ساری بے عزتی آپ کی وجہ سے ہوتی ہے میری۔"

"زری! میں نے کبھی اپنی ماں یا کسی بہن بھائی کو یہ نہیں بتایا کہ میں آپ کے گھر والوں کو کیا دیتا ہوں جیسے آپ کو میں نے یہ نہیں بتایا کہ میں اپنے گھر والوں کو کیا دیتا ہوں۔ میرے لیے آپ کی فیملی اور اپنی فیملی میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

"تو پھر کیسے پتا چلتا ہے انہیں کہ۔"

"پاکستان میں بہت رشتہ دار ہیں ہمارے جن کا آپ کا گھر آنا جانا ہے۔ آپ کے گھر والے ذکر کرتے ہوں گے یا ذکر نہ بھی کریں وہ اندازہ کر سکتے ہیں۔ آپ کی فیملی نے گھر بدلا ہے گاڑی رکھ لی ہے انکل کاروبار کرنے لگے ہیں تو" کرم علی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اب آپ بھی ایک ایک چیز جتائیں مجھے۔ بالکل اپنی ماں کی طرح۔ اسی لیے میرا ان کی شکل دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ہر ہفتے آ جاتی ہیں یہاں اپنے گھر کیوں نہیں رہ سکتیں وہ؟" زری نے اس کو بولنے نہیں دیا۔

"وہ ماں ہیں میری اور یہ ان کے بیٹے کا گھر ہے۔ میری ماں جب چاہیں گی یہاں آئیں گی۔"

"جانتی ہوں میں کہ یہ ان کے بیٹے کا گھر ہے۔ میں نے کب کہا کہ یہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ یہ آپ کی ماں کا گھر ہے۔ آپ کے بہن بھائیوں کا گھر ہے اور آپ جیسے جو مرد ہوتے ہیں نا، انہیں شادی نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں بس ساری عمر اپنی ماں اور بہن بھائیوں کا طواف کرنا چاہیے۔ ویسے بھی اتنی عمر تو گزر گئی تھی آپ کی۔ باقی بھی گزار دیتے۔ میری زندگی برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بیوی کی تو آپ کو ضرورت ہے ہی نہیں۔ ماں ہے نا آپ کے لیے۔"

زری آج پھر اپنے پرانے موڈ میں تھی۔ وہ بری طرح چلانے لگی۔

کرم علی ہونٹ کاٹتا رہا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔

"اپنے اپنے گھروں میں کیوں نہیں آرام سے رہ سکتے یہ سب لوگ جب ان کو پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بھیج دیتے ہیں آپ کی ماں کو یہاں۔"

"Stop it Zarri" کرم کو اس کی بات چابک کی طرح لگی۔

"آپ کو نظر کیوں نہیں آتا کہ یہ سب لوگ آپ کو استعمال کر رہے ہیں۔ بس آپ کے پیسے میں دلچسپی ہے ان سب کو اور آپ کو کیا لگتا ہے۔ یہ بھائی جان، بھائی جان کی گردان آپ کی محبت میں ہوتی ہے۔"

وہ اسے وہ آئینہ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی جس میں کرم علی پہلے ہی سب کا عکس دیکھ چکا تھا۔ خود زری کا بھی اس کے باوجود زری کے منہ سے یہ سب سن کر اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ کیا اس کے سارے خونی رشتے اتنے ہی کھوکھلے اور مادہ پرست تھے کہ زری جیسی کم عمر اور جاہل لڑکی بھی ایک سال سے کم عرصے میں ان کے بارے میں یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔

زری اس کی خاموشی سے شیر ہو گئی اسے لگا اس کی باتوں نے کرم علی کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک اسی طرح نان اسٹاپ دل کا غبار نکالتی رہی اور کرم علی بے حد خاموشی سے صوفے پر بیٹھا اس کی ساری باتیں سنتا رہا۔ وہ زندگی میں بہت بار ایسے ہی مرحلوں سے گزرا تھا جب اس نے خود کو اتنا ہی بے بس محسوس کیا تھا۔

جب اس کے دل کا غبار اچھی طرح نکل گیا تھا تو وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اسے کرم علی سے صرف اتنی ہی باتیں کرنا تھیں جو وہ کر چکی تھی۔

اس رات پہلی بار کرم علی نے زری کے والدین سے اس کے رویے کی شکایت کرنے کی سوچی۔ ان کی بیٹی اگر اس کے لیے مسئلے کھڑے کر رہی تھی تو انہیں یہ پتا ہونا چاہیے تھا۔ وہ خود ہر مسئلہ حل کرتے کرتے تھک گیا تھا۔

اگلے دن اس نے آفس سے زری کے گھر فون کر کے اس کے باپ سے بات کی اور وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس نے کرم علی پر غیر عورتوں سے تعلقات سے لے کر اسے پیٹنے اور گھر میں قید کرنے تک ہر طرح کا الزام لگایا تھا یہ سب اسے زری بتاتی رہی تھی۔ کرم علی یہ سب کچھ سن کر بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

"میں پھر بھی چاہتا ہوں بیٹا کہ تم دونوں خوش رہو۔ بیٹی کی شادی ایک بار کر دی ہے۔ بار بار تو نہیں کر سکتا۔ تم اسے خوش رکھو گے تو وہ تمہاری خدمت کرے گی۔ میری تو ہر بیٹی کی قسمت ہی خراب ہے۔"

زری کا باپ رو پڑا اور کرم علی اپنے سارے گلے شکوے بھلا کر اسے تسلیاں دینے اور وعدے کرنے لگا تھا۔ وہ اچھی طرح اندازہ کر سکتا تھا کہ حمید الدین کے اسٹیٹس کے آدمی کے لیے بیٹیوں کو بیاہ دینا کیا معنی رکھتا تھا۔ وہ اس کی مجبوری کو سمجھ سکتا تھا۔

گھر آ کر اس نے زری سے حمید الدین سے ہونے والی گفتگو کو ڈسکس نہیں کیا۔ وہ کل کی طرح آج بھی کوئی پنڈورا باکس نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ گفتگو پہلے ہی زری تک پہنچ چکی ہوگی۔ وہ اگلے چند دن بے حد خفا پھرتی رہی اور کرم علی اسے اس دن کے جھگڑے کا نتیجہ سمجھتا رہا۔ لیکن ایک ہفتے کے بعد زری نے بالآخر زبان کھول کر کرم علی کو بتا دیا کہ اسے اپنے باپ کے ذریعے کرم علی کی ساری شکایات کا پتہ چل چکا ہے۔ کرم علی نے جواباً اس سے ان الزامات کے بارے میں پوچھ جو وہ اپنے گھر والوں سے اس کے بارے میں لگاتی رہی تھی۔ زری نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اعتراف کیا کہ وہ یہ سب کچھ کہتی رہی ہے کیونکہ اسے پہلے ہی یقین تھا کہ کرم علی بھی نہ کبھی اس کے ماں باپ سے اس کی شکایت ضرور کرے گا۔

زری کے ساتھ سر کھپانا وقت ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ ناقابل اصلاح تھی اور بدقسمتی سے اس کی بیوی بن چکی تھی۔

اور اس سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ کرم علی فطرتاً نرم دل شخص تھا وہ اپنے سے وابستہ کسی بھی شخص کو تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔ حقوق و فرائض کے بارے میں کسی اور کا حساب کتاب غلط ہو جاتا تو ہو جاتا لیکن کرم علی کا نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

فاروق کے گھر والے واقعی شریف لوگ تھے اور لالچی بھی نہیں تھے۔ یہ ربیعہ کو شادی والے دن ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ شادی اسی طرح سادگی سے ہوئی تھی جس طرح اس نے چاہی تھی اور وہ دل میں بے پناہ خدشات لے کر سسرال گئی تھی۔ ایک خالی ہاتھ گھر آنے والی بہو کو جتنے بھی خدشات ہوتے وہ کم تھے۔ لیکن اس گھر میں اس کا شاندار استقبال ہوا تھا۔ ایسا گرم جوش استقبال کہ ربیعہ کو اپنی قسمت پر یقین نہیں ہوا تھا۔ سسرال میں کوئی ایسا نہیں تھا جس نے خالی ہاتھ آنے پر اسے طعنہ دیا ہو یا اسے جتایا ہو نہ ہی کسی نے زینی کے فلمی کیریئر کے حوالے سے کوئی نامناسب بات کی تھی۔

ان میں سے جو بھی زینی کے بارے میں یا اس کے خاندان کے بارے میں بات کرتا، بڑی عزت اور چاہت سے کرتا اور ایسی ہی عزت اور چاہت ربیعہ کو فاروق سے ملی تھی۔ وہ واقعی خود اپنی قسمت پر رشک کرنے لگی تھی۔

ربیعہ نے ساری عمر کے لیے ان کی عزت اور اطاعت کرنے کی قسم کھائی تھی اور اس نے ایسا کر کے دکھایا تھا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی اس نے گھر کا کام کاج اپنے ساس سسر کے منع کرنے کے باوجود سنبھال لیا تھا۔ فاروق کے پی ایچ ڈی کے لیے باہر جانے میں ابھی چند ماہ لگنے تھے اور وہ اس وقت تک جی بھر کر اپنے سسرال والوں کی خدمت کرنا چاہتی تھی اور اس کی خدمت سب کی نظروں میں اس کا مقام اور بڑھا رہی تھی۔

اس نے اپنے میکے آنا تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا جب آتی فاروق کے ساتھ آتی اور اسی کے ساتھ چلی جاتی اور جب کبھی اکیلی آتی تو جتنی دیر وہاں بیٹھتی، اس کی زبان پر اپنے سسرال والوں اور فاروق کی تعریفوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا اور اس کی تعریفوں میں غرور کا رنگ بھی آ جاتا اگر زینی وہاں موجود ہوتی۔ وہ جیسے اسے جتا دینا چاہتی تھی کہ اس نے اس کے سارے دعوے اور ساری فلاسفی کو زیر و زبر کر دیا تھا۔

وہ جس چیز پر یقین رکھتی تھی، وہ سچ ثابت ہوئی تھی۔ زینی نے اس کی شادی کے بعد پہلے کی طرح کبھی اس سے بحث نہیں کی۔ وہ

صرف مسکراتے ہوئے ربیعہ کی باتیں سنتی رہتی۔ ربیعہ جانتی تھی وہ مسکراہٹ نہیں شرمندگی تھی۔ وہ اب اس کے ساتھ بحث کر بھی کیسے سکتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ وہ اسکا احسان لیے بغیر اس گھر سے جائے گی تو وہ اس کا احسان لیے بغیر گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس کے پیسے پر اپنے گھر کی بنیاد نہیں رکھے گی تو اس نے نہیں رکھی تھی۔ اسے یقین تھا، دل ہی دل میں زینی بہت نادم ہوتی ہوگی اس کی باتوں کو سن کر۔

شادی کے دوسرے ہی ماہ ربیعہ پریگنٹ ہوگئی تھی۔ وہ ان دنوں جیسے ساتویں آسمان پر تھی ورشاید ساتویں آسمان پر ہی رہتی اگر فاروق کے ساتھ پی ایچ ڈی کے لیے یوکے جانے سے پانچ دن پہلے وہ فاروق کے بریف کیس میں بیس لاکھ کا ایک چیک نہ دیکھ لیتی جس پر زینی کا نام تھا۔

آسمان سے گرنا اور آسمان سر پر گرنا کسے کہتے ہیں ربیعہ نے اس چیک کو اپنے کانپتے ہاتھوں میں لیتے ہوئے جانا۔ اس پر دو دن پہلے کی تاریخ تھی اور وہ ایک غیر ملکی بینک کا چیک تھا۔ کچھ دیر کے لیے ربیعہ نے اپنے آپ کو بہت سے فریب دینے کی کوشش کی تھی شاید اسے ضرورت پڑی ہو باہر جانے کے پیسے اور اس نے پہلی بار زینی سے پیسے لیے ہوں، شاید اس نے زینی سے یہ رقم کچھ عرصہ کے لیے قرض کے طور پر لی ہو۔ شاید زینی نے یہ رقم کسی کام سے اسے دی ہو۔ مدد کے لیے نہیں کسی اور کام سے۔

پھر اس نے ہر فریب اور جواز کو ایک طرف رکھ کر فاروق کے بریف کیس کی تلاشی لی اور ہر فریب پل بھر میں ختم ہو گیا۔ اس کے بریف کیس سے دو اور ڈیپازٹ سلپس نکلی تھیں پرانی تاریخوں کی۔ ایک اس کی شادی سے ایک ہفتہ پہلے کی تھی۔ اور دوسری بیس لاکھ کی ڈپازٹ سلپ اس کی شادی والے دن کی تھی فاروق کو دوبارہ وہی اتنی رقم دے سکتا تھا جو تیسری بار بھی دے رہا تھا۔ زینی نے ثابت کر دیا تھا۔ وہ واقعی بازار میں کھڑے کسی بھی شخص کو خرید سکتی تھی اس کی اچھائی، شرافت اور نیکی کے ساتھ۔ اس نے فاروق اور اس کے گھر والوں کو ربیعہ کی خواہش پر خرید کر اسے تحفے میں دے دیا تھا۔ کب خریدا تھا؟ کیسے خریدا تھا؟ کیا قیمت طے ہوئی تھی؟ یہ سارے سوال اب بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔

فاروق اور اس کے سسرال والوں کے بت پل بھر میں کرچیوں میں ٹوٹ کر گرے تھے۔ وہ شریف لوگ تھے۔ اسے شبہ نہیں تھا لیکن اس شرافت میں کتنا حصہ اس کی بہن سے ملنے والے ایچکس کا تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔

وہ اس کی دل سے قدر کرتے تھے لیکن اس قدر و قیمت کا کتنا حصہ اس کی اپنی ذات اور خوبیوں کا تھا اور کتنا زینی کی طاقت کا، وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی پر بہت کچھ پل بھر میں ختم ہو گیا تھا۔ اس کی عزت نفس، خود اعتمادی، انا سب کچھ ایک پل میں مٹی کا ڈھیر ہو گیا تھا۔

اسے زینی سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ لیکن سوال اب اس نفرت کا نہیں تھا۔ سوال صرف اس بھرم کا تھا جو اس کے شوہر، سسرال والوں اور اس کے درمیان تھا۔ وہ ان چیکس کے بارے میں ان سے پوچھتی تو وہ بھرم، وہ فریب اٹھ جاتا جس نے ان سب کو ایک بندھن میں باندھا ہوا تھا۔

وہ فاروق کا گریبان پکڑ کر اس سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس کے شوہر کا گریبان تھا۔ زینی نے سب کچھ راز رکھا تھا۔ اس نے چیک اسی خاموشی کے ساتھ بریف کیس میں رکھتے ہوئے جیسے اس راز کو راز رہنے دیا۔

بعض دفعہ جان بوجھ کر اندھا ہو جانا بہتر ہوتا ہے۔ وہ بھی ہو گئی تھی۔ لیکن آج سے پہلے اس نے اپنے آپ کو اتنا بے مول نہیں پایا تھا۔ اسے بھی پیسے کے ترازو سے ہی تول کر اس کی قیمت لگائی گئی تھی اس کے وصف اور خوبیوں کا خریدار کوئی نہیں نکلا تھا۔

یو کے جانے سے پہلے پاکستان میں آخری چار دنوں میں اس نے اپنی سسرال میں کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اب اسے دل جیتنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی بہن اس کے لیے ان کے دلوں کو پہلے ہی خرید چکی تھی۔ وہ اس کے تھے۔ وہ انہیں مٹھی میں رکھتی یا پیر کے نیچے سارا اختیار اس کا تھا۔

وہ آخری دن فاروق کے ساتھ اپنے گھر والوں سے ملنے آئی تھی اور ربیعہ سے بھی ملی تھی اور اس ملاقات کے دوران زینی اسے اندر اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ اس نے ربیعہ کے لیے چند تحائف خریدے تھے۔ ربیعہ نے ان چیزوں کو اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا۔ زینی سکتے میں آ گئی۔

"میں آج آخری بار تمہاری شکل دیکھ رہی ہوں۔ تم بھی دیکھ لو۔ دوبارہ تمہارا اور میرا کبھی سامنا نہیں ہوگا۔ تم نے مجھے برباد کر دیا زینی۔"

وہ اب رو رہی تھی۔ اتنے دنوں سے اندر پکنے والا لاوا بہہ نکلا تھا۔ زینی کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ اسے ربیعہ سے ایسے ہی ردعمل کی توقع تھی اگر وہ یہ سب کچھ جان جاتی تو۔

"میں نے یہ سب کچھ تمہارے لیے کیا... تمہاری خوشی کے لیے!" اس نے بے قرار ہو کر کہا۔

"تم محبت کرتی تھی فاروق سے۔ شادی کرنا چاہتی تھی۔" اس نے جیسے ربیعہ کو یاد دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں۔ محبت کرتی تھی فاروق سے۔ شادی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن... لیکن تمہارے خریدے ہوئے Parasite سے نہیں میں ایک ایسا شوہر چاہتی تھی جو مجھ سے میری وجہ سے محبت کرے۔ تم نے مجھے... " وہ روتے ہوئے مکمل نہیں کر سکی۔

"فاروق برا آدمی نہیں ہے۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ پیسے سے وقتی طور پر اس کی اور اس کے گھر والوں کی کچھ ضرورتیں ضرور پوری کی ہیں میں نے، لیکن وہ اچھے لوگ ہیں ربیعہ، برے ہوتے تو؟"

ربیعہ نے جیسے بے حد غصے میں اس کی بات کاٹی۔ "ہاں اچھا آدمی ہے وہ لیکن تم نے اس اچھے آدمی کے دل میں لالچ کا بیج بو دیا ہے۔ اب یہ بیج پھل دار درخت بنے گا اور میں ساری عمر اس درخت کا پھل کھاؤں گی۔ تم نے پتہ ہے کیا کیا ہے زینی! تم نے میرے شوہر پر میرا سارا مان، سارا فخر، سارا غرور مٹی میں ملا کر رکھ دیا ہے۔ میں ساری عمر اس کے لہجے میں چھلکتی محبت اور نرمی میں تمہارے پیسے کی بو سونگھتی پھروں گی۔ اس لمحے میں بھی جب وہ واقعی دل سے مجبور ہو کر مجھ سے میرے لیے کسی سچے جذبے کا اظہار کر رہا ہوگا اور میں اپنے باپ جیسے کسی دراز قامت مرد کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی جس کی جیب میں سکے بے شک کم ہوں مگر اس کی خودداری آسمان سے باتیں کرتی ہو۔ تم نے مجھے ایک بونے کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جس کی جیبوں میں تمہارے بھرے ہوئے سکوں کے بوجھ نے اس کو میرے سامنے سیدھا کھڑے ہونے کے قابل نہیں چھوڑا۔ تم نے محبت خریدی ہے میرے لیے؟ تم نے محبت نام کی شے میری زندگی میں غائب کر دی ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ زینی تڑختے وجود کے ساتھ کمرے میں رہی۔ چند ماہ میں یہ دوسری بار ہو رہا تھا کہ وہ اپنے خونی رشتوں کے ہاتھوں اس طرح دھتکاری گئی تھی۔

پہلی بار تب جب سلمان اس سے ملے بغیر امریکہ چلا گیا تھا۔ حالانکہ وہ اسے رخصت کرنے کے لیے اپنی ایک شوٹنگ چھوڑ کر گھر آئی تھی۔ وہ تب تک اپنے چند دوستوں سے ملنے نکل گیا تھا اور پھر وہیں سے ایئرپورٹ چلا گیا۔ زینی نے اسے فون کیا اور اس سے نہ ملنے پر ناراضی کا اظہار کیا۔

''آپ سے ملنا ضروری نہیں تھا۔ اس لیے نہیں ملا میں''، اس نے سرد لہجے میں زینی پر بھی اتنی ہی برف ڈال دی تھی۔

''جن سے ضروری تھا، ان سے مل آیا ہوں۔'' وہ باقی بہنوں کی بات کر رہا تھا۔ زینی کو لگا وہ اس کے وجود پر آرا چلا رہا تھا۔ وہ اس کا ماں جایا تھا، اس کا اکلوتا بھائی تھا۔

''آپ کی وجہ سے تو ملک بدر ہو رہا ہوں میں۔ ذلت کا یہ انبار آپ میرے سر پر نہ لادتیں تو آج مجھے اس طرح اس عمر میں امی کو چھوڑ کر نہ جانا پڑتا۔''

زینی کے جیسے کاٹو تو لہو نہیں تھا۔ وہ زندگی میں بہت کم اس طرح گونگی ہوئی تھی۔ وہ پانچ سال چھوٹا تھا اس سے اور پچھلے چند سالوں میں اس کا کبھی اس طرح کا آمنا سامنا اس سے نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے منہ پر اسے یہ سب کچھ کہتا۔ آج وہ سامنا ہو گیا تھا اور کیا وقت تھا ''سامنے'' کا۔

''آپ نے ہمارا گھر، ہماری زندگی برباد کر دی۔'' وہ تلخی سے کہہ رہا تھا۔

''میں تو دوبارہ آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ آپ سمجھ لیں کہ آپ کا کوئی بھائی ہے ہی نہیں، جیسے میں نے سمجھ لیا ہے کہ میری صرف دو بہنیں ہیں۔''

زینی نے فون بند کر دیا تھا۔ مزید سننے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

دنیا کی کہی ہوئی بات اور اپنوں کی کہی ہوئی بات میں فرق یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی کہی ہوئی بات پہلے تکلیف دیتی ہے پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے۔ اپنوں کی کہی ہوئی باتوں کی کبھی عادت نہیں ہوتی۔ ہر بار وہ سننے پر تکلیف پہلے سے زیادہ بڑھتی ہے۔

اس نے سلمان سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا۔ اسے یقین تھا۔ دوسرے پہلے ہی جانتے تھے کہ سلمان اس سے مل کر کیوں نہیں گیا۔ اس کے اندر زینی کے خلاف جو نفرت اور زہر تھا۔ وہ اس نے اگر اس سے نہیں چھپایا تو کسی دوسرے سے کیا چھپایا ہوگا۔

کئی ہفتے وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب رہی تھی۔ سلمان کی باتیں اس کے ذہن سے نکل ہی نہیں رہی تھیں اور جب بالآخر وہ اس قابل ہوئی کہ وہ ان باتوں کو ذہن سے نکال سکے تو اب ربیعہ کی باتوں کی بازگشت اسے کانٹوں پر سلانے کے لیے آ گئی تھی۔

وہ دنیا کے لیے پری زاد تھی انڈسٹری کی طاقتور ترین ہیروئن ایک دنیا جس پر مرتی تھی، جس کی کامیابی پر رشک کرتی تھی۔ جس کی ابرو کے اشاروں پر بہت سے لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوتا تھا، جو انڈسٹری میں ہر حساب صاف کرنے میں یقین رکھتی تھی اور صحیح وقت پر پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لینے میں مہارت رکھتی تھی۔

پری زاد کی لغت میں انڈسٹری کے کسی فرد کے لیے معافی کے لفظ کا اندراج نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنی ذاتی زندگی میں زینی تھی۔ بدقسمت زینی جو اپنے بہن بھائیوں پر جان دینے میں یقین کرتی تھی اور ان کی نفرت کو اپنے لیے محبت میں بدلنے پر قادر نہیں تھی۔ اس حقیقت کو جاننے کے باوجود وہ ان کو دنیا کی ہر تنگی، ہر تکلیف سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی، یہ اندازہ کیے بغیر کہ وہ انجانے میں ان کے رستے میں کانٹوں کا جال بچھا رہی تھی۔

☆☆☆

"میں ایک دو ماہ بزی ہوں۔ مصروفیات کم ہوتی ہیں تو پھر پاکستان کا چکر لگا آتے ہیں۔"

زری کافی دنوں سے کرم علی سے پاکستان چلنے کا مطالبہ کر رہی تھی۔ یہ بھوت بھی بیٹھے بٹھائے اس کے سر پر سوار ہوا تھا ورنہ وہ جب سے یہاں آئی تھی اس نے پاکستان جانے کا نام نہیں لیا تھا لیکن اب اچانک اس نے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا۔

کرم علی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسے واقعی سال ہونے والا تھا۔ وہ نہ بھی کہتی تو وہ خود اسے پاکستان لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے اپنے کچھ ایسے کام آ گئے تھے کہ وہ فوری طور پر پاکستان جانے کے لیے وقت نہیں نکال سکتا تھا اور یہی بات اس نے زری سے کہی تھی لیکن زری اس کی بات پر یک دم جیسے چپ سی ہو کر رہ گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" کرم علی کو لگا وہ خفا ہو گئی ہے۔

"آپ مصروف ہیں تو آپ نہ جائیں۔ آپ ویسے بھی وہاں جا کر کیا کریں گے؟"

"سب لوگوں سے ملوں گا۔ رشتہ داروں وغیرہ سے۔ کہیں سیر و تفریح کے لیے چلے جائیں گے۔" کرم علی نے کہا

"نہیں۔ کتنی دیر رشتہ داروں سے مل سکتے ہیں یا سیر و تفریح کر سکتے ہیں۔ آپ اکیلے رہ کر تنگ آ جائیں گے۔"

"اکیلا کیوں ہوں گا؟ آپ ہوں گی نا میرے ساتھ۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں گی یا اپنے ماں باپ کے ساتھ؟ مجھے اپنے اتنے ہزاروں کام ہوں گے۔ آپ کا دم چھلا بن کر تو نہیں رہ سکتی میں۔ آپ مجھے بھجوا دیں۔ آپ بعد میں بھی سب سے ملنے چلے جائیں جب آپ کی امی جائیں۔"

زری نے جیسے مسئلہ ہی ختم کر دیا تھا۔

وہ اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اکیلے جانا چاہتی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی کرم علی نے آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ پاکستان میں اس کے اب کوئی ایسے رشتہ دار تھے تو وہ اس کا سسرال تھا اور اگر اس کی بیوی کو ہی اس میں دلچسپی نہیں تھی کہ وہ ان سے ملتا یا ان کے ساتھ وقت گزارتا تو اس کے پاس بھی اتنا فالتو وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی کے سر پر زبردستی مسلط کرتا۔

اس نے اس کے پاکستان جانے کا انتظام کر دیا تھا اور زری ان دنوں اس کے لیے سراپا شہد بنی ہوئی تھی۔ کرم علی بعض دفعہ سوچتا کہ اگر واقعی وہ ایسی ہوتی تو وہ اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا لیکن وہ جانتا تھا۔ یہ مٹھاس اور نرمی صرف پاکستان جانے تک رہے گی۔ واپس آنے پر زری کے لہجے میں اس کے بے کیا ہوگا۔ یہ اس وقت زری کی کوئی ضرورت طے کرے گی۔

وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ کے لیے پاکستان گئی تھی۔ اور کرم علی نے بڑی شدت سے گھر میں اس کی کمی کو محسوس کیا تھا۔ اچھی یا بری وہ جیسی بھی تھی لیکن وہ اس گھر میں اسے کمپنی دینے والا واحد وجود تھا جس سے وہ کوئی بات کر سکتا تھا ورنہ وہ اس گھر میں واقعی سونے کے لیے آتا تھا۔ خوشگوار حیرت اسے اس بات پر ہوئی تھی کہ زری نے پاکستان پہنچنے پر تقریباً ہر روز بلا ناغہ اسے فون کرنا اپنا معمول بنا لیا تھا اور ہر بار فون پر وہ کرم علی سے بڑے اچھے انداز میں عزت کے ساتھ بات کرتی۔ ابتدائی چند کالز کے بعد وہ اسے خود کال کرنا چاہتا تھا لیکن زری نے اسے منع کر دیا تھا۔

"میں خود ہی فون کر لیا کروں گی آپ کو۔ گھر پر تو آج کل ویسے بھی ہوتی نہیں ہوں میں۔ ابھی ہم سیر کے لیے مری آئے ہوئے ہیں سب گھر والے پھر بعد میں ایک دو اور شہروں میں بھی جاؤں گی۔ ابو کہہ رہے تھے، سارے رشتہ داروں سے مل جاؤں۔ سب پوچھتے ہیں، اس لیے آپ سے کہہ رہی ہوں کہ میں خود فون کر لیا کروں گی آپ کو۔ جب بھی مجھے فرصت ملے گی۔"

کرم علی کو اس کی بات نامناسب لگی تھی۔

ڈیڑھ ماہ تک زری نے جس باقاعدگی کے ساتھ کرم علی کو فون کیا تھا، اس نے کرم علی کو حیران کرنے کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار حیرت سے بھی دوچار کیا تھا۔ یقیناً وہ پاکستان جا کر اسے مس کر رہی تھی اور اس کا اظہار بھی کر رہی تھی۔

ڈیڑھ ماہ بعد اس کے واپس آنے سے پہلے کرم علی کو امید تھی کہ زری کے رویے میں بہت تبدیلی آ چکی ہوں گی لیکن اس کے پاکستان سے واپس آنے کے بعد کرم علی کو شاک لگا تھا۔

زری کا رویہ بے حد عجیب و غریب ہو گیا تھا۔ وہ پاکستان سے واپسی کے اگلے کئی ہفتے گم صم رہی تھی۔ کرم علی کے ساتھ اس کا رویہ بھی درشت تھا۔ کرم علی نے کئی بار اسے اکیلے میں بیٹھ کر روتے بھی دیکھا۔ وہ یقیناً اپنے گھر والوں سے مل کر آنے کے بعد انہیں بری طرح مس کر رہی تھی۔ کرم علی نے یہی سوچا تھا۔ اس نے زری کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اسے ہر تین ماہ بعد دو ہفتوں کے لیے پاکستان بھیجوا دیا کرے گا اور زری یک دم پرسکون اور مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ پاکستان کی جانے والی فون کالز میں یک دم اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے زری کارڈ استعمال کیا کرتی تھی لیکن اب اس نے گھر کے نمبر سے کالز کرنا شروع کر دی تھیں۔ کرم علی کا فون کا بل پہلے سے دس گنا زیادہ آنے لگا تھا لیکن کرم علی نے اس کی پروا نہیں کی۔ چند ہزار ڈالرز خرچ کرنے سے وہ اس کی خوشی اور گھر کا سکون خرید سکتا تھا تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں تھا۔

زری اس کے تین ماہ کے بعد پاکستان بھیجنے کے وعدے کے بعد سے یک دم بہت بہتر ہو گئی تھی۔ اس نے پہلے کی طرح کرم علی کے ساتھ بحث کرنا اور الجھنا چھوڑ دیا تھا اور وہ حتی المقدور کرم علی کا خیال بھی رکھنے لگی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے کرم علی کی فیملی کے ساتھ بھی اپنا رویہ بہت بہتر کر لیا تھا۔ وہ ان کے گھر آنے پر پہلے کی طرح اپنے کمرے میں بند نہیں ہوتی تھی بلکہ اکثر ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی۔

کرم علی ان دنوں اس سے اتنا خوش تھا کہ وہ تین ماہ کے بجائے اسے دو ماہ بعد ہی پاکستان بھجوانے کا سوچنے لگا تھا اور بھجوا بھی دیتا۔ اگر اس سے پہلے زری اس کے سر پر ایک قیامت نہ توڑ دیتی۔

اس عید کے موقع پر زری کے والد سے بات کرتے ہوئے اسے زری کے ایک ماہ تک پھر دو ہفتے کے لیے پاکستان آنے کی اطلاع دی۔

حمید الدین بہت خوش ہوا۔

"لیکن بیٹا! دو ہفتے کے بجائے اس بار مہینے کے لیے اسے بھیج دو۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اگر زری اتنی جلد آ رہی ہے تو پھر گلشن کی شادی طے کر دیتے ہیں۔ پچھلی بار بھی صرف دو ہفتے کے لیے آئی۔ ہم لوگ چاہتے ہوئے بھی گلشن کی شادی نہیں کر سکے۔ انتظامات مکمل نہیں تھے۔ خود زری بھی کہہ رہی تھی کہ اگلی بار زیادہ وقت کے لیے آئے گی۔"

کرم علی کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"انکل! دو نہیں، زری چھ ہفتے پاکستان رہ کر آئی ہے۔ آپ ان دنوں شادی طے کر دیتے تو میں بھی شرکت کے لیے آجاتا۔"

دوسری طرف حمید الدین بہت دیر تک کچھ نہیں بولا۔

"چھ ہفتے کہاں بیٹا! دو ہفتے کے لیے آئی تھی۔ 21 کو آئی اور 6 کو چلی گئی۔" حمید کو لگا جیسے کرم علی کو غلطی ہوئی تھی کرم علی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"کس مہینے کی 21 کو؟" اس نے بمشکل خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"مئی کی 21 کو آئی اور جون کی 6 کو واپس گئی۔"

کرم علی کا چہرہ سفید ہو گیا۔ "وہ اوٹوا سے 24 کو گئی تھی، 24 اپریل کو۔"

"آپ لوگ مری وغیرہ گئے تھے اس کے ساتھ؟" اس نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ کسی نے جیسے اس کی پشت میں خنجر گھونپ دیا تھا۔

"نہیں بیٹا! کہاں۔ دو ہفتے میں بمشکل وہ بازار جا کر اپنی شاپنگ ہی مکمل کرتی رہی۔ وہ تو سارے رشتہ داروں سے بھی نہیں ملی"

حمید الدین بے حد سادہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"آپ لوگ کراچی یا اسلام آباد کسی رشتہ دار سے ملنے نہیں گئے؟"

"کراچی یا اسلام آباد میں کون ہے ہمارا؟"

حمید الدین سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کرم علی نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ واقعی عقل کا اندھا تھا۔ اس سے بڑھ کر بے وقوف اس وقت اس کرہ ارض پر کوئی دوسرا نہیں تھا۔

"آپ کی بیٹی یہاں سے 24 اپریل کو پاکستان گئی ہے۔ آپ کہتے ہیں وہ 21 مئی کو وہاں آئی ہے۔ چار ہفتے وہ کہاں رہی ہے، یہ آپ کو پتا ہونا چاہیے کیونکہ میں نے اسے آپ کے پاس بھیجا تھا۔ وہ کہتی ہے وہ آپ لوگوں کے ساتھ بھوربن پھرتی رہی۔ آپ کہتے ہیں آپ لوگ کہیں نہیں گئے۔ وہ کہتی ہے، وہ کراچی اور اسلام آباد اپنے رشتہ داروں سے ملنے گئی۔ آپ کہتے ہیں وہاں آپ کے کوئی رشتہ دار نہیں۔ اب اس نے یہ چار ہفتے کہاں گزارے ہیں، یہ میں آپ کو اس سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔"

کرم علی نے تلخی سے فون بند کر دیا۔ وہ جانتا تھا حمید الدین کے گھر میں اس وقت ہنگامہ برپا ہو گیا ہو گا۔

وہ عید کا دن تھا اور کرم علی کی پوری فیملی ڈنر کے لیے وہاں اس کے گھر پر تھی۔ یہ اچھا تھا کہ وہ اپنے بیڈروم سے فون پر اپنے سسرال میں بات کر رہا تھا۔

اگر اس وقت لاؤنج میں بیٹھا ہوتا تو... اس کا جسم پوری طرح سرد پڑ گیا تھا۔

وہ کینیڈا کے ممتاز ترین بزنس مین میں سے ایک تھا جو دن میں درجنوں گھاگ آدمیوں کے ساتھ بزنس ڈیلز کرتا تھا جس کے ساتھ بزنس

ڈینز سے پہلے بڑے بڑے لوگ مکمل تیاری کے ساتھ آتے تھے کیونکہ کرم علی باریک سے باریک نقص کو پکڑنے کا ماہر تھا۔ اس کو بے وقوف بنانا بے حد مشکل کام تھا اور یہاں بیس سال کی ایک لڑکی نے چٹکی بجاتے میں اس کی آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی یا شاید اس نے اسے جان بوجھ کر دھول جھونکنے دی تھی۔

اسے کبھی زری پر کوئی شک نہیں ہوا تھا اور یہ اس کی پہلی غلطی تھی۔ اس نے زری کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی، یہ اس کی دوسری غلطی تھی۔ اس نے زری پر اعتبار کیا، یہ اس کی تیسری غلطی تھی۔ وہ جیسے غلطیوں کی ایک فہرست ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔

سب سے بڑی غلطی شاید اس کا زری سے شادی کرنا تھا اور اس کا احساس کرم علی کو اپنی شادی کے دن ہی ہو گیا تھا۔ لیکن اس mismatched رشتے کو نبھانے کے لیے کرنے والی کوششیں جو "رنگ" لائی تھیں، وہ آج اس کے سامنے تھا۔

سوال اب صرف یہ تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے زری کو "بیوی" سمجھ کر جو درجہ دیا تھا، اس نے اسے وہ دن دکھایا تھا۔ کرم علی کو اب زری کو اس رشتے کی بریکٹ سے باہر رکھ کر ٹریٹ کرنا تھا۔ ایک عام عورت کی طرح، ایسی عورت کی طرح جس کے لالچ اور ہوس سے اس نے ہمیشہ گھن کھائی تھی اور جیسی عورت کو وہ کبھی آنکھیں کھول کر اپنی بیوی جیسے رشتے کے بندھن میں تو نہ باندھتا۔

ہاتھ میں پکڑا فون لے کر اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سی ایل آئی پر ان کالز کو دیکھنا شروع کر دیا تھا جو زری کرتی رہی تھی۔ وہ صرف اس کے گھر کے نمبر نہیں تھے کچھ اور نمبر بھی تھے لیکن صرف ایک ایسا نمبر تھا جو سیل فون کا تھا اور جس پر بار بار لمبی کالز کی گئی تھیں۔

چند لمحے کرم علی اس نمبر کو دیکھتا رہا پھر پتا نہیں کیا سوچ کر اس نے اس نمبر پر کال ملا دی۔ ایک ہی گھنٹی کے بعد دوسری طرف سے جمال نے کال ریسیو کر لی تھی۔

"ہیلو... ہیلو... ہیلو زری آواز نہیں آ رہی ہے کیا میری... ؟ ہیلو... ہیلو..."

جمال مسلسل بولتا رہا، کرم علی نے فون بند کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ تھی۔ اپنا سیل فون اٹھا کر اس بار اس نے اس پر جمال کا نمبر ٹائپ کیا اور دوبارہ اسے کال کرنے لگا۔ اس بار فون چند گھنٹیوں کے بعد اٹھایا گیا تھا۔ پہلے کے برعکس آواز میں بے تکلفی کا عنصر غائب تھا اور اب لہجہ بے حد محتاط تھا۔

"ہیلو"

"ہیلو، میں عزیز صاحب سے بات کر سکتا ہوں۔" کرم علی نے بے حد شستہ انداز میں کہا۔

"کون عزیز صاحب؟" دوسری طرف سے جمال نے الجھ کر کہا۔

"یہ نمبر عزیز صاحب کا نہیں۔"

"نہیں، یہ تو میرا ہے۔" جمال نے بے ساختہ کہا۔

"اور آپ کا نام کیا ہے؟" کرم علی نے پوچھا۔

"جمال۔" جمال نے روانی سے کہہ کر اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔ کال ڈس کنیکٹ ہو گئی تھی۔

کرم علی نے فون بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور اٹھ کر باہر نکل آیا۔ ڈنر ٹیبل تقریباً تیار تھی اور زری باقی لوگوں کی طرح زرق برق کپڑے پہنے کرم علی کی بہن کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ وہ وہاں موجود عورتوں میں سب سے خوبصورت نظر آرہی تھی اور کسی مرد کیا عورت کے لیے بھی اس سے نظریں ہٹانا مشکل ہو جاتا۔ یہ سب نہ ہوا ہوتا تو کرم علی کیا کوئی بھی مرد ایسی بیوی پا کر اپنی قسمت پر نازاں ہوتا لیکن کرم علی اس وقت اسے دیکھتے ہوئے صرف یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ زری نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے۔ پیسے کا لالچ بہت سی عورتوں میں ہو سکتا ہے مگر اپنے شوہر سے بے وفائی کرنے کی ہمت بہت کم عورتوں میں ہوتی ہے اور بدقسمتی سے کرم علی کا واسطہ ایسی ہی ایک عورت سے پڑ گیا تھا۔

رات کو ایک بجے کے قریب سب لوگ چلے گئے تھے۔ کرم علی ان کو رخصت کرنے کے بعد دروزے لاک اور کھڑکیاں بند کرنے کے بعد جب تک اپنے کمرے میں آیا، زری اپنا لباس تبدیل کر چکی تھی اور سونے کی تیاری میں مصروف تھی۔

"آپ کو کیا ہوا؟ صبح تو بہت اچھا موڈ تھا پھر ابھی کیا ہو گیا تھا آپ کو کسی سے بات ہی نہیں کر رہے تھے؟" زری نے اسے دیکھتے ہی قدرے ناراضی کے انداز میں اس سے کہا۔

"ہمیں کچھ باتیں کرنی ہیں زری! وہاں صوفے پر چلتے ہیں۔" کرم علی نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اس سے کہا۔ زری بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کرم علی کے لہجے میں ایسا کچھ تھا جس نے اسے چونکا دیا تھا۔

"کیا باتیں کرنی ہیں آپ کو؟" وہ کچھ پریشان ہو کر کرم علی کے پاس آ گئی۔ اس نے اپنے بیڈ سے صوفے تک آنے کے وقت میں پورے دن کی سرگرمیوں اور باتوں کو اپنے ذہن میں دہرایا تھا۔ کہیں کچھ ایسا نظر نہیں آیا جس لیے کرم علی اسے یوں رات کو بٹھا کر بات کرتا۔

"بیٹھو۔" کرم علی نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ زری کچھ الجھی ہوئی اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"پاکستان اپنے گھر والوں کے پاس کس تاریخ کو گئی تھیں تم۔"

زری کے پیروں کے نیچے سے محاورتاً نہیں، حقیقتاً زمین نکل گئی تھی۔ یہ آخری بات تھی جو کرم علی آج کی رات اس سے پوچھ سکتا تھا۔

اس کے ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے۔ کرم علی ایک ٹک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہا تھا۔ نظریں چرانے کا مطلب ہوتا وہ جھوٹی تھی اور زری نے ساری زندگی ایسی سچویشنز میں جھوٹ ہی بولا تھا۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔" زری کی آواز میں بھی کپکپاہٹ تھی۔

"وہ میں سمجھا دیتا ہوں۔ تم یہاں سے 24 اپریل کو پاکستان گئیں لیکن تمہارے والد صاحب نے تمہیں 21 مئی کو ایئر پورٹ پر ریسیو کیا۔ تم نے مجھے کہا کہ تم بھوربن گھر والوں کے ساتھ گئی تھیں۔ تمہارے والد صاحب نے کہا کہ وہ تمہارے ساتھ کہیں نہیں گئے۔ تم نے کہا تم اپنے رشتہ داروں سے ملنے کراچی اور اسلام آباد گئیں۔ تمہارے والد نے کہا کہ ان دونوں شہروں میں ان کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ اب بات سمجھ میں آ گئی کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں یا کچھ وضاحت کی ضرورت ہے؟"

وہ دم سادھے کرم علی کو دیکھتی رہی۔ شادی کے بعد پہلی بار آج کرم علی نے زری کی آنکھوں اور چہرے پر خوف دیکھا تھا۔ اسے اس پر ترس آیا۔ زری جھوٹ گھڑنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹا تھا اور اب وہ..."

اس نے فی الفور جھوٹ گھڑ لیا۔

"میں ...... میں اپنی کچھ دوستوں کے ساتھ بھوربن گئی تھی۔ آپ سے جھوٹ اس لیے بولا کیونکہ آپ کبھی اجازت نہ دیتے۔"

زری نے بے حد معصوم چہرے کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور جھوٹ بولتی کرم علی نے کہا۔

"جمال کون ہے؟" اس نے جتنے جھوٹ گھڑے تھے، پل بھر میں غائب ہو گئے تھے۔ چار ہفتے غائب رہنے کا اسے اس کے باپ سے پتہ چل گیا تھا مگر جمال کا پتہ کس سے چلا۔ اسے تو اس کا باپ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ اس بار جھوٹ بول کر نہیں نکل سکتی تھی لیکن اس نے پھر بھی کوشش کی۔

"کون جمال؟" اس نے اپنے حلق سے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"بات کروا دوں اس سے تاکہ تم پہچان لو یا پھر تمہارے گھر والوں سے پوچھ لوں کہ جمال کون ہے؟"

کرم علی اس وقت کسی لحاظ کے موڈ میں نہیں تھا اور زری کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا۔ کرم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

"میں جانتا ہوں تم بہت اچھا جھوٹ بولتی ہو لیکن مجھ سے اس وقت صرف سچ بولنا۔ سچ بولنے کا تمہیں جتنا نقصان ہوگا، جھوٹ کا اس سے زیادہ ہوگا اس لیے اس وقت کوئی جھوٹ نہیں۔"

زری بہت دیر چپ بیٹھی جیسے حساب کتاب کرتی رہی۔ ہر تخمینے، ہر اندازے نے اس سے یہی کہا تھا کہ اسے اس وقت سچ ہی بولنا چاہیے۔

"میں جمال سے شادی کرنا چاہتی تھی، میرے ماں باپ نے زبردستی آپ سے کرا دی۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"کتنی بار تم سے پوچھا تھا میں نے کہ یہ شادی تمہاری مرضی سے ہوئی ہے یا نہیں اور ہر بار تم نے یہی کہا کہ یہ شادی تمہاری مرضی سے ہوئی ہے۔" کرم علی جیسے پھٹ پڑا تھا۔

"تو اور کیا کہتی میں، اس وقت شادی ہو چکی تھی میری۔ آپ کو بتا دیتی کہ زبردستی ہوئی ہے تو آپ کیا کرتے۔"

"میں تمہیں چھوڑ دیتا۔ یہاں کبھی نہ لے کر آتا۔"

"آپ چھوڑ دیتے تو ابا مجھے جان سے مار دیتا۔"

"اس لیے تم نے بہتر سمجھا کہ تم میرے ساتھ رہ کر میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہو۔ میرے پیسے پر ایک دوسرے آدمی کے ساتھ عیاشی کرتی رہو۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"دوسرا آدمی آپ ہیں میرے لیے۔" زری نے یک دم اس کی بات کاٹ دی۔ "جمال نہیں۔"

"اور اپنے ہاتھ میں ہوتا تو اسی سے کرتی۔"

"اپنے ہاتھ کی بات مت کرو، تم نے ماں باپ کے مجبور کرنے پر مجھ سے شادی نہیں کی۔ میرا پیسہ دیکھ کر مجھ سے شادی کی۔ سودا کیا تم نے۔"

"آپ نے بھی تو یہی کیا تھا۔ آپ نے بھی میری خوبصورتی، میری جوانی دیکھ کر شادی کی تھی۔ آپ نے کیوں نہیں اپنی عمر کی اپنی شکل و صورت جیسی والی عورت سے شادی کی۔ آپ نے کیوں احساس نہیں کیا کہ آپ کے ساتھ میں جچتی ہوں یا نہیں۔"

کرم علی کچھ بول نہیں سکا۔ زری بے حد تلخی سے بول رہی تھی۔

"مرد کو شادی کرتے ہوئے اپنی عمر اور اپنی شکل نظر کیوں نہیں آتی۔ اس لیے نا کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی جیب میں پیسے ہیں۔ سودا تو پھر وہ پہلے ہی خود کر دیتا ہے۔ عورت کی عمر اور خوبصورتی کا اپنے پیسے سے۔ پھر سودے میں گھاٹا ہوتا ہے تو روتا کیوں ہے؟"

وہ اس وقت کم عقل جاہل زری نہیں لگ رہی تھی جسے وہ جانتا تھا۔ "اگر تم اسے سودا سمجھتی ہو تو تمہیں یہ بھی پتا ہونا چاہیے کہ سودا کرنے کے بعد اس میں 'دھوکا نہیں' ہوتا۔"

"وہ تب ہوتا ہے جب سودا اپنی مرضی سے ہو۔ چار آیتیں سن کر کاغذ پر کیے جانے والے تین دستخط مجھے آپ کی وفادار نہیں بنا سکتے۔ اگر میرا دل نہیں چاہتا تو"

"بہت ساری عورتیں کسی اور کو پسند کرتے کرتے کسی اور کی بیوی بن جاتی ہیں۔ وہ وفاداری کرتی ہیں زری! ان کا دل چاہے نہ چاہے، یہ خاندان کی بات ہوتی ہے۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے خاندان کا طعنہ دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"آپ سمجھتے ہیں، میں نے آپ سے وفاداری کی کوشش نہیں کی؟ میں نے جمال کو اپنے دل سے نکال کر آپ کا گھر بسانے کی کوشش نہیں کی؟ وہ اب آنسوؤں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"بہت بار کی لیکن مجھے برص زدہ لوگ اچھے نہیں لگتے۔ کبھی اچھے نہیں لگے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے ہر بار آپ کا برص زدہ جسم دیکھ کر مجھے اتنی کراہیت آتی ہے کہ میرے دل سے آپ کے لیے ہر وہ جذبہ نکل جاتا ہے جسے میں نے سر توڑ کوشش کر کے پیدا کیا ہوتا ہے۔ مجھے ہر روز اپنے آپ سے یہ جنگ لڑنی پڑتی تھی کہ آپ میرے شوہر ہیں اور مجھے آپ سے محبت کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں کبھی یہ جنگ نہیں جیت سکی۔ آپ نے جھوٹ بول کر اپنی اس بیماری کو مجھ سے چھپا کر شادی نہ کی ہوتی تو شاید میں اپنے آپ کو یہ سوچ کر سمجھا لیتی کہ یہ میرا فیصلہ ہے۔ میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ مجھے اسے نبھانا چاہیے۔ پر ہر بار آپ کے جسم کو دیکھ کر مجھے دھوکے کا احساس ہوتا ہے۔ میرے گھر میں اتنی غربت نہ ہوتی تو آپ اور آپ کے گھر والے کبھی اتنا بڑا عیب چھپا کر آپ کی شادی کرتے کبھی نہیں۔ لیکن انہیں پتا تھا کہ غربت نے میرے ماں باپ کے ہاتھ کاٹ دیے ہیں، زبان بند کر دی ہے۔ برص کیا وہ سو بیماریاں بھی چھپا لیتے تو بھی مجھے آپ ہی کے گھر میں بسنا ہوتا اور مجھ سے "وفاداری" اور "سچائی" کا مطالبہ بھی ہوتا۔"

کرم علی کو پہلی بار اس کی زبان پر جھوٹ کا گمان نہیں ہوا تھا۔ وہ اس وقت وہ کہہ رہی تھی جو اس کے دل میں تھا اور جو اس کے دل میں تھا وہ بے حد تکلیف دہ تھا۔

"میں نے جو کچھ کیا غلط کیا، لیکن اس کام کی ابتدا آپ نے کی ہے۔ نہ کی ہوتی تو شاید یہ پچھتاوا اور احساس جرم ہی مجھے گناہ سے روک دیتا کہ میں آپ کے ساتھ یہ کر رہی ہوں لیکن کرم علی مجھے کبھی کوئی احساس جرم نہیں ہوا۔ ہر بار مجھے لگا میں آپ کے ساتھ ٹھیک کر رہی ہوں کیونکہ اس سے پہلے آپ نے دھوکا دیا تھا مجھے۔"

"تم جانتی تھیں اس شادی کو میں نے ارینج نہیں کیا تھا، نہ تم کو میں نے دیکھ کر تم سے شادی کی خواہش کی تھی۔ تم لوگوں کو میرے بارے میں کیا بتایا گیا، کیا چھپایا گیا، مجھے اس کا بھی پتہ نہیں تھا۔ میری شادی زبردستی "

"مرد کی شادی کوئی زبردستی نہیں کر سکتا کرم یہ عورت ہوتی ہے جس کے ساتھ زبردستی ہوتی ہے۔ مرد کے ذہن میں کہیں نہ کہیں "ہاں" ہوتی ہے۔ تو وہ "ہاں" کہتا ہے۔ اگر "ناں" ہو تو وہ مر جاتا ہے مگر "ناں" ہی کہتا ہے۔ اور آپ کو مجبور کرنے والے تھے کون۔ ایک ماں اور چھوٹے بہن بھائی۔"

اس نے جیسے کرم علی کے منہ پر جوتا کھینچ مارا تھا۔ کرم علی کو اس وقت اس سے بات کرتے ہوئے واقعی ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ اگر اس نے سارا علم اور تجربہ "دنیا" سے حاصل کیا تھا تو زری کا استاد بھی "دنیا" ہی تھی۔

"تم اب کیا چاہتی ہو زری؟" کرم علی نے اپنے سارے سوالوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ اسے زری سے سوال جواب یک دم بے کار لگنے لگے تھے۔

زری خاموش ہو گئی۔ "اب" کے بارے میں اس نے واقعی نہیں سوچا تھا۔

"طلاق چاہتی ہو؟" اس کی خاموشی نہ ٹوٹنے پر کرم علی نے اس کی مشکل جیسے آسان کرتے ہوئے حل پیش کیا۔

"ہاں۔"

"ٹھیک ہے، تم پاکستان چلی جاؤ۔ میں وہیں تمہیں طلاق کے کاغذات بھجوا دیتا ہوں۔" کرم علی نے کہا۔

"میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ ابا مجھے مار دے گا۔" زری یک دم خوف زدہ ہو گئی۔

"تم اپنے گھر مت جانا۔ پہلے کی طرح جمال کے پاس ہی جانا۔" کرم علی نے طنز نہیں کیا تھا لیکن زری کو طنز ہی لگا۔

"جمال کے پاس کیسے جا کر رہوں۔ اس کا گھر ہمارے پرانے محلے میں ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا، مجھے کیسے رکھے گا اور وہ ابا اتنا موقع تھوڑی دے گا مجھے کہ میں اس کے ساتھ جا کر رہ سکوں۔ میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔" زری نے جیسے اعلان کیا۔

"تو یہاں اکیلے کیسے رہو گی؟"

"میں جمال کو یہاں بلوانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس نے ایجنٹ کو پیسے دیے تھے کینیڈا آنے کے لیے لیکن فراڈ ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا وہ اب سیدھا سیدھا ہی اپلائی کرے گا اسے ویزا مل جائے گا تو پھر وہ یہاں آ جائے گا اور ہم شادی کر لیں گے۔" اس کے پاس حل تھا لیکن وہ پھر بھی پریشان نظر آ رہی تھی۔

''اور یہ ایجنٹ کے لیے تم ہی نے اسے پیسے بھجوائے ہوں گے؟'' وہ کرم علی کی بات پر کچھ نہیں بولی۔

''اور اگر جمال کو ویزا نہ ملا تو؟ اس کے بعد تم یہاں کیا کرو گی؟''

وہ اس کی بات پر کچھ اور پریشان نظر آنے لگی تھی۔

''بہتر ہے تم اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاؤ۔ کم از کم اس طرح تم جمال سے شادی کر سکو گی۔''

''نہیں، مجھے پاکستان نہیں جانا۔ میں مر جاؤں گی لیکن پاکستان نہیں جاؤں گی۔''

''زری نے دوٹوک انداز میں کہا۔ کرم علی اسے دیکھتا رہا، وہ اسے وہاں رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ وہ اگر وہاں کسی کورٹ میں اس کے خلاف کیس دائر کر دیتی تو کرم علی کے لیے اچھی خاصی مصیبت کھڑی کر سکتی تھی اور زری سے وہ اب کچھ بھی توقع کر سکتا تھا۔

''میں تمہارے والدین کو یہاں بلوا کر انہیں سمجھا دیتا ہوں۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ میں ان سے کہہ کر تمہاری شادی جمال سے کروا دیتا ہوں۔'' کرم علی نے جیسے راستہ ڈھونڈا تھا۔

زری نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

''آپ ان کی بجائے جمال کو یہاں بلوا کر میری شادی اس سے کر دیں۔ میں ساری عمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔''

☆☆☆

رات کے چار بجے کا وقت تھا، جب زینی سرہانے بجتے ہوئے انٹرکام کی آواز پر بیدار ہوئی تھی۔ دوسری طرف سلطان تھا۔

''غضب ہو گیا پری جی؟''

''کیا ہوا؟'' زینی نے اپنی جماہی روکتے ہوئے کہا۔

''تبریز پاشا کا ہارٹ فیل ہو گیا۔'' وہ سنتی رہی۔ ''رات کسی وقت پاشا اسٹوڈیوز کے ایڈیٹنگ روم میں آگ لگ گئی۔ آپ کی آنے والی فلم ''بہاروں کے سنگ'' کے تینوں پرنٹ جل گئے۔ آگ پر ابھی تک قابو نہیں پایا جا سکا۔ پاشا کا کروڑوں کا نقصان ہوا ہے۔ اس کی باڈی ابھی ہاسپٹل میں پڑی ہے۔ پوری فلم انڈسٹری میں کہرام مچا ہوا ہے۔ سب پاشا کے گھر پہنچ رہے ہیں۔ میں نے ڈرائیور کو کہا ہے گاڑی نکالنے کا۔ آپ بھی تب تک تیار ہو جائیں۔''

سلطان نے کہا۔

''سلطان! میں شدید شاک کے عالم میں ہوں۔ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اور میں فی الحال کسی سے نہیں مل سکتی۔ سمجھ گئے۔''

زینی نے اس سے اطمینان سے کہا اور ریسیور رکھ کر بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آف کرتے ہوئے دوبارہ لیٹ گئی۔ وہ نیند کی گولی کھا کر لیٹی تھی اور ابھی بھی غنودگی کی حالت میں تھی۔ دوبارہ گہری نیند میں جانے میں اسے دیر نہیں لگی تھی۔

دوسری طرف سلطان ابھی تک انٹرکام کا ریسیور ہاتھ میں پکڑے بیٹھا تھا۔

وہ پری زاد کو کتنا جانتا تھا؟

وہ اپنے آپ سے پھر پوچھ رہا تھا۔

☆☆☆

"بہاروں کے سنگ" اگر ریلیز ہو جاتی تو میرے کیریئر کی سب سے اچھی فلم ہوتی میں نے اس سے زیادہ اچھی ایکٹنگ کسی اور فلم میں نہیں کی۔"

پری زاد تبریز پاشا کی رسم قل کے موقع پر جرنلسٹس کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس سیاہ گلاسز لگائے ہوئے تھی۔ تبریز پاشا کی موت کے بعد آج پہلی بار وہ منظر عام پر آئی تھی۔

"میرے لیے تبریز پاشا صاحب کی موت ایک ذاتی نقصان ہے انہوں نے مجھے میرا پہلا بریک دیا تھا اور میرے لیے ان کی حیثیت ایک گاڈ فادر سے کم نہیں ہے۔ یہ یقیناً پاشا فیملی کا نہیں پاکستان فلم انڈسٹری کا نقصان ہے۔" وہ اب تبریز پاشا کے حوالے سے اپنے تاثرات بتا رہی تھی۔

"پولیس کو اپنی ابتدائی تفتیش میں یہ ثبوت ملے ہیں کہ ایڈیٹنگ روم میں آگ کسی حادثے کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ جان بوجھ کر لگائی گئی ہے۔ اس حادثے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟ ایک جرنلسٹ نے سوال کیا۔" یہ یقیناً حادثہ نہیں ہے۔ فلم انڈسٹری کے دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر تبریز پاشا صاحب کو نقصان پہنچانے کے لیے بڑی پلاننگ سے یہ سب کچھ کیا اور صرف تبریز پاشا ہی کو نقصان پہنچانا مقصود نہیں تھا۔ یہ ایک ہیروئن کے طور پر مجھے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش ہے۔ کیونکہ یہ میرے کیریئر کی سب سے بڑی فلم تھی اور اس فلم کا اس طرح ضائع ہونا کیا معنی رکھتا ہے یہ آپ سب آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔" پری زاد نے بے حد اطمینان اور سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کو کسی دوسری ہیروئن پر شک ہے؟" ایک جرنلسٹ نے دلچسپی سے کہا۔

"یہ کام میرا نہیں پولیس کا ہے۔" پری زاد نے بے حد متانت سے کہا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

رپورٹرز نے اس سے کچھ مزید سوال کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہے۔ سلطان نے مداخلت کر کے انہیں روک دیا تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی پری زاد نے ایک سگریٹ سلگا لیا۔ گاڑی کے چلتے ہی اس نے اپنی آنکھوں پر لگے ہوئے گلاسز اتار دیے اب ان کی ضرورت نہیں تھی۔ سلطان نے ایک بار پھر غور سے پری زاد کا چہرہ دیکھا اسے پری زاد کا اطمینان دہلا رہا تھا... وہ پچھلے تین دن سے اسے اسی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ ...وہ جی بھر کر سو رہی تھی اور جی بھر کر کھا رہی تھی تبریز پاشا کی موت کی وجہ سے ایک ہفتے کے لیے تمام سٹوڈیو بند ہو گئے تھے اور تمام شوٹنگز رک گئی تھیں اور پری زاد کو جیسے اطمینان اور سکون سے گھر بیٹھنے کا موقع مل گیا تھا۔ سلطان کی زبان پر بار بار اس کے لیے سوال آ کر رک جاتا تھا کیا اس سب میں پری زاد کا ہاتھ تھا؟ مگر یہ ناممکن تھا پری زاد اتنی طاقتور نہیں تھی کہ وہ تبریز پاشا کے ایڈیٹنگ روم میں آگ لگوانے کی طاقت رکھتی اور پھر ابھی فی الحال پچھلے ایک سال سے تو اس کے اور تبریز پاشا کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے تھے پھر وہ ایسا کیوں کرتی؟ لیکن پھر اس کا یہ ردعمل؟ انڈسٹری میں کوئی بھی ہیروئن تبریز پاشا سے بڑی سے بڑی مخالفت رکھنے کے باوجود پاشا پروڈکشنز کے اتنے بڑے

نقصان اور تبریز پاشا کی موت پر کسی نہ کسی حد تک اپ سیٹ ضرور ہوتی۔

انڈسٹری کا 25 فی صد بزنس پاشا پروڈکشنز کی مرہونِ منت تھا اور اب ان کی تاریخ کے سب سے مہنگے پروجیکٹ کا راکھ میں تبدیل ہونا، ایڈیٹنگ روم کے ساتھ ساتھ سٹوڈیو کے ایک بڑے حصے کی آتشزدگی میں تباہی اور سب سے بڑھ کر تبریز پاشا کی یوں اچانک موت صرف پاشا پروڈکشنز نہیں پوری فلم انڈسٹری ہل کر رہ گئی تھی فلم ریلیز ہو کر فلاپ ہوتی پھر بھی کسی نہ کسی حد تک کچھ نہ کچھ بزنس کرتی ____ تبریز پاشا ان بڑی رقوم کا کچھ نہ کچھ حصہ واپس ریٹرن کرنے کے قابل ہوتا جو اس نے اپنے سینماز کی Renovation اور فلم کی ایڈیٹنگ کے لیے Latest Machinery کی امپورٹ پر بینکوں سے لی تھی۔ لیکن اس آتشزدگی نے سب کچھ راکھ کر کے ایک بہت بڑے ڈھیر میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ فلم فلاپ ہونے پر تبریز پاشا کو اتنا صدمہ کبھی نہ ہوتا جتنا اس فلم کے پرنٹس کے اس طرح جل جانے پر ہوا تھا۔ تبریز پاشا کے دونوں بیٹے بھی اسی لائن میں تھے لیکن تبریز پاشا اور ان کے اثر و رسوخ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور انہیں اپنے سامنے ترکے میں کروڑوں کی جائیداد کے ساتھ کروڑوں کے قرضے بھی مل گئے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اگلے چند سال پاشا پروڈکشنز کسی فلم کا سوچتا بھی۔ اور پوری فلم انڈسٹری میں اسی ایک چیز سے کھلبلی مچ گئی تھی ____ ہر ایک اس متوقع نقصان کا سوچ کر فکر مند ہو رہا تھا جو پاشا پروڈکشنز کی فلموں کے نہ بننے کی وجہ سے ہر ایک کو ذاتی طور پر ہو سکتا تھا اور ایسے حالات میں اگر پری زاد کا اطمینان سلطان کو پریشان کر رہا تھا تو وہ یوں پریشان ہونے میں حق بجانب تھا۔

"یہ فلم اگر ریلیز ہو جاتی تو آنے والے کئی سال تک لوگ اس فلم اور آپ کی ایکٹنگ کے بارے میں باتیں کرتے رہتے۔" سلطان نے گھر پہنچنے پر اس سے کہا تھا۔ وہ اس کے لیے کپڑے نکال رہا تھا۔

"ریلیز نہیں ہوئی تب بھی اگلے کئی سال لوگ اس فلم کے بارے میں بات کریں گے ... زیادہ یادگار بن گئی ہے یہ فلم۔"

وہ اپنے سیل پر کسی کو کال کر رہی تھی۔ سلطان نے بڑے غور سے اس کو دیکھا۔ وہاں طنز تھا یا تنفر وہ اندازہ نہیں کر سکا۔

"آپ نے لازوال ایکٹنگ کی تھی اس میں لوگ زیبا، شمیم آرا، صبیحہ خانم کو بھول جاتے ... انڈسٹری میں اگلے 20 سال صرف پری زاد کا نام ہوتا۔" سلطان نے کہا۔

"تین انڈین فلموں کے چربہ اور چار عامیانہ گانوں پر بے ہودہ ڈانس کر کے اگر میں پاکستان فلم انڈسٹری میں نئی تاریخ بناتے بناتے رہ گئی ہوں ... تو فکر مت کرو ____ یہ تاریخ میں اس سال کئی فلموں کے ذریعے بناؤں گی۔"

شاید کال دوسری طرف نہیں مل رہی تھی پری زاد نے فون رکھ دیا تھا۔ سلطان اس بار رہ نہیں سکا وہ جھجکتے ہوئے پری زاد کے پاس آیا۔

"آپ کو خوشی ہوئی ہے کہ یہ فلم ضائع ہو گئی؟" اس نے بالآخر وہ سوال کیا۔

"ہاں۔"

جواب اتنے بے دھڑک انداز میں آیا تھا کہ سلطان چند لمحے بول ہی نہیں سکا۔ وہ پری زاد سے کم از کم "ہاں" کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اور اس "ہاں" میں اور کتنے "ہاں" تھے سلطان کا جیسے حلق خشک ہونے لگا تھا۔

"پری جی......"

سلطان نے وہ سوال کرنے کے لیے لفظ ڈھونڈنے شروع کیے جس کا ایک متوقع نتیجہ اس کی پری زاد کے گھر سے ہمیشہ کی چھٹی بھی ہوسکتا تھا۔ ابتدا سے پری زاد کے ہاتھوں اس طرح پٹنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا جس طرح وہ اس سے پہلے والی ہیروئنوں کے ساتھ رہ کر بات بات پر پٹتا تھا۔

"یہ حادثہ... جو ہوا ہے... تبریز پاشا کے سٹوڈیو میں" سلطان کو شاید زندگی میں پہلی بار لفظ نہیں مل رہے تھے... چند لمحوں کے لیے اس نے سوال نہ کرنے کا بھی سوچا... لیکن اب دیر ہوگئی تھی۔ سوال سے پہلے جواب اسے مل گیا تھا۔

"اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔" پری زاد نے جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا تھا... تین دنوں سے اگر وہ اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا تو وہ بھی یہی کام کر رہی تھی۔ سلطان اس کا کتنا بھی وفادار کیوں نہ ہوتا یہ فلم انڈسٹری پر حملہ تھا اور سلطان کی ہمدردیاں اس سے زیادہ اس فلم انڈسٹری کے ساتھ تھیں جسے وہ پوجتا تھا... اسے اگر شک بھی ہو جاتا کہ یہ پری زاد کا کام تھا تو سلطان اس درخت کو کاٹنے کی کوشش پر چپ بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا جس کی شاخوں پر اس سمیت لاکھوں لوگ بیٹھے ہوئے تھے... اور وہ واقعی بے وقوف ہوتی اگر وہ سلطان کو اس معاملے میں کسی شک و شبے کا شکار ہونے دیتی۔

"میں تبریز پاشا سے نفرت کرتی ہوں... صرف تبریز پاشا نہیں اس انڈسٹری کا ہر ڈائریکٹر ہر پروڈیوسر... ان میں سے جو بھی گرے گا میں اسے تماشائی بن کر ہی دیکھوں گی... اس کا سوگ منانے یا ماتم کرنے نہیں بیٹھوں گی۔ پاشا کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسی کے قابل تھا۔" پری زاد نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

سلطان نے اطمینان کا سانس لیا۔ نفرت کوئی قابل اعتراض چیز نہیں تھی اس انڈسٹری میں ہر ایک دوسرے سے نفرت ہی کرتا تھا۔ یہ ایک قدر مشترک تھی انڈسٹری کے ہر فرد میں لیکن اس کے باوجود ہر ایک دوسرے کے ساتھ کام بھی کرتا تھا اور بقائے باہمی پر بھی یقین رکھتا تھا۔ سلطان کو اس بات پر کوئی پریشانی نہیں تھی کہ وہ تبریز پاشا کی موت پر رنجیدہ کیوں نہیں ہے۔ تبریز پاشا کی موت پر دل سے کوئی بھی رنجیدہ نہیں تھا... سلطان کو صرف پریشانی یہ تھی کہ وہ اس فلم کے ضائع ہونے اور پاشا پروڈکشنز کے بند ہو جانے پر اس طرح صدمہ زدہ کیوں نہیں ہے جس طرح اسے ہونا چاہیے... پری زاد نے بات کلیئر کر دی تھی اور کسی حد تک اس کے خدشات بھی دور کر دیے تھے... سلطان کو یہ اندازہ نہیں تھا... یہ صرف آغاز تھا۔

تبریز پاشا کی موت کے پانچویں ہی دن انور حبیب نے پری زاد کو فون کر کے اس سے اس فلم کے بارے میں پوچھا تھا جو وہ پاشا پروڈکشنز کے بینر کے نیچے بنانے کا ارادہ رکھتی تھی اور جواب کھٹائی میں پڑتی نظر آ رہی تھی۔ تبریز پاشا کے منظر عام سے ہٹ جانے کے بعد اور پاشا پروڈکشنز کے وقتی طور پر بند ہو جانے کے بعد جو چند بڑے ڈائریکٹر بڑی بڑی اڑانیں بھرنے کی تیاریاں کر رہے تھے ان میں انور حبیب بھی شامل تھا۔ جواب پری زاد کے ساتھ وہی فلم بنانا چاہتا تھا جو پہلے اسے ایک رسک لگ رہی تھی۔ پری زاد نے بے حد خوش دلی کے ساتھ اس کی آفر قبول کر لی تھی۔ انور حبیب کی کال سے پہلے ہی وہ اس کی کال کا انتظار کر رہی تھی وہ جانتی تھی کہ انور حبیب اب اس فلم کے سلسلے میں اس سے رابطہ کرے گا

تبریز پاشا کی موت کے ٹھیک 30 دن بعد پری زاد اور انور حبیب نے ایک پریس کانفرنس میں اپنے اس مشترکہ پروجیکٹ کا اعلان کیا جسے وہ دونوں تبریز پاشا کو Dedicate کر رہے تھے... اور اس پریس کانفرنس کے چند گھنٹوں کے بعد پری زاد کو سفیر خان کی کال ملی تھی جو اس کے انور حبیب

کے ساتھ کیے جانے والے اس پروجیکٹ پر بُری طرح چراغ پا ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سب سے پہلے پری زاد نے اسی کے ساتھ یہ فلم بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس لیے اسے ابھی بھی اس پروجیکٹ کے سلسلے میں انور حبیب پر ترجیح ملنی چاہیے تھی۔ پری زاد نے بڑے اطمینان سے اسے بتایا کہ انور حبیب نے اس سے پہلے اس سے رابطہ کیا تھا سفیر خان اگلا ایک گھنٹہ پری زاد کو انور حبیب کے بارے میں ان تمام خطرات سے آگاہ کرتا رہا جن سے وہ سفیر خان کے خیال میں واقف نہیں تھی۔ پری زاد بے حد متانت سے اس کی باتیں سنتی رہی پھر اس نے اپنی کسی مصروفیت کا بہانہ بنا کر فون رکھ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی اس فلم میں انور حبیب کی شمولیت سفیر خان اور انور حبیب کے درمیان پچھلے کئی سالوں سے چلی آنے والی دوستی کا اختتام تھا۔ وہ جب تک اکٹھے تھے کوئی عورت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی... اور پری زاد نے انہیں اکٹھا نہیں رہنے دیا تھا وہ انہیں آپس میں توڑ کر ختم کر سکتی تھی اور وہ کر رہی تھی تبریز پاشا کی "بہاروں کے سنگ" کی بجائے انہیں تاریخوں میں کرم علی کی فلم سینماز میں ریلیز ہو گئی تھی اور فلم نے بڑا بزنس کیا تھا... اس کے باوجود کہ اس فلم میں پری زاد کے علاوہ کوئی دوسرا بڑا اسٹار نہیں تھا... اور اس چیز نے جہاں پری زاد کی مارکیٹ ویلیو بڑھائی تھی وہاں بہت سے دوسرے ایکٹرز اور ایکٹریسز کے اندیشوں میں اضافہ کر دیا تھا... وہ انڈسٹری کی پہلی ہیروئن تھی جسے کامیابی کے لیے کسی "جوڑی" کا حصہ بننے کی ضرورت نہیں پڑ رہی تھی وہ جس ہیرو کے ساتھ کام کرتی وہ فلم ہٹ ہو جاتی۔

پری زاد نام کا جو سورج طلوع ہوا تھا اس نے بڑے بڑے ستاروں کو گہنا کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆
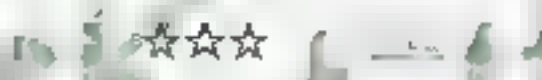
زری اور جمال کے درمیان صلح کرم سے زری کی شادی کے تین دن بعد ہی ہو گئی تھی جب زری شادی کے بعد رہنے کے لیے اپنے میکے آئی تھی اور یہاں آنے کے بعد جو پہلا کام اس نے کیا تھا وہ جمال سے معافی کا تھا۔ یہ کام اس کی توقعات سے بھی زیادہ آسان ثابت ہوا تھا۔ جمال عام حالات میں اس سے ناراض ہوتا تو اسے اسے منانے میں کئی کئی دن لگ جاتے لیکن وہ تب تھا جب وہ چوکیدار حمید کے گھر پر محلے کے کپڑے سینے والی زری ہوتی تھی... اب وہ کینیڈا میں بسنے والے ایک کروڑ پتی آدمی کی بیوی تھی اور اس کے جسم پر موجود لباس اور زیورات جیسے میلوں دور سے دوسروں کو اس کی اطلاع دیتے تھے۔ اس کے جسم پر موجود ایک ایک شے پکار پکار کر جیسے اعلان کرنے لگی تھی کہ اس کی کلاس تبدیل ہو چکی ہے... اور اس تبدیلی کے باوجود اگر وہ جمال سے معافی مانگ رہی تھی اور اس کے ساتھ پرانے مراسم بحال کرنا چاہ رہی تھی تو جمال کے لیے انکار کیسے ممکن تھا... وہ چند گلے شکووں کے بعد بہت آسانی سے مان گیا تھا۔ وہ ہر بار اپنے گھر جانے پر کرم کو گھر بٹھا کر اپنی دوستوں سے ملنے کے بہانے کہیں نہ کہیں جمال سے ضرور ملتی... اور صرف اتنا نہیں تھا وہ کھلے دل سے جمال کو وہ پیسہ بھی دے رہی تھی جو کرم اسے دیتا تھا... زری کی زندگی میں صرف جمال ہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ اس کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا... اور جس کو وہ آنکھیں بند کیے کچھ بھی دے دیتی اسے کوئی ملال نہ ہوتا... وہ کرم کے پاکستان میں قیام کے دوران بھی اس سے ملتی رہی اور اس کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد بھی اور یہ میل جول تمام اخلاقی حدود و قیود کو پار کر گیا تھا... یہ زری کا پلان تھا کہ وہ چند سال کرم کے ساتھ رہ کر اتنا روپیہ اکٹھا کر لے گی کہ جمال کو کینیڈا بلا لے اور پھر وہ کرم سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لے گی... اور دونوں کینیڈا میں ہی رہیں گے اور کوئی کام کر لیں گے... اس نے وہ سارا حساب کتاب جمال کو بھی بتایا تھا جو شادی

کی رات اس نے کرم سے اپنی پہلی گفتگو میں کیا تھا۔ جمال کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو وہ زری پر لعنت بھیجتا اور اپنی راہ لیتا یا پھر اسے مجبور کرتا کہ وہ کرم سے فوری طلاق لے۔۔۔ حق مہر اور زیورات کی شکل جو کچھ اسے مل چکا تھا وہ پہلے ہی ان دونوں کے لیے بہت کافی تھا۔ مگر یہ کینیڈا جانے کا خواب تھا جو زری نے جمال کو دکھا دیا تھا۔ اور جمال کے لیے اب یہ بہت مشکل تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اس خواب کو ذہن سے نکال دیتا۔

زری کینیڈا جانے کے بعد صرف اپنے والدین کو ہی نہیں جمال کو بھی بڑی بڑی رقوم بھیجتی رہی۔۔۔ اور اس نے دو مرتبہ جمال کو کینیڈا آنے کے لیے کسی ایجنٹ سے جعلی دستاویزات بنوانے کے لیے بھاری رقوم بھجوائیں۔ دونوں دفعہ جمال نے اس پیسے کو اپنے اللے تللوں میں ضائع کیا اور زری سے یہ جھوٹ بول دیا کہ اس کے ساتھ فراڈ ہو گیا تھا۔ دونوں کے درمیان اس مسئلے پر معمولی تلخی بھی ہوئی زری کو اس کی بات پر شک بھی تھا اس کے باوجود وہ اس کی بات پر یقین کرنے پر مجبور تھی۔ کرم کے پاس کینیڈا کی شہرت تھی اور زری اگر زیادہ پڑھی لکھی یا قانونی معاملات سے واقف ہوتی تو یہ جان جاتی کہ وہ اگر صرف کچھ عرصہ خاموشی سے وہاں پیپر ورک مکمل ہونے تک گزار لے۔ تو کسی ایجنٹ کی مدد کے بغیر وہ کرم سے طلاق لے کر جمال سے شادی کرنے کے بعد اسے خود بھی بلانے کی کوشش کر سکتی تھی اور شائد وہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان قانونی معاملات سے واقف ہو بھی جاتی اگر اس کے دوران ہی کرم اسے پاکستان نہ بھجواتا اور اسے یہ احساس نہ ہونے لگتا کہ جمال کو اب کینیڈا آ کر اس سے شادی کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ زری کی عدم موجودگی میں اس کے فراہم کیے جانے والے پیسے کو وہ بے حد بے دردی سے خرچ کر رہا تھا اور اس نے زری کے علاوہ بھی بہت سی دوسری دلچسپیاں ڈھونڈلی تھیں۔ زری سے اگرچہ اس نے یہ سب کچھ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ زری تھی اس سے کچھ چھپا رہنا ناممکن تھا۔ جمال نے اس کے سامنے وضاحتوں اور جھوٹوں کا ایک پہاڑ کھڑا کر دیا تھا اس کے باوجود زری کے لیے اس پہاڑ کے دوسری طرف دیکھنا مشکل نہیں تھا۔ اسے شدید صدمہ تو پہنچا تھا لیکن جمال اس کی کمزوری تھا اس کی بے وفائی کے باوجود وہ اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی اور جمال یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا۔ زری کے لیے اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ جلد از جلد جمال کو کینیڈا بلوانے اور اس سے شادی کی کوشش کرے۔۔ اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ یہ موقع کینیڈا واپس جانے کے فوراً بعد ہی آ گیا تھا۔ کرم سے اس آمنے سامنے نے یقیناً کچھ دیر کے لیے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی۔۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر کوئی صحیح معنوں میں اس کی مدد کرنے کے قابل تھا تو وہ بھی کرم ہی تھا۔۔ جو کسی دوسری لڑکی کے لیے بے حیائی کی انتہا ہوتی ہے وہ زری کے نزدیک صرف ایک معمولی نیکی تھی جسے کرنے کا وہ کرم سے مطالبہ کر رہی تھی۔

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے رو رہی تھی۔ اور کرم اسے صرف بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ کیا اس سے زیادہ ناقابل یقین چیز اس کی زندگی میں ہو سکتی تھی؟ یقیناً ہو سکتی تھی۔ صرف کرم علی ہی تو ایسا تھا جس کے لیے ایسی ہر آزمائش لکھ دی گئی تھی۔

"میرے سامنے ہاتھ مت جوڑو زری!" کرم نے اس کے ہاتھ اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے واقعی زندگی میں کسی کو اپنے سامنے ہاتھ جوڑے نہیں دیکھا تھا اور اب زری جوڑ رہی تھی تو اسے تکلیف ہو رہی تھی۔

"میں بہت مجبور ہو گئی تھی واقعی کرم۔ آپ اللہ کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میری مدد کریں۔"

اس نے اب ہاتھ ہٹا لیے تھے لیکن رونا نہیں چھوڑا تھا۔ کرم بے حد خاموشی سے اس کے بہتے آنسوؤں کو دیکھتا رہا۔ اسے اس وقت زری

پر کوئی غصہ نہیں آ رہا تھا... چند گھنٹے پہلے والا اشتعال ختم ہو چکا تھا... وہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی اور نہیں کر سکتی تھی... بات صرف اتنی سی تھی۔ وہ پیسے سے کسی عورت کا وقت خرید سکتا تھا، جسم خرید سکتا تھا۔ اس کے لہجے کی مصنوعی مٹھاس اور آنکھوں میں جھوٹی محبت خرید سکتا تھا لیکن وہ کسی کا دل نہیں خرید سکتا تھا۔ دل وہیں جاتا ہے جہاں اس نے جانا ہوتا ہے... جمال نکما تھا آوارہ تھا خالی ہاتھ اور خالی جیب تھا مگر زری اس پر مرتی تھی... اور کرم علی اسے کیا سمجھ سکتا تھا... شاید سمجھانے کی کوشش کرتا اگر زری نے کسی حدود و قیود کا لحاظ رکھا ہوتا... صرف یہ ایک چیز تھی جو کرم سے برداشت نہیں ہوئی تھی صرف یہی ایک چیز تھی جس پر کرم کو شدید ہتک کا احساس ہوا تھا۔ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ پاکستان میں چند ہفتے بے حد آرام سے گزار آئی تھی اور وہ یہ چاہتی تھی کہ کرم اب اسی مرد کے ساتھ شادی کرنے میں اس کی مدد بھی کرے... کرم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے... زری کو برا بھلا کہے یا اپنے اوپر ہنسے۔

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا سب سے آسان کام اس وقت اسے صرف یہی لگا تھا۔ عورت سے ایک بار پھر اس کا اعتبار بری طرح اٹھا تھا اس بار صرف اعتبار نہیں اس بار دل اٹھ گیا تھا اس کا... اس رات اسے وہ سارے مرد یاد آتے رہے جو پاکستان میں بیٹھی ہوئی اپنی بیویوں، بہنوں اور ماؤں سے نفرت کرتے تھے اس کے باوجود ان سے رشتہ قائم رکھنے پر مجبور تھے۔ ان کے ہاتھوں Exploit ہونے پر بھی مجبور تھے۔

اسے پچھلے کئی سالوں میں اپنی ماں اور بہنوں کے بارے میں کسی قسم کی کوئی خوش فہمی نہیں رہ گئی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں اس کا یہ خیال یا خوش فہمی تھی کہ کم از کم بیوی کے طور پر اس کی زندگی کا حصہ بننے والی عورت اس سے وہ سلوک نہیں کرے گی جو اس جیسے دوسرے مردوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

وہ یہاں بھی بدقسمت نکلا تھا۔

کئی سال پہلے نیویارک کی اس تیسری منزل کے اپارٹمنٹ کے ساتھیوں کی وہ ساری باتیں اس کے لیے جیسے حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی تھیں۔ وہ صابر قیوم، مجاہد، تنویر یا شوکت زمان کی طرح زری کو گالیاں نہیں دے سکا تھا... اسے برا بھلا نہیں کہہ سکا... اسے زری سے نفرت بھی نہیں ہوئی تھی... لیکن ہاں رنج... رنج تھا کہ جا ہی نہیں رہا تھا۔ آخر کسی عورت کا دل کیسے جیتا جاتا ہے؟... کیسے جیتا جا سکتا ہے؟... دل ہوتا بھی ہے عورت کے پاس... ؟ وہ وہاں بیٹھا پتا نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا... اور ہر سوچ کی ہر کو ایک ہی چہرہ ڈسٹرب کر رہا تھا... زینی کا چہرہ... وہ پچھلے ایک سال سے ہر بار اس کا خیال آنے پر اپنے دل کو صرف ایک بات کہہ کر اس کے تصور کو جھٹلاتا رہا تھا... وہ بے کردار ہے... اور میری بیوی با کردار ہے... اس میں ہر خامی سہی لیکن وہ پاکباز ہے... اور اب جیسے زینی اس کو منہ چڑانے لگی تھی وہ ایکٹریس تھی رسوائے زمانہ تھی وہ سب کچھ کرنے پر مجبور تھی جو وہ کر رہی تھی... لیکن زری اس کے پاس کیا جواز کیا مجبوری تھی؟... دوگنی عمر، کم صورتی اور بس... یا پھر صرف ہوس... جو اس میں تھی۔ زینی میں نہیں تھی... فریب... جو اس میں تھا زینی میں نہیں تھا... جھوٹ... جو اس میں تھا زینی میں نہیں تھا... وہ بری طرح جھنجلایا آخر اس وقت وہ کیوں زینی کے ساتھ اس کا موازنہ کرنے بیٹھ گیا تھا... کیوں بار بار اس کے بارے میں... ؟ وہ اب جیسے خود پر پہرے بٹھانے لگا تھا... سوال صرف اب زری کا تھا... صرف زری کا... وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے... اس کا مطالبہ مان لے؟... یا اسے واپس پاکستان بھجوا دے... ؟

اور اس مشکل کو اس کے گھر والوں نے آسان بنا دیا تھا جنہوں نے یہ سب پتہ چلنے پر ایک ہنگامہ بر پا کر دیا تھا۔ وہ واقعی ان کا رد عمل دیکھ کر واقعی ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اور شاید پہلی بار بری طرح پچھتایا تھا۔ کہ اس نے کیوں زری اور جمال کے بارے میں اپنی ماں کو بتایا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کی ماں فوری طور پر یہ سب کچھ اس کے بہن بھائیوں کو بتائے گی اور اس کے بعد ہر ایک کی جیسے دلی مراد بر آئے گی۔ ہر ایک فوری طور پر ہی چاہتا تھا کہ کرم زری کو طلاق دے کر اسے پہلی فلائٹ سے واپس پاکستان بھیج دے بلکہ ان کے لیے اگر ممکن ہوتا تو وہ یہ کام خود ہی سرانجام دے دیتے۔ کرم کوشش کے باوجود ان سب سے یہ نہیں کہہ سکا کہ یہ اس کی زندگی ہے اور اس کے بارے میں کم از کم اب کوئی فیصلہ کرنے کا حق صرف اسے ہی ہے۔ وہ سب بظاہر اس کی ہمدردی اور محبت سے تڑپ رہے تھے اور کرم کے لیے اس طرح کی سچویشن میں کوئی ایسی بات کرنا بے حد مشکل تھا۔ جب اس کی پوری فیملی محاذ بنا لیتی تھی تو ہمیشہ اسے ہی چپ ہونا پڑتا تھا۔ اس وقت بھی وہی ہو رہا تھا۔ لیکن وہ جان گیا تھا کہ اگر زری اس طرح طلاق لے کر پاکستان گئی تو اس کے گھر والے کیا سلوک کر سکتے تھے۔

وہ وہاں سب کی باتیں سن کر وہاں سے بھی اسی طرح اٹھ کر آ گیا تھا۔ زری اور اس کے درمیان بات چیت مکمل طور پر بند تھی اور اس میں دونوں طرف سے کسی شعوری کوشش کا عمل دخل نہیں تھا۔ زری اس سے چھپتی پھرتی تھی اور جب بھی آمنا سامنا ہو جاتا تو کرم کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس سے کیا کہے۔ اس نے زری کو یہ ضرور بتا دیا تھا کہ وہ اسے طلاق دینے کی تیاری کر رہا ہے۔ اور چند دنوں کے اندر اسے کاغذات دے دے گا۔ زری نے اس سے دوبارہ جمال کو بلوانے کی بات نہیں کی تھی شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ کرم یہ کام نہیں کرے گا۔

اپنی فیملی کے ساتھ ہونے والی اس سٹنگ کے دوسرے ہی دن اسے آفس میں روتی ہوئی زری کا فون آیا۔ کرم کی فیملی اس وقت کرم کے گھر پہنچی ہوئی تھی۔ اور وہ اسے اسی وقت گھر سے نکالنا چاہتے تھے۔ زری نے کمرے کو لاک کیا ہوا تھا اور کرم عقب میں دروازے پر ہونے والا شور سن سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو کرم کو یقین نہیں آیا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے گھر پر ہو رہا تھا۔ زری اس کی بجائے ایک کال پولیس کو کر دیتی تو اس سمیت اس کے تمام گھر والوں کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اور اس وقت یہ واقعی اس کی مہربانی ہی تھی کہ اس نے کرم کو فون کیا تھا پولیس کو نہیں۔

کرم اسی وقت آفس سے نکل آیا۔ آفس سے گھر آنے کے دوران اس نے فون کر کے اپنے بھائی اور ماں سے بات کی لیکن اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے وہاں پہنچے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلے گا۔ اور گھر پہنچتے ہی پہلی بار اس کا فیوز بری طرح اڑا تھا۔ جب اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی آصف کو زری کا بازو پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر نکالنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ اس کے پیچھے اس کی پوری فیملی تھی جو غنیمت تھا کہ اس وقت آصف کی طرح اسے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے صرف زبانی طور پر آصف کو ہلا شیری دینے تک ہی محدود تھے۔

"بازو چھوڑو اس کا۔" کرم نہ بھی کہتا تب بھی اسے دیکھ کر آصف پہلے ہی اس کا بازو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کوریڈور میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ "تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" کرم نے زری سے کہا۔ "تیری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں کرم۔ اس آوارہ عورت کو کمرے میں بھیج رہا ہے۔"

اس کی ماں نے زری کو واپس اندر جاتے دیکھ کر واویلا کرنا شروع کر دیا۔

"جی۔ پتھر پڑ گئے ہیں۔" کرم نے بے حد سرد مہری سے کہا۔

''اس وقت ہی پڑ گئے تھے جس وقت آپ سب کے کہنے پر اس سے شادی کی تھی۔''

وہ پہلی بار ان سب کی موجودگی میں تلخ ہو رہا تھا۔

''اور تم... تم نے کس سے پوچھ کر اس کا بازو پکڑا ہے۔'' وہ اب آصف پر برسا تھا۔

''بھائی جان وہ...'' آصف کچھ حواس باختہ ہو کر ماں کو دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا۔

''میں نے کب کہا تھا اسے گھر سے نکالنے کو... میں لے کر آئی ہوں سب کو یہاں پر... تو نے تو اتنے دن سے سب کچھ جاننے کے باوجود اسے مہارانیوں کی طرح رکھا ہوا ہے...''

اس کی ماں نے بروقت مداخلت کر کے آصف کو بچایا تھا۔

''آپ لوگ اپنے اپنے گھر جائیں اور دوبارہ اس طرح کے کسی کام کے لیے یہاں نہ آئیں... مجھے اس طرح کی مدد اور تعاون کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے اپنے بہن بھائیوں سے نظریں ملائے بغیر دو ٹوک انداز میں ان سے کہا۔

''دو ٹکے کی لڑکی کے پیچھے ماں اور بہن بھائیوں کو گھر سے نکال رہا ہے... خون سفید ہو گیا ہے تیرا کرم... ہم سب تیری محبت میں یہاں دوڑے آئے اور تو اپنی اس آوارہ بیوی کو اندر بٹھا کر ہمیں دھکے دینے پر اتر آیا ہے۔'' اس کی ماں اب بری طرح اشتعال میں آ گئی تھی۔

''میں کسی کو اس گھر سے نہیں نکال رہا... نہ ان کو نہ زری کو...'' کرم نے بے بسی سے کہا۔ ''لیکن میں اپنے گھر میں اس طرح کا ہنگامہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''نہیں چاہتے تو اسے اسی وقت فارغ کر کے پاکستان بھیجو۔''

''میں نے کب کہا کہ میں اسے طلاق نہیں دے رہا... میں چند دن میں اسے طلاق دے رہا ہوں لیکن تب تک میں اسے سڑک پر تو نہیں پھینک سکتا۔''

''جب اس نے تمہارا خیال نہیں کیا تو تم اس کا خیال کیوں کرو؟''

''وہ اس کا عمل تھا یہ میرا عمل ہے۔''

''تو بزدل ہے کرم... تجھ میں ہمت ہی نہیں ہے ایسا قدم اٹھانے کی۔'' اس نے ماں کی باتیں خاموشی کے ساتھ سنی تھیں جو کچھ دیر وہاں بکتی جھکتی رہی پھر اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ وہاں سے چلی گئی تھی۔

کرم اپنے کمرے میں چلا آیا۔ زری بے حد پریشان کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اسے کبھی اندازہ بھی نہیں تھا کہ اسے اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا پہلی بار وہ طلاق کے بعد اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ کر خوفزدہ ہو رہی تھی۔ کرم نے اس سے اپنے گھر والوں کے رویے کے لیے معذرت کی اور پھر اسی سانس میں کہا۔

''تم جہاں کو بتاؤ کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

زری جیسے ٹھٹھک کر رہ گئی۔

''کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اس سے؟'' وہ کچھ پریشان ہوئی تھی۔

''اسے پاکستان اپنے کسی دوست کے پاس بھجوانا چاہتا ہوں تاکہ وہ اس کے پیپرز تیار کروا کے اس کے ویزا کے لیے اپلائی کرے اور وہ یہاں آ جائے۔'' زری کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

''آپ اسے یہاں بلا رہے ہیں۔''

''تمہاری خواہش ہے یہ۔'' کرم علی نے سنجیدگی سے کہا۔ اب واقعی ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اس معاملے کو جتنی جلدی نمٹا سکتا تھا نمٹا دیتا۔

جمال سے اس کی دوسرے دن بات ہوئی تھی اور کرم علی کو پہلے چند جملوں میں ہی جمال کے بارے میں کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔

اس نے اسے اپنے دوست کے پاس جانے کا کہا تھا، اپنے پاسپورٹ اور آئی ڈی کارڈ کے ساتھ۔ جمال نے دل میں ہزاروں خدشات لے کر اس کی بات سنی تھی، اسے یقین تھا کرم علی اس کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔ اگر زری اگلے چند دن اسے مسلسل مجبور نہ کرتی رہتی تو جمال کسی بھی قیمت پر کرم علی کی ہدایات کے مطابق اس دوست سے جا کر نہ ملتا۔

کرم علی نے اسی ہفتے کے دوران زری کو طلاق دے دی تھی لیکن اسے گھر سے جانے کا کہنے کے بجائے وہ خود اس مدت تک کے لیے ایک دوسرے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ جب تک زری کی عدت پوری نہیں ہو جاتی۔

اس کی ماں نے اس بات پر بھی ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یوں پورا گھر زری کے ہاتھ میں دینے سے وہ گھر کی ہر چیز غائب کر دے گی اور یہ پہلا موقع تھا جب کرم علی نے اپنی ماں کو قانونی معاملات کے بارے میں بتا کر ان کے اشتعال کو ٹھنڈا کر دیا۔ وہ زری کو ایک کم پڑھی لکھی لڑکی سمجھ کر یوں سمجھے بیٹھے ہیں جیسے وہ پاکستان میں تھے اور وہ پاکستان میں اس کے ساتھ طلاق دینے کے بعد جو چاہے کر سکتے تھے۔ وہ روز کی ملامت جو کرم علی کو ماں سے تقریباً روز فون پر سننا پڑتی تھی، وہ اس کے بعد بند ہو گئی تھی۔

لیکن کرم علی کے بہن بھائیوں کو ساتھ ہی یہ خدشات بھی پیدا ہونے لگے تھے کہ زری عدت ختم ہونے کے بعد پاکستان جانے کے بجائے کہیں کورٹ نہ پہنچ جائے اور اگر اس نے کرم علی کی جائیداد کے حوالے سے کچھ مطالبات کر دیے تو... اور اس ''تو'' نے کرم علی کی فیملی کو بری طرح سے حواس باختہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کو اس رشتے اور کرم علی کی اس شادی کے لیے موردِ الزام ٹھہرانا شروع کر دیا تھا۔

وہ کم عمر کم پڑھی لکھی سیدھی سادی، بھولی بھالی تابعدار لڑکی اب یک دم وہ ہڈی بن گئی تھی جسے وہ نہ نگل سکتے تھے نہ اگل سکتے تھے۔ ہر ایک اب زری کے ہر قیمت پر ایک بار اس کے پاکستان پہنچ جانے کی دعائیں کر رہا تھا یہ جانے بغیر کہ کرم علی اس کے لیے کیا پلان کیے بیٹھا تھا اور اگر اس کے اس منصوبے کی ان میں سے کسی کو خبر ہو جاتی تو وہ جو طوفان نہ کھڑا کر دیتے وہ کم تھا۔

اس لیے کرم علی نے جمال کو وہاں بلوانے کے بارے میں اپنی فیملی کے کسی فرد کے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی۔ ان کے برعکس اسے زری کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ایک عجیب سی بے حسی تھی جو زندگی کے اس مرحلے پر اس پر طاری ہو گئی تھی۔ اگر وہ اپنے گھر کو ٹوٹنے سے نہیں بچا

سکتا تھا۔ تو چند لاکھ ڈالرز کو بچانے کے لیے جدوجہد کیوں کرتا۔ زری اس کی عزت اور ناموس کی حفاظت نہیں کر سکی تو وہ اس سے کسی اور اخلاقی قدروں کا کیا مطالبہ کرتا۔

''وہ عورت'' تھی جو بھی کرتی کم تھا۔

زری بے حد خوش تھی۔ اس کا اندازہ کرم علی کو تب ہوتا جب وہ عدت کے دوران وقتاً فوقتاً اس سے ملاقات کے لیے جاتا رہا۔ اگرچہ یہ ملاقات چند منٹوں سے زیادہ کی نہیں ہوتی تھی اور وہ اس کی صرف خیر و عافیت دریافت کر کے آجاتا تھا۔ اس کے باوجود زری کی خوشی کا اندازہ کرنے میں اسے دقت نہیں ہوتی تھی اور یہ خوشی کرم علی کو ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار کر دیتی تھی۔

رنج اور ملال کے بیچ کا کوئی احساس تھا جو اسے ہوتا تھا، زری نے ایک سے زیادہ دفعہ کرم علی کے سامنے اپنی احسان مندی اور شکر گزاری کا ذکر کیا تھا اور کرم علی کو ایک بار بھی اس کی زبان پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ جھوٹ بولنے کی عادی تھی۔ وہ اب جھوٹ ہی بول رہی ہوگی کرم علی کو یقین تھا اور جھوٹ نہ بھی بول رہی ہوتی تب بھی اسے اس کی احسان مندی اور شکر گزاری کی ضرورت نہیں تھی۔ زندگی میں یہی دو جذبے تو تھے جن کی کرم علی کو کبھی کمی نہیں رہی تھی۔ وہ جس پر بھی احسان کرتا تھا وہ اس کا احسان مند اور شکر گزار ہوتا تھا اور بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ کسی کے دل میں اپنے لیے کوئی تیسرا جذبہ پیدا نہیں کر سکا تھا۔

عدت کی مدت گزرنے سے پہلے ہی جمال کینیڈا آ گیا تھا۔ اور اس کے وہاں آنے کے دوسرے دن کرم علی نے اسے گھر پر ملاقات کے لیے بلایا تھا اور اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی ناپسندیدگی کا وہ تاثر اور مضبوط ہوا تھا جو اس سے پہلے اس سے فون پر باتیں کرتے ہوئے بنا تھا کرم علی ایک زیرک بزنس مین تھا۔ انسانوں کو آسانی جج کر سکتا تھا۔ اور اسے اس وقت زری پر واقعی ترس آ رہا تھا شکل وصورت کے علاوہ جمال میں دوسری کوئی خوبی نہیں تھی اور کرم علی کو کوئی شبہ نہیں تھا کہ جمال سے شادی کی صورت میں زری نے اپنے لیے ایک اندھے کنوئیں کا انتخاب کیا تھا۔

کرم علی جتنی خوش دلی سے مل سکتا تھا اس سے ملا تھا کیونکہ جمال کا انداز بے حد محتاط اور عجیب تھا۔ وہ جیسے کرم علی کے بارے میں مسلسل اندازے لگانے میں مصروف تھا۔

''کچھ لیں گے آپ؟'' اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے کرم علی نے بے حد شائستگی سے پوچھا۔

''ہاں زری۔'' جمال نے بے حد مضحکہ خیز لیکن بے حد چھچھورے انداز میں کہا۔ چہرے پر ایک رنگ آنے کے باوجود کرم علی نے اس کے جواب کو نظر انداز کیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ جمال اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن وہ مستقل کمرے اور کمرے میں موجود چیزوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

''کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی آپ کو اس اپارٹمنٹ میں؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کرم علی نے اس سے کہا۔ جمال چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''نہیں۔''

آپ اور زری شادی کے بعد بھی اسی اپارٹمنٹ میں رہیں گے۔ کرم نے اسے مطلع کیا۔ جمال کے ماتھے پر ایک شکن آئی۔ خریدا ہے آپ نے ہمارے لیے؟''

''ایک سال کے لیے کرائے پر لیا ہے۔''

''اس احسان کی کیا ضرورت تھی کرائے پر تو میں بھی لے سکتا تھا۔''

جمال کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی آئی۔

''مرضی ہے آپ کی۔ نہ رہنا چاہیں تو چھوڑ دیں۔'' کرم علی کے جواب نے جمال کو چند لمحوں کے لیے خاموش کر دیا تھا۔ اسے شاید اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح بھی بات کر سکتا ہے۔ ابھی اس کے ساتھ ہونے والی دو چار بار کی گفتگو میں کرم علی نے ہمیشہ بے حد شائستگی اور تہذیب کا مظاہرہ کیا تھا اور یہ وہ خاصیت تھیں جن سے جمال ناواقف تھا۔ اپنی سابقہ بیوی کی اس کے کسی پرانے آشنا سے شادی کروانے والے مرد کو جتنا کمزور سمجھ سکتا تھا وہ اتنا ہی کمزور سمجھ کر اس سے بات کر رہا تھا۔

''زری بتا رہی تھی کہ آپ نے میرے لیے کسی کام کا بندوبست کیا ہے۔'' جمال نے پہلے جھٹکے کے بعد سنبھلتے ہوئے کہا۔

''ہاں ایک فیکٹری میں پیکنگ کا۔''

کرم علی نے سنجیدگی سے کہا۔

''اب میں کینیڈا آ کر اس طرح کا چھوٹا موٹا کام کروں گا؟'' جمال ایک بار پھر اپنی ناگواری چھپا نہیں سکا۔

''آپ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ کسی ہنر سے بھی واقف نہیں انگلش بھی آپ کو نہیں آتی۔ اس صورت حال میں اسی طرح کا کام ہی کرنے کو ملے گا آپ کو۔'' کرم علی نے اس کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''اس طرح کا کام تو میں خود بھی ڈھونڈ سکتا تھا اس کے لیے مجھے آپ کے احسان کی کیا ضرورت تھی۔'' جمال اس بار اپنی ناراضی کو چھپا نہیں سکا تھا۔

''آپ کی مرضی ہے نہ کرنا چاہیں تو نہ کریں۔''

کرم علی نے ایک بار پھر اسی سرد مہری کے ساتھ کہا تھا۔

جمال کو ہتک کا احساس ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کرم علی سے مزید کچھ پوچھتا۔ زری کمرے میں آ گئی تھی۔ اور بے اختیار جمال کی طرف گئی تھی۔ اگر اچانک اسے کرم علی کی وہاں موجودگی کا احساس نہ ہو جاتا تو وہ یقیناً جمال سے لپٹ جاتی، وہ کچھ ایسی ہی سرخوشی کے عالم میں تھی۔

کرم علی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا وہاں اس کی موجودگی اب غیر ضروری تھی۔ دس منٹ کے بعد زری اس کے پاس آئی اور اس نے کرم علی سے کہا کہ وہ جمال کے ساتھ جانا چاہتی ہے کرم علی نے اسے یاد دلایا تھا کہ اس کی عدت میں ابھی وقت باقی ہے۔ لیکن زری بضد رہی کہ وہ جمال کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ کرم علی نے مزید کوئی اعتراض کیے بغیر اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

زری بے حد جوش و خروش میں اپنے کمرے میں آئی اور اس نے پیکنگ شروع کر دی۔ اور پیکنگ کرتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ وہ صرف ایک دن میں اپنا سارا سامان پیک نہیں کر سکتی تھی جو جگہ جگہ پر بکھرا ہوا تھا۔ اس نے جمال کے ساتھ جانے کا ارادہ کچھ دن کے لیے ملتوی کر دیا۔

جمال کچھ ناخوش ہو کر واپس گیا تھا۔ اور اس کے جانے کے بعد کرم علی نے زری سے کہا تھا کہ وہ اس کے گھر سے اپنے سامان کے علاوہ بھی اگر کچھ لے کر جانا چاہتی ہے تو لے جائے اسے اعتراض نہیں ہوگا۔ اس نے زری کو کچھ مزید رقم کا ایک چیک بھی دیا تھا۔ وہ واقعی جتنے اچھے طریقے سے اسے اپنے گھر سے رخصت کر سکتا تھا رخصت کر رہا تھا اور اس سے وہ چیک لیتے ہوئے زری کو پہلی بار صحیح معنوں میں کرم کے لیے ممنونیت کا احساس ہوا تھا۔ ''آپ کو مجھ پر اور جمال پر غصہ نہیں آ رہا کرم؟'' اس نے پتہ نہیں کس خلش سے مجبور ہو کر کہا تھا۔ ''تم پر آیا تھا غصہ مجھے۔ تم بیوی تھی عزت تھی میری تم سے توقعات تھیں مجھے جمال پر کیوں آتا؟ وہ غیر آدمی تھا اس سے میرا کیا رشتہ تھا۔ جس کا لحاظ یا پاس وہ کرتا۔''

''مجھے بہت شرمندگی ہے میں نے آپ کو دکھ پہنچایا۔''

''دکھ بڑا چھوٹا لفظ ہے زری۔ بڑا ہی چھوٹا لفظ ہے تم نے ایک اور رشتے پر سے میرا اعتبار ختم کر دیا۔'' وہ اس وقت اس کے ساتھ یہ ساری باتیں کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ رشتہ ختم ہو جانے کے بعد یہ ساری باتیں بے کار تھیں۔ لیکن زری بہت مہینوں کے بعد اس سے اس موضوع پر بات کر رہی تھی اور پتہ نہیں وہ اس تک کیا پہنچانا چاہتی تھی۔ ''آپ مجھے بہت برا سمجھتے ہوں گے کرم۔ لیکن میں بری لڑکی نہیں ہوں۔''

''میں نے کب کہا کہ تم بری ہو۔ لیکن تم نے جو کچھ کیا وہ برا تھا چاہے اس کے لیے تمہارے پاس کتنی ہی مضبوط وجوہات کیوں نہ ہوں۔ لیکن اب ان باتوں پر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ واحد نصیحت تمہیں میری یہی ہے کہ عدت کے چند ہفتے باقی ہیں وہ گزار کر یہاں سے جاؤ۔ اور پھر اس مسجد کے امام سے مل لینا وہ جمال کے ساتھ تمہارا نکاح کر دے گا۔ میں نے اس سے تم لوگوں کے بارے میں بات کی ہے۔''

زری نے اس کے ہاتھ سے وہ کارڈ پکڑ لیا جو کرم نے اسے والٹ سے نکال کر اس کے سامنے کیا تھا۔ ''آپ بڑے اچھے آدمی ہیں کرم۔''

زری کے لہجے میں ممنونیت جھلک رہی تھی۔ احسان مندی۔ شکر گزاری۔ ممنونیت۔ کرم نے ایک گہرا سانس لیا اور مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

اگلے چند دنوں میں وہ زری کے وہاں سے چلے جانے کی توقع کر رہا تھا لیکن اسے حیرت ہوئی جب وہ اپنی عدت ختم کرنے کے بعد ہی وہاں سے گئی۔

☆☆☆

جمال کے ساتھ زری کی زندگی کیسے گزرنے والی تھی زری کو نکاح کے فوراً بعد پہلی بار جمال کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں آتے ہی جان گئی تھی۔

''یہ ہے وہ ڈربہ جو تمہارے سابقہ شوہر نے ہمارے لیے پسند کیا ہے۔'' جمال نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی بے حد طنزیہ انداز میں اس سے کہا تھا۔

''کیوں کیا ہوا اسے؟ اچھا خاصا تو ہے۔'' زری نے گھر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''اچھا خاصا؟... اس کا اپنا گھر دیکھا ہے تم نے؟'' جمال نے خفگی سے کہا۔

''وہ اس کا اپنا گھر ہے... اس کی اپنی کمائی کا۔'' زری نے بے ساختہ کہا، اور کہہ کر پچھتائی۔

''میں اچھی طرح جانتا تھا تو ایک دن کمائی کا طعنہ ضرور دے گی مجھے۔'' جمال بری طرح بگڑا تھا۔

''طعنہ تھوڑی دے رہی ہوں بس بات کر رہی ہوں میں۔'' زری نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''تیرے لیے بات ہے میرے لیے گالی ہے یہ... سب کچھ پاکستان میں چھوڑ کر میں تیرے لیے پردیس آ بیٹھا ہوں اور تو یہاں آ کر بھی کمائی کا طعنہ دے رہی ہے مجھے۔'' جمال بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ زری کو اسے منانے میں کئی گھنٹے لگے۔ یہ وہ جمال نہیں تھا جو کچھ ماہ پہلے پاکستان میں اس کے آگے پیچھے دم ہلاتا پھر رہا تھا۔ جب وہ کرم علی کی بیوی تھی... اب وہ ''اس'' کی بیوی تھی... اور اپنی سب کشتیاں جلا کر آئی تھی اور جمال یہ جانتا تھا۔

اگلے چند ہفتے دونوں کے درمیان چھوٹی موٹی تکرار ہوتی رہی لیکن کوئی بڑا جھگڑا نہیں ہوا اس میں بڑا ہاتھ زری کا ہی تھا۔ زری کے پاس فی الحال پیسے کی بہتات تھی اور وہ جمال کے ساتھ کینیڈا میں گھومتی پھرتی اور اس پر کھلے ہاتھ سے روپیہ خرچ کرتی رہی... ایسے حالات میں جھگڑے کا امکان کچھ کم ہی تھا۔ پاکستان میں کرم کے ساتھ اس کی طلاق اور جمال کے ساتھ اس کی شادی کا پتہ چل چکا تھا۔ اس کے گھر والوں نے ابتدائی لعنت وملامت کے بعد بالآخر اس کی شادی کو تسلیم کر لیا تھا۔ وہ جمال کے ساتھ پاکستان آ جاتی تو وہ اس شادی کو کسی صورت میں تسلیم نہ کرتے مگر وہ کینیڈا میں تھی۔ اور اس کے گھر والوں کو ہر ماہ کینیڈا سے آنے والی رقم کی عادت ہو چکی تھی۔ غربت بہت ساری بنیادی صفات سے انسان کو محروم کر دیتی ہے اور اس میں سے ایک خودداری بھی ہوتی ہے۔ وہ زری سے قطع تعلق کر لیتے تو ان کا گھر کیسے چلتا... کینیڈا سے آنے والے چیک کی مالیت کم ہو چکی تھی لیکن بہرحال اب کرم کی بجائے زری انہیں تھوڑی بہت رقم بھجوا رہی تھی ان کے یہ اتنا ہی کافی تھا۔

زری اور جمال کے درمیان پہلا بڑا جھگڑا تب ہوا جب چند ہفتے گزرنے کے بعد ایک دن زری نے جمال کو اس جگہ کام پر جانے کے لیے کہا جہاں کرم نے اس کے لیے کام کا بندوبست کیا تھا۔ جمال نے دوٹوک الفاظ میں وہاں جانے سے انکار کر دیا... وہ وہاں تو کیا فی الحال کہیں بھی کام پر جانے کے لیے تیار نہیں تھا اور وہ یہ بات سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ زری بار بار اسے کام پر جانے کے لیے مجبور کیوں کر رہی تھی جب اس کے پاس کرم کا دیا ہوا ''اتنا'' پیسہ تھا۔ یہ صرف زری جانتی تھی کہ وہ اتنا پیسہ اب آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہونے لگا تھا اور اس کی بنیادی وجہ جمال تھا جس کے ذاتی اخراجات گھر کے اخراجات سے بھی تجاوز کر جاتے تھے اگلے چند دن بھی ان کے درمیان اسی طرح جھگڑے ہوتے رہے پھر بالآخر جمال اس فیکٹری میں چلا گیا جہاں کرم نے اس کے لیے کام کا بندوبست کیا تھا۔ زری نے سکون کا سانس لیا تھا لیکن شام کو اس کے واپس آتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سکون عارضی تھا۔

''میں دوبارہ کبھی اس فیکٹری میں نہیں جاؤں گا... بتا رہا ہوں تجھے میں۔'' جمال نے زری کے دروازہ کھولتے ہی اعلان کرنے والے انداز میں اسے بتایا تھا۔ زری کی جیسے جان پر بن آئی۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''تمہارے پچھلے شوہر نے مجھے ذلیل اور تنگ کرنے کے لیے یہ کام دیا ہے مجھے۔۔۔ اپنے کسی دوست کی فیکٹری میں کام دلوایا ہے مجھے اور جہاں پہلے ہی دن شفٹ انچارج نے ذلیل کیا مجھے۔۔۔''

''لیکن کیوں؟'' زری پریشان ہونے لگی تھی۔

''کبھی کہہ رہا تھا میں سگریٹ نہ پیوں۔۔۔ کبھی کہہ رہا تھا اور کرز باتھ روم میں اتنی دیر نہیں بیٹھتے۔۔۔ کبھی کہہ رہا تھا میں توجہ سے کام نہیں کر رہا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ میں بتا رہا ہوں تمہیں میں نے اب وہاں نہیں جانا۔''

''ٹھیک ہے مت جاؤ وہاں۔۔۔ پھر کہیں اور کام ڈھونڈ لو۔'' زری نے کہا۔

''ڈھونڈ لوں گا کام بھی۔۔۔ چار دن کام نہیں کریں گے تو بھوکے نہیں مر جائیں گے ہم دونوں۔'' جمال نے بے حد غصے سے کہا۔

''جمال پیسے ہی دو ماہ ہو گئے ہیں اور۔۔۔'' زری نے کچھ کہنا چاہا لیکن جمال نے بے حد غصے میں اس کی بات کاٹی۔

''میں نے کہا نا ڈھونڈ لوں گا کام۔۔۔ تو خوہ مخواہ میرا دماغ چاٹنے مت بیٹھا کر۔'' جمال تلخی سے کہتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ زری پر جیسے اوس پڑ گئی تھی۔ جمال کے چند دنوں کا مطلب صرف چند دن نہیں تھا۔۔۔ کتنے دن ہوتا یہ وہ سوچ کر فی الحال اور پریشان نہیں ہونا چاہتی تھی۔

''مجھے کچھ پیسے دے۔'' وہ سنک میں برتن دھو رہی تھی جب اس دن جمال نے آکر اس سے کہا تھا۔ وہ اس ایک دن فیکٹری میں جانے کے بعد کام کے لیے دوبارہ گھر سے نہیں نکلا تھا۔

''کس لیے؟''

''ہر بار تیرا سوال کرنا ضروری ہوتا ہے؟'' جمال کو اس کے سوال پر غصہ آیا تھا اور زری کو اس کے مطالبے پر۔

''دیکھ جمال تو بے مقصد پیسے لے کر ضائع کرتا ہے۔''

''میں بے مقصد پیسے لے کر ضائع کرتا ہوں اور جو پیسے تو ہر ماہ اپنے ماں باپ کو بھیجتی ہے وہ ضائع نہیں ہوتے۔'' جمال نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''وہ میرے حق مہر کے پیسے ہیں کرم نے دیے تھے مجھے۔'' زری نے تنگ کر کہا۔

''ہاں سارا کچھ کرم نے ہی دیا ہے مجھے اور تیرے ماں باپ کو۔۔۔ تجھے تو بہانے بہانے سے اسے یاد کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔''

زری اس کی بات پر غصے سے سرخ ہو گئی تھی۔

''دیکھ جمال بار بار مجھے کرم کے طعنے مت دیا کر۔۔۔ میں تنگ آ گئی ہوں تیری ایسی باتوں سے۔''

''میری باتوں سے نہیں مجھ سے تنگ آ گئی ہے تو۔۔۔ اب کوئی تیسرا شوہر نظر آنے لگا ہو گا تجھے۔'' وہ جمال کی بات پر سناٹے میں رہ گئی تھی۔

''تو نے کیا کہا مجھے؟''

''جو کہنا تھا کہہ دیا۔۔۔ تو بہری نہیں ہے۔'' جمال نے غصے سے کہا اور شیلف پر پڑا گلاس زور سے فرش پر پھینک کر توڑتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

وہ ٹوٹنے والی واحد چیز نہیں تھی آنے والے ہفتوں میں جمال نے گھر کی اور بھی کئی چیزیں توڑی تھیں ہر بار اسے جب پیسوں کی ضرورت ہوتی اور زری اسے

پیسے دینے میں معترض ہوتی تو جمال یہی کرتا تھا... چلاتا گالیاں دیتا اور پھر چیزیں توڑنے لگتا۔ زری لامحالہ اسے پیسے دینے پر مجبور ہو جاتی۔

اگر مکافات عمل نام کی کوئی شے تھی تو زری کے لیے یہ مکافات عمل دنیا میں بہت جلد شروع ہو چکا تھا۔ وہ محبت جس نے اتنے سالوں سے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی وہ یک دم جیسے کہیں غائب ہو گئی تھی۔ وہ جتنی دیر گھر پر رہتا دونوں کے درمیان کسی نہ کسی بات پر تکرار ہوتی رہتی۔ زری کے پاس موجود رقم تیزی سے کم ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا اور اخراجات کو ختم کرنے کا بھی کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ جمال اس کے لیے ایک سفید ہاتھی بن گیا تھا اور اس کے ساتھ رہتے ہوئے اسے دن میں کئی بار کرم یاد آتا۔ اس نے اس کے ساتھ جو وقت گزارا تھا وہ واقعی جنت میں رہنے کے مترادف ہی تھا اور بعض دفعہ اسے شدید پچھتاوا بھی ہوتا لیکن صحیح معنوں میں اسے کرم پہلی بار تب یاد آیا تھا جب جمال نے پہلی بار اس پر ہاتھ اٹھایا۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے کسی نائٹ کلب سے شراب پی کر آ رہا تھا اور اس دن بھی نشے کی حالت میں گھر واپس آنے پر ان کے درمیان جھگڑا ہوا تھا جس پر جمال نے اس کے چہرے پر تھپڑ کھینچ مارا۔ وہ پاکستان میں ہوتی تو ایسا کوئی تھپڑ اسے اس طرح پتھر کے بت میں تبدیل نہ کرتا کیونکہ اس طرح کی مار پیٹ اس محلے کی عورتوں اور خود اس کی ماں اور بہنوں کی زندگی کا ایک اہم جز تھی لیکن سارا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کرم کے ساتھ رہ کر آئی تھی جس نے ہاتھ اٹھانا تو در کنار کبھی اس سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی تھی اور اب اس کے چہرے پر تھپڑ پڑا تھا تو زری کے اعصاب واقعی سن ہو گئے تھے اس رات وہ پہلی بار کرم کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ وہ دوگنی عمر، معمولی شکل و صورت اور برص کے داغ جن کے طعنے دے دے کر اس نے کرم کا جینا اجیرن کر دیا تھا اب وہ یک دم جیسے بے معنی ہو گئے تھے اس کے لیے... اس شخص کی ہر خامی کے باوجود وہ اس کے ساتھ سکون سے زندگی گزار رہی تھی عزت اور محبت سے رکھا ہوا تھا اس نے اسے... پھر اس اندھے کنویں کا انتخاب کیوں کیا اس نے؟... زری کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ خود کو لاکھ عقل مند سمجھنے کے باوجود اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جمال کو اچھی طرح جاننے کے باوجود اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا سوچ کر کیا تھا۔

جمال نے دوسرے دن اس سے معافی مانگ لی تھی۔ زری نے اسے معاف بھی کر دیا تھا اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی یہ کرم کا گھر نہیں تھا جہاں وہ ماتھے پر بل ڈالے پھرتی رہتی اور کرم اس کی خفگی دور کرنے اور دلجوئی کرنے کی کوشش کرتا۔

جمال سے شادی کے چھ ماہ بعد وہ پہلی بار پریگنٹ ہوئی اور دو ماہ کے بعد اس کا پہلا اسقاط حمل ہو گیا اور یہی وہ وقت تھا جب جمال نے اس کی کافی تیمارداری کی اور وقتی طور پر اس کی زبان میں جیسے شہد جیسی مٹھاس آ گئی تھی۔ زری جسمانی اور جذباتی طور پر اس وقت بری طرح کسی سہارے کی محتاج تھی اور وقتی طور پر اسے لگا جیسے جمال واقعی بدل گیا تھا اور اسی خوش فہمی میں اس نے جمال کو بینک میں پڑی رقم کا بڑا حصہ نکال کر دے دیا کیونکہ وہ وہاں اوٹاوا میں کسی پاکستانی کے ساتھ مل کر کوئی بزنس شروع کرنا چاہتا تھا۔ وہ چند بار اس پاکستانی کو لے کر گھر بھی آیا اور زری کو وہ آدمی قابل اعتبار لگا تھا۔ اگلے چند ماہ جمال بلاناغہ گھر سے کام پر جاتا رہا اور اس نے وقتاً فوقتاً گھر کے اخراجات کے لیے زری کو کچھ رقم بھی دی اور زری یہ سمجھنے لگی کہ اب اس کا کام چل نکلا ہے۔ اس کے سارے مسئلے ختم ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کی یہ خوش فہمی بھی دور ہو گئی تھی جب جمال نے ایک ماہ کے بعد دوبارہ گھر پر رہنا شروع کر دیا۔ چند ہفتے اس نے بیماری کا بہانہ بنایا پھر چند ہفتے کچھ اور بہانے اور پھر جب بالآخر زری کی

برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا تو اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ اسے یہ خبر سنا دی تھی کہ اس کے پارٹنر نے اس کے ساتھ فراڈ کیا ہے اور وہ اس کی رقم لے کر غائب ہو گیا تھا۔ زری کو جیسے ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے رہ گیا تھا وہ کتنے آرام سے یہ کہہ رہا تھا کہ رقم ڈوب گئی۔

''ساری دنیا تیری ہی رقم لے کر کیوں بھاگتی ہے؟ پہلے پاکستان میں ایجنٹ نے تمہارے ساتھ فراڈ کیا۔ اب یہاں یہ آدمی مل گیا تجھے۔'' زری کو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔

''تو کہنا کیا چاہتی ہے؟ یہ کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔ دھوکہ دے رہا ہوں تجھے؟'' جمال بھی بری طرح بگڑا تھا۔

''اور کیا کر رہا ہے تو؟ گھر میں جو رقم تھی وہ کھا گیا تو۔ بینک میں پڑی رقم کاروبار میں ڈبو دی تو نے۔ اب باقی رہ کیا گیا ہے؟ کس طرح چلے گا یہ گھر؟''

''تیرا زیور ہے نا ابھی۔'' جمال نے بے حد اطمینان سے کہا۔ ''یا پھر ایسا کر جا کر کرم سے کچھ رقم لے آ۔'' جمال نے بے حد ڈھٹائی سے کہا تھا اور زری کے اشتعال میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''تو اس قدر بے شرم ہو گیا ہے کہ مجھے کرم کے پاس پیسے مانگنے کے لیے جانے کو کہہ رہا ہے۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ کہا۔

''تو اتنی غیرت مند تھی تو پہلے کیوں لیا کرم سے تو نے پیسہ؟ پہلے تو اور تیرے ماں باپ اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹتے رہے۔'' جمال نے اسے طعنہ دیا۔ اس کا انداز بے حد سلگانے والا تھا۔

''تیرے لیے کیا جو بھی کیا۔ ورنہ میں تو بڑی خوش تھی اس کے ساتھ۔'' زری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ لیکن جمال ان آنسوؤں سے ذرہ برابر متاثر نہیں ہوا تھا۔

''میرے لیے؟ ... یہ کہہ تجھے دوسرا آدمی چاہیے تھا۔ تیرے جیسی عورتیں کسی ایک مرد کے ساتھ وفاداری سے کیسے رہ سکتی ہیں؟ پتہ نہیں میں گھر پر نہیں ہوتا تو یہاں کتنے آتے ہیں جن کے لیے تو ہر وقت مجھے گھر سے باہر کام پر بھیجنا چاہتی ہے۔ ... میں بھلا سمجھتا نہیں ہوں کیا؟'' جمال نے بے حد زہریلے انداز میں کہا اور اس نے جیسے زری کے زخموں پر نمک پاشی کر دی تھی۔

''خبردار اگر تو نے ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نکالا تو۔'' زری نے تقریباً غصے سے کانپتے ہوئے چلا کر اس سے کہا تھا۔ لیکن جمال نے اس کا جواب اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ مار کر دیا تھا۔

''تو کیا کرے گی تو؟ بتا کیا کرے گی؟ ... مجھے کرم سمجھ لیا ہے تو نے؟ وہ پہلا دن تھا جب جمال نے صرف ایک تھپڑ پر اکتفا نہیں کیا تھا اس نے جی بھر کر زری کی پٹائی کی تھی زری کی مزاحمت نے اس کے اشتعال کو کچھ اور ہوا دے دی تھی۔ اس نے اسے پیٹتے ہوئے یہ نہیں دیکھا تھا کہ زری کو کہاں چوٹ لگ رہی ہے اور کہاں نہیں۔ اس کے جسم پر پڑنے والی ہر ضرب پر زری کو کرم یاد آتا رہا۔ وہ سب کچھ جو اس کے ساتھ کرتی رہی اسے تنگ کر رہا تھا اسے کرم کی بددعا لگی تھی ورنہ جمال ایسا تو نہیں تھا۔ ایسا ظالم تو وہ کبھی بھی نہیں تھا۔

وہ اگلے کئی دن روتی رہی اور کئی بار کرم کو فون کرنے کا سوچتی رہی لیکن ہر بار ایک عجیب سی ندامت اس کا ہاتھ روک لیتی تھی وہ اب اسے فون کرکے کیا کہتی ... ساری عمر زری کو جو شرم جو ہتک جو ندامت محسوس نہیں ہوئی تھی وہ آج ہونے لگی تھی۔

وہ اب دلدل میں اتر چکی تھی پولیس کو فون کرکے جمال کو Arrest کراتی تو وہاں اکیلے کس طرح رہتی اور اگر اسے آزاد رہنے دیتی تو پھر اسے یقین تھا کہ بہت جلد اس گھر میں فاقے ہونے لگیں گے اور اس کے بعد انہیں فٹ پاتھ پر آنے میں دیر نہیں لگنی تھی۔

پاکستان جو رقم وہ ہر ماہ بھجواتی تھی وہ اب اس نے بھجوانا بند کر دی تھی اور اس بندش کی وجوہات اپنے ماں باپ کو بتانے پر وہ بری طرح ان کی لعنت ملامت کا بھی شکار ہونے لگی تھی اس کی وجہ سے ان سب کا مستقبل تباہ ہو گیا تھا ... وہ ایک خوشحال زندگی گزارتے گزارتے ایک بار پھر کرائسس میں آ گئے تھے اور یہ صرف اور صرف زری کی وجہ سے ہوا تھا جس نے کرم علی جیسی سونے کی چڑیا کو اپنے ہاتھ سے نکل جانے دیا۔ اس لعنت و ملامت سے بچنے کے لیے زری نے پاکستان فون کرنا بھی بند کر دیا تھا۔

جمال کے ساتھ اس بار اس کی صلح اس کی طرف سے کسی معذرت کے بغیر ہوئی تھی ... وہ اب کینیڈا میں بھی اسی محلے کی زندگی گزارنے لگی تھی جس سے اس نے ساری عمر فرار چاہا تھا۔ جمال کی گالیاں کھانا، جمال سے پٹنا اور گھر کے اخراجات چلانے کے لیے ایک ایک پیسے کا حساب کتاب کرتے ہوئے فکر مند ہوتے رہنا ... اور اس سارے عرصے کے دوران اس کے دو اور مس کیرج ہوئے۔ اور جمال نے اسے علی اعلان بانجھ قرار دے دیا۔ وہ اب وقتاً فوقتاً کہیں نہ کہیں کام کرکے کچھ پیسے کما لیتا تھا اور آمدنی کے اس "ذاتی" ذریعے کی دریافت کے بعد زری کے ساتھ اس کے ہتک آمیز سلوک میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا ... اس کے ساتھ ساتھ گھر کے باہر اس کی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح ہر وقت گھر پر بیٹھے رہنے کی بجائے کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا اور جب واپس آتا بھی تو شراب کے نشے میں دھت کپڑے تبدیل کرکے چند دن آرام کرنے اور پھر دوبارہ سے غائب ہو جانے کے لیے ... کینیڈا میں وہ وہاں کی پاکستانی اور سکھ کمیونٹی میں پھرنے لگا تھا اور کمیونٹی سے زیادہ یہ کمیونٹی کی عورتیں تھیں جن میں وہ اور جو اس میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھیں اور ان میں سے کسی کو بھی اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ شادی شدہ تھا یہ چیز انہیں تب پریشان کرتی جب ان میں سے کوئی جمال کے ساتھ شادی کی خواہش مند ہوتی لیکن فی الحال وہ ان سب کے لیے ایک فیورٹ ٹائم پاس تھا ... ایک بے حد ہینڈسم نوجوان جسے دیکھ کر کوئی بھی عورت اس پر فدا ہو سکتی تھی اور جو خدشات پہلے بھی زری کو صرف خدشات لگتے تھے وہ اب حقیقت بن کر اس کے سامنے آنے لگے تھے ... وہ کسی بھی وقت اسے چھوڑ کر جا سکتا تھا ... اور زری جیسے 24 گھنٹے پھانسی کے تختے پر پھندا گلے میں ڈال کر کھڑی رہتی تھی۔

اپنے پاس موجود رقم کے مکمل طور پر ختم ہونے سے پہلے زری نے کہیں چھوٹا موٹا کام ڈھونڈ لیا تھا لیکن وہ جانتی تھی اس کام سے ہونے والی آمدنی گھر چلانے کے لیے کافی نہیں تھی جو اپارٹمنٹ کرم نے انہیں لے کر دیا تھا وہ چھوڑ کر وہ ایک run-down علاقے میں ایک بے حد سستے ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے تھے اور یہاں پہنچنے کے دو ہفتے کے بعد ایک دن جمال اس کے پاس موجود وہ سارا زیور لے کر غائب ہو گیا تھا۔ جو زری بے حد دقتوں سے اس سے چھپا چھپا کر اپنے پاس رکھے ہوئے تھی۔ زندگی میں پہلی بار زری کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کی کمر توڑ دی تھی یہ

زیوراس نے اب تک بیچنے کی کوشش نہیں کی تھی تمام تر مالی پریشانیوں کے باوجود اس نے ان سب کو اسی طرح محفوظ رکھا ہوا تھا۔ اور اکثر جب وہ بہت پریشان ہوتی تو اس زیور کو نکال کر دیکھتی اور اسے عجیب سا سکون اور تسلی ہوتی ابھی اس کا سب کچھ ختم نہیں ہوا تھا۔ لاکھوں کا زیور موجود تھا جسے وہ جب بھی بیچتی اچھی خاصی رقم حاصل کر لیتی اور اب جیسے کسی نے اس کی عمر بھر کی کمائی پر ڈاکہ ڈال دیا تھا۔
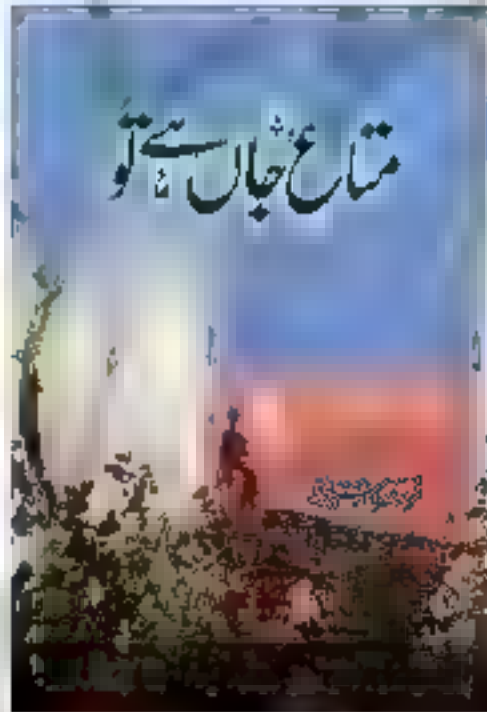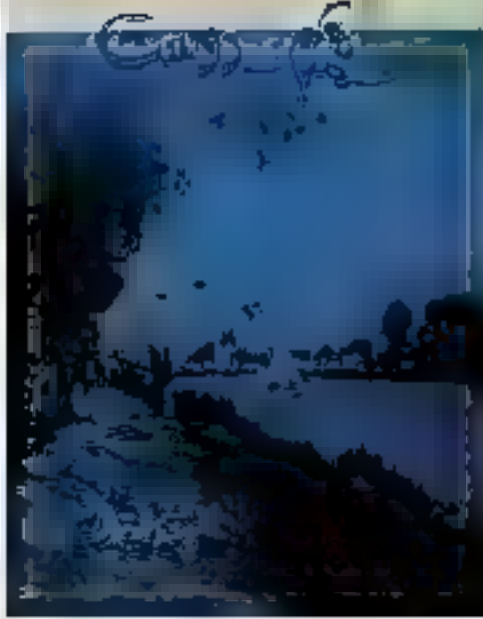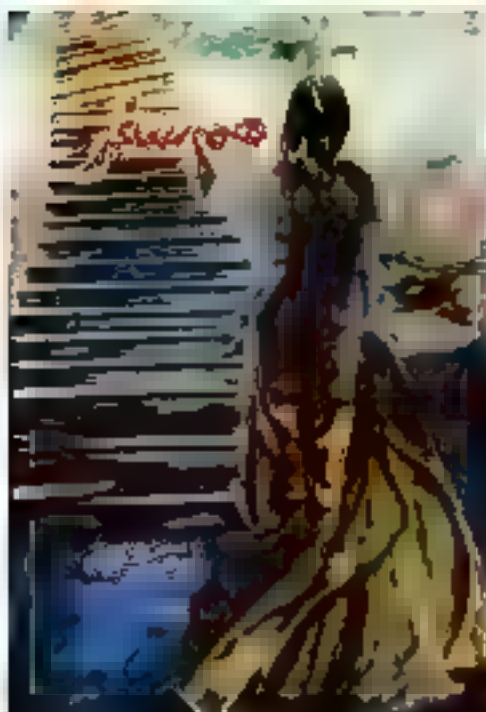
''لیکن انور حبیب صاحب میں کیسے آسکتی ہوں؟ میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے بستر پر پڑی ہوئی ہوں میں۔'' زینی نے نقاہت بھری آواز میں جھولے پر بیٹھے لیٹے کہا۔ وہ ساتھ ساتھ ٹانگیں ہلا رہی تھی جانتی تھی دوسری طرف انور حبیب کی دنیا ہل رہی تھی۔

انور حبیب نے پری زاد کے ساتھ پارٹنرشپ کے اعلان کے ساتھ ہی اس فلم کو کامیاب بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا تھا۔ وہ پہلی فلم تھی جس کے وہ سکرپٹ پر بھی محنت کر رہا تھا ورنہ اس سے پہلے انور حبیب جیسا ڈائریکٹر سکرپٹ کی اہمیت سے ہی انکاری تھا وہ علی الاعلان کہتا تھا کہ ''وہ کہانی کے بغیر بھی صرف ایکٹرز کے زور پر کسی فلم کو کامیاب کر کے دکھا سکتا تھا اور اس نے واقعی ایسا کئی بار کر کے دکھایا تھا۔ ''اس کی بے سروپا پلاٹ والی فلمیں بھی صرف اس عامیانہ انداز کی وجہ سے ہٹ ہوتی رہتی تھیں۔ جس انداز سے وہ اپنی ہیروئنز کے جسم فلمز میں Expose کرتا رہا تھا۔

لیکن اپنی فلم میں وہ کسی قسم کا رسک نہیں لے رہا تھا اور اس میں کچھ دباؤ پری زاد کا بھی تھا جو فلم میں ہر چیز اے ون چاہتی تھی سکرپٹ، میوزک، کوریوگرافر، کیمرہ مین، ایڈیٹنگ، ساؤنڈ اور کاسٹ اور ان تمام چیزوں نے فلم کا بجٹ بہت بڑھا دیا تھا۔ پری زاد نے ابتدائی طور پر انور حبیب کے ساتھ 25 لاکھ روپے کا جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوایا تھا جس میں اس نے ابتدائی 25 لاکھ کے بعد دوبارہ کبھی کوئی رقم جمع نہیں کروائی۔ ...انور حبیب کے بار بار کے مطالبات کے باوجود پری زاد اسے بہانے بہانے سے ٹالتی رہی۔ ...کبھی وہ اسے یہ کہہ دیتی کہ اس نے اپنی پوری رقم سے کچھ پراپرٹی خرید لی ہے اور وہ کچھ عرصے تک اسے کچھ نہیں دے سکتی۔ ...کبھی وہ اس سے یہ کہہ دیتی کہ انور حبیب سفیر اور اس کا معاوضہ کی رقم اس کی طرف سے Investment کا حصہ سمجھ کر اسے ادا نہ کرے۔ ... وہ سفیر کو خود ہی وہ رقم دے دے گی اور جب پورا سال وہ اسی طرح حیلوں بہانوں سے فلم کی پروڈکشن کے لیے دیے جانے والے روپے کو لٹکاتی رہی تو انور حبیب کو اس ایشو پر اس سے باقاعدہ بات کرنی پڑی وہ تب تک اس فلم میں ذاتی طور پر اتنا پیسہ اور وقت انویسٹ کر چکا تھا کہ وہ اسے صرف پری زاد کی طرف سے نہ ملنے والی رقم کی وجہ سے Delay نہیں کر سکتا تھا۔ پری زاد نے بالآخر انور حبیب کے پیسے اس سٹیج پر مزید Finance مہیا کرنے سے معذرت کر لی... اس کا کہنا تھا کہ اس نے کچھ جگہوں پر اپنی رقم انویسٹ کی تھی جو ڈوب گئی ہے اور وہ فوری طور پر چند سالوں کے لیے اس طرح کی کوئی سرمایہ کاری نہیں کر سکتی... انور حبیب کو شدید غصہ آیا تھا لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس نے مجبوراً اس فلم کو اکیلے ہی پروڈیوس کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تبریز پاشا کی موت کے بعد پاشا سٹوڈیو اور پاشا پروڈکشنز ابھی تک بند پڑے تھے اور اس کی وجہ سے فلم انڈسٹری میں سے بہت ساری پروڈیوسرز نکل گئے تھے ورنہ شاید انور حبیب کسی دوسرے پروڈیوسر کو اس فلم کی پروڈکشن میں حصہ دار بننے کو کہتا۔ اس کو سفیر خان کا خیال آیا تھا جو اس فلم میں پری زاد کے مقابل لیڈ رول کر رہا تھا۔ لیکن پھر اس نے سفیر سے بات کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سفیر کا رویہ پہلے ہی اس کے ساتھ اس فلم کے سلسلے میں ہونے والی ابتدائی چپقلش کے باعث ٹھیک نہیں تھا۔ یہ صرف پری زاد تھی جس کی وجہ سے وہ اس فلم میں کام کرنے پر تیار ہو گیا تھا ورنہ وہ تو اس فلم میں کام کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھا۔ انور حبیب کو احساس ہو گیا تھا کہ اسے اس فلم کو اکیلے ہی بنانا تھا۔ لیکن ہر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ فلم سپر ہٹ ہو

گی۔۔۔ اپنے پاس بینک میں موجود سرمایہ وہ فلم پر پہلے ہی لگا چکا تھا۔۔۔ اب اس نے اپنے کچھ قریبی دوستوں اور انڈسٹری کے کچھ لوگوں سے کچھ رقم قرضے کے طور پر لے لی۔ لیکن فلم کی شوٹنگ سٹارٹ ہونے کے دوران ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کی فلم over budgeted ہو گی۔ فوری طور پر اس نے اپنے خریدے ہوئے دو پلاٹ بھی فروخت کر دیے۔

فلم کا 60 فی صد سے زیادہ کام مکمل ہو چکا تھا صرف فلم کے ایک حصے اور دو گانوں کی شوٹنگ کے لیے ایور نیو سٹوڈیوز میں پچاس لاکھ کی لاگت سے گلاس کا ایک سیٹ لگایا گیا پری زاد اور سفیر کا صرف چند دن کا کام باقی رہ گیا تھا۔ اور اس کے بعد انور حبیب فلم کا کیمرہ کلوز کر کے پوسٹ پروڈکشن کا کام شروع کر دیتا۔

سیٹ ابھی مکمل ہو رہا تھا جب پری زاد ایک کمرشل کی شوٹنگ کے لیے ماریشس چلی گئی اور پھر اس نے وہاں سے انور حبیب کو فون کر کے کہا کہ وہ ایک ہفتہ کے لیے امریکہ جا رہی ہے اشتیاق رندھاوا کو وہاں کوئی کام تھا۔ اگر وہ اشتیاق رندھاوا کا ریفرنس نہ دیتی تو شاید انور حبیب اس کے وہاں جانے پر اعتراض کرتا لیکن وہ اشتیاق رندھاوا تھا اور پھر صرف ایک ہفتے کی بات تھی۔ اور ابھی تو سیٹ بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ انور حبیب نے با آسانی اسے اجازت دے دی۔ پری زاد نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ مقررہ Dates پر شوٹنگ کے لیے پاکستان پہنچ جائے گی۔

اور سیٹ مکمل ہونے پر انور حبیب نے سفیر کے وہاں سولو سینز لینے کے دوران ایک بار پھر پری زاد سے اس کی دی گئی Dates سے تین دن پہلے اس کی پاکستان آمد کے بارے میں پوچھا۔ پری زاد نے اسے اپنی فلائٹ اور فلائٹ کے ٹائم کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ انور حبیب مطمئن ہو گیا تھا۔

لیکن اگلے دن صبح اخبار میں اس نے پری زاد کی امریکہ میں ٹانگ ٹوٹنے کی خبر سنی تھی۔۔۔ انور حبیب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔۔۔ پری زاد کی ٹانگ ٹوٹنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اگلے چند مہینے بستر پر پڑی رہتی۔۔۔ اور پچاس لاکھ کا وہ سیٹ ایک بار توڑنے کے بعد انور حبیب کو دوبارہ لگانا پڑتا۔۔۔ اگر وہ سیٹ چند ماہ لگا رہنے دیتا تو اس پر روزانہ ایک لاکھ سے زیادہ خرچہ آتا اور یہ انور حبیب کے لیے اس سے بھی زیادہ مہنگا پڑ جاتا۔ پری زاد مقررہ تاریخ پر پاکستان نہیں آئی تھی اور انور حبیب تین چار دن تک لاکھ کوشش کے باوجود اس سے یا سلطان سے رابطہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ پری زاد اور سلطان دونوں کے سیل فون بند تھے اس سے پہلے کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا چوتھے دن پری زاد نے اسے فون کیا تھا۔۔۔ اور انور حبیب اس کی آواز سنتے ہی اس پر برس پڑا تھا۔۔۔ یہ ایک اور غلطی تھی جو اس نے کی تھی۔۔۔ اور پہلی غلطی کی طرح اسے اس کا بھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔

"اب ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ آپ کی فلم میں ناچنے تو نہیں آ سکتی میں؟" پری زاد نے سرد مہری کے ساتھ کہا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو دھوکہ دے رہی ہو مجھے۔ اس منسٹر کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے مجھے ڈبو رہی ہو۔ میں جانتا ہوں تمہاری ٹانگ کو کچھ نہیں ہوا۔" انور حبیب چلانے لگا تھا وہ اس وقت بالکل آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں۔ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی تصویریں بھیجوں یا ایکسرے؟ تاکہ آپ کو یقین آ سکے کہ میں جھوٹ نہیں بول

رہی۔۔۔۔ یا پھر آپ یہاں امریکہ آ کر دیکھ لیں مجھے کہ میں کس حال میں ہوں۔" انور حبیب سے یہ بات کہتے ہوئے زینی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے پاس امریکہ کا ویزا نہیں ہے۔۔۔۔ اور امریکہ کا ویزا اپلائی کرنے اور ملنے میں اسے اتنا وقت لگتا کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انور حبیب اس تجویز پر عمل کرتا۔۔۔۔ وہ پچاس لاکھ کے لگے ہوئے سیٹ کو جس پر ہر روز اس کا لاکھ روپیہ خرچ ہو رہا تھا چھوڑ کر صرف اس کے سچ اور جھوٹ کو جانچنے امریکہ کبھی نہ آتا اور آ بھی جاتا تو پری زاد کے پاس اس کے لیے بھی پلاننگ تھی۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟۔۔۔۔ کب تک ٹھیک ہو گی اور چل پھر سکو گی تم؟" انور حبیب نے بالآخر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"تقریباً ایک ماہ تک چل سکوں گی۔۔۔۔ لیکن ڈانس کرنے کے لیے تو تین چار ماہ چاہیے ہوں گے مجھے۔۔۔۔ اور میں نے سلطان سے کہا ہے کہ سارے پروڈیوسرز کو بتا دے کہ میں اگلے تین ماہ تک امریکہ میں ہی آرام کروں گی۔" انور حبیب نے اس سے مزید کوئی بات کیے بغیر فون بند کر دیا۔

اب اسے فیصلہ کرنا تھا کہ اسے تین ماہ تک پری زاد کا انتظار کر کے اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ کا نقصان برداشت کر کے فلم کو مکمل کروا کے ریلیز کرنا تھا۔۔۔۔ یا پھر اس سے کافی کم نقصان برداشت کرتے ہوئے فلم کی ہیروئن کو تبدیل کرنا تھا۔۔۔۔ اگلے دو دن میں اسے فلم انڈسٹری کی جس ہیروئن کی فوراً Dates مل گئی تھیں وہ پری زاد کے بعد دوسرے نمبر پر آتی تھی۔ انور حبیب نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔۔۔۔ فلم میں پری زاد نہ سہی رخسار تو آ گئی تھی۔۔۔۔ اور اسے امید تھی کہ رخسار بھی اس کی فلم کو پری زاد جیسی کامیابی نہ سہی لیکن بہرحال کامیابی دلا سکتی تھی۔

اور اس ساری پیش رفت سے پری زاد باخبر تھی۔۔۔۔ اسے سفیر نے اس تبدیلی کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ پری زاد کے بارے میں انتہائی فکرمند تھا اور امریکہ آنا چاہتا تھا لیکن زینی نے اسے یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ وہ اشتیاق رندھاوا کے اپارٹمنٹ میں رہ رہی ہے۔۔۔۔ اور اشتیاق کبھی پسند نہیں کرے گا کہ اس کی جگہ پر اس سے کوئی اور ملنے آئے۔۔۔۔ سفیر نے مجبوراً اس کی بات مان لی تھی لیکن پری زاد نے انور حبیب کے رویے کے بارے میں اس طرح بات کی کہ سفیر نے اس سے کہہ دیا کہ اگر وہ فلم میں کام نہیں کر رہی تو پھر وہ بھی نہیں کرے گا۔۔۔۔ اسے اب تقریباً پوری فلم کو دوبارہ شوٹ کروانا تھا۔۔۔۔ ان سینز کو بھی جو اس نے پہلے پری زاد کے ساتھ کیے تھے اور پہلے تو ابھی تک اسے معاوضے کے طور پر کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا۔۔۔۔ وہ صرف پری زاد کی وجہ سے معاوضے کی بات بھی نہیں کر رہا تھا۔۔۔۔ لیکن اب پری زاد نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ نہیں جانتی انور حبیب اسے کچھ دینے کا ارادہ بھی رکھتا ہے یا نہیں اس لیے اسے سوچ سمجھ کر دوبارہ اس فلم کو شوٹ کروانا چاہیے۔۔۔۔ نہ صرف یہ بلکہ پری زاد نے رخسار کے ساتھ اس کے کام کرنے کے حوالے سے بھی اپنی ناپسندیدگی اس تک پہنچا دی تھی۔۔۔۔ اور سفیر خان کے لیے یہ دونوں وجوہات بہت کافی تھیں۔

رخسار کو کاسٹ کرنے کے دو دن بعد انور حبیب کو سفیر نے انفارم کر دیا تھا کہ وہ رخسار کے ساتھ اس کی فلم میں کام نہیں کر سکتا۔۔۔۔ انور حبیب کو جیسے ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔۔۔۔ پہلے اگر آسمان اس کے سر پر گرا تھا تو اب زمین اس کے پیروں کے نیچے سے نکل گئی تھی اس نے سفیر کے صرف پاؤں نہیں پکڑے تھے باقی جتنی منتیں وہ سفیر کی کر سکتا تھا اس نے کی تھیں۔۔۔۔ لیکن سفیر ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔۔۔۔ انور حبیب سے اپنا حساب برابر کرنے کا یہ نادر موقع سفیر کیسے جانے دیتا۔

انور حبیب کو مجبوراً ایک دوسرے ہیرو کو رخسار کے ساتھ کاسٹ کرنا پڑا تھا۔۔۔۔ پندرہ دن میں انور حبیب نے شوٹنگ کا شیڈول ختم کر کے

سیٹ کو ہٹادیا ... دو دن بعد اسے پری زاد کے پاکستان آنے کی اطلاع مل گئی تھی وہ جتنی گالیاں اسے دے سکتا تھا اس نے دیں ... لیکن پوری فلم انڈسٹری پھولوں کے گلدستوں کے ساتھ پری زاد کی رہائش گاہ پر جا کر اس کی صحت یابی پر اپنی خوشی کا اظہار کرتی رہی۔

پری زاد نے مزید ایک ہفتہ بعد چھوٹی موٹی شوٹنگز میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ ابھی Dance شوٹ نہیں کروا رہی تھی ... اور اس چیز نے فلم انڈسٹری میں اس کی ٹانگ کے ٹوٹنے کے حوالے سے بہت شبہات کو جنم دیا تھا ... لیکن کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں رہا ... اگر پری زاد کہہ رہی تھی کہ اس کی ٹانگ ٹوٹی تھی تو انڈسٹری کو کہنا پڑ رہا تھا کہ واقعی ٹوٹی ہوگی۔

انور حبیب اور اس کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی ... اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ پری زاد نے جان بوجھ کر اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی اور انور حبیب اب اس بات پر بھی پچھتا رہا تھا کہ اس نے پری زاد کے جھانسے میں آ کر اس فلم کا آغاز ہی کیوں کیا ... جس پر اب اسے اپنا گھر بھی گروی رکھنا پڑا تھا۔

چھ ماہ کے بعد انور حبیب کی فلم ریلیز ہو کر باکس آفس پر بری طرح فلاپ ہوئی تھی ... اور تب تک انور حبیب کا بال بال قرضے میں بندھ چکا تھا ... اپنے قرضے ادا کرنے کے لیے انور حبیب نے فوری طور پر اس سال بہت کم معاوضے پر ایسی فلمیں بھی سائن کر لیں جن پر پہلے وہ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا ... اور یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی ... اور انور حبیب یہ جانتا تھا۔

اس سال انور حبیب کی آنے والی تمام فلمز فلاپ ہوئی تھیں ... کم بجٹ اور بی گریڈ کاسٹ کے ساتھ کسی فلم کو کامیاب کروانے کے لیے جس Skill اور Craft کے ساتھ ساتھ Creativity کی ضرورت تھی وہ انور حبیب کے پاس نہیں تھی ... اس کی فلمز باکس آفس پر ایک کے بعد ایک پٹ رہی تھی اور ہر بننے والی فلم انور حبیب کے دام کم کر رہی تھی ... فلم انڈسٹری کا پہلا لکھا پڑھا ڈائریکٹر اب گھر کی دال روٹی چلانے کے لیے مختلف پروڈیوسرز کے پاس جا کر کام کے لیے منت سماجت کرنے لگا تھا ... پری زاد نے Publicaly بھی انور حبیب کے ساتھ اب کام کرنے سے انکار نہیں کیا تھا لیکن وہ ہر اس فلم کو کچھ اور Reasons کی وجہ سے رد کر دیتی تھی جس کا پروڈیوسر انور حبیب سے ڈائریکٹ کروا رہا ہوتا تھا اور یہی کام سفیر خان بھی کر رہا تھا لیکن وہ یہ کام Openly ہر ایک کو بتا کر کر رہا تھا کہ وہ انور حبیب کے ساتھ کام نہیں کرنا چاہتا تھا ... انور حبیب کو بہت جلد فلم انڈسٹری سے فارغ ہو کر چھوٹی سکرین کا رخ کرنا پڑا تھا ... اس سے کم از کم اس کے گھر کے مالی حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے ... لیکن وہ اب بھی ہر روز ایک ہی خواب دیکھتا تھا ... ایک سپرہٹ فلم کے بعد ایک بار پھر سے فلم انڈسٹری کے سب سے کامیاب ڈائریکٹر کہلوانے کا خواب ... لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جب تک پری زاد اور سفیر کی فلمز ہٹ ہو رہی تھیں وہ فلم انڈسٹری میں داخل نہیں ہو سکتا تھا اور ان کی فلمز کب تک ہٹ ہونے والی تھیں ... وہ یہ نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

''دنیا میں تمہارے جیسا بے وقوف کوئی دوسرا نہیں ہوگا کرم ... اپنے ہاتھ سے شادی کروادی ... ؟ لوگ تو قتل کر دیتے ہیں اس بات پر بیویوں کو اور تم نے '' کرم کی ماں کے لیے غصے کے عالم میں بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ جس کو کینیڈا بلوانا اور وہاں بلوا کر زری کے ساتھ اس کی

شادی کروانا کرم کی فیملی سے زیادہ دن چھپا نہیں رہا تھا۔ زری کے محلے میں جمال کے دوستوں کے ذریعے یہ بات گردش کرنے لگی تھی اور اس کے بعد وہاں سے کرم کے رشتہ داروں کے ذریعے کرم کے گھر والوں تک یہ سب کچھ پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ اس کے تمام بہن بھائیوں کی ایک اور میٹنگ ہوئی تھی جس میں زور و شور سے ایک لمبی چوڑی بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ "بھائی جان" کا ذہنی توازن اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خراب ہو رہا تھا۔ وہ اپنے سے آدھی عمر کی اس سابقہ بیوی پر اس طرح عاشق تھے کہ اس کے لیے وہ سب کچھ بھی کرتے پھر رہے تھے وہ دوسرا کوئی مرد کبھی نہ کرتا۔ اور یہ بڑا ضروری تھا کہ انہیں مکمل طور پر اب زری سے قطع تعلق کے لیے مجبور کیا جائے ورنہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اس کے ہاتھوں استعمال ہوں گے اور اس کے ساتھ ایک متفقہ فیصلہ یہ بھی کیا گیا تھا کہ کرم کی دوبارہ شادی کی اب کوئی کوشش نہیں کی جائے گی اور اگر کرم نے خود سے شادی کی کوشش کی تو پوری فیملی مل کر اس کی مخالفت کرے گی کرم کو کسی عورت کے چنگل سے بچانے کا یہ واحد حل سب کی سمجھ میں آیا تھا۔

اور اب کرم کی ماں کرم کے گھر بیٹھی ہمیشہ کی طرح اس پر لعنت ملامت کر رہی تھی۔ یہ کام کرنے سے پہلے اس نے گھر میں پھر کر وارڈ روبز کھول کھول کر زری کے سامان کو وہاں دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر زری اپنے سامان کا ایک تنکا بھی پیچھے نہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ کرم نے اسے اپنے سامان کے علاوہ ضرورت کی دوسری چیزیں بھی لے جانے کی اجازت دی تھی اور زری نے اس اجازت کا بھرپور فائدہ استعمال کیا تھا۔ وہ باتھ روم میں رکھے ہوئے ہینڈ واش، شیمپوز اور باڈی واش تک لے گئی تھی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا کاسمیٹکس کا سامان اور دوسری چیزیں تو خیر اسے لے ہی جانا تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ کچن سے اپنی ضرورت کے کچھ برتن کٹلری اور بیڈ سپریڈ اور comforters بھی لے گئی تھی۔ ان تمام چیزوں کی پیکنگ جب اس نے شروع کی تھی تو ہاؤس کیپر نے کرم کو فون کر کے اسے اطلاع دے دی تھی کرم نے اسے کہا تھا کہ وہ زری کو کوئی بھی چیز لے جانے سے نہ روکے کیونکہ اس نے خود اسے اس کی اجازت دی تھی۔ ہاؤس کیپر کچھ جز بز ہوئی تھی۔ کرم کی فیملی کی طرح اس نے بھی زری کو کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ زری بدتمیز اور بے لحاظ تھی اور وہ اسے کسی پاکستانی نوکر کی طرح Treat کرتی تھی اگر کرم نہ ہوتا تو یہ ہاؤس کیپر بھی زری کے وہاں آنے کے چند ہفتوں بعد ہی وہاں سے چلی جاتی۔

لیکن Divorce کے بعد اس ہاؤس کیپر نے کرم کی ماں کو ان تمام چیزوں کے بارے میں بتا دیا تھا جو زری جاتے ہوئے اس گھر سے لے گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب کرم نے ماں سے یہ جھوٹ بولنے کی کوشش کی کہ اس نے زری کی چھوڑی ہوئی تمام چیزیں کسی Charity Shop میں دے دی ہیں تو اس کی ماں اس کے جھوٹ پر بری طرح چراغ پا ہوئی تھی۔

"اچھی طرح جانتی ہوں میں وہ جھاڑو پھیر گئی ہے اس گھر میں۔ ...اور یہ سب تمہاری مرضی سے ہوا ہے۔ اتنے نیچ خاندان کی تھی کیسے چھوڑ جاتی پیچھے کچھ ایک ایک چیز یوں اٹھا کر لے گئی جیسے اپنے جہیز میں لے کر آئی تھی۔ اور تم نے تم نے اپنی حق حلال کی کمائی کو یوں ضائع ہونے دیا اس طرح لٹا دیا ایک بدکردار اور آوارہ عورت پر۔"

"امی وہ اب بیوی نہیں رہی میری اس لیے اس کے بارے میں بات نہ کریں۔" کرم نے ماں کو ٹوکا تھا۔

"کیوں بات نہ کروں بیوی نہیں رہی تھی تو اس طرح سامان کا انبار کیوں لے گئی وہ یہاں سے۔

"وہ تو اسلام نے حق دیا تھا اسے... میرا فرض تھا کہ میں جاتے ہوئے وہ جو بھی لے جانا چاہتی لے جانے دیتا۔" کرم نے تحمل سے کہا اور اس کی ماں کے غصے میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

"سارا اسلام تمہارے لیے ہی رہ گیا ہے... ساری نیکیاں تم نے ہی کمانی ہیں... اس طرح کی عورتوں کے لیے نہیں ہوتے ایسے فرمان... ایسی عورتوں کو تو دھکے دے کر نکالنا چاہیے... خالی ہاتھ۔"

"ہر طرح کی عورت کے لیے ایک ہی حکم ہے... "اِس" طرح یا "اُس" طرح کی عورت کا کوئی فرق نہیں ہے اس میں... مجھے اللہ نے حکم دیا تھا کہ میں اسے اچھے طریقے سے رخصت کروں... اور میں نے اسے اچھے طریقے سے رخصت کیا... اس نے میرے ساتھ جو کیا اس کے لیے وہ اللہ کو جواب دہ ہوگی میں نہیں... آپ کیا چاہتی تھیں کہ میں اللہ کی نافرمانی کرتا۔" کرم جان بوجھ کر اسلام کا ذکر کر رہا تھا صرف یہی ایک موضوع تھا جس پر وہ اپنی ماں کو کچھ جذباتی کر کے خاموش کروا دیا کرتا تھا ورنہ وہ اگلے کئی گھنٹے اسی طرح یونہی رہتیں اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ کرم کی ماں کا غصہ یک دم کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

"اور مجھے کیا فرق پڑ گیا میری چار چیزیں وہ لے گئی تو... میں مرد ہوں کما کر پھر لے آؤں گا... وہ عورت ہے۔"

"تمہاری چیزیں کیوں لے کر گئی... کہتی اپنے دوسرے شوہر کو... وہ خرید کر دیتا اسے... جس کے لیے تمہیں چھوڑا اس نے۔" کرم کی ماں نے کہا تھا۔ کرم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"پیسہ بھی دیا ہے تم نے اسے؟ کرم کی ماں نے بالآخر اس سے وہ سوال کیا جو کرم کے بہن بھائیوں نے اسے پوچھنے کے لیے بھیجا تھا۔"

"نہیں۔" کرم نے جھوٹ بولا۔

"میں مان ہی نہیں سکتی۔ میں تجھے اچھی طرح جانتی ہوں یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم نے اسے خالی ہاتھ بھیج دیا ہو۔" کرم کی ماں نے بے یقینی سے کہا۔

"جب آپ جانتی ہیں تو پھر پوچھ کیوں رہی ہیں؟"

"کتنی رقم دے دی تم نے اسے؟" کرم کی ماں کی جان حلق میں آگئی تھی۔

"اس کا حق مہر دیا ہے۔" کرم نے جھوٹ بولا کرم کی ماں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

"پانچ لاکھ روپے اور سو تولے سونا دے دیا تم نے اسے؟"

"اس کا حق مہر تھا۔"

"پانی لا کر دے کرم مجھے... پانی لا کر دے میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔"

کرم نے پاس پڑے ٹیبل پر پڑے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر ماں کو تھما دیا۔

"اس کی تو لاٹری نکل آئی کرم... تم نے بیٹھے بٹھائے لکھ پتی بنا دیا اسے... مجھے ہی عقل نہ آئی سو تولے سونا اس کے پاس کیوں رہنے دیا میں

نے اپنے پاس کیوں نہ رکھا۔" وہ اب کفِ افسوس مل رہی تھی۔ کرم اگر انہیں یہ بتا دیتا کہ اس نے حق مہر کی رقم اور وہ زیورات شادی کی رات کو ہی زری کے حوالے کر دیے تھے تو کرم کی ماں کو یقیناً غش آ جاتا۔ کرم کو زندگی میں کبھی پیسہ جانے پر دکھ نہیں ہوا تھا۔ اسے آج بھی کوئی دکھ نہیں ہوا تھا لیکن اسے اس بات پر تکلیف ضرور تھی کہ اس کی ماں اس کے گھر ٹوٹنے پر غم زدہ نہیں تھی گھر کی چیزیں اور اس کا پیسہ جانے پر ماتم کر رہی تھی۔ اور شاید انہیں دونوں چیزوں کا صدمہ اس کے بہن بھائیوں کو تھا ورنہ گھر ٹوٹنے پر تو شاید سب ہی کو خوشی تھی۔ زری ناپسندیدہ تھی اور وہ ناپسندیدہ عورت ان کے بھائی کی زندگی سے نکل گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر بھائی جان پر مکمل حق جتا سکتے تھے۔ وہ ایک بار پھر کھلے عام کسی روک ٹوک کے بغیر بھائی جان کے گھر آ سکتے تھے۔

اگلے چند ہفتوں میں بھی اس کی فیملی میں سے کسی نے کرم سے اس کی طلاق پر افسوس نہیں کیا تھا۔ صرف کرم کے چند دوست تھے جنہوں نے کرم کی Divorce پر اس کے ساتھ ہمدردی کی تھی لیکن ان میں سے بھی کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ کرم اپنی زندگی کے اس حادثے سے کتنا دلبرداشتہ ہوا تھا اس کی فیملی کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ کرم علی "امیر" آدمی تھا اور اس کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ اس طرح کے "چھوٹے موٹے" حادثات تو اس پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ تو ایک عام آدمی تھا جو اپنی زندگی میں ہونے والی ایسی چیزوں سے "ہرٹ" ہوتا کرم کروڑ پتی آدمی تھا کرم کو کیا فرق پڑ سکتا تھا۔ پیسہ تھا نا اس کے آنسو پونچھنے کے لیے۔ دوستوں رشتہ داروں کے کندھوں کی ضرورت تو اس کو پڑتی ہے جس کے پاس پیسہ نہ ہو۔

ایک عجیب سی فرسٹریشن تھی جو ان دنوں کرم کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔ زری جیسی بھی تھی بہر حال اس کے ہونے سے گھر میں کسی کے ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ گھر بہت سالوں بعد پہلی بار گھر جیسا لگتا تھا۔ اور اب ایک بار پھر سے وہاں وہی پرانی خاموشی اور وحشت نظر آنے لگی تھی جو پہلے تھی۔

اور یہی وہ وقت تھا جب پاکستان میں کرم کی فلم شاندار بزنس کر رہی تھی اور اسے پاکستان سے ڈائریکٹرز، ایکٹرز اور ایکٹریسز کی کالز پر کالز آ رہی تھیں۔ ہر ایک اس کی اگلی فلم کا حصہ بننا چاہتا تھا۔ کرم کے یہ بتانے کے باوجود کہ وہ اب دوبارہ کوئی فلم بنانے کا ارادہ نہیں رکھتا کوئی بھی اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا اور پہلے کی طرح اچانک اپنی فلم کے ڈائریکٹر اور کاسٹ کا اعلان کرے گا۔ اس لیے انڈسٹری کا ہر ڈائریکٹر اور ایکٹر اسے فون کر کے اپنا نام اس کی یادداشت میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور انہیں کالز میں کرم کو غیر محسوس طور پر صرف ایک کال کا انتظار رہنے لگا تھا۔ اسے یقین تھا جلد یا بدیر وہ بھی اسے کال کرے گی۔ اگر اگلی فلم کے لیے نہیں تو اس فلم کی کامیابی پر مبارک باد دینے کے لیے ہی سہی۔ فلم کے ڈائریکٹر سے لے کر کمپوزر تک ہر ایک نے باری باری اسے کال کیا تھا لیکن کئی ہفتے گزرنے کے باوجود اسے زینی کی کال نہیں آئی تھی۔ کرم کو یقین تھا وہ یہ جان چکی ہو گی کہ وہ اب مزید کوئی فلم نہیں بنانا چاہتا اور اسی لیے اس نے اسے کال نہیں کیا تھا وہ اب اس کے کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ وہ زندگی کے جتنے تکلیف دہ دور سے گزر رہا تھا۔ وہاں یہی سوچ سکتا تھا۔

پاکستان سے آنے والے اخبارات میگزینز اور چینلز پر وہ پری زاد کی نت نئی فتوحات کی داستانیں پڑھتا اور دیکھتا رہتا تھا۔ اور بعض دفعہ وہ سوچتا کہ پری زاد کو تو وہ اب شاید یاد بھی نہیں ہو گا آخر یاد رہ جانے والی اس میں کوئی بات تھی ہی کیا کہ فلم انڈسٹری کی وہ سپر سٹار اس کو یاد رکھتی۔ اور

یہ سب سوچنے کے باوجود کرم کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ اس کو یاد نہ رکھے یاد نہ کرے۔ ...زینی اس کی زندگی کی کتاب کی خوبصورت ترین یاد تھی ...اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کے بارے میں سوچ کر کرم بہت بار ''کرم'' نہیں رہتا تھا۔

☆☆☆

''تم نے میرے سین کٹوائے ہیں؟'' زینی سین کے لیے ڈریسنگ روم میں تیار ہو رہی تھی جب سفیر دندناتا ہوا اندر آیا تھا۔

''کیسے سین؟'' زینی نے بے حد بے نیازی کے عالم میں کہا سفیر سے پچھلے کئی ماہ سے ایک عجیب سی سرد جنگ جاری تھی اس کی، اور سفیر اس کی وجہ جاننے کے لیے جیسے پاگل ہو رہا تھا زینی نے اسے مکمل طور پر Avoid کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کی پارٹیز میں نہیں جاتی تھی۔ اس کی فون کالز نہیں لیتی تھی یا نے کر مصروف ہونے کا بہانہ کر کے فون رکھ دیتی تھی سیٹ پر بھی ان دونوں کے بیچ پہلے جیسی گرم جوشی اب غائب ہو چکی تھی۔ وہ اس کی باتوں کا جواب بے حد مختصر دیتی یا پھر اس کی سرے سے یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ سیٹ پر سفیر سے بات کرنے کی بجائے دوسرے لوگوں سے بات چیت میں مصروف رہے۔ تاکہ سفیر کو اس سے بات کرنے کا موقع کم سے کم مل سکے اور سفیر کے لیے اس کا یہ رویہ ناقابل یقین تھا وہ پچھلے کئی سالوں سے ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے تھے اور سفیر کو یقین تھا کہ پری زاد اس سے محبت کرتی تھی اس سے کئی گنا زیادہ محبت جتنی وہ اس سے کرتا تھا اور اسی محبت کے یقین میں اس نے اپنے گھریلو اختلافات کو سلجھانے یا اپنی بیوی سے مصالحت کی بجائے اسے طلاق دے دی تھی۔ وہ اب بڑی سنجیدگی سے پری زاد سے شادی کا سوچ رہا تھا اور کئی بار پری زاد کو پرپوز بھی کر چکا تھا کسی دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ پری زاد نے اس کے پرپوزل کو سرے سے ریجیکٹ کر دیا ہو وہ سفیر کو ہر دفعہ امید دلاتی تھی لیکن فوری شادی پر فی الحال تیار نہیں تھی اور سفیر کو بھی اس کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ انڈسٹری کی سب سے بڑی ہیروئن کے ساتھ اس کا نام اتنے عرصہ سے جوڑا جا رہا تھا وہ پری زاد کی محبت میں کچھ اتنی بری طرح گم رہا تھا کہ اس نے اوپر تلے پری زاد کے ساتھ فلاپ ہونے والی فلموں پر بھی غور نہیں کیا نہ ہی اس بات پر توجہ دی کہ پری زاد کی دوسرے ہیروز کے ساتھ آنے والی فلمیں تو ہٹ جا رہی تھیں لیکن اس کے ساتھ آنے والی فلمیں اچھا بزنس نہیں کر رہی تھیں ...اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ پری کی جس مرضی ہیرو کے ساتھ فلم ہٹ ہوتی اس کا نام تو لوگ اسی کے ساتھ لیتے تھے اور کل کو اسے سفیر ہی کے ساتھ شادی کرنی تھی اور اسی خوش فہمی میں اس نے اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ جن فلموں میں اس کے ساتھ پری زاد ہوتی تھی ان فلموں میں اس کے بہت سارے سین کاٹ کر اس کا رول کم کر دیا جاتا تھا۔ اگر کبھی اسے ایسی شکایت ہوتی بھی کہ فلم میں سے اس کے بہت سارے اچھے سینز غائب ہوتے تھے ایسے سینز جن کی وجہ سے وہ ایک اچھے ایکٹر کے طور پر اس فلم میں ابھر کر نمایاں ہوتا تو یا فلم کا ڈائریکٹر یا پروڈیوسر دے اس کا وہم قرار دیتا۔ اور ان سینز کو کاٹنے کی کوئی نہ کوئی بڑی وجہ اسے دیتے سفیر اس بات کو اگنور کرنے پر مجبور ہو جاتا وہ اس بات کو تب زیادہ نوٹس کرتا اگر فلم میں اس کے علاوہ سیکنڈ لیڈ میں موجود کسی ایکٹر کے سینز اس سے بڑھ کر یا اس کے برابر ہوتے اور سفیر کو کم از کم ایسی کوئی شکایت نہیں تھی۔ پری زاد کے سینز کی تعداد اور کوالٹی پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا وہ تو ویسے ہی اس کی محبوبہ تھی جس پر وہ اندھا اعتماد کرتا تھا۔ اور ہیرو کا مقابلہ کسی دوسرے ہیرو سے تو ہو سکتا تھا لیکن ہیروئن ؟ ایسا فلم انڈسٹری کی روایت نہیں تھی۔

اور اب آج اسے اس وقت کرنٹ لگ گیا تھا جب وہ اپنی آنے والی ایک بہت بڑی فلم کے رشز دیکھنے گیا تھا اور اس فلم میں بھی اپنے بہت سارے سینز غائب دیکھ کر وہ ڈائریکٹر سے بڑی طرح الجھ پڑا تھا۔ اسے اس فلم کو دیکھ کر یوں احساس ہوا تھا جیسے وہ فلم میں ہیرو کا رول نہیں کسی ایکسٹرا کا رول کر رہا تھا۔ اور اسے یقین تھا اس فلم کی ریلیز کے بعد ایک بار پھر اسے فلمی تبصرہ نگاروں کی تنقید و تضحیک کا سامنا کرنا پڑتا۔ جو پچھلے کچھ عرصہ سے فلمز میں اس کی پرفارمنس اور کرداروں پر شدید تنقید کر رہے تھے۔ اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اس وقت ایک اچھی فلم آ کر وقتی طور پر ان سب کا منہ بند کر دے اور جس فلم کے بارے میں اسے یہ توقع تھی کہ وہ یہ کام کرے گی اس میں پہلی بار اس نے محسوس کیا تھا کہ پری زاد نے سکرین پر جیسے اسے "کھا" لیا تھا وہ اس کے مقابلے میں کہیں کھڑا نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ سینز میں اس کے اچھے ڈائیلاگ کاٹے گئے تھے۔ اچھے سین غائب تھے۔ Dance Squence میں ایڈیٹنگ کے ذریعے بہت تبدیلی کر دی گئی تھی۔ وہ ہیرو کی طرح فرنٹ میں ناچتا نظر آنے کی بجائے دوسرے ایکسٹراز کے ساتھ ناچتا ہوا ایک ایکسٹرا لگ رہا تھا اور ہر جگہ کیمرہ جیسے پری زاد کا تعاقب کرتا نظر آ رہا تھا اور اس وقت پہلی بار سفیر خان کو احساس ہوا تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔ اور گڑبڑ کو جاننے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور یہ سب کروانے والے کا نام جان کر وہ شاکڈ رہ گیا تھا۔ پری زاد، پری زاد یہ کیسے کر سکتی تھی؟ وہ تو اس کی۔ سفیر کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ اس کی بے اعتنائی، بے نیازی اور سرد مہری کی وجہ کوئی بھی ہو سکتی تھی لیکن سفیر خان کے لیے یہ قبول کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ اس کی دشمن ہو سکتی تھی۔ وہ غصے میں آگ بگولا اسی طرح پری زاد کے پاس چلا آیا تھا اور اسے اس وقت اس کی لاپرواہی دیکھ کر مزید غصہ آیا تھا۔

"کیسے سینز؟" زری نے بے حد اطمینان کے ساتھ میک اپ آرٹسٹ کو ڈریسنگ روم سے جانے کا کہتے ہوئے سفیر سے پوچھا، سلطان اس کے پاس بے حد محتاط اور چوکنا انداز میں کھڑا تھا یوں جیسے اسے سفیر سے کسی اشتعال انگیز حرکت کی توقع ہو۔

"تم بڑی اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کن سینز کی بات کر رہا ہوں۔" سفیر دھاڑا۔

"میں غیب کا علم نہیں جانتی۔" زری نے بے حد سرد مہری سے کہا۔ "تم بتاؤ گے تو ہی پتہ چلے گا مجھے۔"

"میں چوہدری الطاف کی فلم کی بات کر رہا ہوں۔" سفیر نے اس کی بات کاٹی۔

"سفیر میں اس وقت اپنے سین کی تیاری کر رہی ہوں۔ مجھے اپنی لائنز یاد کرنی ہیں۔ تم ویسے بھی اس وقت غصے میں ہو۔ اور جب تمہیں غصہ آ جائے تو پھر تمہیں کچھ سمجھ نہیں آتا۔ اس لیے ہم اس معاملے پر تب بات کریں گے جب تمہارا غصہ ختم ہو جائے گا۔" وہ اس طرح بات کر رہی تھی جیسے کسی چھوٹے بچے کو بہلا رہی ہو۔

"بھاڑ میں گیا تمہارا سین۔ تم میرا کیریئر تباہ کر رہی ہو اور تمہیں اپنے سین کی پڑی ہے۔" سفیر نے اس کے سامنے پڑی میز کو ٹھوکر سے دور پھینکا تھا۔ اس پر پڑی چیزیں کمرے میں بکھر گئی تھیں۔

زری نے بے تاثر چہرے کے ساتھ فرش پر دور پڑی ٹیبل اور بکھری ہوئی چیزوں پر ایک نظر ڈالی پھر ہاتھ میں پکڑے سین کے صفحات کو لپیٹ کر سلطان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے سفیر سے کہا۔ "میں تمہیں سچ بتاؤں سفیر۔ تمہارا کیریئر پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔" زری کی آواز میں جھلکنے

والی ٹھنڈک نے سفیر کے وجود میں پہلی دفعہ لرزاہٹ پیدا کی۔ وہ اس ٹھنڈک سے نا آشنا تھا.... وہ اس پری زاد کو نہیں جانتا تھا۔

"دس فلمیں فلاپ ہونے سے کسی کا کیریئر ختم نہیں ہوتا۔" اس نے غراتے ہوئے زینی سے کہا۔

"اگر دس فلمیں ایک سال میں فلاپ ہوں تو ہو جاتا ہے۔ تم انڈسٹری میں اپنا وقت گزار چکے ہو۔" زینی کے انداز اور آواز میں سفاکی تھی وہی سفاکی جس کے لیے فلمی ہیروئنز جانی جاتی تھیں۔

"اس لیے تم ہر فلم میں اپنے ساتھ سفیان کو کاسٹ کرواتی پھر رہی ہو۔" سفیر کو فلم انڈسٹری میں پچھلے کئی ماہ سے گردش کرنے والی وہ خبریں یاد آنے لگیں جنہیں وہ افواہیں کہہ کر جھٹلاتی رہی تھی۔

"لوگ مجھے اور سفیان کو "ساتھ" دیکھنا چاہتے ہیں۔" زینی کے ہونٹوں پر جھلسا دینے والی مسکراہٹ تھی۔

"اور کل تک میں تمہیں فلموں میں کاسٹ کرواتا پھر رہا تھا مجھے کسی اور ہیروئن کے ساتھ کام نہیں کرنے دیتی تھی تم تمہاری وجہ سے آدھی انڈسٹری کی ایکٹریسز اور ڈائریکٹر کے ساتھ جھگڑے مول لیے میں نے۔" سفیر اب چلانے لگا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا وہ پری زاد کی وجہ سے کس طرح اپنے پیروں پر کلہاڑی مارتا رہا تھا۔ وہ کتنی آسانی سے اسے بے وقوف بناتی رہی تھی۔

"تمہاری وجہ سے میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی۔"

"مجھ سے پوچھ کر نہیں دی۔" [illegible]

"میں نے تمہیں لاکھوں کے تحائف دیے اور اب تم مجھے استعمال کر کے ایک اور نئے ہیرو کے ساتھ پینگیں بڑھاتی پھر رہی ہو۔"

"تم نے میرا وقت لیا اور اس وقت کی قیمت دی۔ پھر احسان کس چیز کا جتا رہے ہو تم؟" وہ بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"وقت؟ تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتی رہی۔" وہ ایک بار پھر چلایا۔

"میں نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں.... ایک بار بھی نہیں۔" زینی نے بے حد پرسکون لہجے میں کہا تھا۔

"تم.... تم.... مجھ سے کہتی تھی کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں.... تم میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" سفیر کو یاد آ گیا تھا۔ اس نے زینی کی زبان سے واقعی اپنے لیے محبت کا اعتراف کبھی نہیں سنا تھا۔

"اچھے لگنے میں اور محبت کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔" زینی کے لہجے کا اطمینان ہنوز برقرار تھا۔

"تم مجھے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک رہی ہو۔"

"تم عورتوں کے ساتھ کیا کرتے ہو؟" اس نے دوبدو کہا تھا۔

"مجھے تم سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔" سفیر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

زینی بے اختیار مسکرائی۔

"یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی.... کچھ اور؟"

”میں... میں تمہیں دیکھ لوں گا پری زاد... میں تمہیں...“ سفیر خان جملہ مکمل نہیں کرسکا تھا وہ اب اسے گالیاں بکنے لگا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اس پر حملہ کرتا سلطان اس پر جھپٹ پڑا تھا۔ دونوں کے درمیان ہاتھاپائی ہونے لگی تھی چند منٹوں کے اندر سیٹ پر موجود تمام افراد ڈریسنگ روم میں پہنچ گئے تھے... سفیر خان کو زبردستی وہاں سے لے جایا گیا تھا... ہر ایک کا خیال تھا کہ وہ وہاں شراب کے نشے میں آیا تھا اور جو کچھ کہہ رہا تھا نشے میں کہہ رہا تھا... اور زینی نے اس تاثر کو مضبوط کیا تھا۔ پری زاد نے سفیر کے اس رویے پر احتجاجاً ان تمام فلمز میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا جو اس نے پچھلے کئی سالوں میں سائن کی تھیں اور جن میں سفیر ہیرو کے طور پر اس کے ساتھ تھا... وہ ایسی کسی فلم میں اب کام کرنے پر تیار نہیں تھی جس میں سفیر کسی بھی رول میں موجود ہوتا... دوسری طرف ایسا ہی اعلان سفیر نے بھی کر دیا تھا... اس نے پریس کانفرنس کر کے میڈیا کے سامنے پری زاد پر اپنے الزامات دہرائے اور ان الزامات کے ساتھ اس نے اس پر کچھ اور رکیک الزامات بھی لگائے... اس نے صرف ایک پریس کانفرنس پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ یکے بعد دیگرے پریس کانفرنسز کا انعقاد کرتا رہا اور ایسی کچھ پریس کانفرنسز میں اس نے میڈیا کے سامنے ان ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز کے نام لیے اور انہیں سامنے لانے کا وعدہ کیا جنہوں نے پری زاد کے کہنے پر اس کے سینز کاٹے تھے، اخبارات میں ان لوگوں کے نام شائع ہوتے ہی انڈسٹری میں مزید کھلبلی مچ گئی تھی ان میں ہر ڈائریکٹر اور پروڈیوسر نے اخبار والوں کو فون کر کر کے سفیر کے ان الزامات کی تردید کی تھی ان میں سے کوئی بھی سفیر کی پریس کانفرنس میں آ کر اس کے ساتھ بیٹھ کر پری زاد کے بارے میں میڈیا کے سامنے کچھ کہنے پر تیار نہیں تھا... ہر ایک جانتا تھا کہ ان کی ایسی کسی حرکت کو پری زاد کس طرح لے گی... ہر ایک نے وقتی طور پر سفیر خان کو بھی Avoid کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور یہ چیز سفیر کے لیے بہت بڑا سیٹ بیک تھا... وہ انڈسٹری کے لوگوں سے ایسے رویے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس چیز نے اس کی فرسٹریشن اور ڈپریشن میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ انڈسٹری پہلی بار جیسے ایک عورت کے ساتھ جا کھڑی ہوئی تھی۔ ماپ کے عہدے داران نے انڈسٹری کے ان دو Giants کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کی کوششیں کی تھیں کیونکہ بہت سارے فلم میکرز کا پیسہ ان دونوں کے ایک ساتھ کام نہ کرنے کی وجہ سے ڈوبتا لیکن سفیر کی ہر نئی پریس کانفرنس صورت حال کو خراب کرتی رہی... وہ ان پریس کانفرنسز کا سلسلہ بند کرنے پر تیار نہیں تھا اور ماپ کے عہدے داران پری زاد پر دباؤ ڈالنے میں ناکام ہو رہے تھے کیونکہ وہ ایسی ہر کوشش کے جواب میں ان کے سامنے سفیر کی کسی نئی پریس کانفرنس کے الزامات رکھ دیتی جن کا جواب ماپ کے عہدیداران کے پاس نہیں ہوتا تھا۔

چند ماہ اخبارات میں اس سکینڈل کی خبریں جلی سرخیوں میں شائع ہوتی رہیں پھر جوں جوں سفیر کی پریس کانفرنسز بڑھتی گئیں ان میں آنے والے جرنلسٹس کی تعداد کم ہوتی گئی۔

پری زاد کی طرف سے کسی الزام کا جواب نہیں دیا گیا تھا... کوئی پریس کانفرنس نہیں کی گئی تھی... کوئی تصدیق یا تردید نہیں آئی تھی وہاں مکمل خاموشی تھی اس نے کسی فلمی تقریب میں میڈیا کے لوگوں کی ہزار کوششوں کے باوجود سفیر کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا اور اس کی اس حکمت عملی نے سفیر کو اس سے زیادہ نقصان پہنچایا جتنا سفیر کے میڈیا میں آنے والے الزامات نے پری زاد کو

فوری طور پر سفیر کو اس نقصان کا اندازہ نہیں ہوا تھا جو اسے آنے والے دنوں میں پری زاد کے ساتھ کام نہ کرنے کے فیصلے سے ہونے والا

تھا۔ لیکن چند ماہ میں ہی اسے پتہ چلنا شروع ہو گیا تھا کہ انڈسٹری نے اس پوری جنگ میں کس فریق کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا۔ بہت ساری ان فلمز میں اس کو نکال دیا گیا تھا جن میں پری زاد کو بھی سائن کیا گیا تھا اور یہ سفیر کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا۔ کیونکہ کسی فلم ڈائریکٹر نے اسے فلم میں رکھتے ہوئے پری زاد کو نہیں نکالا تھا۔ پری زاد کے ساتھ اس کی نفرت میں اضافہ ہوا تھا اور اس نفرت کے ساتھ ساتھ شراب نوشی اور ڈرگز کے استعمال میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک سال میں اس کی چند دوسری ہیروئنز کے ساتھ تین مزید فلمز فلاپ ہوئیں۔ سفیر کے پاس فلمز کی آفر ایک دم نہ ہونے کے برابر ہو گئی تھیں۔ وہ جس معاوضے میں ہر سال اضافہ کر رہا تھا اب اچانک اس نے اس میں آدھی کمی کر دی تھی اور جن مطالبات اور نخروں کے ساتھ وہ ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز کا جینا حرام کر دیتا تھا وہ جیسے اب قصہ پارینہ بن گئے تھے۔ وہ صرف ہر قیمت پر کام چاہتا تھا۔ ہر قیمت پر انڈسٹری میں ان رہنا چاہتا تھا اور اب اسے پری زاد کے خلاف اس طرح کے ری ایکشن پر پچھتاوا بھی ہونا شروع ہو گیا تھا اس نے کھل کر اسے دشمن بنا کر اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔ انڈسٹری کے چند بڑوں کے ذریعے اس نے بالواسطہ اور بلاواسطہ پری زاد سے مصلحت کی کوششیں کرنی شروع کر دیں لیکن ایسی کسی بھی کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا پری زاد اور سفیان کا پیئر اس وقت انڈسٹری کا Hottest Pair تھا اور اس کے ساتھ ساتھ انڈسٹری میں ان کے درمیان افیئر کی خبریں بھی گرم تھیں ان حالات میں سفیر کے ساتھ مصلحت کرنا زینی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ دو سال کے اندر بے تحاشا شراب نوشی کی وجہ سے سفیر کے وزن میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے سر کے بال کم ہونے لگے تھے اس کے چہرے پر بڑھتی ہوئی جھریاں اس کی بڑھتی ہوئی عمر کی چغلی کھانے لگی تھیں۔ اس نے فلم کی آفرز بند ہونے کے بعد اوپر نیچے دو فلمز اپنے بینر کے نیچے پروڈیوس کیں دونوں کا نتیجہ وہی نکلا تھا جو اس سے پہلے دوسروں کی فلموں کا نکلتا آ رہا تھا سفیر خان کی مالی حیثیت کو بھی شدید دھچکا لگا تھا اور یہی حالات تھے جن میں انڈسٹری پر پندرہ سال سے زیادہ سپر سٹار کے طور پر راج کرنے والے سفیر خان نے کیریکٹر ایکٹر کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے ڈوبتے ہوئے فلمی کیریئر کو وہ اب اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے سہارا نہیں دے سکتا تھا۔ انڈسٹری میں یکے بعد دیگرے چار نوجوان خوبصورت ہیرو داخل ہو گئے تھے جنہوں نے اوپر نیچے ہٹ فلمز دے کر سفیر خان سمیت اپنے سے پہلے موجود ہیروز کو ملنے والے کام میں نمایاں کمی کر دی تھی اور انہوں نے کسی پرانے ہیرو کے لیے Come Back کے چانسز کو مکمل طور پر نہیں تو تقریباً ختم کر دیا تھا اور ان چاروں ہیروز کو فلم انڈسٹری میں پہلا بریک پری زاد نے ہی دلوایا تھا ان میں سے ہر ایک کی پہلی فلم پری زاد کے ساتھ تھی اور ان میں سے ہر ایک پری زاد کے گن گاتا تھا پری زاد لوگوں کو صرف تابوت تک نہیں پہنچاتی تھی وہ تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دیتی تھی فلم انڈسٹری میں اس سے زیادہ بااخلاق ایکٹریس دوسری کوئی نہیں تھی اور فلم انڈسٹری میں اس سے زیادہ خوف کوئی کسی سے نہیں کھاتا تھا۔

چار سال کے بعد پری زاد نے بالآخر سفیر خان کے ساتھ فلم میں کام نہ کرنے کا اعلان واپس لے لیا تھا۔ انڈسٹری میں آنے والے ایک نئے ڈائریکٹر نے پری زاد اور سفیر کو اپنی فلم میں کاسٹ کر لیا تھا۔ انڈسٹری میں اس خبر پر کوئی زیادہ بڑا ردعمل نہیں آیا تھا۔ فلم میں سفیر خان پری زاد کے باپ کا کردار ادا کر رہا تھا اور انٹرول سے پہلے فلم سے اس کی Exit ہو جاتی۔

سیٹ پر پہلے دن سفیر خان اپنے بالوں میں سفیدی لگائے دوسروں کی طرح پری زاد کے انتظار میں بیٹھا تھا جو ابھی تک شوٹنگ کے لیے

نہیں پہنچی تھی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اس کا اور پری زاد کا یہ پہلا آمنا سامنا ہونے والا تھا اور سفیر نہیں جانتا تھا کہ پری زاد کیسے ری ایکٹ کرنے والی تھی۔ اس کے لیے انتظار کرتے ہوئے کچھ دیر کے بعد وہ پچھتایا بھی شاید اس نے پری زاد کے ساتھ باپ کے رول میں یہ فلم سائن کر کے غلطی کی تھی لیکن وہ کئی سال بعد آنے والے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا تھا۔ کیریکٹر ایکٹر کے طور پر ہی سہی لیکن پری زاد کو اگر اس کی فلم کی کاسٹ میں موجودگی پر اعتراض نہ ہوتا تو سفیر کو سال میں کئی اور فلمیں مل سکتی تھیں۔ ان میں پری زاد کے ساتھ سیکنڈ Lead والی فلمز بھی ہوتیں جو عام طور پر Hit ہوتی تھیں اور ایک Hit فلم میں ایک چھوٹا رول بھی ایک فلاپ فلم کی Lead سے بہتر تھا۔

وہ آدھ گھنٹہ کی تاخیر سے سیٹ پر آئی تھی اور اس کے سیٹ پر آتے ہی سیٹ پر بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ سفیر خان اس بھاگ دوڑ سے ناآشنا نہیں تھا۔ انڈسٹری میں کئی سال تک سیٹ پر اس کے اسی طرح نخرے اٹھائے جاتے تھے۔ حسرت، رشک اور حسد کے علاوہ اس وقت سفیر کی آنکھوں میں پری زاد کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ گھٹنے تو خیر بہت پہلے ہی اس کے سامنے ٹیک چکا تھا۔ پری زاد کے گرد جمگھٹا اب کم ہو گیا تو وہ سلطان کے ساتھ اپنی لائنز یاد کر رہی تھی اور جوس کے گلاس سے جوس پی رہی تھی جب سفیر نے دوسرے ایکٹرز کی طرح خود آگے بڑھ کر اس وقت انڈسٹری کی واحد "سپر سٹار" کو "سلام" کرنے کا ارادہ کیا۔ پری زاد کے گلاس میں چند گھونٹ باقی تھے۔ جب سفیر خان جھکے کندھوں کے ساتھ اس کے سامنے آیا اور اس نے اسے سلام کیا۔ زینی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے سر سے پاؤں تک اس پر ایک نظر ڈالی تھی۔

"کیسے ہیں سفیر صاحب آپ؟" زینی نے اس سے پوچھا تھا۔ انداز میں کہیں کسی پرانی آشنائی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ میڈم" سفیر نے مدھم آواز میں نظریں چراتے ہوئے کہا۔ آخری لفظ زبان سے ادا کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اسے نام سے پکارتا تھا اور ابھی بہت کچھ کہتا تھا لیکن انڈسٹری اب پری زاد کو میڈم کہتی تھی اسے پری زاد کہہ کر پکارنے والے بہت کم رہ گئے تھے۔

"آئیں سین کرتے ہیں" پری زاد کو سین تیار ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اس نے سفیر سے کہا اس کا پہلا سین اپنے "باپ" ہی کے ساتھ تھا۔

سفیر چپ چاپ اس کے کھڑے ہونے پر اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ فلم انڈسٹری کا بھیڑیا تھا جسے ایک 28 سالہ لڑکی نے "میمنے" میں تبدیل کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ معمول کے چیک اپ کے لیے ہاسپٹل میں گیا تھا جب اس نے ڈاکٹر کو اپنی پشت پر کمر کے اطراف ان چند گلٹیوں کے بارے میں بتایا جو چند ماہ پہلے نمودار ہوئی تھیں اور جن میں وہ پچھلے کچھ عرصہ سے درد محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ابتدائی معائنے کے بعد اسے بائیوپسی کا کہا تھا اور بائیوپسی کی رپورٹ پازیٹو آ گئی تھیں۔ وہ گلٹیاں Cancerous تھیں کچھ دیر کے لیے رپورٹس کے رزلٹس جان کر کرم کے ہوش و حواس مفلوج ہو گئے تھے برص کے علاوہ اسے زندگی میں اب تک کسی بیماری نے تنگ نہیں کیا تھا اور اب یک دم کینسر جیسی ہولناک مرض

لیکن ڈاکٹر نے اسے ساتھ ہی یہ خوش خبری بھی سنادی تھی کہ اس کا کینسر بالکل ابتدائی سٹیج میں تھا اور ایک معمولی آپریشن کے ذریعے وہ بڑی آسانی سے ٹھیک ہو سکتا تھا بلکہ چند اور Tests کروانے کے بعد یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میڈیسنز کے ساتھ ہی ٹھیک ہو جاتا۔

کچھ دیر کے لیے کرم کو ڈاکٹر کی بات پر یقین نہیں آیا اسے لگا کہ وہ اسے جھوٹی تسلیاں دے رہا تھا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس سے جھوٹ کیوں بولے گا اگر اس کا کینسر ایڈوانسڈ اسٹیج پر ہوتا تب بھی وہ اتنا ہی Openly اس کے ساتھ ڈسکس کر رہا ہوتا اور اب اگر وہ یہ کہہ رہا تھا کہ پریشانی کی بات نہیں تھی تو واقعی ایسا ہی ہو گا۔

اگلے چند ہفتے وہ کچھ دوسرے ہاسپٹلز اور ڈاکٹرز کے ساتھ Consult کرتا رہا تھا اور ہر ایک کی رائے تقریباً اسی ڈاکٹر کی رائے جیسی تھی۔ کرم نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

اس نے تب تک اپنے گھر والوں کو اپنی بیماری کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن ان ڈاکٹرز سے Consultation کے بعد اس نے بالآخر اپنی ماں کو اپنی بیماری کے بارے میں بتا دیا۔ اس کی ماں اس کی بیماری کا سنتے ہی بری طرح رونے لگی تھی کرم کو اسی کا اندیشہ تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں امی ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ میری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آپ بس دعا کریں میرے لیے۔" کرم نے ماں کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"یہ سب اس چڑیل کی وجہ سے ہوا ہے..... اس نے ہی کوئی جادو ٹونہ کیا ہے تم پر پتہ نہیں کیا کھلاتی رہی ہے تمہیں تمہارے ساتھ رہ کر۔" کرم نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔ اس کی ماں کا اشارہ زری کی طرف تھا ..... وہ اس کی زندگی سے تو نکل گئی تھی لیکن اس کی فیملی کی یادداشت سے نہیں ہر ایک وقتاً فوقتاً زری کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں ہر ایک کو یہ شک تھا کہ کرم ابھی بھی زری کے ساتھ رابطے میں تھا اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ وہ اس کی مالی مدد کرتا رہا ہو کرم نے ابتدائی چند مہینوں میں بہت بار ان سب کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اب زری کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ رکھے ہوئے نہیں تھا۔ لیکن بہت جلد ہی وہ بار بار کی ان وضاحتوں اور یقین دہانیوں سے تنگ آ گیا تھا۔ اس نے زری کے معاملے پر بالکل چپ سادھ لی تھی اور اس کی خاموشی نے جیسے اس کی فیملی کے شبہات کی تصدیق کر دی تھی۔

اب بھی یہی ہو رہا تھا وہ ماں کو اپنی بیماری کے بارے میں بتا رہا تھا اور ماں کو ایک بار پھر زری یاد آ رہی تھی نہ صرف یہ کہ وہ یاد آ رہی تھی بلکہ وہ اس کی بیماری کو اسی کے سر منڈھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

بعض دفعہ ماں باپ کی "سادگی" اولاد کے لیے بے حد صبر آزما اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ کرم کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا اس کی ماں بہ آسانی اس کے بہن بھائیوں کی باتوں میں آ کر ان کی زبان بولتی تھی۔ کیونکہ وہ زیادہ وقت انہیں لوگوں کے ساتھ رہتی تھی اور 24 گھنٹے جو کچھ اس سے کہا جاتا تھا وہ حرف بہ حرف اس پر یقین کرتی تھی۔ کرم کے لیے ان کا ذہن بدلنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ کرم علی کے بہن بھائی وہ ساری باتیں اور مطالبات جو وہ خود کرم سے نہیں کر سکتے تھے اپنی ماں سے کہہ دیتے تھے اور کرم نہ چاہتے ہوئے بھی ان سب باتوں کو مان جایا کرتا تھا اس کی ماں کو اگر ایک طرف اس بات پر فخر تھا کہ کرم اس کی بات ٹال نہیں سکتا تھا۔ تو دوسری طرف اس بات پر غرور بھی تھا کہ کرم کا سارا مال و دولت انہیں کی دعاؤں کی وجہ سے تھی۔ اور وہ بار بار کرم کو یہ بات جتانا بھی ضروری سمجھتی تھیں کرم نے کبھی اس معاملے پر ان سے بحث نہیں کی تھی۔ اس کے پاس دولت کس طرح آئی تھی؟ اس نے دولت کے لیے کیا کیا قیمت ادا کی تھی؟ اور وہ اس دولت کو کیا سمجھتا تھا؟ اس نے اپنی ماں کو کبھی یہ سب کچھ بتانے کی کوشش نہیں کی تھی وہ بس چپ چاپ ان کی باتیں سنتا تھا جو ہر وقت اسے بتاتی رہتی تھیں۔ کہ انہوں نے اسے کویت بھجوانے کے لیے پیسہ اکٹھا کرنے کے لیے کیا کیا قربانیاں دی تھیں۔ اتنے سال گزرنے کے باوجود اور اپنی فیملی کے لیے یہ سب کچھ کرنے کے باوجود کرم اپنا سر ہمیشہ ان کے اس ایک احسان کے سامنے جھکا ہوا ہی پاتا تھا اس نے کبھی اس چیز Argue نہیں کیا تھا کہ ان کی قربانیاں زیادہ تھیں یا اس کی ان کے لیے دی جانے والی قربانیاں کہیں نہ کہیں اس کو اپنے دل میں یہ یقین تھا کہ ماں اس سے محبت کرتی تھی سچی محبت۔ دنیا کی ہر ماں کی طرح ذہن میں آنے والے ہر خدشے، ہر شبہے اور بہن بھائیوں یا ماں کے رویے سے پہنچنے والی ہر تکلیف کے باوجود کرم کو یقین تھا کہ اگر دنیا میں کوئی واقعی اس کی زندگی اس کی سلامتی کسی مطلب کے بغیر چاہتا تھا تو وہ اس کی ماں ہی تھی اور صرف یہی یقین تھا جس کی وجہ سے وہ ماں کے کہنے پر کچھ ایسے کام بھی کرنے پر تیار ہو جاتا تھا جو کسی اور کے کہنے پر کرتے ہوئے وہ دو بار سوچتا۔

اس کی بیماری کا اس کے بہن بھائیوں کو بھی پتہ چل گیا تھا اور زندگی میں شاید پہلی بار کرم کو انہیں پریشان دیکھ کر لگا کہ وہ واقعی اس کی پرواہ کرتے تھے اس کی زندگی اور صحت ان کے لیے کوئی معنی رکھتی تھی اور یہ اس کے لیے ایک بے حد خوش کن چیز تھی۔

وہ تقریباً روز ہی اپنے بہن بھائیوں کی کالز ریسیو کرتا تھا اور وہ اس سے اس کی خیریت دریافت کرتے تھے۔ اس کے علاج اور طبیعت کے بارے میں پوچھتے۔ اس سے پہلے اس نے کبھی زندگی میں اتنے تواتر اور باقاعدگی سے ان سب کی کالز ریسیو نہیں کی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن ان میں سے کوئی نہ کوئی اپنی فیملی کے ساتھ اس کے گھر آ جاتا یہاں تک کہ اس کی ماں بھی اپنے دوسرے بیٹے کے ساتھ رہنے کی بجائے کرم کے گھر پر ہی آ گئی تھی زری کے اس گھر سے جانے کے بعد یہ پہلی بار تھا کہ کرم کو اپنے گھر میں وحشت نہیں ہو رہی تھی تنہائی کا وہ احساس جو گھر کا دروازہ پار کرتے ہی اس کے وجود کو کھوکھلا کرنے لگتا تھا وہ یک دم کہیں غائب ہو گیا تھا۔

اس نے اس سے پہلے کبھی اپنی زندگی کے لمبے ہونے کی خواہش نہیں کی تھی لیکن اب وہ چاہتا تھا کہ وہ صحت یاب ہو کر اور جیئے کیونکہ اس کی فیملی کو اس کی ضرورت تھی اس کی زندگی ان کے لیے کچھ معنی رکھتی تھی۔

☆☆☆

''سلمان نے ویزا اپلائی کرنے کے لیے کہا ہے۔'' نفیسہ نے اس سے کہا۔

''آپ پاسپورٹ دے دیں میں ویزا اپلائی کر دیتی ہوں۔''

''نعیم اور زہرہ بھی جانا چاہ رہے ہیں سلمان نے کہا ہے کہ اگر ان کا ویزا لگ جاتا ہے تو وہ ان دونوں کی ٹکٹس بھی بھیج دے گا۔''

''آپ آپا سے پاسپورٹ منگو لیں میں ان کے ویزے بھی ساتھ ہی اپلائی کر دیتی ہوں۔ میرا تو خیر پہلے ہی لگا ہوا ہے۔ ربیعہ اور فاروق بھی آ رہے ہیں لندن سے؟''

زینی نے سدرہ کی تصویر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

''ہاں وہ بھی آ رہے ہیں۔'' نفیسہ یک دم کچھ چپ سی ہو گئی تھی یوں جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن کہہ نہ پا رہی ہو۔

''بڑی پیاری لڑکی پسند کی ہے سلمان نے۔'' زینی نے تصویر دیکھتے ہوئے ماں سے کہا۔ سلمان نے سدرہ کی تصویر اپنی تصویروں کے ساتھ بھیجی تھی۔

''تمہارے پاس وقت ہوگا اس کی شادی میں شرکت کے لیے؟ میرا مطلب ہے تم تو آج کل بہت مصروف رہتی ہو تمہاری تو فلموں کا ہرج ہوگا۔''

''سلمان کی شادی میں شرکت کے لیے میں فلموں کا ہرج کر سکتی ہوں۔ اکلوتے بھائی کی شادی میں شرکت سے زیادہ ضروری تو کوئی بھی چیز نہیں ہے۔'' زینی نے تصویروں کو ایک بار پھر دیکھتے ہوئے کہا۔ سلمان ان چند سالوں میں بہت بدل گیا تھا۔ تصویروں پر نظر ڈالتے ہوئے اسے یک دم احساس ہوا تھا کہ نفیسہ یک دم بہت خاموش ہو گئی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' زینی کو ان کی خاموشی بری طرح کھلی تھی۔

''وہ سلمان... نہیں چاہتا کہ تم شادی میں شریک ہو۔'' زینی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ نفیسہ قدرے نادم انداز میں بڑی مشکل سے کہہ رہی تھی۔

''سدرہ کے خاندان کو پتہ نہیں ہے کہ تم فلموں میں کام کرتی ہو پتہ ہوتا تو وہ سلمان کا رشتہ کبھی قبول نہیں کرتے... سلمان کہہ رہا تھا کہ امریکہ میں رہنے کے باوجود اس کی فیملی بڑی مذہبی اور پرانے خیالات کی ہے... سلمان نے ان لوگوں کو تمہارے بارے میں سرے سے بتایا ہی نہیں۔'' نفیسہ نادم انداز میں کہہ کر چپ ہو گئی تھیں کہنے کے لیے زینی کے پاس بھی کچھ نہیں تھا اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ایک نظر ہاتھ میں پکڑی اپنی ہونے والی بھابھی کی تصویر دیکھی پھر ان تصویروں کو بستر پر ماں سے کچھ فاصلے پر رکھ دیا۔

''آپ لوگ پھر پاسپورٹ دے دیجیے گا کل۔'' اس نے آواز کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نفیسہ کا دل بھر آیا اس نے کوئی گلہ کیوں نہیں کیا تھا۔ لاکھ اس کی غلطی تھی پھر بھی وہ کچھ کہتی تو سہی زینی کمرے سے نکل گئی۔ گزرتے دنوں میں ایسے دن ایسے لمحے آ جایا کرتے تھے جب کوئی جیسے آئینہ اس کے سامنے رکھ دیتا تھا۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی آئینے میں اپنا عکس دیکھنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ اور وہ عکس ہمیشہ شکست خوردہ

ہوتا تھا۔ صرف وہی چند لمحے ایسے ہوتے تھے جب وہ اپنے آپ سے یہ پوچھتی تھی کہ اس نے اتنے سالوں میں کیا کھویا کیا پایا ہے؟ ...روشنیوں کی وہ دنیا جس کا وہ حصہ تھی انسانوں کے اندر "تاریکیاں" اتار رہی تھی کیونکہ وہ کچھ دوسرے انسانوں کے اندر کی "تاریکیوں" سے بنی تھی۔

وہ سارے اس کی زندگی کے وہ سال تھے جب وہ صرف دولت اور شہرت کے ساتھ جی رہی تھی عزت اور محبت سے محروم اخبار کی ہیڈ لائن بننا اور ٹی وی سکرین کی سکرول بار کا حصہ ہونا کتنا تضحیک آمیز ہوتا ہے یہ کوئی زینی سے پوچھتا ...اس کی زندگی اس کا وجود چوبیس گھنٹے میڈیا کی مائیکروسکوپ کے نیچے رہتا تھا جو اس کو ایک "غیر انسانی" جذبات نہ رکھنے والی مخلوق سمجھ کر ٹریٹ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک "فلمی ہیروئن" ایک "ایکٹریس" تھی جس کا کام اپنے جسم کو کپڑوں سے "دکھا" کر اور اپنے چہرے کو میک اپ میں "چھپا" کر لوگوں کو "سستی تفریح" فراہم کرنا تھا فلم انڈسٹری کی دوسری ہیروئنز کے برعکس زینی کو کبھی اپنے "ٹھمکو" کی داد سے خوشی نہیں ہوتی تھی سینما میں اپنے کسی جملے یا ڈانس کی کسی Movement پر ملنے والی Clap نے کبھی اس کے جسم میں کرنٹ نہیں دوڑایا تھا وہ پبلک گیدرنگز اور سینماز میں آتے جاتے ہوئے مسکراتی تھی لوگوں کی تالیوں اور نعروں کا ہاتھ ہلا کر جواب بھی دیتی اور میڈیا کے ذریعے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی "محبت" اور "ستائش" کو اپنا سب سے قیمتی اثاثہ بھی بتاتی لیکن وہ ان سب سے اتنی ہی شدید نفرت بھی کرتی تھی اس کے دل میں ان لوگوں کے لیے رتی برابر عزت نہیں تھی اس کے نزدیک وہ سب "تماشائی" تھے صرف "تماشائی" اتنے ہی غلیظ جتنے اس سمیت وہ سب دوسرے لوگ تھے جو ان کے لیے ایک تفریح فراہم کرتے رہے تھے۔ وہ اگر اپنی عزت نہیں کرتی تھی تو ان کو بھی عزت کا حق دار نہیں سمجھتی تھی۔ وہ لوگ جنہوں نے اسے سپر سٹار بنایا تھا وہ اگر اپنے بارے میں پری زاد کے خیالات پڑھ لیتے تو سینما میں بیٹھ کر اسے Clap دینے کی بجائے اسے سنگسار کر دیتے

نفیسہ سلمان کی شادی میں شرکت کے بعد کچھ عرصے کے لیے واپس پاکستان آ گئی تھیں لیکن چند ماہ بعد دوبارہ سلمان کے پاس مستقل طور پر چلی گئیں ... ربیعہ اور فاروق بھی انگلینڈ سے اسی سٹیٹ میں شفٹ ہو رہے تھے جہاں سلمان اور سدرہ تھے۔ ...اور نفیسہ اب زینی کے "خالی گھر" میں رہتے رہتے تھک گئی تھیں۔ ...زینی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی ... اس کے لیے ماں کی خوشی مقدم تھی ... وہ اپنے لیے ان کو باندھ کر کیوں رکھ دیتی ... لیکن اپنا خالی گھر اسے پہلے سے زیادہ خالی لگنے لگا تھا۔ اس کی شوبز کی مصروفیات اتنی بڑھ چکی تھیں کہ وہ تقریباً صرف سونے یا کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ہی گھر آتی تھی مگر وہ چند گھنٹے بھی اسے اس گھر میں گزارنا مشکل لگتا تھا۔

اور یہی وہ وقت تھا جب کئی سالوں کے بعد شیراز نے ایک دن اس کے سیل فون پر کال کی تھی۔ ایک سیکنڈ لگا تھا زینی کو اس کی آواز پہچاننے میں ...ساری عمر ایک سیکنڈ ہی لگتا تھا۔ ...اس نے ہیلو سے آگے کچھ سننے کی بجائے فون بند کر دیا اب ایسا کیا تھا جو اسے شیراز سے سننا تھا۔ لیکن اس کی آواز اسے کئی سال پیچھے لے گئی تھی یادداشت کے سارے دروازے کھڑکیاں، روشن دان کھلنے لگے تھے سب کچھ کیسے پیچھے سے پلٹ کر آ رہا تھا شیراز بار بار کال کر رہا تھا پھر بار بار Text کرنے لگا تھا وہ معافی مانگ رہا تھا ایک بار بات کرنا چاہتا تھا صرف ایک بار ایک بات ایک ملاقات زینی نے سیل فون آف کر دیا وہ یادوں کی کرچیوں پر ننگے پاؤں چلنے لگی تھی۔

☆☆☆

"زری آئی تھی کل۔" کرم چائے کا گھونٹ نہیں بھر سکا اتنے عرصہ بعد زری کا وہاں آنا کیا معنی رکھتا تھا؟ وہ کسی بزنس وینچر کے لیے چند ہفتوں کے لیے امریکہ گیا تھا اور اب صبح اس کی ماں اسے بتا رہی تھی۔

"کب؟" "کیا کہہ رہا ہے تمہیں تو کہنا چاہیے" "کس لیے؟" کرم کی ماں کو اس کا سوال بری طرح کھلا تھا۔ "تمہارے امریکہ جانے کے دو دن بعد آئی تھی۔ کہہ رہی تھی کرم سے ملنا ہے میں نے بھی اچھی بے عزتی کی اس کی... روتی ہوئی گئی وہ یہاں سے آ گئی ہوگی پھر پیسے لینے کے لیے میرا بیٹا جیسے نوٹوں کی مشین بن گیا ہے اس کے لیے جب دل چاہے گی نوٹ نکال لے گی۔ میں نے کہہ دیا اس سے کہ دوبارہ بھی ادھر کا رخ نہ کرے۔ اس کی وجہ سے میرے بیٹے کو کینسر ہو گیا وہ کتنی بھولی بن کر آ گئی۔ کرم ہوں گے مجھے ان سے ملنا ہے۔" کرم کی ماں اب زری کی نقل اتار رہی تھی۔ کرم ناشتہ کرنا بھول گیا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے جیسے اسے بتا دیا تھا کہ زری مشکل میں تھی وہ اس کی بیوی نہیں رہی تھی اس کے باوجود کرم کو اس کی بے بسی یا بے عزتی کے احساس سے کوئی خوشی نہیں پہنچی تھی۔ اس کی ماں مسلسل بول رہی تھی اور وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کس مسئلے نے اس کے پاس آنے پر مجبور کیا ہوگا۔

آفس جاتے ہی اس نے سیکرٹری کو اس اپارٹمنٹ کے مالک سے رابطے کی ہدایت کی تھی جو اپارٹمنٹ اس نے زری کو کرائے پر لے کر دیا تھا۔ آدھ گھنٹہ میں اُسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ اپارٹمنٹ اسی سال چھوڑ دیا گیا تھا جب وہ لیا گیا تھا جمال اور زری نے اس اپارٹمنٹ کو ایک سال مکمل ہونے کے بعد دوبارہ کرائے پر نہیں لیا تھا اور وہ وہاں سے چلے گئے تھے اب وہ وہاں سے کہاں گئے تھے یہ جاننے کا کرم کے پاس کوئی طریقہ نہیں تھا۔ جمال نے اس فیکٹری میں پیکنگ کا کام نہیں کیا تھا یہ وہ پہلے سے ہی جانتا تھا لیکن پھر اس نے کہاں کام تلاش کیا اسے اس کے بارے میں بھی پتہ نہیں تھا۔ اس کے پاس زری کا کوئی کانٹیکٹ نمبر بھی نہیں تھا جس کے ذریعے وہ اسے ٹریس آؤٹ کرنے کی کوشش کرتا واحد کام جو وہ کر سکتا تھا وہ اس اپارٹمنٹ کے آس پاس کے اپارٹمنٹس سے زری اور جمال کے موجودہ پتہ کا پتہ چلانے کی کوشش تھی لیکن وہ یہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی نہ کوئی چیز اس فیصلے میں آڑے آ رہی تھی۔

اس نے وقتی طور پر زری کو نہ ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا تھا اسے یقین تھا کہ اگر اسے واقعی اس کی ضرورت ہوتی تو وہ دوبارہ اس کے گھر یا آفس ضرور آئے گی اور اس نے اس کے بارے میں اپنی سیکرٹری کو ہدایات دی تھیں۔ اس دن کام کرتے ہوئے زری بار بار اس کے ذہن میں آتی رہی اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ہی اسے اس کا بینک اکاؤنٹ چیک کرنے کا خیال آیا تھا اس کا اکاؤنٹ اس نے اپنے بینک میں ہی کھلوایا تھا اور زری نے اپنے حق مہر کی رقم اس میں جمع کروائی تھی۔ کرم اس رقم کے علاوہ بھی کئی بار وقتاً فوقتاً اس کے اکاؤنٹ میں مزید رقم جمع کرواتا رہا تھا لیکن یہ جاننے کی کوشش کیے بغیر کہ اس کے اکاؤنٹ میں اب بیلنس کتنا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ زری کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ضرور تھی کہ اگر وہ بڑے اخراجات نہ کرتی تو اس کے چند سال بے حد آرام سے گزر سکتے تھے۔

بینک سے اسے اب اس کے بیلنس کے بارے میں تو پتہ نہیں چل سکتا تھا لیکن کرم کو یقین تھا کہ ان کے پاس زری کا کوئی موجودہ پتہ یا کانٹیکٹ نمبر ضرور ہوگا۔ وہ یہ دونوں چیزیں بھی اسے نہیں دینے والے تھے لیکن کرم چاہتا تھا کہ وہ اپنا کانٹیکٹ نمبر ان کے ذریعے زری تک ضرور پہنچاتا

تاکہ وہ اس سے رابطہ کرنا چاہتی تو کر لیتی۔

لیکن بینک منیجر سے بات کرنے پر اسے شاک لگا تھا زری کا وہ اکاؤنٹ بھی اسی سال بیلنس نہ ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ جس سال ڈائیورس ہونے کے بعد جمال کے ساتھ شادی کی گئی تھی۔ کرم کو کچھ دیر کے لیے یقین نہیں آیا۔ زری نے اتنی بڑی رقم کا کیا کیا تھا؟

کرم کو اب شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ شدید قسم کے فنانشل کرائسس کا شکار تھی اور شاید اسی لیے اس کے پاس آئی تھی۔

اگلے چند دن وہ زری کے بارے میں تشویش کا شکار رہا۔ چند بار اسے خیال آیا کہ وہ پاکستان فون کرکے اس کے گھر سے اس کے بارے میں بات کرے لیکن ایک بار پھر وہ اپنے اس ارادے سے باز رہا تھا۔ وہ Humble تھا شریف تھا نیک تھا، مخلص تھا، اعلیٰ ظرف تھا لیکن تھا ایک ''مشرقی مرد'' جس کی انا اس کے لیے بہت ساری خندقیں کھود دیتی ہے۔

اگلے چند دنوں میں وہ زری کو بھول گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا کوئی ایسا جذباتی تعلق نہیں تھا جو سالوں چلتا وہ اسے اس آسانی سے نہ بھولتا تو اور کیا کرتا

''کب ہو رہا ہے تمہارا آپریشن؟'' اس دن وہ رات کو سونے سے پہلے ماں کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بہن بھائی پورا دن وہاں گزارنے کے بعد چند گھنٹے پہلے ہی واپس گئے تھے اور کرم بے حد خوشگوار موڈ میں تھا۔

''دو تاریخ کو۔'' ''اللہ کرے آپریشن کامیاب ہو جائے۔'' اس کی ماں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

''ڈاکٹر کہہ رہا تھا معمولی آپریشن ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں آپ بس دعا کریں۔'' کرم نے ماں کو تسلی دی۔

''یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں نے تو جب سے تمہاری بیماری کا سنا ہے۔ دن رات تمہارے لیے دعا کر رہی ہوں۔ میری تو راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔'' اس کی ماں کی آواز بھرا گئی۔

''بیٹھے بٹھائے کیسی مصیبت میرے بچے پر آ گئی۔'' اس کی ماں نے دوپٹے کے ساتھ اپنے آنسو پونچھے۔

''آپ اتنا مت سوچیں۔''

''کیسے نہ سوچوں؟ ماں ہوں میں تمہاری۔ اولاد کو تکلیف ہو تو مجھے کیسے تکلیف نہیں ہوگی۔''

''میں جانتا ہوں۔'' کرم نے سر جھکا کر کہا۔

''اور میں کیا تمہارے سارے بہن بھائی پریشان ہیں تمہاری وجہ سے۔ دعائیں کر رہے ہیں وظیفے کر رہے ہیں۔ منتیں مانی ہوئی ہیں سب نے۔'' اس کی ماں نے قدرے جوش سے کہا۔ کرم تشکر کے احساس سے مغلوب ہو کر کچھ دیر کے لیے کچھ بول نہیں سکا۔

''جان دیتے ہیں سب تجھ پر کرم۔ بڑا اتفاق ہے میری اولاد میں۔ اللہ یہ اتفاق ہمیشہ برقرار رکھے۔'' اس کی ماں نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کی تھی۔

''بس مجھے رہ رہ کر ایک بات کا خیال آتا ہے۔'' اس کی ماں نے کہا۔

کرم چونک گیا۔

''کس بات کا؟'' ''زندگی اور موت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا بیٹا اللہ تمہیں لمبی عمر دے میری عمر بھی لگا دے۔ ...لیکن میں کہہ رہی تھی کہ تم اپنی وصیت لکھوا دیتے تو اچھا تھا آپریشن چھوٹا سہی پر ہے تو آپریشن ہی۔'' کسی نے خنجر لے کر پوری قوت سے کرم کے عین دل میں گھونپ دیا تھا۔ سانس لینے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''تمہارے بہن بھائی بھی کئی دنوں سے مجھے یہی کہہ رہے ہیں کہ بھائی جان سے کہیں وہ اپنے کاروبار اور جائیداد کے بارے میں وصیت لکھ دیں۔ تمہیں پتہ ہے بعد میں ایسی باتوں پر کتنے جھگڑے ہوتے ہیں تم اپنی زندگی میں ہی سب کو بتا دو گے کس کو کیا ملے گا تو پھر بعد میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' اس کی ماں سادہ لہجے میں کرم کا چہرہ دیکھے بغیر کہتی جا رہی تھی خاموشی سی خاموشی تھی جو کرم کے اندر اور باہر چھائی تھی تاریکی سی تاریکی تھی جو ہر طرف پھیل گئی تھی صرف وہی ایک لمحہ تھا جب کرم نے دل سے اللہ سے واقعی موت مانگی تھی موت آسان تھی۔ وہ سب بہت اذیت ناک تھا جو وہ سن رہا تھا ماں نے اسے کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہاں بیٹھے چند لمحوں کے لیے اس نے خود کو ہر فریب دینے کی کوشش بھی کی کہ وہ ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ بے حد ڈراؤنا خواب جو صرف چند منٹوں کے بعد ٹوٹ جاتا تھا لیکن خواب میں کوئی آنکھیں اور کان کیسے کھلے رکھ سکتا تھا یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''آصف تو ویسے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے بھائی جان نے پہلے ہی وصیت لکھوا لی ہو۔ وہ بڑے عقل مند آدمی ہیں۔ ..ہماری طرح تھوڑے ہیں۔'' اس کی ماں بولتی جا رہی تھی۔ کرم کا پورا وجود ادھڑنا شروع ہو چکا تھا۔ سلائیوں سے اترے کسی نامکمل سویٹر کی طرح جس کی اون کے سرے کو کوئی پکڑے کہیں کھینچتا جا رہا تھا۔ وہ سب ماں نہ کہتی تو گھاؤ اتنا گہرا نہ لگتا پر وہ سب ماں کہہ رہی تھی اور برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ کرم بس ماں کا چہرہ دیکھتا جا رہا تھا۔ ..بس دیکھتا جا رہا تھا۔ ..کون کہتا تھا کہ ماں کبھی اولاد کی موت کی بات نہیں کرتی۔ .. اس کی ماں تو کر رہی تھی کسی دقت کے بغیر بے حد آسانی سے۔ ..

''پھر میں کیا کہوں تمہارے بہن بھائیوں سے؟'' وہ اب اپنی بات ختم کرتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''لکھوا دوں گا ... آپ آرام کریں۔'' یہ دو جملے بولنے کے لیے کرم کو گردن تک دلدل میں پھنسے آدمی کی طرح کوشش کرنی پڑی تھی۔

''جیتے رہو۔'' اس کی ماں نے ہمیشہ کی طرح دعا دیتے ہوئے اس کا چہرہ پکڑ کر اس کا ماتھا چوما پہلی بار کرم کو وہ بوسہ ٹھنڈا لگا تھا ... یا پھر وہ اس کا دل تھا جس نے کسی بھی لمس کو جذبات اور احساسات میں Convert کرنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ رات ایک بار پھر بہت لمبی ہو گئی تھی گھر ایک بار پھر بہت خالی لگنے لگا تھا تنہائی ایک بار پھر اسے دہشت زدہ کرنے لگی تھی تو کرم علی کون تھا؟ اس کی زندگی کیا تھی؟ اس کا ہونا نہ ہونا کیا معنی رکھتا تھا بہت سارے سوال تھے جو اس کو چکرا رہے تھے اسے اس وقت شوکت زمان بری طرح یاد آیا تھا وہ آج صحیح معنوں میں شوکت زماں کی اذیت محسوس کر سکتا تھا اس کی زندگی کے ساتھ relate کر سکتا تھا۔ دنیا کی 'محبت' ''جیتنے'' اور اپنے رشتوں کی محبت ''پانے'' کے لیے کی جانے والی کوشش میں بس ایک فرق ہوتا

ہے۔ دنیا کی محبت جیتنے میں ناکام رہنے کا غم انسان کو گھن کی طرح نہیں کھاتا۔ اپنوں کی بے اعتنائی دیمک کی طرح چاٹنے لگتی ہے۔ دنیا کی محبت سو بار "خالص" ہونے کے پیمانے پر تولنے کے بعد بھی اپنی شرطوں پر قبول کرتا ہے اپنوں کی "جھوٹی محبت" کے لیے بھی وہ جھولیاں پھیلائے رہتا ہے۔ خونی رشتے وہ ناسور ہوتے ہیں جن کے بغیر انسان اپنی جوانی گزار سکتا ہے بڑھاپا نہیں اور کرم وہ 40 سال میں بھی اسی طرح خالی ہاتھ تھا جس طرح اپنے 20 سال میں یا جس طرح اپنے 60 سال میں ہوتا شوکت زمان جیسی زندگی تو وہ نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ اسے ایڈز تھا وہ اس لیے ایڑیاں رگڑنے پر مجبور اور موت مانگنے پر مجبور ہو گیا تھا اور کرم وہ کیوں موت مانگ رہا تھا۔

"میں نہ آپ کو زہر لا کر دے سکتا ہوں نہ تکیے سے آپ کا سانس بند کر سکتا ہوں نہ ہی آپ کا گلا دبا سکتا ہوں۔ یہ گناہ ہے میں نہیں کر سکتا۔" اس نے اس رات شوکت سے کہا تھا۔

"لیکن دیکھ کرم میں تجھے اس کے بدلے میں اپنی پوری جائیداد دے رہا ہوں تیری زندگی بدل جائے گی زندگی میں ایسا موقع پھر کہاں ملے گا تجھے؟" شوکت زماں ایک بار پھر گڑگڑا رہا تھا۔

"میں آپ سے زیادہ بزدل آدمی ہوں شوکت صاحب۔ آپ کی خدمت کر سکتا ہوں اگلے دس سال بھی آپ اس بستر پر پڑے رہے تو آپ کی غلاموں کی طرح خدمت کروں گا لیکن جان نہیں لے سکتا آپ کی آپ کے کہنے پر بھی نہیں۔ ساری رات سوچا ہے میں نے اس بارے میں۔ لیکن اتنا بڑا گناہ نہیں کر سکتا... اور وہ بھی صرف پیسے کے لیے۔" کرم نے دوٹوک انداز میں اس سے کہا تھا۔

"تو پھر تو کسی اور آدمی سے بات کر۔ اس سے کہہ وہ یہ کام کر دے۔" شوکت زماں نے کہا تھا۔

"وہ بھی گناہ ہو گا وہ بھی میرے ہی حساب میں لکھا جائے گا۔ مجھے معاف کر دیں لیکن میں یہ نہیں کر سکتا۔" کرم نے بے چارگی سے شوکت زماں سے کہا۔

"تو بڑا ظالم آدمی ہے کرم۔ تجھے انسانوں پر ترس نہیں آتا۔ میں نے کتنے احسان کیے تجھ پر۔ اور اب تیرے سامنے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور تو میرے لیے ایک چھوٹا سا کام نہیں کر سکتا۔" شوکت زماں اسے ایک بار پھر گالیاں دے رہا تھا۔

کرم چپ چاپ سنتا رہا پھر اٹھ کر باہر آ گیا۔ اس نے زندگی میں پیسے کی خواہش ضرور کی تھی لیکن اس کے لیے کبھی کوئی حرام کام نہیں کیا تھا۔ وہ اب کیسے کر سکتا تھا۔

شوکت زماں کی آواز وہ باہر تک بھی سن سکتا تھا۔ وہ نقاہت بھری آواز میں اسے وہاں سے نکل جانے کے لیے کہہ رہا تھا اور یہ وہ لمحہ تھا جب کرم علی نے واقعی وہاں سے چلے جانے کا سوچا تھا۔ اگلے چند دن وہ شدید کشمکش میں رہا تھا وہ شوکت زماں کو چھوڑ کر چلا جاتا تو پھر اس کا کیا ہوتا اسے یقیناً ہاسپٹل منتقل کرنا پڑتا لیکن وہاں شوکت زماں کے پاس چند لمحوں کے لیے بھی اس کی عیادت کے لیے جانے والا کوئی نہ ہوتا لیکن وہ اس کے پاس رہتا تو اسے خدشہ تھا کہ وہ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آ کر شوکت زماں کی بات ماننے پر مجبور نہ ہو جائے۔ وہ پہلے ہی شوکت زماں کی دولت کے بارے میں بہت کچھ سوچنے لگا تھا اور اسے ایک دوسرے شخص کی دولت کے بارے میں سوچنے کا خیال پریشان کرنے

لگا تھا — شوکت زماں کی دولت جیسے اس کے دل کو اپنی طرف کھینچنے لگی تھی۔

جس صبح وہ اپنا سامان پیک کر کے گھر چھوڑنے کی اطلاع دینے شوکت زماں کے پاس آیا اس نے اسے اپنے بستر میں مردہ پایا کرم کو شدید رنج ہوا تھا وہ چند لمحے وہ تھے جب اسے لگا تھا اس نے دولت مند ہونے کا سنہری موقع تھا پھر اس نے اس کی بات کیوں نہ مانی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا ہاتھ سے سب کچھ اب نکل چکا تھا کرم علی یہ نہیں جانتا تھا کہ شوکت زماں اپنی وصیت بہت پہلے لکھوا چکا تھا اور اپنی وصیت میں اپنے دونوں بیٹوں کے لیے کچھ مخصوص رقم چھوڑنے کے سوا اس نے اپنی ساری جائیداد کرم علی کے نام کی تھی لیکن یہ جائیداد کرم کو تب ملتی اگر شوکت زماں قدرتی موت مرتا شوکت زماں مرنے سے پہلے اس کے ساتھ کیا کھیل کھیل رہا تھا یہ کرم کو کبھی سمجھ میں نہیں آیا آج آ گیا تھا وہ ساری عمر شوکت زماں کو اپنا محسن سمجھ کر اس کا احسان مند رہا — وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس "محسن" نے دولت کی شکل میں اپنے وہ عذاب اس سزا کے طور پر مسلط کر دیا تھا جو وہ ساری عمر خود اٹھائے پھرا کرم سمجھتا رہا اس نے اسے آزمائش میں پورا اترنے پر انعام کے طور پر جائیداد اس کے نام کی تھی مگر شوکت زمان نے فطری موت ہونے کی صورت میں کرم کی مدد نہ ملنے کے امکان کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو وہ سب سونپ دیا تھا وہ کرم کو اتنا مال مال کر دینا چاہتا تھا کہ اس کے خونی رشتے اسے گدھوں کی طرح نوچ نوچ کر کھانے لگیں کرم کی جیبوں کے علاوہ ان کا دھیان کہیں اور جائے ہی نہ وہ اسے دولت نہ دیتا تو محنت مزدوری کر کے پیسہ اکٹھا کرنے والے کرم کو شاید خونی رشتوں کی وہ قدر اور محبت مل جاتی جو اسے اب نصیب نہیں تھی — شوکت زماں اس سے ہمدردی اور محبت کرنے والوں کو رشک اور حسد کرنے والے جگھٹے میں تبدیل کرنا چاہتا تھا اور شوکت زماں نے ایسا کر دکھایا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں اس رات بیٹھ کر کرم نے اتنے سالوں میں پہلی بار سوچا کہ اسے شوکت زماں کا وہ سارا پیسہ تب نہیں لینا چاہیے تھا — وہ اس کا پیسہ نہیں تھا — اس نے اسے نہیں کمایا تھا — وہ ایک آدمی کا چھوڑا ہوا ترکہ تھا جو اس کی اولاد کے پاس جانا چاہیے تھا چاہے اس آدمی نے اسے اولاد کے لیے چھوڑا تھا یا نہیں — وہ دولت کرم علی کے لیے "کرم" نہیں تھی۔

☆☆☆

"میں کیا کروں اس کا؟" اتنے مہینوں سے فون کر کر کے جان عذاب میں کر دی ہے اس نے — نمبر بدلتا ہے — آواز بدلتا ہے — نام بدلتا ہے — سوکال میں کرتا ہے ایک دن میں — ایک بار اس سے بات کر ہی لیں پری جی — میری جان تو چھوڑے یہ۔" سلطان نے ایک بار پھر سیل فون کو آف کرتے ہوئے کہا۔ وہ بے حد زچ لگ رہا تھا۔

"ابھی اسے فون کرنے دو — بات کرنے کی اتنی جلدی کیا ہے اسے — نہ وہ کہیں جا رہا ہے — نہ میں کہیں جا رہی ہوں — دونوں یہیں ہیں تو پھر کیسی جلدی۔" زری نے اپنے ناخنوں پر کیوٹکس لگاتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا اتنے سال سے کوئی رابطہ نہیں کیا اس نے — اب اتنے سالوں کے بعد آپ کی یاد کیسے ستانے لگی اسے؟" سلطان نے اس کے ہاتھ سے کیوٹکس کی بوتل پکڑ لی تھی۔

"اسے لگتا ہے میں اس کے انتظار میں بیٹھی ہوں... شادی جو نہیں کر رہی — مرد کو بڑی خوشی ہوتی ہے جب عورت اس کی یاد کا طوق گلے میں لٹکائے اس کے نام پر بیٹھی رہے۔" زینی کے لفظ تلخ تھے یہ نہیں وہ یوں بات کر رہی تھی جیسے اپنے اور شیراز کے بارے میں نہیں کسی اور کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

"جب جانتی ہیں تو کیوں بیٹھی ہوئی ہیں اس کے لیے؟ — دفع کریں اسے پری جی... آپ بھی گھر بسا لیں اب..."

زینی اس کی بات پر ہنسی سلطان نے برا منایا۔

"پہلی دفعہ کسی ہیروئن کا سیکرٹری اسے شادی کا مشورہ دے رہا ہے۔ کسی دوسری ہیروئن کے پاس تو نہیں جانا چاہتے؟"

زینی نے اسے چھیڑا۔ سلطان اور ناراض ہوا

"بار بار سیکرٹری کہہ کر میری اوقات کیوں جتاتی رہتی ہیں مجھے پری جی۔ ٹھیک ہے تنخواہ دار ملازم ہوں آپ کا وہ مجبوری ہے میری آپ کا گھر بس جائے گا تو کتنی خوشی ہوگی مجھے آپ کو اس کا اندازہ بھی نہیں ہے۔"

"شادی۔ گھر بسانا کس سے شادی کروں؟ بتاؤ مجھے؟"

اتنے لوگ کہتے ہیں آپ سے شادی کے لیے۔"

"ان مردوں سے شادی کروں جو گھر میں شریف اور معزز خاندانوں کی عورتوں کو شادی کے نام پر لا کر بٹھانے کے بعد باہر جگالی کرتے پھرتے ہیں۔" زینی کے لہجے میں تنفر تھا۔

"ایسے مرد جو پاؤں کی جوتی اور عورت میں زیادہ فرق نہیں سمجھتے تم چاہتے ہو میں کسی کے پاؤں کی جوتی بن جاؤں؟" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"اللہ نہ کرے پری جی۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ آپ کو پاؤں کی جوتی کون بنائے گا سر کا تاج بنا کر رکھیں گے... اتنے لوگ جان دیتے ہیں آپ پر — آپ کیوں سوچتی ہیں کہ شادی کے بعد ان کا رویہ بدل جائے گا۔"

"کیونکہ میں عقل کی اندھی نہیں ہوں۔" زینی نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"اور ویسے بھی رشتے بنا کر اب مجھے کرنا کیا ہے؟... جو پہلے تھے ان کا کیا کر لیا کہ اب مزید گلے کے پھندے تیار کروں میں۔"

"تو اس کا کیا کروں پری جی۔ — وہ تو بات کیے بغیر نہیں ٹلے گا آج بھی 35 بار کال کی ہیں اس نے — جو کچھ مجھے کہہ رہی ہیں ایک بار اسے کہہ دیں میری بات کا تو اثر نہیں ہوتا۔ اس پر ہو سکتا ہے آپ کی بات کا ہی ہو جائے۔" سلطان نے کہا تھا۔

کیوٹکس کا برش ہاتھ میں لیے زینی کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے سلطان کو برش دیتے ہوئے اپنا سیل فون اس کے ہاتھ سے تھام لیا۔

"فون کرنے لگی ہیں اسے؟" سلطان بے اختیار خوش ہوا۔ زینی نے جواب نہیں دیا۔ سیل آن کر کے اس نے شیراز کو کال بیک کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ شیراز کی بدقسمتی تھی کہ وہ زینی کا سیل آف ہونے کے بعد قدرے مایوس ہو کر ڈنر ٹیبل پر آیا تھا اور ابھی اس نے کباب کا پہلا لقمہ منہ میں

رکھا ہی تھا جب ٹیبل پر رکھا اس کا سیل بجنے لگا۔ شیراز نے بے حد لاپرواہی کے انداز میں سیل پر نظر ڈالی اور زینی کا نام سکرین پر چمکتے دیکھ کر اس کا دل جیسے کچھ دیر کے لیے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا کانٹا پکڑنے کی کوشش کرتے کرتے بھی پلیٹ میں گر پڑا تھا۔ شینا نے چونک کر اسے دیکھا۔ شیراز یک دم بے حد نروس بے حد کنفیوزڈ نظر آ رہا تھا یوں جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ کیا کرے کال ریسیو کرے یا ایسے ہی بیٹھا رہے۔ شینا نے بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اور یہ جیسے اس کی نظریں ہی تھیں جنہوں نے جیسے شیراز کو حوصلہ دیا تھا وہ یک دم سیل فون پکڑ کر ایکسکیوزمی کہتے ہوئے ٹیبل سے اٹھ گیا۔ شینا کھانا کھاتے کھاتے رک گئی تھی۔ وہ کس سے بات کر رہا تھا کہ اسے تنہائی کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اس سے پہلے تو وہ ٹیبل پر ہی کالز لے لیا کرتا تھا۔ پھر اب وہ کون تھا جس سے بات کرنے کے لیے اسے ٹیبل سے اٹھ کر کمرے سے نکلنا پڑا تھا۔ اتنے سالوں میں اسے شیراز کے معاملات میں صرف اتنی دلچسپی تھی کہ وہ کسی دوسری عورت میں دلچسپی نہ لے اور اپنا روپیہ کہیں اور خرچ نہ کرے۔ باقی وہ کیا کرتا تھا۔ کیسے رہتا تھا؟ کیسے جیتا تھا۔ شینا کو اس میں دلچسپی نہیں تھی۔ شوہر نام کا جو ڈھول اس نے گلے میں بجانے کے لیے ڈال لیا تھا اسے وہ بہت پہلے اتار کر پھینک چکی ہوتی اگر سعید نواز شیراز کے پیچھے نہ کھڑے ہوتے۔ اتنے سالوں میں بھی ان دونوں کا رشتہ ابھی بھی اسی طرح ہچکولے کھاتا پھر رہا تھا جیسے وہ شادی کے شروع کے دنوں میں تھا۔ سہیل اس دوران اپنی بیوی کے ساتھ بیرون ملک چلا گیا تھا اور یہ پہلا سیٹ بیک تھا جو شینا کو ہوا تھا اس کا خیال تھا وہ پاکستان میں رہے گا تو کبھی نہ کبھی وہ اسے اس کی بیوی کو چھوڑ دینے پر مجبور کر ہی لے گی لیکن اس کا پاکستان سے چلا جانا۔ سعید نواز اور شیراز کو اس وقت ایک امید بندھی تھی کہ شاید شینا اب شیراز کے ساتھ اپنے رویے پر نادم ہوتے ہوئے اپنے رویے کو بہتر کرے گی۔ مگر یہ ان دونوں کی خوش فہمی تھی۔ شینا نے اپنے سوشل سرکل میں نئے بوائے فرینڈز بنا لیے تھے۔ شیراز دنیا میں رہ جانے والا آخری مرد بھی ہوتا تب بھی شینا کے لیے اسے برداشت کرنا ناقابل برداشت تھا۔ اسے شیراز سے اتنی ہی چڑ تھی۔ اور کیوں تھی یہ شیراز کو سمجھ نہیں آتی تھی۔ اتنے سالوں میں اس نے اس طرح کا مرد بننے کے لیے لاکھ پاپڑ بیلے تھے جیسے مرد شینا کو اچھے لگتے تھے۔ اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے لے کر اپنی بول چال تک اس نے خود کو مکمل طور پر بدل لیا تھا۔ کوئی بھی اب اسے دیکھ کر یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے اپر کلاس کا حصہ نہیں رہا۔ لیکن شینا کے لیے وہ اب بھی قابل قبول نہیں تھا۔ بہر حال اتنے سالوں میں شیراز نے ایک چیز سیکھ لی تھی۔ آنکھوں میں دھول جھونکنا شادی کے ابتدائی سالوں کے برعکس وہ اب شینا کے شکنجے سے بڑی آسانی سے بچ نکلتا تھا۔ اس نے شینا اور سعید نواز کو دھوکہ دیتے ہوئے بہت سارا روپیہ آر پار کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب بھی سعید نواز کو پتہ چلتا تو وہ کچھ دیر کے لیے اس کی ٹھیک ٹھاک بے عزتی کرتے۔ وہ ہمیشہ کی طرح جھوٹ کے انبار گھڑ کر رکھ دیتا۔ اور سب کچھ پہلے کی طرح ہی رہتا۔ بے عزتی سے اب اسے خوف نہیں آتا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا ایک اہم جز بن گئی تھی وہ اس سے کیا خوف کھاتا۔ اور وہ یہ بھی اندازہ کر چکا تھا کہ سعید نواز اس کو پٹے کے طور پر شینا کے گلے میں باندھے رکھنے پر مجبور تھے۔ اور ان کی اس مجبوری سے وہ جتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا اٹھا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر شینا نے اس سے الگ ہو ہی جانا تھا۔ یہ واحد صحیح نتیجہ تھا جو اس نے اتنے سالوں میں نکالا تھا۔ اور اس نتیجے نے اسے اپنے مستقبل کی پلاننگ کے حوالے سے کچھ اور چیزیں بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور ان میں سے ایک دوسری شادی تھی لیکن یہ قدم وہ تب ہی اٹھاتا جب شینا کسی وجہ سے اس سے طلاق لے لیتی وہ خود ایسا کوئی قدم اٹھا کر

سعید نواز کے عتاب کا نشانہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ ...لیکن شیراز نے تلاش شروع کر دی تھی۔ اپنے سوشل سرکل میں اپنی آئندہ ممکنہ بیوی... اپر کلاس ہی کی کوئی دوسری عورت (کم از کم یہ وہ معیار تھا جس پر وہ کمپرومائز کرنے پر تیار نہیں تھا)۔ بے شک زیادہ خوبصورت نہ ہوتی۔ بے شک مطلقہ ہوتی لیکن اس بار وہ لو میرج چاہتا تھا تاکہ اس طرح کی ذلت اور ہتک اس کی زندگی میں دوبارہ نہ آئے جس کا شکار وہ پچھلے کئی سالوں سے شینا کے ساتھ تھا۔ شینا کی طرح ہی وہ بھی گرل فرینڈز بدلنے لگا تھا۔ سعید نواز کی طرح وقتی وابستگیاں اس کی زندگی کا حصہ بھی بننے لگی تھیں۔ کہیں نہ کہیں دولت ہونے کے باوجود محبت نام کا ایک خلا جو اس نے خود اپنے وجود میں پیدا کیا تھا اب اس کو بری طرح چبھنے لگا تھا دولت نے اس کی ہر کمی پوری نہیں کی تھی۔ اور جب بھی شیراز کو محبت نام کی چیز کی خواہش ہوتی زینی اس کی نظروں کے سامنے آ جاتی۔ وہ اس سے کتنی نفرت کرنے لگی تھی اور اسے ذلیل کرنے کے لیے کیا نہیں کر سکتی تھی شیراز کو اس کا اندازہ اس ایک ملاقات سے ہی ہو گیا تھا جو اس کے گھر پر ہوئی تھی اور اس ایک ملاقات کے بعد وہ کچھوے کی طرح اپنے خول میں بند ہو گیا تھا وہ ہر اس جگہ سے دور بھاگ رہا تھا جہاں اسے شوبز کے کسی بھی فرد کے آنے کا خدشہ ہوتا زینی تو خیر ایک بہت دور کی شے تھی۔ وہ جانتا تھا وہ جب بھی اس کے سامنے آئے گی وہ طوفان کی طرح آئے گی اور وہ اس کے جانے کے بعد اپنے پرزے سمیٹتا پھرے گا جیسے پہلی بار سمیٹتا رہا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود اسے یقین تھا کہ وہ محبت اسی سے کرتی ہے۔ اور کبھی نہ کبھی اس کا یہ غصہ یہ ناراضگی ختم ہو جائے گی اور تب اس کے لیے زینی سے دوبارہ مراسم بڑھانے آسان ہو جائیں گے اتنے سالوں میں کرم کی طرح اس نے بھی زینی کے بارے میں ایک ایک چیز کی خبر رکھی تھی۔ ...اس کی ایک ایک کیریئر موو پر اس کی نظر تھی۔ ...اور اسے جتنا عروج مل رہا تھا شیراز کی اس سے ملنے کی خواہش اتنی ہی شدید ہو رہی تھی۔ وہ پاکستان کی Most Wanted Woman تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ شیراز جیسا مرد اس کے چارم سے محفوظ رہ پاتا۔

اب اتنے سالوں کے بعد اس سے رابطے کی کوشش اس نے بہت سوچ سمجھ کر کی تھی۔ اسے جس طرح کے ردعمل کی توقع تھی۔ زینی نے ویسے ہی ری ایکٹ کیا تھا لیکن شیراز مستقل مزاج تھا۔ وہ اگر شینا جیسے فتنے کے ساتھ اتنے سال گزار سکتا تھا تو زینی کا اس طرح کا رویہ تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے یقین تھا زینی پگھل جائے گی۔ پری زاد نام کا ماسک وہ زیادہ عرصے اپنے وجود پر چڑھا کر نہیں رہ سکے گی۔

اور آج اس طرح یک دم اس کی کال، جانے پر اسے لگا تھا جیسے اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔

اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈائننگ روم سے نکل کر زینی کی کال ریسیو کی۔

"ہیلو زینی!" اس نے بڑی بے تابی سے کہا۔

"پری زاد" دوسری طرف سے زینی نے اسے کہا۔

شیراز چند لمحوں کے لیے طے کرتا رہا کہ اسے اس کو کس نام سے پکارنا چاہیے پھر اس نے کہا۔

"پری زاد کیسی ہو تم؟"

"بہت اچھی ہوں۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔"

"یقین کرلو شیراز" اس نے بڑی سرد مہری سے اس سے کہا شیراز کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔

"بات تم شروع کرو گے یا میں کروں؟" زینی نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

"I am sorry" اس نے ندامت سے کہا۔

کسی نے جلتے ہوئے انگارے زینی کی ہتھیلیوں پر رکھ دیے۔

"تم مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی۔"

"معافی مانگنے کی اتنی جلدی کیا ہے تمہیں شیراز۔ ابھی تو بڑا وقت ہے۔ معافی مانگنے کے لیے تو آمنا سامنا ضروری ہوتا ہے۔" اس نے شیراز کی بات کاٹ کر کہا۔

"آمنا سامنا ہی چاہتا ہوں میں تم سے۔"

"اس کے لیے چند سال انتظار کرو۔ کچھ کام مجھے نپٹا لینے دو۔ کچھ کام تم نپٹا لو۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر پہلے بات کریں گے پھر حساب کتاب کریں گے۔"

زینی نے فون آف کر دیا۔ اسے اس بار مایوسی نہیں ہوئی۔ اس سے اتنی بات بھی اس کی کامیابی تھی۔ وہ اس کے گرد کھنچی ہوئی دیواروں پر پہلی ضرب لگا چکا تھا۔

وہ قدرے مسرور سا اندر ڈائننگ روم میں واپس آیا اور سیل ٹیبل پر رکھتے ہی اس نے شینا کو ہاتھ پر ہاتھ رکھے اپنا منتظر پایا وہ کھانا نہیں کھا رہی تھی۔

"کس کا فون تھا؟" اس نے شیراز کے بیٹھتے ہی کہا۔

"ایک دوست تھا۔ شیراز نے نظریں چراتے ہوئے اپنی پلیٹ کو دیکھا۔

"دوست تھا یا تھی؟" اگلا سوال بے حد ڈائریکٹ تھا شیراز کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی شینا نے ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل اٹھا کر اس کی کالز کا ریکارڈ چیک کرنا شروع کر دیا شیراز کا چمچ ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے گرا تھا۔ وہ بری طرح بوکھلایا تھا۔

"زینی" شینا نے بے حد تنفر سے لاسٹ کال کو دیکھا۔

"کون ہے یہ؟"

"میرے ساتھ کام کرتی ہے آفس میں۔" شیراز نے بے اختیار جھوٹ بولا۔

"تو آفس میں کام کرے۔ گھر میں کیا کام پڑ گیا ہے اس کو دیکھتی ہوں اسے۔" شیراز کے ہاتھ کانپنے لگے۔ شینا کال بیک کر رہی تھی۔

"شینا۔ شینا پلیز وہ کیا سوچے گی میری بے عزتی ہو جائے گی۔" شیراز منتیں کرنے لگا تھا۔

"وہ ان کی ہوتی ہے جن کی کوئی عزت ہوتی ہے۔ اس لیے تم بے عزتی کی تو فکر مت کرو۔" شینا نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

شیراز نے بے اختیار دل میں فون کے بند رہنے کی دعا کی ..دعا قبول نہیں ہوئی تھی دوسری طرف سے زینی نے کال ریسو کر لی تھی۔ ہیلو کہتے ہی اس کے کانوں میں شینا کی حقارت بھری آواز پڑی تھی۔

"میں مسز شیراز بول رہی ہوں اور تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ دوبارہ میرے شوہر کے نمبر پر تمہاری کال نہیں آنی چاہیے۔"

"ورنہ تم کیا کرو گی؟"

شینا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہا ورنہ تم کیا کرو گی؟" زینی نے بے حد ٹھہر ٹھہر کر اپنا ایک ایک لفظ دہرایا۔

"اس سے بات کروا بھی اور اسی وقت اور اسے بتاؤ کہ تم دوبارہ اس کی آواز بھی نہیں سننا چاہتے۔" شینا نے غراتے ہوئے شیراز کے ہاتھ میں فون تھمایا۔ دوسری طرف فون کال سے لگائے زینی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ زندگی نے اسے ایک بار پھر جیسے بازار میں لا کر جا کھڑا کیا تھا۔ ایک آس تھی اسے۔ ایک موہوم سی آس۔ وہ چند لمحے پہلے اس سے ایکسکیوز کر رہا تھا۔ وہ اب ایک بار پھر اسے وہ سب کچھ نہیں کہے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا شیراز نے نہ چاہتے ہوئے بھی شینا کے الفاظ دہرا دیے۔ کسی نے پھر سے بازار میں جیسے زینی کے منہ پر جوتا کھینچ مارا تھا سیل اب دوبارہ شینا کے ہاتھ میں تھا۔

"سن لیا تم نے؟ دوبارہ تمہارا فون نہیں آنا چاہیے۔ سن لیا نا؟"

"بہت اچھی طرح" زینی نے بمشکل کہا۔ آگ ہی آگ تھی جو اس کے وجود کو جلانے لگی تھی۔

"اس کی آواز بڑی familiar لگ رہی ہے مجھے۔ پتہ نہیں کیوں۔" شینا نے ایک لمحے کے لیے الجھتے ہوئے فون ٹیبل پر رکھا تھا اور پھر کندھے اچکا دیے۔ شیراز کی جان میں جان آئی۔ شینا نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ زینی کو وہ دوبارہ منا سکتا تھا۔

اس نے کھانا ختم کرتے ہی شینا کے گھر سے نکلنے کے بعد زینی کو کال کی تھی اس کا سیل آف تھا۔ شیراز نے دوسرے دن فون کرنے کا سوچا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ جتنی محنت اس نے زینی کو اس سے بات کرنے پر کی تھی وہ شینا کی ایک ہی کال نے برباد کی تھی اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ شینا نے اس کی محبت پر نہیں اس کال سے شیراز کی قسمت پر سیاہی پھیر دی تھی۔

وہ سارا غصہ اس رات ایک آتش فشاں کی طرح زینی کے اندر ابل پڑا تھا جو وہ اتنے سالوں سے مسلسل دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کتنی بار اسے ذلت دیتا آخر کتنی بار۔ شینا کے لہجے کا غرور ایک نیزے کی انی کی طرح اسے چبھ رہا تھا تو شیراز کی بزدلی اسے خنجر کی طرح کاٹ رہی تھی۔

اس رات اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد ایک بار پھر ہوش و حواس کھوئے تھے۔ بے تحاشا شراب پی تھی بے شمار سگریٹ پھونکے تھے۔ سلطان اس کی حالت دیکھ کر پچھتا رہا تھا شیراز سے ملاقات کا مشورہ اسی نے دیا تھا اسے۔ وہ جانتا ہوتا کہ پری زاد کی یہ حالت ہو جائے گی تو وہ پری زاد سے نہ کہتا۔

"ایسی بھی کیا ہو گیا ہے پری جی؟ ...ایسی بھی کیا کہہ دیا ہے اس نے؟" وہ جاننے کے لیے پری زاد کی منتیں کرتا پھر رہا تھا... اور وہ چپ تھی اور سلطان کو ہمیشہ اس کی خاموشی سے ڈر لگتا تھا... وہ جانتا تھا اب وہ کچھ پلان کر رہی تھی... اور اب وہ کس کو ڈبونے والی تھی یہ کم از کم پہلے کی طرح اس کے لیے راز نہیں تھا... لیکن کرنا کیا چاہتی تھی... یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا... چند دنوں بعد آ گیا تھا۔

☆☆☆

شیراز کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا اس نے ایک بار پھر اس سے معذرت کرنے کے لیے اسے فون کیا تھا اور زینی نے اس کی بات سننے کی بجائے بڑے بیٹھے بیٹھے میں اس سے ملنے کے لیے اسے ایک گیسٹ ہاؤس میں بلا لیا تھا۔

"بکنگ تم کرواؤ گے... مسٹر اور مسز شیراز کے نام سے۔"

شیراز کو لگا اسے سننے میں غلطی ہو رہی تھی اس کا دل جیسے اس کی پسلیاں توڑ کر باہر آ جانا چاہتا تھا... وہ کیا رات گزارنے کے لیے اسے وہاں بلا رہی تھی... ؟ یقیناً رات گزارنے کے لیے بلا رہی تھی... ورنہ... ورنہ... کیا زینی اس پر اس طرح مہربان ہو سکتی تھی؟... ہاں کیوں نہیں... وہ محبت کرتی ہے مجھ سے... وہ خود ہی سوال کر رہا تھا... خود ہی جواب دے رہا تھا... اس کے پورے وجود میں یک دم جیسے پارہ بھر گیا تھا۔

"تم پہلے میرے گھر آ کر مجھے پک کرو گے... ہم PC میں ڈنر کریں گے... اس کے بعد اس گیسٹ روم میں جائیں گے... بہت ساری باتیں ہوں گی پھر... تم ہی کہہ رہے تھے تاکہ میرا سامنا کرنا چاہتے ہو... مجھ سے ملاقات کی خواہش ہے تمہیں۔"

شیراز بہت کچھ کہنا چاہتا تھا اس سے لیکن فرط جذبات سے اس سے بات نہیں ہو رہی تھی... زینی نے فون بند کر دیا... اچھا کیا شیراز اس وقت جیسے اپنے آپ میں نہیں رہا تھا... ایک دن اور ایک رات کے بعد وہ اس لڑکی سے ملنے والا تھا جس سے وہ بھی محبت کرتا تھا (کم از کم اس بات پر اسے یقین تھا)

وہ ساری رات سو نہیں سکا... وہ ساری باتیں سوچتا رہا جو اسے زینی سے کہنی تھیں وہ سارے خیالات ترتیب دیتا رہا جو اس کے ذہن میں آ رہے تھے... سوچتا رہا کہ زینی اس سے کیا کیا گلہ کر سکتی ہے اور ہر گلے کا وہ مناسب ترین جواب تلاش کرتا رہا... ایسا جواب جو زینی کو مطمئن کر سکے... وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے "زینی" سے ملنے کی زیادہ خوشی تھی یا "پری زاد" سے ملنے کی... جواب وہ جانتا تھا... لیکن وہ جواب وہ زینی کے سامنے نہیں دے سکتا تھا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر اس نے بے حد سنجیدگی سے شینا کو بتا دیا کہ وہ شہر سے باہر جا رہا تھا... ایک دن بعد آئے گا... "شہر کی بجائے وہ دنیا سے بھی باہر جا رہا ہوتا تو شینا کو دلچسپی نہ ہوتی۔"

وہ شام کو مقررہ وقت سے بھی پہلے زینی کے گھر پہنچ گیا تھا۔

چند منٹوں بعد اسے گھر میں داخلے کا پروانہ مل گیا۔ پھولوں کے بکے کے ساتھ اس کے شاندار ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے شیراز کو ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے... وہ کیوں اتنا نروس تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا... اتنا نروس تو وہ سعید نواز اور شینا کے علاوہ کسی کا سامنا کرتے ہوئے

نہیں ہوتا تھا۔

ملازم نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ شیراز نے کیک رکھ دیا اور خود ڈرائنگ روم میں بے چینی سے ٹہلنے لگا بیٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ چند لمحوں کے بعد وہاں آنے والی تھی اور شیراز اس کے متوقع ردعمل کے بارے میں اندازے لگانے میں مصروف تھا۔

☆☆☆

سلطان کو چند لمحوں کے لیے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ منہ کھولے وہ بے یقینی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ پنڈلی کے گرد سینڈل کے ان اسٹریپس کو لپیٹنا بھول گیا۔ جنہیں چند لمحے پہلے وہ بڑے انہماک، شوق اور محبت کے ساتھ لپیٹ رہا تھا۔

وہ خاموش نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اب بڑی سہولت کے ساتھ جھک کر ان اسٹریپس کو خود لپیٹنا شروع کر دیا تھا۔ سلطان اس کے پیروں کے پاس کارپٹ پر کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھا اسی ہکا بکا انداز میں پری زاد کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے پچھلے آٹھ سالوں میں سینکڑوں بار اسے اسی طرح چونکایا تھا۔ آٹھ سال کے طویل عرصے کے بعد اب سلطان کو یقین تھا کہ وہ اسے مزید حیران اور پریشان نہیں کر سکتی کیونکہ وہ پری زاد کو اندر باہر سے جان گیا تھا۔

لیکن اس وقت اس کے سامنے بیٹھے وہ اپنے آپ کو احمق سمجھ رہا تھا۔ پری زاد کے بارے میں انڈسٹری جو کہتی تھی ٹھیک کہتی تھی۔

صرف پانچ منٹ پہلے ہی تو اس کے سرخ کیوٹکس سے رنگے ہوئے بے داغ ناخنوں کو دیکھتے ہوئے وہ اس کے پیروں پر قربان ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ ہر بار اسی شوق اور لگن کے ساتھ پری زاد کے پیروں میں جوتے پہناتا تھا۔ اور اس پر رشک کرتا تھا۔ وہ کسی بیلے ڈانسر کے پیروں کی طرح نازک، خم دار اور دودھیا تھے۔ سلطان نے شراب کے نشے میں بہت سے مردوں کو اس کے پیروں کو چومتے دیکھا تھا اور اسے سامنے بٹھا کے وہ روز ان پیروں میں جوتے پہنایا کرتا تھا۔

وہ اب اسٹریپس بند کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اپنی ساڑھی کو سنبھالتے ہوئے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی، سلطان اب بھی اسی طرح کارپٹ پر بیٹھا سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آئینے میں خود پر تنقیدی نظریں ڈالتے ہوئے اپنی ساڑھی ٹھیک کر رہی تھی۔

کمرے میں پڑا انٹرکام بجنے لگا تھا۔ سلطان چونک گیا پھر اٹھ کر انٹرکام کی طرف گیا۔ وہ اسی طرح آئینے میں اپنی ساڑھی کو ٹھیک کرتے ہوئے بولتی رہی۔

چوکیدار نے انٹرکام پر سلطان کو ”کسی“ کی آمد کی اطلاع دی۔ سلطان انٹرکام کا ریسیور ہاتھ میں لیے پری زاد کو اس آمد کی اطلاع نہیں دے سکا۔ وہ آئینے سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بولنے سے پہلے ہی اس سے کہہ رہی تھی۔

”اسے اندر آنے دو۔ میں نے تم سے کہا تھا ناوہ وقت سے پہلے یہاں پہنچ جائے گا۔“

سلطان جان نہیں سکا اس کے لہجے میں کیا تھا۔ اس نے انٹرکام پر چوکیدار کو ہدایت دی پھر ریسیور رکھ دیا۔

"یہ مت کریں۔" وہ ریسیور رکھتے ہی پری زاد کی طرف آیا تھا۔ پری زاد نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

وہ "دوپہر" سے اس "ملاقات" کی تیاری کر رہی تھی۔

پری زاد "کب" سے اس ملاقات کی تیاری کر رہی تھی یہ پری زاد کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

"یہ مت کریں۔" سلطان ایک بار پھر گڑگڑایا۔

"کیوں؟" وہ مسکرائی۔ "تمہیں مجھ پر ترس آرہا ہے یا اس پر؟"

"نو سال لگائے ہیں یہ فلمی کیریئر بنانے میں آپ نے۔ آپ اس طرح کی کوئی چیز سوچ بھی کیسے سکتی ہیں۔؟"

وہ اب اسے پتہ نہیں کیا کیا یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں سلطان؟"

اس نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے یک دم، مڑ کر مسکراتے ہوئے سلطان سے پوچھا۔ وہ آٹھ سال سے اس کے ساتھ تھا۔ ان آٹھ سالوں میں اسے ایک موقع بھی یاد نہیں آیا۔ جب پری زاد نے اس سے یہ سوال کیا ہو۔ اس نے پری زاد کو کسی سے بھی یہ سوال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ پری زاد کیسی لگتی تھی، پری زاد جانتی تھی۔

اس نے پری زاد سے پہلے انڈسٹری کی دو بڑی ہیروئنز کے ساتھ تیرہ سال کام کیا تھا۔ وہ دونوں بھی انڈسٹری کی خوبصورت ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھیں۔ مگر وہ دن میں کئی کئی بار سلطان سے یہ سوال کرتی تھیں، اپنی مرضی کا جواب سننے کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوتی تھیں۔ وہ کہیں جانے کے لیے پندرہ پندرہ بار اپنی وارڈ روب سے کپڑے نکالتیں، ہر بار غیر مطمئن ہوتے ہوئے انہیں واپس رکھ دیتیں۔

دس دس جوتے پاؤں میں بدلنے کے باوجود اپنے پاؤں کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتی تھیں۔ پندرہ پندرہ بار اپنی جیولری بدلتیں اور پچاس بار اپنا میک اپ ٹھیک کرتیں پھر بھی انہیں اپنے چہرے اور جسم پر موجود دوسرے لوازمات میں کوئی نہ کوئی چیز ٹھیک نہیں لگتی، کوئی نہ کوئی چیز پریشان کرتی رہتی۔ لپ اسٹک ہونٹوں کے کسی نہ کسی کونے پر ہلکی ہوتی رہتی۔ چہرے کے کسی نہ کسی حصے پر کمپیکٹ پاؤڈر سے ٹچنگ کی ضرورت پڑتی تھی۔ آنکھوں کا آئی لائنر کہیں نہ کہیں سے نامناسب لگتا ہی رہتا۔

پری زاد وارڈ روب کھول کر ہاتھ میں آنے والا پہلا لباس پہن لیتی۔ بعض دفعہ یہ کام بھی سلطان ہی انجام دیتا وہ اپنی مرضی سے اس کے لیے کپڑے نکال دیتا اور وہ دوسری نظر ڈالے بغیر اس لباس کو پہن لیتی۔ سلطان ہی اس کے لیے میچنگ جیولری اور جوتے نکالتا تھا اور پری زاد کو کبھی ان پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

سلطان نے ایک بار یہ بات اس سے کہہ ہی دی تھی۔

"جس مرد سے شادی کا ارادہ ہوگا اس کے لیے تیار ہوتے ہوئے گھنٹے لگاؤں گی۔ درجنوں ملبوسات کو رد کر کے کسی ایک لباس کا انتخاب کروں گی۔ جوتے بدل بدل کر دیکھوں گی اور صرف وہ زیور پہنوں گی جو اس نے مجھے دیا ہوگا۔" اس نے ہنس کر کہا تھا۔

"جن کے لیے اب تیار ہوتی ہوں، یہ تو کیڑے مکوڑے ہیں۔" اس نے اسی سانس میں کہا تھا۔
"لیکن تم فکر مت کرو، پری زاد کسی سے شادی نہیں کرے گی۔"

سلطان نے اسے مذاق سمجھا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا پری زاد مذاق بہت کم کیا کرتی ہے۔

آج پری زاد کو تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر سلطان کو ایک لمحے کے لیے کچھ شک سا ہوا اس کی وہی بات یاد آئی وہ وارڈ روب کھولے کھڑی کپڑوں پر نظر ڈال رہی تھی اور کسی لباس سے مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر یک دم مڑ کر اس نے سلطان سے کہا۔

"آؤ سلطان! ساڑھی خریدنے چلیں۔" وہ اسے لے کر ایک بڑے ڈیزائنر کے بوتیک پر آ گئی۔ وہاں ساڑھی خریدی جس کے ساتھ بیک لیس بے حد مختصر سا سرخ رنگ کا بلاؤز تھا سلطان کو حیرت ہوئی جب پری زاد نے اس ساڑھی کے ساتھ میچنگ میں ملنے والی سرخ سینڈلز کے بجائے اسی بوتیک میں پڑے ایک اور لباس کے ساتھ رکھی لمبے اسٹرپس کی سینڈل لی۔ ساڑھی نے اس کے پاؤں کو چھپا لینا تھا پھر وہ ان جوتوں کو کیوں خرید رہی تھی سلطان کی سمجھ سے باہر تھا۔

پینتیس ہزار کی ساڑھی اور پانچ ہزار کے جوتے کی ادائیگی پری زاد نے اس کریڈٹ کارڈ سے کی تھی، جس کے بل چیمبر آف کامرس کے صدر کو بھیجے جاتے تھے۔

اور اب وہ اسی ساڑھی میں ملبوس وہی جوتے پہنے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ڈی بیرز کے وہ ڈائمنڈ اسٹڈز اور نیکلس پہن رہی تھی۔ جو اسے پچھلے ہفتے رحیم یار خان میں متحدہ عرب امارات کے شاہی خاندان کے ایک فرد نے اپنے محل میں تین روزہ قیام کے بعد روانہ ہوتے وقت دیے تھے۔

اپنے Streaked بالوں کو سر کی پشت پر ایک بہت سادہ لیکن بہت خوبصورت تراشیدہ انداز کے جوڑے میں لپیٹے پانچ فٹ سات انچ کی وہ قیامت کسی اور کے لیے قیامت اٹھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

سلطان نے اس کے "میں کیسی لگ رہی ہوں؟" کا جواب نہیں دیا تھا۔ پری زاد نے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ اسی طرح پلٹ کر پھر آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے نیکلس پہننے لگی تھی۔ وہ واضح طور پر سلطان کی درخواست کا مذاق اڑا رہی تھی۔

نیکلس کو گردن کی پشت کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر نیکلس کے دونوں حصوں کو ہاتھوں سے پکڑے دائیں ہاتھ کی انگلی کو دو تین بار گردن کی پشت پر ہلکے سے مارا۔ یہ سلطان کے لیے مدد کا اشارہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پری زاد کے ہاتھوں سے نیکلس پکڑتے ہوئے اسے اس کی راج ہنس جیسی گردن کی پشت پر بند کر دیا۔ اس کے اتنے قریب کھڑے سلطان نے اس کے جسم سے اٹھتی ایسٹے لاڈر کی مہک کو محسوس کیا۔ چھ انچ اونچی ہیل پہنے وہ اس وقت اس سے آدھ فٹ اونچی تھی۔ سلطان کو اسے گردن اوپر کر کے دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ بیک لیس اور سلیولیس بلاؤز میں سے نظر آتے اس کے بے داغ دودھیا جسم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کو اگر چھونے کو دل چاہتا تھا تو یہ باعث حیرت نہیں تھا۔ فلم انڈسٹری میں نو سال سے راج کرنے اور دن رات کام کرنے کے باوجود پری زاد آج بھی ہوش ربا تھی۔ وہ اس حسن کے ساتھ انڈسٹری میں اگلے دس

سال بھی اسی طرح راج کر سکتی تھی۔ اسے دور دور تک خطرہ نہیں تھا۔ وہ خطرے کو خطرہ بننے سے پہلے ہی ختم کر دیا کرتی تھی۔

سلطان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں دبا لیا، وہ اس کے آٹھ سال کی محنت کو مٹی میں ملانے جا رہی تھی۔

''میں یہ سب نہیں ہونے دوں گا۔'' سلطان نے بے ساختہ اس کے عقب میں کھڑے ہو کر کہا۔ اپنے جسم پر ہیوگو باس کا اسپرے کرتے پری زاد کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا پھر ڈریسنگ ٹیبل پر بوتل رکھتے ہوئے وہ پلٹ کر سلطان کے مقابل آ گئی۔

''تم نہیں کرو گے تو کوئی اور کرے گا۔ پری زاد کو جو کروانا ہے وہ کروا لے گی۔''

اس کا لہجہ سرد اور چیلنج دینے والا تھا۔ سلطان کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے وہ اس کے سامنے سے ہٹ کر بیڈ کی طرف آئی اور وہاں پڑا چھوٹا سا پرس اٹھا لیا۔ سلطان کی طرف دیکھے بغیر وہ بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف جانے لگی۔ سلطان لپک کر اس کے سامنے آیا۔ اس نے پری زاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔ ایک آخری کوشش۔

''مت کریں پری جی ایسا مت کریں، میں آپ کو تباہ ہونے نہیں دوں گا۔'' اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔

''تمہیں لگتا ہے میں تباہ ہونے جا رہی ہوں؟ غلط فہمی ہے تمہاری۔ اس وقت آٹھ بج رہے ہیں۔ میں رات کے دو بجے اسی بیڈ روم میں یہیں تمہارے ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں گی۔ اگر تم، ایسا کرو گے جیسا میں کہہ رہی ہوں تو اور اگر تم یہ نہیں کرو گے تو جب میں رات کو دو بجے یہاں آؤں تو مجھے تمہاری شکل نظر نہیں آنا چاہیے۔ نہ آج نہ دوبارہ کبھی۔''

وہ بے حد پرسکون انداز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ پری زاد نے اسے دھکا یا پھر بڑے پیار سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے سلطان کا گال تھپتھپایا، وہ دنیا میں کسی مرد کسی عورت پر اعتماد نہیں کرتی تھی۔ صرف سلطان پر کرتی تھی کیونکہ اس کا تعلق ان دونوں اصناف سے نہیں تھا۔

دروازہ کھول کر قیامت کمرے سے چلی گئی اس نے مڑ کر ایک بار بھی سلطان سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ وہ جانتی تھی وہ کیا کرے گا۔ سلطان بھیگی ہوئی آنکھوں اور گالوں کے ساتھ بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ چند منٹوں بعد اس نے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہو کر جانے کی آواز سنی۔ وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ بیڈ کے پاس آیا۔ سائیڈ ٹیبل سے موبائل فون اٹھا کر وہ اس نمبر پر کال کرنے لگا۔ آج کی رات پاکستان فلم انڈسٹری پر بہت بھاری پڑنے والی تھی۔

☆☆☆

شیراز اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا لوگ اسے پری زاد کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اور کیا کہتے؟ وہ بلاشبہ کسی مرد کے ہوش اڑا سکتی تھی۔ اور وہ بھی مرد تھا۔ وہ کتنے سالوں بعد یوں ایک دوسرے کے بالمقابل آئے تھے۔ اس طرح آمنے سامنے کھڑے تھے۔

شیراز کو کیا کہنا تھا وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ وہ کسی بھی مرد کو کچھ کہنے کے قابل کہاں چھوڑتی تھی اور یہ تو پھر شیراز تھا۔

''چلیں؟'' زینی نے اس کے سکتے کو توڑا۔ یہ وہ آدمی تھا کہ اسے لگتا تھا کبھی اکیلے میں اس کے سامنے آ گیا تو وہ مر جائے گی۔ کھڑی

بھی کیسے رہ پائے گی اس کے سامنے... پر وہ کھڑی تھی اور بڑے آرام سے کھڑی تھی۔ ...صرف دل تھا جسے سنبھالنے میں کچھ وقت ہو رہی تھی اسے حیرت ہو رہی تھی۔ یہ دل کو کیا ہو گیا تھا۔ اتنے سالوں بعد۔ اتنا سب کچھ سہنے کے بعد بھی بچوں کی طرح کیوں ہمکنے لگا تھا؟ کیوں مچل رہا تھا۔

''اوہ ہاں تم نے بڑی دیر کر دی۔'' شیراز نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے گھڑی کو دیکھا وہ تقریباً دس منٹ کے بعد آئی تھی۔

''ہاں... اب تم سے ملنے کی جلدی نہیں رہی۔''

''میں تو بہت جلد آ گیا تھا۔ وقت سے بھی پہلے۔'' شیراز نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''زندگی میں پہلی بار مجھ سے ملنے کے لیے وقت سے پہلے آئے ہو۔ ورنہ یہ کام ہمیشہ میں کرتی تھی۔''

''یہ میں پھول لایا ہوں تمہارے لیے۔'' شیراز نے ایک بار پھر اس کا معنی خیز جملہ نظر انداز کیا اور ٹیبل پر پڑا بکے اٹھا کر اس کے آگے کیا۔

''پھولوں سے بہلنا چھوڑ دیا ہے میں نے۔'' زینی نے ایک نظر ان پھولوں پر ڈال کر کہا۔

''لیکن تمہیں تو پھول بہت پسند ہوتے تھے کبھی۔'' شیراز نے جیسے اسے یاد دلایا۔

''حیرت ہے تمہیں یاد ہے۔'' زینی کے لہجے میں حیرت نہیں طنز تھا۔

''مجھے سب کچھ یاد ہے'' شیراز نے اپنے لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

''مجھے بھی۔'' زینی نے بے ساختہ کہا۔

شیراز ایک لمحے کے لیے کچھ بول نہیں سکا۔

''مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر تم یہ لے لو گی۔'' شیراز کا لہجہ اب تقریباً التجائیہ ہو گیا تھا۔

زینی نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے پھول اس کے ہاتھ سے لیے اور پھر بے حد لاپروائی سے انہیں میز پر پھینک دیا۔

شیراز کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔'' اس نے اس پر تعریف کا حربہ استعمال کیا۔

''اتنی خوبصورت ہوتی تو تمہاری بیوی ہوتی۔'' زینی نے اس کے حربے کو کند کرتے ہوئے کہا۔

''زینب میں...''

''میں پری زاد ہوں۔'' اس نے شیراز کی بات کاٹ دی۔

''میں زینب سے ملنے آیا ہوں۔''

''پری زاد سے نہیں؟'' زینی نے جیسے اس کا مذاق اڑایا تھا۔

''پری زاد سے بھی۔''

زینی نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ "یہ بھی" کیا ہوتا ہے شیراز؟ ...زندگی میں صرف "یا" ہوتا ہے... یا "یہ" یا "وہ"... "یہ بھی" اور "وہ بھی" نہیں ہوتا۔" اس کی آواز میں تلخی تھی۔

"تم بڑی مشکل باتیں کرنے لگی ہو۔" وہ بات کہہ کر ہنسا۔

"زندگی میں مشکل کام اتنے کر لیے ہیں کہ باتیں تو کچھ بھی نہیں... تم نے بتایا نہیں کہ تم کس سے ملو گے... منصب سے یا پری زاد سے؟"

شیراز کچھ دیر اسے دیکھتا الجھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"پری زاد سے۔" زینی کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آئی۔

"پری زاد سے ایک رات کی ملاقات کی قیمت جانتے ہو تم؟" وہ پتہ نہیں اسے کیا جتانا چاہ رہی تھی۔

"بہت پیسہ ہے میرے پاس میں سب کچھ افورڈ کر سکتا ہوں۔" شیراز نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک کہا تم نے... تمہارے پاس پیسہ ہے اب... تمہیں سب کچھ افورڈ کرنا چاہیے اب۔" وہ اس کی بات میں چھپے طنز کو نہیں سمجھا تھا۔ صرف مسکرا دیا۔

"چلیں" زینی نے ایک بار پھر کہا۔

گاڑی میں دونوں کے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ شیراز ایک بار پھر سے ممکنہ سوال و جواب کی تیاری کرتے ہوئے وقفے وقفے سے زینی کو دیکھ رہا تھا۔ جو بے تاثر چہرے کے ساتھ ونڈ سکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔

وہ اس کے ساتھ PC کی ڈرائیو وے پر اترا تھا اور اس کے گاڑی سے نکلتے ہی شیراز نے ہر طرف کھڑے مردوں کی نظریں پری زاد پر گڑتی دیکھیں... اسے ایک عجیب سے رشک کا احساس ہوا تھا۔ وہ ایک ہی کسی عورت کی ہمراہی چاہتا تھا جو اس کے ساتھ ہو تو دنیا کی نظریں اس کا طواف کرتی رہیں... اس کے ساتھ لابی میں داخل ہوتے ہوئے شیراز نے پہلی بار شاید لوگوں کو پری زاد کی طرف ہی نہیں اپنی طرف بھی متوجہ پایا۔

PC کی لابی کے چمکتے فلور پر پر اس خوبصورت ساڑھی میں ملبوس اٹھی ہوئی گردن اور تنے ہوئے وجود کے ساتھ وہ واقعی جیسے پری جیسی تمکنت کے ساتھ چل رہی تھی... رستے میں پڑی ہوئی "چیزوں" پر ایک نظر بھی ڈالے بغیر، ایک لمحہ کے لیے بھی کسی سے نظر ملائے بغیر... شیراز کو اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملانا مشکل ہو رہا تھا... اپنی ٹائی اور کوٹ کو بار بار ٹھیک کرتا وہ بے حد نروس ہو رہا تھا۔ کیوں ہو رہا تھا یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پری زاد کے ساتھ ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں قدم رکھتے ہی مختلف ٹیبلز پر اس نے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھا... شیراز کو اپنے اعصاب جیسے کسی نشے کی گرفت میں محسوس ہوئے تھے۔

منیجر پری زاد کو دیکھ کر خود آگے بڑھ آیا تھا وہ خود انہیں ایک ٹیبل تک لے آیا تھا ایک ویٹر ان کے لیے Table سیٹ کرنے لگا کچھ Pleasantries کے تبادلے کے بعد منیجر واپس چلا گیا تھا۔

مینو کارڈ ہاتھ میں لیتے اسے کھولے بغیر زینی نے شیراز سے کہا اور اپنا کارڈ واپس ویٹر کو دے دیا۔

''نہیں آج سب کچھ تمہاری مرضی سے ہوگا۔'' شیراز نے بھی اپنا کارڈ نہیں کھویا۔

''کھانے کے علاوہ سب کچھ میری مرضی سے ہوگا صرف کھانا تمہاری مرضی سے ہوگا۔'' زینی نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''یاد ہے، یاد ہے ایک بار میں نے تم سے کہا تھا کہ میں کبھی تمہیں یہاں پر لاؤں گا اور سب سے مہنگا کھانا کھلاؤں گا۔'' شیراز نے دبے دبے جوش کے ساتھ اسے کچھ یاد دلایا تھا۔ زینی کی آنکھوں میں کچھ آیا تھا پھر چلا گیا۔

''ٹھیک ہے سب سے مہنگی ڈش سب سے مہنگا ڈرنک۔'' زینی نے جیسے بات ختم کرتے ہوئے ویٹر سے کہا۔ ویٹر چند منٹ ان کے پاس کھڑا آرڈر کی Details نوٹ کرتا رہا پھر وہاں سے چلا گیا۔

زینی نے پانی کا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا شیراز نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

''اردگرد بیٹھے سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔''

زینی نے اردگرد نظریں دوڑائے بغیر عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کچھ دیر بعد ہر کوئی تمہیں بھی دیکھنے لگے گا۔'' وہ گھونٹ گھونٹ پانی پی رہی تھی اور شیراز کو دیکھ رہی تھی۔

''دیکھیں گے تو ضرور آخر میں پری زاد کے ساتھ بیٹھا ہوں مجھے لگ رہا ہے زینی میں جنت میں آ گیا ہوں۔'' شیراز اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش میں بے حال ہو رہا تھا۔

''جنت میں ہی ہیں بس نکالے جانے والے ہیں۔'' زینی نے ترچھی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ میں پکڑے گلاس سے ایک گھونٹ اور لیا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی خوبصورت باتیں کر سکتی ہو۔'' شیراز ہنسا۔

''میں اور کیا کیا کر سکتی ہوں... اندازہ تو تمہیں اس کا بھی نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو... مجھے واقعی اندازہ نہیں تھا کہ تم فلموں میں چلی جاؤ گی... اتنی بڑی سٹار بن جاؤ گی۔'' شیراز نے رشک آمیز لہجے میں کہا۔

''اندازہ تو مجھے بھی نہیں تھا کہ تم اتنے بڑے خاندان کے داماد بن جاؤ گے۔''

شیراز چند لمحوں کے لیے بول نہیں سکا۔

''یہ شادی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی'' زینی'' وہ اب سنجیدہ تھا۔

''اچھا؟ تو پھر طلاق دے دو شینا کو ابھی اور اسی وقت۔'' زینی نے جیسے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا۔

شیراز نے ایک نظر آس پاس بیٹھے لوگوں کو دیکھا یوں جیسے یہ اندازہ کرنا چاہ رہا ہو کہ ان میں سے کتنے ہونے والی گفتگو کے موضوع کا اندازہ لگا سکتے تھے۔

''کاش میں یہ کرسکتا... لیکن میرے لیے اسے چھوڑنا بہت مشکل ہے۔'' اس نے قدرے بے چارگی سے کہا۔

''حیرت ہے شیراز تمہارے لیے کسی کو چھوڑنا مشکل کیسے ہوگیا؟'' زینی نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

''میں... میں تم سے بہت شرمندہ ہوں زینی''

''تمہیں ہونا بھی چاہیے۔'' زینی نے اطمینان سے ایک گھونٹ اور بھرا۔

''تم سمجھ رہی ہو شاید میں جھوٹ بول رہا ہوں۔''

''نہیں میں جانتی ہوں تم نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔''

شیراز جانتا تھا یہ تعریف نہیں تھی۔

''چھوڑو ماضی کو بھول جاتے ہیں زینی۔''

''میں اپنے ماضی کو بھول جاتی ہوں... تم اپنے مستقبل کو بھول جاؤ... صرف حال میں جیتے ہیں... صرف آج میں... کھانا آگیا۔''

اس کا اطمینان شیراز کو الجھا رہا تھا... وہ طوفان سے پہلے کے آثار تھے جن پر شیراز غور نہیں کر رہا تھا۔

شیراز نے کھانا کھا یا تھا... زینی نے کھانا ''چکھا'' تھا وہ اس کے کھانے سے فارغ ہونے کے انتظار میں بیٹھی مشروب کے سپ لیتی رہی... شیراز مسلسل باتیں کر رہا تھا... اور زینی صرف چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی وہ کیا کہہ رہا تھا وہ سن نہیں رہی تھی صرف اسے بولتے ہوئے دیکھ رہی تھی... ایک وہ وقت تھا جب وہ اس کے ایک ایک لفظ کو جیسے حدیث سمجھ کر سنتی تھی... ایک یہ وقت تھا جب اس کی زبان سے نکلنے والے لفظوں پر اعتبار تو ایک طرف وہ سننے کی کوشش تک کی زحمت نہیں کر رہی تھی۔ وقت وقت کی بات تھی۔

کھانے کا بل شیراز نے دیا... اور جیسے بے حد فخریہ انداز میں دیا تھا۔ یوں جیسے وہ یہ بتانا چاہ رہا ہو کہ اس کا اسٹیٹس تبدیل ہو چکا تھا اب ایسی جگہوں پر کھانوں کے بل ادا کرنا اس کے لیے معمولی بات تھی... وہ صرف یہ نہیں جانتا تھا کہ زینی جن مردوں کے ساتھ وہاں آتی تھی ان میں سے ہر ایک کے لیے ایسی جگہوں پر آکر بل دینا معمول کی بات تھی اور ان میں سے شاید کسی نے بل کے بارے میں اس طرح سوچا بھی نہیں ہو جس طرح شیراز سوچ کر مغرور ہو رہا تھا... لاکھ بھیس بدلے لاکھ ملمع چڑھائے آدمی وہی رہتا ہے جو وہ ہوتا ہے... جیسی غربت ان دونوں نے ساتھ دیکھی تھی ساتھ بھگتی تھی کیسے ممکن تھا کہ وہ اب ایک دوسرے کا ذہن کھلی کتاب کی طرح نہ پڑھ لیتے... کیسے ممکن تھا۔ زینی نہ جان جاتی کہ وہ کس وقت کس چیز کے بارے میں کیا سوچ رہا تھا... کیسے ممکن تھا کہ شیراز یہ نہ جان جاتا کہ وہ اس کا ذہن پڑھ رہی تھی۔

گیسٹ ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے ایک سگنل پر شیراز نے اسے دو گجرے لے کر دیے۔ زینی نے ڈنڈے پر لٹکے موتیوں کے تمام ہاروں کی فرمائش کی۔ شیراز خوشی سے جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ زینی نے بالآخر اس سے کوئی فرمائش کی تھی... معمولی مگر بالآخر وہ اس سے کچھ مانگ رہی تھی۔

''اتنے ہاروں کا کرو گی کیا؟'' ہار پچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے شیراز کو خیال آیا تھا۔

''کسی کی قبر پر چڑھاؤں گی۔'' زینی کے لہجے میں بڑا اطمینان تھا۔

"میری قبر تو نہیں ہے؟" شیراز نے ہنستے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

زینی نے بے حد سنجیدگی سے اس کے چہرے کو دیکھ پھر مسکرائی۔

"تمہاری ہی ہے۔"

شیراز نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"پہلے تو کبھی میری موت کی بات نہیں کرتی تھی اب کتنے آرام سے کر رہی ہو۔"

"قبر صرف مرنے والے کی تھوڑی ہوتی ہے۔"

"اچھا... پھر؟"

"زندہ درگور ہونے والے کی بھی ہوتی ہے۔"

"کس کی؟"

"جیسے میری۔"

شیراز کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ بے حد سادگی سے کہی جانے والی بات سادہ نہیں تھی۔ بہت کچھ تھا اس ایک جملے میں۔ وہ باقی کا پورا راستہ بول نہیں سکا تھا۔ گاڑی میں عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔۔۔۔ اور اس خاموشی نے شیراز کے ذہن سے یہ سوال بھی محو کر دیا تھا کہ وہ اس کی کسی قبر کی بات کر رہی تھی۔ کیا وہ اسے زندہ درگور کرنے کا ارادہ رکھتی تھی؟ پر یہ کام زینی کیسے کر سکتی تھی؟ اور کس طرح کرتی؟۔۔۔ اس کے پاس اس کی کوئی کمزوری نہیں تھی۔

شیراز بے حد مطمئن تھا اور اسی اطمینان کے ساتھ وہ پھولوں کے ہار لے کر زینی کے ساتھ اس بیڈروم میں آیا تھا۔ جو اس نے اس گیسٹ ہاؤس میں بک کروایا تھا۔

"شراب پیتے ہو؟" زینی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"میں... "شیراز اٹکا۔ وہ اس وقت اس طرح کا سوال کیوں کر رہی تھی؟

"نہیں۔" اس نے انکار کرنا مناسب سمجھا۔

"میں پیتی ہوں۔ میرے لیے منگوالو۔" زینی نے منی بار پر لگی ہوئی ریٹ لسٹ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں بھی پیتا ہوں۔ کبھی کبھار۔" شیراز نے کچھ ہکلاتے ہوئے قدرے نادم لہجے میں اعتراف کیا۔ اسے کیا پتہ تھا وہ خود شراب پیتی ہو گی۔ وہ دونوں واقعی بہت بدل گئے تھے۔۔۔ کبھی زندگی میں انہوں نے اپنی کسی ملاقات کے دوران مشروب کے طور پر شراب کے انتخاب کا سوچا تک نہیں ہوگا اور آج۔ یہ خیال دونوں کے ذہن میں بیک وقت آیا تھا۔ شیراز روم سروس کو آرڈر کرنے لگا۔ زینی صوفے پر بیٹھ کر اپنے سینڈلز اتارنے لگی۔ اس نے جوتے اتارنے کے بعد اپنے پیروں کو کچھ آرام دینے کے لیے انہیں سامنے پڑی ہوئی ٹیبل پر رکھ لیا۔ اگلے چند دن اس کے

کیریئر کے سب سے زیادہ tumultous دن ثابت ہونے والے تھے۔ وہ صبح کے اخبارات کی ہیڈ لائنز اور چینلز کی سکرول بار دیکھ رہی تھی۔

"یہ تمہارے لیے۔" شیراز نے اسے چونکایا تھا۔ وہ اپنا کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر لٹکانے کے بعد اب ایک ڈبیا اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"یہ کیا ہے۔" زینی نے ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے بے حد فخریہ انداز میں کہا۔

"ڈائمنڈ رنگ۔" وہ اس کے اتنا قریب تھا کہ زینی نے اس کے پرفیوم کی مہک کو محسوس کیا۔ وہ ہیوگو باس نہیں تھا۔ کوئی اور تھا۔ اس نے شاید ماضی کی ہر چیز چھوڑ دی تھی۔

"پرپوز کر رہے ہو؟" زینی نے کھلی ڈبیا سے نظر آتی رنگ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کچھ کاٹتے ہوئے انداز میں اس سے کہا۔

"تحفہ ہے۔" شیراز کا اکڑا ہوا وجود یک دم کچھ ڈھیلا ہو گیا۔

"سوری ضرورت ہے نہ جگہ۔" زینی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"ڈائمنڈ رنگ ہے۔" شیراز نے جتانے والے انداز میں کہا۔

"میرے ہاتھ کی ہر رنگ میں ڈائمنڈ ہی ہیں۔ یہ رنگ مجھے ایک فیڈرل سیکرٹری نے دی۔ یہ ایک فیڈرل منسٹر نے۔" وہ بے حد اطمینان سے شیراز کے سامنے ہاتھ پھیلائے یک ایک رنگ پر انگلی رکھے یوں بات کر رہی تھی جیسے شیراز نے ان انگوٹھیوں کے بارے میں پوچھا ہو۔

"یہ ایک عربی شیخ نے اور یہ چیمبر آف کامرس کے صدر نے... اب مجھے نہیں آتی 18 گریڈ کے ایک معمولی آفیسر کے لیے کون سی رنگ اتار کر جگہ بناؤں۔" اس کے لہجے میں بے حد معصوم الجھن تھی شیراز کا رنگ سرخ ہونے لگا تھا۔

"پلیز... " اس نے وہی کام کیا جو وہ کرنے میں مہارت رکھتا تھا... منت کرنے کا۔

زینی نے اس کے ہاتھ سے ڈبیا لے لی اور اسے بند کیا... صوفے سے اٹھی۔ کرسی پر لٹکے اس کے کوٹ کے پاس گئی اور وہ ڈبیا اس کی جیب میں ڈال دی۔

"زیورات سے بہلنے کا وقت گزر گیا ہے شیراز...!" وہ اب ایک ہار نکال کر کمرے میں پھرنے لگی تھی وہ پھولوں کی پتیوں کو چلتے ہوئے نوچ رہی تھی شیراز صوفہ پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

آخر کس طرح بہل سکتی تھی وہ۔ کس طرح بھول جاتی وہ سب کچھ جو ماضی تھا۔ وہ بور ہونے لگا تھا آخر ایسا بھی کیا کر دیا تھا اس نے کہ وہ طنز پر طنز کر رہی تھی۔

"میں... میں کچھ اور بھی لایا ہوں۔ تمہارے لیے۔" شیراز نے یک دم کہا۔

"اب کیا ہے؟" زینی کے انداز میں کوئی ایک کشش نہیں تھی۔ تبھی کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ان کا "آرڈر" آ گیا تھا۔ روم سروس والے کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ ہار کے خالی دھاگے کو ایک طرف پھینکتے ہوئے دوبارہ صوفہ پر آ کر بیٹھ گئی اور شراب کے

پیگ تیار کرنے لگی۔ شیراز ایک بار پھر اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ نکالنے میں مصروف تھا جب تک وہ نکال کر لایا... زینی پیگ تیار کر چکی تھی۔

"تمہیں چوڑیاں اچھی لگتی ہیں نا؟" ایک لمحے کے لیے زینی کا ہاتھ لرزا

"یاد ہے ایک بار تم نے اپنی سونے کی دو چوڑیاں مجھے دی تھیں اور میں نے تمہیں کہا تھا۔ کہ میں تمہیں ان کے بدلے چھ چوڑیاں بنا کروں گا۔" وہ محبت سے کہہ رہا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلائے ہوئے تھا۔ جس پر چھ چوڑیاں رکھی تھیں۔

"وہ چھ چوڑیاں تمہیں مجھ سے شادی کے بعد اپنی پہلی تنخواہ سے میرے لیے بنائی تھیں" وہ ان چوڑیوں کو دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں بڑبڑائی۔

"لیکن ان کی ضرورت نہیں تھی تم نے بعد میں قیمت بھیج دی ان کی۔"

"اور وہ تم نے نہیں لی"

"وہ بہت کم تھی۔" وہ اب اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"یہ تو کم نہیں ہے نا؟" شیراز نے ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔

زینی نے چوڑیں اٹھا کر میز پر رکھیں اور اس کے ہاتھ میں پیگ تھما دیا۔

"یہ تو اور بھی کم ہے۔"

"تمہیں اور چوڑیں چاہیں میں تمہیں اور چوڑیاں لا دوں گا۔" شیراز نے بے ساختہ کہا۔

"پھر کیا ہوگا؟" وہ اب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی۔

"پھر... آ... پھر..." وہ ہکلانے لگا۔

اسے آگے کچھ کہنے کے لیے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ زینی نے بڑے آرام سے اس کی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور اس کی شرٹ کا اوپر کا بٹن کھول دیا۔ کوئی عجیب احساس ہوا تھا اسے کالر ہاتھ میں لیے وہ رک گئی... وہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی شرٹ تھی کئی سال پہلے اس کے ہاتھ سے بنی ہوئی شیراز نے اس کی محویت کو نوٹس کیا۔

"تم نے پہچانا اس شرٹ کو؟ تم نے میرے لیے اسے اپنے ہاتھوں سے سیا تھا۔" شیراز نے فخریہ انداز میں کہا۔

زینی نے اس کے کالر سے ہاتھ ہٹا لیا۔

"کیوں پہن کر آئے ہو اسے؟" وہ پہلی بار تلخ ہوئی تھی۔

"تمہارا دل جیتنے کے لیے۔"

"دل کچھ معنی رکھتا ہے تمہارے لیے؟"

"دل ہی تو معنی رکھتا ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اس نے ایک اور ہار لیا تھا اور اسے نوچتے ہوئے بکھیرنے لگی۔

''منگنی توڑنے کے بعد میرے ہاتھ کی کل ایک ایک چیز لوٹادی تم نے — پھر یہ تمہارے پاس کیسے رہ گئی؟''

''یہ تمہاری نشانی تھی۔''

''تم نے مجھے گنوادیا۔ میری نشانی کو پاس رکھ لیا۔'' وہ تلخی سے ہنسی۔

''تمہیں گنوادیا۔ غلطی کی۔''

''میری نشانی پاس رکھ کر اس سے بڑی غلطی کی۔''

شیراز خاموشی سے شراب کا پیگ پیتا رہا پھر اس نے کہا۔

''اس میں مجھے تمہارے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوتا ہے۔''

''لیکن میرے ہاتھوں کے لمس میں روپے جیسی حرارت نہیں تھی۔''

وہ چپ چاپ سر جھکائے شراب پیتا رہا۔ وہ ایک کے بعد ایک ہر نوچ نوچ کر پھینکتی رہی۔ کمرے کا سارا کارپٹ پھولوں کی پتیوں سے بھر گیا تھا۔ شیراز نے ایک کے بعد دوسرا پیگ بھی اپنے اندر انڈیلا۔

''میں کیا کروں کہ تمہاری ناراضگی دور ہو جائے۔'' شیراز نے اس کے دوبارہ صوفے پر آ کر بیٹھتے ہی کہا۔ اس سے پہلے زینی کچھ کہتی شیراز کا سیل بجنے لگا۔ اس نے تیزی سے اپنی ٹراوزر کی جیب سے سیل نکال کر اس پر نظر ڈالی وہ شینا کی کال تھی۔ یہاں کال ریسیو کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شیراز نے سیل آف کر کے فون ٹیبل پر رکھ دیا لیکن وہ کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ آج تک شینا نے کبھی اس وقت اسے کال نہیں کی تھی چاہے وہ جہاں مرضی ہوتا .... پھر آج؟

''تمہاری بیوی کا فون ہوگا؟'' زینی نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب اپنا گلاس پی رہی تھی۔

''بہت خوبصورت ہے تمہاری بیوی۔ لگتا ہے بہت محبت کرتی ہے تم سے۔ اس لیے فون کر رہی ہے تاکہ جان سکے کہ تم رات کے اس وقت کہاں بیٹھے ہو۔'' زینی نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''پیار؟... شک کرتی ہے وہ مجھ پر۔'' شیراز نے بے ساختہ کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہی کرتی ہے۔ ...اب ہو تو تم اس وقت بھی غلط جگہ پر ہی۔'' زینی کا اطمینان برقرار تھا۔

''تم اسے نہیں جانتی وہ خود بہت سارے مردوں کے ساتھ انوالوڈ ہے۔'' شیراز نے تیز آواز میں کہا۔

''چچ چچ ...'' زینی نے افسوس کا اظہار کیا۔

''اور تمہارے جیسے غیرت مند مرد کے لیے تو یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے اس کی جگہ میں ہوتی تو اب تک تم میرا گلا دبا چکے ہوتے۔ مگر وہ ہے حرام کھانے والے ایک بڑے باپ کی بیٹی۔ اور میں تھی ایک ایماندار کلرک کی بیٹی جو بدقسمتی سے تمہاری کزن بھی تھی۔''

شیراز نے یکدم اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''زیبی میں آج بھی صرف تمہی سے محبت کرتا ہوں۔''

''تم نے پیسے کے علاوہ زندگی میں کبھی کسی سے سچی محبت نہیں کی۔'' زیبی نے اس سے ہاتھ چھڑالیا۔ اس کے ہاتھ کا لمس اسے انگارے جیسا لگا تھا۔

''میں بہت مجبور تھا۔''

''کیا مجبوری تھی جس نے تمہیں میرے باپ سے یہ کہنے پر مجبور کردیا کہ آپ کی بیٹی جہیز کے نام پر کچھ نہیں لائے گی کم از کم عزت تو لائے۔''

شیراز چند لمحوں کے لیے ہکا بکا رہ گیا اسے توقع نہیں تھی کہ ضیاء چچا یہ سب کچھ زیبی کو بتائیں گے۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں نے کبھی ایسا کچھ نہیں کہا۔'' اس نے یک دم خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''تم کہنا چاہتے ہو کہ میرے تہجد گزار باپ نے مجھ سے جھوٹ بولا جنہوں نے ساری عمر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔'' وہ غرائی تھی۔

''نہیں نہیں میں چچا کو جھوٹا نہیں کہہ رہا۔'' شیراز گڑبڑا گیا تھا۔ اعتراف اور انکار دونوں ہی مصیبت بن گئے تھے اس کے لیے۔

''شاید تب غصے میں ایسے ہی میرے منہ سے کچھ الٹا سیدھا نکل گیا ہو۔'' اس نے نظریں چرا کر اپنے اعتراف سے زیبی کے دل کا خون کیا تھا۔ باپ کی زبان پر تو اسے پہلے بھی یقین تھا پھر بھی اس کی زبان سے یہ اعتراف سن کر بہت سال پہلے جیسی ہی تکلیف ہوئی تھی۔

''ایک بات بتاؤ شیراز کیا تمہیں واقعی میرے کردار پر شبہ تھا؟'' زیبی نے اپنا پیگ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں.... میں ...'' شیراز میں میں کرنے لگا۔

''سچ بولنا۔ سچ پر کچھ نہیں کہوں گی تمہیں۔'' زیبی نے اسے ٹوکا۔

وہ بہت دیر خاموش رہا۔ زیبی کا دل دھڑکتا رہا۔ شیراز ہاتھ میں پکڑے گلاس پر انگلیاں پھیرتا رہا پھر بہت دیر بعد زیبی نے اس کی مدھم آواز سنی۔

''نہیں۔''

وہ کسی نے زیبی کو کسی پہاڑ کی چوٹی سے دھکیلا تھا۔

''نہیں؟ پھر تم نے میرے چہرے پر اتنی کالک کیوں ملی؟ میں تو سمجھتی رہی کہ اس لڑکے کو دیکھ کر تم میں تو اتنا عرصہ'' زیبی اپنی بات مکمل نہیں کر پا رہی تھی۔

''اس وقت رشتہ توڑنے کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آ رہا تھا مجھے'' شیراز نے مدھم آواز میں کہا۔

''اور تم نے میرے کردار پر کیچڑ اچھال کر وہ راستہ ڈھونڈا۔ ایک بار میرے سامنے آجاتے تم مجھے کہہ دیتے زیبی میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں دوبارہ کبھی تمہارے پیچھے نہ آتی اتنی خودداری تھی مجھ میں۔'' وہ نہیں جانتی وہ کیوں رونے لگی تھی وہ رونے کے لیے وہاں

نہیں آئی تھی۔

"سونے کی وہ چوڑیاں بنانے کے لیے میں نے چار سال ٹیوشنز کر کے ایک ایک روپیہ جمع کیا تھا اور تمہارے ایک بار کہنے پر میں وہ تمہیں دے آئی کیونکہ تمہارا مستقبل اہم تھا میرے لیے تمہاری خواہش یہ معنی رکھتی تھی میرے لیے اور تم نے تم نے خالہ کے ذریعے اپنے سسرال کی حرام کی کمائی کے چند ہزار بھیج کر سمجھا کہ تم نے ان چوڑیوں کی قیمت ادا کر دی بس وہ چند ہزار قیمت تھی ان کی وہ دو چوڑیاں میری زندگی کے چار سال تھے پتہ نہیں کس کس چیز سے جی مار کر ان کے لیے پیسہ جوڑتی رہی میں وہ تمہارے ساتھ میری ہونے والی شادی کا زیور تھا۔ اور تم کہتے ہو بس چند ہزار روپے کافی تھے ان کی قیمت دینے کے لیے؟"

"تم جو قیمت چاہو میں ادا کروں گا ان کے لیے زینی جو قیمت تم چاہو میں دوں گا۔" شیراز نے بے حد بے بسی کے عالم میں کہا۔ وہ اس وقت واقعی جذباتی ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ زینی کچھ کہتی دروازے پر بلند آواز میں دستک ہوئی تھی۔

"قیمت لینے کے لیے ہی بلایا ہے تمہیں یہاں جاؤ دروازہ کھولو۔" زینی کا لہجہ پہلی بار شیراز کو عجیب لگا تھا۔

وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ زینی بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ دروازے کے باہر اب مسلسل دستک ہو رہی تھی۔ شیراز زینی سے کچھ کہتا کہتا پلٹ کر دروازہ کھولنے چلا گیا۔

"ایک بار ایک دروازہ مجھ پر بند ہوا تھا۔ میری قسمت بدل گئی۔ آج ایک دروازہ تم کھولو گے تمہاری قسمت بدل جائے گی۔"

اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے اپنے عقب میں زینی کی آواز سنی۔ شیراز نے پلٹ کر اسے دیکھا وہ صوفے پر بیٹھی پیگ ہاتھ میں لیے پاؤں ٹیبل پر رکھے بیٹھی تھی۔ یوں جیسے کوئی پری اپنے دربار میں بیٹھی تھی کچھ برا ہونے والا تھا یہ شیراز کی چھٹی حس نے اسے اس وقت بتا دیا تھا کیونکہ دروازہ اب بری طرح دھڑ دھڑایا جا رہا تھا اور اس نے دروازے کے باہر شور سنا تھا... کچھ بے ہنگم آوازیں تھیں جو اسے سنائی دے رہی تھیں۔ ...وہ ایک سرکاری آفیسر تھا ... دروازے کے باہر جو بھی ہو گا اسے دیکھ لوں گا۔ شیراز نے جی کڑا کر کے سوچا ...زینی سے فی الحال بات کا فائدہ نہیں تھا پہلے باہر والی مصیبت کو دیکھنا تھا۔

اس نے دروازہ کھول دیا اور اس کی قسمت نے دروازہ بند کر لیا۔ ایک ہجوم کمرے کے اندر آ گیا تھا۔ پریس فوٹو گرافرز، رپورٹرز، کیمرہ مین ...اور پولیس کے لوگ۔ کمرہ فلیش لائٹس کے جھماکوں سے چکا چوند ہو رہا تھا۔ شیراز کو بات کرنے کا موقع نہیں ملا وہ حواس باختہ ہو چکا تھا۔ چند لمحوں میں کسی نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں اور اب کچھ لوگ زینی کو اریسٹ کر رہے تھے۔ شیراز کو غش آنے لگا وہ اتنے لوگوں کو bribe کیسے کر سکتا تھا؟ رشوت دے کر اس خبر اور ٹی وی چینلز اور نیوز پیپرز میں اپنی تصویر کی اشاعت کیسے رکوا سکتا تھا؟ اسے لگا تھا کسی نے اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا تھا کس نے؟ کس نے؟ اس نے زینی کو ایک بار پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی وہ نہیں دیکھ سکا۔ ان دونوں کے بیچ لوگ تھے۔ دنیا تھی۔ ان دونوں کے بیچ ہمیشہ دنیا آ جاتی تھی۔

کوئی اسے دھکے دیتے ہوئے باہر نکال رہا تھا۔ اور باہر نکلتے ہی گیسٹ ہاؤس کی انٹرنس پر اس نے شینا اور سعید نواز کو دیکھ لیا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا وہ کینچوا بن کر ان سے لپٹ جائے ...معافی ایک بار معافی ...صرف ایک بار ...وہ بلند آواز میں پکار پکار کر کہنا چاہتا تھا لیکن نہیں کہہ سکا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں اس وقت جیسے انگارے دہک رہے تھے ...شیراز جانتا تھا اسے اب سعید نواز کے خاندان سے نکالا جا چکا تھا ...ورنہ وہ ہتھکڑی اس کے ہاتھوں میں اور وہ ذلت اس کے چہرے پر کبھی نہ ہوتی ...وہ واقعی قیامت کا دن تھا۔ کون کہتا ہے قیامت صرف قیامت والے دن آتی ہے۔

☆☆☆

وہ رات کے دو بجے اپنے بیڈ روم میں صوفے پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اس کے گھر کے تمام فون آف تھے۔ اس کے قدموں میں بیٹھا سلطان آنسو بہا رہا تھا۔ یہ وہی تھا جس نے زینی کے کہنے پر یہ سب کچھ کروایا تھا ...شینا کو اطلاع ...پریس کو اطلاع ...پولیس کو اطلاع ...اور سلطان نہ ہوتا تو ایک ایسے بڑے گیسٹ ہاؤس پر پولیس کا ریڈ کیسے ہو سکتا تھا ...جرنلسٹس اندر کیسے پہنچ سکتے تھے ...؟ ...وہاں ہر دوسرے کمرے میں کسی نہ کسی کا شوہر کسی نہ کسی کے ساتھ موجود تھا ...پھر پری زاد اور شیراز کا ساتھ ہونا ...لیکن یہ شینا تھی جس نے سلطان کا کام بے حد آسان کر دیا تھا اور یہ چیز زینی اچھی طرح جانتی تھی ...شینا نے سلطان کی انفارمیشن پر کوئی ایکشن لینے سے پہلے شیراز کو ٹریس آؤٹ کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ نہیں کر سکی تھی۔

شیراز نے اپنے لیے گڑھا خود کھودا تھا ...وہ خود Clues چھوڑتا گیا تھا ...اس کی گاڑی غائب تھی ...گیسٹ ہاؤس میں اس نے مسٹر اور مسز شیراز کے نام سے کمرہ بک کروایا ...نہ صرف یہ بلکہ اپنی شناختی کارڈ کی کاپی بھی وہاں دی ...باقی کا سٹیج اس بیڈ روم میں زینی نے سیٹ کر دیا تھا ...شراب، پھول اور رات کا وہ پہر ...وہ اس کمرے میں بیٹھے قوالیاں بھی سن رہے ہوتے تو ان حالات میں پکڑے جاتے ...اور وہ بہر حال قوالیاں نہیں سن رہے تھے۔

وہاں پکڑے جانے کے آدھ گھنٹہ میں پولیس سٹیشن پہنچنے سے پہلے ہی پری زاد کو اشتیاق رندھاوا کی مداخلت پر رہا کر دیا گیا تھا ...پولیس سٹیشن صرف شیراز پہنچا تھا اور بے حال پہنچا تھا ...اور زینی وہ اس وقت ایک بار پھر اطمینان سے اپنے بیڈ روم میں بیٹھی اپنے دعویٰ کے مطابق چائے پی رہی تھی۔

''اتنی عزت دی تھی اللہ نے سب مٹی میں ملا دی ...پہلے بھی سب کچھ اس کی وجہ سے گنوایا ...اب بھی سب کچھ اس کے لیے پھونک ڈالا۔ زندگی سے کچھ سیکھا نہیں آپ نے پری بی۔'' سلطان نے اس سے کہا۔

''عزت؟ ...کیسی عزت؟'' وہ بے اختیار ہنسی۔

''یہ جو گلے کے مرد تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں میرے لیے؟ ...یہ عزت ہے؟''

''صبح جب اخباروں میں تصویریں چھپیں گی تو دیکھیے گا کیا ہوتا ہے ...دوسری ساری ہیروئنیں شادیانے بجائیں گی ...'' سلطان نے

اس کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیجانے دو۔"

"بڑی خوشی ہوئی ہے آپ کو یہ سب کچھ کر کے؟ بڑا سکون مل گیا؟" سلطان نے جھنجلا کر کہا۔

زینی نے چائے کا کپ رکھ دیا۔ وہ بہت دیر چپ بیٹھی رہی۔

"ہاں۔ چند لمحے اس وقت خوشی ملی تھی جب میں نے اس ہجوم کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف دیکھا پر سکون سکون تو کبھی نہیں ملا اور خوشی اب تو خوشی بھی نہیں ہے۔" اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"سب کچھ جیسے چل رہا تھا چلنے دیتیں پری جی میں اب صبح پریس والوں کو کیا کہوں گا؟" سلطان کو ایک نئی فکر ہونے لگی۔

"میں کہہ آئی ہوں مجھے جو بھی کہنا تھا۔"

"کیا کہا آپ نے؟" وہ چونک پڑا۔

"یہی کہ شیراز مجھے پرپوز کرنے وہاں آیا تھا اور وہ میرا کزن ہے اور ہم بہت پہلے انگیجڈ تھے پھر منگنی ٹوٹ گئی لیکن اب وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوبارہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"یہ باتیں ہیں کوئی کرنے والی... اشتیاق رند صاحب سے بات کریں۔ انہوں نے کہا تھا مجھ سے۔" سلطان کو یک دم یاد آیا۔

"کر چکی ہوں ابھی گھر آتے ہوئے گاڑی میں فون آیا تھا ان کا۔"

"ناراض ہوں گے وہ تو۔ پہلے ہی ناراض تھے کہہ رہے تھے کہ میں نے چھاپہ پڑنے سے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تاکہ ایسی کوئی صورت حال پیش ہی نہ آتی۔ اب میں ان سے کیا کہتا کہ پری جی خود چھاپہ ڈلوانا چاہتی تھیں۔"

"ہاں ناراض تھا۔ شیراز کو ناپسند کرتا ہے اس لیے۔ لیکن خوش بھی تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اب وہ دیکھے گا شیراز جیل سے کیسے باہر آتا ہے۔" زینی کی ہنسی کھوکھلی تھی۔

"بڑی ضد کی پری جی آپ نے... بڑا ہی غلط... پر آپ کسی کی سنتی تھوڑی ہیں۔" سلطان کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

زینی چپ چاپ بیٹھی رہی۔

اکیلی ہوئی تھی تو شیراز کے ساتھ اکیلے میں کی جانے والی ساری باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ وہ اسے وہیں دیکھنا چاہتی تھی جہاں وہ آج رات پہنچ گیا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں وہ اتنی خوش نہیں تھی جتنا اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔ اس نے اسے اس سے بڑھ کر ذلت دی تھی جتنی ذلت اس نے زینی کو دی تھی پھر بھی اطمینان، سکون، خوشی نام کی کوئی شے وہ اس وقت اپنے اندر نہیں پا رہی تھی۔ تو کیا اس نے کہیں کچھ غلط کر دیا تھا؟

☆☆☆

اس نے کیا غلط کر دیا تھا یہ اگلے چند دنوں میں کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ دو بڑی ملٹی نیشنل کمپنیز نے اسے اپنی campaign سے الگ کر دیا تھا... وہ ایک ایسی ایکٹریس نہیں چاہتے تھے جس کے کردار کے حوالے سے کوئی ایسا سکینڈل بنتا جو میڈیا اچھالتا۔

چند آنے والی فلمز میں بھی اس کی جگہ دوسری ہیروئنز کو کاسٹ کر لیا گیا۔ اس کے تمام پچھلے سکینڈلز کو بھی میڈیا نے اچھالنا شروع کر دیا تھا اور نیوز پیپرز نے اس کے خلاف دوسرے ایکٹرز اور ایکٹریسز کے بیانات بھی شائع کرنے شروع کر دیے تھے۔ پری زاد کی ساکھ کو بہت بری طرح نقصان پہنچا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کچھ عرصے کے بعد یہ سب کچھ لوگوں کی یادداشت سے غائب ہونا شروع ہو جائے گا۔ کوئی اور سکینڈلز اس کے سکینڈل کی جگہ لے لے گا۔ زینی کو کسی قسم کی کوئی فکر نہیں تھی۔ صرف نفیسہ کی فون کالز سے اسے رنج ہوا تھا اس سکینڈل پر اس کے بہن بھائیوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا اور نفیسہ نے بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس نے اس بار پہلے کی طرح ماں کو صفائیاں اور وضاحتیں نہیں دی تھیں۔ اس نے خاموشی سے ان کی باتیں سن لی تھیں۔

میڈیا اس تک رسائی پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا اور زینی مکمل طور پر گھر میں بند ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ شوبز سے بہت عجیب سے انداز میں اس کا جی اچاٹ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور اس کے ذہن پر ان دنوں ایک ہی چیز سوار رہتی تھی۔ شیراز۔ وہ مستقل اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی اور یہ بہت عرصے کے بعد ہوا تھا کہ وہ اس طرح اسے یاد آیا ہو۔

شینا نے طلاق کے لیے کیس فائل کر دیا تھا اس کی خبر اسے اخبارات کے ذریعے مل گئی تھی۔ شیراز نہ صرف معطل تھا بلکہ اس کے خلاف کرپشن کے بہت سارے کیسز بھی رجسٹر ہوئے تھے۔ اسے ان سب چیزوں کے بارے میں بھی اخبارات میں ہی پتہ چلتا رہا تھا۔

☆☆☆

"شیراز کے ماں باپ آئے ہیں آپ سے ملنے... باہر گیٹ پر کھڑے ہیں۔ اندر لانا ہے کیا؟" اس دن سلطان نے اسے اطلاع دی۔

وہ ایک میگزین دیکھتی دیکھتی کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی۔ وہ اس کے پاس کیوں آئے تھے؟ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ وہ انہیں اندر نہ بلائے باہر سے ہی بھجوا دے...... دروازہ تک نہ کھولے۔ جیسے انہوں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا خیال آنے پر اس نے انہیں اندر بلا لیا تھا۔

ان پر ایک نظر ڈالتے ہی زینی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قدر پریشان تھے۔ وہ اس کی طرف آنا چاہتے تھے شاید اس سے گلے ملنا یا اس کے سر پر پیار دینا چاہتے تھے لیکن زینی نے ان کا یہ ارادہ پہلے سے ہی بھانپتے ہوئے ان کے اندر داخل ہوتے ہی ان سے کہا۔

"بیٹھیں"

نسیم اور اکبر کچھ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئے تھے۔

"کیا پئیں گے آپ؟"

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش رہے۔

"کچھ کام ہے آپ کو مجھ سے؟" زینی نے پہلے سوال کو دوبارہ نہیں دہرایا۔

"دیکھو زینی بیٹا۔۔۔" نسیم نے بات شروع کرنا چاہی زینی نے کاٹ دی۔

"آپ پری زاد کے گھر آئے ہیں زینی کے نہیں۔"

نسیم نے یک دم چادر کا پلو آنکھوں پر رکھتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔

"خون کے رشتے کبھی ختم نہیں ہوتے بیٹا۔" یہ اکبر تھا۔

"خون کے رشتے اسی دن ختم ہو گئے تھے جب آپ نے میرے باپ کو اس کی اوقات جتائی تھی۔" اس کے انداز میں سرد مہری تھی۔

نسیم کے آنسوؤں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

"ہم سے غلطی ہو گئی بیٹا۔" اکبر نے بے حد ندامت سے کہا۔ "تم وہ غلطی مت کرو۔"

"میں نے کوئی غلطی کب کی۔۔۔؟ آپ نے تو مجھ پر اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے تھے۔ مجھے اندر نہیں آنے دیا۔۔۔ میں نے تو آپ کو اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔" زینی نے بے حد ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"تم ہمیں اور شیراز کو معاف کر دو۔" نسیم نے روتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ معاف کیا۔" اس نے بے حد اطمینان سے کہا۔

"ہمارا گھر تباہ ہو گیا۔۔۔" نسیم ایک بار پھر رونے لگی تھی۔

"تو کیا ہوا؟۔۔۔ ہمارا گھر بھی تباہ ہو گیا تھا۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

"ہم نے جو کچھ کیا ہم اس پر بہت پچھتاتے ہیں زینی۔" اکبر نے کہا۔ اس کے چہرے پر واقعی ندامت تھی۔

"آپ کا پچھتاوا میری زندگی کو نہیں بدل سکتا اس لیے یہ میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔" زینی نے تلخی سے کہا۔ "آج آپ کا بیٹا جیل میں نہ بیٹھا ہوتا تو آپ اپنا پچھتاوا اور شرمندگی لے کر میرے پاس آتے؟ کبھی نہیں؟" زینی نے کہا۔

"ہم پر رحم کرو زینی۔" "آپ کو بھی مجھ پر اور میرے ماں باپ پر رحم کرنا چاہیے تھا۔" وہ اس وقت سفاکی کی حد تک بے حس ہو گئی تھی۔

"ہم نے بڑا ظلم کیا زینی۔۔۔ بڑا ظلم کیا۔"

"دولت اتنا اندھا کیسے کر دیتی ہے انسان کو کہ اپنے بہن بھائی ہی نظر آنا بند ہو جائیں۔"

"سب کچھ چھن گیا ہے ہم سے زینی سب کچھ۔۔۔ نزہت کو بھی اس کے شوہر نے بچے چھین کر گھر سے نکال دیا۔۔۔ ہم پر تو اللہ کی طرف سے عذاب آ گیا ہے۔۔۔ تم مدد کرو ہماری۔" نسیم نے روتے ہوئے کہا۔

"جس پیسے کے لیے آپ نے زینی کے چہرے پر کالک ملی تھی اس سے کہیں وہ آپ کی مدد کرے۔۔۔ زینی کیوں مدد کرے آپ کی۔۔۔؟ اور جہاں تک نزہت کا تعلق ہے تو کوئی بات نہیں زہرہ آپا کو بھی گھر سے نکال دیا گیا تھا۔۔۔ آپ نے چھوٹی خالہ کو مجبور کر کے ربیعہ سے عمران کی منگنی

بھی ختم کروادی تھی تو کیا ہوا؟ یہ کوئی بڑی باتیں تھوڑی ہیں۔ ۔۔زندگی میں تو اس سے بھی بڑے بڑے حادثے ہو جاتے ہیں۔'' وہ اس طرح بات کر رہی تھی جیسے یہ سب کچھ بے حد معمولی بات تھی۔

اکبر اور نسیم کے پاس جیسے سارے لفظ ختم ہو گئے تھے۔ وہ اس سے رحم اور ہمدردی کی توقع کیسے رکھ سکتے تھے کیسے یہ سمجھ سکتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ وہ نہیں کرے گی جو انہوں نے اس کے ساتھ کیا۔

''ایک بار شیراز سے مل لو زینی بس ایک بار اس کی بات سن لو ۔۔اس نے منتیں کر کے بھیجا ہے ہمیں تمہارے پاس کہ زینی سے کہیں ایک بار آ کر اس کی بات سن جائے۔'' نسیم اب بھی مسلسل رو رہی تھیں۔

''میں بھی ملنا چاہتی تھی اس سے منگنی ٹوٹنے کے بعد ایک بار وہ ملا مجھ سے؟ آپ نے ملنے دیا اس سے؟ پھر میں کیسے جاؤں اس کے پاس؟ وہ ہے کون میرا؟'' وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ لوگ دوبارہ میرے پاس نہ آئیں۔'' زینی نے انہیں کہا۔

اس کا خیال تھا وہ سب کچھ سننے کے بعد وہ دوبارہ کبھی اس کے پاس نہیں آئیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ بری طرح مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے اور اس مصیبت سے زینی کے علاوہ انہیں کوئی نہیں نکال سکتا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ بار بار اس کے پاس نہ آتے۔ شیراز کی ساری جائیداد سیل کر دی گئی تھی جو اس کے نام تھی اور اس میں وہ گھر بھی تھا جو شیراز نے اپنے ماں باپ کے لیے لیا تھا۔ اکبر اور نسیم اب دوبارہ اسی محلے میں جا کر رہنے لگے تھے جہاں وہ ہمیشہ رہتے رہے تھے اور اتنے سال آسائشوں میں رہنے کے بعد اس دو کمرے کے گھر اور اس محلے میں رہنا انہیں عذاب سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس پر شیراز جیل میں بند تھا اور نزہت کے سسرال والے جو صرف شیراز سے وقتاً فوقتاً ملنے والے روپے اور اس کے تعلقات کو ضرورت پڑنے پر استعمال کرنے کے لیے نزہت کا رشتہ جوڑ کر گھر لے گئے تھے۔ انہوں نے فوری طور پر شیراز کو بھنور میں پھنسے دیکھ کر اس کی بہن کو بھی ڈبو دیا تھا۔ ۔۔اکبر اور نسیم کی دوسری دونوں بیٹیوں کو بھی آج کل اپنے اپنے سسرال میں اسی طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ شیراز نے اپنی ساری بہنوں کی شادی اپنے سے بہت اوپر کی فیملیز میں کی تھیں اور اب وہ فیملیز اگر شیراز کے سکینڈل پر اس طرح ری ایکٹ کر رہی تھیں تو اس میں ان کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ نظریہ ضرورت کی بنیاد پر کیے گئے رشتے تھے، وہ نظریہ ضرورت ختم ہونے کے ساتھ ہی اب اگر وہ تڑخنے لگے تھے تو اس میں توڑنے والے کا قصور نہیں تھا۔

اکبر اور نسیم محلے میں سے جس جس کو زینی کو سمجھانے کے لیے زینی کے پاس لے جا سکتے تھے لے کر جا رہے تھے یہ اور بات تھی کہ اب اس کام کے لیے بھی انہیں لوگوں اور رشتہ داروں کے سامنے ہاتھ جوڑنے اور منتیں کرنی پڑ رہی تھیں۔ خاندان میں اور محلے میں ''اب'' کوئی ایسا نہیں تھا جو انہیں ان کی زیادتیاں یاد نہ دلا رہا ہو شیراز کے ہاتھ سے ''پاور'' جاتے ہی لوگوں کو حق بات کہنا یاد آ گیا تھا۔ اور بہت سے لوگ تو انہیں دیکھ کر کانوں کو ہاتھ بھی لگاتے تھے۔ اگر غرور کا سر نیچا ہوتا ہے تو وہ اپنی آنکھوں سے اس کی زندہ مثال دیکھ رہے تھے۔

اکبر اور نسیم خاندان یا محلے کے جس بھی شخص کو زینی کے پاس اسے سمجھانے کے لیے لے کر گئے وہ زینی کے اس چار کنال کے گھر میں داخل

ہوتے ہی گونگا ہو جاتا تھا اور ڈرائنگ روم میں زینی کے سامنے بیٹھا وہ بمشکل ہی زینی کی کسی بات کو غلط کہتا بلکہ الٹا زینی کی حمایت میں بولتا۔ ...دنیا دریا کے دھارے کے ساتھ چلتی ہے اور دریا کا دھارا اس طرف تھا جس طرف زینی کھڑی تھی۔

اکبر اور نسیم نے محلے اور خاندان میں سب سے مایوس ہو کر زہرہ اور نعیم سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی اور منہ کی کھائی تھی۔ زینی ہر بار انہیں گھر کے اندر داخل ہونے دیتی تھی یہ اس کی مہربانی تھی لیکن زہرہ اور نعیم نے یہ بھی نہیں کیا تھا۔ گیٹ سے ہی ٹکا سا جواب دے کر ان کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ بڑھاپے میں اس "لائق اور قابل اولاد" کی وجہ سے انہیں جتنے دھکے کھانے پڑ رہے تھے وہ صرف وہ ہی جانتے تھے۔

اور جب اکبر اور نسیم نے بالآخر یہ جان لیا کہ زینی کا دل موم نہیں ہو گا وہ ان کی بات مان کر شیراز سے ملنے نہیں جائے گی تو پتہ نہیں زینی کے دل میں کیا آئی کہ وہ شیراز سے ملنے کے لیے جیل جا پہنچی۔

شیراز کو اس سے ملانے کے لیے سپرینٹنڈنٹ کے کمرے میں لایا گیا تھا اور وہ اسے دیکھ کر جتنا شاکڈ ہوا تھا وہ اسے دیکھ کر اس سے زیادہ شاکڈ ہوئی تھی وہ چند مہینے پہلے کا شیراز لگ ہی نہیں رہا تھا جسے اس نے دیکھا تھا وہ بے حد کمزور اور نقاہت زدہ لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اور آنکھیں جیسے اندر کو دھنس گئی تھیں۔ میلے کپڑوں اور بے ترتیب بالوں اور بے ترتیب شیو کے ساتھ وہ زینی کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

"تم نے میرا سب کچھ برباد کر دیا زینی۔ ...میرے اتنے سالوں کی محنت مٹی میں ملا دی۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم نے بھی یہی کیا تھا شیراز! تم نے بھی اسی طرح ایک پل میں میری زندگی تباہ کر دی تھی۔" اس بار زینی کے لہجے میں طنز اور تنفر نہیں تھا... تھکن تھی۔ وہ اسے اذیت دینا چاہتی تھی لیکن اب اسے اذیت میں دیکھ رہی تھی تو بے چین ہو رہی تھی۔

"میں مانتا ہوں میں نے غلطی کی۔ ...پر میں کیا کرتا ...ایک سرکاری عہدہ میرے مسئلے حل نہیں کر سکتا تھا۔ پیسے کی ضرورت تھی مجھے ...بہنیں بیاہنی تھیں مجھے۔" وہ اسی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

"تم مجھے برا کہتی ہو... سب مجھے برا کہتے ہیں لیکن کوئی اس معاشرے کو برا کیوں نہیں کہتا جو میرے جیسے لوگوں کو پیسے کے پیچھے بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ...میں نے زہرہ آپا کا حال دیکھا تھا۔ ..اپنے محلے میں جہیز کی وجہ سے لڑکیوں کو گھر میں بیٹھے بوڑھا ہوتے دیکھا تھا ... میں ڈر گیا تھا زینی۔ میں اپنی بہنوں کو ویسی زندگی گزارتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھتی جا رہی تھی۔ اس نے ساری عمر شیراز کو صرف ایک "محبوب" سمجھا تھا اسے پتہ ہی نہیں تھا وہ ایک "بھائی، ایک بیٹا" بھی تھا۔

"ساری عمر ایک ایک روپے کے لیے میں نے اپنے ماں باپ کو ترستے دیکھا۔ ایک ایک روپے کے لیے۔ ابو کی تنخواہ دس تاریخ کو ختم ہو جاتی تھی باقی کے 20 دن اوپر کی کمائی سے ہی گھر چلتا تھا ہمارا۔ اوپر کی کمائی نہ ہوتی تو فاقے ہوتے ہمارے گھر۔ جب بھی ابو معطل ہوتے ہمارے گھر میں سب کچھ ختم ہو جاتا تھا۔ پتہ نہیں کتنی جگہوں سے پیسے مانگ کر میری ماں اور باپ گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ اور میں

نے سارا بچپن یہی سب کچھ دیکھ کر گزارا... اور مجھے نفرت تھی ایسی زندگی سے... بجلی کا بل نہ دینے پر میٹر کٹ جاتا... پانی کا بل نہ دینے پر پانی بند ہو جاتا... پچھلی واجب الادا رقم نہ دینے پر راشن کی دکان والا ادھار دینا بند کر دیتا... یہ تھی میری اور میرے گھر کی زندگی۔"

وہ خالی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی وہ اسے یوں بتا رہا تھا جیسے وہ اس محلے میں صرف اس کے گھر کی کہانی تھی کسی دوسرے کی نہیں... وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ اس کا باپ بھی ویسی ہی زندگی جی رہا تھا اور اس کی تنخواہ بھی مہینے کی دس کو ختم ہو جاتی تھی لیکن پھر وہ ایک سائیکل لیے پتہ نہیں کہاں کہاں دوسرے تیسرے کام کرتا رہتا تھا... کبھی کبھی تو وہ رات کو گیارہ بجے بھی گھر آتا... چند گھنٹے سو کر وہ اسے پھر تہجد کے لیے جاگتا پاتی... اور صبح ایک بار پھر دفتر... اس کا دل چاہ رہا تھا وہ شیراز کو بتاتی کہ اس کے ماں باپ کو بھی بعض اوقات کسی سے قرض لینا پڑ جاتا تھا لیکن ہر بار اس کا باپ پائی پائی بچا کر بھی مقررہ وعدے پر وہ رقم ادا کر دیتا تھا... ہاں اس کا باپ کبھی معطل نہیں ہوا اور اس نے اپنے گھر میں کبھی فاقے نہیں دیکھے لیکن بہت بار روٹی کو صرف اچار یا چٹنی کے ساتھ کھایا... اور صرف اس نے نہیں اس کے سارے گھر والوں نے بھی اس کے باپ کی بھی اتنی ہی بیٹیاں تھیں جتنی شیراز کے باپ کی... اور ایک بیٹی بیاہ کر وہ "ذلت" نام کی اس شے کو بھی چکھنے لگا تھا جس سے اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے وہ ہمیشہ نامانوس رہا تھا... اس کے باوجود اس کے باپ نے بیٹیوں کی شادی کو حرام رزق کے دروازے کھولنے کی بنیاد نہیں بنایا... کیونکہ اس نے اللہ پر توکل کیا تھا اس نے اپنے مقدر کو دوسروں کا مقدر بدل کر لکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"ٹھیک ہے میں نے غلطی کی... غلطی نہیں گناہ کیا... جو بھی تمہارے ساتھ کیا... لیکن میں نے اپنے دل سے تمہیں کبھی نہیں نکالا... میرے دل میں ہمیشہ تم ہی رہی زینی۔" وہ اب اس سے کہہ رہا تھا۔

"دل میں رکھے جانے والے شخص کے منہ پر کوئی کالک نہیں لگاتا... تم نے مجھے کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔" زینی نے رنجیدہ آواز میں کہا۔

"تم نے بھی میرے ساتھ یہی کیا تم نے بھی مجھے کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا... حساب برابر کر دیا تم نے نوکری چلی گئی... جو گھر جائیداد بنائی تھی وہ ضبط ہو گئی... شینا نے بھی divorce لے لی... اب جیل بھی ہو جائے گی... ایک بہن گھر آ بیٹھی ہے... دوسری دونوں بھی آ جائیں گی... میرے بوڑھے ماں باپ اس عمر میں کتنے صدمے اٹھائیں گے۔" وہ ایک بار پھر رو رہا تھا... بلک بلک کر... اور پتہ نہیں کیوں... زینی کو ترس آ رہا تھا... اس پہ آ رہا تھا کہ اس شخص سے اس نے عشق کیا تھا... خالی محبت ہوتی تو وہ کہاں یوں اپنے آپ کو سولی پر چڑھا لیتی... اور اب وہ اس کے سامنے بیٹھ کر رو رہا تھا تو زینی کا پورا وجود اس کے ساتھ پانی بن کر بہنے لگا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" اس نے بے بسی سے کہا۔

"زینی میری مدد کرو مجھے اس جہنم سے نکال دو..."

"میں کیا کر سکتی ہوں... ایک معمولی ایکٹریس ہوں میں... میں کیا کر سکتی ہوں۔" زینی نے اس سے کہا۔

"تمہارے Contacts ہیں اتنے بڑے بڑے افسروں اور منسٹرز کے ساتھ پھرتی ہو تم... تم کسی افسر کو ایک بار بھی اشارہ کرو گی تو میں

باہر آ جاؤں گا... میرے خلاف مقدمات ختم ہو جائیں گے۔" وہ اب رو نہیں رہا تھا اپنے آنسو پونچھ رہا تھا اور شاید اسے امید ہو گئی تھی کہ زینی اس کے لیے کچھ کرے گی۔

"اور جس افسر سے میں تمہیں چھڑوانے کے لیے کہوں گی وہ مجھ سے کیا کہے گا تم جانتے ہو؟" پتہ نہیں کیوں زینی کو اس کی زبان سے اپنے Contacts کا سن کر اچھا نہیں لگا تھا۔

"کیا کہے گا؟" شیراز نے کہا۔

"وہ کہے گا میں اس کے ساتھ رات گزاروں۔"

"تو گزار لینا تم پہلے ہی ان مردوں کے ساتھ پھرتی ہو ایک بار میرے لیے کسی مرد کے ساتھ..." زینی کی آنکھوں اور چہرے پر کوئی ایسی چیز آئی تھی جس نے شیراز کو اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی۔ وہ چپ ہو کر التجائیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

زینی بے بس و بے حرکت دم سادھے آنکھیں جھپکائے بغیر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی... گلی میں ایک لڑکے کا خط پکڑنے پر وہ اسے سنگسار کرنے پر تیار ہو گیا تھا اور آج اتنی آسانی سے وہ اسے اپنے لیے کسی دوسرے مرد کے پاس بھیج رہا تھا... اتنی آسانی سے؟... اور وہ اپنی زبان سے یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اس کے دل میں آج بھی صرف وہ بستی ہے پھر اسے اپنی زبان پر زینی کے لیے یہ "مطالبہ" لاتے ہوئے کوئی شرم، کوئی ندامت محسوس نہیں ہوئی تھی... اور وہ... وہ اس مرد کے پیچھے برباد ہو گئی... صرف اس ایک خوش فہمی میں کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ کئی بار اپنی زبان سے اقرار کر چکا تھا... اس پر جان دیتا تھا۔ جان دیتا تھا؟... یہ جان لے رہا تھا؟... زینی نے آنکھیں بند کیے اپنی بھینچی ہوئی مٹھیاں کھولنے کی کوشش کی... اس کا پورا وجود جیسے برف کی ایک بہت بڑی سل میں تبدیل ہو چکا تھا... وہ شیراز اکبر اپنے پیسے اور پیسے کے لیے کس حد تک جا سکتا تھا۔ زینی نے یہ دونوں چیزیں دیکھ لی تھیں لیکن غلط وقت پر دیکھی تھیں اور اسے غلط وقت پر سمجھ آئی تھی... کسی دوسرے مرد کے پاس چلی جاؤ... وہ کیا سمجھ رہا تھا اسے؟... زینی؟ پری زاد؟ یا کوئی طوائف؟... نہیں وہ زینی سمجھ کر اس سے یہ باتیں نہیں کر رہا تھا... میں "زینی" رہتی تو شیراز مجھ سے ایسی بات کبھی نہ کرتا... وہ تو یہ سب کچھ پری زاد سے کہہ رہا تھا... جس کو وہ طوائف سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا... وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے جیسے پہیلیاں سلجھانے بیٹھی تھی۔

وہ اس کی بیوی بن جاتی اور زندگی میں شیراز کو کبھی اپنا آپ بچانے کے لیے اس کو قربان کرنا پڑتا تو وہ اتنی ہی آسانی کے ساتھ کرتا... کسی سیکنڈ Thought کسی وقفے کے بغیر... شیراز نے رزق حرام پر پرورش پائی تھی اور حرام رزق کا عشق اس کے خون میں شامل تھا... وہ کچھ بھی کر لیتا وہ روپے کی ہوس کو اپنے Genes سے الگ نہیں کر سکتا تھا... لیکن وہ... اس کی پرورش تو اس کے باپ نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے کی تھی پھر وہ کیوں اس کے تعاقب میں چلی آئی... اسے کس فریب نے یوں اندھا اور بہرا کر دیا تھا... کیا یہ مرد اس قابل تھا کہ اس کے لیے وہ سب کچھ گنوا کر یوں تہی دامن ہو کر بیٹھ جاتی۔

وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اور کیا سننا تھا اسے شیراز سے؟... اور رہ ہی کیا گیا تھا۔

"پھر تم نے کیا سوچا زینی؟" شیراز نے اسے اٹھتے دیکھ کر بے تابی سے کہا۔

"میں نے ؟ میں نے کیا سوچنا ہے؟ کچھ بھی نہیں سوچا " وہ روتے ہوئے ہنسی۔

"تمہیں صرف اپنے آپ سے اور پیسے سے محبت ہے سچا عشق بس تمہیں تو کسی زینی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں زینی؟" وہ گڑگڑانے لگا۔

"مت سمجھاؤ مجھے سب کچھ سمجھ میں آ گیا ہے سارے پردے اٹھ گئے ہیں۔" وہ پلٹنے لگی شیراز اس کے قدموں میں بیٹھ گیا

"ضیاء چچا کی خاطر مجھے یہاں سے رہا کروا دو زینی ضیاء چچا کی خاطر۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ زینی نے آنکھیں بند کر لیں وہ اب گرنے لگا تھا تو گرتا ہی جا رہا تھا۔ اس کی پستی کی کوئی انتہا تھی کیا؟ ۔ وہ اپنی زندگی کی خاطر ایک عورت کے قدموں میں بیٹھ سکتا تھا۔ اسی چچا کا واسطہ دے کر اسے بلیک میل کر سکتا تھا جسے اس نے جیتے جی درگور کر دیا تھا۔ اور وہ اس مرد کو پتہ نہیں کیا سمجھتی تھی۔ پتہ نہیں کون سا خدا بنا لیا تھا اس نے اسے اور وہ، وہ تو انسان کہلانے کے لائق بھی نہیں تھا۔

وہ پری زاد ہوتی تو اسے ٹھوکر مار کر آ جاتی لیکن وہ پری زاد نہیں تھی۔ وہ اس وقت صرف زینب ضیاء بن گئی تھی ۔ ضیاء صاحب کی بیٹی ۔ کسی نے زندگی میں پہلی بار اسے اس کے باپ کا واسطہ دے کر کچھ مانگا تھا وہ کیسے اسے نہ دیتی۔

وہ واپسی پر گاڑی میں بیٹھی روتی آئی تھی۔ پری زاد کی طرح نہیں ... زینی کی طرح ۔ زینب ضیاء کی طرح۔ اس نے بہت دفعہ اپنی زندگی کے پرخچے اڑتے دیکھے تھے اور ہر بار تکلیف پہلے سے سوا تھی۔ لیکن اگر وہ شخص جھوٹا نکل آئے جس کی محبت کی خاطر آپ نے اپنے آپ کو خوار کر دیا ہو پھر احساس زیاں نہیں ہوتا پھر کچھ اور ہی ہوتا ہے ۔ شیراز کی زبان سے نکلے ہوئے کانچ کا انبار تھا جو اس کے چاروں طرف تھا۔ اور وہ جہاں سے بھی گزرتی پیروں کو زخمی ہوتا ہی تھا۔

اس رات اتنے سالوں کے بعد پہلی بار روتی رہی ... لیکن شراب اور سگریٹ پیئے بغیر ... وہ کیا تھی ... وہ کیا ہو گئی تھی۔

دنیا کے بازار میں شیراز نے اپنا ضمیر بیچا تھا۔ اس نے اپنا سب سے مہنگا اثاثہ سب سے "سستا" سمجھ کر دیا تھا ۔ اسے "ضمیر" کے بدلے "لاکھوں" ملے یہ دام شیراز کو اچھا سودا لگا۔ ... دنیا کے بازار میں زینی لے اپنی "حیا" رکھ دی تھی ۔ اس نے اپنے سب سے "قیمتی" اثاثے کو "قیمتی" سمجھ کر ہی دیا تھا۔ ... اسے "حیا" کے بدلے "کروڑوں" ملے ... جو بھی دام ملے وہ زینی کو ہمیشہ گھاٹے کا سودا ہی لگا۔

آنسو اب کیا تھمتے پچھتاوا اب کیا جاتا اس رات وہ ساری نصیحتیں اسے یاد آتی رہیں جو سب اسے کرتے رہے تھے اور جنہیں سننے پر وہ تیار نہیں تھی۔

"وہ "حرام رزق" کو "من وسلویٰ" سمجھ کر کھا رہا ہے اسے جانے دو زینی ۔ اس کے مقدر میں حرام کھانا ہے ۔ "من وسلویٰ" نہیں ہے اس کی قسمت میں۔" اس کے باپ نے اس سے کہا تھا۔ اس کے باپ کو کیا پتہ تھا کہ "من وسلویٰ" تو زینی کے مقدر میں بھی نہیں تھا۔ شیراز اپنی وجوہات کی وجہ سے پیسے کے پیچھے گیا تھا۔ وہ اپنی وجوہات کی وجہ سے

"جو چیز اللہ نہ دے زینی اسے انسانوں سے نہیں مانگنا چاہیے — ورنہ انسان بڑا خوار ہوتا ہے۔" ماں باپ کی باتیں اتنی دیر سے سمجھ میں کیوں آتی ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM 572 / 660 من و سلویٰ

"یہ بیٹھے بٹھائے سب کچھ کیوں چھوڑ رہی ہو؟" نفیسہ بے حد پریشان ہو کر فون پر اس سے پوچھ رہی تھی۔

"آپ ہی کہتی تھیں یہ رسوائی کا کام ہے اب پتہ چل گیا تو چھوڑ رہی ہوں۔"

"پر زینی یوں اچانک اور پھر پاکستان چھوڑ دینے کی کیا تک بنتی ہے؟"

"یہاں لوگ میرا چہرہ پہچان لیتے ہیں امی یہاں میں گم نہیں ہو سکتی اور میں ...میں اب بے نام ونشان ہونا چاہتی ہوں۔"

"میں نے تم سے کہا تھا تم شادی..."

زینی نے ماں کی بات کاٹ دی "میری قسمت میں شادی نہیں ہے امی۔" نفیسہ کا دل دہل گیا۔

"اس طرح مت کہہ زینی بعض دفعہ زبان سے نکلی ہوئی بات پوری ہو جاتی ہے۔"

"زینب کو اپنی قسمت کا حال پتہ ہے امی۔"

"غیب کا علم صرف اللہ کے پاس ہوتا ہے زینی...!"

"ہاں اللہ کے پاس ہوتا ہے لیکن جب آدمی غلط راستے پر چلنے لگتا ہے تو "غیب" اس کے لیے "غیب" نہیں رہتا اسے پتہ چلنے لگتا ہے کہ آگے اس کے لیے کونسا پھندہ... کون سا کنواں... کون سا گڑھا تیار ہو رہا ہے۔"

نفیسہ کو وہ زینی نہیں لگ رہی تھی جس کو وہ اتنے سالوں سے پال رہی تھیں... کچھ تھا جو اس میں بدلا تھا... وہ اسے کہنا چاہتی تھیں وہ ان کے پاس آ جائے لیکن وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکی تھیں۔

"میرے لیے دعا کریں امی کہ میرے گناہ دھل جائیں... مجھے سکون مل جائے... کہیں سے پر مل جائے" وہ اب بچوں کی طرح رونے لگی تھی... اتنے ہفتوں سے یہی ایک چیز تھی جو وہ کر پا رہی تھی۔

شوبز کو چھوڑنے کا فیصلہ آسان نہیں تھا لیکن اسے یہ فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے اپنے اس فیصلے کے بارے میں کوئی اعلان نہیں کیا... لیکن سلطان نے ان سب لوگوں کو ایڈوانس واپس کرنا شروع کر دیا تھا جن سے اس نے ایڈوانس لیا تھا... شوبز میں زینی کے بارے میں افواہیں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں کئی مہینوں سے کسی نے اسے کسی فلمی تقریب میں کسی فلم کے سیٹ پر نہیں دیکھا تھا اس کے تمام واقف کار اس سے Contact کرنے میں ناکام ہو رہے تھے... سلطان سے انہیں متضاد خبریں مل رہی تھیں اور یہ بات لوگوں کو زیادہ الجھا رہی تھی۔ پری زاد آخر اتنے دن سے کہاں چھپی تھی اور کیوں چھپ کر بیٹھ گئی تھی یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

"شیراز آیا ہے ملنے کے لیے اپنے ماں باپ کے ساتھ۔" سلطان نے اسے اطلاع دی پیکنگ کرتے ہوئے چند لمحوں کے لیے اس کے ہاتھ رکے پھر اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اب نہیں ملنا اس سے۔''

''تو پھر چھڑوایا کیوں اسے جیل سے۔ رہنے دیتیں اس خبیث کو وہاں۔'' سلطان نے جل کر کہا۔

''اس نے میرے باپ کا واسطہ دیا تھا مجھے میں نے معاف کر دیا اسے۔'' اس کا لہجہ اتنا بے تاثر تھا کہ سلطان کو چبھنے لگا اس نے انڈسٹری میں بڑی بڑی ہیروئنز دیکھی تھیں پر ایسی ہیروئن نہیں دیکھی تھی۔ اس نے کبھی کسی بھکاری کو اللہ کے نام پر کچھ نہیں دیا تھا وہ ہمیشہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتی یا اس سے کہتی اللہ کے نام پر مت مانگو کسی اور چیز کا واسطہ دو تو دے دیتی ہوں اور پھر کوئی اسے ترقی کی دعا دیتا کامیابی اور شہرت کی دعا دیتا اور زینی اپنے پرس میں جو کچھ ہوتا نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔

''میرے پاس حرام کا پیسہ ہے سلطان یہ اللہ کے نام پر نہیں دے سکتی میں۔'' اس نے ایک بار سلطان کے پوچھنے پر کہا اور وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ سلطان نے آٹھ سال میں اسے ''اللہ کے نام پر'' کسی کو کچھ بھی دیتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن انڈسٹری میں اس سے زیادہ کھلے ہاتھ کی ہیروئن اس نے بھی کبھی نہیں دیکھی تھی فلموں میں کام کرنے والے کتنے ایکسٹراز اس فلم میں کام کرنے کی تمنا رکھتے جس میں پری زاد ہوتی۔ کیونکہ فلم کا معاوضہ انہیں جو بھی ملتا پری زاد کے طفیل ان کے کئی کام ہو جاتے تھے

''تو اب اس کو کیا کہوں میں؟'' سلطان کی آنکھوں میں نمی آنے لگی۔

''اسے کہنا مجھے معاف کر دے... لیکن اب بس کرے۔''

''اسے بتا دوں کہ آپ جا رہی ہیں؟''

''نہیں۔''

''ڈھونڈتا پھرے گا آپ کو پری جی۔''

''نہیں ڈھونڈے گا... وہ کوئی اور ڈھونڈ لے گا... دنیا میں نہ پیسہ ختم ہوا ہے نہ عورتیں۔''

''آپ کو ابھی بھی اچھا لگتا ہے تو اس سے شادی...'' سلطان نے پتہ نہیں کیا سوچ کر اس سے کہا۔

زینی بے اختیار ہنسی۔ وہ روتی تو سلطان کو تنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس کے کھلکھلا کر ہنسنے سے ہوئی تھی۔

''اب نہیں... میں نے تھوک دیا اسے۔ میں تھوک کے نہیں چاٹوں گی۔'' وہ اپنا آخری بیگ بند کرنے لگی تھی۔

''مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جائیں پری جی۔'' سلطان یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''میرے ساتھ رہ کر تم کیا کرو گے؟''

''آپ کی خدمت کروں گا۔''

''مجھے اب خدمت کی ضرورت نہیں رہی سلطان۔''

''پری جی میں آپ کے بغیر کیا کروں گا؟''

''عیش کرنا.... تمہارے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے جمع کروادیے ہیں میں نے کہ ساری عمر گھر بیٹھے آرام سے زندگی گزار سکتے ہو اپنے لیے جینا اب۔''

''ساری عمر اپنے لیے نہیں جیا تو اب اپنے لیے کیا جیوں گا.... مجھے لے جائیں اپنے ساتھ۔'' اس نے زینی کا بیگ پکڑ کر جیسے اسے پیکنگ سے روکتے ہوئے کہا۔

زینی نے شکست خوردہ انداز میں اسے دیکھا۔

''میرا اب زوال شروع ہو رہا ہے اور زوال کے دن انسان کو اکیلے ہی گزارنا چاہئیں.... زوال میں ساتھی مل جائے تو پتہ کیسے چلے گا کہ زوال آ گیا ہے۔''

''یہ زوال آپ خود لے کر آئی ہیں پری جی۔''

''زوال انسان خود ہی لے کر آتا ہے.... میں شوبز کے آسمان پر چمکتے چمکتے تھک گئی ہوں.... مجھے اب گم ہو جانے دو۔'' سلطان کے آنسو تھمنے لگے۔ بے حد شکست خوردہ انداز میں اس نے زینی کے بیگ سے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔

☆☆☆

پری زاد کے شوبز سے علیحدگی کے بارے میں پتہ اس کے پاکستان کے چلے جانے کے بعد کچھ ہفتے کے بعد چلا تھا.... جب سلطان نے ایک دوسری ہیروئن کے کیمپ کو جوائن کر لیا۔ اور یہ خبر پھیلتے ہی فلم انڈسٹری میں کہرام مچ گیا تھا۔ وہ پہلے بھی چند ماہ تک شوبز سے غائب رہ کر واپس آ جایا کرتی تھی مگر کبھی اس کے بارے میں ایسی خبریں نہیں آتی تھیں.... شوبز کے کسی بھی شخص کے ساتھ اس کا رابطہ نہیں تھا.... یہاں تک کہ سلطان کے ساتھ بھی نہیں.... سلطان نے اس کی ہدایات کے مطابق میڈیا اور شوبز کے لوگوں کو یہی بتایا کہ وہ دبئی شفٹ ہو گئی ہے۔ شوبز میں کچھ لوگوں نے اس پر یقین کیا.... کچھ نے نہیں.... لیکن پری زاد کی گمشدگی نے اس کے پیچھے کھڑی ہیروئنز کے راستے کھول دیے تھے.... راتوں رات فلمز میں اس کی Replacement ڈھونڈی جانے لگی۔ وہ ہر فلم کا ایڈوانس واپس کر کے گئی تھی۔ لیکن اپنی زیر تکمیل فلمز کو مکمل کروا کر نہیں گئی تھی.... اور یقیناً اس نے بہت سارے پروڈیوسرز کو لاکھوں، کروڑوں کا نقصان پہنچایا تھا ان میں سے بہت سے پروڈیوسرز نے اس کے خلاف عدالتوں میں مقدمات بھی دائر کر دیے.... اور کچھ نے تو غصے میں اس کے خلاف دھوکہ دہی کے تحت ایف آئی آر بھی رجسٹر کروا دیں.... جو یہ نہیں کر سکتے تھے وہ اپنے Contacts کے ذریعے اسے ڈھونڈتے رہے.... اور کچھ عرصہ اس میں ناکام ہونے کے بعد ماپ نے پری زاد کو کسی فلم میں کاسٹ کرنے پر مکمل طور پر بین لگانے کا اعلان کر دیا تھا۔

ہر ایک کو لاشعوری طور پر یہ امید تھی کہ اس کے خلاف اٹھایا جانے والا کوئی نہ کوئی قدم پری زاد کو واپس یا سامنے آنے پر مجبور کرے گا کم از کم یہ تو پتہ چلے گا کہ وہ کہاں تھی.... پری زاد نے ہر ایک کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا.... وہ دوبارہ چند سال بعد سامنے آئی تھی لیکن ایک بڑے اخبار کے بیک پیج پر ایک دو کالمی خبر بن کر۔

☆☆☆

وہ اس بوڑھے بھکاری کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ ہاتھ میں پکڑا آدھا برگر اس نے اس کے سامنے رکھ دیا۔ بوڑھا اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ تاش کے پتوں سے گھر بنا رہا تھا۔ بے حد انہماک بے حد محویت سے یوں جیسے وہ واقعی اصلی گھر تھا۔ بڑا کس سے بننے والا۔ وہ یوں بیٹھی انہماک سے اس گھر کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ اسی کام سے وہاں آئی تھی۔ 52 پتوں سے بننے والا گھر۔ وہ سانس روکے پلکیں جھپکائے بغیر پتوں کے اس گھر کو مکمل ہوتے ہوئے دیکھے جا رہی تھی۔ بوڑھا کپکپاتے ہاتھوں سے آخری دو پتے رکھنے جا رہا تھا۔ آخری دو پتے پھر گھر مکمل ہو جاتا۔ وہ اب پتے رکھ رہا تھا۔ اب۔ اب۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ یا شاید اس کا ہاتھ کانپا۔ یا شاید پتے ٹھیک سے رکھے نہیں جاسکے۔ کچھ ہوا تھا۔ پورا گھر زمین بوس ہو گیا تھا۔ بوڑھے نے ایک گالی دی۔ زینی نے گہرا سانس لیا۔ آج بھی گھر نہیں بن سکا تھا۔ ہر روز ان ہی آخری دو پتوں کو رکھتے رکھتے گھر ٹوٹ جاتا۔ وہ روز یونہی اسی انہماک سے بیٹھ کر گھر دیکھتی جیسے کسی دن تو وہ معجزہ ہو ہی جانا تھا۔ لیکن وہ معجزہ اب تک نہیں ہوا تھا۔

"Hard luck" اس نے بوڑھے سے افسوس کیا اور پانی کی آدھی بوتل بھی اس کے پاس ہی چھوڑ دی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کا راستہ تھا وہ روز وہاں کام پر جاتے اور آتے ہوئے گزرتی تھی۔ جاتے ہوئے وہ جلدی میں ہوتی رکنے کا وقت نہیں ملتا تھا لیکن آتے ہوئے یہ فٹ پاتھ اور اس پر بیٹھے ہوئے یہ پانچ بھکاری اس کے لیے جیسے amusement park میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ وہ انہیں تقریباً روزانہ ہی کچھ نہ کچھ دیتی تھی۔ کبھی چند سکے کبھی چند ڈالر۔ کبھی کھانے پینے کی چیزیں۔ اور کبھی آنسو۔ جو وہ وہاں کسی نہ کسی کے سامنے بیٹھ کر بہاتی تھی۔ وہاں کون اسے جانتا یا پہچانتا تھا کہ حیرت زدہ ہوتا یا اس پر ترس کھاتا یا اس سے پوچھتا۔ نہ وہ ان میں سے کسی سے کچھ پوچھتی تھی نہ ان میں سے کوئی اس سے کچھ پوچھتا تھا۔ جو واحد جملے ان کے درمیان کبھی کبھار exchange ہوتے وہ موسم کے بارے میں تھے۔ یا greetings یا شکریے کا اظہار۔ یہ پھر وہی۔ "bad luck"، "hard luck"، "nice effort"، "good show"۔ جو وہ ان میں سے کسی نہ کسی سے کہتی تھی۔

اگلا سیاہ فام گٹارسٹ اس دن پتہ نہیں کونسا گانا اپنے گٹار پر بجا رہا تھا وہ پہچان نہیں پائی ورنہ اتنے عرصے سے وہ ان پانچ چھ ٹیونز کو پہچاننے لگی تھی جو تقریباً وہ ہر روز بجاتا تھا۔ اور اس نے باری باری اس سے ان میں سے ہر گانے کے lyrics اور سنگر کے بارے میں پوچھا تھا۔

لانگ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بے مقصد اس کے سامنے کھڑی اس کو سنتی رہی۔ اسے لگتا اسے دیکھ کر وہ ہمیشہ بڑی محنت اور زیادہ توجہ سے بجاتا تھا۔ وہ اسی کے پاس کھڑے گٹار کو سنتے سنتے بعض دفعہ رونے لگتی تھی۔ اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ جیسے آج بھی نہیں ہوا تھا۔ گانا ختم ہونے کے بعد لانگ کوٹ کی جیب میں موجود سکوں میں سے ایک سکہ نکال کر اس نے اس کے سامنے پڑے ہیٹ میں ڈالا تھا اور پھر اپنے گیلے گالوں کو صاف کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

Spanish وہ بھی آج نہ گیندوں کو ہوا میں اچھال رہا تھا نہ گلاسز کو۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ اور ایسا تب ہوتا جب وہ بہت زیادہ نشے میں ہوتا۔ اور ہفتے میں ایک دو بار ایسا ضرور ہوتا جب وہ بالکل کسی مردہ جانور کی طرح فٹ پاتھ پر اپنی مخصوص جگہ پر پڑا رہتا۔ کوئی

اسے کچھ دے کر جاتا یا اس کے سامنے پڑے سکے لے جاتا اس کو پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ وہ کرتب دکھا رہا ہوتا تو وہ کچھ دیر اس کے سامنے کھڑی رہتی۔ .. ہوا میں اچھالی جانے والی چیزوں میں کوئی دلچسپی لیے بغیر وہ صرف اس کی انگلیوں، کلائیوں اور گلے میں پڑے عجیب عجیب پتھروں والے بینڈز اور زیورات کو دیکھتی رہتی تھی۔ ان میں سے کون سا پتھر اس نے کس مقصد کے تحت پہنا تھا یہ شاید وہ اب خود بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سکہ اس نے اس کے سامنے پڑے گلاس میں ڈال دیا وہ اس دن کا پہلا سکہ تھا جو کسی نے اس ہپی کے گلاس میں ڈالا تھا۔

اگلا بھکاری ایک سیہ فام نوجوان تھا۔ اور یہ واحد بھکاری تھا جس کے پاس وہ سب سے کم وقت گزارتی تھی۔ وہ فلوٹ بجاتا تھا اور اسے بے حد عجیب لگتا تھا۔ اس نے کسی کو اتنا برا فلوٹ بجاتے زندگی میں نہیں سنا تھا اور وہ شاید یہ سمجھتا تھا کہ وہ بہت اچھا بجاتا تھا اس لیے وہ اپنے پاس رکنے پر ہر شخص کے لیے پہلے سے بھی کوئی خراب دھن بجاتا تھا۔ زینی کو بعض دفعہ اس کی ''محنت'' پر ہنسی آتی۔ اسے اپنے سامنے ڈرم اور سکس فون بھی رکھتے ہوئے تھے لیکن ایسا بہت کم ہوا کہ زینی نے اسے ان میں سے کسی انسٹرومنٹ کو بجاتے دیکھا ہو۔ وہ صرف فلوٹ ہی بجاتا تھا۔ کم از کم زینی کے آنے پر۔ اور آہستہ آہستہ زینی کو احساس ہونے لگا کہ وہ اسے asian سمجھ کر صرف اس کے لیے فلوٹ بجا رہا تھا۔ اسے please کرنے کے لیے اسے یقین تھا وہ اسے انڈین سمجھ رہا ہوگا۔ بعض دفعہ وہ اسے بھکاری نہیں لگتا تھا۔ چند ایک بار وہ کچھ دنوں کے لیے وہ وہاں سے غائب بھی ہوا۔ لیکن پھر واپس آ گیا۔ زینی کو وہ کبھی نشے میں محسوس نہیں ہوا تھا اس کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ وہاں اس فٹ پاتھ پر کیوں بیٹھا رہتا تھا۔ بھیک کیوں مانگتا تھا۔ .. اور ہر وقت فلوٹ کیوں بجاتا تھا۔ جیب سے ایک سکہ نکال کر اس نے ہمیشہ کی طرح اس کے پاس پڑے ایک ڈبے میں اچھال دیا۔ .. پھر ہمیشہ کی طرح چلتی ہوئی فٹ پاتھ کے آخر میں بیٹھی اس میکسیکن عورت کے پاس پہنچ گئی جو پھر وہی سکیچ بنا رہی تھی جو وہ ہمیشہ بناتی تھی۔ ہمیشہ۔ وہی مرد۔ وہی خوبصورت مرد۔ زینی آنکھیں بند کیے بھی اس مرد کے نقوش بتا سکتی تھی۔ .. وہ میکسیکن عورت کاغذ پر اس مرد کا چہرہ سکیچ کرتی تھی اور اس کے ہاتھ کی ہر حرکت کے ساتھ زینی کے ذہن پر کسی ''اور'' مرد کے نقوش ابھرنے لگتے تھے۔ .. اس عورت نے اس مرد کا چہرہ بناتے ہوئے کبھی سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ .. بس پاگلوں کی طرح وہ اپنے کام میں لگی رہتی تھی۔ .. اور بعض دفعہ تو وہ زینی کو پاگل ہی لگتی تھی۔ .. بعض دفعہ ہر کوئی کسی دوسرے کو پاگل ہی لگتا ہے۔ .. وہ ادھیڑ عمر عورت تھی۔ .. وہ تو جوان مرد تھا۔ .. پتہ نہیں وہ کتنے سالوں سے اسی ایک چہرے کو بناتی آ رہی تھی۔ یا ہو سکتا ہے وہ ابھی کچھ عرصہ پہلے سے۔ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ .. لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس مرد کے ساتھ عورت کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ .. اس کے نقوش میں اس عورت کے نقوش نہیں تھے۔

وہ بہت دیر اس عورت کے پاس کھڑی اس چہرے کو کاغذ پر ابھرتے دیکھتی جب سکیچ مکمل ہو جاتا تو عورت بہت سارے دوسرے سکیچز کے ساتھ اس کاغذ کو رکھ کر ایک نیا سکیچ بنانے لگتی تھی۔ زینی کو کبھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ان پرانے سکیچز کو کیا کرتی تھی۔ پھینکتی تھی۔ پھاڑتی تھی یا کہیں رکھ آتی تھی۔

اس نے اپنی جیب میں موجود آخری سکہ اس عورت کے سامنے رکھا اور فٹ پاتھ کا موڑ مڑ آئی۔ اداسی آج بھی اتنی ہی گہری تھی جتنی روز ہوتی تھی۔ اور صرف سڑک کا یہ وہ حصہ تھا جس سے گزر کر چند لمحوں کے لیے کم ہو جاتی تھی۔ پھر وہ اس فٹ پاتھ کو پیچھے چھوڑ آتی۔ آگے وہ

بلڈنگ تھی جہاں 23 ویں منزل پر اس کا اپارٹمنٹ تھا... اور جہاں کی حالت اتنی ہی ڈپریسنگ تھی جتنا ہر سڑک کا ماحول تھا۔

وہ کینیڈا آنے کے بعد شروع میں ایک بہتر علاقے میں تھی... بہتر لیکن مہنگے... اور چند ماہ میں کام حاصل نہ کر پانے پر اسے وہ علاقہ چھوڑنا پڑا تھا... جہاں بالآخر اسے کام ملا اس کے قریب ترین یہی علاقہ تھا... یہاں وہ لوگ رہتے تھے جو کینیڈا میں آ جانے کے بعد struggle کرنے کے دور سے گزر رہے تھے... جو اپنے اپنے ملکوں اور اپنی اپنی سوسائٹیز کے outcast تھے اور وہ اس خواب کے ساتھ وہاں آئے تھے کہ ایک دن وہ کسی نہ کسی فیلڈ میں کسی نہ کسی طرح excel کریں گے... وہ علاقہ کسی کا بھی "انتخاب" نہیں تھا... "مجبوری" تھی... سیڑھی کا پہلا پائیدان... صرف وہ تھی جو سیڑھی کے آخری پائیدان سے اتر کر پہلے پائیدان پر آ کر کھڑی ہوئی تھی... کامیابی کو "چکھ" لینے کے بعد کامیابی کی خواہش یا خواب کے بغیر... ایک ایک پائی بچانے کی جدوجہد کے بغیر وہ وہاں شاید اپنی زندگی گزارنے نہیں آئی تھی... زندگی ضائع کرنے آئی تھی۔

اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر وہ اندر چلی آئی۔ ہمیشہ کی طرح بے حد "سرد خاموشی" نے اس کا استقبال کیا تھا۔ دن ڈوب رہا تھا۔ سٹنگ ایریا کی کھڑکیاں اب روشنی اندر لانے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ اس نے لائٹ آن کر دی۔ اپنا لانگ کوٹ اور جوتے اتارتے ہوئے وہ آگے بڑھ آئی۔ ہاتھ میں پکڑا پرس کچن کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے وہ کھڑکیوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی... یہ اس کا روز کا معمول تھا کام سے واپس آنے کے بعد ان کھڑکیوں کے سامنے کھڑے ہو کر باہر دیکھنا... گزری ہوئی زندگی کو کسی فلم کی طرح ان کھڑکیوں کے شیشوں پر دیکھنا... تکلیف دہ مناظر سے بچنے کی کوشش کرنا... چبھنے والے جملوں کو سماعتوں سے غائب کرنے کی جستجو کرنا...... اور پھر پچھتاوا... وہ جیسے روز خود احتسابی کے عمل سے گزرتی تھی... وہ جیسے روز بے یقینی کا شکار ہوتی تھی... جو کچھ "پری زاد" کرتی رہی تھی... وہ "زینب ضیاء" کیسے کر سکتی تھی... کیسے؟ اس کے اندر اتنی نفرت، اتنا غصہ، انتقام کا ایسا جذبہ کہاں سے آ گیا تھا... یہ عفریت اس نے کس طرح پال لیا تھا... وہ تو زینی تھی اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر اس کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہہ دینے والی سیدھی سادھی لڑکی... پھر اسے کیا ہو گیا تھا؟

وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ آئی... ہر بار اس سوال کے آتے ہی وہ شکست خوردہ انداز میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ آتی تھی...

فریج میں کل کا پکایا ہوا کھانا ابھی بھی پڑا تھا... وہ اسے نکال کر گرم کرنے لگی... کئی سالوں کے بعد وہ یہاں آ کر کھانا پکانے لگی تھی... اور جب پکانے لگی تو اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی... ہر کھانے کی ترکیب وہ جیسے مشینی انداز میں ذہن میں لاتی... لیکن کسی بھی کھانے کا ذائقہ ویسا نہیں تھا جیسا پہلے تھا... جیسا اس کے گھر میں "زینی" پکاتی تھی کوئی بھی چیز لاکھ جدوجہد کے بعد اب ویسی نہیں بنتی تھی... اسے پہلے بے بسی کا احساس ہوتا تھا... رونا بھی آتا تھا پھر جیسے اس نے اس بدلے ہوئے ذائقے کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا... یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے ہاتھ کی تاثیر میں کمی آ گئی تھی

وہ اب رزق حلال کماتی تھی... رزق حلال کھاتی تھی... وہ یہاں آنے سے پہلے ہر وہ چیز کسی نہ کسی کو دے آئی تھی یا چھوڑ آئی تھی جسے اس نے رزق حرام سے پایا تھا... جو چند لاکھ روپے وہ یہاں لے کر آئی تھی وہ اس گھر کو بیچ کر لائی تھی جو ضیاء کا تھا وہ واحد اثاثہ تھا جو اس نے اپنی فیملی سے مانگ کر لیا تھا... کہیں نہ کہیں وہ اپنے ذہن میں آج بھی اپنے باپ کی بات پر یقین رکھے ہوئے تھی کہ رزق حلال میں برکت ہوتی ہے... وہ

اس برکت کا اثر اپنی زندگی میں دیکھنا چاہتی تھی ــــ کہیں نہ کہیں وہ آج بھی اپنے باپ کی بات کی آزمائش چاہتی تھی۔ ..اور وہ پیسے واقعی ابھی تک ختم نہیں ہوئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح سے چل رہے تھے۔ ...اس کی زندگی میں ویسا سکون نہیں تھا جیسا وہ چاہتی تھی لیکن سکون تھا۔ .وہ مقابلے کی دوڑ سے نکل کر جیسے اطمینان سے تماشائیوں میں جا کھڑی ہوئی تھی۔

سرفرائیڈ ہوٹ جیٹیلز اور بوائلڈ رائس، وہ یہاں آ کر کئی سالوں کے بعد "کھانا" کھانے لگی تھی ــــ .ڈائیٹنگ کے نام پر چھوڑی جانے والی تمام چیزیں۔ وہ انگلیوں کی پوروں کے ساتھ لقمے بنا کر چاول کھاتی رہی۔ اسے کینیڈا میں آئے ایک سال سے زیدہ کا عرصہ ہونے لگا تھا۔ پیچھے پاکستان میں کیا ہو رہا تھا۔ شو بز میں کیا ہو رہا تھا۔ وہ جیسے بھول گئی تھی۔

واحد رابطہ جو اس کا کسی کے ساتھ تھا وہ نفیسہ تھیں۔ جنہیں وہ کبھی کبھار فون کرتی۔ ان کی شادی کر لینے کی ہدایت اور تشویش سنتی اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں جانتی اور فون رکھ دیتی۔ .وہ اس کے لیے روٹین کی باتیں ہوتی تھیں۔ .وہ سب اب امریکہ میں اکٹھے تھے ایک سٹیٹ میں۔ تھوڑے سے فاصلے پر۔ اور اپنی اپنی زندگی میں settled اور خوش تھے۔ ان میں سے کسی کی زندگی میں زینی نام کا کوئی خلا نہیں تھا جسے وہ جا کر پر کرتی۔ ان سب کے لیے وہ اب ایک outsider تھی اور زینی نے اپنے اس سٹیٹس کو قبول کر لیا تھا۔

دس منٹ میں کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے ان چند برتنوں کو صاف کیا اور کچن سے باہر آ گئی۔

مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد عشاء کی نماز تک وہ قرآن پاک پڑھتی رہتی ــــ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ یہ وہ قرآن پاک تھا جسے کبھی ضیاء پڑھا کرتے تھے اور اسے پڑھتے ہوئے بہت بار وہ اپنے ارد گرد ضیاء کی مہک محسوس کرنے لگتی تھی۔ بہت بار اسے لگتا وہ وہیں کہیں ہیں اس کے آس پاس بہت قریب ــــ لیکن بہت دور ــــ بہت دفعہ اسے قرآن پاک کے صفحات پر اپنے باپ کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہونے لگتا۔ ...وہ ہر لائن کے نیچے انگلی پھیرتے تھے۔ ...وہ بھی ہر لائن کے نیچے انگلی پھیرا کرتی تھی ــــ کبھی کبھار بھول جاتی۔ ..اور پھر احساس ہونے پر دوبارہ اسی طرح انگلی پھیرنے لگتی تھی۔

ضیاء کو اتنے سالوں میں اس نے کبھی خواب میں نہیں دیکھا تھا ــــ کبھی نہیں۔ ..لیکن ان کی خوشبو کو بھی اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا جس طرح وہ اب کرنے لگی تھی۔ اس ایک سال میں بہت بار تہجد میں روتے ہوئے اسے لگتا ضیاء اس کے پاس آ بیٹھے تھے۔ ناراض لیکن بے چین ــــ خفا لیکن اس کے پاس ــــ سارا قصور اس کا قصور تھا ــــ ساری غلطی اس کی غلطی تھی ــــ وہ ہمیشہ روتی تھی لیکن کچھ کہے بغیر ــــ کوئی گلہ کوئی شکایت کیے بغیر۔ سب نے اس سے بہت کچھ کہا تھا صرف ایک ضیاء نے ہی کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اب سننا چاہتی تھی باپ سے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس نے ضیاء سے کیا کہا تھا۔ وہ جیسے چاہتی تھی کہ باپ بھی ملامت کرے ــــ سب کچھ کہہ دے۔ پر بات کرے اس سے۔ لیکن وہاں خاموشی تھی ــــ اور خاموشی اسے رلاتی تھی ــــ باپ کی خفگی اتنے سالوں میں اس طرح پہلی بار چبھی تھی اسے ــــ تب جب وہ "میں جو کچھ کر رہی ہوں ٹھیک کر رہی ہوں" کے زعم سے باہر آ گئی تھی۔

"اللہ بڑا معاف کرنے والا بڑا رحیم ہوتا ہے زینی۔" وہ شاید پانچ چھ سال کی تھی جب اس نے پہلی بار اپنے باپ کے منہ سے سنا تھا۔ وہ

رات کو ان کے ساتھ سوتی تھی اور سوال پوچھ پوچھ کر ان کا کتنا وقت ضائع کرتی تھی اسے احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ "سب کو معاف کر دیتا ہے؟" اس نے باپ کے سینے سے سر اٹھا کر ضیاء کا چہرہ دیکھا۔

"ہاں سب کو" ضیاء نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسے۔

"کیونکہ وہ ہمارا رب ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ وہ ہم سے بڑی محبت کرتا ہے۔" انہوں نے اس کے ماتھے پر آئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کتنی محبت کرتا ہے؟" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"ستر ماؤں جتنی۔"

"آپ جتنی نہیں۔" وہ جیسے بے حد مایوس ہوئی۔

ضیاء کھلکھلا کر ہنستے رہے۔ انہوں نے اسے لپٹا لیا تھا۔

"ہاں میرے جتنی بھی بلکہ مجھ سے بہت زیادہ۔"

اس نے دوبارہ باپ کے سینے پر سر رکھ دیا پھر کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر سر اٹھایا اور برابر والے بستر میں سوئی نفیسہ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد بے حد مدھم آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے ضیاء سے کہا۔

"آپ کو پتہ ہے آج امی نے مجھے مارا ہے۔"

"کیوں مارا ہے میری بیٹی کو؟" ضیاء نے اس کا ماتھا چوما۔

"میں گلی میں کھیلنے گئی تھی جوتوں کے بغیر۔" اس نے محتاط آواز میں سوئی ہوئی نفیسہ کو دیکھتے ہوئے کہا اسے خدشہ تھا وہ سن رہی ہوں گی۔

"دوبارہ مت جانا۔" انہوں نے اس کا سر سہلایا۔

"اچھا۔ لیکن اللہ تو معاف کر دیتا ہے پھر امی نے کیوں مارا؟"

ضیاء جواب نہیں دے سکے اس نے جیسے انہیں مشکل میں ڈال دیا تھا۔

"تم نے امی سے معافی نہیں مانگی ہو گی اس لیے مار پڑی۔"

اس بار وہ سوچ میں پڑ گئی ضیاء نے اس کی چمکتی لمبی پلکوں والی خوبصورت آنکھوں میں جھلکنے والی الجھن دیکھی۔

"اللہ سے بھی تو معافی مانگنی پڑتی ہے ورنہ اللہ بھی ناراض ہو جاتا ہے۔"

"امی کی طرح؟"

"امی سے بھی زیادہ؟" "پھر اللہ سے معافی کیسے مانگتے ہیں؟" وہ بے حد پریشان ہوئی۔

ضیاء نے اسے اپنے سینے سے ہٹا کر اپنے بازو میں لٹاتے ہوئے کہا۔

"ایسے مانگتے ہیں۔ پہلے آنکھیں بند کرتے ہیں۔" انہوں نے اس کی آنکھیں بند کردیں۔ پھر اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو جوڑا۔

"آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑ کر اللہ سے کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے۔ تو بڑا معاف کرنے والا ہے۔" انہوں نے جیسے اسے دعا سکھائی۔

"اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے۔ تو بڑا معاف کرنے والا ہے۔" اس نے پہلی بار اٹک اٹک کر دعا کی تھی پھر آنکھیں کھولیں۔

"آنکھیں نہیں کھولتے۔ آنکھیں بند رکھتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔" ضیاء اب اسے سلانا چاہ رہے تھے۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ننھے ہاتھوں کو جوڑے ہونٹوں کے پاس کیے وہ شروع میں اٹک اٹک کر اور پھر روانی سے دعا کرنے لگی تھی اور اسی طرح سو گئی تھی۔

وہ اب بھی ہر روز رات کو بھیگی آنکھوں کے ساتھ دونوں ہاتھ باندھے وہی دعا کرتے سو جایا کرتی تھی۔ کئی سالوں کے بعد نیند کے لیے وہ نیند کی گولیوں اور شراب کی محتاج نہیں رہی تھی۔ کئی سال بعد بھی اسے نیند باپ کی سکھائی ہوئی دعا سے ہی آنے لگی تھی۔ نیند "آنے" لگی تھی یا نیند "کھلنے" لگی تھی۔

☆☆☆

"پری زاد" کسی نے بے یقینی سے کہا تھا زینی کے ہاتھ سے باکس چھوٹ کر گرتے گرتے بچا۔ ایک سال بعد پہلی بار اس نے کسی کے منہ سے پری زاد سنا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور فریز ہو گئی تھی۔ اگر کرم نے اتنے سالوں بعد اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا تھا تو اس نے بھی کرم کو ایک ہی نظر میں پہچان لیا تھا اور پھر اسے یک دم یاد آیا کہ اسے کرم کو نہیں پہچاننا تھا۔ وہ سٹور منیجر کے ساتھ کھڑا تھا کیلا ہوتا تو وہ۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ یہاں کام کر رہی ہیں۔" زینی نے ایک نظر سٹور منیجر کو دیکھا پھر مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کرم سے کہا۔

"سوری میں پری زاد نہیں ہوں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ دوبارہ شیلف پر سیریل کے ڈبے رکھنے لگی تھی۔

"I mistook you for a friend" کرم نے معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا۔ پھر سٹور منیجر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ زینی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ اتنی آسانی سے چلا گیا اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے اتنی آسانی سے اس کی بات پر اعتبار کر لیا یہ اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین بات تھی۔ لیکن بہرحال وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

اور کرم اس سٹور سے نکلتے ہوئے اس سٹور میں زینی کے بارے میں موجود تمام معلومات دیکھ کر گیا تھا۔ وہ کب سے کام کر رہی تھی اس کا کانٹیکٹ نمبر۔ اس کا ایڈریس۔

وہ بہت عرصے کے بعد اپنے اس ڈیپارٹمنٹل سٹور میں آیا تھا۔ اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے وہاں اس کی قسمت لے کر گئی تھی ورنہ پری زاد کا وہاں نظر آنا اور اس حالت میں نظر آنا۔ وہ پچھلے دو سال سے پری زاد کے شیراز کے ساتھ ہونے والے سکینڈل اور اس کے بعد اس کی گمشدگی پھر شوبز سے علیحدگی اور اس کی پاکستان سے چلے جانے کے بارے میں کی جانے والی قیاس آرائیوں کے بارے میں میگزینز میں پڑھتا اور چینلز پر

دیکھا آرہا تھا۔ کچھ جرنلسٹس کا خیال تھا پری زاد کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا اور وہ کسی دوسرے ملک میں ذہنی امراض کے کسی ادارے میں ایڈمیٹڈ تھی۔ کچھ کا خیال تھا کہ وہ کسی جاگیردار سے شادی کر کے کسی حویلی میں رہنے لگی تھی۔ اور کچھ کا خیال تھا کہ وہ کسی عربی شیخ سے شادی کر کے ملک چھوڑ گئی تھی۔ ان میں سے کوئی خبر بھی ایسی نہیں تھی جو کرم کے لیے خوشگوار ہوتی۔ اس کی شوبز سے گمشدگی کے بعد اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔ اس نے بھی انڈسٹری میں اپنے جاننے والے ہر شخص کے ذریعے اس کو ڈھونڈنے یا اس کی خیریت دریافت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پری زاد گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئی تھی... اور اب یک دم وہ اسی کے ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور میں اس کے اتنے قریب آ گئی تھی اور جس حالت میں وہ تھی اس نے کرم کو حیران کیا تھا۔ میک اپ اور جیولری سے بے نیاز چہرے کے ساتھ ڈیپارٹمنٹل سٹور کے مخصوص یونیفارم میں ملبوس وہ اب بھی خوبصورت لگ رہی تھی لیکن کہیں سے بھی وہ سپر سٹار نظر نہیں آ رہی تھی جس نے ایک دنیا کو اپنے گلیمر اور اداؤں سے دیوانہ کر دیا تھا۔

اس کے انکار کے باوجود وہ جانتا تھا کہ وہ پری زاد ہی تھی۔ سٹور میں اس کا نام "زینب" تھا۔ اس کے گلے میں لٹکے کارڈ پر بھی اس کا نام زینب ہی تھا۔ اور کرم اس کے اس نام سے واقف تھا۔ یقیناً وہ اپنے فلمی نام سے اپنی شناخت نہیں چاہتی تھی اور کرم نے اسے شناخت نہیں کیا تھا لیکن اسے سٹور میں اس طرح کام کرتے دیکھ کر وہ بری طرح بے چین ہوا تھا۔ رہی سہی کسر اس کے ایڈریس نے پوری کر دی تھی۔ وہ اوٹوا کے سستے ترین علاقے میں رہائش پذیر تھی۔ جہاں رہنے والے زیادہ تر لوگ سیاہ فام میکسیکن یا Spanish تھے۔ وہ کون سے حالات تھے جو اسے وہاں لے آئے تھے اور یوں چھپ کر رہنے اور معمولی کام کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ کرم حیران تھا... وہ ایک فلاپ ہیروئن ہوتی تو وہ یہ سب کچھ اس کی مجبوری سمجھتا لیکن وہ انڈسٹری کے ایک بڑے سکینڈل کے بعد لیکن سپر سٹار کی حیثیت سے ہی علیحدہ ہوئی تھی۔ کیوں؟ یہ کرم کو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

اس نے اس شام زینی کو فون کیا تھا۔ چند بیلز کے بعد کال ریسیو کی گئی اور پھر اس نے زینی کی آواز سنی "ہیلو میں کرم علی بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف یک دم خاموشی چھا گئی۔ پھر چند لمحوں بعد اس نے فون پر اس کی بے حد محتاط آواز سنی۔

"سوری میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"میں نے چند سال ایک فلم پروڈیوس کی تھی اور اس میں آپ نے کام کیا تھا اور اس سلسلے میں آپ یہاں آئی تھیں اور تب ہم دونوں ملے تھے۔" کرم نے اس کے جھوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بے حد تحمل سے اس سے اپنا تعارف کروایا۔ ردعمل فوراً ہوا تھا۔ کال ڈس کنیکٹ کر دی گئی تھی۔ وہ فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا... یعنی بات صرف یہ نہیں تھی کہ وہ اس سٹور میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی وہ اس سٹور کے باہر بھی اس کو پہچاننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا وہ اگر اس طرح رہنا چاہتی تھی تو وہ اسے اسی طرح رہنے دینا چاہتا تھا۔

اگلی صبح اس کے اس ڈیپارٹمنٹل سٹور کے منیجر سے بات کی۔ وہ زینی کو کچھ سہولتیں دینا چاہتا تھا لیکن بہتر یہی تھا کہ یہ سب کچھ اسے سٹور کے ذریعے سے ملتا۔ ایک بہتر پوسٹ اور پیکج کے ذریعے۔ لیکن اسے یہ جان کر دھچکا لگا کہ وہ کل ہی جاب چھوڑنے کے لیے نوٹس دے کر گئی تھی اور آج leave پر تھی۔ کرم کو یقین تھا اس نے یہ قدم کرم کی وجہ سے اٹھایا تھا۔ اس نے چند بار اسے کال کیا۔ اس کا سیل فون آف تھا۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ایڈریس پر چلا آیا۔ ....وہ زندگی میں شاید پہلی بار اس علاقے میں آیا تھا۔ اس کا اپارٹمنٹ تلاش کرنے میں اسے کچھ وقت لگا تھا۔ لیکن بہرحال وہ اس پرانی بلڈنگ کے 23 ویں منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتی تھی اور عمارت اندر سے اتنی بری نہیں تھی جتنی باہر سے لگ رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس کے ایڈریس پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے دروازے پر لگے ایڈریس کو دیکھا اور پھر ڈور بیل بجا دی۔ چند لمحوں بعد اسے قدموں کی چاپ سنائی دی کرم کے دل کی حرکت تیز ہو گئی۔ چاپ اب دروازے کے پاس آ کر رکی تھی پھر فش ہول میں سے یقیناً اس نے باہر جھانک کر دیکھا تھا اور اب کرم کے ذہن میں مختلف خدشات پیدا ہونے لگے تھے۔ اس کا ری ایکشن وہ بوجھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اچھا نہیں ہوگا یہ اسے یقین تھا۔ چند لمحے دروازے پر خاموشی رہی پھر دروازے کا لاک کھولا گیا اور چین ہٹا دی گئی۔

''اسلام علیکم۔ آئیے۔'' کرم اپنے قدموں پر فریز ہو گیا۔ کم از کم دروازہ کھلتے ہی وہ زینی سے یہ سننے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ دروازے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ لیکن آنکھوں میں خفگی بھی نہیں تھی۔ کرم جھجکتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ اتنا کنفیوزڈ تھا کہ سلام کا جواب بھی نہیں دے سکا۔

وہ ایک سادہ سی شلوار قمیض میں ملبوس تھی اور اس کے آنے سے پہلے کچن کا فرش mop کرنے میں مصروف تھی۔ اسکے بال بے حد بے ترتیبی سے ایک clip میں بندھے ہوئے تھے۔ آدھی سے زیادہ لٹیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ وہ اسے کل سے بھی زیادہ سادہ لگی تھی۔ ایک کمرے کا وہ اپارٹمنٹ بے حد چھوٹا تھا۔ وہ اس وقت سٹنگ ایریا میں تھا اور وہاں بے حد معمولی سا فرنیچر پڑا ہوا تھا گھر کو سجانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن بے حد معمولی، سستی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے۔

''بیٹھیں۔ کیا لیں گے آپ؟'' اس نے کرم کی محویت کو توڑتے ہوئے کہا۔

''میں... کچھ بھی؟'' کرم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

زینی کچن ایریا کی طرف چلی گئی تھی۔ کرم اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس طرح کافی کا ایک کپ تیار کرنے میں مصروف تھی جیسے ہمیشہ سے یہی کام کرتی آ رہی تھی۔

''میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا کہ آپ سے ملتا چلوں۔'' کرم نے بات شروع کرنے کی کوشش کی۔

''میں جانتی ہوں آپ ادھر سے نہیں گزر رہے تھے۔'' کرم چونکا وہ کافی تیار کرتے ہوئے کرم کو دیکھے بغیر بول رہی تھی۔

''آپ کے اور میرے علاقے میں اتنا فاصلہ ہے کہ آپ ادھر سے گزر ہی نہیں سکتے۔''

کرم خاموش رہا۔

زینی نے کافی کا مگ تیار کر لیا اور لا کر کرم کے سامنے رکھ دیا۔ وہ واپس کچن میں چلی گئی اور دوبارہ کچن کے فرش کو mop کرنے لگی۔ وہ کافی کا مگ ہاتھ میں لیے اسے دیکھتا رہا۔

''کب سے ہیں آپ یہاں؟'' کافی کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''جان کر کیا کریں گے؟'' وہ اسی طرح رگڑ رگڑ کر کلینزر کے ساتھ فرش صاف کرتی رہی۔ شاید فرش پر کوئی چیز گری تھی۔

''شوبز کیوں چھوڑ دیا؟'' کرم نے چند لمحوں بعد کہا۔

''پتہ نہیں۔'' اس کا سارا انہماک فرش پر تھا۔

کچھ دیر وہ خاموشی سے اسے دیکھتے ہوئے کافی پیتا رہا وہ اسی طرح فرش رگڑتی رہی۔ پھر کرم نے کہا۔

''میں کل آپ کو سٹور میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔''

''میری طرح۔'' مسکراہٹ ہلکی سی تھی۔ لیکن چہرے پر آئی تھی۔

''مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ آپ اونٹوا میں ہیں۔''

''اور مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ آپ کا سٹور تھا۔''

''اور پتہ چلنے پر آپ نے کام چھوڑ دیا؟''

''جب جانتے ہیں تو پوچھ کیوں رہے ہیں؟''

''کیوں؟''

''مجھے شناسا چہروں سے خوف آتا ہے اور آپ ایک شناسا چہرہ ہیں۔''

کرم کو اس کا جواب عجیب لگا۔

''میرا خیال ہے آپ کسی شناسا چہرے کا احسان لینا پسند نہیں کرتیں.... اس لیے۔''

زینی نے پہلی بار سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر مسکرائی۔

''چلیں آپ یہ کہہ لیں۔'' وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

''اس سٹور میں میں نے کام نہیں دلوایا تھا آپ کو.... میرا احسان کیسے ہوا یہ؟''

جواب نہیں آیا۔

''بہت egostic ہیں آپ۔'' کرم نے جیسے شکوہ کرنے والے انداز میں کہا۔

''مجھ میں اور بھی بہت سارے عیب ہیں۔'' اس کے جواب نے کرم کو خاموش کر دیا۔

''میں آپ کے عیب بتانے یہاں نہیں آیا۔'' چند لمحوں بعد اس نے کہا۔

''جانتی ہوں آپ یہاں سے گزر رہے تھے اس لیے یہاں آئے۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ کرم بے ساختہ ہنسا۔

اس نے فرش صاف کر لیا تھا۔ اب وہ چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

''اس طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں کیوں آ گئی ہیں؟''

چیزیں سمیٹتے ہوئے پل بھر کے لیے وہ رکی۔ پھر اسی انداز میں اس نے کرم سے کہا۔

"بیوی بچے کیسے ہیں آپ کے؟" واضح طور پر اس نے کرم کا سوال گول کیا تھا۔

"Divorce ہو چکی ہے میری۔"

زینی نے پلٹ کر کرم کو دیکھا پھر الماری میں چیزیں رکھتے ہوئے اسے بند کر دیا۔

"کیوں؟"

"اسے میں پسند نہیں تھا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے اب کرم کے سامنے پڑا مگ اٹھایا اور جا کر اسے دھونے لگی۔

"وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔"

مگ دھوتے دھوتے زینی نے گردن موڑ کر کرم کو دیکھا۔ وہ افسردہ نہیں لگ رہا تھا۔

"بہت برا ہوا۔"

"اس کے ساتھ؟"

"میں آپ کی بات کر رہی ہوں۔"

"نہیں اچھا ہوا۔ میری Divorce نہ ہوتی تو چند سالوں بعد ویسے بیوہ ہو جاتی وہ۔"

زینی نے حیرانی سے گردن موڑ کر کرم کو دیکھا۔ اس کو لگا وہ کوئی مذاق کر رہا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مجھے کینسر ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہی diagnose ہوا ہے۔"

زینی کے ہاتھ سے مگ بے اختیار چھوٹ کر سنک میں گرا اور ٹوٹ گیا۔

"آپ کا مگ ٹوٹ گیا۔" وہ سنک میں گرنے والا مگ اٹھانے کے لیے آیا تھا لیکن اس نے قدرے ندامت کے عالم میں مگ کے ٹکڑے نکالے یوں جیسے وہ مگ اس کے ہاتھ سے چھوٹا ہو۔ وہ شاکڈ انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ کیا کہے۔ کرم اس کے تاثرات سے محظوظ ہوا۔

"پلیز مجھے اس طرح مت دیکھیں جیسے کوئی بھوت ہوں۔" اس نے مگ کے ٹکڑے Trash میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"I, I am so sorry." زینی ہکلائی۔

"It's alright. میں آپ کو کسی بہتر جگہ پر جاب دلوا سکتا ہوں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو۔"

"Thank you لیکن میں پہلے ہی کسی اور جگہ پر کام ڈھونڈ چکی ہوں۔"

کرم خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

"میں آپ کے لیے یہ کچھ لے کر یہاں آنا چاہتا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ آپ برا مان جائیں گی۔"

"ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟" اس نے کرم کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"میں ٹریٹمنٹ نہیں کروا رہا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں اب جینا نہیں چاہتا۔" کرم کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا۔

"آپ اس طرح کیوں کہہ رہے ہیں ؟ آپ ایک اچھے انسان ہیں دنیا کو آپ کی ضرورت ہے۔" اسے کرم کی باتیں واقعی پریشان کر رہی تھیں۔

"کوئی بھی انسان "پوری دنیا" کے لیے نہیں جیتا صرف ایک انسان کے لیے جی سکتا ہے جو اس کی "دنیا" ہو اور میرے پاس وہ دنیا نہیں ہے۔"

زینی بول نہیں سکی۔

"میں آپ کے لیے دعا کروں گی۔" اس نے کچھ دیر بعد مدھم آواز میں کہا۔

"یہ اب نہ کریں۔ میرے مرنے کے بعد کیجیے گا۔" وہ اب اپنے والٹ سے کچھ نکال کر کچن کے کاؤنٹر پر رکھ رہا تھا۔

"خدا حافظ۔" وہ اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔

زینی اسے خدا حافظ نہیں کہہ سکی وہ صرف اسے جاتا دیکھتی رہی اسے کرم کی بیماری کے بارے میں سن کر واقعی بہت تکلیف پہنچی تھی وہ اچھا آدمی تھا۔

"تھا"... زینی نے خود ہے اپنی تصحیح کی... وہ "تھا" کا لفظ کیوں استعمال کر رہی تھی۔ اس کے لیے؟... وہ تو ابھی زندہ ہے۔ اس نے کاؤنٹر پر پڑا کارڈ اٹھا کر اس پر ایک نظر ڈالی وہ کرم کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ وہ شاید عادتاً چھوڑ گیا تھا وہاں... زینی نے کارڈ اٹھا کر دراز میں رکھ دیا۔ کرم نے اس دن اسے الجھا دیا تھا... بالکل ویسے ہی جیسے کئی سال پہلے... جب وہ اس سے پہلی بار ملی تھی... پتہ نہیں کیوں لیکن وہ اسے "مرد" نہیں لگتا تھا اور شاید اسی لیے ایک عجیب سی اپنائیت محسوس ہوتی تھی اسے اس سے حالانکہ اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے کے باہر یوں یک دم اسے کھڑا دیکھ کر وہ کچھ دیر کے لیے تو سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ کیا کرے۔ دروازہ کھولے نہ کھولے؟ بات کرے نہ کرے ؟ پہچانے نہ پہچانے؟ اندر بلائے نہ بلائے؟...

اور اب وہ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ وہ علاج کیوں نہیں کروا رہا تھا ایسا بھی کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ کہ۔

☆☆☆

اس رات کرم سو نہیں سکا۔ زینی جیسے اس کے ساتھ چل کر اس کے گھر اس کے بیڈروم اس کی آنکھوں میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ پہلے اس کا خیال آنے پر وہ میگزینز میں اس کی تصویریں دیکھتا۔ اس کی موویز دیکھتا۔ آج پہلی بار اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ باربی ڈول کی طرح سجے ہوئے اس کے وجود کو آج کی زینی نے کہیں چھپا دیا تھا۔ آج اداکاراؤں والی کوئی خوبی اس میں نظر نہیں آئی تھی اسے۔ وہ اسے ایک عام سی گھریلو لڑکی لگی تھی۔ ویسی ہی لڑکی جیسی وہ اپنی فیملی میں دیکھتا آ رہا تھا۔ اگر میک اپ میں چھپے چہرے کو بھلانا مشکل تھا تو اس سادہ چہرے کو بھی ذہن سے نکالنا دشوار تھا۔ بہت دفعہ اس کا دل چاہا وہ اسے فون کرے۔ اور ہر بار اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ وہ پتہ نہیں کیا سمجھتی۔ اور پھر؟ کرم نے کوئی اور توجیہہ بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن کوئی اور توجیہہ سمجھ میں نہیں آئی۔ دل تھا کہ جیسے مقناطیس کی طرح اس کی طرف جا رہا تھا اور ذہن تھا کہ اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور یہ۔ یہ اس کی زندگی میں دوسری بار ہوا تھا۔ پہلی بار بھی یہ زینی کو دیکھ کر ہی ہوا تھا۔

وہ اگلا سارا دن بھی صرف اسی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ آفس سے نکلتے ہوئے بے اختیار اس کا دل ایک بار پھر اس کے گھر جانے کو چاہا تھا۔ اس سے بات کرنے کو۔ اس کے ہاتھ کی کافی پینے کو۔ اس کافی میں اسے "گھر" والی مہک محسوس ہوئی تھی۔ ویسی مہک جیسی وہ اپنے دوستوں کی بیویوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی میں محسوس کرتا تھا۔ یا اپنی بھابھیوں اور بہنوں کی ہاتھ کی کافی میں۔ اور کبھی کبھی رزری کے ہاتھ سے بنی ہوئی کافی میں بھی۔

ایک عجیب سی اداسی نے گھر پہنچنے پر اسے گھیرا تھا جیسے وہ اس وقت غلط جگہ پر آ گیا تھا اسے کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔

اس نے نو بجے بالآخر اسے فون کر دیا تھا۔ بیل ہوتی رہی۔ کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ وہ بار بار فون کرتا رہا۔ اور message چھوڑے بغیر فون بند کرتا رہا اس نے کم از کم 25 بار اسے کال کیا تھا اور بہت غصہ بھی آیا اسے۔ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھ رہی تھی؟۔ اس پر ایکٹریسوں والے حربے آزما رہی تھی کہ وہ اسے avoid کرتی اور وہ خود ہی پیچھے بھاگتا آتا۔ وہ غصے میں پتہ نہیں کیا کیا سوچنے لگا تھا اس کے بارے میں۔ غصہ اب اسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنے لگا تھا۔ یہ پہلے نہیں تھا لیکن اب کرم کو خود بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ اسے کیا ہونے لگا تھا۔

پچھلے کئی ماہ سے اس کے اور اس کی فیملی کے درمیان رابطہ ہونے کے برابر تھا۔ صرف ماں تھی جس سے فون پر اس کی بات ہو جاتی تھی لیکن باقی کسی کے ساتھ تو یہ بھی نہیں تھا۔ اس کے گھر ہونے والے ڈنرز میں اب صرف اس کے کاروباری دوست ہی شریک ہوتے تھے۔ پہلے کی طرح اس کی فیملی کے لوگ نہیں۔ اور کرم نے آہستہ آہستہ انہیں انوائیٹ کرنا ہی بند کر دیا تھا۔

صبح تک اس کا موڈ اتنا خراب ہو چکا تھا کہ وہ آفس نہیں گیا۔ دوپہر تک سوتا رہا۔ دو بجے سو کر اٹھتے وقت بھی اس کا موڈ اسی طرح تھا۔ وہ اس دن کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ نائٹ سوٹ میں ہی ملبوس کپڑے تبدیل کیے بغیر اس نے ہاؤس کیپر کو کچھ ہدایات دیں اور پھر اپنے بیڈروم میں آ کر سیل آن کر کے messages اور کالز کا ریکارڈ چیک کرنے لگا۔ پہلے message نے اس کے وجود میں زندگی دوڑا دی تھی۔

"ہیلو کرم میں زینی بات کر رہی ہوں۔ میں رات کی شفٹ سے فارغ ہو کر ابھی آئی ہوں۔ آپ کی کال نہیں لے سکی۔ اگر آپ

اس ویک اینڈ پر کچھ وقت نکال سکیں تو میں ہفتے کو آپ کو لنچ کے لیے بلانا چاہتی ہوں ... خدا حافظ۔" کرم نے کم از کم دو سو بار اس message کو سنا۔ اس کا غصہ یک دم پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا ......بس اتنی ہی بات تھی جو اسے کل رات سے اپ سیٹ کر رہی تھی۔

ایک گھنٹے کے بعد اس نے زینی کے سیل پر پروگرام کنفرم کرنے کا message چھوڑا تھا۔ اور اس کے بعد اس نے اپنی سیکرٹری کو کہہ کر ہفتے کا کہیں اور شیڈولڈ لنچ کینسل کر دیا۔

ہفتے میں دو دن تھے اور ان دونوں دن کرم نے زینی کو فون کیا۔ پہلی کال دس منٹ کی تھی ... دوسرے دن کی جانے والی ایک گھنٹہ اور دس منٹ کی تھی۔

کرم نے زندگی میں پہلی بار کسی لنچ پر جانے کے لیے وقت کو گنا تھا۔

☆☆☆

وہ ہفتے کو ٹھیک ٹائم پر زینی کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا اور دروازہ کھلنے پر اس نے زینی کو پچھلی دفعہ سے بھی زیادہ خراب حلیے میں پایا تھا۔ ایپرن باندھے پانی میں شرابور اس نے قدرے حواس باختہ دروازہ کھولا اور پھر اسے کھلا چھوڑ کر کرم کی طرف ٹھیک سے دیکھے بغیر اسی طرح تیزی سے کہتی ہوئی واپس چلی گئی۔

"سنک کے tap کو کچھ ہو گیا ہے۔ میں پانی بند کرنے کی کوشش کر رہی ہو..... آپ آ جائیں اندر۔" آخری جملہ کرم تک جب پہنچا تھا تب تک وہ کچن میں غائب ہو چکی تھی۔ وہ بکے ہاتھ میں لیے کچھ دیر احمقوں کی طرح باہر کھلے دروازے کے سامنے کھڑا رہا پھر دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آ گیا۔ وہ ایک رینچ ہاتھ میں لیے سنک پر لگے ایک طرف کے tap کے نچلے حصے کو گھما کر اس پانی کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو پوری قوت سے سنک میں گر رہا تھا اور اس کے چھینٹے اس پر پڑ رہے تھے۔ وہ پرانی بلڈنگ تھی وہاں بے ڈھنگ پرانے طریقے کی ہوتی تھی یہ کرم کو پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ اور مناسب والوز کے بغیر پانی کو کسی مہارت کے بغیر بند کرنا مشکل تھا۔ بکے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے اس نے کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا اور اپنی آستین کھول کر اوپر کرتا ہوا سنک کے پاس آ گیا۔

"مجھے دیں ذرا میں دیکھتا ہوں۔" کرم نے رینچ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

زینی نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ کو یہ کام کہاں آتے ہوں گے ... آپ بیٹھیں میں بس کوشش کر رہی ہوں بند ہو جائے گا۔"

کرم مسکرایا ... "یہ کام کویت میں ڈیڑھ سال پلمبر کے طور پر کیا ہے میں نے۔"

زینی نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی کرم نے اس کے ہاتھ سے رینچ لے لیا ... پانچ منٹ میں اس نے tap اتار کر اس کے نیچے والے حصے کو کس کر پانی بند کر دیا تھا۔

"میں نے اپارٹمنٹ کے مالک کو فون کیا تھا لیکن اس کا فون آف ہے ... ویک اینڈ ہے شاید اس لیے available نہیں ہے ورنہ میں اس کو بتاتی ... ہر دوسرے چوتھے دن کچن اور باتھ روم میں کچھ نہ کچھ مسئلہ ہوتا ہی رہتا ہے ... " وہ قدرے خفگی کے عالم میں کرم کے پاس کھڑی اسے کام

کرتے دیکھتے ہوئے بتاتی رہی۔

"اپارٹمنٹ بدل لینا چاہیے آپ کو پرانی بلڈنگ ہے یہاں ایسے مسئلے تو ہوتے رہیں گے۔" کرم نے کام میں مصروف اسے مشورہ دیا۔

"نہیں بدل سکتی، یہ بہت سستا ہے۔" زینی نے کہا۔

کرم نے اس کا چہرہ دیکھا لیکن کچھ نہیں کہا وہ اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ وہ اب کچن رول لے کر ہاتھ خشک کر رہا تھا۔

"آپ کی شرٹ بھیگ گئی" زینی نے کچھ معذرت کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"ابھی خشک ہو جائے گی۔" کرم نے کہا اور کچن رول پھینکتے ہوئے اپنی آستین نیچے کرنے لگا۔ وہ اس کے برعکس زدہ بازوؤں کو بار بار دیکھ رہی تھی کرم نے محسوس کیا۔

"مجھے change کرنا ہوگا۔" وہ اپنا ایپرن اتار کر رکھتے ہوئے بولی پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے فریج میں سے ایک گلاس نکال کر کچن کاؤنٹر پر کرم کے پاس رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے قدرے حیران ہو کر پوچھا تھا لیکن جواب وہ جانتا تھا۔

"لیمونیڈ۔ آپ کو پسند ہے نا۔" وہ کہتے ہوئے کچن سے نکل گئی۔

کرم نے پلٹ کر اسے دیکھا وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا رہی تھی۔ اس نے گلاس اٹھا لیا۔ گلاس میں موجود مشروب کو پیتے ہوئے وہ سٹنگ ایریا کی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ جب تک اس کا مشروب ختم ہوا وہ لباس بدل کر آ چکی تھی۔

"یہاں اکیلی رہتی ہیں۔"

"ہاں۔"

کرم کو متوقع جواب ملا تھا۔ وہ اب کھانا سرو کرنے کی تیاری میں مصروف تھی۔

"آپ بتا رہے تھے آپ نے کویت میں ڈیڑھ سال پلمبنگ کا کام کیا۔"

"بھی کیا" کرم نے تصحیح کی۔

زینی نے حیرانی سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"اور کیا کیا کام کیے؟" زینی نے دلچسپی سے پوچھا کرم اس کے پاس چلا آیا اور اس نے اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیے۔

"انہیں دیکھ کر اندازہ لگائیں کہ ان ہاتھوں نے کیا کیا کام کیا ہوگا؟"

زینی نے بے حد اچنبھے سے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ ہتھیلیاں واقعی بہت سخت اور مشقت کرنے والے آدمی کے ہاتھوں جیسی تھیں۔ ان پر چھوٹے بڑے زخموں کے نشان بھی تھے اور ایسے نشان اس کی کلائیوں پر بھی تھے۔ زینی نے ایک گہرا سانس لیا۔

"تو زندگی کا سفر آسان نہیں رہا آپ کے لیے۔"

کرم نے ہاتھ ہٹا لیے۔ کاؤنٹر پر رکھا گلاس اس نے دوبارہ اٹھا لیا۔

"ہر چھوٹا بڑا کام کیا ہے میں نے زندگی میں... تو آئندہ کبھی آپ کو اس اپارٹمنٹ میں کسی کام کے لیے پینٹر... کارپینٹر، الیکٹریشن یا میسن کی ضرورت پڑے تو مجھے کال کر لیجیے گا... میں ویک اینڈ پر بھی available ہوتا ہوں۔" وہ بظاہر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

زینی مسکرائی نہیں تھی اس نے برتن میز پر لگانے شروع کر دیے۔

"آپ نے کیا کام ڈھونڈا ہے اب اپنے لیے؟"

"کھانا تیار ہے۔" زینی نے بات گول کر دی۔

کرم جان گیا تھا وہ گلاس رکھ کر ٹیبل کی طرف آ گیا۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کو کھانا پکانا آتا ہے۔" کرم نے بریانی اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے بھی کیا ہیں میرے بارے میں؟" زینی نے مسکراتے ہوئے رائتہ اس کی طرف بڑھایا۔

"آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں بس آپ کو نہیں جانتا۔"

"اس لیے اس ٹیبل پر بیٹھے ہیں آپ۔" وہ اب اپنی پلیٹ میں چاول نکال رہی تھی۔ اس کے نیل پالش کے بغیر تراشیدہ ناخنوں والے خالی ہاتھ کرم کو بڑے عجیب لگے تھے۔ زینی نے اس کی "توجہ محسوس" کی تھی۔

"آپ علاج کیوں نہیں کروا رہے؟"

کرم نے بے ساختہ نظریں ہٹا لیں۔ "بریانی دیکھنے میں بہت اچھی لگ رہی ہے۔" کرم نے مسکراتے ہوئے اپنی پلیٹ کو دیکھ کر زینی کو جیسے انفارم کیا۔

"علاج نہیں کروائیں گے تو مرض بڑھ جائے گا۔" وہ بے وقوف نہیں تھی۔

کرم نے جھک کر چاولوں کی مہک کو محسوس کیا۔

"خوشبو بھی بہت اچھی ہے۔"

"زندگی بڑی قیمتی شے ہے۔"

"اور اگر خوشبو اتنی اچھی ہے تو ذائقہ کیسا ہوگا۔" کرم نے پہلا چمچ منہ میں ڈالا۔

"کرم بات کو مت ٹالیں۔" وہ پہلی بار خفا ہوئی۔

"کون سی بات؟" وہ رک گیا۔

"میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ زندگی بڑی قیمتی شے ہوتی ہے۔" اس نے اپنے لفظوں پر زور دے کر کہا۔

"اچھا۔" وہ تلخی سے ہنسا۔

''مجھے تو اتنے سال پتہ ہی نہیں چلا کہ زندگی قیمتی ہوتی ہے۔''

''آپ جیسے لوگ ناشکرے اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔'' زینی کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا جملہ کرم کو اتنا مشتعل کر دے گا۔

کرم نے چمچ ہاتھ سے رکھ دیا۔

''سب کچھ؟... سب کچھ کیا؟''

''محبت، عزت، دولت، خونی رشتے، دوست... سب... کیا نہیں ہے آپ کے پاس؟''

''ہاں کیوں نہیں... سب کچھ تو ہے میرے پاس... دنیا کی ہر بڑی کرنسی میں بنک اکاؤنٹ... جس سے میں دنیا کے کسی ایک شہر میں کسی ایک عورت کی سچی محبت نہیں خرید سکتا۔ وہ بے حد تلخ ہو رہا تھا۔

''میں...'' زینی نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اب کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''خونی رشتے جو گدھوں کی طرح میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ میری جائیداد کے ٹکڑے کر سکیں۔''

''آپ...''

''دوست؟... جو کرم علی کو بینر رہانڈ سمجھتے ہیں... عزت؟... جو میرے کمرے سے باہر نکلتے ہی میری عیب جوئی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔''

''کرم آپ کھانا کھائیں۔'' زینی نے بات بدلنا چاہی لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''میں نے یہ کھانا آپ کے لیے بنایا ہے۔''

زینی نے اسے جتایا اور یہ ایک اور بڑی غلطی تھی وہ یک دم کرسی دھکیلتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میرے لیے کھانا بنایا؟ بہت بڑا احسان کیا مجھ پر لیکن یہ احسان مجھے مت جتائیں... میں آپ کے کھانے کا محتاج نہیں ہوں... اور نہ ہی مجھے ہمدردی کا فریب دینے کی ضرورت ہے... یہ ڈائیلاگز اور ایکٹنگ آپ اپنی فلم کے کسی ہیرو کے لیے رکھیں۔ میرے لیے نہیں۔'' وہ سن ہو گئی کرم اپنا کوٹ اٹھا کر کے بغیر دروازہ کھول کر چلا گیا تھا... وہ اپنی کرسی سے ہل تک نہیں سکی... اتنے مہینوں میں پہلی بار اس نے کسی سے اپنے لیے ہتک آمیز جملہ سنا تھا... وہ واقعی احمق تھی... کیا سوچ کر کرم علی سے بات کر رہی تھی... کیا سوچ کر اسے گھر پر بلایا تھا اس نے... کیا یہ سب کچھ سننے کے لیے؟... اور وہ کیا سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہمدردی کا ڈرامہ کر رہی ہے تاکہ اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے... وہ بہت دیر تک سن اعصاب کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی تھی۔

☆☆☆

اس سے غلطی ہوگئی تھی۔ اس کا احساس کرم کو اپنے گھر پہنچتے ہی ہوگیا تھا۔ وہ کس بات پر اس طرح اتنا برہم ہوگیا تھا اسے اب سمجھ نہیں آرہا تھا۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اس میں زینی کا کیا قصور تھا۔ اسے ندامت ہونے لگی تھی اور اسی احساس کے تحت اس نے زینی کو فون کیا فون کی گھنٹی کچھ دیر بجتی رہی پھر اس نے فون آف کر دیا تھا۔ وہ یقیناً اس وقت اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے وقفے وقفے سے کئی بار اس کا نمبر ٹرائی کیا اس کا فون مسلسل آف رہا تھا۔ کرم کو شدید پچھتاوا ہو رہا تھا۔

اگلے دن وہ اس کے گھر چلا گیا کئی بار بیل دینے کے باوجود دروازہ نہیں کھولا گیا تھا۔ وہ یقیناً شدید غصے میں تھی۔ وہ اگلے کئی دن اس کے اپارٹمنٹ جاتا رہا اس کو فون کرتا رہا اسے وہ نہیں ملی تھی۔ وہ جھنجلانے لگا تھا آخر ایسا بھی کیا کہہ دیا تھا اس نے کہ وہ اس کے ساتھ اس طرح کر رہی تھی وہ اسے بار بار message بھیج رہا تھا جو اتنے ہی بے سود ثابت ہو رہے تھے۔

ایک ہفتہ مسلسل اس کے لیے خوار ہونے کے بعد اس نے اگلا پورا ہفتہ اس سے کسی قسم کا رابطہ نہیں کیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا وہ ایک ہفتہ اس سے رابطہ نہیں کرتا تو کیا ہوتا۔ ایک ہفتہ بالکل آرام سے گزر گیا تھا اسے واقعی کچھ نہیں ہوا تھا۔ کوئی افاقہ کوئی بہتری کچھ نہیں۔ آٹھویں دن وہ ایک بار پھر اس کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑا تھا۔ اس بار اس نے بیل سے انگلی نہیں ہٹائی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ تک بیل ہوتی رہی اور جب کرم کو خدشہ ہونے لگا کہ بیل خراب ہو جائے گی تو دروازہ کھل گیا وہ کوٹ پہنے ہوئی تھی یقیناً باہر نکل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ لیکن غصہ نہیں تھا۔ وہ غصہ جو کرم expect کر رہا تھا۔ کرم کو اندر بلانے کی بجائے اس نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا اور چلنے لگی کرم بے حد خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"I am sorry." کرم نے لفٹ میں اس سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس کے لہجے میں بھی کسی ناراضگی کا شائبہ نہیں تھا۔ کرم کو تکلیف ہوئی اسے ناراض ہونا چاہیے تھا۔

"غلطی میری ہی تھی۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"نہیں میں نے زیادتی کی۔" کرم نے کہا زینی خاموش رہی۔ وہ دونوں اسی خاموشی میں چلتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" "گروسری کرنے کے لیے۔"

"کہاں؟" "دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر مارکیٹ ایریا ہے۔"

"میرے پاس گاڑی ہے۔" کرم نے آفر کی۔

"تو آپ جائیں۔"

کرم نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"میں آپ کے لیے کہہ رہا تھا۔"

"میں ایسے ہی جاتی ہوں۔"

کرم خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔

"میری غلطی اتنی بڑی تو نہیں تھی کہ آپ اتنا ناراض ہوئیں۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں ناراض ہوں؟ میں ناراض نہیں ہوں میں نے خوامخواہ کا مشورہ دیا تھا آپ کو آپ نے اچھا کیا مجھے بتا دیا یہ آپ کی زندگی ہے آپ اسے جو چاہے کریں جیسے بہتر سمجھیں کریں آپ کی زندگی میرا مسئلہ تو نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی ناراضگی بھی نہیں تھی اور یہ چیز کرم کو بری طرح ہرٹ کر رہی تھی۔ اس نے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا۔

مارکیٹ ایریا آ گیا وہ ایک ڈیپارٹمنٹ سٹور میں چلی گئی۔ اسے لمبی چوڑی گروسری نہیں کرنی تھی سیریل، سیڈڈ بریڈ، دودھ کی بوتل، انڈے liquid soap، ٹی بیگز کا ڈبہ اور چند اسی طرح کی دوسری چیزیں اس نے اٹھائیں اور till پر آ گئی۔ کرم خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا تھا۔ Till پر پہلی بار چیختے ہوئے اس نے والٹ نکال کر ادائیگی کی کوشش کی اور یہ پہلا موقع تھا جب اس نے زینی کو بری طرح خفا ہوتے پایا تھا۔

"آپ مجھے کیا سمجھ کر یہ بل دینے کی کوشش کر رہے ہیں؟" کرم کریڈٹ کارڈ ہاتھ میں لیے ہکا بکا رہ گیا تھا۔ وہ کیا سمجھ رہی تھی؟ وہ اب till پر بل کی ادائیگی کر رہی تھی۔ کرم اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سامان لینا چاہتا تھا لیکن اس کو ہمت نہیں ہوئی تھی۔

وہ دونوں ایک بار پھر اسی طرح خاموشی کے ساتھ چلتے ہوئے باہر آ گئے اور فٹ پاتھ پر ساتھ ساتھ کچھ دیر چلنے کے بعد زینی سے مزید برداشت نہیں ہو سکا۔

"آپ کو پتہ ہے ہم یوں بغیر وجہ کے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہوئے کتنے احمق لگ رہے ہیں۔"

"آپ مجھے بتا رہی ہیں یا میری رائے لینا چاہتی ہیں۔"

زینی نے ایک لمحے کے لیے رک کر اسے دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔ وہ ایک بار پھر چلنے لگی۔ کرم بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ اس بار کسی دوسری سڑک سے بلڈنگ کی طرف جا رہی تھی اور یہی وہ راستہ تھا جس پر موجود فٹ پاتھ پر کرم نے وہ پانچ فقیر دیکھے تھے۔ جنہیں بعد میں وہ باقاعدگی سے دیکھنے لگا تھا۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے زینی کو ہر فقیر کو جیب سے کوئی نہ کوئی سکہ نکال کر دیتے ہوئے دیکھا۔ وہ ان سے باقاعدہ ہیلو ہائے کر رہی تھی اور وہ اسے دیکھ کر یوں مسکرا رہے تھے جیسے اسے پہچانتے تھے۔ وہ راستے سے پانچ منٹ میں واپس اس کی بلڈنگ میں پہنچ گئے تھے۔ وہ یقیناً جان بوجھ کر اسے اس لمبے راستے سے لے کر گئی تھی۔

"ان بھکاریوں کو خیرات دے رہی ہیں تو مجھے معافی دے دیں۔" اس نے آخری فقیر کے گزر جانے کے بعد اس سے کہا۔

"آپ بھکاری نہیں ہیں۔" زینی نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"آپ بھکاری سمجھیں۔"

"لیکن میں تو آپ سے ناراض نہیں ہوں آپ نے وہی کیا جو ایک ایکٹریس کو کوئی کہہ سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں کرم کو پہلی بار ہلکا سا رنج نظر آیا۔

''میں نے آپ کو کبھی ایک ایکٹریس نہیں سمجھا۔'' وہ خاموشی سے چلتی رہی۔

''آپ کا چہرہ میرے لیے کانچ کی طرح چبھنے والی کسی یار کا چہرہ ہے۔''

زینی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''میں بھی نہیں۔''

''آپ کی شکل عارفہ سے بہت ملتی ہے۔ پہلی دفعہ آپ کو اس فیشن شو میں دیکھ کر عارفہ ہی سمجھا تھا میں اور عارفہ جیسا نظر آنے پر ہی میں'' کرم نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ورنہ میں کہاں شوبز کی کسی عورت میں دلچسپی لیتا۔''

''عارفہ کون ہے؟''

''میری منگیتر تھی۔ کئی سال اس کے ساتھ میری منگنی رہی۔''

''پھر...'' زینی نے اس کی بات کاٹی۔

''پھر آپ نے توڑ دی؟''

''نہیں اس نے توڑ دی۔''

''کیوں؟''

''وہ انتظار نہیں کر سکتی تھی اور مجھے اپنے بہن بھائیوں کے لیے ابھی بہت پیسہ کمانا تھا۔''

''آپ نے گھر والوں کو اس پر ترجیح دی... محبت نہیں ہوگی اس سے۔'' زینی کو کہتے ہوئے شیراز یاد آیا۔

''بہت محبت تھی لیکن ذمہ داریوں کا بوجھ اس سے بڑھ کر تھا۔''

''مرد کی زبان پر ہر وقت مجبوری کیوں ہوتی ہے؟... کندھوں پر ذمہ داریاں تھیں۔ بہنیں بیاہنی تھیں... ماں باپ نہیں مانتے تھے... وغیرہ وغیرہ۔'' وہ اب جیسے اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

وہ خاموش رہا۔

''اب پھر غصہ آ گیا ہوگا۔'' زینی نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

''نہیں غصہ کیوں آئے گا۔''

''پھر علاج کی بات پر کیوں آ گیا؟'' وہ رک گئی۔

''علاج کی بات پر نہیں آیا تھا... کسی اور بات پر آیا تھا۔'' کرم نے گہرا سانس لیا۔

''آپ کی ناراضگی ختم ہو گئی ہے؟''

"میری ناراضگی......؟" وہ سوچ میں پڑی۔

"آپ کو ہرٹ کرنا میں کبھی نہیں چاہوں گا لیکن پتہ نہیں کیا ہو گیا مجھے۔ بہت پچھتایا میں۔ کہنا کچھ اور چاہتا تھا لیکن پتہ نہیں کیا کیا کہہ دیا آپ سے۔" وہ اپنی ندامت کا اظہار کر رہا تھا۔ زینی نے اس بار اسے نہیں ٹوکا بات کرنے دی۔

اس نے اس دن اسے اپنے اپارٹمنٹ کے اندر نہیں بلایا۔ کرم نے کہا بھی نہیں۔ چند دن گزرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر زینی کو فون کیا تھا۔ پھر جیسے یہ روز کا معمول بن گیا تھا وہ اسے فون کرنے لگا تھا اور معمول کی اسی گفتگو کے دوران زینی نے اسے مجبور کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ آپریشن کروائے۔ وہ اس سے بحث تک نہیں کر سکا۔ اس نے آپریشن کروا لیا تھا اور اس آپریشن کی اطلاع ملنے کے بعد کئی ماہ بعد اس کا اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ رابطہ بحال ہوا تھا۔ ان میں سے ہر ایک باری باری اس کی عیادت کے لیے آیا تھا ان کے انداز میں گرم جوشی نہیں تھی جو کرم دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اتنی بے حسی بھی نہیں تھی جو وہ expect کر رہا تھا۔

اور آپریشن کے بعد زینی بھی اس سے ملنے آئی تھی اور پہلے ہی دن اس کا سامنا کرم کے بھائی اور ماں سے ہو گیا تھا۔ وہ کرم کے کمرے سے نکل رہے تھے اسے دیکھ کر وہ دونوں حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ "پری زاد" وہاں کیا کرنے آئی تھی اور کرم کی زندگی میں وہ کب سے تھی اس کا اندازہ وہ نہیں لگا سکے تھے لیکن یہ اندازہ انہوں نے لگا لیا تھا کہ کرم کی اس "خود غرضی" اور "تبدیلی" کے پیچھے وہی تھی ورنہ کرم ایسا تو نہیں تھا جیسا اب ہو گیا تھا۔

زینی کا استقبال انہوں نے اتنی ہی سرد مہری سے کیا جتنا وہ کر سکتے تھے اور زینی کو بے اختیار وہاں آنے پر پچھتاوا ہونے لگا۔ انہیں اس کا وہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا یہ سمجھنے میں اسے وقت نہیں ہوئی تھی لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ آ چکی تھی۔

اس کے کمرے میں داخل ہوتے وقت وہ بری طرح ڈسٹرب تھی اور کرم نے یہ چیز چند منٹوں میں اس سے باتیں کرتے ہوئے نوٹ کر لی تھی۔

"نہیں۔ کچھ نہیں ہوا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں بس کچھ سوچ رہی تھی۔" اس کے پوچھنے پر زینی فوراً سنبھل گئی تھی۔ کرم کے اصرار کے باوجود وہ یہ ماننے پر تیار نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی بات پر اپ سیٹ تھی۔

وہ دوبارہ ہاسپٹل اسے دیکھنے نہیں گئی۔ نہ ہی وہ اس کے ڈسچارج ہونے کے بعد اس کے گھر اس کی عیادت کے لیے گئی۔ وہ ان نظروں اور ان سوالات کا دوبارہ سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی جن کا سامنا اس نے ہاسپٹل کے کوریڈور میں کیا تھا۔ کرم سے اس کی بات فون پر ہوتی تھی اور اس کے بار بار کہنے کے باوجود وہ اس کی عیادت کے لیے آنے پر تیار نہیں ہوئی۔ ہر بار اس کے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ تھا۔

☆☆☆

"یہ پری زاد سے کب سے ملنے لگے ہو تم؟" وہ اپنی ماں کی بات پر چونک گیا تھا۔ زینی کے بارے میں انہیں کیسے پتہ چلا تھا؟ اس نے تو اس کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اب اس کی ماں اس کے ہاسپٹل سے گھر آنے پر اس کے پاس رہنے کے لیے آئی تھی اور چند دن گزرتے ہی اس نے کرم سے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

"آپ سے کس نے کہا؟" کرم نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔

"مجھ سے کون کہے گا؟ میں اور آصف خود ملے ہیں اس سے تم کو دیکھنے ہاسپٹل آئی تھی وہ۔" کرم بول نہیں سکا۔ اس کے ذہن میں جیسے بجلی سی کوندی تھی۔ یقیناً وہ اس دن ان لوگوں سے ملنے کی وجہ سے ہی اپ سیٹ تھی اور اس کے دوبارہ عیادت کے لیے نہ آنے کی وجہ

"تم نے بتایا نہیں یہ یہاں کینیڈا کیوں آ گئی ہے؟" اس کی ماں نے اب اپنا سوال بدلتے ہوئے کہا۔

"ہر سال لاکھوں لوگ کینیڈا آ جاتے ہیں۔ پھر کیا مجھے بتاتے ہوں گے کہ کیوں آئے ہیں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم نے بلایا ہے اسے۔ اسی کی وجہ سے تم اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ یہ سب کر رہے ہو۔" وہ بے حد خفگی سے کہنے لگی تھیں۔

کرم نے آنکھیں بند کر لیں۔ انہیں اس چیز کا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ ابھی بستر پر پڑا تھا بیمار تھا ان کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ آپریشن ہو گیا۔ وہ گھر آ چکا تھا۔ اب ایک بار پھر پہلے والا سلسلہ شروع کیا جا سکتا تھا۔

"یہ اداکارائیں بہت بری عورتیں ہوتی ہیں۔ یہ مردوں کو الو بناتی ہیں۔ انہیں فریب دیتی ہیں۔ جھوٹی باتیں کرتی ہیں۔ ان کی نظریں مردوں کی جیب پر ہوتی ہیں۔ جب مطلب پورا ہو جائے تو پلٹ کر بھی نہیں دیکھتیں یہ۔"

"ہر عورت یہی کرتی ہے وہ اداکارہ ہو یا نہ ہو اس سے فرق نہیں پڑتا۔" وہ بڑبڑایا۔

اس کی ماں کو سمجھ نہیں آئی۔

"اور یہ پری زاد تو ہے ہی آوارہ... تم نے..."

کرم نے ماں کو ٹوکا۔ "میں سونا چاہتا ہوں مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس کی ماں کو بادل نخواستہ خاموش ہونا پڑا۔ کرم نے ماں کے کمرے سے نکلتے ہی آنکھیں کھول دیں۔

☆☆☆

وہ اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ اپنے گھر پر ان دنوں آپریشن کے بعد آرام کر رہا ہوگا۔ آپریشن خطرناک نہ سہی لیکن اس کے باوجود اس کے پشت اور کمر سے تین جگہوں سے گلٹیاں نکالی گئی تھیں۔ اصولی طور پر اسے ابھی آرام کرنا چاہیے۔

"مجھے آپ کی سمجھ نہیں آتی کرم۔" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے بے حد خفگی کے عالم میں اس سے کہا تھا۔

"اندر آ سکتا ہوں؟" کرم نے اس کو ٹوکا۔ وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی لیکن اس کے چہرے سے خفگی نہیں گئی تھی۔

"آپ کو اس وقت آرام کرنا چاہیے گھر پر بیٹھ کر۔ اور آپ اتنی لمبی ڈرائیو کر کے یہاں۔"

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ کرم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اگر آپ میری عیادت کے لیے نہیں آئیں گی تو پھر مجھے ہی آنا پڑے گا۔" کرم نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"میں آئی تھی آپ کی عیادت کے لیے۔ اب روز روز تو کوئی نہیں آتا عیادت کے لیے۔" زری نے بے ساختہ کہا۔

''آپ کے کہنے پر آپریشن کروایا ہے میں نے ۔۔۔اور آپ کو اتنی بھی دلچسپی نہیں ہے کہ آپ میری عیادت کے لیے آ سکیں۔'' کرم کے انداز میں گلہ تھا۔

زینی بول نہیں سکی۔

''بیٹھیں۔'' اسے خیال آیا وہ اب تک کھڑا تھا وہ آگے بڑھ کر صوفہ پر بیٹھ گیا۔

''کیسے ہیں اب آپ؟''

''جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔''

''میں آپ کی صحت کا پوچھ رہی ہوں۔''

''آپ کو کیسا لگ رہا ہوں؟''

''بہتر لگ رہے ہیں۔''

''آپ کے گھر بیٹھا ہوں اس لیے۔''

''کیا لیں گے آپ؟'' وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

''کچھ نہیں۔''

''کیوں؟'' وہ ٹھٹھکی۔

''جس طرح آپ کو کسی کا احسان پسند نہیں ہے مجھے بھی نہیں ہے۔''

زینی نے ایک لمحے کے لیے حیرانی سے اسے دیکھا پھر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

''اس سے پہلے تو کھانا کھانے بیٹھ گئے تھے۔ ۔۔۔اس وقت کیوں خیال نہیں آیا کہ آپ کو میرا احسان نہیں لینا۔''

''اس وقت حالات دوسرے تھے۔'' کرم اب بھی ویسا ہی سنجیدہ تھا۔

''نہیں تو نہ سہی ۔۔۔آپ کا کیا خیال ہے میں آپ کی منتیں کروں گی۔'' وہ آ کر دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''نہیں مجھے یقین تھا آپ اسی طرح صوفے پر آ کر بیٹھ جائیں گی۔''

زینی چند لمحے کچھ کہے بغیر اسے دیکھتی رہی پھر کھلکھلا کر ہنسی۔

''تم بڑے عجیب آدمی ہو۔''

''تم؟'' کرم کو اس کا انداز تخاطب بدلنا اچھا لگا۔

''میں آپ صرف ان مردوں کو کہتی ہوں جن کی عزت نہیں کرتی۔''

اس بار کرم اس کی بات پر ہنسا۔

"لیکن میں ان کو کہتا ہوں جن کو غیر سمجھتا ہوں۔"

کچھ دیر تک دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے رہے پھر کرم نے کہا۔

"میری امی یا بھائی نے تمہیں ہاسپٹل میں کچھ کہا تھا؟"

وہ چونکی پھر اس نے بظاہر نارمل لہجے میں کہا۔

"مجھ سے کیا کہیں گے وہ؟ مجھے تو ٹھیک سے جانتے بھی نہیں وہ۔"

"میں نہیں مان سکتا تم اسی وجہ سے دوبارہ مجھے ملنے ہاسپٹل نہیں آئی۔"

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر اس نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں سب کچھ چھوڑ کر لوگوں کی نظروں سے چھپ کر یہاں بیٹھی ہوں بہت مدت کے بعد بہت سکون میں ہوں میں اب اپنے آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں چاہتی جو مجھے پھر کسی دلدل میں گھسیٹے۔ میری قوت برداشت کم ہو چکی ہے کرم ان کی آنکھوں میں شک، حقارت بہت کچھ تھا میرے لیے اور میں نظریں اور لہجے پہچاننے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہو گئی ہوں ہتک کے ایک احساس نے مجھے ایک کنویں میں کودنے پر مجبور کر دیا تھا میں اب دوبارہ کسی کنویں میں کودنا نہیں چاہتی تم اچھے آدمی ہو لیکن تم میرے "کوئی نہیں" ہو ہم دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی رشتہ نہیں ... اور بس یہی تعلق ہے ہمارا... میں نہیں چاہتی کوئی منہ کھول کر مجھ سے تمہارے بارے میں ایسے سوال کرے جن کے جواب میرے پاس نہیں ہیں۔" وہ بے حد صاف گوئی سے کہہ رہی تھی اور کرم کو اس کی یہ صاف گوئی تکلیف پہنچا رہی تھی۔ وہ بہت پہلے ہی اس کے ساتھ کسی ممکنہ تعلق کو رجیکٹ کر رہی تھی یعنی وہ کرم کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ اگر وہ ایسا کچھ سوچ بھی رہا ہے تو بھی نہ سوچے کیوں؟ اس لیے کیونکہ زری کی طرح وہ بھی کسی معمولی شکل کے برص زدہ اور کینسر زدہ آدمی کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ عمر کا فرق بھی اس کے ذہن میں ہوگا۔ وہ اس سے دگنی عمر کا نہ سہی لیکن بہرحال کافی بڑا تھا۔ پھر کرم اپنے آپ کو خواہ مخواہ کسی فریب میں گرفتار کیوں کر رہا تھا۔ رجیکشن تکلیف دہ ہوتی ہے لیکن اتنی بھی رجیکشن کرم وہاں بیٹھے اس کی باتیں سنتا ہوا اس کی ہر بات کو اپنا مفہوم پہنا رہا تھا۔ اور تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ اب خاموش ہو گئی۔ شاید منتظر تھی کہ کرم کچھ کہے گا لیکن کرم کچھ کیسے کہتا۔ بات کرنے کے لیے اس وقت بڑا حوصلہ چاہیے تھا۔

"میں چلتا ہوں کچھ کام ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ یہ جیسے راہ فرار تھی۔

"اوکے and get well soon." وہ جیسے بالواسطہ اس سے دوبارہ وہاں نہ آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

وہ اس کے اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا اس کے ساتھ زندگی میں بہت بار روشنی دیکھ کر وہ اندھیرے میں گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیوں محبت کی خواہش میں یوں لوگوں کے پیچھے بھاگتا تھا... لوگوں کے پیچھے؟... زینی لوگ نہیں تھی۔

وہ واپسی پر تمام راستے پتہ نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔

☆☆☆

اگلے کئی ہفتے کرم نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ کوئی فون، کوئی message کوئی visit نہیں... وہ یک دم جیسے غائب ہو گیا تھا اور زینی کو جیسے حیرانی ہوئی تھی... حیرانگی یا بے چینی؟... وہ طے نہیں کر پائی... لیکن کئی دن لاشعوری طور پر وہ اس کی کال اس کے message یا ویک اینڈ پر اس کے خود چلے آنے کی منتظر رہی... پھر آہستہ آہستہ زندگی پھر پہلے جیسے معمول پر آ گئی تھی... ویسے معمول پر جو کرم کے آنے سے پہلے تھا... اس نے اس کی زندگی میں ایک ہلکی سی ہلچل ضرور پیدا کی تھی لیکن کوئی بھنور پیدا کرنے سے پہلے ہی چلا گیا... بالکل کئی سال پہلے کی طرح۔

دو ڈھائی مہینے کے بعد یہ اس کی سالگرہ کا دن تھا جب اسے کرم کی طرف سے ایک کیک اور پھول ملے... اسے خود بھی یاد نہیں تھا کہ یہ اس کی سالگرہ کا دن تھا... کچھ دیر کے لیے وہ ٹھٹھکی تھی... اور وہ سوچ رہی تھی وہ اسے اپنے ذہن سے نکال چکا تھا... شوبز سے علیحدگی کے بعد یہ دوسری سالگرہ تھی جو اس طرح خاموشی سے کسی ہنگامے کے بغیر گزری تھی... ورنہ اس سے پہلے... ماضی کسی جھماکے کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے آیا تھا... ماضی جو عجیب سی ٹیسیں اٹھانے لگا تھا اس کے وجود میں۔

کئی ہفتوں کے بعد اس دن پہلی بار اس نے کرم کو فون کیا... کئی بار بیل ہونے پر بھی فون نہیں اٹھایا گیا... اس نے message نہیں چھوڑا... ہلکی سی خفگی کے ساتھ فون رکھ دیا تو وہ اب اس کے ساتھ وہی کر رہا تھا جو وہ اس کے ساتھ کرتی رہی تھی۔

فون رکھنے کے پانچ منٹ بعد ہی اس کی کال آ گئی تھی۔

''میں دوسرے فون پر تھا... Happy Birthday'' اس نے چھوٹتے ہی کہا ''اس کی ضرورت نہیں تھی کرم۔''

''جانتا ہوں... تم بہت self-reliant ہو... تمہیں کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے... لیکن میرے جیسے لوگ اس طرح کی favours اس لیے کرتے ہیں تاکہ شاید کبھی کوئی جواباً ایسی favours لوٹا دے۔'' اس نے زینی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا۔

زینی کی سمجھ میں نہیں آیا اسے کیا کہے۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہوں میں۔''

''علاج کروا رہے ہو نا؟''

''کوشش کر رہا ہوں'' جواب مختصر تھا۔ وہ کچھ اندازہ نہیں لگا سکی۔

''کوئی تحفہ بھی بھیجنا چاہتا تھا میں... لیکن تمہارے ناراض ہونے کے خدشے سے نہیں بھیجا۔''

''بہت اچھا کیا... کیک اور پھول کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میری پیدائش کا دن ایسی خوشی کا دن نہیں ہے۔'' اس نے بے ساختہ کہا اور پچھتائی ایسی بات کرم سے کہنے کا کیا فائدہ تھا۔

''یہ صرف تمہارا خیال ہے''

''بس میں شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی اس لیے فون کیا۔'' اس نے بات بدلنا چاہی۔

"بہت دن ہو گئے ہمیں ملے۔ اگر تم کو برا نہ لگے تو میں اس ویک اینڈ پر...." وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

وہ خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"میں فری ہوں تم آسکتے ہو۔"

"کہیں باہر ملتے ہیں زینی۔" اس نے کہا تھا۔

زینی نے اقرار کر لیا۔ فون رکھنے کے بعد وہ بہت دیر پریشان بیٹھی رہی۔ آخر اس نے انکار کیوں نہیں کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ اس ویک اینڈ پر کسی پارک گئے۔ تین گھنٹے وہاں بیٹھے بے مقصد باتیں کرتے رہے۔ ہر جملہ بولنے کے بعد اس پر پچھتاتے ہر لفظ کہنے پر سوچتے یہ کیوں کہا۔

وہ جیسے اپنے اندر کو ایک دوسرے کی نظروں سے چھپانے کی کوشش میں بے حال ہو رہے تھے۔ دونوں اپنے اردگرد دیواریں کھینچنے، خندقیں کھودنے میں لگے تھے۔ جو انہیں ایک دوسرے کی طرف جانے سے روک دیتی۔ لیکن ہر بار کی طرح اس بار بھی ایک دوسرے سے ملتے ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہی خوشی کے جس احساس سے وہ دوچار ہوتے تھے اسے جھٹکنا اسے جھٹلانا بہت مشکل تھا۔

اس دن بھی تین گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد وہ دونوں دوبارہ اپنی اپنی دنیا میں چلے گئے تھے اور اپنی اپنی دنیا میں جاتے ہی انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ "اپنی دنیا" سے نکل آئے تھے۔ اس بار اس سے دوبارہ رابطہ کرنے میں پہل کرم نے کی تھی۔

پہل نہیں کی تھی جیسے ہار مان لی تھی۔ زینی کو زندگی سے نکال دینا بڑا مشکل تھا۔ کم از کم اس زندگی سے جواب رہ گئی تھی۔ کوئی اور رشتہ نہیں وہ دوست تو رہ سکتے تھے۔ بات تو کر سکتے تھے۔ مل تو سکتے تھے۔ آنکھیں بند کر کے یہ سوچ لینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کے شہر میں اس سے چند میل کے فاصلے پر رہتی ہو اور وہ اس سے مکمل طور پر کٹ کر رہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ زینی کے بیے یہ آسان تھا۔ اور زینی کے لیے یہ شروع میں واقعی آسان تھا..... اس تنہائی میں جینا جس میں وہ جی رہی تھی اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ اس کی عادی تھی۔ لیکن پھر یہ عادت بدلنے لگی تھی۔ غیر محسوس طور پر غیر ارادی طور پر وہ اس کے وجود کی عادی ہونے لگی تھی۔ اس کے فون پر کسی غیر کی آنے والی وہ واحد کال تھی۔ واحد message اور ہر بار بیل ہونے پر بنا دیکھے بھی وہ پہچان جاتی تھی کہ وہ کرم تھا۔ اور ہر بار اس سے بات کرنے کے بعد اس سے ملنے کے بعد وہ بہت دیر بیٹھ کر سوچتی رہتی تھی کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ اور پھر کرم کی طرح اس نے بھی خود کو یہ بتانا شروع کر دیا تھا کہ وہ صرف اس کا دوست تھا۔ اور کچھ نہیں۔ بس فرق یہ تھا کہ کینیڈا میں کرم کے اور بھی بہت سے دوست تھے اور کرم کے علاوہ زینی کا کوئی نہیں۔ کون کس کے "ہونے یا نہ ہونے" کو زیادہ محسوس کرتا تھا یہ دونوں کے لیے طے کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور مزید مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''فلم انڈسٹری کیوں چھوڑ دی؟'' کرم نے کئی مہینوں کے بعد اس سے وہ سوال کیا تھا جو اسے پہلے دن سے پریشان کر رہا تھا۔ اور اس بار اسے خاموشی نہیں ملی تھی۔ جواب ملا تھا۔ مبہم سہی مگر جواب تھا۔

''بس چھوڑ دی۔ زندگی میں جو مقصد تھا وہ ختم ہو گیا اور جب وہ ختم ہوا تو پتہ چلا کہ وہ تو کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔'' وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ کیا کیا تھا جو یاد نہیں آ گیا تھا۔ کرم بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ میک اپ سے مبرّا اس چہرے کو پڑھنا بڑا آسان تھا۔ رنج، دکھ، خوشی، تکلیف سب کچھ دیوار پر لکھی ہوئی تحریر کی طرح ہوتا۔

''کیا مقصد تھا؟'' اس نے پوچھا وہ بہت دیر سر جھکائے اسی طرح دونوں ہتھیلیوں کو دیکھتی رہی۔

''بتانا نہیں چاہتی؟'' کرم نے بالآخر کہا۔

''بتا نہیں سکتی۔'' اس نے بالآخر سر اٹھایا۔

کرم کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

''شیراز کون تھا؟''

زینی کو کرنٹ لگا۔ کرم اسے کیسے جانتا تھا۔

''تمہارا آخری سکینڈل اسی کے ساتھ بنا تھا۔ نیوز پیپرز میں تمہارے بیان آتے رہے کہ وہ کبھی تمہارا منگیتر تھا۔ اور شاید کزن بھی؟ .... کون تھا وہ؟''

''ایک فریب اور دھوکہ جو میں کئی سال اپنے آپ کو دیتی رہی۔'' وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ 23 منزل کی اس کھڑکی سے کبھی کبھار کچھ نظر ''نہیں'' آتا تھا... اور وہ اسی لیے؟ وہاں آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ مدھم آواز میں کرم کو سب کچھ بتاتی گئی۔ سب کچھ ... زینب سے پری زاد بننے تک کی کہانی ... کرم بڑی خاموشی سے کوئی مداخلت کیے بغیر سنتا رہا تھا۔ کوئی جیسے اس کے سامنے اس کی کہانی کہہ رہا تھا۔

''تم بہت عجیب ہو زینی۔'' اس نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔

زینی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''عجیب نہ ہوتی تو اس حال کو پہنچتی میں؟''

کرم کو اس پر بے تحاشا ترس آیا۔

''تم نے خود پر بڑا ظلم کیا۔'' وہ اٹھ کر اس کے پاس کھڑکی میں آ گیا وہ ایک بار پھر باہر دیکھ رہی تھی۔

''پتہ نہیں اپنے آپ پر زیادہ ظلم کیا یا اپنے باپ پر یا اپنے گھر والوں پر'' اس نے اتنے مہینوں میں پہلی بار اس کی آنکھیں بھیگتے دیکھی تھیں۔

"میری ضد ان سب کی زندگیوں کو کھا گئی — غربت تھی — کچھ بھی نہیں تھا۔ پر بڑا سکون تھا ہمارے گھر میں — بڑی برکت تھی ہمارے رزق میں۔" وہ کھڑکی سے باہر جیسے کسی خلا میں دیکھ رہی تھی۔ ماضی کبھی کبھار خلا بن جاتا ہے۔

"ہم سب بڑے خوش تھے اپنے گھر میں۔ اپنی زندگیوں میں۔ ساری دنیا میں پھری ہوں میں۔ مہنگے سے مہنگا کھانا کھایا ہے میں نے۔ لیکن اپنے باپ کے گھر سوکھی روٹی اور پیاز کے لقمے کا ذائقہ نہیں بھول سکی میں۔ ویسا کھانا کہیں نہیں کھایا میں — اس لقمے کی یاد ہر کھانے کو بے مزہ کر دیتی ہے میرے لیے۔" اس کی آنکھوں میں پانی تھا کہ امڈتا ہی آ رہا تھا۔

"مہنگے سے مہنگا لباس پہنا میں نے لیکن جو خوشی اپنے باپ کے لائے ہوئے چند سو کے معمولی سے جوڑے کو پہن کر ملتی تھی ویسی خوشی دوبارہ نہیں ملی۔ اپنے باپ کے دو کمرے کے گھر جیسی عزت اور تحفظ کسی کے "محل" میں نہیں ملا مجھے۔ ...ہر گاڑی میں بیٹھی ہوں میں لیکن اپنے باپ کی سائیکل کو نہیں بھول سکی میں۔" وہ آنسو نہیں تھے وہ نہ ختم ہونے والا پچھتاوا تھا۔ جس کے ساتھ وہ جی رہی تھی۔

"لوگ کہتے ہیں ناولاد آزمائش ہوتی ہے۔ میں اپنے باپ کی آزمائش تھی۔ بہت بڑی آزمائش۔ شیراز نے ہمارے گھر کو نہیں توڑا۔ یہ میں تھی جس نے سب کچھ برباد کیا — میں یوں ضد میں پاگل نہ ہوتی تو۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا مجھے۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ بس صبر نہیں ہوا مجھ سے۔ صبر کبھی بھی نہیں کر سکی میں۔" آنسو اب اس کے گالوں پر پانی کے دھاروں کی طرح بہہ رہے تھے۔

"عبادت بڑی کی میں نے ....نماز، روزہ، صدقہ، خیرات سب۔ شکر بھی بہت کیا میں نے۔ پر صبر کرنا مجھے کبھی نہیں آیا۔ میرا باپ بہت بار کہتا تھا مجھ سے۔ آسائش میں شکر کرنا چاہیے آزمائش میں صبر کرنا چاہیے۔ میں سوچتی رہتی تھی اتنی آزمائشیں تو پہلے ہی ہیں۔ زہرہ آپا کے مسئلے، غربت۔ صبر تو پہلے ہی کر رہے تھے ہم سب۔ پر وہ میری آزمائش نہیں تھیں۔ وہ زہرہ آپا کی آزمائش تھی۔ ابو کی آزمائش تھی۔ میری آزمائش تو وہی ایک آئی تھی جس پر میں صبر نہیں کر سکی۔"

اس نے سر جھکایا ہوا تھا۔ شکست خوردہ انداز میں۔ آنکھوں سے بہنے والا پانی اب اس کی ٹھوڑی سے ٹپک رہا تھا۔

"ابو کی بات سننی چاہیے تھی مجھے.... ماننی چاہیے تھی۔" اس کی آواز میں پچھتاوے سے زیادہ اذیت تھی — اذیت سے زیادہ پچھتاوا تھا۔

"جانتے ہو ڈیفنس میں میرے پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے میرا گھر کس نے خریدا ہے؟ ...ابو کے اسی دوست کے بیٹے نے جو ابو کے ڈیپارٹمنٹ میں کلرک تھا اور ابو جس کے ساتھ میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ اس نے انہی دنوں نوکری چھوڑ کر کوئی کاروبار کر لیا تھا۔ بہت پیسہ ہے اب اس کے پاس بھی۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ وہ میرا گھر خرید رہے ہیں۔ پتہ چلا تو وہ لوگ ملنے آئے۔ میرے ابو کی بہت عزت کرتے ہیں وہ لوگ۔ آج بھی۔ میں ان کے گھر کی بہو ہوتی تو وہ مجھے بھی اتنی ہی عزت دیتے۔ دس سال لگتے لیکن یہ ساری آسائشیں جائز طریقے سے میرا مقدر بنتیں۔ یوں سب کچھ گنوا کر خالی ہاتھ نہ کھڑی ہوتی میں۔ لیکن مجھے بڑی جلدی تھی — انسانوں کو بڑی جلدی ہوتی ہے۔"

کرم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم نے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ وہ سب کچھ جو غلط تھا جو تمہارے ابو نہیں چاہتے تھے کہ تم کرو۔ تم پھر

پہلے کی طرح ہو چکی ہو۔ حلال رزق کھانے والی... برائی سے بچنے والی... عبادت کرنے والی۔" وہ اس کی بات پر روتے روتے ہنسی۔

کرم کی طرف مڑتے ہوئے اس نے اپنے کندھے سے کرم کا ہاتھ ہٹا دیا۔ وہ اب اس کے مقابل تھی۔

"یہ ایسے نہیں ہوتا جیسے تم کہہ رہے ہو... کچھ بھی پہلے جیسا کبھی نہیں ہوتا... کبھی بھی نہیں... انسان جب ہمیشہ سے گناہ گار ہو اور توبہ کرنا چاہے تو نیکی کھینچ لیتی ہے اسے اپنی طرف... بڑے آرام سے توبہ قبول ہو جاتی ہے اس کی... پھر "درجہ" ملتا ہے اسے کوئی... دعا میں اثر آ جاتا ہے اس کے... لیکن انسان اگر اچھائی سے برائی کی طرف چلا جائے اور پھر توبہ کرنا چاہے تو بڑا وقت لگتا ہے واپس آنے میں... توبہ قبول تو ہو جاتی ہے پر "درجہ" کوئی نہیں ملتا... دعا بس دعا ہی رہتی ہے قبول ہو نہ ہو... اثر نہیں رہتا اس میں۔" وہ بے حد عجیب سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"سارا سفر شروع کرنا پڑتا ہے... زیرو سے۔"

"کس نے کہا تم سے یہ سب کچھ؟" کرم حیران تھا۔

"ابو کہتے تھے... تب مجھے سمجھ نہیں آتی تھی... میں تمہیں ابو کی تصویر دکھاؤں؟"

کرم نے سر ہلا دیا۔ وہ اپنی آنکھیں رگڑتی ہوئی اندر چلی گئی۔ کرم کو وہ اس وقت اسے ایک ننھی بچی لگی تھی جو ہر ایک کو اپنے ماں باپ کی تصویر دکھا کر خوش ہوتی۔ اسے کئی سال پہلے دبئی کے اس ہوٹل کی وہ رات یاد آئی تھی جب اس نے زینی کو پہلی بار دیکھا تھا... اپنے جس جنون اور وحشت کی داستان وہ اسے آج سنا رہی تھی وہ مدتوں پہلے اسے دیکھ چکا تھا... تب سمجھ نہیں سکا تھا... آج سمجھ رہا تھا... وہ بیڈروم سے نکل آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فریمڈ تصویر تھی اور ایک چھوٹی البم۔

فریمڈ تصویر ایک ادھیڑ عمر آدمی کی تھی... خوش شکل باریش مرد کی... جس کے چہرے میں زینی کی مشابہت دیکھنا بے حد آسان تھا... اس نے زینی سے اس کے باپ کے بارے میں اتنا سب کچھ نہ بھی سنا ہوتا تب بھی اس آدمی کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر اس کی آنکھوں میں جھلکتی اچھائی اور سچائی کو دیکھنا مشکل نہیں تھا۔

وہ اب متورم آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ اسے بڑے اشتیاق سے اپنے بہن بھائیوں اور ماں کی تصویر دکھا رہی تھی... اس کی اور ان کی بچپن کی تصویریں... ہر تصویر میں وہ اسے اپنے باپ کے ساتھ ہی نظر آئی تھی... انگلی پکڑے ہوئے، گود میں بیٹھی ہوئی... ٹانگوں سے لپٹی ہوئی گود میں اٹھائی ہوئی۔

"یہ بھائی ہے میرا اکلوتا... سلمان... اور اس کی بیوی سدرہ... یہ اس کا بیٹا دانش..." وہ اسے باری باری ہر ایک تصویر دکھاتے ہوئے ان کو متعارف کروا رہی تھی... ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے کرم ایک عجیب سے خالی پن کا شکار ہونے لگا تھا... ایک عجیب سے احساس کمتری نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا... آخر اس کے پاس کون سے ایسے رشتے تھے جنہیں وہ اتنی محبت کے ساتھ اسے یا کسی کو دکھا سکتا... زینی کے پاس ان رشتوں کے حوالے سے یادیں تھیں اس کے پاس کیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" وہ کوئی تصویر دیکھتے دیکھتے رک گیا تھا زینی نے اسے ٹوکا۔ وہ چونک گیا۔

''کچھ نہیں'' کرم نے البم بند کر دی۔

''تم بہت خوش قسمت ہو کم از کم تمہارے کسی خونی رشتے نے تمہیں exploit نہیں کیا۔''

وہ کرم کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''اتنا شک کیوں کرتے ہو تم اپنے بہن بھائیوں پر؟'' اس نے بے حد سنجیدگی سے کرم سے پوچھا۔

''شک؟'' وہ تلخی سے ہنسا۔

''کاش مجھے شک ہوتا یقین نہ ہوتا تمہیں پتہ ہے میرا کینسر بہت ابتدائی سٹیج پر diagnose ہوا تھا۔ لیکن میرے بہن بھائیوں نے میری ماں سے یہ کہا کہ آپریشن سے پہلے مجھے وصیت لکھ دینی چاہیے کیونکہ زندگی اور موت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کل کو ایسا نہ ہو کہ میری جائیداد کی وجہ سے ان کے درمیان جھگڑے ہونے لگیں۔ اور تم مجھ سے یہ کہہ رہی ہو کہ میں شک کیوں کرتا ہوں۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''میں نے واقعی وصیت لکھ دی لیکن وصیت میں سب کچھ ان کے نام لکھنے کی بجائے میں نے اس کا تین چوتھائی حصہ مختلف charities کے نام کر دیا تمہیں اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ کتنا ہنگامہ کیا ان سب نے اس پر ابھی بھی انہیں اپنے حصے میں جو ملے گا وہ کروڑوں میں ہوگا اس کے باوجود وہ خوش نہیں ہیں مجھ سے۔ کوئی ایک بھی نہیں مجھے یقین ہے میرے مرنے کے بعد یہ لوگ میری جائیداد charities سے بچانے کے لیے کورٹ میں جا کر ایک آخری کوشش ضرور کریں گے۔''

وہ بہت دیر چپ بیٹھی رہی پھر اس نے کہا۔ ''بعض دفعہ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔''

''ہاں بعض دفعہ ہو جاتی ہے۔ لیکن ہر بار نہیں۔ انہیں میری ذات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے صرف اس دولت میں دلچسپی ہے جو میرے پاس ہے انہیں کرم علی صرف تب یاد آتا ہے جب انہیں کوئی ضرورت یاد آتی ہے۔''

''تم اتنے دولت مند ہو کرم۔ کیا فرق پڑتا ہے ان کے چھوٹے موٹے مطالبے پورے کر دینے سے۔'' زینی نے کہا کرم نے اپنے کوٹ کی جیب پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''فرق یہاں نہیں پڑتا'' اس نے اب اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھ دیا۔

''یہاں پڑتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں رنج تھا۔

''میں سوچتا ہوں وہ کبھی ''خونی رشتے'' کے حوالے سے بھی تو ملیں مجھ سے۔''

''تم نے خود انہیں فاصلے پر رکھا ہوگا۔'' زینی اب بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہیں تھی۔

''پہلے نہیں رکھا تھا۔ اب رکھا ہے میرا جانا انہیں اتنی خوشی نہیں دیتا میرا بھیجا ہوا چیک اس لیے میں انہیں وہی چیز بھیجتا ہوں جو انہیں زیادہ خوشی دے۔''

''تم اندر سے بہت تلخ ہو کرم۔'' زینی نے بہت غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرا دیا۔

"25 سال اگر کوئی انسان کڑواہٹ اپنے اندر جمع کرتا آ رہا ہو تو کبھی نہ کبھی زبان وہ کڑواہٹ اگلنے لگتی ہے۔"

"پھر بھی تمہیں اپنے بہن بھائیوں سے ملنا چاہیے یوں الگ ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیے۔" زینی نے جیسے بات ختم کی۔

"تم کیوں نہیں ملتی اپنے بہن بھائیوں سے؟ تم کیوں یوں چھپ کر بیٹھ گئی ہو؟" وہ اس کے سوال پر چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ وہ واقعی بہت تلخ تھا۔

"میں" اس نے نظریں چرائیں۔

"میں اپنے بہن بھائیوں سے اس لیے نہیں ملتی کیونکہ میں ان کے لیے داغ ہوں پھر میں کیوں ان کی زندگی کو اپنے وجود سے آلودہ کروں وہ سب میرے بغیر بھی بہت خوش ہیں انہیں میری ضرورت نہیں ہے۔"

"میری فیملی بھی میرے بغیر بہت خوش ہے انہیں بھی میری ضرورت نہیں ہے۔" کرم نے بے ساختہ کہا۔

"رشتے اتنی آسانی کے ساتھ"

"زینی باہر چلیں؟" کرم نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی وہ الجھی نظروں کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

☆☆☆

کرم نے زندگی میں بہت ساری عورتیں دیکھی تھیں لیکن زینی ان میں سے عجیب ترین تھی وہ انسانوں کو منٹوں میں judge کرتا تھا ان کی اگلی move کو پڑھ لیتا تھا اور "عورت" کے بارے میں اس نے آج تک جو سوچا تھا جو اندازے لگائے تھے۔ اس کی زندگی میں آنے والی عورتیں اس پر حرف بہ حرف پوری اتری تھیں ... صرف زینب ضیاء تھی جو اس کا ہر اندازہ غلط ثابت کر دیتی تھی۔ وہ اس کے ذہن کو نہیں پڑھ سکتا تھا۔ صرف چہرہ پڑھ سکتا تھا اور اس کا چہرہ پڑھنا اسے تکلیف دیتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس کی زندگی کا وہ تکلیف دہ حصہ یوں منٹوں میں اس کی زندگی سے غائب کرتا کہ دوبارہ کبھی وہ اس کے چہرے پر سایہ بن کر نہ لہراتا۔

وہ اس سے جتنا زیادہ مل رہا تھا وہ اس سے اتنا زیادہ ملنا چاہتا تھا 25 سال بعد وہ کسی سے اپنے دل کی باتیں کر رہا تھا ... کسی کے دل کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ دنیا میں واحد انسان تھی جس سے کرم نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا تھا ... ایک ایک چیز بتا دی تھی اس نے ایک ایک غلطی ... ایک ایک گناہ وہ جیسے اس کے لیے ایک آئینہ بن گئی تھی جس میں وہ جھانکتا تو با آسانی اپنا عکس دیکھ لیتا اور ہر بار اس سے اپنا کوئی راز شیئر کرنے کے بعد وہ گھر آتا اور پچھتاتا اسے یہ نہیں بتانا چاہیے تھا۔ یہ تو چھپانے کی بات تھی کیا ہو گیا ہے مجھے؟ وہ خود کو ملامت کرتا اگلی بار اپنی زبان بند رکھنے کا عہد کرتا اور اس پر جما رہتا تب تک جب تک وہ فون پر اس کی آواز نہ سن لیتا یا وہ اس کے سامنے نہ آ جاتی اور جیسے ہی ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز ہوتی کرم ایک بار پھر کرم نہیں رہتا تھا اس کی کڑواہٹ بڑے عجیب انداز میں ختم ہونے لگی تھی اس کی تلخی دم توڑنے لگی تھی۔ زینی کا وجود جیسے اس کی تنہائی کے زہر کو مارنے لگا تھا اور یہ سب تب تھا جب وہ صرف ایک دوست

تھی.....صرف ایک دوست۔

دن میں ایک بار کی جانے والی کال اب دن میں کئی بار کی جانے والی کالز میں بدل گئی تھی ...اور بے شمار بھیجے جانے والے message اس کے علاوہ تھے وہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی کی روٹین کے ایک ایک لمحے سے واقف تھے کرم کی سیکرٹری کو بھی کرم کی ایک مہینے کی مصروفیات بتانے کے لیے ڈائری کا سہارا لینا پڑتا اور زینی کو سب کچھ زبانی پتہ تھا وہ کس دن کس وقت کتنی دیر کے لیے کس کے پاس کہاں جا رہا تھا زینی زبانی بتا سکتی تھی خود کرم بھی اس کی روٹین سے اسی طرح واقف تھا کہ وہ اگر اس کے ایک پورے دن میں صبح سے لے کر شام تک کنٹری کرتا تو وہ اس کے بتائے ہوئے وقت پر بتائی ہوئی جگہ پر ہی پکچر کرتی پائی جاتی جو وہ کہہ رہا ہوتا۔

اور اب اس کی زندگی کی روٹین میں ان پانچ بھکاریوں کے علاوہ کرم علی بھی شامل ہو گیا تھا کیسے شامل ہو گیا تھا؟ کرم کی طرح یہ زینی کو بھی سمجھ نہیں آتا تھا شاید ایک دوست کی کمی تھی میری زندگی میں جو کرم کی صورت میں مل گیا ہے مجھے اس نے بھی کرم کی طرح اپنے رشتے پر دوستی کا لیبل چسپاں کر دیا تھا یہ جیسے حفاظتی اقدام تھا۔

☆☆☆

"تم کوئی جیولری کیوں نہیں پہنتی؟" وہ اس ویک اینڈ پر کافی پینے نکلے تھے اور اب کافی پیتے ہوئے ونڈو شاپنگ کر رہے تھے جب کرم نے اچانک اس سے پوچھا تھا اس نے واقعی کبھی اس کے ہاتھ کانوں یا گردن میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔

"میرے پاس کوئی جیولری نہیں ہے یہاں آنے سے پہلے سب چھوڑ آئی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کرم سے کہا۔

"میں لے کر دوں؟ .. اگر تم برا نہ مناؤ تو" کرم نے پہلے آفر کی پھر ساتھ ہی معذرت۔ وہ ہنسی۔

"میں تمہاری جیب سے کافی تک نہیں پیتی تم سمجھتے ہو جیولری لے لوں گی؟" وہ واقعی کرم کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے اپنے کھانے پینے کے بل کی ادائیگی خود کرتی تھی کرم کے احتجاج کے باوجود ...وہ کرم کا بل نہیں دیتی تھی لیکن اپنا بل بھی اسے نہیں دینے دیتی تھی۔ ...وہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ محتاط تھی..... کرم نے آہستہ آہستہ اس کے اس رویے کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا واحد تبدیلی جو آئی تھی وہ یہ تھی کہ ہر بار اپنی اپنی کافی اور کھانے کا بل ادا کرنے کی بجائے اب ایک بار بل وہ ادا کرتی تھی اگلی بار کرم اور کھانے اور کافی کی جگہ کا انتخاب ہمیشہ زینی کا ہوتا تھا ...اور کرم اگر زینی کے بل دینے کی باری پر اگر کسی سستی سی چیز کا انتخاب کرتا تو زینی بھی اس کی باری پر یہی کرتی تھی .. وہ بہت سالوں کے بعد وہ سستی چیزیں کھا رہا تھا جو اب اس کی زندگی سے نکل گئی تھیں۔

"ہاں مجھے پتہ ہے تم نہیں لوگی لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آیا کروں۔" کرم نے سنجیدگی سے کہا۔

"کون سی ایسی چیز لا سکتے ہو تم کرم جو میرے پاس نہ رہی ہو اور میں اسے چھوڑ نہ آئی ہوں۔"

کرم جواب نہیں دے سکا۔ وہ اب بھی فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔

"جیولری، کپڑے، جوتے کاسمیٹکس یہ سب کچھ نکل گیا ہے میری زندگی سے بہت پہلے لیے میں نے یہ جو زندگی ہے نا

جو بیوٹی پارلر، جم، سٹوڈیوز، اور پارٹیز سے ہٹ کر گزار رہی ہوں یہ بہت پر سکون زندگی ہے ... مجھے 24 گھنٹے سکرین پر خوبصورت نظر آنے کے لیے میک اپ کا ڈھیر اپنے چہرے پر نہیں لگانا پڑتا ... جیولری کا انبار سجانا نہیں پڑتا نہ ہی کپڑوں اور جوتوں کے پیچھے ہلکان ہونا پڑتا ہے ... نہ ہی اپنے جسم اور چہرے کو خوبصورت دکھانے کی جدوجہد میں جم اور بیوٹی پارلر میں جا کر خوار ہونا پڑتا ہے ... میں بہت خوش ہوں ان چند کپڑوں اور جوتوں کے ساتھ جنہیں میں بار بار استعمال کرتی ہوں ... مجھ پر ترس مت کھاؤ۔" کرم کو اس کی بات بری لگی۔

"میں ترس نہیں کھا رہا تم پر۔"

وہ ہنسی۔ "تو اور کیا کر رہے ہو؟ ... ایک غریب لڑکی کو جیولری لے کر دینے کی بات کر رہے ہو ... اگر ترس کھا کر نہیں دے رہے تو یہ اس سے بھی خطرناک بات ہے ... پھر کیوں دے رہے ہو اسے۔"

کرم کچھ اور خفا ہوا وہ اب اس کا مذاق اڑا رہی تھی اور جیسے اس سے محظوظ ہو رہی تھی۔

"تم اگر مجھے تحفہ دینا چاہو گی تو میں کبھی منع نہیں کروں گا میں بڑی خوش دلی سے لے لوں گا۔" کرم نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔

"لیکن میں تو تمہیں تحفہ دینا ہی نہیں چاہتی ... اور بھلا میں تمہیں تحفہ دوں کیوں ... ؟" وہ جیسے اسے زچ کرنے پر تل گئی تھی۔

"ہم دوست ہیں زینی اور دوست ایک دوسرے کو تحفے دیتے ہیں۔ میں اپنے سب دوستوں کو تحفے دیتا ہوں۔" کرم نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ مارکیٹ ایریا میں ایک بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔

"میں نے کب منع کیا ہے ... تم دیتے ہو ... دو ... لیکن میں نہ تحفہ لوں گی نہ دوں گی ... ویسے بھی بہت تحفے دے چکے ہو پہلے ہی تم مجھے۔" کرم اس کا اشارہ سمجھ گیا۔

"جو تم میرے منہ پر مار گئی۔"

"منہ پر نہیں مارے تھے ... تم چاہتے تھے میں منہ پر مار کر جاتی؟" زینی نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر ہنس پڑا ... وہ آج اچھے موڈ میں تھی، اتنی اداس نہیں تھی جتنی اکثر ہوتی تھی اور کرم یہ دیکھ کر خوش تھا۔

"تم بہت عجیب ہو زینی۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"کتنی بار کہو گے یہ مجھ سے؟ ... میں جانتی ہوں ... تمہارا بس چلے تو تم مجھے عجائب خانے میں رکھوا دو ... اتنی ہی عجیب لگتی ہوں تمہیں میں۔" وہ اطمینان سے کافی پیتے ہوئے مارکیٹ ایریا میں گاتے ہوئے سٹریٹ سنگر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"عجائب خانے میں تو نہیں لیکن ..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

زینی اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر گاتے سنگر کو سن رہی تھی۔

وہ کافی پینا بھول گیا ... بہت دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ اب بھی کسی پینٹر کی پینٹنگ کی طرح خوبصورت تھی ... اسے واقعی

خوبصورت نظر آنے کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی... زری بھی بے انتہا خوبصورت تھی اسے دیکھتے ہوئے بھی بعض دفعہ وہ اسی طرح مبہوت ہو جاتا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اسے زری کی آنکھوں میں آنے والے کسی تاثر کسی احساس نے کبھی اس طرح باندھا ہو جس طرح وہ باندھ کر رکھ دیتی تھی۔ کرم نے نظریں ہٹا کر کافی کا آخری گھونٹ بھرا۔ وہ اس کی نہیں تھی۔ وہ اس کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے شیراز کی بدقسمتی پر رحم آتا کوئی زینی جیسی لڑکی کو پیسے کی خاطر کیسے چھوڑ سکتا تھا... کم از کم کرم علی تو نہیں۔

☆☆☆

''تم اس ایکٹریس سے کیوں ملتے ہو؟''

''وہ دوست ہے میری۔''

''اس سے پہلے تو کبھی عورتوں کو دوست نہیں بنایا تم نے پھر اب کیا ضرورت آن پڑی؟''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' وہ تنگ آ گیا تھا۔ پچھلے دو گھنٹوں سے وہ ویک اینڈ پر اپنے ہاں آئی ہوئی ماں کو زینی کے بارے میں کی جانے والی تفتیش کا جواب دے رہا تھا۔

''بڑا پچھتاؤ گے تم کرم۔ زری سے زیادہ بڑا دھوکہ کھاؤ گے اس بار۔'' اس کی ماں نے اسے خبردار کیا وہ جیسے اس کے پورے خاندان کے خیالات کو اس تک پہنچا رہی تھی۔

''میں نے آپ سے کہا ہے۔ وہ دوست ہے میری اور بس۔'' کرم نے کہا۔

''دوست سے کوئی روز روز ملتا ہے؟''

''آپ سے کس نے کہا کہ میں روز ملتا ہوں اس سے۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا۔

''آصف نے بتایا مجھے... تمہارے دفتر کے سب لوگوں کو پتہ ہے۔''

''آپ آصف سے کہیں کہ وہ اپنا کام کرے... میں کہاں جاتا ہوں یا کہاں نہیں جاتا اس کے بارے میں ریکارڈ رکھنا اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔'' کرم کچھ ناراض ہو گیا۔

''آصف کو میں نے کہا ہے۔ میں پوچھتی رہتی ہوں اس سے... اس لیے بتاتا ہے وہ۔'' کرم کی ماں نے فوراً آصف کا دفاع کیا۔

''اتنے جان دینے والے بہن بھائی ہیں اور تم ان کو چھوڑ کر ان غیر عورتوں کے پیچھے خوار ہو رہے ہو۔ اپنے بہن بھائیوں کے بچوں کو اپنے بچے سمجھو۔ ہم سب ہیں تمہارا اپنا خون۔ شادی کر لی اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا۔ بس تمہاری قسمت ہی خراب نکلی ورنہ ہم نے تو اپنی طرف سے بڑی اچھی جگہ رشتہ کیا تھا تمہارا۔ لیکن بیٹا اب تمہاری قسمت میں اچھی بیوی نہیں تھی۔ تو کوئی کیا کرے پھر ایسی ویسی لڑکی سے شادی کرو گے تو پھر بھی کچھ ہو گا۔ آج کل کی لڑکیاں ایسی ہی لالچی اور مطلب پرست ہیں۔ پھر اب تمہاری عمر بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ ورنہ میں تو پہلی شادی کے ختم ہوتے ہی تمہاری دوسری شادی کروا دیتی۔ ان چکروں سے نکل آؤ اب۔ تمہارے بہن بھائی کہہ رہے ہیں کہ تم ان میں سے جس کا بچہ لینا چاہو

وہ دے دیتے ہیں۔ میں بھی مستقل یہیں آ جاتی ہوں تمہارے پاس۔ اپنے بہن بھائی کی کسی اولاد کو گود لو گے تو بڑھاپے میں سہارا بنے گی تمہاری۔ اپنا خون تو اپنا ہی ہوتا ہے۔ تمہارے بہن بھائی تو اپنی اولاد کو لکھ کر تمہیں دینے کو تیار ہیں۔ کہتے ہیں بھائی جان نے اتنا کچھ کیا ہے ہمارے لیے انہیں تو انکار کر ہی نہیں سکتے ہم۔" وہ چپ چاپ بیٹھا ماں کا چہرہ دیکھتا ان سب باتوں کو سنتا رہا۔ ان میں سے کتنی باتیں ہمدردی سے کہی گئی تھیں اور کتنی باتوں کے پیچھے کوئی اور مقصد تھا۔ وہ بے وقوف سے بے وقوف شخص بھی سن کر جان لیتا اور کرم بہر حال بے وقوف نہیں تھا۔ ماں سادہ تھی وہ اپنی طرف سے کرم کی بھلائی سوچ رہی تھی اور واقعی دل سے سمجھتی تھی کہ اس کے بہن بھائی ایسا ہی چاہتے تھے۔ وہ ماں کا یہ زعم اور خوش فہمی ختم نہیں کرنا چاہتا تھا وہ ان کی باتوں میں جھلکتا کھوٹ انہیں دکھانا نہیں چاہتا تھا۔

"میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی کی اولاد کو میں کسی سے الگ کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں میری قسمت خراب ہے۔ اس لیے میری شادی نہیں نبھ سکی۔ گھر کا سکون واقعی میری قسمت میں نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں دوبارہ شادی جیسی حماقت نہیں کروں گا۔" اس نے ماں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"نہیں قسمت تو خراب نہیں ہے تمہاری۔ اللہ نے کتنا پیسہ دیا ہے تمہیں" ماں نے فوراً جیسے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"اتنی دولت کہاں ہے کسی دوسرے کے پاس۔ اللہ نے ہر بہن بھائی سے بڑھ کر نوازا ہے تمہیں۔"

اس کا دل چاہا وہ ان سے کہے وہ اس کی زندگی کو اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ بدل دیں۔ اس کا پیسہ انہیں دے دیں اور ان کی زندگی اسے دے دیں۔

بے حد بوجھل دل کے ساتھ وہ اپنی ماں کے پاس سے اٹھ کر آیا تھا۔ بات چیت کے لیے ان کے پاس واحد موضوع اس کی دولت ہی ہوتی تھی اور بعض دفعہ تو کرم کو لگتا اس دولت کا ذکر سنتے سنتے اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔

اپنے بیڈ روم میں آ کر وہ بہت دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ اپنی ماں کی زینی کے بارے میں کہی جانے والی باتیں بار بار اس کے ذہن میں گونجتی رہیں۔

☆☆☆

زینی نے بستر سے اٹھتے ہوئے گھڑی دیکھی پھر سیل فون اٹھا کر اسے دیکھا۔ حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا اسے۔ اس میں کرم کا کوئی message نہیں تھا۔ کئی مہینوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ صبح سو کر اٹھنے پر اسے کرم کا message نہ ملا ہو۔ وہ آدھ گھنٹہ جس میں وہ کام پر جانے کے لیے تیار ہوتی تھی اس کے لیے مزید تشویش کا باعث بنے تھے کیونکہ اس پورے وقت میں کرم کی کوئی کال کوئی SMS اسے نہیں ملا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے بالآخر کرم کو message کیا۔ بس سٹاپ تک جاتے جاتے بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے بس پر بیٹھ کر کرم کو قدرے تشویش کے عالم میں کال کی۔ اس کا سیل فون بند تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں تھا۔ پورا دن وہ وقفے وقفے سے کرم کو کال اور message کرتی رہی اس کا سیل فون اسی طرح آف ملا اسے۔ واپس گھر آنے تک وہ بے حد پریشان ہو چکی تھی۔ ایک پورا دن اس سے رابطہ

نہیں ہوا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کرم اسے کسی وجہ سے اگنور کرتا... وہ ناراض بھی ہوتا تب بھی اس کے message اور کالز کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

رات کے وقت اس نے بالآخر کرم کے گھر فون کیا یہ کرم کے بیڈ روم کا نمبر تھا اگر وہ وہاں تھا تو اسے کال ریسیو کرنی چاہیے تھی

کال ریسیو نہیں کی گئی وہاں آنسر فون لگا ہوا تھا۔ زینی نے اس کے لیے message چھوڑ کر فون بند کر دیا۔

صبح اٹھ کر اس نے ایک بار پھر اپنا فون چیک کیا اور اس بار وہ فرسٹریٹ ہوئی تھی... کرم کا کوئی message اس بار بھی نہیں تھا۔ اس پورے ہفتے میں کرم کو ہر روز صرف اپنے آفس ہی جاتا تھا... گھر یا آفس پھر وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔

زینی نے دس بجے کے قریب اس کے آفس کی سیکرٹری کو فون کیا۔

''وہ دو ہفتے کے لیے کہیں گئے ہیں۔'' وہ اس کی سیکرٹری کے جواب پر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس کی سیکرٹری اس سے واقف تھی

''کہاں؟''

''یہ تو نہیں بتایا بس کل صبح انہوں نے کال کر کے مجھے بتایا کہ دو ہفتے کے لیے وہ شہر سے باہر جا رہے ہیں میں ان کی ساری میٹنگز کینسل کر دوں۔''

''کس شہر میں گئے ہیں؟''

''یہ بھی نہیں پتہ۔''

''کوئی فون نمبر؟''

''نہیں... وہ کہہ کر گئے تھے کہ وہ اپنا سیل فون آف کر کے جائیں گے دو ہفتے تک وہ کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں چاہتے۔'' سیکرٹری نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔

زینی کو یقین نہیں آ رہا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسے بتائے بغیر کہیں چلا جاتا... رابطہ رکھنا تو ایک طرف وہ اطلاع دینا تک گوارا نہ کرتا۔

''اس کی طبیعت تو ٹھیک تھی؟'' اسے عجیب سی تشویش ہوئی۔

''ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے، اب آخری چیک اپ کی رپورٹس ٹھیک آئی تھیں۔'' سیکرٹری نے اسے اطلاع دی۔

زینی نے فون بند کر دیا۔ کرم کا یہ رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا دو ہفتے کے لیے یوں بغیر اطلاع دیے کہیں جانے کی کیا تک بنتی تھی اور آخر وہ جا کیسے سکتا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ دو ہفتے اس نے بے حد پریشانی میں گزارے تھے کوئی ایک دن ایسا نہیں تھا جب اس کو کرم کا خیال نہ آتا رہا ہو۔ دو ہفتے ختم ہوتے ہی اس نے کرم کے فون پر کال کی تھی یہ سوچتے ہوئے کہ وہ واپس آ چکا ہو گا سیل فون ہنوز آف تھا... زینی نے اس کی سیکرٹری کو فون کیا۔

''وہ تو دو تین دن بعد ہی واپس آ گئے تھے۔ آپ کا ان سے رابطہ نہیں ہوا کیا؟ ابھی ایک میٹنگ میں ہیں جیسے ہی میٹنگ ختم ہوتی ہے میں آپ سے بات کرواتی ہوں ان کی۔''

زینی نے کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا۔ وہ واپس آ گیا تھا اور اس نے اتنے دنوں میں اس سے ایک بار بھی رابطہ کی کوشش نہیں کی وہ اسے اگنور کر رہا تھا اس سے رابطہ ختم کرنا چاہتا تھا۔ اور زینی کو یہ سمجھنے کے لیے کسی عقل داڑھ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے اس رویے سے اسے بے حد ہتک کا احساس ہوا تھا۔ وہ خود اس کی طرف آیا تھا اور اب خود ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پہلے کی وجہ وہ جانتی تھی لیکن دوسرے کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

سیکرٹری کے کہنے کے باوجود کرم کا اس دن اسے کوئی فون نہیں آیا۔ چند دن وہ بری طرح اپ سیٹ رہی۔ وہ صرف دوست تھا تو پھر اس طرح اس کے اعصاب پر کیوں سوار ہو گیا تھا۔ وہ بار بار اس کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی۔ بار بار ناکام رہتی۔ اس کے وجود پر چھائی جو خاموشی کرم نے توڑی تھی وہ پھر واپس آ گئی تھی۔ کرم سے اس طرح کٹ کر رہنا بے حد مشکل تھا۔ زینی نے اعتراف کیا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود ہزار مزاحمت کے باوجود وہ اس کی کمپنی کی عادی ہو چکی تھی۔ کہیں نہ کہیں اس کے اندر زینی کو وہ ساتھی نظر آیا تھا جیسا ساتھی وہ کبھی شیراز کو سمجھتی تھی۔ کہیں نہ کہیں کچھ تھا کرم میں جو اس کے دل کو اس کی طرف کھینچتا تھا۔ وہ اس کو محبت ماننے پر تیار نہیں تھی پر وہ اسے دوستی کی حدود کے اندر رکھنے میں بھی ناکام ہو رہی تھی۔

وہ ویک اینڈ پر اکثر اس پارک میں جاتے تھے۔ اس ویک اینڈ پر بھی وہ وہاں چلی گئی تھی۔ پارک کی جھیل کے قریبی بینچ پر بیٹھ کر وہ اکثر اس جھیل کو دیکھا کرتے تھے۔ بے مقصد باتیں کرتے ہوئے۔ کئی بار وہ اپنا لنچ بھی وہیں کیا کرتے تھے۔ بینچ خالی تھا۔ وہ اس کے ایک سرے پر آ کر بیٹھ گئی۔ دوسرے سرے پر کرم بیٹھتا تھا۔ بینچ کا فاصلہ جیسے ان کی زندگی کا فاصلہ ہوتا تھا۔ وہ جھیل کے پانی کو چپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہی جس پر کبھی کبھار کوئی پرندہ نیچی پرواز کرتے ہوئے گزرتا دور تک جاتا پھر اونچی پرواز کرتے ہوئے فضا میں غائب ہو جاتا۔ بینچ کے دوسرے سرے پر کوئی آ کر بیٹھ گیا تھا۔ زینی نے گردن موڑ کر دیکھا وہ کرم تھا۔ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد زینی نے دوبارہ جھیل کو دیکھنا شروع کر دیا۔ پانی اب صرف جھیل میں نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی تھا۔ بہت دیر تک وہ اجنبیوں کی طرح بالکل چپ چاپ بیٹھے جھیل کو دیکھتے رہے۔ پھر کرم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ابھی بھی گردن سیدھی کیے ہوئے ایک ٹک جھیل کو دیکھ رہی تھی۔ اتنے ہفتوں کے بعد اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے عجیب سی تکلیف ہوئی۔ تکلیف یا شرمندگی وہ فوری طور پر بوجھ نہیں سکا۔ چند لمحے لفظ ڈھونڈتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"کیسی ہو؟"

وہ خاموش بیٹھی جھیل کو دیکھتی رہی۔ ہوا اس کے شانوں پر بکھرے بالوں کو آہستہ آہستہ اڑا رہی تھی۔ اس کا چہرہ چند لمحوں کے لیے جیسے کرم کی نظروں سے اوجھل ہوا۔ کرم کا دل چاہا وہ اس کے چہرے کو چھپاتے بالوں کی ان لٹوں کو ہاتھ سے ہٹا دے۔

"ناراض ہو؟"

خاموشی۔ کرم نے سر جھکا لیا۔ اس کے انداز میں شکست خوردگی تھی۔ چند لمحے اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اس نے ایک بار پھر گردن موڑ کر زینی کو دیکھا۔ وہ گلے میں لپٹے سکارف کو نکال کر بالوں کو سمیٹ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پھر نظر آنے لگا تھا اور چہرہ نظر آنے کے ساتھ کرم نے اس

کے گالوں پر پھسلتے آنسو بھی دیکھ لیے تھے۔ گود میں پڑے کوٹ کو اٹھاتے ہوئے وہ کرم کی طرف دیکھے بغیر بینچ سے اٹھنے والی تھی جب کرم نے بہت آہستگی کے ساتھ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"زینی۔" اس نے اسی نرمی کے ساتھ اپنے ہاتھ پر دھرا کرم کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"میں کھلونا نہیں ہوں کرم جس کو تم اپنی تفریح اور ضرورت کے مطابق جب چاہو استعمال کرو... جب جی چاہے اٹھا کر پھینک دو۔" اس نے اپنے گالوں سے آنسو صاف کرتے کرتے کرم سے کہا۔ پہلی بار دونوں کی نظریں ملی تھیں۔

"I am sorry" اس نے کرم کی بات کاٹ دی۔

"میں جانتی ہوں تمہارے دل میں میری کوئی عزت نہیں ہے۔

کیونکہ میں ایک بری لڑکی ہوں۔ میری زبان سے اپنے لیے کچھ عزت اور احترام کا مطالبہ شاید تمہیں مذاق لگے۔" کرم نے اس کی بات کاٹنا چاہی لیکن وہ خاموش نہیں ہوئی۔

"عورت کی تم عزت نہیں کرتے یہ میں جانتی ہوں اور میرے جیسی بری عورت کی تو کبھی بھی نہیں لیکن انسان کے طور پر تو میں تھوڑی عزت کی مستحق ہوں یا نہیں۔"

وہ بول نہیں سکا۔

"مجھ سے جان چھڑانے کے لیے تمہیں مجھ سے چھپنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایک دفعہ کہہ دیتے میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں کبھی شکل نہ دکھاتی۔ ایک message کر دیتے کہ میں تمہیں message یا کال نہ کروں۔ کرم میں تمہیں کبھی۔ کبھی دوبارہ message یا کال نہ کرتی۔ لیکن یوں چھپنے کی کیا ضرورت ہے تمہیں؟ اور اب ایک بار پھر تمہیں اپنا کتھارسس کرنے کے لیے کوئی سننے والا چاہیے تو تم پھر میرے پاس آ گئے ہو۔ اپنی تنہائی اور محرومیوں کی داستان سنانے۔ یہ بتانے کہ تم کس طرح اپنی دولت کے ساتھ تنہا جی رہے ہو۔"

وہ شکوہ جو آنسوؤں سے شروع ہوا تھا اب جیسے کسی لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔

"مجھے پھر یہ بتانے آئے ہو گے کس طرح ساری دنیا تمہیں پیسے کے لیے exploit کرتی ہے۔ لیکن تم دوسروں کو کس طرح exploit کرتے ہو۔ تم نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے؟ دوسرے تمہیں ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیتے ہیں۔ اور تم بھی ضرورت کے وقت یہی کرتے ہو۔" وہ اب کھڑی ہوتے ہوئے کوٹ پہنتے ہوئے بول رہی تھی۔

وہ سر اٹھائے خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔

"تم بھی دوسرے مردوں کی طرح بے حد خود غرض ہو۔ خود ترسی کا شکار۔ صرف اپنے بارے میں سوچنے والے۔ تمہیں ہر وہ شخص یاد ہے جس نے تمہیں دھوکہ دیا۔"

کرم کی خاموشی زینی کو مزید مشتعل کر رہی تھی۔

"تم نے کبھی ان کے بارے میں سوچا ہے جنہیں تم ہرٹ کرتے ہو۔"

"تمہیں کیسے ہرٹ کیا میں نے؟" اس نے پہلی بار زبان کھولی اور زینی بول نہیں سکی۔

"میرے غائب ہونے سے تم کو کیا فرق پڑا؟ کچھ فرق پڑا؟" وہ چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ وہ اسے کیا جواب دیتی۔ یہ فلم نہیں تھی۔ زندگی تھی۔ وہ ہیرو نہیں تھا۔ کرم تھا۔ وہ پری زاد نہیں تھی زینی تھی۔ اور اس کے پاس جذبات سے بھرپور ڈائیلاگز کا کوئی سکرپٹ نہیں تھا جسے وہ رٹے رٹائے انداز میں بولتی جاتی۔ جو کچھ تھا دل میں تھا اور جو دل میں تھا اسے زبان پر وہ کیسے لے آتی۔

"فرق اگر پڑتا ہے تو مجھے پڑتا ہے۔ تم سے نہ ملنے پر مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ بات نہ ہونے پر مجھے اذیت ہوتی ہے۔ تمہیں تو کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ میں تو صرف ایک دوست ہوں تمہارا۔ لیکن یہ بات میں اپنے آپ کو نہیں سمجھا پا رہا۔" وہ شکست خوردہ انداز میں اعتراف جرم کی طرح اقرار محبت کر رہا تھا۔

"تم سے چھپنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اپنے آپ سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار پھر اپنے آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تم میری کوئی نہیں ہو۔ میں کیوں اپنے آپ کو تمہارا عادی کر رہا ہوں؟ کل کو اگر تم نے مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا تو مجھے تمہارے بغیر رہنے کے قابل ہونا چاہیے۔ بے کار کوشش کی۔ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا میں۔" وہ یوں سے سر ہلا رہا تھا۔

زینی کا غصہ ماچس کی تیلی کی طرح جل کر بجھ گیا۔ وہ کچھ اور سننے کی توقع کر رہی تھی۔ یہ سب نہیں۔

"دنیا کے اندر تو کم از کم کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں تم مجھے یاد نہ آؤ۔" وہ چند لمحے کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ کر بینچ پر بیٹھ گئی۔

"اتنے دن کہاں تھے تم؟"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔" کرم نے اسے یاد دلایا وہ اس سے کوئی اور بات کر رہا تھا۔

"تمہیں کہیں جانا تھا تو تم مجھے بتا دیتے میں پریشان ہوگئی تھی تمہارے بارے میں۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کہہ رہی تھی۔

کرم نے ایک گہرا سانس لیا اظہار محبت مرد کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ پہل کر چکا تھا۔ دوسرا قدم زینی کو اٹھانا تھا مگر وہ وہیں کھڑی تھی۔

"تمہیں یوں اچانک کیا ہو گیا تھا؟"

"کیا پھر سے دہراؤں۔" کرم نے مدھم آواز میں کہا۔

وہ خاموش ہوگئی کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر کرم نے زینی کی طرف بڑھایا۔ اس نے رومال تھام کر اپنی آنکھیں خشک کیں اور کرم کو رومال تھما دیا۔

"I am sorry" کرم نے رومال اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

زینی نے سر ہلا دیا۔ وہ رومال ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔

''بہت غلط باتیں سوچتی ہو تم میرے بارے میں زینی۔'' کرم نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

''تمہاری عزت کرتا ہوں تو تمہارے پاس بیٹھا ہوں یہ مانتا ہوں میں خود غرض ہوں اپنی خوشی کے لیے یہ سوچے بغیر تمہارے پاس آجاتا ہوں کہ تم مجھے پسند بھی کرتی ہو یا نہیں زندگی میں پہلی بار خود غرض بنا ہوں یہ بھی نہیں سوچ رہا کہ ہوسکتا ہے ایک بے دل زدہ آدمی سے تمہیں الجھن ''

جسم پر داغ ہونا روح پر داغ ہونے سے بہتر ہے مجھ سے بہتر ہو تم میری طرح آلودہ نہیں ہو۔'' اس نے کرم کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

''تم کیوں سوچتی ہو اس طرح کی باتیں؟'' وہ ہمیشہ کی طرح اس کی اس بات سے Irritate ہوا تھا۔

''تم کیوں کرتے ہو اس طرح کی باتیں؟'' اس نے جواباً کہا۔

وہ خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اتنے ہفتوں کے بعد ''زندگی'' جیسے لوٹ آئی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ اسے بتائے وہ ''زندگی'' کے ساتھ جینا چاہتا تھا۔

''اگلی بار ایسا دورہ پڑے تو بتا دینا۔''

''زندگی'' اس سے چند فٹ دور بیٹھی خفگی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

''یہ کیا ہے؟'' زینی نے حیرانی سے اس کے ہاتھ میں پکڑے pot کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جس میں ایک چھوٹی سی سبز بیل لگی ہوئی تھی۔

''تحفہ نہیں ہے اس لیے گھبراؤ مت۔'' وہ دو بدو کہتا ہوا اندر آ گیا۔

زینی نے کچھ الجھ کر اس کے عقب میں دروازہ بند کیا اور پلٹ کر کرم کو دیکھا۔ وہ سٹنگ ایریا کی کھڑکی کو کھولتے ہوئے اس کے باہر Ledge پر اس pot کے لیے جگہ ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔

''کیا کر رہے ہو تم؟'' وہ اس کے پاس چلی آئی۔

''کوئی شناختی علامت چاہتا ہوں تمہاری کھڑکی کے باہر جس سے میں فوراً پہچان سکوں کہ یہ تمہارا اپارٹمنٹ ہے۔'' وہ ابھی بھی کھڑکی سے باہر pot کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

''اور تم باہر سے اس کھڑکی کو پہچان کر کیا کرو گے۔''

''کچھ بھی نہیں بس آتے اور جاتے ہوئے ایک بار پلٹ کر سر اٹھا کر دیکھوں گا۔''

''کیوں؟''

''ہوسکتا ہے اس کھڑکی میں تم مجھے کھڑی نظر آؤ۔''

زینی نے بے یقینی سے اس کے سنجیدگی سے کہے ہوئے جملے کو سنا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

کرم سنجیدگی سے اپنے کام میں مصروف رہا اس کی ہنسی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''کرم تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ 23 منزل کی کھڑکی میں میں کھڑی ہوں گی اور تمہیں نیچے سڑک پر کھڑے ہو کر نظر آؤں گی۔'' اس نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''یہ مذاق تھا۔''

وہ اب کچن ایریا کی طرف جاتے ہوئے وہاں کوئی کیبنٹ کھول کر کچھ نکال رہا تھا۔

''اب ضروری ہے کہ تم مجھ پر یہ پابندی بھی لگاؤ کہ میں نیچے سڑک پر کھڑا ہو کر سر اٹھا کر اوپر تمہارے اپارٹمنٹ کو بھی نہ دیکھوں۔'' وہ ایک وائر اور پلائرز نکال کر دوبارہ کھڑکی کے پاس آتے ہوئے بولا۔

''یہ pot ہوا کی وجہ سے اگر نیچے کسی کے سر پر گرا تو میں تمہیں بہت جلد اپنے اپارٹمنٹ کی بجائے جیل میں نظر آؤں گی۔'' زینی نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے گردن باہر نکال کر کھڑکی سے کھڑے آگے بڑھتے ledge پر پڑے pot کو دیکھا کرم نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا اور اس pot میں بنے سوراخ میں وہ وائر ڈال کر اسے Pliers کی مدد سے کسنے لگا۔

''تم سمجھتے ہو یہ بیل یہاں پھیلے گی، اس پر پھول آئیں گے اور آہستہ آہستہ یہ اتنی بڑی اور لمبی ہو جائے گی کہ تم لفٹ سے آنے کی بجائے اس کی شاخوں سے لٹک کر اوپر آیا کرو گے۔'' وہ اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

کرم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں اسے پانی نہیں دوں گی۔'' زینی نے کھڑکی سے ہٹ کر کچن ایریا کی طرف جاتے ہوئے اعلان کیا۔

''اسے بڑھنے کے لیے تمہارے پانی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میری محبت کی طرح ہے تمہاری دیکھ بھال کے بغیر بھی مرے گی نہیں۔ بڑھتی جائے گی۔'' اس کی پرسکون بڑبڑاہٹ نے کچن میں جاتی زینی کے قدموں میں کوئی زنجیر ڈالی تھی۔ اس نے پلٹ کر کرم کو نہیں دیکھا۔ وہ چلتے چلتے رک گئی تھی کرم اس pot کو باندھتے ہوئے اسے دیکھے بغیر بھی جانتا تھا۔ وہ گھر میں ننگے پاؤں چلتی تھی اور وہ اس کے قدموں کی چاپ کو لفظوں کی طرح پڑھتا تھا۔ ''چاپ'' ''چپ تھی'' یوں جیسے سوچ میں پڑ گئی ہو وہ کھڑکی بند کرنے لگا اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔

''کھانا کھاؤ گے؟'' وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

''اس ویک اینڈ پر میرے گھر آؤ گی زینی؟'' کرم ہاتھ دھونے کے لیے کچن کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''کس لیے؟'' وہ فریج کا دروازہ کھولتے ہوئے رکی۔

''تمہیں میرا لان اچھا لگتا تھا کبھی دل نہیں چاہا دوبارہ آ کر دیکھو۔'' وہ tap کھولے سنک میں ہاتھ دھونے کے بعد towel سے خشک کر رہا تھا۔

وہ دروازہ پکڑے جیسے کچھ سوچنے لگی۔

''حساب کا سوال تو نہیں تھا۔ صرف دل رکھنے کی بات ہے۔'' کرم نے اسے سوچ میں دیکھ کر کہا۔

''مجھے دل رکھنا نہیں آتا کرم۔ یہ کام کب کا چھوڑ چکی میں۔'' اس کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ آ گئی وہ کھانا نکال رہی تھی۔

''میرا رکھ لو۔'' کرم نے مدھم آواز میں کہا۔

زینی نے اسے نظر انداز کیا۔ وہ پلیٹیں نکال رہا تھا۔

''کرم تم شادی کر لو۔''

وہ پلیٹیں نکالتے رک گیا۔ وہ سلاد کے لیے ٹماٹر کاٹنے میں مصروف بے حد معمول کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''کسی بہت اچھی سی لڑکی سے جو تمہارا بہت خیال رکھے کسی بڑی پیاری سی لڑکی سے۔''

''ایک پیاری سی لڑکی سے کی تھی۔ اس کا جو نتیجہ ہوا تمہیں بتا چکا ہوں۔ بار بار اپنی بیویوں کی شادی نہیں کرا سکتا میں۔'' زینی کو اس کی سنجیدگی سے کہی بات پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''تم عجیب آدمی ہو۔ اپنی بیوی کی شادی کروا دی۔'' وہ ہنستی جا رہی تھی۔

''انسان کو اتنا بھی اعلیٰ ظرف نہیں ہونا چاہیے۔''

''غلط کیا کیا؟'' وہ سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''پتہ نہیں۔'' وہ ہنسی پر قابو پانے میں ناکام ہو رہی تھی۔

''تم نے شیراز کو جیل سے کیوں نکلوایا؟''

یک دم جیسے کسی نے اس کی ہنسی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے چپ چاپ اس کو دیکھتی رہی۔ وہ کاؤنٹر کے دوسری طرف اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''اس نے ابو کا واسطہ دیا تھا مجھے۔'' وہ مدھم آواز میں کہتے ہوئے دوبارہ سلاد بنانے لگی۔

''اس نے اللہ کا واسطہ دیا تھا مجھے۔'' زینی کا ہاتھ رک گیا کرم پلیٹیں لے کر میز کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ جیسے سلاد بنانا بھول گئی۔ بہت دیر اسے ٹیبل سیٹ کرتے دیکھتی رہی۔ اس کی نظروں میں اضطراب تھا۔ اسے اپنا باپ یاد آیا تھا اس وقت پہلی بار اسے احساس ہوا اسے کرم کی طرف کون سی چیز کھینچتی تھی۔ اس کی فطرت اس کے باپ جیسی تھی۔ ویسی ہی نرمی ویسی ہی محبت، ویسا ہی ایثار، ویسے ہی اخلاق اور ویسی ہی اعلیٰ ظرفی۔ ساری زندگی اسے لگا اس کے باپ جیسا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اور آج قسمت کرم کو اس کے سامنے لے آئی تھی۔

''تم کیا مجھ سے تنگ آ گئی ہو؟'' ٹیبل سیٹ کرتے کرتے کرم کو جانے کیا خیال آیا۔

وہ دوبارہ سلاد بنانے لگی۔

''تنگ نہیں آئی۔۔۔ میں واقعی چاہتی ہوں کرم کہ تمہاری زندگی میں کوئی ایسی ہو جو تم سے محبت کرے۔۔۔تمہارے گھر کو گھر بنا کر رکھے۔۔۔ یہ جو تم ہر جگہ مارے مارے پھرتے ہونا۔۔۔ایک اچھی سی بیوی گھر پر ہوگی تو یوں خوار نہیں ہوگے تم اور یہ بھی کہ

''کہ تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔'' کرم نے اس کی بات میں اضافہ کیا۔

''میں تو ویسے ہی کچھ عرصے میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔'' اس کی بات پر کرم کو کرنٹ لگا۔

''کہاں چلی جاؤ گی تم؟'' وہ ٹیبل چھوڑ کر اس کی طرف آیا۔

''اگلے سال کے شروع میں میرا ویزا ختم ہو جائے گا۔ میں پاکستان جاؤں گی۔۔۔ ویزہ اپلائی کروں گی۔۔۔ پتہ نہیں ملتا ہے یا نہیں پھر شاید کسی دوسرے ملک میں چلی جاؤں۔۔۔''

''کہاں؟''

''پتہ نہیں۔۔۔ لیکن کہیں نہ کہیں تو جاؤں گی میں۔۔۔''

''میں لگوا دیتا ہوں ویزا تمہارا پاسپورٹ اور پیپرز۔۔۔''

''نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں'' زینی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''کیونکہ تمہیں کسی کا احسان پسند نہیں۔''

''مذاق مت اڑاؤ میرا۔'' وہ برا مان گئی۔

''میں تمہیں جانے نہیں دوں گا یہاں سے۔''

''اچھا؟۔۔۔ تم روک کیسے سکتے ہو مجھے؟'' اس نے سر اٹھا کر کرم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک دن تم یہاں آؤ۔۔۔اور تمہیں میں یہاں ملوں ہی نہ تو۔۔۔ کیا کرلو گے تم؟''

کرم بے حد خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں اذیت تھی۔

''تم میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتی زینی۔۔۔''

''کیوں نہیں کر سکتی۔'' وہ اسے تنگ کرنے لگی تھی۔

''تم کو یاد ہے نا تم کس طرح مجھے چھوڑ کر غائب ہو گئے تھے تب۔۔۔ مجھے بتایا تک نہیں تھا کہ کہیں جا رہے ہو۔۔۔ پھر میں تمہیں بتا کر کیوں جاؤں؟''

''لیکن میں واپس بھی تو آ گیا تھا۔۔۔ اور میں نے ایکسکیوز بھی کیا تھا تم سے۔''

''لیکن میں نہ تو واپس آؤں گی نہ ہی ایکسکیوز کروں گی۔'' وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

کرم کی بھوک یک دم ختم ہو گئی تھی۔ وہ دوبارہ سلاد بنانے میں مصروف تھی۔

''اس لیے تم سے کہہ رہی ہوں۔ ..شادی کرلو کسی اچھی سی لڑکی سے ورنہ پھر کس کے پاس جا کر کھانا کھایا کرو گے۔'' وہ اب اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

''تم کرو گی مجھ سے شادی؟'' سوال بے ساختہ تھا کھیرے کے ساتھ ساتھ اس کی انگلی بھی کٹتے کٹتے بچی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے ایک بار پھر سنبھل کر کھیرا کاٹنا شروع کر دیا۔

''کیوں؟''

''کیوں کے سو جواب ہو سکتے ہیں۔'' وہ اپنے کام میں مصروف بولی۔

''تم وہ جواب دو جس سے میں مطمئن ہو جاؤں۔''

وہ چند لمحے سوچ میں پڑی۔

''کوئی نہیں ہے؟'' کرم نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

بات پتہ نہیں کیوں اس موضوع پر آ گئی تھی لیکن اب اس موضوع پر آ گئی تھی تو کرم موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''کرم شادی کا رشتہ اس تعلق کو ختم کر دے گا جو ابھی ہم دونوں کے درمیان ہے۔''

''نہیں تعلق کو مضبوط کر دے گا۔...تم سمجھتی ہو شادی دوستی ختم کر دیتی ہے؟''

''نہیں میں ایسا نہیں سمجھتی۔ شادی دوستی ختم نہیں کرتی لیکن تمہاری اور میری شادی ختم کر دے گی۔''

''کیوں؟... تمہیں نہیں لگتا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں شاید اس لیے ملے ہیں۔''

زینی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''نہیں مجھے ایسا نہیں لگتا۔''

''جھوٹ مت بولو زینی'' کرم نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔

''تم اگر یہ کہو کہ میری شکل تمہیں پسند نہیں ہے۔ یا پرس کی وجہ سے تم انکار کر رہی ہو تم میں پھر بھی تمہاری بات مان لوں گا لیکن یہ وجہ مجھے مت دو کہ شادی ہماری دوستی کو ختم کر دے گی۔'' کرم نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

''تم بہت جلد بدگمان ہو جاتے ہو کرم... بہت جلد ...اور میں ایکٹریس رہ چکی ہوں میرا کریکٹر جیسے تھا تمہیں بتا چکی ہوں۔ .. سو لوگ ملیں گے تمہیں جاننے والے۔ میرے بارے میں باتیں کرنے والے تم کیا جہاں تا بدنام بھی ہو، تو وہ بھی شک کرنے لگے گا مجھ پر مشہور عورت بدقسمت ہوتی ہے کرم مشہور ہونا اپنے اندر ایک تہمت ہے کوئی جب جہاں چاہے بیٹھ کر جو چاہے کہہ دے ہر سننے والا یقین کرے گا ثبوت اور گواہ تک نہیں چاہیے ہوں گے اسے یہ شہرت کی قیمت ہے اور میں تو بدکردار بھی تھی۔''

''بس کرو زینی مت کہا کرو یہ سب کچھ بار بار تم یہ سب کچھ بھول کیوں نہیں جاتی۔'' کرم نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''تم سمجھتے ہو میں یہ کوشش نہیں کرتی؟ رات دن صرف ماضی ہی تو بھلانے کی کوشش کرتی ہوں میں۔ لیکن صبح آنکھ کھولنے پر اور

رات کو آنکھ بند کرنے سے پہلے پہلی اور آخری چیز جو مجھے نظر آتی ہے وہ ماضی ہی ہوتا ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی چھری رکھ دی تھی۔ اس کے لہجے میں تھکن تھی۔

"دنیا میں عورت بن کر "جینا" بڑا مشکل ہے کرم بعض دفعہ میرا دل چاہتا ہے میں مر جاؤں پھر سوچتی ہوں دنیا کے دوزخ میں جی کر شاید آگے دوزخ نہ ملے۔ ورنہ ہر کبیرہ گناہ تو کر چکی ہوں میں تم اچھے آدمی ہو کسی پاکباز لڑکی سے شادی کرو جس کے پاس میرے جیسا ماضی نہ ہو" وہ سر جھکائے پیالے میں سبزیوں کے ٹکڑے ڈال رہی تھی۔

"میں تمہارے ماضی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کروں گا۔ کبھی تمہیں judge نہیں کروں گا۔"

"دنیا کرے گی۔"

"مجھے دنیا کی پرواہ نہیں ہے۔" وہ جھنجلایا۔

"کیوں تم دنیا میں نہیں رہتے کیا؟" زینی نے ہنسنے کی کوشش کی۔

"میں تم پر کبھی شک نہیں کروں گا کبھی بدگمان نہیں ہوں گا تم سے۔" کرم نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔

"ویری گڈ چلو کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے بچوں کی طرح اسے بہلایا اور سلاد کا پیالہ لے کر ٹیبل کی طرف چلی گئی۔

کرم کو اس کے انداز پر بری طرح غصہ آیا تھا۔ وہ ٹیبل کی طرف جانے کی بجائے بیرونی دروازے کی طرف گیا۔

"ٹھیک ہے کھانا چھوڑ کر جا رہے ہو اب دوبارہ کبھی کھانا نہیں کھلاؤں گی تمہیں..."

وہ دروازے سے کوٹ اتارتے اتارتے رک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ بے حد خفا انداز میں کرسی پر بیٹھ رہی تھی۔ کرم پلٹ آیا۔

"تم کتنی آسانی سے مان جاتے ہو کرم۔ تم واقعی بہت اچھے انسان ہو۔" وہ کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ جب زینی نے اس سے کہا۔

"آج تک کسی نے مجھے منایا ہی نہیں۔" "منایا نہیں یا تم کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوئے۔" زینی نے اس کی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔

کرم سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی وہ واقعی کبھی کسی سے خفا نہیں ہوا تھا پھر زینی سے اس طرح ناراض کیوں ہوتا تھا۔ عارفہ سے ایک بار ہوا تھا اور اس کا نتیجہ اس کے منگنی اسے کھونے کی صورت میں ہوا تھا۔ مگر زینی سے تو بار بار خفا ہو رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟... کھانا کھاؤ؟" زینی نے اسے چونکایا۔

☆☆☆

اگلی صبح اٹھ کر آفس جانے کے لیے تیار ہوتے ہوئے اسے اس pot کا خیال آیا تھا۔ وہ سلائس کھاتی کھاتی بے اختیار کھڑکی کی طرف گئی۔ اسے کرم کی بات یاد آئی ایک مسکراہٹ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر آئی تھی۔ ایک گلاس میں پانی لا کر اس نے اس بیل میں ڈالا تھا لیکن اسے یقین تھا چند ہفتوں میں وہ بیل ختم ہو جائے گی۔ اس پوری بلڈنگ کی کسی کھڑکی میں ایسا کوئی پودا یا بیل اسے کبھی نظر نہیں آیا تھا اور پھر اب چند

مہینوں کے بعد جو موسم آنے والا تھا اس میں تو بیل یقیناً ختم ہو جاتی۔

اس کا اندازہ غلط نکلا تھا۔ وہ بیل بڑے عجیب انداز میں تیزی سے بڑھنے لگی تھی۔ وہ ہر روز اس پر نکلتے ننھے ننھے پتوں کو دیکھ کر حیران ہوتی ۔ بہت جلد وہ اتنی بڑھ گئی تھی کہ زینی کو ایک بانس کا ٹکڑا اسے سہارا دینے کے لیے pot میں لگانا پڑا۔ بیل اب اس کے گرد بل کھاتے ہوئے پھیل رہی تھی اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے کھڑکی کے شیشے سے جھانکتی اس سبز بیل پر ہی پڑتی تھی وہ بعض دفعہ اسے دیکھتی رہتی اور یہی کام کرم بھی کرتا جب وہ ہر دوسرے تیسرے دن اس کے پاس آتا۔

وہ ''بیل'' ابتدا تھی وہ چند دن بعد اس کے لیے ایک بیگ لے کر آیا تھا Armane کا ایک قیمتی لیدر ہینڈ بیگ۔

''بہت سالوں بعد میرا دل چاہنے لگا ہے کہ میں کسی کے لیے کچھ لوں۔ ورنہ آج تک صرف اپنے لیے ہی شاپنگ کرتا رہا ہوں لیکن اب جب بھی مارکیٹ جاتا ہوں ہر اچھی چیز کو دیکھ کر مجھے تمہارا خیال آتا ہے مجھے وہ تمہارے وجود پر بجتی نظر آنے لگتی ہے۔'' اس نے پہلی بار اس کے لیے ایک بیگ لانے پر اس کی خفگی پر کہا تھا۔

''اب چاہے تو اسے رکھو چاہے تو پھینک دو۔''

''تم اسے واپس لے کر نہ گئے تو میں اسے پھینک دوں گی۔'' اس نے خفگی سے اعلان کیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ''اب'' ایسا نہیں کر سکتی ایک سال پہلے کرم سے ابتدائی ملاقاتوں میں یقیناً کر دیتی۔ کرم وہ بیگ پھینکے جانے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ بے حد بے بسی کے عالم میں اس بیگ کو لیے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اتنے سالوں میں وہ پہلا تحفہ تھا جو ''قیمت'' نہیں تھا۔ ''قرض'' بھی نہیں تھا۔ اور اسے ''احسان'' بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اتنے سالوں میں وہ پہلا تحفہ تھا جسے گود میں رکھے اس نے اپنے آنسوؤں سے بھگویا تھا۔

وہ پہلا تحفہ تھا جو زینی نے قبول کیا تھا پھر بے حد غیر محسوس طریقے سے وہ اس کے لیے تحفے لانے لگا تھا۔ وہ ساری چیزیں جو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ ...کاسمیٹکس، پرفیوم، بیگز، کپڑے، سویٹرز، جیولری وہ جیسے کسی بلیک اینڈ وائٹ پکچر میں رنگ بھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ ان سارے تحفوں کو استعمال کیے بغیر رکھتی جا رہی تھی۔ اس کے پاس ایک بار پھر قیمتی چیزوں کا ایک انبار اکٹھا ہونے لگا تھا۔ وہ کئی بار رات کے پچھلے پہر تہجد کے بعد ان چیزوں کو نکال کر دیکھتی ان پر لگے چھوٹے چھوٹے کارڈز پر کرم کے ہاتھ سے لکھے مختصر پیغامات پڑھتی کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو وہ اس کا کوئی نہیں تھا اور وہ اس کا ''سب کچھ'' ہو رہا تھا۔ شیراز کا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔ وہ اولو ''امیں ہی نہیں اسے لگتا اس وقت دنیا میں واحد شخص تھا جو سب کچھ جاننے کے باوجود اسے ''اچھی لڑکی'' سمجھتا تھا۔ اس کی ''عزت'' کرتا تھا۔ جب عزت اس کے پاس تھی تو وہ ''محبت'' کو سب کچھ سمجھتی تھی۔ اب ''عزت'' نہیں تھی تو وہ ''عزت'' کی ''قیمت'' سے واقف ہوئی تھی۔

☆☆☆

چند لمحوں کے لیے کرم کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ بے حد زیادہ میک اپ کے ساتھ منی سکرٹ اور stringy top میں اپنا فربہی مائل نیم عریاں جسم لیے وہ زری ہی تھی۔ جو فٹ پاتھ کے اس حصے پر سگریٹ کے کش لگاتی کسی مرد سے باتیں کر رہی تھی کرم کو یہ نظر کا دھوکا لگا وہ اس حلیے میں رات کے اس وقت وہاں کیا کر رہی تھی۔ اور وہاں تھی ہی کیوں؟

سگنل کھل گیا تھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی۔ کرم نے گاڑی آگے بڑھا دی پانچ منٹ کے بعد وہ آگے سے ٹرن کر کے واپس آیا تھا اور واپسی پر اس نے ایک بار پھر اسے وہیں کھڑا دیکھا۔ اس بار اس کے ساتھ وہ مرد نہیں تھا۔ وہ گاڑی آگے لے گیا۔ سڑک کے کنارے کچھ دور ایک جگہ گاڑی پارک کر کے وہ بہت تیزی سے چلتا ہوا واپس آیا تھا۔ وہ کھڑی ایک دوسرا سگریٹ سلگا رہی تھی۔ سگریٹ سلگاتے سلگاتے اس نے پاس آتے کرم کو دیکھا اور اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھوٹ کر زمین پر گر پڑا وہ جیسے سکتے میں آ گئی تھی اور ایسا ہی سکتہ کرم کو بھی ہوا تھا۔ اس کا حلیہ، اس کا انداز، وہ علاقہ اور جگہ اس کے ''کام'' کا تعارف کروا رہے تھے۔

بہت دیر تک وہ دونوں اسی طرح کھڑے رہے پھر کرم نے جیسے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔

''آؤ میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔'' اس کے علاوہ وہ اور کوئی جملہ ذہن میں نہیں لا سکا تھا۔

''میرا اپارٹمنٹ پاس ہی ہے.... بس walking distance پر۔'' اس نے کپکپاتی آواز میں اپنے ایک کندھے پر لٹکی جیکٹ کو پہنتے ہوئے اور اپنے جسم کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس کا اپارٹمنٹ واقعی قریب ہی تھا وہ ایک بے حد خستہ حال اور غلیظ جگہ پر تھا اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ کے اندر آنے تک کرم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نشے میں تھی اور پوری کوشش کر رہی تھی کہ کرم کو اس کا احساس نہ ہو۔

اس عمارت کے باہر اور اندر جتنی گندگی تھی اس کے اپارٹمنٹ کی حالت بھی اس سے بہتر نہیں تھی۔ شاید بہتر ہو جاتی اگر اس کا خیال رکھا گیا ہوتا۔ وہ سٹوڈیو اپارٹمنٹ تھا اور اس وقت اس کا فرش بیئر کے خالی کینز، شراب کی خالی بوتلوں اور سگریٹ کی راکھ اور ٹکڑوں کے ساتھ تقریباً اٹا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا اسے بہت عرصے سے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ کسی نائٹ کلب کے علاوہ کرم نے کسی اور جگہ شراب کی اتنی تیز بو نہیں پائی تھی۔ اور اس بو کے ساتھ ساتھ وہاں کوکین کی بو بھی تھی یا کم از کم کرم کو محسوس ہو رہی تھی۔ اسے شدید گھٹن محسوس ہونے لگی تھی وہاں۔

زری اب وہاں پڑے اکلوتے صوفے پر پڑی چیزیں اٹھانے میں مصروف تھی۔ کرم روشنی میں پہلی بار اس کا چہرہ پاس سے دیکھ رہا تھا۔ میک اپ کی گہری تہہ بھی زری کے چہرے کی زردی اور ویرانی کو چھپانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے یوں جیسے وہ بہت عرصے سے سوئی نہ ہو۔

''جمال کہاں ہے؟'' کرم نے بالآخر اپنی خاموشی توڑی وہ چیزیں اٹھاتے اٹھاتے رک گئی۔

''پتہ نہیں۔ کبھی کبھی آتا ہے یہاں۔ آپ بیٹھیں یہاں۔''

"کبھی آتا ہے؟..... کیا مطلب؟" کرم نے اسے ٹوکا۔

"اس نے چھوڑ دیا ہے مجھے۔" زری نے کہا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اسے کھڑے ہونے میں دقت ہو رہی تھی کرم ابھی بھی کھڑا تھا۔

"تم نے وہ اپارٹمنٹ کیوں چھوڑا؟"

"پیسے ختم ہو گئے تھے میرے" اس نے صوفے پر پڑا ایک سویٹر اپنی عریاں ٹانگوں پر ڈال لیا تھا۔

"اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئے؟ تمہارے پاس حق مہر کی رقم بھی تھی زیور بھی تھا۔" کرم کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

"وہ سب جمال لے گیا۔"

"تم نے اسے دے دیا سب کچھ؟"

"اس نے چوری کر لیا تھا میرا زیور۔"

"تم کو پولیس کے پاس جانا چاہیے تھا۔"

"کیسے جاتی؟ وہ آخری سہارا تھا میرا یہاں اسے پولیس پکڑ لیتی تو میں کہاں جاتی؟"

"تم پاکستان جا سکتی تھی۔"

"نہیں جا سکتی تھی..... وہاں کس کے پاس جاتی میں؟"

"کیوں؟..... تمہارے ماں باپ ہیں وہاں۔"

"ان کے پاس جاتی تو وہ طعنے دے دے کر مار دیتے مجھے۔"

"طعنے کھا کر مرنا ایسی زندگی سے بہتر ہے جو تم گزار رہی ہو۔" کرم اپنے لہجے کی تلخی اور غصہ چھپا نہیں سکا۔

"جمال سے محبت اور اس کے لیے مجھے دھوکہ دے دینا اور بات تھی لیکن میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم یہ سب کر سکتی ہو۔" کرم کو واقعی شدید دکھ ہو رہا تھا۔

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"میں نے بھی کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں یہ سب کروں گی لیکن آپ نے کبھی پیٹ کی بھوک نہیں دیکھی کبھی غربت نہیں دیکھی ورنہ....."

کرم نے اس کی بات کاٹ دی۔ "سب کچھ دیکھا ہے میں نے سب کچھ۔ ایسی ہی سڑکوں پر بارہ بارہ گھنٹے کام کی تلاش میں پھرتا رہا ہوں میں چودہ چودہ لوگوں کے ساتھ ایک سویٹر اور جینز میں ٹھنڈے basement میں سویا ہوں میں لیکن میں کبھی حرام پیسے کے پیچھے نہیں گیا۔"

"میں کب حرام پیسے کے پیچھے گئی میں تو صرف ضرورت کے پیچھے گئی۔" زری کی آنکھوں میں اب آنسو آنے لگے تھے۔

''ضرورت عزت سے بڑھ کر نہیں ہونی چاہیے۔''

''میں نے زندگی کے 20 سال صرف ضرورت کے ساتھ گزارے ہیں کرم دن میں ایک وقت کی روٹی کی ضرورت سال میں دو جوڑے کپڑے کی ضرورت اور پتہ نہیں کون کون سی ضرورتیں تھیں جو جونکیں بن کر مجھے اور میرے گھر والوں کو چمٹی ہوئی تھیں پھر آپ سے میری شادی ہوئی صرف دو سال میں پیسے کے ساتھ رہی اور میں ضرورت کے ساتھ جینا بھول گئی دوبارہ بھوک کی ذلت کے ساتھ جینے کا حوصلہ نہیں تھا مجھ میں۔''

''اور یہ سب یہ ذلت نہیں ہے تمہارے لیے؟'' کرم کو تکلیف ہوئی۔

''جمال چھوڑ گیا تھا تم میرے پاس آتی میں کچھ نہ کچھ کرتا تمہارے لیے رہنے کی جگہ اور کام تو دے ہی دیتا تمہیں۔''

''میں آئی تھی آپ کے گھر دوبارگئی تھی آصف نے بہت بے عزتی کی میری اس نے آپ کے کینسر کے بارے میں بھی بتایا مجھے اس نے مجھے الزام دیا کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے میں کیسے جاتی آپ کے پاس پھر لیکن میں نے بڑی دعائیں کی آپ کی زندگی کے لیے۔''

کرم نے اس سے نظریں چرائیں یہ جاننے کے باوجود کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔

''اور اب پھر ملنے لگی ہو تم جمال کے ساتھ تو اس سے کہتی وہ کوئی کام کرتا تمہاری ذمہ داری اٹھاتا۔''

''وہ ڈرگز استعمال کرتا ہے شراب پیتا ہے اگر کوئی کام کرتا بھی ہے تو اس کا اپنا خرچ پورا نہیں ہوتا وہ مجھے کیا دے گا۔ وہ کہتا ہے میں نے اسے یہاں بلا کر اس کی زندگی تباہ کر دی۔'' وہ رو رہی تھی۔

''لیکن میں نے تو اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ یہ سب کرے۔''

''اور تم تم بھی لیتی ہو ڈرگز۔'' وہ کچھ دیر چپ بیٹھی روتی رہی پھر اس نے کہا۔

''تو کیا کروں؟ سکون ملتا ہے مجھے۔ ہوش میں نہیں رہتی تو پچھتاوا نہیں ہوتا مجھے۔ میں نے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی کی کرم۔ آپ کی بددعا لگ گئی مجھے۔''

''تم واپس پاکستان چلی جاؤ زری میں وہاں تمہیں گھر خرید دیتا ہوں کچھ رقم بھی دے دوں گا تم چلی جاؤ واپس وہاں جا کر تم ایک باعزت زندگی''

اس نے کرم کی بات کاٹ دی۔

''مجھے پاکستان نہیں جانا وہاں کچھ نہیں ہے میرا آپ کیا سمجھتے ہیں جو گھر اور پیسا آپ مجھے دیں گے وہ میرے پاس رہے گا؟ نہیں رہے گا میرے ماں باپ گھر والے سب آجائیں گے اپنا اپنا حصہ لینے نہیں کرم مجھے وہاں نہیں جانا یہاں میں آزاد ہوں وہاں یہ بھی ختم ہو جائے گا۔'' وہ بے حد حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی تکلیفیں اس کے چہرے پر رقم تھیں وہ اپنی عمر سے 20 سال بڑی لگ رہی تھی

لیکن وہ اس تنہائی کو پاکستان میں ماں باپ اور گھر والوں کے ساتھ جینے پر ترجیح دے رہی تھی بالکل ویسے ہی جیسے کرم کر رہا تھا کہیں نہ کہیں جا کر وہ اور زری جیسے ایک ہی جگہ جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ وہاں کھڑے ہو کر اس سے مزید سوال جواب نہیں کرنا چاہتا تھا... وہ ''قاضی'' اور ''تماشائی'' دونوں کا کردار ادا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی جیب میں اس وقت چند ڈالرز تھے اور والٹ کو چیک کرنے کے باوجود اسے زیادہ رقم نہیں ملی۔ اس نے وہ رقم زری کو دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

''میں کل یا پرسوں بھیجوں گا کسی کو یہاں یا پھر خود آؤں گا تمہارے لیے کسی بہتر جگہ پر رہائش اور کام کا انتظام کروں گا میں۔'' اس نے سیل فون میں زری کا نمبر اور ایڈریس safe کرتے ہوئے کہا۔ زری کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے کیا کہے شکریہ ادا کرے یا پچھتاوے اور شرمندگی کا اظہار کرے یا صرف خاموش ہو جائے وہ خاموش رہی تھی۔ کرم کو لڑکھڑاتے قدموں سے وہ دروازے تک اس کے روکنے کے باوجود چھوڑنے گئی تھی۔ کرم کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ اس کے رویے سے ممنونیت کا اظہار ہوتا تھا۔

''میں تمہیں کچھ عرصہ کے لیے کسی rehabilitation center بھی بھجواؤں گا تمہیں علاج کی ضرورت ہے اور جمال سے طلاق کی بھی۔'' اس نے جملے کا آخری حصہ کچھ تامل کے بعد ادا کیا۔

زری نے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بالکل خالی تھیں وہ چمک تیزی طرازی سب غائب تھی جو کبھی ان آنکھوں کا حصہ تھی۔

''میں اسے نہیں چھوڑ سکتی کرم..... وہ لچا ہے کمینہ ہے گھٹیا ہے لیکن مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

کرم بول نہیں سکا۔ پوری کائنات جیسے محبت کے نام پر فریب کھانے کو تیار تھی۔ جن کی عقلیں ساری دنیا کے سامنے چلتی تھیں محبت کے سامنے آ کر بند ہو جاتی تھیں... کیا تھا یہ انسان...؟ کیا تھے یہ مرد اور عورت؟

کینیڈا کے اس جہنم میں زری اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے آکسیجن کی طرح جمال کی محبت کی ڈوز لے رہی تھی... یہ سمجھے بغیر کہ وہ سو پوائزن تھا۔

کرم چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ کہنے کے لیے لفظ جیسے دم توڑ گئے تھے اس کے پاس... وہ اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

زری اسے جاتا دیکھتی رہی پھر دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔ وہ ہمیشہ اس کی زندگی میں فرشتہ بن کر آیا تھا اور ہر بار اس نے اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ کرم کا قرض دار پایا تھا۔

جمال کے اس کا زیور چرا کر بھاگ جانے کے بعد وہ کئی ہفتے تک اسے ڈھونڈتی رہی تھی شروع میں یہ زیور کا صدمہ اور غصہ تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ دونوں چیزیں غائب ہونے لگی تھیں وہ چاہنے لگی تھی کہ وہ واپس آ جائے وہ فوری طور پر واپس نہیں آیا اور اس کی تلاش کی بھاگ دوڑ کے سلسلے میں ہی زری وہاں بنائے گئے جمال کے کسی پاکستانی دوست سے ملنے گئی پہلے یہ وقتی شناسائی اور ہمدردی مدد کے لیے تھی بعد میں اس کا مفہوم بدل گیا۔ زری خوبصورت ضرورت مند تھی جسے نظر انداز کرنا مشکل تھا اور اسے مدد کے نام پر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں عار محسوس نہیں

ہوتی تھی... نتیجہ وہی ہوا تھا جو ہو سکتا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا... اور اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس نے ایک انڈین عورت کے نائٹ کلب میں بار اٹینڈنٹ کے طور پر کام شروع کر دیا اور بہت ساری واقفیتیں اس کی یہاں بننی شروع ہوئیں۔ اس کے مالی حالات بھی یک دم بہت اچھے ہو گئے تھے... ضمیر کے بوجھ اور چبھن کے باوجود اسے نہ تو اس زندگی سے گھن آتی تھی نہ ہی نفرت محسوس ہوتی تھی کیونکہ اس لائف سٹائل نے اس کے بہت سے مسئلوں کو حل کر دیا تھا۔ اور اسی دوران اس کے زیور سے ملنے والی رقم خرچ کر لینے کے بعد جمال ایک بار پھر اس کے پاس آ گیا تھا۔ چند شدید لڑائی جھگڑوں کے بعد ان کی ایک بار پھر صلح ہو گئی تھی اور یہیں سے زری کی زندگی عذاب بننا شروع ہوئی تھی... جمال اس کے ہر کام کے بارے میں جانتا تھا اور اگرچہ اسے اس پر اعتراض نہیں تھا لیکن وہ اس روپے کو اپنا حق سمجھتا تھا جو وہ اپنے جسم کی فروخت سے لے کر آتی تھی... دونوں کے درمیان مار پٹائی ہوتی پھر صلح ہوتی پھر وہی سب کچھ ہوتا... اور اس روٹین کے دوران زری کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ اس سے چھین کر لے جانے والی رقم صرف شراب اور ڈرگز پر ہی نہیں کسی دوسری عورت پر بھی خرچ کر رہا تھا جسے اس نے اسی طرح کے کسی اپارٹمنٹ میں رکھا ہوا تھا... ان کے جھگڑے اب اور شدید ہونے لگے تھے اور اسی فرسٹریشن میں شراب کے ساتھ زری نے پہلی بار ڈرگز کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ eating disorder کا بھی شکار ہو گئی تھی۔ اپنے ڈپریشن سے لڑنے کے لیے وہ بے تحاشا کھاتی اور اس کا جسم یک دم بے حد بے ڈول ہونا شروع ہو گیا تھا... وہ پہلے اپنے جسم کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اپنے اوپر اور اپنے استعمال کی چیزوں پر خرچ کرتی اور کسی نہ کسی حد تک اس کا guilt کا احساس کم ہوتا رہتا لیکن اب اس کی زیادہ تر رقم جمال کے پاس چلی جاتی تھی جو رقم وہ بچا پاتی وہ اس سے بمشکل ڈرگز، شراب اور یوٹیلٹی اور گروسری کے اخراجات ادا کر پاتی۔ وہ اس اپارٹمنٹ کو بھی چھوڑ کر اس سے زیادہ بدتر اور سستی جگہ پر آ گئی تھی لیکن حالات یہاں بھی زیادہ بہتر نہیں ہوئے تھے۔ ڈرگز اور شراب نوشی بڑھ جانے کے بعد بہت جلد اسے اس نائٹ کلب سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ اسے پہلے اگر گاہک وہاں سے مل جاتے تھے تو اب یہ کام سڑک پر کھڑے ہو کر کرنا پڑتا تھا اور اس جاب سے نکالے گئے آج تیسرا ہفتہ ہوا تھا جب کرم اسے اس سڑک پر مل گیا تھا۔

وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھی جب اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ جمال کس وقت دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ وہ تب چونکی جب وہ فرج کھول کر اندر سے کچھ کھانے کے لیے نکالنے لگا تھا۔ ان دونوں کے درمیان اب ایسا ہی رشتہ تھا... دونوں کے درمیان بات چیت تب ہوتی جب دونوں کو ایک دوسرے سے لڑنا ہوتا یا پھر جمال کو اس سے پیسوں کی ضرورت ہوتی... ورنہ دونوں ایک گھر میں رہ کر ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہونے پر بھی بات نہیں کرتے تھے۔

لیکن آج زری اپنی خوشی پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔

"جمال کرم آیا تھا آج۔"

جمال کو کھانا گرم کرتے کرتے جیسے کرنٹ لگا۔

"تو کہاں ملی اسے؟" وہ اتنے سال کے بعد بھی اس کے لیے "تو" ہی تھی۔

"اس نے مجھے سڑک پر دیکھا پھر میرے پاس چلا آیا۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی گیا ہے یہاں سے... کہہ رہا تھا کہ ایک دو دن

میں میرے لیے کسی گھر اور نوکری کا بندوبست کردے گا۔"

"تو تو کہہ رہی تھی اسے کینسر ہو گیا تھا۔ مرنے والا تھا وہ۔"

"اس کے بھائی نے کہا تھا مجھ سے مگر وہ تو ٹھیک تھا کہہ رہا تھا علاج ہو رہا ہے۔ مگر اب ٹھیک ہے۔"

جمال کھانا چھوڑ کر اس کے پاس چلا آیا۔

"پیسے بھی دے کر گیا ہوگا تجھے؟" اس کے لہجے میں یک دم نرمی آ گئی تھی۔ اور زری اس نرمی سے واقف تھی۔

"نہیں دیے۔ اور دیتا بھی تو تجھے کسی صورت نہ دیتی میں۔ پہلے کی طرح اب بے وقوفی نہیں کروں گی میں۔ ایک ڈالر تک گھر میں نہیں رکھنا اب میں نے۔" زری نے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

"میں تجھ سے ساری رقم نہیں مانگ رہا دو ہزار ڈالر دے دے۔ مجھے بڑی ضرورت ہے۔"

"تجھے بتایا ہے میں نے کہ وہ کچھ نہیں دے کر گیا مجھے۔ اور ضرورت تجھے کب نہیں ہوتی۔ 24 گھنٹے بھکاریوں کی طرح مانگتا رہتا ہے تو۔ اب پھر اس چڑیل کو پیسہ دینا ہوگا تو نے۔ کرم ٹھیک کہہ رہا ہے مجھے اب طلاق لے لینی چاہیے تجھ سے۔ اب تجھ سے طلاق لے کر میں کرم سے دوبارہ شادی کروں گی تو پھر قدر ہوگی تجھے زری کی۔ پھر رہنا اس چڑیل کے ساتھ تو بھوکا مرنا۔" وہ کہتے ہوئے بیڈ روم والے حصے میں چلی گئی۔ اس نے اس سے جھوٹ بولا اسے لگ رہا تھا کہ وہ اسے کرم سے جیلس کر کے اس انڈین عورت سے تعلقات ختم کرنے پر مجبور کر سکتی ہے اسے اندازہ بھی نہیں تھا اس نے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ جمال اس کی بات پر یک دم بری طرح مشتعل ہو گیا تھا۔

"میری طرف سے جہنم میں جا تو۔ مجھے کیا دلچسپی ہے تجھے اپنے ساتھ باندھ کر رکھنے میں۔ پیسے دے مجھے۔" اس نے گالیاں دیتے ہوئے زری سے کہا تھا۔ جس نے گالیوں کا جواب ویسی ہی گالیوں سے دیا تھا اور جلتی پر جیسے تیل چھڑکا تھا۔ جمال نے اسے گردن سے پکڑ لیا تھا۔

"پیسے دے مجھے۔"

"اس نے کوئی پیسہ نہیں دیا مجھے۔" اس نے اس کے ہاتھوں سے اپنی گردن آزاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تیرے پاس آئے اور تو اس سے کچھ لیے بغیر اسے جانے دے۔" جمال یقین کرنے پر تیار نہیں تھا۔

زری نے جواباً اسے کچھ اور گالیاں دی تھیں وہ اسے گالیوں کے ساتھ پہلے پیسے بھی دیا کرتی تھی اس لیے جمال کو اتنا غصہ نہیں آتا تھا جتنا خالی گالیاں کھا کر آ رہا تھا۔ اس نے زری کی گردن پوری طاقت سے دبانا شروع کر دی اور زری نے اپنے دفاع میں اس کے چہرے کو اپنے لمبے ناخنوں سے زخمی کیا۔ وہ جمال سے اپنی گردن چھڑانے میں تو کامیاب ہو گئی تھی لیکن اس کے بعد جمال کے ہاتھ میں جو چیز لگی تھی وہ اس نے زری پر کھینچ ماری تھی کچھ چیزیں زری کو لگیں کچھ سے اس نے اپنے آپ کو بچا لیا لیکن وہ شراب کی اس خالی بوتل سے اپنے آپ کو نہیں بچا پائی تھی جو جمال نے فرش سے اٹھا کر اس کے ماتھے پر ماری تھی۔ خون کا ایک فوارا اس کے ماتھے سے نکلا اور وہ تیورا کر فرش پر اوندھے منہ گری۔ جمال کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک اور بوتل پوری قوت سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر ماری تھی۔ بوتل چکنا چور ہو گئی تھی اور زری حلق سے

آواز تک نہیں نکال سکی تھی۔ پہلی ضرب نے اس کے حواس کو ماؤف کر دیا تھا دوسری ضرب نے اس کے جسم سے اٹھنے اور ہلنے کی سکت نکال لی تھی۔ وہ اسی طرح فرش پر اوندھے منہ پڑی رہی اس کا پورا وجود اس وقت جیسے مفلوج ہو گیا تھا۔ یوں جیسے اس کے پاس جسم تھا ہی نہیں صرف سانس تھا... آنکھیں تھیں اور درد سے پھٹتا ہوا سر۔

جمال اب اس کے جسم کو ٹٹول کر اور اس کی مختصر جیکٹ کی جیبوں میں اس بات کی تسلی چاہتا تھا کہ رقم اس کے پاس نہیں تھی۔ اس کے سر کے پچھلے حصے اور ماتھے سے بہتے ہوئے خون میں اسے دلچسپی نہیں تھی اس کے پاس رقم نہ ملنے پر اس نے کھڑے ہو کر گالی دیتے ہوئے ایک بار پھر پوری قوت سے اسے اپنے پاؤں کی ٹھوکر ماری تھی اس کے جسم نے اس ٹھوکر کو محسوس نہیں کیا صرف آنکھوں نے "محسوس" کیا یہ زری کی زندگی کا "حاصل اور وصول" تھا۔ خون اب فرش پر بہتا ہوا دور تک جا رہا تھا۔ جمال کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اسے کتنی شدید چوٹیں آئی تھیں ورنہ یہ پہلی بار نہیں تھا کہ اس نے زری کو اس طرح مار مار کر لہولہان کیا تھا۔ وہ ہر بار ٹھیک ہو جاتی تھی کبھی نہیں مری تھی پھر اب کیسے مر سکتی تھی وہ اب گھر میں ہر اس جگہ وہ رقم ڈھونڈنے لگا تھا جو اس کے خیال میں کرم زری کو دے کر گیا تھا پانچ دس ہزار ڈالر تو ضرور ہوں گے اسے یقین تھا اتنا پیسہ تو کرم دیتا ہی۔ وہ گالیاں دیتے ہوئے ڈھونڈنے میں ناکام ہونے پر زری کو کوس رہا تھا۔ فرش پر گری زری پر ایک نظر بھی ڈالے بغیر۔

☆☆☆

"آج بیل کیوں نہیں بجائی؟" زینی نے قدرے حیرانی سے کچن میں کام کرتے ہوئے کرم کو دیکھا جو اپنی چابی سے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

"پتہ نہیں خیال نہیں آیا۔" وہ الجھا ہوا صوفے پر جا کر بیٹھ گیا آج اس نے اپنا کوٹ بھی نہیں اتارا تھا۔ زینی نے قدرے حیرانی سے کچن میں کھانا پکاتے ہوئے اسے دیکھا وہ بہت کم اتنا اپ سیٹ ہوتا تھا... آج کیا بات ہو گئی تھی۔

"کیا بات ہے کرم؟" اس نے دور سے ہی کرم سے کہا

وہ صوفے پر بیٹھا کھڑکی سے نظر آتی اس مختصری بیل کو گھور رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے زینی کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا۔

وہ کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی تھی پھر ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اس بار اس سے کچھ نہیں کہا تھا کچھ دیر اسی طرح خاموش بیٹھے رہنے کے بعد کرم نے اس سے کہا۔

"میں کل رات زری سے ملا۔" زینی چونکی۔

"کہاں؟"

"یہاں سے واپسی پر ایک علاقے کے فٹ پاتھ پر کھڑی تھی وہ hooker کے طور پر۔"

زینی بول نہیں سکی۔

وہ بے حد رنجیدہ آواز میں اسے سب کچھ بتاتا رہا۔

"اس کو طلاق لینی چاہیے جمال سے۔" کرم نے جیسے اپنی بات کے اختتام پر اپنا فیصلہ دیا۔

وہ خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی پتہ نہیں کیوں آج پہلی بار اس کے منہ سے زری کا نام سن کر اسے اچھا نہیں لگا تھا زری سے ہمدردی محسوس کرنے کے باوجود۔

"یہ سب میرا قصور ہے نہ میں جمال کو یہاں بلا کر اس کے ساتھ اس کی شادی کرتا نہ یہ سب ہوتا۔" کرم پچھتا رہا تھا۔

"مجھے اسے پاکستان بھیج دینا چاہیے تھا۔"

"تم وہاں اسے بھیجتے وہ وہاں جا کر بھی یہی کرتی۔"

"ہاں لیکن تب کم از کم وہ یہ سب کچھ نہ کر رہی ہوتی میں نے اسے طلاق دے کر بہت جلد بازی کی۔" کرم کو کہتے ہوئے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ اس کے چہرے پر کچھ کھوجنے لگی تھی زری کے لیے کوئی خاص جذبہ۔

"اسے جمال سے طلاق دلوائے بغیر اس کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔

اور وہ صرف سن رہی تھی وہ زری سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہتی تھی کرم سے لیکن اس کو لفظ ڈھونڈنے میں عجیب دقت ہو رہی تھی۔

"مجھے اس کی مدد کرنی ہے۔" کرم نے کہا۔

"ہاں تمہیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔" زینی نے بے حد بے دلی سے کہا۔

"مجھے جانا ہے اب۔" کرم نے یک دم گھڑی دیکھی۔

"کہاں؟" وہ چونکی وہ اتنی جلدی نہیں جاتا تھا۔

"مجھے زری کے پاس جانا ہے اس کے لیے ایک اپارٹمنٹ کا بندوبست کیا ہے میں نے۔"

"اور کھانا؟"

"نہیں وہ میں نہیں کھاؤں گا۔" وہ کہتے ہوئے چلا گیا۔

اتنے عرصے میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اس طرح اس کے پاس آ کر کچھ کھائے پیئے بغیر گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد زینی کی بھوک بھی مر گئی تھی وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اس کو شادی کا مشورہ دیتی رہتی تھی اس کے باوجود ایک دوسری عورت جو اس کی سابقہ بیوی تھی کے لیے اس کی بے قراری دیکھ کر وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ کہیں نہ کہیں کوئی جذبہ تو ہوگا کرم کے دل میں زری کے لیے کہ وہ اتنے عرصہ بعد زری سے اتنا بڑا دھوکہ کھانے کے باوجود اس کی مدد کے لیے یوں بھاگ رہا تھا اور جمال سے طلاق کیا وہ اس لیے دلوا رہا تھا کہ دوبارہ اس کے ساتھ شادی زینی اس سے بری طرح بدگمان ہونے لگی تھی وہ اس وقت کرم کو "اچھی فطرت" رکھنے والا انسان نہیں صرف وہ مرد سمجھ کر دیکھ رہی تھی۔ جو اسے "اچھا" لگتا تھا وہ بے چینی سے اپنے اپارٹمنٹ میں پھرتی رہی جیسے بلآخر کرم کی زندگی میں بالآخر ایک دوسری عورت آ گئی تھی اور زینی کی

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

کرم کے وہاں سے جانے کے کئی گھنٹے بعد تک وہ کرم کی کسی کال message کا انتظار کرتی رہی جو وہ ہمیشہ گھر پہنچنے کے بعد اسے کرتا تھا کوئی message کوئی کال نہیں آئی۔ زینی پوری رات بری طرح روتی رہی کرم نے ایک بار پھر جیسے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا وہ اگلے دن کام پر نہیں گئی ... وہ تقریباً سارا دن کھائے پیئے بغیر کھڑکی کی بیل کے پاس کھڑی اس کے گرتے ہوئے پتے دیکھتی رہی ... جن گرتے ہوئے پتوں کو کچھ دن پہلے وہ آئندہ ایک آدھ ہفتے میں شروع ہونے والی برف باری کا اثر سمجھ رہی تھی آج وہ ان گرتے پتوں کو کچھ اور مفہوم پہنا کر رو رہی تھی۔

اس دن چار بجے تک کرم کی کوئی کال کوئی message نہیں آیا اور چار بجے بالآخر اسے کرم کا message آیا تھا۔ "I am very upset. Someone murdered Zari last nite."

زینی کے ہاتھ یک دم کپکپانے لگے تھے۔ اس نے یہ کبھی نہیں چاہا تھا پوری رات ایک بار بھی ایسی کوئی خواہش اس نے نہیں کی تھی پھر اس نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ کرم کو فون کیا۔ ہیلو کہنے کے بعد دونوں چپ ہو گئے تھے۔

"تم کہاں ہو اس وقت؟" زینی نے اس سے کہا۔

"میں گھر پر ہوں۔"

"میں آ جاؤں؟"

"تمہیں پوچھنے کی ضرورت ہے؟"

زینی نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اس نے اسے گھر کے دروازے پر ریسیو کیا تھا ... وہ نائٹ سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات نہیں سویا تھا۔

"کل صبح کے وقت اس کی کسی فرینڈ نے لاش دیکھی ... زری نے اس کے ساتھ کل کہیں جانا تھا ... بار بار بیل بجانے پر جب وہ باہر نہیں آئی تو اس کی دوست نے اپنی چابی سے دروازہ کھولا۔"

وہ خالی آنکھوں اور بے تاثر چہرے کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ اس کے بعد خاموش ہو گیا۔ بہت دیر تک دونوں لاؤنج میں اسی خاموشی سے بیٹھے رہے۔ وہ منتظر تھی وہ بات شروع کرے گا اسے زری کے مرڈر کے بارے میں بتائے گا لیکن وہ خاموش تھا۔

"I am sorry" بالآخر زینی نے بات شروع کی۔

"میں جانتی ہوں تم بہت اپ سیٹ ہو ... وہ تمہاری بیوی رہی ہے اور تم یقیناً اس کے لیے بہت خاص feelings رکھتے ہو ... میں سمجھ سکتی ہوں کہ ..." اس نے سنبھل کر کہنا شروع کیا۔

کرم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں تمہارے بارے میں اپ سیٹ ہوں۔"

وہ حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"پرسوں رات تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ تم بھی ایک بُرے علاقے میں رہتی ہو۔ اور وہ بھی۔ اکیلے اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو۔" کرم نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں جلد ہی جگہ بدل لوں گی۔" اس نے کرم کو تسلی دی۔

"جلد ہی کیوں؟ کل کیوں نہیں؟"

"کرم میرا لائف اسٹائل زری جیسا نہیں ہے۔ مجھے زری جیسے خطرات نہیں ہیں۔ کچھ نہیں ہوتا۔"

"زینب ضیا تم بے حد ضدی ہو۔"

زینی کو اس کا جملہ اس وقت بے حد برا لگا۔

"ہاں ہوں۔ اور مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اتنے عرصہ سے اس علاقے میں رہ رہی ہوں۔ کچھ نہیں ہوا مجھے۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

"اور مجھ سے بالکل یہ مت کہو کہ تم میرے لیے پرسوں رات سے اپ سیٹ ہو۔۔۔ تم صرف زری کے بارے میں پریشان ہو اتنا تو میں بھی دیکھ سکتی ہوں۔ وہ آج زندہ ہوتی تو اس وقت بھی تم اس کے پاس بیٹھے ہوتے میرے پاس نہیں۔ تم جمال سے بھی اسی لیے طلاق دلوانا چاہتے تھے اسے تاکہ اس سے دوبارہ شادی کر سکو۔"

کرم اس کے الزام پر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ زینی خفگی میں یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ اس وقت کرم کو تسلی دینے وہاں آئی تھی۔ کل رات سے جو کچھ اس کے اندر پک رہا تھا اب اس کی زبان سے لاشعوری طور پر نکل رہا تھا۔

"اور مجھے بہت دکھ ہے کہ تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ لیکن کوئی بات نہیں ابھی عارفہ تو ہے نا۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ بھی کہیں مل جائے تمہیں اور اس کو بھی تمہاری مدد کی ضرورت پڑے۔"

کرم بھونچکا اسے دیکھ رہا تھا وہ اس کی زبان سے پہلی بار عارفہ اور زری کا ذکر اس طرح سن رہا تھا اور اسے زینی کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا۔

"تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ تم ہی تو کہتی ہو شادی کروں میں کسی سے۔ پھر میں جس سے مرضی کروں۔" وہ بھی خفگی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔

زینی کچھ بول نہیں سکی اس کے بہتے آنسوؤں میں یک دم اضافہ ہو گیا۔

ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ دروازے کی طرف چلی گئی۔ کرم بے اختیار اس کے پیچھے گیا۔

"میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

''نہیں اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔

''I am sorry'' کرم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں نے تم سے کیا کہا مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی sorry'' اس کے انداز میں اتنی عاجزت تھی کہ زینی رک گئی۔ اس وقت اسے بھی احساس ہوا تھا کہ اس نے کرم کو بہت نامناسب باتیں کہہ دی تھیں جبکہ وہ یہاں پر اس سے تعزیت کے لیے آئی تھی۔

''مجھے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' اس نے بھی بے ساختہ کہا۔

''آؤ میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔'' کرم نے موضوع بدل دیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس اندر لے گیا۔

☆☆☆

وہ واش بیسن کے سامنے جھکی پانی اپنی دونوں ہاتھوں کی مٹھی میں لیتے لیتے رک گئی تھی اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں کچھ تھا۔ اس نے بے حد ہکا بکا انداز میں اپنا ہاتھ پلٹ کر دیکھا اور ساکت رہ گئی اس کے ہاتھ میں پلاٹینم کی ایک انگوٹھی تھی جس میں Till death do us part (جب تک موت ہمیں جدا نہ کر دے) کے لفظ چمک رہے تھے۔ وہ بل نہیں سکی تو وہ پچھلی رات تین بجے اسے یہ دینے کے لیے اس کے اپارٹمنٹ آیا تھا اور وہ سمجھی تھی وہ دو دن پہلے زری کی موت کی وجہ سے ذہنی طور پر اتنا پریشان تھا کہ رات کو دوبارہ اس وقت اس کے پاس چلا آیا۔ انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ بری طرح کپکپانے لگا تھا۔ وہ اس انگوٹھی کا مطلب بوجھ سکتی تھی لیکن اسے اس وقت یہ کوئی خواب لگ رہا تھا۔ وہ رات کس وقت آیا تھا اسے یاد تھا مگر کب گیا اسے یاد نہیں آیا اور اس نے کس وقت اسے یہ انگوٹھی پہنائی اسے یہ بھی یاد نہیں آیا۔ اس نے tap بند کر دیا اور واش بیسن کو تھام لیا چند لمحوں کے لیے اسے یوں ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس کے پیروں سے جان نکل گئی تھی۔ بہت دیر اس انگوٹھی کو دیکھتی وہ اسی طرح وہاں کھڑی رہی پھر اسے یاد آیا وہ تہجد پڑھنے کے لیے اٹھی تھی اس نے وضو کرنا شروع کر دیا اور وضو کے دوران اس نے کب رونا شروع کر دیا اسے پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ ایک انگلی جو کسی وعدے کی گرفت میں تھی اس کے پورے وجود کو کہیں اڑائے لے جا رہی تھی اسی انگلی میں کئی سال پہلے بھی ایک انگوٹھی پہنائی گئی تھی اور وہ سستے نگینے کی اس ہلکی سی انگوٹھی کو اپنی کائنات سمجھ کر ہاتھ میں لیے پھرتی تھی۔ ... وہ سرشاری اور وہ غرور اسے آج بھی اشکبار کر رہے تھے آج اتنے سالوں کے بعد ایک دوسری انگوٹھی کو وہ انگلی سے اتار دینا چاہتی تھی کسی دوسرے وعدے کی زنجیر سے خود کو مصلوب نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اسے اتار نہیں پا رہی تھی۔ وہ اس دن تہجد میں بری طرح روتی رہی۔

☆☆☆

کرم نے آگے بڑھ کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی کو دیکھا پھر بڑے اطمینان سے کہا۔

''یہ ایک رنگ ہے engagement ring'' وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس کے گھر بغیر اطلاع دیے آئی تھی کرم اس وقت ناشتہ کی ٹیبل پر تھا اور زینی نے اندر آتے ہی اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے؟''

"میں جانتی ہوں..... لیکن میں اس کا مطلب پوچھ رہی ہوں۔" وہ سنجیدہ تھی۔

"اس پر لکھے ہوئے لفظوں کا؟"

وہ انجان بنا۔

"کرم میں سیریس ہوں۔" زینی نے اس کی بات کاٹی۔

"بیٹھ جاؤ۔" کرم نے ایک کرسی نکالتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ بیٹھ گئی۔

"چائے پیو گی؟" کرم نے کہا۔

"چار میل سے چائے پینے آئی ہوں۔"

"نہیں ناشتہ بھی کرنا چاہتی ہو؟" وہ کرم کی بات پر مسکرائی تک نہیں صرف اسے دیکھتی رہی۔

کرم سنجیدہ ہو گیا۔

"تم جانتی ہو یہ ring میں نے کب لی تھی؟"

وہ سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہی۔

"اسی رات دوبئی ایئر پورٹ سے جس رات میں نے تمہیں فیشن شو میں دیکھا تھا۔ کیوں لی مجھے سمجھ نہیں آئی لیکن وہاں اسے لیتے ہوئے میرے ذہن میں تمہارا خیال ہی آیا تھا کئی سال یہ میرے پاس پڑی رہی۔ پھر جب تم یہاں کینیڈا آئی تو میں تمہیں پرپوز کرنا چاہتا تھا اسی رنگ کو دینا چاہتا تھا لیکن تم اس رات مجھے کچھ اور سمجھ رہی تھی۔ زری سے میری شادی ہوگئی لیکن میں نے اسے کبھی یہ رنگ نہیں دی۔ کئی بار دینی بھی چاہی لیکن کوئی چیز آڑے آجاتی تھی۔ "دل" وہ ہنسا "کل تم یہاں آئی۔ مجھ سے ناراض ہوئی۔ جب چلی گئی تو میں تمہاری باتوں کے بارے میں سوچتا رہا... الجھتا رہا... رات کو دو بجے بالآخر مجھے سمجھ آئی کہ تم نے عارفہ اور زری کا نام اس طرح کیوں لیا... وہ آگ جس میں گیارہ سالوں سے جل رہا ہوں اس نے تمہیں بالآخر اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

تم اعتراف کبھی نہیں کرو گی کبھی مجھ سے یہ نہیں کہو گی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے لیکن میری دی ہوئی بیل کو پانی سے سینچ سینچ کر مجھے یہ ضرور بتاتی رہو گی کہ آج دو نئے پتے نکل آئے ہیں... آج پتے گر گئے ہیں... کبھی یہ نہیں مانو گی کہ تم بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتی... لیکن میرے رابطہ نہ کرنے پر غصے میں رو رو کر طوفان اٹھا دو گی۔ کبھی یہ نہیں کہو گی کہ تم میرا انتظار کرتی ہو لیکن میرے لیے ٹیبل پر کھانے کے برتن رکھتی رہو گی۔ میری خوشی کے لیے کبھی میرے گھر نہیں آؤ گی لیکن مجھے تکلیف میں دیکھ کر بھاگتی آؤ گی۔ مجھے زور و شور سے شادی کا مشورہ دو گی لیکن میری زندگی میں آنے والی اور گزرنے والی کوئی عورت برداشت نہیں ہو سکے گی تم سے... اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کیونکہ تم مجھے "دوست" سمجھتی ہو۔" وہ ہنس پڑا۔

وہ اس کے دل کو جیسے کتاب کی طرح پڑھ رہا تھا... پڑھ کر رہا تھا۔ زینی نے زندگی میں ایسی ندامت کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

"زینب ضیاء میں تمہارا دوست نہیں ہوں... "کیا" ہوں... یہ تسلیم کرو تم"

زینی نے نظریں جھکا لیں وہ نہیں چاہتی تھی وہ دل کے بعد اب اس کی آنکھیں بھی پڑھنے لگے۔

کرم نے ہاتھ بڑھا کر اس کے انگوٹھی والے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''تم یہی چاہتی تھی نا کہ میں کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لوں جو مجھے بہت محبت دے میرے گھر کو گھر بنائے تاکہ میں خوار نہ ہوتا پھروں یہ سارے کام تم سے اچھے تو کوئی نہیں کر سکتا'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔

زینی نے سر جھکائے اپنی آنکھوں اور گالوں کو ہاتھ کی پشت سے رگڑا۔

''بیل کو پانی میں نے پودا سمجھ کر دیا تھا اور اس طرح بغیر بتائے رابطہ ختم کرنا بدتمیزی تھی اس لیے غصہ آیا مجھے اور کھانے کے برتن میں اس لیے ٹیبل پر رکھتی ہوں کیونکہ کبھی کوئی مہمان آسکتا ہے اور کل میں تعزیت کے لیے آئی تھی یہاں جو ہر مسلمان پر فرض ہے اور میں عارفہ اور زری سے حسد کیوں کروں گی میں نے تو کبھی ان کے بارے میں سوچا تک نہیں۔'' اس نے کرم کے ہاتھوں سے ہاتھ چھڑائے بغیر بھرم رکھنے کی آخری کوشش کی۔

وہ بے اختیار مسکرایا پھر بے اختیار سنجیدہ ہو گیا۔

''I trust you یقیناً یہ سب ایسے ہی ہوگا جیسا تم کہہ رہی ہو لیکن یہ سب تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتی ہو؟''

''میں اسے ضروری نہیں سمجھتی۔'' اس نے ہلکی سی خفگی کے ساتھ اس کے ہاتھوں سے ہاتھ چھڑانا چاہا میں سچ بول رہی ہوں اور مجھے ثبوت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے بالآخر ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ گئی۔

''جانے سے پہلے چائے تو بنا کر دے سکتی ہو مجھے۔'' کرم نے کہا۔

وہ چند لمحے کھڑی کشمکش میں رہی۔ پھر اس نے بالآخر چائے بنانا شروع کر دی۔

''میں تمہاری ملازمہ نہیں ہوں۔'' چائے کا کپ کرم کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے خفگی سے کہا۔

''سلائس پر مکھن لگا دو۔'' کرم نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں اس کام کے لیے یہاں نہیں آئی۔'' زینی نے سلائس اور knife اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کی خفگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے سلائس اس کے سامنے پلیٹ میں رکھ دیا۔

''اور انڈہ بھی چھیل دو۔'' اس نے بے حد اطمینان سے اگلا حکم دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے کوئی ناشتہ کروا رہا تھا۔ زینی نے اس بار کچھ نہیں کہا اس نے خاموشی سے انڈہ اٹھا کر اسے چھیلنا شروع کر دیا۔

کرم نے knife کے ساتھ سلائس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ایک ٹکڑا اٹھا کر اس نے اس پلیٹ میں رکھ دیا جو زینی کی کرسی کے سامنے پڑی تھی۔

''یہ تمہارے لیے... تمہارا حصہ'' وہ اپنا حصہ کھانے لگا تھا۔

زینی انڈہ چھیلتے چھیلتے رک گئی۔ سلائس کے اس آدھے حصے کو دیکھتے ہوئے اسے شیراز یاد آیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح اسے کھلایا کرتی تھی کبھی اپنے ہاتھ کی پکی چیزیں کبھی اس کی لائی ہوئی چیزیں۔ لیکن اسے یاد نہیں تھا کہ شیراز نے کبھی اپنے حصے میں سے کبھی اس کے لیے کوئی حصہ نکالا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھی صرف اسے کھاتا دیکھتی تھی اور صرف اسی بات پر مسرور ہوتی رہتی تھی کہ وہ پیٹ بھر کر کھا رہا تھا۔ زندگی میں آج تک صرف اس کا باپ تھا جس نے اپنے حصے کا نوالہ اسے دیا تھا اور آج اس شخص نے دیا تھا جو کرسی پر بیٹھا اب اپنے حصے کا سلائس کھا رہا تھا۔

آنسوؤں نے پھر کسی بند کو توڑا تھا۔ وہ آہستگی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہاتھ میں پکڑا اچھلا ہوا انڈہ اس نے اپنی پلیٹ میں رکھا پھر اپنے knife کے ساتھ اس کے دو ٹکڑے کر دیے پانی ہر منظر کو دھندلا کر رہا تھا۔ اس نے ایک ٹکڑا بڑی سہولت کے ساتھ کرم کی پلیٹ میں رکھا اور اس پر نمک اور کالی مرچ چھڑکنے لگی یوں جیسے وہ ہر روز روٹین میں یہی سب کرتی ہو۔ کرم ہاتھ بڑھا کر اس کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کرنے لگا یوں جیسے وہ ہر روز روٹین میں یہی سب کرتا ہو۔ زینی نے اس بار اس کو نہیں روکا تھا اس کی شرٹ کی آستین کہنیوں تک مڑی ہوئی تھیں اس کے گلے کے اوپر والے دونوں بٹن کھلے ہوئے تھے وہ بدنما داغ جو وہ پوری دنیا سے چھپاتا پھرتا تھا بہت عرصے سے اس کے دائیں ہاتھ کرسی پر بیٹھی لڑکی دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے برص کو اس سے نہیں چھپاتا تھا کیونکہ اس نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے کبھی تحقیر یا گھن نہیں دیکھی تھی۔

conservatory میں بیٹھے وہ دونوں ایک عجیب "بولتی خاموشی" کے سحر میں تھے۔ وہ "کہہ" رہے تھے جو نہیں کہہ پا رہے تھے وہ "سن" رہے تھے جو سننا چاہتے تھے۔ وہ "بوجھ" رہے تھے جو ہمیشہ سے جانتے تھے۔ وہ "کھوج" رہے تھے جو ہمیشہ سے اوجھل تھا۔ محبت "کمال" کرتی ہے محبت "کمال" کر رہی تھی۔

☆☆☆

نفیسہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ فون کان سے لگائے لگائے انہوں نے دوبارہ جیسے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا۔

"تم شادی کر رہی ہو؟" وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ نفیسہ کا دل بے اختیار خوش ہوا انہوں نے اس کی بلائیں لی تھیں۔ ایسی ہنسی انہوں نے زینی کے منہ سے کب سنی تھی انہیں فوراً یاد نہیں آیا۔ مگر وہ بہت پہلے کی بات تھی۔

"جی امی شادی کر رہی ہوں۔" نفیسہ کا دل سویلی کی گھنٹی کی رفتار سے دھڑکنے لگا تھا۔ زینی انہیں کرم کے بارے میں بتا رہی تھی۔ نفیسہ اس کی آواز سنتے ہوئے جیسے خوشی سے بے قابو ہو رہی تھیں۔ کیسی زندگی تھی جو اس کی آواز سے جھلکنے لگی تھی۔ کیسی کھنک تھی جو اس کے لہجے میں آ گئی تھی کیا سرشاری تھی جو اس کی باتوں سے محسوس ہو رہی تھی۔ نفیسہ آنکھوں میں آنسو لیے بچوں کی طرح اس کے ساتھ کئی بار اسی کی طرح کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔ خوشی سے بے یقینی سے تشکر سے۔ وہ آخری آزمائش ختم ہونے والی تھی جس نے ان کو اتنے عرصے سے جیسے کانٹوں پر کھڑا رکھا تھا۔

"آپ کرم سے بات کریں۔" وہ اب ان کی بات کرم سے کروا رہی تھی اور نفیسہ کی باتیں خوشی سے بے ربط ہونے لگی تھیں انہیں سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہیں۔ کرم خود ہی انہیں اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ شادی کی تاریخ اور شادی کے پروگرام کی تفصیل وہ

ان کی آمد کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے زینی اور کرم کے ساتھ باتیں کرتے رہنے کے بعد فون بند ہوا تھا اور فون بند کرتے ہی نفیسہ نے سلمان کو اس کے آفس فون کیا وہ اس وقت خوشی سے کچھ ایسی ہی بے حال ہو رہی تھیں سلمان زینی کی شادی کی خبر سن کر ان کی طرح بے اختیار نہیں ہوا تھا لیکن وہ خوش تھا یہ نفیسہ فون پر بھی محسوس کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

''سلطان میں زینی ہوں۔'' سلطان کا دل جیسے خوشی سے اچھلا تھا۔

''پری جی آپ آپ کہاں ہیں؟'' اسے لگا جیسے وہ پاکستان واپس آ گئی ہے۔

''پری جی نہیں ہوں میں زینب ضیاء ہوں'' زینی نے اسے ٹوکا اور ''پاکستان میں نہیں یہیں ہوں۔''

''اتنے عرصہ کے بعد آپ کو سلطان کی یاد آئی۔'' سلطان نے گلہ کیا۔

وہ جواباً ہنسی سلطان کو عجیب سا احساس ہوا۔

کچھ بدلا ہوا ہے پری جی میں اس نے سوچا۔

''ہاں دیر سے یاد آئی پر دیکھو آ تو گئی۔'' وہ ہنس رہی تھی۔

''سنا ہے سونیا کو سٹار بنا دیا ہے تم نے۔'' وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

''جب آپ چلی گئیں تو شوبز کے آسمان کو روشن رکھنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔'' سلطان نے پھر شکوہ کیا۔

''میں ہر روز یاد کرتا ہوں آپ کو ہر روز۔'' سلطان کی آواز بھرا گئی وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ زینی کو اس پر پیار آیا۔

''اب رونا مت شروع کر دینا۔'' اس نے اسے ڈانٹا۔

''اچھا سنو کینیڈا آ ؤ گے؟'' زینی نے اگلے ہی جملے میں کہا۔

''کیوں؟'' وہ چونکا۔

''کسی کی شادی ہو رہی ہے۔''

سلطان نے بے اختیار چیخ ماری۔

''آپ کی؟''

زینی بے اختیار ہنسی۔ وہ اب تقریباً چلاتے ہوئے سوال پر سوال کر رہا تھا۔

''کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے؟''

''تم جانتے ہو اسے۔''

سلطان نے ایک اور چیخ ماری۔

''کرم علی؟'' زینی ہنستی گئی۔ سلطان واقعی آفت تھا ایک سیکنڈ بھی نہیں لگایا تھا اس نے کرم کا نام بوجھنے میں۔

''میں نہیں آؤں گا تو اور کون آئے گا آپ کی شادی میں، میں نے ہی تو کہا تھا کرم علی سے شادی کرنے کو۔ اللہ میرا دل چاہ رہا ہے اڑ کر پہنچ جاؤں میں آپ کے پاس۔''

''ہاں تو آ جاؤ کرم سے کہا ہے میں نے تمہارے ویزے اور ٹکٹ کے لیے۔ اسی لیے فون کر رہی ہوں تمہیں۔'' زینی نے اس سے کہا۔

وہ اپنی فیملی کے علاوہ وہ واحد شخص تھا جسے وہ اپنی شادی میں بلا رہی تھی۔

شادی کے لیے ایک ماہ بعد کی ڈیٹ طے کی تھی دونوں نے اور آج کل دونوں اس کے انتظامات میں لگے ہوئے تھے۔ کئی سالوں کے بعد سلمان نے اور ربیعہ نے اسے فون کیا تھا۔ ساری باتیں آنسوؤں میں ہوئی تھیں۔ کسی نے کسی سے کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ پلوں کے نیچے سے اب اتنا پانی بہہ گیا تھا کہ کوئی بھی پیچھے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اور اتنے سالوں میں پہلی بار سلمان نے اپنی بیوی اور بیٹے سے بھی اس کی بات کروائی تھی۔ اتنے سالوں بعد وہ بالآخر فیملی کے ممبر کے طور پر تسلیم کر لی گئی تھی۔ سلمان نے شادی کے لباس اور زیورات کے لیے اس کے اکاؤنٹ میں ایک بڑی رقم ٹرانسفر کروائی تھی۔ نفیسہ دو ہفتے تک اس کے پاس کینیڈا آنے والی تھیں تاکہ شادی کے انتظامات دیکھ سکیں اور اس کے باقی بہن بھائی بھی اپنا اپنا پروگرام سیٹ کرنے میں مصروف تھے۔ نفیسہ کے آنے سے پہلے وہ وقتی طور پر کرم کے ملکیتی ایک دوسرے گھر میں شفٹ ہونے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ تاکہ اس کی فیملی بھی کینیڈا آنے پر اکٹھے اس کے ساتھ رہ سکیں۔

وہ حسین تھی لیکن جیسی چمک کرم نے ان چند دنوں میں اس کی آنکھوں اور چہرے پر دیکھی تھی ویسی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی ہر گزرتے دن کے ساتھ زینی پر نظر ٹھہرانا مشکل ہوتا جا رہا تھا اس کے لیے وہ اور کرم سارا سارا دن شاپنگ مالز میں پھرتے رہتے تھے۔ وہ شادی سے پہلے گھر کو نئے سرے سے renovate کر رہے تھے اور وہ سارا دن پارے کی طرح گردش میں رہتی تھی۔ نان سٹاپ بولتی بچوں کی طرح کھلکھلاتی ہر دوسرے منٹ اسے کرم کو ایک نئی چیز کے بارے میں بتانا یاد آ جاتا تھا اس نے زینی کے کئی روپ دیکھے مگر یہ روپ اس نے نہیں دیکھا تھا اور اگر باقی روپ بھلانا مشکل تھے تو یہ روپ نظر انداز کرنا بھی ناممکن تھا وہ تقریباً ہر روز ہی اس کی فیملی کے کسی نہ کسی فرد سے بات کر رہا تھا۔ اور وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ زینی کی خوشی کا تعلق صرف اس کے ساتھ شادی سے نہیں اس کا تعلق ان ٹوٹے ہوئے رشتوں کے دوبارہ جڑنے سے بھی تھا۔

کئی سالوں بعد وہ دونوں بالآخر ''ایک گھر'' بنا رہے تھے۔ اس شخص کے ساتھ جن سے انہیں محبت تھی۔ کئی سالوں کے بعد وہ تنہائی ختم ہو رہی تھی جو اتنے سالوں سے ان دونوں کو کھنور کی طرح اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ وہ ٹین ایجرز کی طرح آنے والی زندگی کی ایک ایک چیز کو پلان کر رہے تھے یہ جانے بغیر کہ زندگی ان کے لیے کچھ اور پلان کر رہی تھی۔

☆☆☆

کرم اسے دیکھ کر ہل نہیں سکا وہ بلڈ ریڈ کلر کے سلک کے شلوار قمیض میں ملبوس تھی اور کمر سے کچھ اوپر اس کے سیاہ سیدھے بال اس وقت لٹوں کی صورت میں جھول رہے تھے شیفون کا سرخ دوپٹہ سینے پر پھیلائے اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے دروازہ کھولا کرم کو دیکھتے ہوئے مسکرائی اور پھر اسی طرح بھاگتے ہوئے واپس چلی گئی کرم نے اسے پہلی بار حقیقی زندگی میں سرخ لباس میں دیکھا تھا اور وہ اس سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ کسی سنگار کسی جیولری کے بغیر بھی اس کی سفید رنگت اس سرخ لباس میں دمک رہی تھی۔

"میں نے تم سے کہا بھی تھا کچھ دیر سے آنا لیکن تم اتنی جلدی آ گئے ... ابھی میں تیار بھی نہیں ہوئی۔" دروازہ بند کر کے اندر جاتے ہوئے اس نے زینی کو کہتے سنا اور چند قدم آگے جا کر اس نے لاؤنج میں بکھرے سامان کو دیکھا تھا وہ سارے اسی کے دیے گئے تحائف اور ان کی پیکنگ تھی وہ پہلی بار زینی کے اپارٹمنٹ میں اتنی بے ترتیبی دیکھ رہا تھا زینی دوبارہ واش روم کے مرر کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بال dryer سے خشک کرنے لگی تھی۔

"یہ سب کچھ سمیٹنے کے لیے میری مدد کی ضرورت ہے؟" کرم نے لاؤنج کی بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ... نہیں ... یہ میں آ کر سمیٹوں گی۔" اس نے وہیں سے کرم کو منع کیا۔ وہ لاؤنج میں بکھری چیزوں اور ان کی پیکنگ پر نظر ڈالنے لگا۔

"تم نے میرے دیے ہوئے ان گفٹس کو پہلے استعمال کیوں نہیں کیا؟" اسے اندازہ ہو گیا تھا وہ Untouched تھیں۔

"نہیں ایسے ہی ..." زینی نے بات گول مول کی تھی۔

کرم نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویروں کا لفافہ کچن کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے اس میں سے زینی کی تصویریں نکال کر کچن کاؤنٹر پر پھیلا دیں۔ اس نے اپنے گھر کی ایک دیوار پر لگانے کے لیے زینی کے البم سے اس کی بچپن اور نو عمری کی کچھ تصویریں نکال کر انلارج کروائی تھیں اور سٹوڈیو جاتے ہوئے اچانک دونوں کا ارادہ اکٹھے اپنے پہلے فوٹو شوٹ کا بن گیا تھا۔ وہ تصویریں اب کچن کاؤنٹر پر بکھری ہوئی تھیں کرم مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہر تصویر پہلے سے زیادہ اچھی تھی۔

"تصویریں مل گئیں؟" وہ واش روم سے بال خشک کر کے نکلی تھی اور سیدھا بڑی ایکسائیٹڈ ہو کر تصویروں کی طرف آئی کرم نے فوراً تصویریں سمیٹ دیں۔

"زینی تم پہلے تیار ہو جاؤ ... یہ تصویریں واپس آ کر بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

"ہاں لیکن میں ..." اس نے احتجاج کرنا چاہا پھر یک دم ارادہ ترک کرتے ہوئے سینٹر ٹیبل کی طرف چلی گئی۔ اور سینٹر ٹیبل پر پڑی سرخ کیوٹکس کی ایک شیشی اٹھا کر اپنے پاؤں کے ناخنوں پر بڑی احتیاط سے کیوٹکس لگانے لگی۔ سرخ نیل پالش اس کے بے حد دودھیا نازک پیروں پر بہت جچ رہی تھی۔ کرم صوفہ پر بیٹھا بڑی محویت سے اس کے پیروں کو دیکھتا رہا۔ وہ نیل پالش لگاتے ہوئے اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اور کرم کی نظروں سے بے خبر تھی۔

"تمہارے پاؤں بہت خوبصورت ہیں۔" کرم نے کچھ دیر کے بعد بے اختیار کہا۔ وہ اسی طرح نیل پالش لگاتے لگاتے ہنسی۔

"صرف پاؤں؟" وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

کرم مسکرادیا۔

وہ اب ہاتھوں کے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔

پتہ نہیں کیا بات تھی مگر آج وہ اسے ضرورت سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی کرم کا دل اس کے وجود سے نظریں ہٹانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ کون تھا جو زینی کو آج دیکھتا اور اس کے عشق میں گرفتار نہ ہو جاتا۔

اس کے سیل فون پر نفیسہ کی کال آرہی تھی۔ زینی نے چند منٹ ان سے مختصر بات کی انہیں کرم کے گھر جانے کے بارے میں بتایا اور پھر جلدی جلدی کال ختم کردی۔ کرم اب جا کر کھڑکی میں کھڑا اس بیل کو دیکھنے لگا تھا بیل پر صرف چند زرد ہوتے ہوئے پتے رہ گئے تھے چند دنوں میں وہ بھی جھڑ جاتے۔ کرم مسکرادیا اب انہیں اس بیل کے بڑھتے ہوئے پتوں کی ضرورت نہیں تھی۔

زینی اب واش روم کے مرر کے سامنے اپنے ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک لگانے کے بعد وہ ایک بار پھر سٹنگ ایریا میں آگئی۔ صوفہ پر بیٹھ کر اس نے جوتے پہنے اور پھر اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''اور کتنی دیر لگے گی زینی؟'' کرم ہلکا سا جھنجلایا۔

''بس منک کوٹ پہننا ہے مجھے۔ اور سیل فون لینا ہے اور کچھ'' وہ یاد کرنے لگی کرم نے منک کوٹ اٹھا کر اسے پہنانا شروع کردیا۔

وہ منک کوٹ پہننے کے بعد پلٹ کر کرم کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت۔''

زینی بے اختیار مسکرائی۔ سیل کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے کچن کے ایک دروازے سے کچھ سکے بھی کوٹ کی جیب میں ڈال لیے اور اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے کی چابی کو بھی۔

کرم تب تک دروازے کے پاس پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

''وہ جانتے ہیں کہ تم آج مجھے ان کے پاس لا رہے ہو؟'' گاڑی میں بیٹھتے ہوئے زینی نے کرم سے پوچھا۔

''میں نے آج صبح بتایا ہے انہیں۔'' وہ گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''پہلے کیوں نہیں؟'' وہ سنجیدہ ہوگئی۔

''بس ایسے ہی۔'' کرم نے کہا۔

''پتہ تو چل گیا ہوگا انہیں اب تک۔ آصف وغیرہ میری سرگرمیوں سے اتنا بے خبر نہیں رہتے۔'' کرم مسکرایا۔

''اور یہاں تو میری PA میری شادی کے انتظامات کررہی ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آفس میں گردش کرنے والی یہ خبر ان تک نہ پہنچ چکی ہو۔''

"میں نے سوچا شاید تم ان کے انوائیٹ کرنے پر مجھے ان کے پاس لے جارہے ہو؟" زینی نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ کچھ بجھ گئی تھی۔ وہ کرم کی ماں اور بھائی سے ایک بار سامنا کر چکی تھی اور ان کا رویہ کتنا سرد ہو سکتا تھا اسے اندازہ تھا۔

"جب شادی ہو جائے گی تو انوائیٹ بھی کرنے لگیں گے تمہیں Don't worry ویسے بھی ہم تو انہیں شادی پر انوائیٹ کرنے کے لیے جارہے ہیں۔"

زینی خاموش ہو گئی۔ اس کے ذہن میں اس وقت کسی قسم کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ وہ کرم کے ساتھ جارہی تھی اور وہ اسے پسند کرتے نہ کرتے شادی ان دونوں کی ہو جانی تھی۔

کرم کا اندازہ غلط نہیں تھا اس کے گھر والوں کو اس کی اس متوقع شادی کے بارے میں دو دن پہلے پتہ چل چکا تھا۔ اور اس کی فیملی میں افراتفری مچ گئی تھی۔ ایک وہ شادی کر رہا تھا دوسرا جس سے کر رہا تھا وہ ایکٹریس تھی اور وہ بھی وہ جس کے قصے ہر ایک کی زبان پر تھے اور تیسرا کرم آج تک اس کے ساتھ ایسے کسی تعلق کو جھٹلاتا رہا تھا پھر اب وہ یک دم کیسے ان سب کو بتانے کی زحمت کیے بغیر شادی کی تیاریاں کرنا شروع ہو گیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ راز میں رکھنا کرم کا گناہ عظیم تھا۔ اور اب اس نے کتنے معمول کے انداز میں ماں کو فون کر کے بتایا تھا کہ وہ زینی کے ساتھ ان کے پاس آ رہا تھا۔ انہیں اپنی شادی کے لیے انوائیٹ کرنے کرم کو حیرت ہوئی تھی جب ہمیشہ کی طرح اس کی ماں نے اسے کسی طرح کی ناراضگی کا اظہار کیے بغیر اسے کہا تھا کہ وہ پہلے زینی کے بغیر ان کے پاس آئے۔ کرم رضا مند نہیں ہوا اسے اندازہ تھا کہ اکیلے بلائے جانے کا کیا مطلب تھا۔ وہ اس کے انکار پر جز بز ہوئی تھیں لیکن کرم نے مصروفیت کا بہانہ کیا تھا وہ شادی سے پہلے اکیلا ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اور اگر اسے اندازہ ہو جاتا کہ اگلی یہ حکمت عملی اس کے لیے کتنی قاتل ثابت ہونے والی تھی تو کرم یقیناً زینی کو وہاں ساتھ لے جانے سے پہلے ایک بار زینی سے شادی کے ایشو پر ماں اور بہن بھائیوں سے بات ضرور کر لیتا۔

وہ کرم کے ساتھ گاڑی سے اترتے وقت بے حد نروس ہو رہی تھی ان دونوں کو اندازہ نہیں تھا کہ انہیں گھر کے شیشوں سے بیل دینے سے پہلے ہی دیکھا جا چکا تھا۔

بیل بجانے پر دروازہ آصف نے کھولا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خیر مقدمی تاثرات نہیں تھے۔ ایک سرسری نظر زینی پر ڈال کر سلام دعا کے تبادلے کے بعد وہ دروازے سے ہٹ گیا تھا۔ کرم کو برا لگا اس نے اسے رسماً بھی زینی سے متعارف کروانے کا موقع نہیں دیا۔

"امی لاؤنج میں ہیں۔" آصف نے دروازہ بند کرتے ہوئے کرم کو مطلع کیا۔ کرم جانتا تھا لاؤنج میں صرف امی نہیں تھی باہر ڈرائیو وے اور سڑک پر کھڑی گاڑیوں کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اوٹوا میں موجود اس کے تمام بہن بھائی اس وقت آصف کے گھر موجود تھے۔

وہ کرم کے پیچھے چلتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی اور کرم کے پہلے سے بتا دینے کے باوجود بری طرح کنفیوز ہوئی وہاں مختلف صوفوں پر کرم کے بہن بھائی، بھابھیاں اور بہنوئی بھی اس کی ماں کے ساتھ موجود تھے سامنے کھڑکی کے شیشوں سے گھر کے عقبی حصے میں کھیلنے والے فیملی کے بچے بھی نظر آ رہے تھے۔

کرم کے سلام کا جواب دیا گیا تھا زینی نے اپنے سلام کرنے پر کسی کو منہ کھولتے نہیں دیکھا۔ ان سب کی نظریں اس وقت ان پر گڑی ہوئی تھیں اور ان کے چہرے بالکل سرد اور بے تاثر تھے۔ ٹانگوں پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھے ہوئے ان تمام افراد میں سے کسی نے بھی زینی یا کرم کے استقبال کے لیے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ''میدانِ جنگ'' میں آیا تھا اپنے خونی رشتوں کے پاس ان میں سے کسی کے گھر نہیں آیا تھا یہ کرم کو احساس ہو گیا تھا۔ وہ سب وہاں ایک آخری کوشش کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ وہ زینی سے شادی کر لیتا تو ان میں سے ہر ایک کی سلطنت کا سورج غروب ہو جاتا۔

''بھائی جان۔'' اس عمر میں اتنے ''خود غرض'' کیسے ہو گئے تھے؟ ایک عورت نے ان کی آنکھوں پر محبت کی پٹی کیسے باندھ دی تھی؟ وہ اپنے اتنے ''مخلص جان چھڑکنے'' والے بہن بھائیوں کو let down کیسے کر سکتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک برہم تھا ہر ایک مشتعل تھا۔ وہ وہاں ون پوائنٹ ایجنڈا کے ساتھ آئے تھے۔ کرم کی زندگی سے زینی کو ہٹانا۔

''یہ زینب ضیاء ہیں اور زینب یہ میری امی اور فیملی۔'' کرم نے بالآخر برف توڑنے کی کوشش کی۔

زینی کی سمجھ میں نہیں آیا وہ جواباً کیا کہے۔ زندگی میں آج تک کسی نے اس کے تعارف کے اور اس طرح کا ٹھنڈا ری ایکشن نہیں دکھایا تھا۔ ان میں سے کسی نے کرم یا زینی کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔ وہاں صرف ایک سنگل خالی صوفہ تھا اور وہ یقیناً زینی کے لیے نہیں تھا۔ کرم کو توہین کا احساس ہونے لگا تھا۔ انہیں رسماً ہی سہی لیکن زینی کو بیٹھنے کو کہنا چاہیے تھا۔ کم از کم اس کی ماں کو جو ایک تسبیح پر کچھ پڑھنے میں مصروف تھیں انہوں نے دو دن پہلے ہی اس شادی کی اطلاع ملنے پر اس رشتہ کو ختم کروانے کے لیے ایک نیا وظیفہ شروع کیا تھا۔

''آپ پلیز بیٹھ جائیں۔'' کرم نے ڈھیٹ بن کر زینی سے کہا۔ وہ کمرے کا اکلوتا خالی صوفہ اسے آفر کر رہا تھا۔ وہ اس صوفے پر جا کر بیٹھنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی اس صوفے کے دائیں بائیں دو صوفوں پر کرم کے بھائی اور بہنوئی بیٹھے ہوئے تھے۔

''نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' زینی نے مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ لاؤنج کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ کرم نے اس سے اصرار نہیں کیا لیکن وہ خود بھی اس صوفہ پر جا کر نہیں بیٹھا۔

''میں زینب سے شادی کر رہا ہوں ... اور آپ لوگوں کو انوائیٹ کرنے آیا ہوں۔'' کرم نے اپنے غصے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ اس کا دل تو اس وقت یہ چاہ رہا تھا کہ وہ ان لوگوں سے بات کیے بغیر زینی کو لے کر وہاں سے پلٹ جائے۔

''زینب سے یا پری زاد سے؟'' گفتگو بالآخر شروع ہو گئی تھی۔ اور ہمیشہ کی طرح آغاز اس کی ماں نے کیا تھا۔

زینی کو اپنے ماتھے پر پسینہ آتا محسوس ہوا۔ عدالت لگ گئی تھی۔ مگر اسے یقین تھا اس کے وکیل کی موجودگی میں اسے منہ کھولنے تک کی ضرورت نہیں تھی ایسا ہی اندھا اعتماد تھا اسے ''اپنے وکیل پر''۔

''بھانت بھانت کے مردوں کے سامنے ناچنے والی اس دو ٹکے کی اداکارہ کو تو میری بہو بنانا چاہتا ہے اس خاندان سے رشتہ جوڑنا چاہتا ہے اس کا؟'' کرم کی ماں اب گرج رہی تھی۔

''آپ اس طرح کی باتیں مت کریں وہ فلم انڈسٹری چھوڑ چکی ہے۔'' کرم نے ماں کی بات کاٹی تھی۔

"فلم انڈسٹری چھوڑ دی ہے۔ یہ لیں یہ اخبار پڑھیں اور پھر یہ دوسرے اخباروں کا بھی ڈھیر پڑھ لیں آپ کے لیے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کیا ہے میں نے۔" اس کے چھوٹے بھائی آصف نے طنزیہ ہنستے ہوئے سینٹر ٹیبل پر پڑا ایک اخبار اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور میز پر پڑے باقی اخباروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کرم نے الجھی ہوئی نظروں کے ساتھ اس اخبار کو دیکھا اور اس کا ذہن بھک کے ساتھ اڑ گیا۔ ایک پاکستانی اخبار کے پہلے صفحے پر زینی کی ایک بے حد معیوب تصویر کے ساتھ ہیڈ لائن تھی۔

سپر سٹار پری زاد کی فلموں میں واپسی مشہور اداکارہ پری زاد جو ایک بڑے سکینڈل کے بعد فلم انڈسٹری سے یک دم غائب ہو گئی تھیں بالآخر کینیڈا کے کروڑ پتی پروڈیوسر کرم علی سے شادی کے بعد انہیں کی فلم کے ذریعے انڈسٹری میں come back کرنے والی ہیں۔ کرم علی ایک طویل عرصے سے کینیڈا میں مقیم ہیں اور کئی سال پہلے انہوں نے پری زاد کو لے کر ایک فلم بنائی تھی جس نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے تھے۔ ہمارے رپورٹر کی اطلاع کے مطابق پری زاد پچھلے ڈھائی سال سے کرم علی کے ساتھ ہی کینیڈا کے شہر اوٹوا میں مقیم تھیں اور دونوں اب چند ہفتے تک باقاعدہ طور پر رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے ہیں۔ فلم انڈسٹری کے اندرونی حلقوں نے اس خبر کی تصدیق کرتے ہوئے اسے انڈسٹری کے لیے خوش کن قرار دیا ہے۔ ماپ نے پری زاد کی واپسی کا خیر مقدم کرتے ہوئے پری زاد کی طرف سے اس یقین دہانی کے بعد ان پر لگی پابندی ہٹالی ہے کہ وہ ان تمام فلموں کو مکمل کروائیں گی جنہیں وہ ادھورا چھوڑ کر غائب ہو گئی تھیں۔ فلمساز جاوید بٹ اور رانا مصدق نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ پری زاد کے پرانے سیکرٹری سلطان سے ان کی پری زاد کو ان کی آنے والی فلمز میں سائن کرنے کے لیے بات ہوئی ہے اور معاملات جلد طے ہو جائیں گے۔ پری زاد اگلے مہینے کی 17 تاریخ کو اوٹوا میں بہت دھوم دھام سے کرم علی کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ رہی ہیں۔ انڈسٹری کے تمام نامور اداکاروں اور اداکاراؤں نے پری زاد کی زندگی کے اس نئے سفر پر ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔

کرم برف کی سل کی طرح سرد ہو گیا تھا۔ وہ انڈسٹری کی سب سے بہترین ایکٹریس تھی وہ مان گیا تھا... وہ ایک بار پھر بے وقوف بن گیا تھا... تو وہ سلطان کو ان کی شادی کے لیے نہیں ان معاملات کو طے کرنے کے لیے کینیڈا بلانا چاہتی تھی۔ کیا وہ کرم کا شکار کھیلنے جان بوجھ کر وہاں اس کے اتنے پاس آئی تھی۔ اس کے ڈیپارٹمنٹ سٹور میں کام کرتا کیونکہ وہ جانتی ہو گی کہ کبھی نہ کبھی اس سٹور پر اس کا سامنا کرم سے ہو سکتا تھا... وہ بدگمانی کے اندھیروں میں خود ہی روشنیاں کرتا پھر رہا تھا۔ ہر اس چیز پر غور کرتا جو اسے مشکوک لگ رہی تھی ہر اس چیز کو نظر انداز کرتا جو زینی کے حق میں جا رہی تھی۔ ...وہ اخبار پکڑے اس کے ذہن میں جیسے اندھیروں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ دو سال لگا کر بھی وہ زینی کو نہیں سمجھ سکا تھا اور وہ تو زری کو بھی نہیں جان پایا تھا۔ پر آج تکلیف کچھ اور طرح کی تھی اسے لگ رہا تھا وہ مر رہا تھا۔ کم از کم "وہ" وہ تو اس کے ساتھ یہ سب نہ کرتی۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتا تھا اس نے یہ بھی نہیں سوچا وہاں کھڑا وہ نمک کی طرح گھلنے لگا تھا۔ اس تعلق کو توڑنے کے لیے اس کے بہن بھائیوں کو ہاتھ بھی نہیں ہلانا پڑا تھا۔ زینی کی محبت کے پیڑ کو کرم نے بدگمانی کی زمین پر کھڑا کیا تھا اعتبار کی مٹی میں نہیں۔ ایک جھونکا آتے ہی پیڑ زمین بوس ہو گیا تھا اپنی جڑوں سمیت باہر نکل آیا تھا۔ زینی نے اسکے بارے میں ٹھیک اندازہ لگایا تھا وہ بہت جلد بدگمان ہو جاتا تھا لیکن وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکی کہ کرم ہر رشتے کو شک کی چھلنی سے چھاننے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ زندگی میں اعتبار کی سیڑھیوں سے اتنی بار گر کر زخمی ہو چکا تھا کہ اب وہ

جدوجہد کے باوجود پہلے پائیدان پر بھی پاؤں نہیں رکھ پاتا تھا... اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ اس کے پاس دولت کے علاوہ ایسی کوئی خوبی نہیں تھی جس کی وجہ سے کوئی اس کی طرف آتا۔ وہ ایک پٹاری میں دوست کے سانپ کے ساتھ بند تھا اور جب بھی اس پٹاری سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا وہ سانپ اسے ڈنک مار دیتا تھا... کرم مجبور اور بے بس تھا اور زینی کو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا۔ ہو جاتا تو آج وہ وہاں نہ کھڑے ہوتے۔ وہ کیا پڑھ رہا تھا۔ زینی کو اندازہ نہیں تھا لیکن زینی کو یقین تھا اس اخبار میں ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی جس کے بارے میں وہ کرم کو پہلے ہی نہیں بتا چکی تھی... کرم سے کوئی راز نہیں رکھا تھا اس نے... پھر اخبار کا وہ ایک ٹکڑا کیا کر سکتا تھا... اور اخبار کا وہ ٹکڑا کیا کر چکا تھا اس کا احساس اسے کرم کے اخبار سے سر اٹھانے پر ہوا تھا۔ زینی کو سمجھ نہیں آیا وہ یک دم اسے اس طرح کیوں دیکھنے لگا تھا... ایسی نظروں سے جو اسے مار رہی تھیں... اس کے وکیل نے مقدمہ forfeit کر دیا تھا کرم نے کچھ کہے بغیر اس اخبار کو زینی کی طرف بڑھا دیا۔ چند سیکنڈز لگے تھے زینی کو وہ خبر پڑھنے میں... اس کے نزدیک ایک خبر تھی وہ... شاید سلطان نے کسی سے ذکر کیا تھا۔ اسے منع کرنا چاہیے تھا اسے... وہ پچھتائی لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔

''جھوٹ ہے یہ کرم... تم جانتے ہو میں فلم انڈسٹری چھوڑ چکی ہوں... میں... مجھے... مجھے تو اب فلموں میں کام نہیں کرنا۔'' اس نے کرم کو دیکھتے ہوئے اسے بتانے کی کوشش کی تھی... کرم کی آنکھیں وہ آنکھیں نہیں تھی جن سے وہ زینی کو دیکھتا تھا۔

وہ ''پری زاد'' کو دیکھنے والی آنکھیں تھیں ایک لمحہ لگا تھا زینی کو ساری وضاحتیں ساری صفائیاں سارے لفظ بھولنے... بس ایک لمحہ... یہ ''کرم'' کی ''نگاہ'' نہیں تھی۔

کمرے میں اچانک شور ہونے لگا تھا وہاں بیٹھا ہر شخص اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا... لو ہا گرم تھا ہر ایک اس پر چوٹ لگا رہا تھا کرم سب کچھ سن رہا تھا وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔ وہاں سب کے ہاتھوں میں پتھر تھے اور وہ اس پر سنگباری کر رہے تھے صرف ایک ہاتھ خالی تھا اور وہ اسی سے لہولہان ہو رہی تھی وہ اسے ''جانتا'' تھا یا کم از کم اسے یہ خوش فہمی تھی کہ وہ اسے ''جانتا'' تھا پھر شبہ آخر ان دونوں کے تعلق میں شبے کی گنجائش کہاں سے نکال لی تھی؟... کیا اس لیے کہ وہ اس سے تحفے لینے لگی تھی؟... کیا اس لیے کہ وہ اس کی کی ہوئی عنایات پر معترض نہیں رہی تھی؟... یا پھر صرف اس لیے کہ وہ اس سے شادی پر تیار ہو گئی تھی؟...

زینی نے ایک بار پھر چند لمحوں کے لیے آنکھیں جھپک کر کرم کی آنکھوں کو دیکھا وہاں اب بھی وہی کچھ تھا جو پہلے تھا... وہ اس کا واہمہ نہیں تھا۔

زینی کی آنکھوں کے سامنے پچھلے سارے مہینے کسی فلم کی طرح چلنے لگے تھے... کرم کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ... اس کے ساتھ لگائے ہوئے قہقہے... اس کے سامنے بہائے ہوئے آنسو... سب جیسے دھواں بن کر اڑنے لگا تھا... دنیا کی کسی لغت میں وہ لفظ نہیں تھے جن سے وہ کرم کو یہ یقین دلا سکتی کہ وہ اس کی دولت کی ہوس میں اس کے ساتھ نہیں آئی تھی... وہ صرف کرم کا اپنا وجود تھا جس نے اسے کھینچا تھا۔ کوئی اس کے اور کرم کے بیچ اینٹیں چننے لگا تھا... کرم کا وجود اس کی نظروں کے سامنے دھیرے دھیرے غائب ہونے لگا تھا۔ شیراز وہ آدمی نہیں تھا جس سے وہ محبت کرتی... کرم بھی وہ آدمی نہیں تھا جس پر وہ اعتبار کرتی... زینی آج بھی جیسے اپنے باپ کے آنگن میں خالی ہاتھ کھڑی تھی۔ کرم اب گردن

گردن تک اس دیوار کے پیچھے چھپ گیا تھا اور اب... اب چہرہ... چہرہ غائب ہو رہا تھا... اور اب آنکھیں اور اب بال... اور اب سب کچھ... وہاں اب کوئی نہیں تھا دنیا خالی ہو گئی تھی۔

Check mate... (شہ مات) زندگی میں زینب ضیاء سے بڑھ کر کسی کو شہ ماتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہو گا۔

سر جھکا کر زینی نے اپنے ہاتھوں کے ناخنوں پر لگی سرخ نیل پالش کو دیکھا... منک کوٹ سے جھانکتے اس سرخ سلک کے لباس کو منک کوٹ کو... پیروں میں پہنے ہوئے اس خوبصورت سرخ جوتے کو... اس نے واقعی اس مرد کے لیے سجنے سنورنے میں بہت وقت لگایا تھا جس سے اسے عشق کا "فریب" ہوا تھا... اس نے سر اٹھا کر آخری بار پانی سے بھری آنکھوں کے ساتھ اس "دیوار" کو دیکھا... پھر وہ پلٹ گئی... اب تو پلٹ ہی جانا چاہیے تھا اسے... دروازے سے باہر نکلنے تک وہ کسی آواز کی منتظر رہی جو اس کے قدموں کی زنجیر بن جاتی کسی ہاتھ کی منتظر رہی جو اس کا ہاتھ پکڑ لیتا... انتظار واقعی موت تھا۔

وہ دروازے سے باہر نکل آئی سامنے کرم کی گاڑی کھڑی تھی جس پر وہ کچھ دیر پہلے وہاں آئے تھے... اس نے پلٹ کر ایک بار پھر کرم کے گھر کے بند دروازے کو دیکھا... شاید وہ آئے... اس کے پیچھے ایک بار... اسی طرح... جیسے وہ ہمیشہ آتا تھا... دروازہ نہیں کھلا... زینی جانتی تھی بند دروازے کبھی نہیں کھلتے... اس نے زندگی میں بہت سے بند دروازے دیکھے تھے۔ اس نے ان میں سے کسی کو بھی کھلتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ ڈرائیو وے پر نکل آئی۔ وہ کیٹ واک پر سات سات انچ اونچی ہیل پہن کر چلتی رہی تھی... ایک بار لڑکھڑائے یا گرے بغیر... آج پہلی بار وہ ڈرائیو وے کے کنکریٹ پر چار انچ اونچی ہیل کے ساتھ لڑکھڑا رہی تھی۔

33 سال کی عمر میں زینی نے پہلی بار اپنے وجود کو تھکن سے چٹختے پایا... وہ آج بھی اپنے باپ کی سب سے بے وقوف اولاد تھی... وہ آج بھی محبت کا فریب کھا بیٹھی تھی... اگلے پچھلے سارے کھرنڈ جیسے کسی نے کھرچنے شروع کر دیے تھے... جسم کے... روح کے سارے... زینب لہولہان ہو رہی تھی... تکلیف اب رک جانی چاہیے تھی... سفر اب ختم ہو جانا چاہیے تھا... آخر زینب ضیاء کو زندگی میں اب اور کیا دیکھنا تھا... تذلیل، توہین، رسوائی، بدنامی ہر طوق تو اس کے گلے میں پڑ چکا تھا پھر اب کیا تھا؟ کیوں خواب بننا بند نہیں کرتی وہ؟

آج بہت عرصے کے بعد اتنی اونچی ہیل پہنی تھی... وہ واقعی چلنا بھول گئی تھی۔

کرم علی ٹھیک کہتا تھا وہ منک کوٹ واقعی بہت گرم تھا وہ اسے سردی سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا... سامنے کے سارے کھلے بٹنوں کے باوجود۔

"آپ نے کوئی بددعا دی ہو گی مجھے ابو" وہ دور نظر آنے والی سڑک دیکھ کر بڑبڑائی۔ "ورنہ زینی کو ایسی ذلت تو کبھی نہ ملتی... زینی کا مقدر اتنا سیاہ تو کبھی نہ ہوتا... مجھے یقین ہے کوئی نہ کوئی بددعا کی ہے آپ نے میرے لیے... اور ٹھیک کیا۔ زینی نے بہت تنگ کیا آپ کو... بہت دل دکھایا آپ کا... پھر زینی کو سکون کیوں ملے..." وہ بڑبڑا رہی تھی۔ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہی تھی لیکن چل رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا... پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہ مین روڈ پر آ گئی تھی... اسے واپس جانا تھا... وہ بس سٹاپ پر رک گئی... وہاں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

اسے ہوش دروازہ بند ہونے پر آیا تھا اس کے چلے جانے پر آیا تھا۔

”دیکھا جھوٹ کھلا تو کس طرح بھاگ گئی۔“ کرم نے اپنی ماں کو کہتے سنا وہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ جو وہاں پڑا ہوا تھا جہاں وہ چند منٹ پہلے کھڑی تھی۔ فرش پر پڑے اخبار میں اس کی وہی معیوب تصویر جیسے اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ اس طرح کیوں گئی تھی؟ کوئی وضاحت یا صفائی تو دینی چاہیے تھی اسے وہ بے چین ہونے لگا تھا۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا۔ کیوں کھڑے ہو؟“ اس کی ماں نے کہا تھا اور اس کے بہن بھائی اپنی جگہ سے اٹھ اٹھ کر اسے جگہ دینے لگے تھے۔ ”بھائی جان“ ”لوٹ“ آئے تھے۔ معجزہ ہو گیا تھا۔ اور کسی خاص محنت کے بغیر ماں کو واقعی اس وقت فوری طور پر کرم پر فخر محسوس ہوا تھا وہ واقعی اس کی سعادت مند اولاد تھا۔ کرم نے اس کی طرف اب قدم نہیں بڑھائے۔ وہ وہاں تھی تو اسے ”خون“ کھینچ رہا تھا وہ چلی گئی تھی تو اب ”محبت“ کھینچنے لگی تھی۔ وہ اسے اس لیے وہاں نہیں لایا تھا کہ وہ سب اس کے بارے میں یہ سب کچھ کہتے اس کی تذلیل کرتے۔ اس کی تذلیل ہوئی تھی اسے اب احساس ہوا تھا۔ وہ سب وہی لوگ تھے جن کو وہ اتنے سال آزما چکا تھا وہ کسی آزمائش میں پورے نہیں اترے تھے۔ جھوٹے تھے۔ خود غرض تھے۔ زر پرست تھے پھر بھی یہ کیوں تھا کہ وہ جب بھی زبان کھولتے وہ کیا اس لیے ان پر اعتبار کرتا کیونکہ وہ اس کے خونی رشتے تھے؟ یا پھر اس لیے کیونکہ وہ ایک کمزور مرد بن چکا تھا۔ جو ضرورت سے زیادہ سوچتا تھا۔ ضرورت سے زیادہ شک کرتا تھا۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے میں ہمیشہ تاخیر کرتا تھا۔

”پریشان مت ہو بیٹا۔ سب کچھ بالکل ٹھیک۔“ اس کی ماں نے اسے گلے لگانے کی کوشش کی کرم نے ان کے ہاتھ دور ہٹا دیے۔ آج پہلی بار اسے اپنی ماں کے لمس سے وحشت ہو رہی تھی۔ اس کی آغوش میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی کرم کی ماں نے حیرت سے اسے دیکھا تھا وہ ماں کے ہاتھ کیسے جھٹک سکتا تھا۔ کرم علی تو ان کی سب سے سعادت مند اولاد تھا۔

”یہ سب کچھ کر کے تسلی ہو گئی آپ کی؟ سکون مل گیا؟ میں زندگی میں جو نیا رشتہ بنانا چاہوں گا آپ سب مل کر اسے اسی طرح توڑ دیں گے؟ مجھے صرف اکیلا دیکھنا چاہتے ہیں آپ۔ صرف اکیلا۔“

”ہم نے جو کچھ کیا تمہاری بہتری کے لیے کیا۔ ارے وہ تمہاری ساری دولت لے جاتی۔ تم جانتے نہیں ہو ایسی عورتوں۔“

کرم نے پوری قوت سے چلاتے ہوئے ماں کی بات کاٹی۔ ”بس یہی پریشانی ہے آپ سب کو کہ وہ میری دولت لے جائے گی۔ اور وہ لے گئی تو آپ۔ آپ سب کیا کریں گے؟“

سب کو سانپ سونگھ گیا تھا زندگی میں پہلی دفعہ ان میں سے کسی نے کرم کو یوں چلاتے ہوئے سنا تھا۔

”کرم میرے بچے میں۔“ اس کی ماں حواس باختہ ہو گئی۔

”کرم یا کرم کی خوشی یا زندگی میں تو کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ کتنی دولت لے لیتی وہ مجھ سے؟ اس سے زیادہ جتنی میں اتنے سالوں سے آنکھیں بند کیے آپ سب پر لٹا رہا ہوں۔“

”بیٹا خونی رشتہ ہے ہمارا تم سے۔ یہ سب بہن بھائی ہیں تمہارے۔“ اس کی ماں نے آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی۔

”خونی رشتہ ہے اسی لیے تو اپنے آپ کو استعمال ہونے دیا میں نے۔“

"استعمال؟ ہم لوگوں نے آپ کو استعمال کیا؟" آصف نے پہلی بار زبان کھولی۔

"ہاں تم سب نے مجھے زندگی میں سیڑھیاں چڑھنے کے لیے پائیدان بنایا اور ساری عمر پائیدان ہی سمجھا"

"آپ ہم پر الزام نہ لگائیں بھائی جان۔" یہ اس کی چھوٹی بہن تھی۔

"تو احسان کرنے کے بعد اب احسان جتانے بیٹھ گیا ہے۔" کرم کی ماں اب کچھ خفا ہونا شروع ہو گئی تھی ابتدائی حواس باختگی غائب ہو گئی تھی۔

"احسان نہیں جتا رہا صرف یہ بتا رہا ہوں کہ احسان کرنا صرف میرا فرض نہیں ہے آپ سب کا بھی فرض ہے۔"

"آپ کے جتنا پیسہ میرے پاس ہوتا تو میں اپنے بہن بھائیوں کو اس سے کہیں زیادہ دیتا جو آپ نے ہمیں دیا۔" یہ آصف تھا۔

"بس یہی چیز ہے نا تم سب کے دلوں میں کہ مجھے تم لوگوں کو اور زیادہ دینا چاہیے زیادہ کی کوئی حد ہے تم سب کے نزدیک؟" وہ زہریلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"کاغذ پر لکھ کر دے دو مجھے کہ تم لوگوں کو کتنے کروڑ چاہیے کتنا پیسہ دوں میں تم لوگوں کو کہ تمہارے جسم میں میرے لیے بہنے والا پانی خون بن جائے۔"

اس نے وہاں سے پلٹنا چاہا اس کی ماں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"اس کے پیچھے مت جا کرم۔" انہوں نے اسے روکنا چاہا تھا۔

اس نے بازو سے ماں کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"وہ میری زندگی ہے زندگی کے پیچھے کون نہیں جاتا میں نے اپنی ساری زندگی صرف آپ کے کہنے پر ان سب کے لیے ضائع کر دی وہ میری واحد خوشی تھی۔ میں بڑے مان سے اسے آپ کے پاس لایا تھا۔ یہ سب نہ سہی اسے قبول کر کے آپ ہی میرا مان رکھ لیتیں۔"

زندگی میں پہلی بار کرم کی ماں بول نہیں سکی تھی زندگی میں پہلی بار اس نے ان کے سامنے کھڑے ہو کر ایک گلہ کیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ ضمیر کی چبھن کا شکار ہوئی تھیں۔

"کرم تو لے آ اسے تیری خوشی اور پسند ہے تو بس ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔۔" اس کی ماں رونے لگی تھی۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں امی" آصف گڑبڑا گیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار ماں نے کھڑے کھڑے پلٹا کھایا تھا۔

"بس چپ ہو جاؤ سارے۔ کوئی کچھ نہیں بولے گا اس بارے میں۔ تو جا کرم اگر وہ باہر کھڑی ہے تو لے آ اسے۔" وہ بہت بے یقینی سے ماں کو دیکھ رہا تھا عجیب سے اطمینان اور بے یقینی کے ساتھ کیا واقعی وہ اس کی پسند کو قبول کر لینے والے تھے؟

☆☆☆

بس آ گئی تھی۔ زینی کے کانوں میں گونجنے والی آوازیں ایک لمحہ کے لیے جیسے بند ہوئیں۔ ...اس نے سینما میں مرد تماشائیوں کے منہ سے اپنے بیے اس سے کہیں غلیظ اور رکیک باتیں سنی تھیں جتنی اس نے کرم کے گھر والوں کی زبان سے سنی تھیں لیکن ان لفظوں کے نشتر نے کبھی اسے اس طرح نہیں کاٹا تھا جس طرح کرم کے گھر والوں کی باتوں نے کاٹا تھا۔ کیونکہ وہ سب کچھ کرم کے سامنے کہا گیا تھا اور وہ خاموش رہا تھا۔ تماشائی بن گیا تھا۔ اس نے زینی کی "عزت" کو اپنی "عزت" کیوں نہیں سمجھا؟ کیا اس لیے کہ کہیں نہ کہیں اس کے دل میں بھی اس کے لیے یہی سب کچھ تھا جو وہ اس کے خاندان کی زبان سے سن رہی تھی آوازیں پھر آنے لگیں۔ وہ بس پر چڑھ گئی۔ پھر اسے یاد آیا اس کے ہاتھ میں پرس نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر ڈرائیور کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ سکے نکالے تھے جو سے ان بھکاریوں کو دینے تھے۔ اس نے ڈرائیور کے سامنے وہ سکے ڈال دیے اور آگے بڑھ گئی۔ ڈرائیور نے اسے آوازیں دینے کی متوجہ کرنے اور ٹکٹ اور باقی رقم دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ تب تک بس کے پچھلے حصے میں پہنچ چکی تھی۔ بس بالآخر چل پڑی ایک سیٹ پر بیٹھ کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ بس سے باہر اس کی نظروں کے سامنے اس کی زندگی کی فلم چلنے لگی تھی۔ ضیاء، نفیسہ، سلمان، ربیعہ، زہرہ، شیراز سب اس کی نظروں کے سامنے آنے لگے تھے کرم کہیں غائب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کرم نے باہر نکلتے ہی اسے دور تک ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی شاید کہیں کھڑی ہو۔ ...وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف آیا اور اس نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی سٹارٹ کرنے کی کوشش کی گاڑی سٹارٹ نہیں ہوئی۔ اسے کیا ہوا تھا؟ وہ پانچ منٹ تک گاڑی سٹارٹ کرتا رہا وہ بری طرح جھنجلا رہا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اس گاڑی کو کچھ نہیں ہوا تھا اور اب یہ خراب اس وقت ہوئی تھی جب اسے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ گاڑی سے نکل آیا۔ مین روڈ قریب تھی وہ جانتا تھا چند منٹ چلنے کے بعد اسے بس مل جاتی اور یہ بھی ممکن تھا زینی ہی مل جاتی۔

وہ ایک بار پھر اس خبر کے بارے میں سوچنے لگا اور اسے ندامت ہو رہی تھی ایک خبر پڑھ کر وہ یک دم اس طرح ری ایکٹ کیوں کرنے لگا تھا۔ آخر زینی اس سے جھوٹ کیوں بولتی اسے دھوکہ کیوں دیتی۔ اور پھر اس کی ساری فیملی جو اس شادی کے لیے آ رہے تھے ان سے ایک ہفتے کے دوران ہونے والی بات چیت سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیسے لوگ تھے۔ پھر یہ کیوں ہوا کہ ایک خبر پڑھ کر اسے زینی کے بارے میں بس سٹاپ آ گیا تھا اور وہاں چند لوگ کھڑے تھے مگر زینی نہیں تھی وہ کچھ مایوس ہوا اسے دور سے مطلوبہ بس نظر آتی دکھائی دے رہی تھی وہ تقریباً بھاگتے ہوئے بس سٹاپ پر پہنچا وہ اس بس کو مس نہیں کرنا چاہتا تھا چند منٹوں میں بس وہاں تھی وہ بس پر چڑھ گیا۔

☆☆☆

زینی بس سے اتر گئی۔ ڈرائیور نے ایک بار پھر اس کے عقب میں آوازیں دیتے ہوئے اسے روکنے اور اس کی بقیہ رقم دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس بار بھی ناکام رہا۔ اسے یقین تھا اس ایشین عورت کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی خوبصورتی سے بری طرح متاثر ہوا تھا۔

یہ وہی سڑک تھی جس پر وہ دونوں تقریباً ہر دوسرے چوتھے دن کافی پینے کے لیے پیدل جایا کرتے تھے اور آتے جاتے ان پانچوں فقیروں سے ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ زینی فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس پر کھانسی کا پہلا دورہ پڑا۔ آج پہلی برفباری ہوئی تھی ہلکی سی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس کا جسم موسم میں ہونے والی اس تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ بری طرح کھانستے کھانستے رکی سرد ہوا کے تھپیڑے اس کے چہرے اور ہاتھوں کو سن کر رہے تھے۔ اس کے حواس پہلے ہی سن ہو چکے تھے وہ چند لمحے فٹ پاتھ پر رکی رہی۔ وہ کہاں جا رہی تھی؟ گھر؟ کون سا گھر؟ کرم کا چہرہ ایک لمحے کے لیے صرف ایک لمحے کے لیے اس کے سامنے آیا۔ پھر اس نے اس کو جھٹک دیا۔

وہ ایک بار پھر فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ اس کا پورا وجود بے حد بوجھل اور زیادہ لڑکھڑاہٹ تھی۔ اس نے بس میں بیٹھے اپنی زندگی کو وائنڈ اپ کر لیا تھا۔ اپنی زندگی کی پوری فلم کو۔۔ ایک عجیب سی بے حسی تھی جو اس کے پورے وجود پر چھا رہی تھی۔ وہ جیسے اس وقت اپنے جسم سے خود الگ ہو گئی تھی۔۔

"آپ کی بیٹی جہیز کے نام پر کچھ نہیں لائے گی کم از کم عزت تو لے کر آئے۔" وہ آواز نہیں پہچان سکی۔ کسی نے اس کے باپ سے یہ کہا تھا مگر کس نے۔ اور کب۔ وہ ابھی فٹ پاتھ پر چلتی رہی۔

"اس انڈسٹری میں ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے پری زاد۔ کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔ تم اس انڈسٹری میں رہنا چاہتی ہو تو اس ڈبے کو اٹھا لو ورنہ اس کمرے کا دروازہ وہ ہے۔۔۔ تم باہر چلی جاؤ مگر یہ یاد رکھو۔ یہ انڈسٹری سے باہر جانے کا راستہ ہے۔" پری زاد کون تھی؟ اسے فوری طور پر کچھ یاد نہیں آیا۔ کیسا کمرہ؟۔ کیسا دروازہ؟ پھر اس نے اپنے جسم پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس کے جسم پر "بچھو" رینگنے لگے تھے۔ وہ وحشت کے عالم میں فٹ پاتھ پر کھڑی اپنے جسم اور کپڑوں کو جھاڑنے لگی۔ اس کے جسم پر ہاتھ ہی ہاتھ تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے آپ کو جھاڑ رہی تھی۔۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگ قدرے حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے مگر ان میں سے کسی کے پاس بھی رکنے کے لیے وقت نہیں تھا۔

"آپ دعا کریں میں جلدی مر جاؤں ورنہ بڑا مسئلہ ہو گا آپ کے لیے۔" وہ یک دم رک گئی۔ اس کا سانس بے ترتیب ہو رہا تھا۔۔ ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا اتنے سرد موسم میں بھی۔ وہ ایک زومبی کی طرح چلنے لگی۔ پہلا فقیر آ گیا تھا۔۔۔ وہ ہمیشہ اسے کچھ نہ کچھ دیتی تھی اس نے بے اختیار منک کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اس میں کوئی سکے نہیں تھے اس کے ہاتھ میں سیل فون آیا تھا اور چابی۔ اس نے سیل فون نکال کر اس بوڑھے کے سامنے کر دیا چابی اس کی مٹھی میں دبی رہی وہ گھر بناتے بناتے اسے حیرانی سے دیکھنے لگا زینی نے فون گرا دیا۔۔ اسے جانا تھا۔ دیر ہو رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ گئی اس نے ایک بار پھر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔ دوسرا فقیر پاس آ رہا تھا۔ کوٹ کی جیب میں صرف چابی تھی۔ لیکن اسے اسے کچھ دینا تھا۔ کیا؟ کیا؟ اسے اپنی کلائی پر باندھی گھڑی یاد آئی اس نے گھڑی اتار لی۔ اسے اب "وقت" کو گن کر کیا کرنا تھا۔ اس بار اس نے گھڑی نہیں بڑھائی۔ اسے گرا دیا۔

اور اگلا بھکاری۔ وہ۔ وہ اس کے لیے کیا ہے میرے پاس۔ کیا ہے؟ کچھ نہیں؟ منک کوٹ اس نے اسے اتارنا شروع کر

دیا۔۔ سردی گرمی اب اس پر کیا اثر کرتی اس نے کوٹ بھی اسی انداز میں اتار کر پھینک دیا۔ ہوا نے اس کے دوپٹے اور سلک کے کپڑوں کو بری طرح اڑانا شروع کر دیا وہ چلتی رہی اب اسے اگلے فقیر کو کچھ دینا تھا۔ اس نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر وجود پر ایک نظر ڈالی۔ پاؤں میں پہنے ہوئے سرخ جوتے اس نے فقیر کے سامنے وہ جوتے اتار دیے فٹ پاتھ برف کی سل بنا ہوا تھا۔ وہ بھی برف کی سل تھی۔ اسے اب کون سی گندگی سے پیروں کو بچانا تھا۔ اور وہ بھکاری عورت اس کے پاس اس کے لیے کیا بچا تھا۔۔ وہ اپنا لباس اتار کر اسے دے دیتی اگر اسے اپنے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی نظر نہ آ جاتی اور صرف انگوٹھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس پر کندہ لفظ بھی نظر آئے تھے Till death do us part (جب تک موت ہمیں جدا نہ کر دے) وہ انگوٹھی اتارتے اتارتے رک گئی "کوئی" اسے یاد آیا تھا جیسے سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔ اس کے حواس لوٹنے لگے تھے۔ اس کا جسم سردی سے کپکپانے لگا۔ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب آیا تھا۔ پھر اس نے سردی سے نیلے پڑتے ہاتھ کی انگلی سے انگوٹھی اتار کر اس عورت کے سامنے پھینک دی

"کوئی غلط کام مت کرنا زینی۔" اس نے آواز سنی اسے کرنٹ لگا وہ اس کے باپ کی آواز تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فٹ پاتھ کے سرے پر کھڑے تھے۔ وہ ساکت ہو گئی تھی وہ اتنے سال بعد پہلی بار انہیں سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ ان کی شکل دیکھنے کے لیے ترس گئی تھی۔ اس نے یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ اتنے سال اس سے کیوں چھپ گئے تھے ننگے پاؤں روتے ہوئے وہ بے اختیار باپ کی طرف بھاگی تھی۔۔ ضیاء نے چلنا شروع کر دیا تھا وہ کھڑے نہیں رہے تھے الٹے قدموں چل رہے تھے۔

☆☆☆

بس میں بیٹھے اسے پہلی بار اپنی پینٹ کی جیب میں سیل فون کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے بے اختیار اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا اسے۔۔ سیل فون اس کی pante کی جیب میں تھا اس کا خیال تھا وہ اس رانگ کوٹ کی جیب میں تھا جو وہ آصف کے گھر دروازے کے عقب میں لٹکا کر بھول آیا تھا۔

سیل فون نکال کر اس نے ایک کے بعد ایک کئی بار اسے کال کیا۔ بیل بجتی رہی زینی نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ اسے یہی توقع تھی۔ وہ جانتا تھا وہ اب تک اپنے اپارٹمنٹ پر پہنچ چکی ہو گی اور بیٹھ کر رو رہی ہو گی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے لیے دروازہ بھی نہیں کھولے گی۔ ایک بار پھر اس نے بے اختیار اپنی جیبیں ٹٹولنا شروع کیں۔ اس کے اپارٹمنٹ کی ایک چابی اس کے والٹ میں لگی ہوئی تھی۔ والٹ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا چابی پاس تھی وہ جانتا تھا وہ اس سے بہت ناراض ہو گی لیکن اسے یقین تھا وہ اسے منا لے گا وہ جانتی تھی وہ اس سے کتنی شدید محبت کرتا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کی اس غلطی پر اسے معاف نہ کرتی۔ لیکن غلطی ہوئی کیوں تھی؟۔ وہ ایک بار پھر خود کو Analyze کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

"مجھ سے غلطی ہوئی ابو مجھے معاف کر دیں۔" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے باپ کے پیچھے کسی مقناطیس کی طرح جا رہی تھی وہ اب انہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر آتے جاتے لوگوں سے ٹکراتی بس ان کے پیچھے بھاگتی ہی جا رہی تھی۔

"تم نے بہت ستایا ہے مجھے زینی۔" اس نے ضیا کو کہتے سنا۔ وہ برہم تھے۔

"لیکن میں اب کبھی نہیں ستاؤں گی۔ کبھی نہیں۔ ایک بار معاف کر دیں مجھے اپنے پاس آنے دیں۔" فٹ پاتھ سے گزرنے والے لوگ اس بھاگتی، روتی اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی لڑکی پر ترس کھاتے ہوئے اسے پلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھی لیکن پاگل تھی۔

"مجھ سے پوچھے بغیر تم گھر سے چلی گئی میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر خوار ہو گیا۔ تمہیں ذرا خیال نہیں آیا باپ کا۔" وہ اور بلکنے لگی۔

"مجھے خیال آیا تھا۔ بار بار آتا تھا۔ لیکن میرے ساتھ سب نے برا کیا۔ آپ نے دیکھا نا۔ میرے ساتھ کس طرح سب نے برا کیا۔" اس کی کھانسی بڑھ رہی تھی۔

"تم نے بھی سب کے ساتھ برا کیا۔ میں نے یہ سب کچھ سکھایا تھا تمہیں؟" وہ اسے ملامت کر رہے تھے۔

"میں اب آپ کی ساری باتیں مانوں گی کبھی گھر سے باہر نہیں جاؤں گی۔ بس آپ مجھے اپنے پاس آنے دیں۔" وہ بلک بلک کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی ضیاء نہیں رکے تھے وہ اب سڑک کراس کرنے لگے تھے۔

وہ بھی بھاگتی ہوئی ان کے پیچھے سڑک کراس کرنے لگی تھی۔ سڑک پر چلنے والی تین چار گاڑیوں کے ڈرائیورز نے بیک وقت بریکس لگائے تھے۔ یہ نہ کرتے تو اس روڈ پر بہت بڑا حادثہ ہوتا۔

☆☆☆

بس کا دروازہ کھلتے ہی اس نے بے اختیار جھرجھری لی اور پھر اسے یاد آیا۔ وہ اپنا کوٹ جلدی میں گھر ہی بھول آیا تھا۔ بس سے نیچے اترتے ہوئے اس نے ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔ موسم کی پہلی برف باری ہو چکی تھی۔ اگرچہ وہ بہت مختصر وقت کے لیے ہوئی تھی مگر محکمہ موسمیات نے اگلے چند گھنٹوں میں مزید اور طویل برف باری کی پیش گوئی کی تھی۔

فٹ پاتھ پر برف کی بے حد ہلکی اور معمولی سی تہہ نظر آ رہی تھی جس نے فی الحال لوگوں کی زندگیوں کو مفلوج کرنا اور انہیں عمارتوں کے اندر رکنے پر مجبور کرنا شروع کیا تھا۔

وہ فٹ پاتھ بھی اس کے لیے شناسا تھا۔ اس کے گھر تک وہ دونوں اتنی بار اس پر چلتے رہے تھے کہ اس فٹ پاتھ پر بیٹھے پانچ بھکاری تک ان کے شناسا بن گئے تھے۔ وہ اب باقاعدہ بھیک لیتے ہوئے ان سے مسکراہٹوں اور greetings کا تبادلہ کیا کرتے تھے۔ اسے شک تھا، وہ ان دونوں کا نام بھی جانتے تھے اور نام نہیں تو کم از کم یہ ضرور جانتے تھے کہ وہ پاکستانی ہیں، انڈین نہیں اور ان دونوں کا رشتہ؟ شاید اس کے بارے میں بھی انہیں اندازہ تھا۔

اس کا پاؤں یک دم پھسلا، سوچوں سے واپس آتے ہوئے اس نے بے اختیار خود کو سنبھالا کنکریٹ کے اس فٹ پاتھ پر وہ گرتا تو اسے کتنی

بری چوٹ آسکتی تھی۔ وہ ہر بار اس فٹ پاتھ پر اسی جگہ پھسل جاتا تھا۔ جب اس کا یہ پھسلنا معمول بننے لگا تو وہ ناراض ہونے لگی اور وہ مزید شرمندہ۔ اور اب کچھ عرصے سے وہ فٹ پاتھ پر مخصوص جگہ آنے سے پہلے ہی اس سے کہنا شروع کر دیتی۔

''پھسلنے والی جگہ آنے لگی ہے، اب دھیان سے پاؤں رکھنا۔''

وہ بے حد محتاط ہونے اور اس کی اس تنبیہ کے باوجود وہاں کئی بار پھسلا تھا اور وہ بے اختیار اس کو سہارا دیتے ہوئے کہتی۔

''مجھے لگتا ہے تم اس لیے یہاں پھسلتے ہوتا کہ میرا ہاتھ پکڑ سکو۔''

''تمہارا ہاتھ پکڑنے کے لیے مجھے پھسلنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ جھنجلا کر کہتا۔ وہ رک جاتی اور اس سے چند قدم دور ہو کر بے حد تیکھے انداز میں اس سے کہتی۔

''اچھا؟ تمہارا کیا خیال ہے۔ بغیر وجہ کے اتنی آسانی سے ہاتھ پکڑا دوں گی تمہیں؟''

''میں ہاتھ پکڑانے کی بات نہیں کر رہا، ہاتھ پکڑنے کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ کچھ اور جھنجلاتا۔

''اتنی ہمت ہے؟ ذرا پکڑ کر تو دکھاؤ۔''

وہ بے حد ناراضی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ اپنے عقب میں کر کے اس کو چیلنج کرتی۔ وہ چند لمحے اس کو گھورتا۔ وہ جانتی تھی، وہ اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کرے گا اور اسے بھی پتا تھا کہ وہ یہ بات جانتی ہے۔ دو منٹ کی اس لڑائی کے بعد دونوں ہمیشہ کی طرح ساتھ ساتھ چلنے لگتے۔

اس کے پچھتاوے میں کچھ مزید اضافہ ہوا۔ جیب سے سیل فون نکال کر اس نے ایک بار پھر اس کو کال کرنے کی کوشش کی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس کی کال ریسیو نہیں کرے گی۔ وہ راستے میں پندرہ دفعہ اسے کال کر چکا تھا۔ ہر بار بیل ہوتی رہی تھی۔

سولہویں بار پھر اس نے کسی موہوم سی امید کے تحت کال ملائی۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس نے آج ایک دوسری جگہ سے ٹھوکر کھائی تھی۔ سیل فون کان سے لگائے بے یقینی کے عالم میں اس کے قدم رک گئے۔ دوسری طرف بیل ہو رہی تھی اور پہلے کی طرح کسی نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ اس کے پیروں کو روک دینے والی یہ چیز نہیں تھی بلکہ اس کے سیل فون کی رنگ ٹون تھی جو اس کے آس پاس کہیں بج رہی تھی۔

If tomorrow never comes کا وہ رنگ ٹون اس سیل فون میں اس کی منتخب کردہ تھی۔ بیل جس تواتر سے ہو رہی تھی، وہ رنگ ٹون اسی تواتر سے گونج رہی تھی۔

اس نے کال ختم کر دی۔ وہ جان گیا تھا، فون کہاں ہو سکتا تھا مگر وہاں کیوں تھا؟

وہ چند قدم آگے بڑھ کر ایک سیکنڈ میں اس فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے پانچ بھکاریوں میں سے پہلے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے سیل فون اپنے ہاتھ میں بلند کیے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اس کے سامنے کھڑا اس قیمتی سیل فون کو دیکھ رہا تھا۔ یہ سیل فون چند ہفتے پہلے ہی اس نے اسے گفٹ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا، اس سیل فون کی میموری میں محفوظ واحد نام اور کانٹیکٹ نمبر اس کا تھا۔

"واحد تمہارا نام ہے جسے دیکھ کر مجھے کچھ "محسوس" ہوتا ہے، باقی ہر نام کے ساتھ صرف "یادیں" جڑی ہیں اور میں ان یادوں سے فرار چاہتی ہوں۔ تمہارا نام کافی ہے میرے لیے۔" اس نے سیل فون میں اس کا نام محفوظ کرتے ہوئے کہا تھا۔

اسے یقین تھا، اس سیل فون میں اور کسی کا نام نہیں تھا۔ اس کی فون بک اس کے نام سے شروع ہو کر اسی کے نام پر ختم ہو جاتی تھی۔

اور اب وہ قیمتی فون سڑک پر بیٹھے اس بوڑھے بھکاری کے ہاتھ میں تھا جو ہر روز وہاں بیٹھ تاش کے پتوں سے مختلف چیزیں بناتا رہتا تھا یا اکیلا بیٹھ تاش کھیلتا رہتا۔ آج وہ تاش کھیل رہا تھا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ وہ تاش کے پتے کھڑے نہیں کر سکتا تھا، وہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کئی بار اس کے پاس بیٹھ کر تاش کھیلنا شروع کر دیتی اور وہ احمقوں کی طرح فٹ پاتھ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اس کو یکے بعد دیگرے بازی پر بازی ہارتے دیکھتا رہتا۔ وہ دیکھتا تھا کہ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر وہ آخری لمحوں میں بازی ہار جاتی تھی۔ بہت دفعہ اس کا جی چاہتا، وہ اسے ٹوک کر کی جانے والی غلطی کے بارے میں بتا دے۔ اگرچہ یہ غلط ہوتا پھر بھی وہ اس کو اتنی بری طرح ہارتے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ اسے زبان سے کچھ نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ وہ بوڑھا بھکاری برا مان جاتا اور کسی اشارے کی مدد سے بھی نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ وہ تاش کھیلتے ہوئے ایک بار بھی سر نہیں اٹھاتی تھی۔ کسی مدد، کسی داد، کسی آس سے اس کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ سر جھکائے وہ کچھ دیر وہاں بیٹھی تاش کھیلتی پھر آخری بازی کے بعد ایک گہرا سانس لے کر مسکراتی اور بوڑھے کو دیکھتی جو فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا ہوتا پھر وہ جیب سے چند ڈالر نکالتی اور اس کے ڈبے میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوتی۔

"میں اچھا کھیلی نا؟" وہ ساتھ چلتے اس سے پوچھتی۔

"ہاں۔" وہ مختصراً کہتا۔

"لیکن ہار گئی۔"

وہ جانتا تھا، وہ اس جملے میں کیا کہہ رہی تھی۔

"معمولی غلطی سے۔" اسے بھی پتا تھا کہ وہ ان تین لفظوں میں اسے کیا جتا رہا تھا۔

وہ ایک دوسرے کو دیکھتے، چند لمحوں کے لیے جھجکتے۔ گہری نظروں کا تبادلہ کرتے، نظریں چراتے پھر قدم بڑھا دیتے۔

"She gave it to me." (یہ اس نے مجھے دے دیا۔) بوڑھے بھکاری کی آواز نے اسے یک دم چونکا دیا۔ وہ جھریوں بھرے چہرے پر پیلے دانتوں کی نمائش کرتا اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنے جسم میں کپکپاہٹ محسوس کی۔ یہ سردی نہیں تھی، کچھ "اور" تھا۔ وہ اس کے دیے ہوئے تحفے کو فٹ پاتھ پر بیٹھے بھکاری کو کیسے تھما سکتی تھی؟"

☆☆☆

"کتنا سمجھایا کرتا تھا میں تمہیں کتنا ... تم نے میری ہر نصیحت کو ذہن سے نکال کر پھینک دیا ... اپنی ضد اور بے صبری میں سب کچھ تباہ کر دیا" وہ اب کہتے ہوئے اس کی بلڈنگ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ اسی طرح روتے ہوئے باپ کی طرف لپک رہی تھی ان کی کوئی ملامت کوئی جھاڑ کوئی

غصہ اسے اس وقت برا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کتنے سالوں بعد پہلی بار اسے نظر آئے تھے۔ پہلی بار اس کے ہاتھ اور پاؤں نیلے اور سوج رہے تھے۔ سرد کاٹ دار ہوا کے تھپیڑے اس کی ہڈیوں میں سلاخوں کی طرح اتر رہے تھے۔ اس کے پورے جسم اور گردن پر خون کی رگیں آہستہ آہستہ ابھرنا شروع ہوگئی تھیں۔ اس کی کھانسی بلڈنگ کے اندر آ کر بھی نہیں رکی تھی۔ نہ کھانسی نہ آنکھوں اور ناک سے بہتا پانی وہ اب منہ کھول کر جدوجہد کرتے ہوئے سانس لے رہی تھی اسے ناک سے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ لیکن وہ خوش تھی باپ اس کی بلڈنگ میں آ گیا تھا۔ وہ لفٹ میں باپ کے ساتھ تھی۔ لیکن باپ چند لوگوں کے پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو ہٹا کر باپ تک جانے کی کوشش کی وہ ناکام رہی۔ لفٹ میں اتنی جگہ نہیں تھی لفٹ میں کھڑے لوگوں نے اس سے کچھ کہنا شروع کیا تھا۔ ضیا یک دم خاموش ہو گئے تھے۔ وہ بس اسے دیکھ رہے تھے۔ بے حد اداس اور رنجیدہ آنکھوں سے۔ وہ جانتی تھی ایسا ہی ہوگا۔ ضیا اس سے ناراض کیسے رہ سکتے تھے۔

☆☆☆

اس نے بے یقینی اور شاک کے عالم میں قدم آگے بڑھائے۔ کچھ دور آگے گٹار بجاتے ہوئے اگلے سیاہ فام بھکاری نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

وہ دونوں ہمیشہ وہاں کھڑے ہو کر کچھ دیر خاموشی سے اس کے گٹار کو سنا کرتے تھے پھر جیسے بجائی جانے والی دھن پہچاننے کی کوشش کرتے اور اکثر اس میں کامیاب ہو جاتے۔ پھر وہ اس سیاہ فام کو کوئی دوسری دھن بجانے کے لیے کہتے۔ ایک دفعہ پھر اسے پہچاننے میں لگ جاتے۔

اس سیاہ فام کی انگلیاں آج بھی بڑی تیزی سے گٹار بجا رہی تھیں مگر وہ آج وہاں کسی دھن کو بوجھنے نہیں آیا تھا، وہ اس کے ڈبے میں پڑے سکوں اور نوٹوں میں اس چیز کو دیکھنے آیا تھا جو وہاں وہ پھینک کر گئی تھی اور وہ چیز سامنے ہی پڑی تھی۔ Gucci کی وہ گھڑی جو اس نے اس کی پچھلی سالگرہ پر دی تھی۔

”تم اسے پہنو گی تو وقت قیمتی ہو جائے گا۔“

وہ گھڑی کا کیس ہاتھ میں پکڑے اس پر ایک نظر ڈال کر مسکرائی۔ ”کس کا وقت؟ میرا یا تمہارا؟“

”تمہارا۔“ وہ بھی مسکرایا۔

”لیکن میرے پاس تو وقت ہے ہی نہیں۔“ اس نے لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں پتا ہے، میں نے زندگی میں کبھی ریسٹ واچ نہیں پہنی۔“

”کیوں؟“ اس نے دلچسپی لی۔

”مجھے وقت کو کلائی پر باندھنے کی بجائے مٹھی میں قید رکھنا زیادہ آسان لگتا ہے۔“

اس نے عجیب سے لہجے میں اس کی دی ہوئی بیش قیمت گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے لگتا ہے، وقت کلائی پر ہو تو یہ انتظار کروانے لگتا ہے۔“

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ چونکا۔

"انتظار موت ہے۔" اس نے گھڑی کو دیکھتے ہوئے بے حد عجیب لہجے میں کہا۔

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" اس نے اسے ڈانٹا اور پھر گھڑی کیس سے نکال کر اس کی کلائی پر باندھ دی تھی۔

اور اب وہ گھڑی اس ڈبے میں پڑی تھی، اس کے دل کو بے اختیار کچھ ہوا۔

☆☆☆

لفٹ رک گئی اس سے پہلے کہ دوسرے لوگ اترتے اور وہ ضیا سے لپٹ جاتی ضیا لفٹ سے نکل گئے تھے۔ وہ ایک بار پھر روتے ہوئے باپ کے پیچھے لپکی تھی پھر اس نے انہیں اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے کے سامنے جا کر غائب ہوتے دیکھا۔ وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ آ کر وہاں کھڑی ہو گئی۔ وہ اندر گئے تھے۔ اسے یقین تھا وہ اندر تھے اس نے مٹھی میں دبی چابی سے دروازہ کھولنے کی کوشش۔ اسے کئی منٹ لگ گئے۔ اس کی انگلیاں کام نہیں کر رہی تھیں وہ بری طرح سوجی ہوئی تھیں اور بالکل بے حس ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

اسے دیکھنا تھا، وہ اگلے بھکاری کو کیا دے کر گئی تھی۔ اس بار اسے کسی ڈبے میں جھانکنا نہیں پڑا۔ وہ اسپینش ہپی جسے وہ ہر وقت نشے میں دیکھتے تھے، ور جو کچھ ہوش میں ہوتا تو چند رنگین بالز کو ہوا میں اچھالتے کرتب دکھا رہا ہوتا یا چند گلاس کو ہوا میں اچھالتا رہتا۔ وہ ہپی، وہ منک کوٹ پہنے ہوئے تھا جو اس نے نئے سال پر اسے تحفے میں دیا تھا۔ وہ اس بیڈیز منک کوٹ کو اپنے دبلے پتلے جسم پر چڑھائے بے حد مضحکہ خیز مگر بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل بے اختیار ڈوبا۔ اس نے اس دن وہ قیمتی منک کوٹ پہلی بار پہنا تھا۔ اس خاص موقع پر اور اب وہ ایک متروکہ چیز بن چکا تھا۔

"مائی گاڈ۔" وہ اس کوٹ کو دیکھ کر بے اختیار چلائی تھی۔

"تمہیں پسند نہیں آیا کیا؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنا۔

"اس منک کوٹ کی قیمت میں دس، بہت اچھے کوٹ آ جاتے۔ تم ایک بے حد فضول خرچ آدمی ہو۔" وہ واقعی ناراض تھی۔

"تو کیا اسے واپس کر کے دس اچھے اور شاندار کوٹ لا دوں تمہیں؟" اس نے اسی انداز سے کہا۔

"کتنا روپیہ تم نے عورتوں میں اس طرح کے منک کوٹ بانٹنے پر ضائع کیا ہو گا۔" وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

"کون سی عورتیں؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"اچھا اب ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ مدافعانہ انداز میں بولی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے کوئی غلط بات کہہ دی تھی۔

وہ جواب دینے کے بجائے بے حد ناراض ہو کر اس کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ حواس باختہ اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی۔

"مذاق کر رہی تھی۔ اچھا اب بس ختم کرو بات کو اوکے آئی ایم سوری اب کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑوں اچھا کم از کم تم کچھ کہو تو سہی اب ایکسکیوز کر تو رہی ہوں، اب اور کیا کروں کیا مر جاؤں؟"

وہ اس کے پیچھے گاڑی تک آتے آتے روہانسی ہوگئی تھی۔

وہ بے اختیار رکا۔ ''میں پہلے تو شاید مان جاتا مگر یہ بے ہودہ بات جواب تم نے کی ہے... یہ...'' وہ واقعی بے حد غصے میں آ گیا تھا۔

''تم مجھے تحفے مت دیا کرو۔'' اس نے بے اختیار اس کی بات کاٹ کر بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''کیونکہ میں تمہارے اتنے قیمتی تحفوں کے بدلے میں اتنے قیمتی تحفے نہیں دے سکتی۔''

''تو تم سے تحفے مانگ کون رہا ہے؟''

''ہاں، کوئی نہیں مانگ رہا مگر مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگنے لگتا ہے۔''

''اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تمہارا دماغ چھوٹا ہے اور چھوٹے دماغ کے ساتھ انسان صرف چھوٹی باتیں سوچتا ہے۔''

اس نے بے اختیار اسے وہیں کھڑے کھڑے ڈانٹا اور پھر اگلے دس منٹ وہیں پارکنگ میں گاڑی کے پاس کھڑا مسلسل بولتا رہا تھا۔

''کسی سمجھ دار مرد کو کسی بے وقوف عورت سے محبت نہیں کرنا چاہیے۔'' اس نے بالآخر بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''چلو، پھر تو سارا جھگڑا ہی ختم ہوا کیونکہ نہ میں بے وقوف عورت ہوں، نہ تم سمجھ دار مرد ہو۔ آؤ واپس چلیں۔''

وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے بے ساختہ بڑے اطمینان سے بولی تھی۔ وہ چند لمحے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھتا رہا پھر یک دم ہنس پڑا۔

''یہ احساس تک نہیں تم کو کہ اتنی سردی میں یہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ دیکھو، میرے ہاتھ تک نیلے ہو گئے ہیں۔''

اپارٹمنٹ تک واپسی کے پانچ منٹ میں وہ بولتی رہی تھی اور وہ ہنستا رہا تھا۔

بچی کے ہاتھ سے بے اختیار ایک بال گر کر اس کے پیروں کے پاس آئی۔ اس نے کھڑے کھڑے جوتے کی نوک سے بال اس کی طرف لڑھکائی اور اگلے بھکاری کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

''ابو... ابو...'' وہ اپارٹمنٹ کے اندر آتے ہی آوازیں لگانے لگی تھی۔ ضیا کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بے تحاشا روتی ہوئی پاگلوں کی طرح اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ہر اس جگہ باپ کو ڈھونڈ رہی تھی جہاں ان کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا... وہ کہیں نہیں تھے وہ پھر بھاگتے ہوئے اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے کی طرف لپکی... شاید... شاید وہ باہر ہوں گے... اس انتظار میں کہ وہ ان کے لیے دروازہ کھولے... یا پھر کہیں دوبارہ... دوبارہ لفٹ کے ذریعے بلڈنگ سے باہر... وہ ایک بار پھر چلے گئے تو وہ ان کو کیسے ڈھونڈے گی۔ وہ دروازے تک پہنچی جب اس نے ایک بار پھر ضیا کی آواز اپنے عقب میں سنی۔

''زینی۔'' وہ اسے پکار رہے تھے۔

وہ پھر بے اختیار ہو کر بھاگتے ہوئے اندر آئی۔ وہ وہاں نہیں تھے۔

''ابو... ابو... ابو...'' وہ بڑبڑاتے ہوئے رونے لگی... کسی چیز سے اس کا پاؤں اٹکا اور وہ اوندھے منہ فرش پر گر پڑی اس کی دونوں کہنیوں اور گھٹنوں کو بری طرح چوٹ آئی۔

''کتنا کہا تھا احتیاط سے چلا کرو... مت بھاگا کرو... لیکن تم نے کبھی میری نہیں سنی۔''

وہ بے تابی سے اٹھ کر بیٹھی ضیا سامنے کھڑے تھے... مگر دور تھے۔

زینی نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی وہ اٹھ نہیں سکی اس کا جسم یک دم جیسے اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا... وہ وہیں بیٹھے اکھڑے ہوئے سانس کے ساتھ روتی ہوئی ضیا کو دیکھتی رہی... وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

اگلے بھکاری نے اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر فلوٹ بجاتے ہوئے سر کو بے اختیار خم کر کے ہمیشہ کی طرح اس کا استقبال کیا۔ اس نے آج پہلی بار اس کے اس استقبالی انداز کو نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں اس کے ڈبے کے پاس پڑے سرخ برانڈڈ اٹالین جوتوں کے اس جوڑے کو دیکھ رہی تھیں جو اس نے کل ایک بہت مہنگے اسٹور سے کوئی پچاس جوتے ٹرائی کرنے کے بعد اسے خرید کر دیے تھے۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی سے ایک لہر گزری تھی، وہ کیا پاگل ہوگئی تھی کہ اس سردی میں وہ جوتے وہاں اتار کر وہاں سے پیدل اپنے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ تک گئی تھی۔ برف اور سرد کھردری سڑک نے اس کے پیروں کا کیا حال کیا ہوگا۔ کوئی اسے اپنے پیٹ میں گھونسے مارتا محسوس ہوا۔

اسے اپنے سرخ کپڑوں کے ساتھ میچ کرتا سرخ جوتوں کا ایک جوڑا چاہیے تھا۔ چار مختلف اسٹورز سے پھرتے پھراتے وہ بالآخر پانچویں اسٹور میں آئے تھے اور تب تک وہ کچھ جھنجلا چکا تھا جبکہ وہ ابھی اسی طرح چہکتے ہوئے خوش باش مختلف جوتوں کو پہن پہن کر دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں آخر کس قسم کا جوتا چاہیے؟'' اس نے پندرھواں جوڑا ٹرائی کرنے کے بعد ریجکٹ کر دیا تو اس نے بالآخر تنگ آکر پوچھا۔

اس نے جواب میں بے حد سنجیدگی سے اسے جوتے کی شکل، معیار، اسٹائل اور رنگ کے بارے میں جو تین منٹ کا لیکچر اسے دیا تھا، اس سے وہ صرف یہ اخذ کر سکا تھا کہ اسے 'Stiletto' ہیل والا ایک سرخ جوتا چاہیے۔

''تم کسی اور رنگ کا جوتا کیوں نہیں خرید لیتیں۔''

ساتویں اسٹور کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے کہا۔

اس نے جواباً اسے اتنی ملامت بھری نظروں سے دیکھا تھا کہ وہ بے اختیار شرمندہ ہوگیا۔

''میرے کپڑے سرخ رنگ کے ہیں۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اس طرح کہا جیسے کوئی بڑا کسی بچے کو سمجھاتا ہے۔ ''اس لیے کامن سینس تو یہی کہتی ہے کہ مجھے سرخ جوتے ہی خریدنے چاہئیں۔'' اس نے مزید اضافہ کیا۔ اس نے دوبارہ کچھ بولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''کہیں نہ کہیں ایک سرخ جوتوں کا جوڑا ہوگا جو اس کے نام کا ہوگا اور مجھے کیا کرنا ہے، مجھے صرف اس کو escort ہی تو کرنا ہے۔'' اس نے جیسے خود سے طے کیا تھا۔

اور بالآخر جب اسے یقین ہونے لگا کہ شہر میں سرخ جوتوں کا ایسا کوئی جوڑا نہیں ہے جو اس کے نام کا ہے تو اس نے جوتے پہن کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھا "میرا خیال ہے، یہ ٹھیک ہے۔ تمہیں کیسے لگ رہے ہیں؟"

"Just Perfect"

وہ بے اختیار والٹ نکالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس کے انداز پر بے اختیار ہنسی۔

"کم از کم دیکھ تو لو کہ میں نے کیا خریدا ہے اور یہ میرے پیروں میں کیسے لگ رہے ہیں۔"

"یہ جیسے بھی لگ رہے ہیں، مجھے صرف یہ خوشی ہے کہ تم نے بالآخر جوتے پسند کر لیے ہیں۔" اس نے کریڈٹ کارڈ نکالتے ہوئے ایک سرسری نظر اس کے پیروں پر ڈالی۔ وہ جوتے اس کے پیروں میں اچھے لگ رہے تھے مگر اسے وہ پچھلے پچاس جوڑے بھی برے نہیں لگے تھے جو اس نے پچھلے پانچ گھنٹوں میں مختلف اسٹورز میں پہن کر اسے دکھائے تھے۔

اور اب پانچ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد ڈھائی سو ڈالرز کے وہ برانڈڈ جوتے اس ناہموار فٹ پاتھ پر فلوٹ بجاتے اس آدمی کے سامنے پڑے تھے جو شاید اسی کی طرح اس ہڈیوں تک اترتی سردی میں اسے جوتے پاؤں سے اتارتے دیکھ کر حیران ہوا ہوگا اور پھر اس نے وہی سوچ ہوگا جو اسے سوچنا چاہیے تھا کہ وہ شاید نشے کی حالت میں ہے۔

اس کا منک کوٹ، جوتے، گھڑی، موبائل اس فٹ پاتھ پر پڑے تھے تو اب اس کے پاس اتار پھینکنے کے لیے اور کیا رہ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا، کہ اس کے جسم پر صرف دو چیزیں باقی تھیں۔ اس کا سرخ باس اور ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی (اس کے جسم پر اس دن سجایا ہوا واحد زیور)

وہ لباس اس کا اپنا تھا۔ اس کا دلوایا ہوا ہوتا تو وہ اسے بھی اتار کر اسی فٹ پاتھ پر پھینک چکی ہوتی۔ وہ کسی دوسری عورت کو جانتا تھا یا نہیں مگر اس کو جانتا تھا۔ وہ اس فٹ پاتھ پر اس کی دی ہوئی چیزیں پھینک رہی تھی۔

☆☆☆

"یہ ساری چیزیں چاہیے تھیں تمہیں ۔۔۔؟" وہ کمرے میں بکھرے کرم کے تحائف کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

"اس لیے سب کچھ گنوایا تم نے ۔۔۔؟"

"نہیں ۔ نہیں مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے ۔ کوئی چیز بھی نہیں۔" وہ یک دم اٹھ گئی۔

"مجھے ۔ مجھے ۔ یہ سب ۔ یہ سب نہیں چاہیے ۔ یہ بھی نہیں ۔ یہ بھی نہیں ۔ کچھ بھی نہیں ۔" وہ لڑکھڑاتی ۔ گرتی پڑتی کمرے کی کھڑکی کھولے کرم کے دیے ہوئے سارے تحفے باہر پھینک رہی تھی ۔ سب ۔ ان گفٹس کے پیپرز تک ۔ کچن کاؤنٹر پر پڑی کرم کی کھینچی ہوئی تصویروں تک ۔ صرف چند منٹ میں کمرہ ان تمام چیزوں سے خالی ہو گیا تھا ۔ اس نے جیسے "دنیا" کو کمرے سے باہر پھینک دیا تھا۔

☆☆☆

فٹ پاتھ پر بیٹھی اسکیچ بناتی اس ادھیڑ عمر عورت کے پاس اس کی انگوٹھی ہونا چاہیے تھی۔ وہ آگے بڑھ کر اس قطار میں بیٹھے پانچویں بھکاری کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ وہ عورت مخبوط الحواس تھی یا کم از کم ان دونوں کو یہی لگتا تھا۔ پچھلے چار بھکاریوں کے برعکس وہ کبھی سر اٹھا کر پاس سے گزرنے والے یا پاس آ کر کھڑے ہونے والے لوگوں کو نہیں دیکھتی تھی۔

وہ ہر بار ایک ہی مرد کا چہرہ اسکیچ کرتی تھی۔ ایک نوجوان...... خوبصورت مرد کا...... مگر ہر بار وہ چہرہ کسی دوسرے اینگل سے اسکیچ کر رہی ہوتی۔ وہ اپنے کام میں بلاشبہ طاق تھی۔ وہ دونوں اکثر اس کے پاس کھڑے اس کو اسکیچ بناتے دیکھتے رہتے۔ وہ دونوں اب اس اسکیچ کیے جانے والے چہرے سے بے حد شناسا ہو گئے تھے۔

''کون ہو سکتا ہے یہ مرد؟'' اس نے ایک دن وہاں کھڑے کھڑے اس سے پوچھا۔ ''شاید اس عورت کا بیٹا۔'' اس نے خود ہی اندازہ لگایا۔

''نہیں، بیٹا نہیں ہے۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

اس نے اس کے جواب پر چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اسکیچ پر نظریں جمائے اپنے اوور کوٹ میں دونوں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔

''تو پھر کون ہے؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں اور چہرے پر بے حد عجیب سا تاثر تھا۔

''چھوڑو، جانے دو۔'' اس نے جواب دینے کے بجائے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔ اس نے جواب کے لیے اصرار نہیں کیا۔ اسے جواب مل گیا تھا۔

وہ عورت اب بھی وہی چہرہ بنا رہی تھی اور اسکیچ کرتے اس کے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں پلاٹینم کی وہ انگوٹھی تھی جو اس نے سات دن سترہ گھنٹے پہلے رات کے تین بجے اسے دی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا، کہاں گئی۔'' وہ رات کے تین بجے اس کے اپارٹمنٹ پہنچنے کے بعد اب اپنی جیکٹ اور اوور کوٹ کی ایک ایک جیب کو کھنگال چکا تھا۔ اور اب جیکٹ کی جیبوں کو ایک بار پھر ٹٹول رہا تھا۔

''کیا کہاں گئی؟'' وہ اس کے قریب کھڑی تھی منہ پر ہاتھ رکھے اپنی جماہی کو روکتے ہوئے اس نے اپنی نیند سے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے کہا۔

''ایک رنگ تھی۔'' وہ اب جیکٹ کی اندرونی جیب کو دوبارہ چیک کر رہا تھا۔

''کیسی رنگ؟'' وہ جماہیاں لیتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نیند میں کھڑے رہنا اس کے لیے بے حد دشوار تھا۔

''تھی ایک رنگ۔'' وہ بے حد مایوسی سے جیکٹ کو آخری بار جھاڑتے ہوئے بولا۔

''اور تو کوئی مسئلہ نہیں ہے نا؟'' اس نے کشن کو سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا مسئلہ؟'' وہ حیران ہوا۔

''اب رات کو تین بجے تم کسی کے گھر آؤ گے تو وہ تم سے یہی پوچھے گا نا۔'' وہ اب کشنز کے ڈھیر کو صوفے کے ایک طرف کرتے ہوئے

اس پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"جب جانے لگو تو دروازہ ٹھیک سے بند کر کے جانا۔ اب یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اسے ہدایت دینے کی کوشش کی مگر آنکھیں بند کرنے سے پہلے ہی وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ لاؤنج میں پڑی کرسیاں ادھر ادھر ہٹا کر فرش پر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے۔ یہیں پر کہیں گری ہے۔" اس نے مڑ کر اسے دیکھے بغیر کہا۔

"میں سونے لگی ہوں اور اب اگر تمہیں کوئی کرسی ہٹانا بھی ہے تو بالکل آواز نہیں ہونا چاہیے۔ اب ایک رنگ ڈھونڈنے کے لیے تم کیا میرا اپارٹمنٹ کھود ڈالو گے۔" وہ ہلکی سی خفگی کے ساتھ بڑبڑائی اور ایک بار پھر کشن کے اوپر سر رکھ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ انگوٹھی اسے فرش پر ہی دروازے سے کچھ فاصلے پر پڑی ملی۔ اس نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا مگر اس تلاش میں اسے پانچ منٹ لگ گئے تھے اور تب تک وہ صوفے پر گہری نیند سو چکی تھی۔ وہ انگوٹھی لے کر اس کے پاس آیا اور دو تین بار اسے آواز دی مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ مزید وقت ضائع کیے بغیر وہ پنجوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اس نے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ اسے وہ انگوٹھی پہنائی اور پھر اسی احتیاط کے ساتھ اس کا ہاتھ دوبارہ کشن پر رکھ دیا۔ اس کے بیڈ روم سے کمبل لا کر اس پر ڈالتے ہوئے وہ اسی خاموشی اور احتیاط کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ سے نکل آیا تھا۔

Till death do us part?

وہ انگوٹھی پر کندہ لفظوں کو وہاں کھڑا کسی دقت کے بغیر دیکھ سکتا تھا۔ وہ کیا کر رہی تھی؟ اسے اپنی زندگی سے نکال رہی تھی یا خود اس کی زندگی سے نکل رہی تھی؟

وہ میکسیکن عورت فٹ پاتھ کے کونے پر تھی، وہ اسے چھوڑ کر آگے بڑھا اور موڑ مڑ کر اس عمارت کے سامنے آ گیا جس کی 23 ویں منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں وہ اس وقت تھی۔ وہ ہر بار جب بھی اس عمارت کے سامنے آتا، ایک بار لاشعوری طور پر سر اٹھا کر 23 ویں منزل کی اس کھڑکی کو ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کرتا جو اس کے اپارٹمنٹ کی تھی۔ شروع شروع میں وہ ناکام رہا پھر اس نے ایک گملا لا کر اس کی کھڑکی کے باہر بڑھے ہوئے چھجے پر رکھ دیا تھا۔ اس گملے اور اس میں لگی ہوئی بیل سے وہ آسانی سے اس کی کھڑکی ڈھونڈ لیتا تھا لیکن آج فضا ہلکی ہلکی دھند آلود تھی۔ اسے یقین تھا، وہ سر اٹھا کر 23 ویں منزل کو نہیں دیکھ سکے گا۔

اس نے پھر بھی سر اٹھا کر دیکھا اور پھر وہ سر نیچے نہیں کر سکا۔ اسے 23 ویں منزل نظر نہیں آئی تھی مگر اسے ہوا میں بہت سی تصویریں اڑتی نظر آ گئی تھیں۔ ان میں سے چند کچھ لمحوں تک زمین پر پہنچنے والی تھیں۔

اس کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹ کر گر پڑا تھا پھر اس نے اپنے آپ کو بے تحاشا بھاگتے پایا۔ اس کے پاؤں سے ایک بوٹ نکل گیا۔ اس نے دوسرا خود اتار پھینکا۔ وہ ایک بار بھی سلپ نہیں ہوا اور اس نے برف اور کنکریٹ کی ٹھنڈک کو بھی محسوس نہیں کیا۔ اس کے کانوں میں صرف اس کی ہنسی اور آواز آ رہی تھی۔

وہ دونوں سینما ہال میں بیٹھے تھے اور وہ بے حس و حرکت اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"تم مجھے یہ دکھانے کے لیے یہاں لائی تھیں؟" اس نے شاکڈ ہو کر بے یقینی سے اس سے کہا۔

"ہاں، تمہیں اچھا لگا؟" وہ اسی اطمینان سے پاپ کارن کھاتے ہوئے بولی۔

اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتا، اس نے اس سے ایک اور بات کہی تھی۔ وہ اگلے دو منٹ تک بے حس و حرکت اس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اسے لگا کہ وہ اسے نہیں جانتا تھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" وہ اس کی بات پر ہنس پڑی۔

"ہر عورت کا ہوتا ہے۔" وہ سکرین پر نظریں جمائے پاپ کارن کھا رہی تھی۔

سکرین پر ہیروئن کی چیزیں اب بھی ایک بلند عمارت سے گرتی نظر آ رہی تھیں پھر ہیروئن کھڑکی میں کھڑی نظر آئی اور پھر فضا میں نیچے گرتی۔

"کیا Exit ہے۔" اس نے زینی کو ستائشی انداز میں گہرا سانس لیتے دیکھا۔ کرم اب بھی شاک سے باہر نہیں نکلا تھا...... اس نے چند لمحے پہلے اس سے کہا تھا وہ اپنی زندگی کا اختتام ایسا ہی چاہتی تھی۔

"زندگی میں آپ کی entry جیسی مرضی ہو exit شاندار ہونی چاہیے Dramatic......tragic......unforgettable۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔ پھر یک دم اس نے ہنس کر کرم کو دیکھا۔

"پریشان مت ہو مجھے اس ہیروئن کی طرح اب کوئی صدمہ ملنے کا امکان نہیں جسے میں برداشت نہ کر سکوں اور اپنے کو دو جاؤں۔"

☆☆☆

"اب میں آ جاؤں آپ کے پاس؟" اس نے بازو پھیلا کر روتے ہوئے باپ سے کہا۔

ضیاء نے نفی میں سر ہلایا تھا اور پھر صوفے پر اٹھ کر کھڑکی کی طرف گئے اگلے ہی لمحے زینی نے انہیں کھڑکی سے باہر جاتا دیکھا...... وہ چیخ مارتی ننھے بچے کی طرح باپ کے پیچھے لپکی تھی...... باپ پھر جا رہا تھا...... وہ کھڑکی کی sill پر پاؤں رکھ کر چڑھنے لگی...... ضیاء تھوڑی دیر کھڑے تھے۔

"زینی مت آؤ۔" زینی نے باپ کو بے اختیار چلاتے ہوئے سنا۔

"آگے مت آؤ۔" اس نے سر اٹھایا...... اس نے ضیاء کو روتے دیکھا تھا بالکل ویسے ہی بلک بلک کر جس طرح وہ اس رات سول سروسز اکیڈمی کے باہر سے اسے لاتے ہوئے رکشے میں روئے تھے۔

"مجھے آپ کے پاس آنا ہے ابو...... میں اب ہمیشہ آپ کی بات مانوں گی...... کبھی نافرمانی نہیں کروں گی۔" وہ ونڈو سل پر پاؤں جمانے کی کوشش کرتے ہوئے سیدھا کھڑے ہونے کی کوشش کر رہی تھی...... ہوا کے تھپیڑے اسے واپس اندر دھکیل رہے تھے۔

ضیاء نے روتے ہوئے بالآخر اس کی طرف اپنے بازو پھیلا دیے تھے...... اس نے ونڈو سل پر کھڑے پہلا قدم باہر رکھا...... دوسرا قدم ہوا میں پڑا تھا...... تیسرا قدم کہیں نہیں...... اس نے اپنی گردن سے دوپٹے کو نکلتا محسوس کیا...... پھر اس نے خود کو ضیاء کی آغوش میں پایا...... وہ روتے

ہوئے اس کا ماتھا چومتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے.....زیبی نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں اپنی آنکھیں بند کرلیں اور تب اسے یاد آیا.....ضیاء تو مر چکے تھے پھر وہ کسے دیکھ رہی تھی.....اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں.....اب دیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

سامنے کھلی کھڑکی میں پڑی بیل کے گرد لپٹا اس کا دوپٹہ ہوا میں لہرا رہا تھا.....پتوں سے خالی اس بیل پر.....وہ مشینی انداز میں چلتا ہوا اندر آ گیا.....کمرے میں چند گھنٹے پہلے بکھری اس کی چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں تھا.....کمرے میں وہ بھی نہیں تھی اس کا وجود بری طرح کپکپانے لگا تھا۔ بیل سے لپٹا وہ سرخ دوپٹہ ہوا میں عجیب رقص کرنے میں مصروف تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کھڑکی کے پاس آیا تھا.....اس کا پورا وجود لرزاں تھا..... پورا وجود..... وہ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ نیچے جھانکنا نہیں چاہتا تھا..... نیچے اب کچھ نہیں رہا تھا.....اس کا سرخ دوپٹہ کرم کے سینے سے لپٹنے لگا تھا.....کرم نے اپنے کپکپاتے ہاتھ سے اس کے دوپٹے کو اپنی گرفت میں لینا چاہا تھا..... بالکل اسی لمحے دوپٹے کا بیل سے اٹکا ہوا سرا نکل گیا تھا.....وہ اس کی انگلیوں کی پوروں کے پاس سے ہوتا ہوا اور ہوا میں بلند ہو گیا تھا..... کسی کٹی پتنگ کی طرح ہوا میں تیرتا وہ اب آہستہ آہستہ نیچے جا رہا تھا.....کرم گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا کسی مفلوج، بے جان آدمی کی طرح.....وہ ''زندہ'' تھا لیکن ''زندگی'' چلی گئی تھی۔

''زندگی میں آپ کی entry جیسی مرضی ہو لیکن آپ کی exit شاندار ہونی چاہیے۔ dramatic.....tragic..... unforgettable۔'' کسی نے سرگوشی کی تھی.....وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑا رہا۔

.....❀.....

ختم شد